مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں

تمہید عہد قبل تاریخ کا تو علم نہیں کہ انسان پر ہر وقت کس قسم کا جذبہ طاری رہتا تھا، لیکن جب سے دنیا کی تاریخ مدوّن ہوئی ہے، اس وقت سے لیکر اس وقت تک کوئی زمانہ، کوئی قوم، اور کوئی ملک ایسا نہیں، جو مزاح و تفنن کے ذوق سے خالی پایا جاتا ہو۔ علی الخصوص شعراء کا طبقہ کہ ان میں سے اکثر کا مدار شہرت یہی ذوق رہا ہے۔ چنانچہ اردو فارسی جاننے والے حضرات واقف ہوں گے۔ کہ قاآنی۔ نعمت خان عالی۔ سعدی۔ سوزنی۔ جعفر زٹلی۔ ضاحک۔ انشا۔ اکبر وغیرہ کے کلام میں یہ عنصر کس حد تک پایا جاتا ہے۔ غالب کو فلسفی اور دقیق گو شاعر ہونے کی حیثیت سے تو سب نے دیکھا لیکن اسکے بذلہ سنج اور شوخ نگار ہونے پر کسی نے نگاہ نہیں ڈالی جو اصل راز اس کی کامیابی کا تھا۔ چنانچہ اس مضمون میں ہم اس پرا سی حیثیت سے گفتگو کریں گے اور بتائیں گے۔ کہ اس کی ظرافت کسقدر بلند تھی۔ ظرافت نہایت وسیع المعنی لفظ ہے۔ جو ہزل، پھکڑ، ضلع جگت۔ فقرے۔ پھبتیاں۔ اور لطائف وغیرہ سب سے پر مشتمل ہے۔ اس لئے پہلے مختصراً ان سب کے فرق کو بھی معلوم کر لیجئے

ہزل ظرافت کے اُس آخری درجہ کا نام ہے۔ جہاں کلام کا سلسلہ بیہودگی اور مسخرگی سے جا ملتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی خواہش کا بھی شمول ہوتا ہے۔ ہم نظم میں سعدی د انوری وغیرہ کی ہزلیات کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں انوری کہتا ہے

روزے از بہر تماشا سوے دشت   چند زن بیروں شدند از مہتراں
چوں بہ صحرا ساعتے ماندند دیر   چند خر دیدند در صحرا ابہ سراں
نر خرے برماده، خر رغبت نمود   بر مثال عاشقاں با دلبراں
با عمودے یک گز و نیم آبنوس   گادنی میکرد بر رسم خراں
گہ فرو شے بر زگہ بر مے کشید   تیز مے افگند و میکرد عاں وعاں

زاں زناں یکے زاں گادراں بدید برکشید آہے وگفت اے خواہراں
گر جماع نیست کیں خرے کند برکسِ ما مے ریند ایں شوہراں

حکیم شفائی بھی اپنے زمانے کے مشہور ہزال گزرے ہیں ایک رباعی کہتے ہیں -

خلاب مرا بہ فتہ نتوانی برد گر سام نریمانی وگر رستم گرد
یا قیمت آنچہ خوردہ باید داد یا در عوضش آنچہ ریدہ باید خورد

عدی کہتے ہیں -

زر بہ امرد کسے دہد بہ گزاف کہ نداند شریعت زردشت
ہر کجا سرو قامتے بینی چشم در روے کن و خیو در مشت
چوں نہ کونش دری و نے شلوار بے گناہت کسے نخواہد کشت

اُردو میں بھی اس قسم کے بہت سے کہنے والے موجود ہیں۔ جن کے کلام میں ہزالی اور ہزالی کے ساتھ فواحش بھی
بودہیں۔ اور جن کے پڑھنے سے ایک خاص قسم کا تکدر اور تنفر پیدا ہوتا ہے۔
پھکڑ بھی قریب قریب ہزل کے مشابہ ہے۔ جو بالکل بازاری چیز ہے۔ اور جس میں گالی گلوچ کی نوبت آتی ہے
ہاتھا پائی کی بھی۔ عام طور پر شہدے۔ اور بازاری لوگ اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات مہذب لوگوں کے
ں جلسوں میں بھی پھکڑ بکا جاتا ہے۔ نظم میں پھکڑ کا وجود زیادہ نہیں ہے۔ مگر صاحبقراں۔ جانصاحب۔ انشا وغیرہ کے
ں اس قسم کے شعر بھی پائے جاتے ہیں۔
ضلع جگت۔ نام ہے۔ صنعت مراعات النظیر اور تناسب الفاظ کا۔ اس میں ظرافت صرف اتنی ہے۔ کہ سامع اور قائل
فاظ سوال وجواب میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مناسب اور موزوں ہوتے ہیں۔ گو اکثر حیا سوز اور
ش بھی ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو کسی وقت مبحث خاص قرار پا جائے۔ ضلع قرار دی جاتی ہے۔ اور جگت نام ہے۔ صرف
ک چیز کے دوسرے سے متعلق ہونے اور ایک سے تک لگانے کا۔ پس جب یہ دونوں چیزیں مکمل ہو کر گفتگو کی صورت
تیار کر لیں گی اسی کو عرف میں ضلع جگت سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ گفتگو اکثر بازاریوں میں ہوتی ہے مگر کبھی کبھی
اص بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی کا نام تناسب الفاظ رکھ لیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ظرافت اس میں کچھ
ھی نہیں۔ بلکہ سامع کو ایک لطف اور انبساطی کیفیت اس کے سننے سے البتہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ صرف طرفین کی

اضر جوابی کے نتیجہ پر مبنی ہوتی ہے۔

قرہ چست کرنا یا آوازہ کسنا فقرہ نام ہے اوس بات کا جس سے فریب دینا مقصود ہو۔ فقرہ بنانا۔ فریب دہ
قرہ چلنا۔ فریب کی بات کا گر ہونا۔ فقرہ کرنا۔ کوئی بات فریب کی لیکر کسی کو فریب میں مبتلا کرنا۔ مگر فقرہ چست کرنا۔ اکثر آوازہ
سنے کے معنی پر بھی مستعمل ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کی طنز آمیز ظرافت ہوتی ہے۔ جیسے ایک شخص مریل اور دبلے گھوڑے پر
وار جارہا ہے۔ گھوڑا اپنی نقاہت اور ضعف کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے۔ دیکھنے والے سوار اور گھوڑے پر
آوازے کستے ہیں۔

ب کہتا ہے۔ خر عیسے نے دوسرا جنم لیا ہے۔
سرا کہتا ہے۔ بھئی واہ رے کمہار کیا گھوڑا بنا دیا ہے۔ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔
سرا کہتا ہے۔ حضرت پیٹے لگوائیے پہلے

مثلاً ایک بہت لمبا آدمی ایک انار والے کی دکان پر پہونچا۔ جو بیٹھا ہوا ٹوکرے میں انار رکھے آواز لگا رہا تھا۔ یہ صاحب
ہاں پہونچ پہلے کھڑے ہوئے کچھ سوچتے اور دیکھتے رہے۔ پھر انار والے سے کہا کہ تمھارے انار بہت چھوٹے ہیں۔
ار والے نے جواب دیا۔ حضرت بیٹھ کر دیکھئے۔ یہ گویا اس کی درازی قد پر ایک تعریض تھی۔

پھبتی یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے جس میں قائل مشبہ کے لئے ایسا مشبہ بہ تجویز کرتا ہے۔ جو درجہ میں مشبہ سے بہت
بہت زیادہ بدنما۔ بہت زیادہ بھونڈا ہوتا ہے۔ اور یا مشبہ بہ اسقدر بلند اور ذی رتبہ ہوتا ہے۔ جس کا مشبہ سے کوئی
قابل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں سامع کی ہنسی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے یا تو وہ اس پست چیز کے جس کو مشبہ بہ ٹھہرایا گیا
ہے۔ نظر میں پھر جانے سے ہنستا ہے۔ یا اس بلند رتبہ کے مقابل ایسی بدتر چیز کو دیکھ کر ہنستا ہے پھبتی کبھی وضع قطع اور
ال پر کہی جاتی ہے۔ اور کبھی ذات پر۔ کبھی ایک خاص جز پر۔ کبھی ایک جزو مشترک و متصل بالذات پر۔ اور کبھی
منفصل من الذات پر۔ کبھی ایک صفت پر۔ کبھی ذی روح پر۔ کبھی غیر ذی روح پر۔ اسی طرح مشبہ بہ کے ذوی الارواح
ذوی العقول یا ہم جنس یا غیر جنس ہونے کی کوئی قید نہیں ہے۔

پھبتی ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ اہل عرب میں اکثر یہی پھبتی ناموں اور کنیتوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔
انھوں نے اس کو زیادہ تر تشبیہ کی حدود میں رکھا ہے۔ اور مدح و ذم میں برابر برتا ہے۔ اس کی پروا نہیں کی کہ
مشبہ بہ مشبہ سے زیادہ تر پست یا زیادہ تر بلند ہو۔ بلکہ زیادہ تر اون کی پھبتیوں میں یا کسی حالت خاص کی تشبیہ ہے۔
رشبیہ پہلو ہے۔ پھر بھی مشبہ اور مشبہ بہ کے غیر متناسب ہونے کی وجہ سے نقاد نظریں اون کو پھبتیوں ہی حدود میں
ستی ہیں۔

اسی طرح زبان فارسی میں بھی پھبتی کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے۔ مگر اون کے یہاں بالکل وہی طریقہ ہے جو

ہندوستان میں ہے۔ چنانچہ ایک شاعر پر جس کا تخلص تنگی تھا، حکیم ابوالفتح نے پھبتی کہی (تنگی مادر زاد)
محمد رضائے کاشی کی عادت تھی کہ جب کوئی بات کہتا تو نہایت قرأت کے ساتھ کہتا تھا۔ اوس پر لوگوں نے پھبتی کہی (قاری روزمرّہ)
زبان اُردو میں بھی پھبتیوں کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ مندرجہ بالا نمونوں کی پھبتیاں دیکھنے کے بعد یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ یہ چیز ہندوستان کی پیداوار ہے۔ بلکہ اس کو بھی اتباع ہی کہا جائے گا۔
فضل علی دانا جو میر کے ایک معاصر شاعر تھے۔ ایک مرتبہ میر صاحب کی محفل مشاعرہ میں جو ہر مہینہ کی پندرہ تاریخ کو دلّی میں منعقد ہوتی تھی، آئے۔ دانا کی قطع یہ تھی کہ نہایت سیاہ فام تھے۔ اور داڑھی بھی جو معمول سے زیادہ بڑھی ہوئی پیٹ پر پڑی تھی۔ بہت سیاہ تھی۔ اوس روز اتفاق سے کرتہ بھی سیاہ پہنے ہوے تھے۔ سودا نے جو شاعر میں موجود تھے یہ قطع دیکھ کر پھبتی کہی۔ کہ ہولی کا ریچھ آیا۔
محمد امان اللہ غریب میر تقی کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ذرا ہکلا کر بولتے تھے۔ اسی سبب سے کبھی کبھی الکن بھی تخلص کرتے تھے۔ جی بہلانے کے لئے اکثر مغل پورہ کے باغوں کی طرف چلے جاتے تھے۔ اور دن دن بھر وہیں گزار دیتے تھے۔ میر صاحب نے اون پر پھبتی کہی۔ ارنڈ باغاتی۔
میر تقی میر نے جب تذکرہ نکات الشعرا لکھا تو ایک شاعر محمد یار متخلص بہ خاکسار نے بھی ان کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا۔ جس کا نام اپنے دوست محمد معشوق کنبوہ کے نام پر تذکرۂ معشوق رکھا۔ محمد معشوق کی عمر اس وقت چالیس برس کی تھی۔ میر صاحب نے ان پر پھبتی کہی معشوق چہل سالہ
محمد یار خاکسار کا عرف کلو تھا۔ محمد معشوق نے پھبتی کہکر ایک مصرع موزوں کیا۔ اور خاکسار کو سنایا۔ ع

کتا ہے دریار کا کلو اس کا نام

اشرف علی خاں فغاں نے ناگر مل پر جو احمد شاہ کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ اور دُہرے بدن کا موٹا تازہ آدمی تھا۔ یہ پھبتی کہی (ٹکیمی کی منڈی کا سانڈ)
ایسے ہی حکیم معصوم گجراتی پر (جو گجرات کے رہنے والے سیدھے سادے بھولے آدمی تھے) (گاؤ گجراتی کی پھبتی کہی۔
شیخ شرف الدین مضمون کے دانت گر گئے تھے۔ اور پوپلا منہ کچھ عجب طرح کا معلوم ہوتا تھا۔ ویسے سرخ سفید آدمی تھے۔ ایک دن ان کو دیکھ کر ان کے استاد خان آرزو نے شاعر بیدانہ کی پھبتی کہی۔
شیخ ناسخ ایک پہلوان اور اکال شاعر تھے۔ فربہ جسم طویل القامۃ۔ تہمد باندھے ہوے سر گھٹا ہوا۔ لوگوں نے ان کو دیکھ کر دم کٹے بھینسے کی پھبتی کہی۔

ایک پستہ قد شاعر پر مرزا فخر اللہ بیگ صاحب صابر نے پھبتی کہی۔ چندیا بلطخ

ایک نہایت مشہور و معروف شاعر جو اب بوجہ طویل العمر ہونے کے سفید ہو گئے ہیں۔ داڑھی لمبی بھی ہے یہ ی ہے۔ اُس پر طُرّہ یہ کہ ضعف کی وجہ سے کہیں آنا جانا دشوار ہو گیا ہے۔ بالکل گوشہ نشین اور عزلت گزیں ہیں۔ لوگوں نے اُن پر پٹاری کے انگور کی پھبتی کہی۔

ایک کریہہ المنظر سیہ فام شاعر اپنے ایک دوست کے بچے کو کھلا رہے تھے۔ خود لیٹے ہوئے تھے۔ اور بچہ کو اتی پر بٹھا رکھا تھا۔ ان کے دوست نے دیکھا تو پھبتی کہی۔ آپ کے نوروز سُور پر سوار ہے۔

پھبتی بہترین وہ ہے جس میں کنایہ کے ساتھ کوئی بات کہی جائے۔ جیسا کہ ایک کا ... بدرو بدقطع شخص سنا رہے تھے۔ لوگوں نے کچھ چھیڑنا چاہا تو ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت نہ بولنا۔ کاٹ لے گا۔ غصہ ا اپنی دُم چبا رہا ہے۔

پھبتی کا وجود جس طرح فارسی نظم میں پایا جاتا ہے اسی طرح اُردو میں بھی ہے۔ چنانچہ خدمتگار خاں ایک خوجہ پر وہ نے مستثنےٰ منقطع کی پھبتی کہی۔

یار و خدمتگار خاں خوجوں کے بیچ — ہے تو مستثنےٰ ولیکن منقطع

رتقی میر شیخ چلہ نشین پر پھبتی کہتے ہیں۔

تو بہ زاہد کی توبہ تلی ہے — چلے بیٹھے تو شیخ چلی ہے

امام بخش ناسخ ایک زاہد کے سر اور عمامہ پر پھبتی کہتے ہیں۔

دیکھنا ناسخ سر شیخ معمم کی طرف — کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

نسیم ایک دیوانی کے ہر عضو پر پھبتی کہتے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

زنبور سیاہ خال اُس کے — برگد کی جٹائیں بال اُس کے

ایسی ہی جگہ اور کہتے ہیں۔

دانت اُسکے تھے گورکن قضا کے — دو تختے رہ عدم کے نالے

وس ایک ظریف شاعر اپنے معشوق کی مانگ پر پھبتی کہتے ہیں۔

یہ اُن کی مانگ پہ پھبتی کہی ہے یاروں نے — کہ کالے سانپوں میں ہنسا سا کھنکھجورا ہے

ی طرح مسّی لگے ہوئے دانتوں پر ایک عجیب انداز سے پھبتی کہتے ہیں۔

ان نازک نازک دانتوں پر کیوں یار مسی کا ڈالا ہے — میں خوب سمجھتا ہوں اسکو کچھ دال میں کالا کالا ہے

غرضکہ پھبتی کو صرف تشبیہ سے علاقہ نہیں۔ بلکہ پھبتی وہ ہے جو تشبیہ سے گزر کر استعارے کی صورت اختیار کر لے

اور اس میں بہتر قسم کی وہ پھبتی ہے جس میں صرف استعارہ رہ جائے اور مستعار لہ اور مستعار منہ کا ذکر ہی نہ رہے۔

ہجو وہ گفتگو ہے جس میں طنز، طعنہ۔ ملامت، غصہ۔ رمز و کنایہ۔ استہزا۔ پھبتی وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس گفتگو سے ہمیشہ اپنے مخالف کی دل آزاری مقصود ہوتی ہے۔ اس کو ظرافت سے اسی واسطے تعلق ہوتا ہے کہ اس میں رمز و کنایہ۔ استہزا۔ پھبتی فقروں۔ تمسخر۔ وغیرہ کا بھی شمول ہوتا ہے۔ جیساکہ انوری ایک طویل القامت آدمی کی ہجو کرتا ہے۔

اے خواجہ درازیت رسیدہ است بجائے کز اہل سماوات بگوشت برسد صوت
گر عمر تو چوں قد تو بودے بدرازی تو زندہ بماندے دگر مرد ملک الموت

وہ شخص جس کی ہجو کی گئی ہے۔ اس کو سنکر یقیناً برہم اور متالم ہوگا۔ مگر ایک غیر متعلق شخص کے لئے یہ خالص ظرافت ہوگی۔ اور وہ اس سے بوجہ احسن لطف اندوز ہوسکے گا۔ اور درازی پر وہ طعن آمیز تمسخر جو اس میں موجود ہے۔ اوس کے لئے ایک سامان تفریح ہوگا۔

سعدی ایک داڑھی منڈانے والے نوجوان کی ہجو اس طرح کرتے ہیں۔ اور ہجو میں ایک طنز و طعن شامل کرتے ہیں۔

گر دست بجان داشتے ہمچو تو بہ ریش نگزاشتے تا بہ قیامت کہ برآید

یعنی جس طرح تو داڑھی پر ہاتھ رکھتا ہے اس طرح اگر میں جان پر ہاتھ رکھتا تو قیامت تک اُس کو اپنے جسم سے نہ نکلنے دیتا
میر تقی میر اوباش اور بازاری لڑکوں کی ہجو کرتے ہیں۔

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل و خواب

تشبیہ شامل کرکے اس میں ایک ظرافت پیدا کردی گئی ہے۔

میر صاحب ایک پُرخور شخص کی ہجو کرتے ہیں۔

صد منی دیگ ہے شکم اوس کا نفس اژدہا ہے دم اُس کا

اس ہجو میں پیٹ پر صد منی دیگ۔ اور دم پر نفس اژدھا کی پھبتی کہکر ظرافت پیدا کی گئی ہے۔

سودا اپنے حریف ظریف میر ضاحک کی ہجو اس طرح کرتے ہیں۔

ریم سو ناک بد رہے تو شریر ریم بادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

اس ہجو میں ریم کو اُلٹ کر میر کہا۔ اور اُسی سے ہجو کے ساتھ ظرافت پیدا ہوگئی۔ اسی طرح میر ضاحک کی ایک دوسری ہجو میں صرف تمسخر کے ساتھ ظرافت پیدا کی ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا یوں جو رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھے بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا تب شیخ سدّو اُس پر غصہ کو کھا کے آیا

بولا کہ کیوں بے رضا کٹ بکرا کوئی منگایا

یہ ہجو کا ایک بند ہے جو نمونتاً لکھا گیا ہے۔ ورنہ اول سے لے کر آخر تک اس میں وہی تمسخر اور ہجو کی شان ہے اور اسی سے ظریفانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ایک شخص نے مسجد کا بیعنامہ کر دیا۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اوس کے حق میں فرماتے ہیں۔

کیا کہتے ہیں اس میں مفتیان اسلام　　جب بیع مساجد سے نہیں چلتا کام
تو وجہ کفاف کے لئے مومن کو　　جائز بھی ہے یا نہیں خدا کا نیلام

اس ہجو میں طنز بطریق رمز و کنایہ شامل کر کے اور استفہام کے طریق پر استفتا کر کے ظرافت پیدا کی گئی ہے۔ اسی طرح رمز و کنایہ شامل کر کے مولانا حالی مولویان زمانہ حال کی خبر لیتے ہیں۔

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں　　سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرتد میں سوال　　تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

غرض کہ ہجو میں بھی وہ تمام چیزیں شامل کی جاتی ہیں جنھیں اجزائے ظرافت میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ظرافت کا جب ذکر کیا جائے گا۔ ہجو بھی اوس کے اقسام میں سے شمار کی جائے گی۔ اگرچہ اوس کا مقصد ظرافت سے جدا اور اس کا مفہوم مذاق سے علیحدہ ہے۔

ریختی شعر کی ایک قسم ہے۔ جس میں عورتوں کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اور انھیں کے رسوم۔ محاورات ضرب الامثال لکھے جاتے ہیں۔ دراصل ریختی غزل ہی کی بگڑی ہوئی ایک صورت ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب زمانہ اپنی رنگینیوں اور عیاشیوں میں شرابور ہو رہا تھا۔ تفنن طبع کے طریق پر لوگوں نے اُس عہد کی رسم کو تازہ کرنا چاہا۔ جب ہندوستان کی بھاشا شاعری میں عورت کی طرف سے اظہار رغبت کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی شاعری کی مثال زمانہ اوائل شعر اردو میں ملتی ضرور ہے۔ مگر شاذ و نادر ولی اور رحمان کا معاصر ایک شاعر دکھنی رحیم کہتا ہے۔

اری نادان تین اپنے سجن کو کیوں رُٹھایا ہے　　رُٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے
بہت پچھتائیگی میری نصیحت مان کہتی ہوں　　سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ یہ صنف شاعری امیر خسرو کے وقت سے رائج ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ اس کا عروج رنگین اور انشا کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے اس صنف کو نہ صرف تازہ کیا۔ بلکہ لطف بڑھانے کے لئے اون کے محاورات اور روزمرّہ کا اس میں اضافہ کیا۔ پھر لقدر ضرورت اس میں ہزالی اور فواحشات کو دخل دیا۔

لطیفہ نام ہے اُس ظرافت کا جس میں کسی چھوٹے سے واقعے کو ظرافت کی چاشنی دیکر اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اس میں کوئی خاص چیز ایسی نہیں ہوتی جسے لطیفے کے مخصوصات میں شمار کیا جائے۔ البتہ حسن بیان اور طرز

ادا کی قید بہت ضروری ہے - اس کے بغیر لطیفہ معمولی گفتگو سے آگے نہیں بڑھ سکتا -

اِس میں بھی دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں - ایک کسی واقعہ کا بذاتہ اتنا دلچسپ ہونا - جس میں حسن پیدا ہو جائے - دوسرے کسی واقعہ میں انداز بیان سے کوئی خاص ندرت پیدا کر دینا - چنانچہ ذیل میں اس قسم کے کچھ لطایف درج کئے جاتے ہیں -

حکیم سولن کا ایک لڑکا مر گیا - اور وہ اُس کے غم میں رو دیا - لوگوں نے کہا کہ رونے سے کیا فائدہ - حکیم نے جواب دیا - کہ بس اسی لئے میں روتا ہوں کہ رونا بیکار ہو گیا -

سعدی ایک مکان کی خرید و فروخت میں مشغول تھے - وہاں ایک یہودی رہتا تھا - اُس نے شیخ کو ترغیب دی کہ خرید لیجئے میں اس کا ہمسایہ ہوں اس مکان میں کوئی عیب نہیں ہے - سعدی نے جواب دیا - بس یہی عیب ہے کہ آپ یہاں رہتے ہیں -

سقراط کی بیوی بہت بد خو تھی ایک مرتبہ لڑ کر پانی کی بھری ہوئی پتیلی چیخ کر پھینک دی - سقراط بولا کہ پہلے گرجا اور پھر برسا -

ایک یونانی پہلوانی کرتا تھا - لیکن کشتی کے موقع پر ہمیشہ پچھاڑا جاتا تھا - آخر کار اُس نے پہلوانی چھوڑ کر طبابت سیکھنی شروع کی - سقراط نے اوس کو اس فن میں مصروف دیکھ کر کہا کہ اب تم لوگوں کو پچھاڑا کرو گے -

سقراط کی بیوی اُس وقت بہت رو رہی تھی - جب سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا تھا - سقراط نے پوچھا کہ تو کیوں روتی ہے - کہا اس لئے کہ تو بے گناہ مارا جاتا ہے - سقراط نے کہا - اری کمبخت کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں کسی گناہ پر مارا جاؤں -

یہ لطایف جو لکھے گئے ہیں - ان میں وہ ظرافت ہے جو صرف مشاق اور ظرافت آگاہ لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہے　عوام کے لطایف قصداً نظر انداز کئے جاتے ہیں - کیونکہ اِن میں ظرافت بالقصد اکثر نہیں پائی جاتی - دوسرے اس قسم کے لطائف اسقدر مشہور ہیں، یہاں اون کا لکھنا بیکار ہے -

کہیں نہ لطیفہ ہوتا ہے - نہ ہزل - نہ پھبتی - نہ پھکڑ بلکہ ظرافت کا دار و مدار دوسری چیزوں پر رکھا جاتا ہے - کہیں اپنی اصلی وضع یا اپنی اصلی گفتگو کو چھوڑ کر کسی دوسرے فرقہ کی گفتگو اختیار کی جاتی ہے - کہیں بالکل بیمعنی بات کہی جاتی ہے - اور اس کو سنکر سننے والے کو ہنسی آتی ہے - کہیں ایک زبان میں دوسری زبانوں کی آمیزش کر کے اور گفتگو کو معجون مرکب بنا کر ظرافت پیدا کی جاتی ہے - کہیں واقعات مضحک کا بطریق تلمیح ذکر کیا جاتا ہے - کہیں کسی شعر کی غیر موزونی ہی ظرافت اور ہنسی کا سبب ہوتی ہے -

ان سب باتوں کے بعد یہ نتیجہ بہ آسانی نکل آتا ہے کہ انسان کی ہنسی کا فلسفہ یہ ہے - کہ اُس کے سامنے

کوئی ایسی بات کہی جائے جو معمول سے ہٹی ہوئی ہو - یا ایسا کام کیا جائے جو مروج نہو - یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایک کمزور مریض کو چلتے اور ڈگمگا کر گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی نہیں آتی - بلکہ اُس کی بجائے افسوس ہوتا ہے - اور جب ایک جوان - طاقت ور کو کہیں پھسلتے گرتے دیکھتے ہیں تو ہنسی آجاتی ہے - یہ ممکن ہے کہ کسی غیر متوقع اور غیر معمولی بات سے ہنسی نہ آئے - مگر یہ مسلم ہے کہ ہنسی جب آئیگی وہ غیر معمولی بات یا غیر متوقع واقعہ ہی سے آئیگی -

اسی سلسلہ میں جب ہم مرزا غالب کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لئے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں - نہ لطایف پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں - نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں - خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لاتے ہیں - واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں - مگر اُن کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اوسی سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے - وہ روا روی میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں - مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے -

کسقدر حیرت خیز - اور کتنا تعجب انگیز ہے یہ امر - کہ وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں - اور اتنا ناراض ہوتے ہیں - کہ خود ان کے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں کانپتے نظر آتے ہیں - چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار ہیں - ماتھے پر شکنیں ہو لی ہیں - غصہ سے ہونٹ ہل رہے ہیں - زیر لب کچھ کہتے جاتے ہیں - مگر سننے والا سمجھتا ہے - کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے - اور دل میں انبساط پیدا ہو رہا ہے - اور ظرافت اگر صرف ظرافت ہو تو خیر کوئی بڑی بات نہیں - مگر اُن کے یہاں تو اوسی میں اخلاق ہے - اوسی میں رنج و ملال کا اظہار ہے - اوسی میں اون کی عادات فطری کے آثار ہیں - اسی میں جذبات مسرت ہیں - اوسی میں درد کا بیان ہے - اوسی میں تاریخی واقعات ہیں - اوسی میں شہر دہلی کے حالات ہیں - اوسی میں تعلیم ہے - اوسی میں تلقین ہے - اوسی میں شفقت بزرگانہ کا لحاظ ہے - اوسی میں امر دوستانہ کا ظہور ہے - وہیں فخر و مباہات کے دریا بہہ رہے ہیں - اور وہیں سر عجز و نیاز جھک رہا ہے - غرض کہ ان کے چند فقرے نہ صرف تفنن کا کام دیتے ہیں - بلکہ ایک وسیع فضا پیش کر دیتے جہاں لطف و تفریح کے ساتھ عبرت و بصیرت بھی سامنے آجاتی ہے - اور لوگ بھی جیسا کہ بیان ہو چکا - اس رنگ کے لکھنے والے ہیں مگر وہ ظرافت حقیقی جس سے روح کو لطف حاصل ہو - وہ صرف مرزا کا حصہ ہے - عالمگیر کی تحریر میں بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ ظرافت کا عنصر غالب ہے - مگر ان کی ظرافت میں ایک جاہ و جلال - اور ایک نوع کا غصہ بھی شامل ہے - مثلاً وہ محمد معظم شاہ کو لکھتے ہیں -

"اعلیحضرت فردوس منزلت بہ گرفتن ولایت بلخ و بدخشاں و خراسان و ہرات ملک قدیم موروثی توجہ مفرط داشتند و مکرر افواج بادشاہی بسرکردگی مراد بخش بآن سو فرستادہ شد چنانچہ اکثر آن ولایت فتح ہم شد لیکن بہ سبب کم حوصلگی آں نامراد کہ بے طلب حضور برخاستہ آمد و اصلا بہ اہالی و اکابر آں دیار پرداخت ملک مقبوضہ و مفتوحہ از دست رفت و محنت و زر ضائع گشت از ینجاست

کہ گفتہ اند از پسر نا خلف دختر بہتر۔ نظر باین توجیہ کہ ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ این فانی را آرزو باقی است و تدبیرش جز اینکہ نبیرہ آنحضرت را با فوجی شایستہ و سامان بایستہ بآں ہمت بفرستیم دیگر از ما چہ می آید۔ باوجود تاکیدات حضور شما قتے صادر از گرفتہ آید۔ تا باں مہم چہ رسد۔ ظاہرا کار ما از شما نیست۔ عارف بہ خود یُر عارف است۔ این نمود بے بود خود آفتاب سر کوہ است بدست آمدہ دنیا مدچہ شما فکر خود کنید کہ در ینجا بہم چشماں چہ ردخواہید نمود۔ و در انجا بحضرت حق سبحانہ تعالےٰ و حضرت اعلیٰ،،

ضائع گشت تک مندرجہ بالا عبارت میں بہت خشکی ہے۔ از ینجاست سے عبارت میں رنگینی شروع ہوئی ہے۔ نظر باین توجیہ سے عبارت میں ایک تفنن کے ساتھ ظرافت کا بہت ہلکا رنگ شروع ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر حسن تنبیہ۔ ظریفانہ انداز میں ہے۔ مگر ہر فقرہ سے غصہ۔ طنز۔ طعن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نبیرۂ آنحضرت۔ دیگر از ما چہ می آید۔ تا باں مہم چہ رسد۔ ظاہرا کار ما از شما نیست۔ عارف بہ خود یُر عارف است۔ شما فکر خود الخ یہ سب فقرے تفنن عبارت کے ساتھ بہت ہلکی ظرافت اپنے ذیل میں لئے ہوئے ہیں۔ مگر کمی اتنی ہے۔ کہ رنگ طنز غالب ہے اور ظرافت مغلوب۔

حکیم سوزنی۔ انوری۔ جعفر زٹلی وغیرہ پھکڑ تک پہونچ کر رہ گئے اس کے سوا اور کچھ اُن کے یہاں نہیں ملتا۔ البتہ سعدی کے ظریفانہ رنگ میں ہر جگہ ظرافت محض کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اور بہار کا کام دیتا ہے

اردو میں بھی بہت سے ظریف ہیں۔ مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم کو ایک خاص ملکہ ہے مگر دو باتیں ہیں ایک تو صرف نظم پر ان کی ظرافت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے اون کے کلام میں کوئی خاص ظرافت نہیں بلکہ اوس کا انحصار محض ایک خاص فرقہ کا خاکہ اُڑانے اور ہر ایک خاص جماعت کی ہجو ملیح کرنے پر ہے۔ جس سے ایک تصویر دیکھنے والے کی نظر میں پھر جاتی ہے اور اُسی پر تمام لطف کا انحصار ہوتا ہے

برعکس اس کے مرزا نظم اور نثر دونوں میں ظرافت کے بادشاہ ہیں۔ اون کا کوئی خط ایسا نہ ملے گا۔ جس میں ظرافت نہو۔ مگر نہ اورنگ زیب کی طرح وہ یبوست کو مزاحی رنگ پر غلبہ دیتے ہیں۔ اور نہ نعمت خاں عالی کی طرح الفاظ کے گورکھ دھندے کو ہر جگہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ انوری۔ سوزنی۔ جعفر زٹلی کی طرح فواحش پر اُتر آتے ہیں۔ نہ اکبر کی طرح کسی خاص طبقہ اور فرقہ کی طرف سے اظہار تنفر کرتے ہیں۔ اور ان سب عیوب ظرافت سے بچے رہنے کی خاص وجہیں ہیں۔ یبوست سے بچنے کا سبب یہ ہے کہ وہ دراصل فطری ظریف ہیں۔ شاد و خرم ہشاش بشاش دل اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔ تصنع اور آورد کا اُن کے یہاں نام بھی نہیں۔ جو لب پر ہے وہ دل میں بھی ہے۔ جو دل میں ہے وہ لب پر بھی ہے۔ برعکس اس کے عالمگیر کے مزاج میں خشکی بھی ہے۔ ظرافت بھی ہے۔ شاہی تمکنت بھی ہے۔ ہر جگہ شان ملوکیت کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ تقوی و طہارت بھی دامنگیر رہتی ہے خلقی زندہ دلی بھی ان سب میں تھوڑی بہت شامل ہو جاتی ہے۔

نعمت خاں عالی کی طرح الفاظ کے پھیر میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ مراعات النظیر۔ یا رعایت الفاظ سے اُنھیں

بیر ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت صاف کہتے ہیں۔ مُراسلت یا مکاتبت کو جب تک کہ مکالمہ نہیں بنا دیتے انہیں چین ہی نہیں آتا۔ چنانچہ مفتخرانہ انداز سے جا بجا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

انوری سوزنی کی طرح پھکڑ نہیں بکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اون کی سوسائٹی بہت بلند ہے۔ سوائے ایک دو جگہوں کے اون کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی کے مرتبہ سے کم ہو۔ عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت رہی عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اعلےٰ تعلیم حاصل کی۔ ذوق سلیم۔ اور صحیح مذاق لائے پھر اُن کو ان باتوں سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

اُن کے رُقعات کو دیکھنے اور ان کے مکتوب الیہم کو جانچئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ وہ کس قدر مزاج داں۔ اور نبض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں۔ غیظ و غضب کی حالت ہو۔ کیف و سرور ہو۔ مزاح کا غلبہ ہو۔ غم ہو۔ رنج ہو۔ خوشی ہو۔ مصیبت ہو۔ غرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے قلم سے کوئی لفظ مکتوب الیہ کی شان کے خلاف نکل جائے۔ اور وہ ایک انچ دائرہ مزاج شناسی سے ہٹ جائیں صرف یہی نہیں کہ مزاج کو ملحوظ رکھیں۔ صرف یہی نہیں کہ کوئی لفظ زائد یا خلاف محل استعمال نہ ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ مکتوب الیہم کی شان مزاج اور افتاد طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے اور اپنا رنگ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے۔ اب ہم غالب کی شوخی و شوخ نگاری کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرتی زندگی میں

منشی ہرگوپال تفتہ مرزا کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ مرزا کو انسے کمال درجہ انس تھا۔ اور وہ بھی ان کے سچے جان نثار تھے۔ اگر خط بھیجنے میں کبھی دیر ہوتی تو مرزا کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اور منتظر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ یہی اتفاق پیش آیا مرزا نے لکھا کہ

”بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو“

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں مرزا کے محبوب دوست تھے۔ اون کے خط میں دیر ہوئی تو خط تمام کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”نجات کا طالب ہے اور تم سے اس رقعہ کے جواب کا طالب غالب“

حکیم ظہیر الدین احمد خاں غلام نجف خاں کے بیٹے تھے۔ مرزا ان سے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مرزا رام پور گئے تو شاید گھر کا کوئی خط اور مختار کی کوئی چٹھی نہ پہونچی۔ تو ظہیر الدین احمد خاں سے ان الفاظ

ساتھ گھر کا حال پوچھا۔

"کدارناتھ ڈیوڑھی پر آکر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو دیر نہ کیجیو۔ خط کے جواب کا طالب فقیر غالب"

آخر عمر میں مرزا علایق دنیوی سے ایسے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ کہ متانت اور ظرافت کا اظہار اسی انداز سے کرتے تھے۔ چنانچہ علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"تمھارے والد ماجد سے۔ اور تمھارے جد ماجد۔ اور تمھارے عم عالیمقدار سے کہہ چکا ہوں خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ یہ تمھارے ہیں۔ مجھ سے لیلو۔ کہ میں اب اس بوجھ کا تحمل نہیں ہو سکتا میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل گیا۔ تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی چاہا وہاں رہگیا جہاں سے دل اکھڑا چل دیا"

مرزا علاء الدین خاں کے دلی آنے کی خبر سنی تو خود انھیں کو لکھتے ہیں۔

"یہاں اختلاف طبایع کا وہ حال کہ آغاز مخدوش۔ انجام مغشوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ۔ شرط جزا سے محروم۔ سنا اور متواتر سنا کہ قصہ طے ہو گیا۔ اب علاء الدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتایج کے دیکھوں گا"

کسی بات کے پوچھنے میں بھی مرزا کا ایک جداگانہ انداز ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے ایک مرتبہ کوئی بات لکھی اور ساتھ ہی عدم یقین کی وجہ سے یہ بھی لکھدیا کہ۔ راست و دروغ بہ گردن راوی مرزا کو اس بات سے کوئی تعلق تھا۔ تفتہ سے تفصیل چاہی تو وہی تفتہ کا فقرہ لکھکر عبارت میں تفنن اور ظرافت کا رنگ پیدا کر دیا۔ لکھتے ہیں کہ

"میاں وہ راست دروغ بہ گردن راوی نے مجکو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے۔ وہ مجھکو ضرور لکھو"

میر مہدی مجروح مرزا کے مایۂ ناز اور مشہور شاگرد ہیں۔ غدر کے آشوب ناک زمانے میں دہلی سے نکل کر پانی پت میں جا رہے تھے۔ مگر رسم مکاتبت و مراسلت دلی والوں اور خصوصاً مرزا سے برابر جاری تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مرزا کو لکھا تو مرزا صاحب نے جواب میں یہ اشتیاقیہ ظرافت آمیز فقرہ لکھا۔ جو القاب۔ ظرافت۔ تخاطب سب ہی بند ہے۔

"کیوں یار کیا کہتے ہو۔ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں۔ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا۔"

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ یہ کہتا ہوں کہ عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو،،

غلام نجف خاں نے آنے کے لئے لکھا تو ان کو اشتیاقیہ خط لکھتے ہیں۔

"کہو اب خیر سے کب آؤ گے۔ کئے برس کئے مہینے۔ کے دن راہ دکھاؤ گے،،

نہ کوئی تشبیہ نہ پھبتی ہے۔ نہ پھکڑ ہے۔ صرف انداز بیان نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

نواب سعد الدین خاں شفق رئیس کالپی مرزا کے غائبانہ دوست تھے۔ ایک مرتبہ ان کا خط آیا۔ تو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا"

علاء الدین احمد خاں بہت دنوں سے آنا آنا کر رہے تھے روز لکھتے تھے کہ اب آتا ہوں اور اب آتا ہوں۔ مگر یہ وعدے سب نقش آب ہوتے تھے۔ آج آتے تھے نہ کل ایک مرتبہ لکھا کہ عید کے مہینے میں آؤں گا تو مرزا نے جواب میں لکھا کہ

"رجب بیگ۔ شعبان بیگ۔ رمضان بیگ۔ یہ نامور مہینے ہیں سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس جب عید ہے۔ اور روز سعید ہے تو کیا بعید ہے۔ کہ بخلاف شہور ثلثہ ماضیہ اس مہینہ میں تم آسکو۔ ہے ہے میں تو کہتا ہوں نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا ہنگامہ گرم ہو کر پارسیوں کی کوسہ برنشین کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی دو لنڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خر سوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلی حسن اتفاق یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا مزہ لایا ہے۔ پھر میں چند روز اور ستم کش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منائے۔ اور خر سوار کو بضرب تازیانہ دوڑائے۔ علاء الدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں تو مولوی ہے۔ ارے ظالم اس کوسہ برنشین کی داد دے۔ عقل کرامت ہے۔ الہام ہے۔ لطف طبع ہے۔ کیا ہے۔ یہ اسم کسقدر مناسب مقام ہے"

غدر کا ہنگامہ برپا ہے - گلی گلی کوچہ کوچہ میں گیر و دار کی صدائیں بلند ہیں نفسی نفسی کا عالم ہے - ایک کو دوسرے کی خبر نہیں - ہر کوئی اپنی بلا میں گرفتار ہے - مجرموں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں - مرزا بھی حال اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اور تفتہ سے کہتے ہیں

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دُکھ مجھکو ہے اُس کا بیان تو معلوم مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں - انگریز کی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے - اوس میں کوئی میرا امید گاہ تھا - اور کوئی میرا شفیق - کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار کوئی میرا شاگرد - ہندوستانیوں میں کچھ عزیز - کچھ دوست - کچھ شاگرد کچھ معشوق - سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے - ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"

مندرجۂ بالا عبارت میں انتہائی افسوس کا اظہار ہے لیکن شوخی بیان بدستور قائم ہے -

ہنگامہ غدر کے بعد مرزا اس لئے معتوب ہوئے تھے کہ وہ بھی دلی کے آخری تاجدار کے مصاحب تھے - چونکہ اُس زمانہ میں ظفر کے کلام پر مرزا ہی اصلاح کرتے تھے - اِس لئے ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا - کہ تم نے بادشاہ کے لئے سکہ کہہ کر دیا - حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ سکہ ظفر کے پہلے اُستاد ذوق مرحوم نے کہا تھا - اور مطبع مولوی محمد باقر دہلوی میں دہلی اُردو اخبار میں چھپا تھا - مرزا کو یہ بات یاد تھی - اِنھوں نے اپنی بریت کے لئے ادھر اُدھر اپنے دوستوں کو خط لکھے کہ کہیں وہ اخبار مل جائے تو بھیجدو - چودھری عبدالغفور مارہروی کو بھی یہی لکھا تھا - اُنہوں نے بہت ڈھونڈا کہیں نہ ملا - اُنھوں نے مرزا کو لکھا کہ اخبار نہیں ملتا - اپنے جواب میں اُس افسوس کو ان الفاظ میں ظاہر کیا - ذرا دیکھئے کس قدر شگفتگی برستی ہے -

"آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دل نشین اور خاطر نشان ہے . . . . وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا نہ آئے گا -"

میر سرفراز حسین کو ایک خط لکھتے ہوئے گذشتہ صحبتوں کو یاد کرتے ہیں - اور اپنے احباب خاص کا نام گنا کر کہتے ہیں -

"مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا ہوں بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ کہتے ہیں - اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتمدار ہوں - میں مروں گا تو مجھکو کون روئیگا - سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو -"

میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں -

"خلاصہ میرے فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے سُنی الگ شیعہ الگ - نیک جُدا بد جُدا -"

سید احمد حسین مرودودی کو لکھتے ہیں -

"خداوند نعمت کیا تم دلی کو آباد - اور قلعہ کو معمور - اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو - جو حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا حال پوچھتے ہو - آں دفتر را گاؤ خورد - و گاو را قصاب برد - و قصاب در راہ مرد -"

مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں -

"ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے - یہ بھی انھیں میں ہے - کہ جنکا میں ماتمی ہوں - ہزارہا دوست مر گئے - کس کو یاد کروں - اور کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غمخوار نہیں - مروں تو کوئی عزادار نہیں -"

یوسف مرزا کو دلی کی ویرانی پر افسوس کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں -

"جب اہل شہر ہی نہ رہے - شہر کو لیکے کیا چولھے میں ڈالوں "

منشی شیو نرائن نے مرزا کو لکھا کہ میرے اخبار کے کچھ خریدار پیدا کیجئے - مرزا نے دلی کی تباہی پر آنسو بہاتے ہوے مگر ظاہرا ہنستے ہوئے ایک ایسا ظرافت آمیز جواب لکھ بھیجا کہ شیو نرائن کی تسلی کو کافی ہو گیا لکھتے ہیں -

"یہاں آدمی کہاں کہ اخبار کا خریدار ہو - مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں -"

مرزا شراب کے عادی تھے - مگر دیسی شراب سے اُن کو نفرت تھی - ہمیشہ اولڈ ٹام پیتے تھے - جس کی بوتلیں چوبیس روپیہ درجن کے حساب سے اُس زمانہ میں ملتی تھیں - ۱۸۵۸ء میں غدر کے بعد اوس کی قیمت بڑھ کر پچاس اور ساٹھ روپیہ درجن ہو گئی - مرزا بہت گھبرائے اور اپنے ایک عزیز ہندو دوست کانپور کے رہنے والے کو لکھا - کہ وہاں کچھ سستی ہو تو بھیجو - اونہوں نے لکھا کہ وہی نرخ یہاں ہے - مرزا صاحب نے گھبرا کر لکھا -

"جب وہاں بھی اس قیمت کو ملتی ہے تو میرا مقدور نہیں میں سمجھا تھا کہ شاید وہاں ارزاں ہو خیر اوس کو جانے دو - روٹی ہی ملے جائے تو غنیمت ہے - مہینہ بھر کی روٹی کا مول ایک درجن کی قیمت ہے -"

مرزا نے بعض جگہ چند الفاظ کے اجتماع سے عبارت میں [illegible] اور شوخی پیدا کی ہے - ہر چند کہ وہ الفاظ کے اجتماع سے گھبراتے تھے - مگر پھر بھی کسی جگہ خاص خاص طریقہ سے الفاظ کا اجتماع کیا ہے اور اُن سے ایک خاص بات پیدا ہو گئی ہے - مگر یہ نہیں ہے کہ انکو کہیں مراعات النظیر وغیرہ کی فکر ہوئی ہو -

میاں داد خاں سیاح جو مرزا کے نہایت راسخ العقیدہ شاگرد تھے۔ سیر و سفر کے عادی تھے۔ جب وہ ایک مرتبہ سورت اپنے مکان پر پہونچے تو مرزا نے لکھا۔

"سورت کا پہونچنا بہر صورت مبارک۔"

ایک مرتبہ تفتہ کو لکھا کہ "پنڈت بدری داس ...... میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا" پھر لکھتے ہیں

"اوپر کے نمبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے وہ بہ اعتبار ترک اصلاح نظم لکھا ہے ورنہ زندہ ہوں مردہ نہیں بیمار بھی نہیں۔"

مرزا کا دیوان اُردو جب پہلی مرتبہ چھپا تو میر مہدی۔ اور دوسرے لوگوں نے ایک ایک جلد مانگی اور لکھا کہ تینوں آدمیوں کے لئے ایک ایک جلد بھیجد یجئے۔ مرزا نے الفاظ میں ظرافت کی۔

"اگر خدا چاہے تو اسی ہفتہ میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہونچ جائیں۔"

نصیر الدین میر مہدی کے دوستوں میں تھے۔ اور اسی توسط سے مرزا بھی اُن پر مہربان تھے۔ ایک مرتبہ میر مہدی کو خط لکھا تو یہ فقرہ لکھ بھیجا۔

"نصیر الدین چراغ دلی کو اور میر نصاحب کو دعا کہنا۔"

ایک جگہ حکیم ظہیر الدین احمد خاں کی طرف سے نجم الدین حیدر اون کے چچا کو خط لکھا۔ اس میں وہ الفاظ کی بھرمار کی اور اتنا مبالغہ سے کام لیا۔ کہ ناسخ وغیرہ کو مات کر دیا سنئے۔

"سبحان اللہ کیا توپ جس کی آواز سے رعد کا دم بند۔ اور رنگ کے رشک سے بجلی کو رنج۔ گولہ اس کا خدا کا قہر۔ دھواں اُس کا دریائے آتش کی لہر استغفر اللہ کیا باتیں کرتا ہوں۔ کیسی رنجک۔ کیسا دھواں کیسا گراب۔"

"دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کے اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔"

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کو ایک قصیدہ بھیجا۔ انہوں نے نہ جواب دیا۔ نہ رسید بھیجی۔ مرزا نے جب دوسرا خط لکھا تو امید گاہ کے بجائے اُمید گاہ بہ کاف عربی لکھدیا۔ انھوں نے لطیفہ کو سمجھ لیا۔ اور جواب میں پوچھا کہ مرزا صاحب یہ کیا۔ مرزا صاحب جواب دیا کہ

"پیر و مرشد اگر میں نے اُمید کاہ بکاف عربی لکھا تو کیا گناہ۔ نہ خط کا جواب۔ نہ قصیدے کی رسید ہ
در پن خستگی پوزش از من مجوے		بود بندہ خستہ گستاخ گوے"

انہیں شفق کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"احترام الدولہ بہادر میرے ہمزبان اور آپ کے ثنا خواں ہوگئے۔ گویا اس امر خاص میں وہ شریک غالب ہیں۔ ہم بطریق کسرۂ اضافی و ہم بطریق کسرۂ توصیفی"

نواب صاحب نے ایک مرتبہ اپنے اعزہ کی کچھ شکایت لکھی۔ مرزا کو خط ملا تو جواب میں لکھا۔

"قبلہ و کعبہ کیا لکھوں امور نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالات عادیہ میں سے ہے۔ یہ کیونکر ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب انشراح کا بھی ہو اور باعث انقباض کا بھی ہو یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اوس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی"

میر امجد علی قلق لکھنوی کا ایک مرتبہ نواب صاحب سے ان الفاظ کے ساتھ حال پوچھا۔

"میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اون کے تخلص نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے یعنی قلق میں مبتلا ہوں۔"

نواب ذوالفقار الدین حیدر خاں کو خبر دیتے ہیں۔

"مرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے اُنہوں نے زمین پکڑی ہے۔ دیکھئے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اُٹھ جائیں"

نیرؔ کو مرزا نے خلیفہ کیا۔ اس کی جب علاء الدین احمد خاں کو خبر ہوئی تو انہوں نے دبتے دبتے مرزا سے شکایت کی کہ حقدار میں بھی ہوں۔ مرزا نے جواب لکھا اور الفاظ کے بھیر میں خدا جانے کیا کہہ گئے۔

"مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفہ اوّل ہے تو تم خلیفہ ثانی ہو۔ اوس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ ایک اوّل ہے۔ ایک ثانی ہے۔"

دسمبر ۱۸۶۵ء میں رام پور میں کوئی بڑا جشن ہوا جس میں اکثر معزز انگریز بھی مدعو تھے۔ اور بہت اہتمام اور تزک و احتشام عمل میں لائے جا رہے تھے۔ مرزا اُس زمانے میں رام پور ہی میں تھے۔ چنانچہ علاء الدین احمد خاں کو وہاں کا حال لکھتے ہیں۔ اور ایک فقرہ سے عبارت میں ظرافت کی روح پھونک دیتے ہیں۔

"آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم۔ حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاہیئے۔"

میر احمد حسین میکشؔ کی کسی تقریب میں خرمے تقسیم ہوئے آپ نے لکھا۔

"میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ تازے خرمے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے۔ تازہ شے بہتر۔ بارہ سے بہتر۔"

دیکھئے اس تاریخ میں تجنیس سے جان ڈال دی ہے۔

جس زمانے میں عودِ ہندی چھپنے کو تھی۔ اور منشی غلام غوث بیخبر اس کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ تو مرزا صاحب نے لکھا۔

"اور ہاں حضرت وہ مجموعہ چَھپے گا (بالفتح) یا چُھپے گا (بالضم)۔"

اسی بارہ میں ایک اور جگہ بھی خواجہ غلام غوث صاحب کو لکھتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ خواجہ صاحب مرزا پر زور دیتے تھے۔ کہ دیباچہ آپ لکھئے۔ مرزا صاحب نے لکھا۔

"مجموعہ نثر اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعہ کا چَھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چُھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

رسم است کہ مالکان تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اُسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔"

مالکان تحریر سے یہ مراد ہے کہ جو لوگ غلاموں کے مالک ہیں وہ بڈھے غلاموں کو آزاد کر دیتے ہیں۔ تو مالک تحریر آپ بھی ہیں یعنی آپ میرے مالک بھی ہیں اور صاحب تحریر یعنی مصنف بھی ہیں۔

مرزا القاب و اداب کی پرانی اور فرسودہ رسم کے سخت خلاف تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ مراسلہ مکالمہ کی صورت میں آجائے۔ اور اُس میں آورد کے تکلفات نہ پائے جائیں۔ اسی واسطے انہوں نے نئی نئی طرح کے القاب نکالے۔ جن میں بعض تو ایسے ہیں جو براعت الاستہلال کا کام دیتے ہیں یعنی القاب سے مکتوب الیہ کے حالات موجودہ اور اخلاق پر روشنی پڑجاتی ہے۔ اور بعض وہ ہیں جو طنز آمیز ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو باہمی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اکثر القابوں میں وہ خیال رکھتے ہیں کہ ظرافت کا رنگ باقی رہے۔ سیّاح سے اُن کو ایک خاص تعلق تھا۔ بعض رسالے بھی اُن کے نام سے لکھے۔ اور سیف الحق اُن کو خطاب بھی دیا۔ ایک مرتبہ جب وہ ادہر اُدہر کر کے سورت پہونچے۔ اور مرزا کو خط لکھا۔ تو مرزا نے جواب میں لکھا کہ

"آ بیٹے مولانا سیّاح۔ سلام علیکم۔"

مرزا تفتہ کے خط پہونچنے میں دیر ہوئی۔ مرزا نے اُن کو خط لکھا۔ اور صرف اِس القاب سے خط شروع کر دیا۔

"کیوں صاحب روٹھے ہی رہوگے۔ یا کبھی منوگے بھی۔ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ مَیں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔"

مجروح کو لکھتے ہیں۔

"برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی اُردو بازار کے مولوی صاحب لوائے ولائے مرتضوی پہ علم عباس ابن علی کا سایہ"

ایک جگہ انھیں کو لکھتے ہیں۔

"میری جان سُنو داستان"

خواجہ غلام غوث کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مولانا۔ بندگی۔"

نواب سعد الدین خاں شفق نے ایک مرتبہ خطوں کا جواب اور قصیدہ کی رسید نہیں بھیجی انہوں نے خط پھر لکھا۔ اور القاب میں اُمیدگاہ کے بجائے۔ اُمیدکاہ۔ لکھدیا بکاف عربی۔

مرزا شمشاد علی بیگ رضواں کو لکھتے ہیں۔

"فرزند دلبند شمشاد علی بیگ کو اگر خفا نہوں تو دعا۔ اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی۔"

حالت خوشی میں دعا۔ اور حالت آزردگی میں بندگی کی کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ الفاظ کی اندازہ شناسی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

یوسف مرزا کی عادت تھی کہ مُدتوں خط نہ بھیجتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے اصلاح کے لئے ایک مثنوی مرزا کے پاس بھیجی۔ مگر مثنوی ناتمام تھی۔ اور مرزا کی عادت یہ تھی کہ وہ ناتمام کلام پر کبھی اصلاح نہ دیتے تھے۔ انہوں نے اوس کو احتیاط سے رکھ لیا۔ اب یوسف مرزا کے خط پر خط تقاضہ کے آرہے ہیں۔ سب کچھ لکھتے ہیں۔ مگر مرزا ڈکار نہیں لیتے۔ ایک خط کا جواب لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

"میری جان خدا تیرا نگہبان۔ میں نے گرگ دھینگ کو دام میں پھنسایا۔ پھر قفس میں بند کر کے یہ رقعہ لکھوایا۔ . . . . . مثنوی کبھی اصلاح نہ پائے گی۔ جب تک سب نہ آئے گی۔ لاکھ باتیں بناؤ۔ مجھ کو غیرت دلاؤ۔ غزل جب تک پوری نہ ہو۔ قصیدہ جب تک تمام نہ ہو۔ مثنوی جب تک سب نہ لکھی ہو کیونکر اصلاح دی جائے۔"

ایک جگہ علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں اور اپنے رنج و غم کا ثبوت دیتے ہیں۔

"جان غالب۔ مگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔ قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے۔"

ایک جگہ صاحب عالم کو خط لکھتے ہیں۔ اور اسی فقرے سے خط کو شروع کر دیتے ہیں

"میکنم عرض گو مکرر باش"

مرزا رحیم بیگ مرزا کے ایک حریف تھے۔ اور قاطع بُرہان کے چھپنے پر مرزا کی بعض نکتہ چینیوں پر اُنھوں نے بھی اعتراضات کئے تھے۔ چنانچہ آبدہ دست کے معنی میں بھی اختلاف کیا تھا۔ مرزا اُنھیں کو ایک خط لکھتے ہیں اور خط کے القاب میں ان پر طنز کرتے ہیں۔

"بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہ بالاسرار وعینہ بالانوار۔"

دیکھئے مرزا رحیم بیگ کا جاہل مزاج ہونا۔ اور اندھا ہونا۔ سب ایک اسی القاب سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا کی زندگی بھی دنیاداری کی زندگی تھی۔ اس لئے ان کو بھی آئے دن وہی ضرورتیں اور وہی مناظر پیش آتے تھے۔ جو سب کو آتے رہتے ہیں۔ وہ خفا بھی ہوتے ہیں ڈانٹتے بھی ہیں۔ تنبیہ بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں بھی ان کا شیوہ سب سے نرالا اور سب سے جُدا ہے۔ ان کی فطری خوش طبعی اور ظرافت یہاں بھی اوسی طرح باقی رہتی ہے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو بجائے رنج و غم کے اور اک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ایک خاص لطف آتا ہے۔ ایک خاص لذت کا احساس ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور دلی میں قدیم سے ایک ادبی چشمک چلی آتی ہے۔ دلی والے اہل لکھنؤ کو اور اہل لکھنؤ اہل دلی کو حسد اور رشک سے دیکھتے ہیں۔ انھیں میں سے میر مہدی مجروح بھی تھے۔ چنانچہ اکثر خطوط میں اس قسم کے دل آزار فقرے لکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے لکھا۔

"آؤ میاں سید زادے آزادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ۔ ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ ذوق کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے والے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔"

جس صورت سے تنبیہ کی گئی ہے۔ شاید اس کا جواب اخلاق و ادب کی بڑی سے بڑی کتابوں میں بھی نہ ملے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص پر ایک وقت میں دو حالتیں طاری ہیں۔ غصہ بھی اور ناصحانہ جذبہ بھی، محبت بھی اور خوش طبعی بھی۔ وہ سمجھاتا ہے۔ مگر تلخ نوائی سے دور رہنا چاہتا ہے۔ محبت کرتا ہے۔ مگر دیوانوں کی طرح نہیں۔ بلکہ ایک ذی ہوش کی طرح۔

مرزا کی نثر کا ان کی زندگی ہی میں کافی شہرہ ہو چکا تھا۔ اور لوگ اس کی نقلیں اُتار اتار کر اپنے طرز بیان کو چمکانا چاہتے تھے۔ اونھیں لوگوں میں میر مہدی بھی تھے۔ خط لکھتے تو عبارت کا بناؤ چناؤ بہت کرتے تھے۔ مرزا عبارت کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ یا مبتدیانہ انداز پر بناتے تھے۔ ایک مرتبہ میرن صاحب۔ (جو ایک خوبصورت نوجوان تھے۔

اور میر مہدی مجروح کے بڑے محبوب دوست تھے - اور خود مرزا بھی اُن سے محبّت کرتے تھے۔) کے چہرے پر مہاسا نکل آیا - میر مہدی نے اس واقعہ کو خوب نمک مرچ لگا کر مرزا کو لکھا - مرزا نے جواباً لکھا -

" سیّد خدا کی پناہ - عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اٹھایا ہے - ایک غریب سیّد کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے - تم کو سرمایۂ آرائش گفتار بہم پہونچا ہے - میری اُن کو دعا پہنچاؤ - "

ایک مرتبہ لکھا کہ

" سید صاحب اچھا ڈھکوسلہ نکالا ہے - بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا - اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لینا - میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پہ مرتا ہوں - میر سرفراز حسین نہیں کہ اُن کو پیار کرتا ہوں - علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں - اوس میں تم بھی آگئے - کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبّت قدیم ہے - دوست ہوں - عاشق نار نہیں - بندۂ مہر و وفا ہوں - گرفتار نہیں - "

میر مہدی مرزا کے اُن سعادتمند اور عقیدت شعار شاگردوں میں تھے جو استاد سے باتیں کرنے کو بھی حسنات کا درجہ دیتے ہیں - اسی لئے جب یہ مرزا کو خط لکھتے تو خوب طول دیتے - چنانچہ ایک خط لکھا جو بہت طویل تھا - مرزا اوس کے جواب میں لکھتے ہیں -

" واہ حضرت کیا خط لکھا ہے - اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ - بات اتنی ہے - کہ میرا پلنگ مجھکو ملا - میرا بچھونا مجھکو ملا - میرا حمام مجھکو ملا - میرا بیت الخلا مجھکو ملا - رات کا وہ شور کوئی آئیو - کوئی آئیو - فرو ہو گیا - میری جان بچی - میرے آدمی کی جان بچی - ع

اکنوں شب من شب است و روزم روز ست "

جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں - میر مہدی کو دلی کی زبان پر بڑا ناز تھا - ایک مرتبہ ایک غزل کے مقطع میں لکھا -

ع میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے -

یہ غزل مرزا صاحب کے پاس اصلاح کے لئے آئی - مرزا نے لکھا -

" اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی ع میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے " ارے اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں - یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں - یا گورے ہیں - تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے - "

ایک مرتبہ میر مہدی نے لکھا کہ آپ کا خط میرے ایک ہمنام کے پاس پہونچ گیا - مرزا نے جواب میں لکھا -

" صاحب قصور تمھارا ہے - کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو مجھکو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں - نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا - نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا - نہ اپنا ہم تخلص

بہم پہونچایا۔ ''

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب مرحوم کو لکھا۔

''بڑی شرم کی بات ہے۔ ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج۔ اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ وا غیر سبب یہ کہاں کی بولی ہے۔ ع

ازخواندن قرآن توقاری چہ فائدہ

عیاذاً باللہ۔ امیر خسرو قرآن کو کہ بسکون رائے قرشت والف ممدودہ ہے۔ قران بروزن پُران لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دوگد ہوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔ ''

مرزا کے مزاج میں رکھ رکھاؤ بہت تھا۔ اور ہمیشہ دوسروں کی عزت کرتے تھے۔ اسی حالت میں خود بھی اتنا جھکتے تھے اور احباب کے ساتھ اسقدر عجز و نیاز کے ساتھ پیش آتے تھے کہ اس سے زیادہ متصور نہیں ہے۔ مگر اس صورت میں بھی اپنا خاص طرز بیان اور انداز ظریفانہ قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ اون کے بعض انکساریہ جملے نقل کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے۔

''غذا مفقود ہے صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب اور اسی قدر گلاب۔ خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے۔ سه

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم　　القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

منشی ہرگوپال تفتہ مرزا کے شاگرد رشید اور بہت محبوب دوست تھے۔ مرزا کو اُن کی خاطر عزیز تھی۔ مگر با اینہمہ وہ کلام بھیجتے تو مرزا سے پہلے اجازت مانگا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے لکھا۔

''تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جزو ہوں تو ۲۰ جزو ہوں تو بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون ہوں بناوٹ نہ سمجھنا ''

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی نے دلی کی حالت اور ہنگامۂ غدر کی حالت دریافت کرتے ہوئے مرزا کی خیریت پوچھی اور کچھ شعر و شاعری کا ذکر کیا تو مرزا صاحب نے جواب دیا۔

''میں اموات میں ہوں مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل

کی روشن ضمیر میں آئے ،،

میر مہدی نے کچھ تصوف کا ذکر کیا - اور کچھ ایسی ہی باتیں کیں جن سے نصیحت معلوم ہوتی تھی - مرزا نے میر مہدی کو اپنے خاص طرز میں انتباہ کرتے ہوئے چند انکساریہ جملے لکھے - ملاحظہ ہو -

" میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بنیئے سے سیانا سو دیوانہ - صبر و توکل شیوہ صوفیہ کا ہے - مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا - جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو - کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں کی پرورش کرتا ہوں - استغفر اللہ - لاموثر فی الوجود الا اللہ - یا تم یہ سمجھے ہو کہ میں شیخ چلی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا - اور اوس کے انڈے بچے بیچ کر بکری خریدوں گا - ،،

میر مہدی مجروح کو کوئی قطعہ بھیجا - جو روا روی میں کہا گیا تھا - اور فکر تمام نہ تھی بھیج کر خط لکھتے ہیں -

" قطعہ تم نے دیکھا بیچ بیچ میرا حلیہ ہے - واہ کیا شاعری رہ گئی ہے ،،

مولوی احمد حسین قنوجی کو لکھتے ہیں -

" ۶۵ برس کی عمر ہوئی اضمحلال قوٰے - ضعف دماغ - فکر مرگ - غم عقبےٰ - جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں - مَیں اب وہ نہیں ہوں - نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے - ورنہ جوہر فکر کی رخشندگی کہاں - بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے - زور نہیں دلوا سکتا - ،،

حکیم سید احمد حسن نے غزلوں کی اصلاح کے لئے لکھا - آپ نے جواب دیا - اور جواب میں ظرافت آمیز لہجہ میں وہ انکسار اور ناتوانی کا اظہار کیا کہ اگر لاکھ بار یوں متین لہجے میں سمجھاتے تو وہ بات پیدا نہ ہوتی لکھتے ہیں -

" مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے - جس مہینے تک میں زندہ ہوں اوس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا - ،،

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق نے پوچھا کہ دنبالہ دار ستارہ کا کیا اثر ہوتا ہے - مرزا صاحب نے جواب دیا کہ نہ رصد ہے نہ کتاب ہے لکھوں کیا - اور صائب کا شعر ؎

ز خال گوشۂ ابروے یار می ترسم ازیں ستارۂ دنبالہ دار می ترسم

لکھ کر فرمایا کہ

" کیا آپ مجھکو بے ہنری اور ہیچمیرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے - بیش ملا طبیب - و بیش طبیب ملا - و بیش ہیچ ہر دو - و بیش ہر دو ہیچ - شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے - ورنہ سوائے موزونی طبع یہاں اور کیا رکھا ہے ،،

ایک جگہ شفق کو یوں لکھتے ہیں۔

"دیکھو بحر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں۔ نہ القاب نہ آداب۔ نہ بندگی۔ نہ تسلیم۔ سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ بن۔ ایاز حد خود بہ شناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نوبت غزل کی لکھی ہے۔ اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے۔ پہلے القاب لکھ پھر بندگی عرض کر پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ۔"

مولوی عبدالغفور کو لکھتے ہیں۔

"خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے۔ تفقد نامہ سامی میں صورت عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق طے لسان زبان پر آئی ہے۔ ورنہ قدردانی کیسی یہ قدر فزائی ہے۔ نظیری علیہ الرحمہ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجئے روزمرۂ شعرا سے مجھکو نکال دیجئے۔ شعر یہ ہے ؎

جوہر بینش من در تہ زنگار بماند آنکہ آئینہ من ساخت نپرداخت دریغ"

مرزا کی پیشین گوئی منجموں یا رمالوں کی پیشین گوئی سے بالکل جدا ہے۔ وہ ظرافت کے طریق پر کہیں پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اور کبھی اندیشہ کے طریق پر۔ مگر کہیں اصل رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو خط لکھا۔ اس خط کے لکھنے سے پہلے یہ غزل بھیج چکے تھے" ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے" جب خط لکھا تو پیشین گوئی کے طریق پر یہ فقرہ بھی لکھ دیا۔

"اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق یکتا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہونچ گئی ہوگی۔ رہا سلام وہ آپ پہونچا دیں گے۔"

منشی غلام غوث صاحب بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند وطالب مرد
ور بگویند در کدامیں سال — مرد غالب بگو کہ غالب مرد

اب بارہ سو چھتر ہیں۔ اور غالب مرد کے بارہ سو ستتر ہیں اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہونچتی ہو۔ پہونچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔"

ہم لکھ چکے ہیں کہ ظرافت نگاری کے ساتھ درد پیدا کرنا مرزا کا حصۂ خاص ہے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی عبارت میں دیکھئے۔ حزن وملال بھی ٹپک رہا ہے۔ اور ظرافت کے بھی دریا بہہ رہے ہیں۔

بعض ضروری خطوں کے ضایع ہوتے پر مرزا کو بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اسی بنا پر خواجہ غلام غوث کو لکھتے ہیں۔

"آپ کارپردازان ڈاک ڈاکو نہ بن جائیں۔ اور میرے ان دونوں خطوں اور پارسلوں کو باحتیاط پہونچائیں۔"

ڈاک کی مناسبت سے ڈاکو کا لفظ لکھ کر لطف ظرافت پیدا کر دیا۔

ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا سے اپنی موت کی پیشین گوئی ان لطیف الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"حال قصیدے اور مخمس کا معلوم ہوا۔ قبلہ وکعبہ وہ کر رہے ہیں۔ جو آبا اولاد سے اور آقا غلام سے سلوک کرتا ہے۔ اون کو منظور رہے کہ دعا کا عطیہ جدا پاؤں اور ثنا کا صلہ جدا پاؤں ؎

کارساز ما بہ فکر کار ما — فکر ما در کار ما آزار ما

لیکن میری جان انصاف تو کر ان صلوں میں زندگی تو بسر نہیں ہوتی۔ یہ فکر بھی بیہودہ ہے۔ زندگی میری کب تک۔ سات مہینے یہ۔ اور بارہ مہینہ سال آئندہ کے اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس۔ نہ جاڑے کی شدت۔ نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف۔ نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت گھی منگاؤں۔ نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور۔ اور سراسر سرور۔ ؎

یارب ایں آرزوی من چہ خوش است — تو بدیں آرزو مرا برساں"

تاریخ گوئی کو مرزا دون مرتبت اور ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی وہ اس میں نہ محنت کرتے ہیں۔ اور نہ اس مشغلے میں اون کا جی لگتا ہے۔ پھر بھی ضرورت اور احباب کے تقاضے اونھیں اس بات پر مجبور کرتے ہیں۔ اور تاریخیں لکھنی پڑتی ہیں۔ مگر ان میں وہ وہ جدتیں اور اختراع کرتے ہیں کہ سبحان اللہ انہیں

ظرافت کے خاص جوہر سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ کافی دلچسپ ہوجاتی ہیں۔ اگرچہ تاریخ کا ذکر نظم کے حصہ میں کرنا چاہئے۔ مگر چونکہ یہ تاریخیں نثر کے سلسلہ میں پائی گئیں لہذا نثر ہی میں لکھتا ہوں۔

مجتہد العصر لکھنؤ کے چھوٹے بھائی میرن صاحب نے انتقال کیا۔ جنکا نام سید حسین اور خطاب سید العلما تھا۔ جو نقش نگیں بھی تھا۔ مرزا نے خود ہی یا کسی کے تقاضے سے تاریخ نکالی۔ مگر اس میں اتفاق سے پانچ عدد بڑھتے تھے۔ یعنی اون کا انتقال ۱۲۷۳ میں ہوا۔ اور مادۂ تاریخ میں ۱۲۷۸ نکلتے تھے۔ مرزا نے ایک نئی صورت سے تخرجہ کیا تاریخ یہ ہے۔

حسین ابن علی آبروئے علم و عمل　　کہ سید العلما نقش خاتمش بودے
نماندو ماندے اگر زندہ پنج سال دگر　　غم حسین علی سال ماتمش بودے

ظاہراً تاریخ صاف ہے۔ مگر ظرافت یہاں بھی کام کر رہی ہے۔ کہتے ہیں۔ کیا کیجئے وہ زندہ ہی نہ رہے۔ اور اگر کہیں پانچ سال اور زندہ رہتے تو اچھی تاریخ غم حسین علی اون کی تاریخ وفات ہوجاتی۔

تشبیہ کی اصناف اور صفات سے یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ مرزا تشبیہ سے کام لیتے ہیں تو اس کو کس درجہ بلند کردیتے ہیں۔ اور پھر بھی اپنے رنگ طبعی کو نہیں چھوڑتے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہ بذاتہ ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے ذریعہ سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر اوس میں اور بھی حسن پیدا کیا جائے تو وہ خوب سے خوب تر ہوجاتی ہے۔ تشبیہ میں مشبہ بہ کی ندرت اس کی کفیل ہوتی ہے۔ اور اکثر وجہ شبہ بھی اوس میں جان ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ مرزا کی بعض بلکہ اکثر تشبیہیں انھیں دونوں چیزوں کی وجہ سے نہایت اعلےٰ درجہ پر واقع ہوئی ہیں۔

منشی حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں۔

"کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارہ دنبالہ دار آیا"

خط کو ستارہ۔ اور رجسٹری کو دنبالہ ٹھہرایا۔ وجہ شبہ یہ ہے کہ جیسے ستارہ دنبالہ دار میں ایک دُم لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس میں ایک رسید کا دُم چھلہ لگا ہوا تھا۔

دس گیارہ برس سے مرزا جس مکان میں رہتے تھے اتفاق سے اُس مکان دار نے مکان بیچ دیا۔ اب دوسرے مکان دار نے مرزا پر تقاضہ کیا کہ جناب مکان خالی کردیجئے۔ اور اس بارہ میں اتنا مُصر ہوا کہ مرزا عاجز ہوگئے۔ برابر یہی جواب دیتے رہے کہ اچھا بھائی مجھے اچھا سا مکان مل جائے تو خالی کردوں۔ اُس نے انتظار نہ کیا اور مکان کی مرمت شروع کردی۔ اوس حالت کا مرزا اپنے الفاظ خاص میں نقشہ کھینچتے ہیں اور ایک تشبیہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"بیدرد نے مجھکو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالاخانہ کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول اور اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت۔ پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرہ اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔"

۱۸۶۲ء میں دلی میں اس زور کی برسات ہوئی کہ لوگ عاجز ہو گئے۔ سیکڑوں مکانات منہدم ہو گئے۔ اور جو رہے وہ بھی بارش کی وجہ سے خراب و خستہ تھے چھتیں ٹپکنے لگیں سامان برباد ہو گئے۔ اسی عالم کا مرزا نقشہ کھینچتے ہیں۔

"جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ اور مینہ کی نئی صورت۔ دن میں دو چار بار برسے۔ اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانہ کا جو دالان۔ میرے بیٹھنے اوٹھنے۔ سونے جاگنے۔ جینے مرنے کا محل ہے۔ اگرچہ گرا نہیں۔ لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن۔ کہیں چلمچی۔ کہیں اوگالدان۔ رکھدیا کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔"

ٹپکتی ہوئی چھت کی چھلنی سے تشبیہ تو خیر ایک پرانی تشبیہ ہے۔ مگر گھر کو کشتی نوح سے تشبیہ دینا صرف غالب کا حصہ تھا۔

مرزا ایک مدت تک رامپور رہنے کے بعد اپنے گھر آئے۔ تو مرزا تفتہ کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اور اسی اطلاع میں اپنے گھر پہونچنے کی تشبیہ بھی دی۔ لکھتے ہیں۔

"لو صاحب کھچڑی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔ ۸ر جنوری ماہ و سال حال غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔"

منشی شیو نرائن نے پنج آہنگ کی جلدیں بنوا کر مرزا کے پاس بھیجیں۔ بہت پسند کیں۔ چونکہ یہ کتابیں ہدیہ کے طور پر حکام کو بھیجنا تھیں۔ اس واسطے ان پر طلائی نقش و نگار کی بھی ضرورت تھی۔ مگر یہ کام ابھی باقی تھا۔ اسی کی بابت مرزا تفتہ کو ایک خیالی تشبیہ دے کر لکھتے ہیں۔

"طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی۔ حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔"

مرزا نے اپنی جتنی کتابیں چھپوائیں وہ اس طرح کہ حق تصنیف کسی سے کچھ بھی نہیں لیا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو جلدیں لیتے رہے۔ بلکہ یہ طریقہ تھا کہ جب کتاب چھپ جاتی تو خود بھی دوستوں میں تقسیم کرنے کے لئے دس بیس جلدیں خرید لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب قاطع برہان طبع ہوئی تو ارادہ کیا کہ پچاس جلدیں خرید لوں۔ مگر افلاس اور پریشانی کے ہاتھوں مجبور۔ اسی کی بابت مرزا تفتہ کو اطلاع دیتے ہیں کہ

"برہان قاطع کا چھاپا ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست

پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپیہ بھیجوں تو اکچاس جلدیں منگاؤں۔ دیکھئے نومن تیل کب ہو اور رادھا کب ناچے۔"

مہاراجہ الور کو اختیارات ملنے کی خبر ملی تو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا۔"

میر مہدی مجروح نے پنشن کے بارہ میں کچھ دریافت کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بعد غدر بعض معتوبین بعد تحقیقات بے گناہ ثابت ہوے اور اُن کے اعزاز کو بحال کر دیا گیا تھا۔ مرزا نے جواب دیا۔

"چند اشخاص کو اس بائیس مہینہ میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے۔ روپیہ کے باب میں اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اب اپنے سوال کو یاد کرو اس واقعہ سے اُس کو کچھ نسبت ہے۔ یا نہیں۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے "چیل بسولا لیگئی تو کاہے سے ٹیکوں راب۔"

سید احمد حسن صاحب سورتی نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی۔ مرزا نے شکریہ ادا کیا اور لکھا۔

"امسال فقیر نے اپنی خاکساری کا خاکہ (یعنی تصویر) منشی میانداد خاں کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے کہ وہ پہونچی ہوگی۔"

مرزا علاءالدین احمد خاں کی اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے کچھ صفائی نہ تھی۔ اسی وجہ سے بارہا تکلیفوں اور غموں کا بھی سامنا ہوتا تھا۔ مرزا کو یہ بات دل سے ناگوار تھی۔ اور بہ نسبت نواب امین الدین احمد خاں کی تکلیف بھی اُن کو کافی صدمہ پہونچاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ علاءالدین احمد کو لکھتے ہیں۔

"تمہارے حال میں غور کی۔ اور چاہا کہ اُس کا نظیر بہم پہونچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے۔ جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارا اخلاق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں "

صاحب عالم مارہروی نے مرزا سے حاشا۔ اور حاش للہ پہ بحث کی اور کچھ دلائل اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے مرزا نے لکھا۔

"آپ کی اس لفظ لکھنے سے اس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ لوکشف الغطا ما ازددت یقیناً۔

اس جواب میں محض حضرت علی کرم اللہ وجہ کا یہ قول ہی نقل کرنا۔ ایک خاص ظرافت ہے۔ کیونکہ جس سائل سے

آپ نے یہ کہا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا خاصہ لطیفہ ہے

چودھری عبدالغفور سرور نے ایطاء کے باب میں مرزا سے کچھ دریافت کیا۔ مرزا نے جواب دیا۔

"آئمہ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر قابل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو۔ اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اوس کا نام میر بادشاہ رکھدیا ہے۔"

مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط کے جواب میں دیر ہوگئی تو لکھتے ہیں۔

"قبلہ اُس عنایت نامہ کا جو مارچ گزشتہ میں پایا ہے۔ آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں۔ گویا نماز صبح قضا پڑھتا ہوں۔"

اسقدر تشبیہیں دیکھنے کے بعد ہر شخص آسانی سے معلوم کرسکتا ہے کہ تشبیہ میں مرزا کا کیا مرتبہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ بالطبع ان چیزوں کے عادی نہیں ہیں۔ اور ہر جگہ یہ کوشش نہیں کرتے کہ اس کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کریں۔ امراض جسمانی کی تشبیہیں بھی اس خوبی سے دیتے ہیں کہ دیکھنے والا۔ اور سننے والا حیران ہوکر سوچنے لگتا ہے کہ کوئی مریض ایسی تشبیہیں دے سکتا ہے تو کیا اُس کو مریض کہا جا سکتا ہے۔

میر غلام بابا کو لکھتے ہیں۔

"ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں۔ جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دَل آتا ہے۔"

ایک مرتبہ عوارض فساد خون میں مبتلا تھے۔ پھوڑے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اوسی حالت کی منشی سیف الحق سیاح کو اطلاع دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

"بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہو"

قد کی تشبیہ سرو سے۔ اور اس پر لال لال پھوڑے یا زخم کی تشبیہ چراغاں سے کس قدر عجیب و غریب ہے۔

منشی حبیب اللہ ذکا کو مرض کا حال لکھتے ہیں۔

"تم میری بات پوچھتے ہو مگر میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں رعشہ اونگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کوئی دوست آتا ہے تو اس سے خط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے۔ مونے کی روح کو اُس کی بو پہونچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔"

انھیں کو ایک جگہ ناتوانی کی تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بنکر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔"

شاہزادہ بشیر الدین کو ناتوانی اور لاغری کا حال لکھتے ہیں۔

"حضرت پیر و مرشد برحق روز افزونی کاہش اب اس حد کو پہونچی ہے کہ ع

تقسیم جزو لا یتجزیٰ محال ہے

آگے بادِ مہر یُ نے لہو خشک کر دیا تھا۔ اب دوزخ نے جلا دیا ہے۔"

آخری فقرہ بھی ایک تشبیہ ہے۔ وہ یہ کہ شاہزادہ صاحب نے مدتوں تک خط نہ بھیجا۔ سرد مہری برتی اور اب خط بھیجا تو عتاب نامہ بھیجا۔ فراموش کاری اور سرد مہری کو بادِ مہر یُ سے اور غصہ اور عتاب کو آتش دوزخ سے تشبیہ دے کر مضمون خط میں جان ڈال دی۔

مرزا اگر کسی بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو وہ طریقہ بھی جدا اور دنیا بھر سے نرالا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب غدر ۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوگیا۔ اور کار گزاروں کو انعام اور مجرموں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ تو مرزا بھی ناکردہ گناہ معتوبین میں قرار پائے۔ اور ایک سکہ جو ذوق مرحوم نے بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر کہا تھا غالب کا کہا ہوا ٹھہرایا گیا۔ مرزا نے بہت عذر کئے مگر پذیرائی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اُردو اخبار تلاش کیا۔ جس میں وہ سکہ ذوق کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مگر وہ بھی ہاتھ نہ آیا۔ مجبوراً خاموش ہوگئے۔ اور زبردستی کے مجرم قرار پائے۔ اسی بارہ میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"میں نے سکہ کہا نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا۔ اور توپیں لگانی۔ اور بنک گھر اور میگزین لوٹنا معاف ہو جائے۔ اور شاعر کے دو مصرع معاف نہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے۔ اور شاعر کا سالا بھی مددگار نہیں۔"

کون نہیں جانتا کہ تعزیت اور عیادت کے لئے وہ جملے جو عام طریقہ سے رائج ہیں ان میں اظہار رنج۔ اور تلقین صبر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور ان کی قدامت اور فرسودگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جس شخص کے پاس تعزیت کے لئے جاتے یا خط لکھتے ہیں۔ وہ تعزیت کرنے والے کے منھ سے ایک جملہ سنے بغیر۔ یا ایسے خط سے ایک فقرہ پڑھے بغیر کہنے والے یا لکھنے والے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے یہ افسوس آمیز جملے اور

تشفی آمیز فقرے اوس پر ذرا بھی اثر نہیں کرتے۔ بلکہ برعکس اس کے اوس کا زخم اور تازہ ہو جاتا ہے۔ اور گھڑی بھر کے لئے ان غمخواروں کی خاطر بھی اوس کو رونا پڑتا ہے۔ مگر اس کہنگی مضامین اور پامالی خیال کے نتیجے مرزا کے ذہن نشین ہو چکے تھے۔ اس واسطے انہوں نے اظہار تعزیت میں بھی۔ اپنے ظریفانہ انداز بیان اور شگفتگی طبع کو قائم رکھا۔ اور اس خوبی سے اس جانگداز فرض کو انجام دیا کہ جا بجا انفرا بنا دیا۔

امراؤ سنگھ مرزا تفتہ کے دوست یا عزیز تھے۔ اون کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا۔ تفتہ نے مرزا کو بھی یہ حال لکھا مرزا صاحب نے ان الفاظ میں تعزیت کی۔ اور تعزیت کے ساتھ ہی ایک لطیفہ شامل کر دیا۔ جس کو پڑھ کر کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے رنج و غم ضرور دور ہو جاتا ہے۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اوس کے واسطے مجھکو رحم۔ اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اوس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔ وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے۔ وہ حکیم سنائی کا ہے۔ اور وہ قطعہ حدیقہ میں مرقوم ہے۔

پسرے با پدر بزاری گفت | کہ مرا بار شو بہمر و جفت
گفت بابا زنا کن و زن نہ | پند از خلق گیر و از من نہ
ور زنا گر بگیر دت عسسے | بہ ہلد کو گرفت چون تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نہ کند | ور تو بگزاریش رہا نہ کند"

میر مہدی نے میر اشرف علی کو لکھا کہ تمہاری بھانجی کا انتقال ہو گیا۔ مگر نام نہ لکھا۔ مرزا نے اون کی طرف سے میر مہدی کو لکھا۔ اور اُس میں بھی وہی رنگ ظرافت قائم رکھا۔

"اوس غریب کا یہ قول ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اوس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کونسی بھانجی مری ہے اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی ایک محبوبہ کا گل حیات پژمردہ ہوا۔ مرزا کو خبر ہوئی تو ان الفاظ میں تعزیتی خط لکھا۔

"سنو صاحب شعراء میں فردوسی۔ اور فقراء میں حسن بصری۔ اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ

حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اوس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ تم اُس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اوس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔"

مرزا قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں۔

"میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو بیٹ چکا۔ اب چچا کو بھی رو۔ تجھکو خدا اختیار رکھے۔ اور تیرے خیالات واحتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا۔ کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے۔ اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرام گاہ وعرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلم دسخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اون سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب کہئے اوغلا لحسن آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا بیغیرت کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔ اور ان کے باپ کی تعزیت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں۔ کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہ ہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے، اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا صلاح اس امر میں بتائی نہیں جاتی دعا کو دخل نہیں۔ دوا لگاؤ نہیں پہلے بیٹا

پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ سروپا کس کو کہتے ہیں۔ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں سے چھوٹ گیا نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ" یوسف مرزا کا بچہ مرا تو ان الفاظ میں تشفی دی۔

معہ اے میری جان اے میری آنکھیں سے

زہجران طفلے کہ درخاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو۔ اور ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ نانا کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرتے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔"

ایسے ہی موقع پر سقراط نے اپنے مرنے کے وقت اپنی بیوی کو روتا دیکھ کر اوس سے پوچھا کہ تو کیوں روتی ہے۔ اوس نے جواب دیا کہ اس واسطے روتی ہوں کہ یہ لوگ تجھ کو بے گناہ مارتے ڈالتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اے بیوقوف کیا تو یہ چاہتی ہے۔ کہ میں کسی گناہ کی پاداش میں مارا جاؤں"

نواب امین الدین احمد خاں کی والدہ کا انتقال ہوا۔ مرزا صاحب نے تعزیتی خط لکھا۔

"بھائی صاحب۔ آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں۔ اظہار غم۔ تلقین صبر۔ دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے۔ ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بیدردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت میں کیا۔ اور میری دعا کیا۔"

نواب علاء الدین احمد خاں کو اون کے ایک نوزائیدہ بچہ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"سبحان اللہ میں نے اوس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یا ولادت کی تاریخ سُنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔"

بعض جگہ تفنن طبع کے طریقہ پر مرزا بعض اشعار یا کسی عبارت کے الفاظ میں تصرف و تغیر کر کے وہ لطف پیدا کرتے ہیں کہ خود ان کی طبعی ظرافت معلوم ہوتی ہے۔

میر حسن نے اوس وقت جبکہ بے نظیر قید ہو گیا ہے۔ اوس کی زبان سے یہ شعر بدر منیر کے فراق میں کہلایا

ہے ؎

میں بھولا نہیں تجھکو ای میر جاں کروں کیا کہ ہے مجھ پہ قید گراں "

مرزا برسات کی مصیبت میں یہ شعر میر مہدی کو بہ تبدیل الفاظ یوں لکھتے ہیں ؎

" میں بھولا نہیں تجھ کو ای میر جان کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں "

میر تقی میر کا یہ مشہور شعر ہے جو ان کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

مرزا نے اس کو میرن صاحب کی تعریف میں یوں بنا دیا ؎

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

جیسا کہ ایک جگہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کی اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں سے کچھ صفائی نہ تھی۔ ایک مرتبہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کسی طرح یہ شکر رنجی دفع ہو گئی تو مرزا صاحب نے علائی کو حافظ کے یہ شعر یوں لکھے:-

شکر ایزد کہ میان من و او صلح افتاد حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

بہ تغیر الفاظ۔

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح افتاد حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

قدسیاں بہر دعاے تو و والا پدرت قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

قائم چاند پوری کا ایک شعر ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

اسکو بتغیر الفاظ خواجہ غلام غوث کے پاس یوں لکھ کر بھیجا۔

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے روٹھا جو بیگناہ تو بے عذر من گیا "

تمسخر کی تعریف یہ ہے کہ وہ پھکڑ اور فواحش کی حدود سے جا ملے۔ مگر علی الرغم اس تعریف کے مرزا نے تمسخر میں ایک قسم کی متانت کو جگہ دی ہے۔ میر کاظم علی کو سب میر حسن فضلو فضلو کہتے تھے۔ مرزا صاحب پاس ادب و احترام علی رکھتے تھے کہ فضلو کے پہلے بھائی ضرور کہتے۔ مگر از راہ تمسخر اون کو احتلام الدولہ کا خطاب بھی دیدیا تھا۔ اور ہمیشہ اُن کو بنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاید انھوں نے کوئی کتاب مرزا سے مانگی۔ مرزا صاحب نے یوسف مرزا

کو جواب میں لکھا۔

"احتشام الدولہ بھائی فضلو میر کاظم علی بہادر کیا جانے کتاب کس کو کہتے ہیں اور آگرہ کے ہتھیار کا نام اور سکندر شاہ کون سے درخت کا پھل ہے۔ میرا اردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لیگئے۔ مصطفےٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں رسید اوس کی آگئی۔ نہ برہان قاطع نہ قاطع برہان"

مرزا علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"پیرجی سے جب پوچھتا ہوں تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں کیا کہنا ہے۔ اور میں پوچھتا ہوں کس کا تو وہ فرماتے ہیں مرزا اشمشاد علی کا۔ ایں۔ اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے۔ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں یہ سر اسکہ موجود ہے۔ واہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منھ دیکھی کہوں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب۔ غائب کی تعریف کرنا کیا عیب ہے۔ ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں اس میں کیا ریب ہے"

ارمان و تمنا خاصہ انسانی ہے۔ مرزا بھی اس سے خالی نہیں۔ ذوالفقار الدین حیدر عرف حسین مرزا کو لکھتے ہیں۔

"ابراہیم علی خاں الور میں مستحق ہو کر مر گئے۔ خدا ان کو بخشے اور مجھکو بھی یہ دن نصیب کرے"

مرزا نے واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا تھا۔ اوسی کی بابت یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"مرتضےٰ علی پہلے سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہ اودہ سے ہاتھ آئے حصہ برابر نہ کروں نصف حسین مرزا اور تم اور سجاد۔ نصف میں۔ مفلسوں کا مدار حیات خیالات پر ہے۔ مگر اوسی خیالات سے جس طبیعت معلوم ہوجاتا ہے۔"

صاحب عالم مارہروی ہمیشہ مرزا کے ملنے کی امید لگائے رہتے تھے۔ اور مرزا یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کیوں ایسا اتفاق ہوگا۔ اور کیوں ملاقات ہوگی اسی باب میں چودہری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں۔

"مخدوم مکرم و مطاع معظم قبلہ دیدہ و دل کہ جو میرے اور اپنے ملنے کو از قسم فرض محال نہیں مانتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ جیسا وہ جانتے ہیں۔ تقصیر معاف ہو۔ اگر دنیا میں ظہور ہر امر بحسب مساعدت اسباب ہے تو اس تمنا کا حصول مانند اعادۂ شباب ہے۔ کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے وہاں آنے کی۔ اگرچہ حیز امکان سے باہر نہیں۔ مگر وقوع میں تامل ہے۔"

مرزا جب کسی بات کی توجیہ کرتے ہیں تو حد درجہ ظرافت آمیز متانت کے ساتھ۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے رنگین عبارت میں مرزا کو لکھا کہ شاید میرا کلام دیکھنے سے آپ کو زحمت ہوتی ہے۔ اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ مرزا نے جواباً لکھا۔

"یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اور اب اُس کے دونوں بچے کہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آ رہتے ہیں اور دق کرتے ہیں۔ اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمھارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھکو کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھے دوپہر کو سونے نہیں دیتے ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لنڈھاتے ہیں۔ کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا تو اُن معنوی پوتوں سے کہ اون میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ کیوں گھبراؤں گا۔"

مرزا تفتہ کو ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تمھارا کلام پختگی کو پہونچ گیا ہے۔ اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔"

۱۸۵۹ء میں دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی مجروح اوس وقت تک پانی پت ہی میں تھے۔ مرزا سے انہوں نے وبا کا حال دریافت کیا۔ مرزا نے جواب دیا کہ وبا یہاں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی۔

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے۔ یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا۔ تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی تف بریں وبا۔"

میر مہدی نے آشوب چشم کی شکایت لکھی۔ مرزا نے جواب میں یہ توجیہ کی۔

"تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے۔ اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اوڑی۔ اُس کو آپ نے از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔"

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ مرزا نے اپنے مرنے کی تاریخ اپنی زندگی ہی میں کہہ لی تھی۔ جس کی رو سے ۱۲۷۷ھ میں نکلتے تھے۔ ۱۲۷۷ھ میں دہلی میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ میر مہدی مجروح نے مرزا کو لکھا کہ کہئے اب تو یہ سال بخیر گزر گیا۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں لکھا کہ

"میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"

چونکہ مرزا کی اس تاریخ وفات کی شہرت ہو چکی تھی اور آپ نے سب احباب کو اس سے مطلع کر دیا تھا اس لئے

قاضی عبدالجمیل صاحب نے بھی دریافت کیا۔ آپ نے اون کو جواب میں یہ لکھا۔

"۱۲۷۷ھ میں میرا مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے۔ جیسے طائر قفس میں کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ خرم آنکہ ازیں منزل ویراں بردم"

جس زمانے میں مرزا نے برہان قاطع کا جواب دیا اور قاطع برہان لکھی تو بعض ادا ناشناسوں نے برہان قاطع کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ اور کہا کہ یہ ترکیب صحیح نہیں ہے۔ مرزا نے جواب دیا۔

"برہان قاطع و قاطع برہان کی ایک نمط ہے۔ برہان قاطع نے کیا انھا نینوئین سکھ قطع کیا ہے۔ جو آپ نے اُس کو قاطع لقب دیا ہے۔"

عضد الدولہ حکیم غلام نجف کے صاحبزادے ظہیر الدین عوارض فساد خون وغیرہ میں مبتلا ہوئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو لکھا۔ کہ

"یہ جو تم پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مجھ میں تمھارا لہو ملتا ہے۔ اور میں احتراق خون کا پتلا ہوں۔"

مولوی احمد حسن قنوجی کو مفتی صدر الدین خاں آرزدہ کا حال لکھتے ہیں۔

"لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جاداد واگزاشت کی۔ اب نصف جاداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ آمدان۔ کے گزارے بھر کی نہیں ہے۔ اسواسطے کہ ایک آپ ایک بی بی۔ تیس چالیس۔ روپیہ مہینہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش جیراسی کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بال سے نہیں گزرتی۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے دلی کا حال پوچھا۔ اور مرزا سے وہاں کی لوٹ مار کی کیفیت دریافت کی۔ مرزا نے جواباً لکھا

"جناب مرزا صاحب دلی کا حال تو یہ ہے ؎

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے۔ جو کوئی لوٹیگا۔ یہ خبر محض غلط ہے۔"

مرزا نے مسہل لیا۔ نواب انور الدولہ شفق نے خط بھیج کر دریافت کیا کہ کیا حال ہے۔ مرزا نے جواب میں لکھا

"آپ کا بندۂ بے درم خرید اچھی طرح ہے۔ ایک فصد ۲۲ منفضج ۴ مسہل کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کریں۔ بارے آفتاب عقرب میں آگیا۔ پانی برفاب ہوگیا۔ کابل و کشمیر کا میوہ بکنے

لگا۔ یہ ضعف قسمت تو نہیں کہ ایسے ایسے امور اوس کو زائل نہ کر سکیں۔،،

مرزا نے ایک قصیدہ بادشاہ اودھ امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا۔ ہنوز یہ قصیدہ نظر سے نہ گزرا تھا۔ کہ شاہ موصوف نے رحلت کی اور ان کے بجائے واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ مرزا نے اوس قصیدے ردّوبدل کرکے واجد علی شاہ کا نام ڈال دیا۔ یہی واقعہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرانا تھا۔ میں نے اسی قصیدہ میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے۔،،

تہنیت یا مبارکباد دونوں ایسی چیزیں ہیں۔ جنکے ادا کرنے میں ہر شخص جوش مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ مگر جب اُس کے ساتھ خوش طبعی۔ مذاق۔ اور ظرافت کے پہلو شامل ہوجاتے ہیں تو پھر وہ بہت ہی بلند چیز ہوجاتی ہے۔ مرزا کے یہاں تمام مبارکباد اور تہنیتوں میں یہ رنگ غالب ہے اور کثرت سے۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو عہدۂ وکالت کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صاحب میرے عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجئے پریوں کو تسخیر کیا کیجئے،،

نواب علاءالدین احمد خاں کے لڑکا پیدا ہوا۔ مرزا اوس کی مبارکباد دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"میری جان نئے مہمان کا قدم تم پر مُبارک ہو۔ اللہ تعالےٰ تمھاری اور اس کی اور اُس کے بھائیوں کی عمر میں برکت دے۔ تمھاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اوس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو کہ احتمال رفع ہو۔،،

انہیں نواب علاءالدین احمد خاں نے شاید پنشن کے دوبارہ ہونے یا اور کسی بات پر مرزا کو مبارکباد دی تو مرزا نے جواباً انہیں لکھا۔ اور دو چھوٹے تلے فقروں میں شکریہ بھی ادا کردیا اور اُلٹی انھیں کو مبارکباد دیدی۔

"خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مُبارک اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب للہ الحمد۔ للہ الشکر۔،،

کہیں مرزا صاحب نے نواب علاءالدین احمد خاں کا نسیمی تخلص رکھا تھا۔ اور اسی تخلص سے اکثر ان کو نظم میں مخاطب کرتے تھے۔ مثلاً

ہاں نسیمی زمن چہ میخواہی

یا غمدیدہ نسیمی

نواب صاحب نے پہلے یہ تخلص منظور کر لیا۔ مگر پھر نہ معلوم کسی نے کان بھر دئے یا خود خیال آیا کیا ہوا کہ یہ تخلص نواب موصوف کو برا معلوم ہوا۔ مرزا کو لکھا کہ تخلص دوسرا تجویز فرمائیے۔ نسیمی کی تصحیف تو یشمی ہو سکتی ہے۔ مرزا کب بند رہنے والے تھے۔ خط پڑھا۔ اور جواب لکھا۔ ایک ایک کی دس دس سنائیں۔

"میری جان تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میری پسند ہے۔ یشمی کو بہ تکلف اوس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ۔ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی خے کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بہ تقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا تخلص ہے۔ رہزو اس کی تجنیس موجود ہے۔ شیون ایک اچھا تخلص ہے۔ ستون اس کی تصحیف ہے۔ تمھارے واسطے بہ مناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں نامی سامی یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا فایق کی پیروی کرو۔ مولانا لایق کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس کی ترکیب سے لفظ نالایق پیدا ہوتا ہے۔ شایق بنجاؤ۔ ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ نسیمی تخلص خماسی۔ بروزن ظہوری و نظیری اگر بدلنا منظور ہے تو نامی۔ سامی۔ رہرو۔ شیون۔ یہ تخلص بروزن عرفی و غالب اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ فخری تخلص بہتر ہے۔ مگر کہو گے کہ آزادپور کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے۔"

مرزا کا حساب بھی دنیائے ریاضی سے الگ ہو کر مرکز ادب میں آ ٹھہرا ہے۔ اور اسی واسطے وہ حساب حساب نہیں ہے۔ بلکہ ظرافت کا سرمایہ دار اور خوش طبعی کا حق گزار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ علم ریاضی انتہا درجے کا خشک ہے۔ اور غالباً یہ صحیح بھی ہے۔ مگر مرزا کے یہاں یہ کلیۃً باطل اور یہ دعوے لاطایل ہو جاتا ہے مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"بندہ پرور راؤ صاحب نے پہلی بار تو مجھکو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں۔ سو سو روپیہ کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں۔ اور ایک اپنی طرف سے مجھکو بطریق نذر شاگردی بعد اس کے دو دو ہنڈیاں سو سو روپیہ کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے روپیوں کی چار سو اور اس سے علاوہ تین سو۔ کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالہ ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس میں۔ اور اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔"

پنشن ملنے کے بعد میر مہدی کو لکھتے ہیں۔ اور حساب بتاتے ہیں۔

"مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اوس کا قرضدار ہوں۔ روپیہ اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا۔ سُود مول سات کم پندرہ سو ہوئے۔ میں نے کہا میرے قرضۂ متوفق کا حساب کرو۔ کچھ اوپر گیارہ سو نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو بانٹ دے۔ نو سو بچے آدھے تو لے آدھے مجھے۔ وہ کہتا ہے سات کم پندرہ سو مجھے دو۔ پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئیگا۔ خوانہ سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار وگیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللہی ہے۔"

حکیم سید احمد حسین مودودی کو لکھتے ہیں۔ کہ

"نوٹ عطیۂ سید صاحب آپ کے خط میں پہنچا روپیہ وصول ہوا معاً خرچ ہوا"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو بارہ روپیہ بھیجے کہ دستنبو یا پنج آہنگ کی دو لوحیں زریں اور پانچ لوحیں سیاہ قلم کی بنوا کر بھیجدیجئے۔ اونہوں نے نہایت تکلف سے جلدیں بنوا کر بھیجیں۔ مرزا کو بڑا تعجب ہوا کہ بارہ روپیہ تو اجرت جلدبندی کے لئے کافی ہوئے نہوں گے۔ پھر یہ کیا ہوا۔ اسی تعجب کی بنا پر مرزا صاحب کو لکھا۔

"حیران ہوں کہ آیا شمار آئمہ نے اُن بارہ روپیوں میں برکت دی یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا"

حُسن طلب شاعروں ادیبوں اور ظریفوں کا حصّہ ہے۔ پھر آپ خود ہی خیال کر سکتے ہیں۔ کہ جس شخص میں یہ تینوں صفات جمع ہوں۔ اوس کے حُسن طلب کا کیا درجہ ہوگا۔

مرزا کے یہاں حسن طلب کے مختلف پہلو ہیں۔ یہی نہیں ہے کہ وہ ضرورت دنیوی کے لئے امرا اور رؤسا کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔ یا اپنی ضرورت کے موافق لطایف وظرایف تراشتے ہیں۔ بلکہ ادنےٰ ادنےٰ باتوں کے لئے مثلاً جواب خط کے لئے یا اور ایسی ہی باتوں کے لئے بھی وہ کہیں کہیں اوسی نشتر سے کام لیتے ہیں جس کی کسی بڑی جگہ ضرورت ہوتی ۱۸۶۶ء میں نواب میر غلام بابا خاں سورتی کے یہاں کوئی تقریب تھی سیف الحق سیّاح نے جو نواب صاحب کے مصاحب اور مرزا کے شاگرد تھے۔ مرزا کو اطلاع دی۔ اور جشن کی کیفیت لکھی۔ مرزا صاحب نے نواب صاحب کو لکھا۔

"میاں سیف الحق کا خط پہنچا۔ خط کیا تھا۔ خوان دعوت تھا۔ میں نے کھانے بھی کھائے۔ میوے بھی کھائے۔ ناچ بھی دیکھا۔ گانا بھی سُنا۔ خدا تم کو سلامت رکھے کہ اس نالایق درویش گوشہ نشین پر اتنی عنایت کرتے ہوئے"

انھیں کو یوں لکھتے ہیں۔

"سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں۔ مبارک ہو اور مبارک ہو۔ نظارۂ بزم جمشیدی سے محروم رہوں گا۔ مگر میرا حصہ مجھ کو پہونچ رہے گا خاطر جمع ہے۔"

پہلے خط کی بابت شاید نواب صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ یہ ناچ دیکھنا گانا سننا۔ مرزا صاحب کا حسن طلب کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے سیف الحق سے ذکر کیا۔ سیف الحق نے مرزا کو لکھا کہ نواب صاحب کا یہ خیال ہے۔ مرزا صاحب نے سیف الحق کو جواب دیا۔

"اجی وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی کی ایک بات لکھی تھی۔ دوستانہ اختلاط تھا بھئی بہرا ہوں گانا کیا سنوں گا۔ بوڑھا ہوں ناچ کیا دیکھوں گا۔ غذا بھی ماشہ آتا کھانا کب کھاؤں۔ بمبئی و سورت میں شرابیں اچھی ہوتی ہیں۔ اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"بھائی یہ تمھارا دعاگو اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔"

اور ایک جگہ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"حسن اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شال ڈھائی گز دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لیکر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔"

مرزا تفتہ ۱۸۵۸ء میں آگرے میں مقیم تھے۔ اور وہیں منشی شیو نرائن کے اہتمام سے مرزا صاحب کی کتاب پنج آہنگ چھپ رہی تھی۔ مرزا صاحب نے صحافی کا کام مرزا مہر کی سپرد کر دیا تھا۔ انھوں نے جلدیں بندھوائیں اور مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ کتابیں تیار ہیں۔ مرزا صاحب نے تفتہ کو لکھا کہ

"جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہئے اور یہ پیام کہئے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آگیا مگر آنکھوں کو رشک ہے۔ کانوں کا اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں۔ آنکھوں پر یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب ملے گا۔"

. . . .

. . . .

مرزا حاتم علی مہر آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ مگر مرزا سے دید وا دید نہیں ہے۔ نہ راہ و رسم ہے۔ مرزا رسم دوستی کے آغاز کے واسطے یوں پرداز ڈالتے ہیں۔ اور غالباً پہلا خط لکھتے ہیں۔

"علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں

کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے۔ مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اُس کے اجارے میں
آئی ہے یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دیدوادید نہو لے اپنے کو بیگانہ یک دیگر
سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں۔''

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔

'' قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے۔ کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے۔
اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ اور یہ پنشن
کا احاطۂ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سو ان کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب
مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔''

مرزا شمشاد علی بیگ رضوان پر جواب خط کے لئے ان الفاظ میں تقاضہ کرتے ہیں۔

'' خط کی آمد و شد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا دسویں دن اگر تمھارا خط نہ آیا تو میں تمھارا رافضی
بن جاؤں گا۔''

منشی شیونرائن سے کتابوں کے لئے مصر ہوتے ہیں۔

'' صاحب کتابیں کب روانہ ہوں گی - روانی بھی ہوئی۔ اگر آگرہ جانے کا قصد ہے تو بھائی میری
کتابیں بھیج کر جانا۔''

نواب مرزا علاء الدین خاں کو شوخی محض کی راہ سے لکھتے ہیں۔

'' جو قاطع برہان تمھارے پاس پہونچی ہے۔ اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ
ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔
اوس کو میری تالیف نہ سمجھو۔ بلکہ مجھکو مول لے لو۔''

میر احمد حسین میکش کو لکھتے ہیں۔

'' بھائی میکش آفریں ہزار آفریں تاریخ نے مزا دیا خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے
جنکی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ تاریخ دیکھی اوس کی تعریف کی۔ خرمے
کھائیں گے۔ اوس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمھارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب
ہے۔ کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرمے لیکر
آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرض محال تم یونہی عمل میں لاؤ گے۔ اور میاں
دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے۔ تو ہم کہیں گے۔ تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔''

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔ اور ان کی زبانی دوسرے کو ایک پیام پہنچاتے ہیں۔

"چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبدالطیف کو کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمھارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں۔ تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیے سنتا ہوں کہ چھاپے کے حرفوں پر سیاہی کے قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حروف روشن ہو جائیں سیاہ جلد بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی صناعی اور ہوشیاری آخر میرے کس دن کام آئے گی۔"

حزن و مسرت خاصۂ مخلوق ہیں۔ کبھی اوس کو ایک بات شگفتہ کردیتی ہے اور کبھی وہ مُرجھائی ہوئی کلیوں کی طرح دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ خوشی ایک ایسی چیز ہے جو ظرافت کی تلوار کا جوہر بنجاتی اور اُس کو معمول سے زیادہ چمکاتی ہے۔ خصوصیت سے اوس ظریف کے یہاں جس کی عام باتیں بھی ظرافت کی گل افشانیوں سے خالی نہوں۔ پھر مرزا کی خوشی کے الفاظ کا کیا پوچھنا ہے میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی۔ اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ ستر ہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ؎

کسے کیں مُرادش میسر بود	اگر جم نباشد سکندر بود

ایک گنہگار جب خدا کے غضب سے ڈرتا ہے۔ ایک عاصی بدکردار جب اپنے کئے پر پچھتاتا ہے تو رحمت اُس کے لئے آمادہ اور مغفرت کے دروازے اُس کے لئے کشادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ کہ مجرم کا ضمیر اُس کو ملامت نہ کرے۔ اور کسی تباہ کار عصیاں کا دل کبھی ایک لحظہ کے لئے خوف خدا سے لرز نہ جائے۔ مرزا کا یہی بڑا کمال ہے۔ کہ وہ اس عالم بیم میں بھی رجا کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اور روتے ہوئے بھی ان کے لبوں سے تبسم کی صورت عیاں ہوتی ہے۔

"رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادراہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے۔ اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاویدی اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے	مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔ نجات کا طالب غالب۔ ،،

مرزا آلام و اسقام کے ہاتھوں اتنے پریشان تھے۔ کہ زندگی ہی میں اپنے آپ کو مُردہ تصور کرتے تھے۔ اوس خیال کا بارہا اعادہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا ،،

اب تو خیر مگر پہلے زمانہ میں یہ رسم تھی کہ کاتب القاب لکھتا۔ القاب کے بعد آداب۔ اسی آداب میں سلام ہوتا تھا۔ اور جب خط کو ختم کرتا تو چھوٹے بڑوں کو دعا و سلام سے یاد کرتا۔ مرزا بھی اُسی زمانہ کے لوگوں میں سے تھے۔ وہ بھی آخر خط میں سختی کے ساتھ اس رسم کی پابندی کرتے تھے اور اپنے ملاقاتیوں کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ سلام و دعا برابر ان کے خط میں ہوتی تھی۔ مگر سلام میں طرح طرح کی ندرتیں اور ظرافتیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سلام کے مراتب اون کے یہاں اس طریقہ سے مقرر تھے۔ کہ اوس شخص کے مرتبہ سے جسکو سلام لکھنا ہوتا۔ سر مو نہ تجاوز کرتے تھے۔ اور نہ کمی۔ ہر کام قرینے سے ہر بات ٹھکانے کی ہوتی تھی

میرزا تفتہ کے ایک خط میں منشی بھگوان پرشاد کو یوں سلام لکھتے ہیں۔

" وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں یعنی منشی بھگوان پرشاد مثل خوان میرا سلام قبول کریں۔ ،،

شاہ عالم کے خط میں اون کے والد کو سلام لکھتے ہیں۔

" اور اپنے والد ماجد یعنی میرے مرشد ہم عمر و ہم فن کو وہ سلام جس سے محبت ٹپکے اور اشتیاق برسے ،،

یوسف مرزا کے خط میں اون کے ماموں کو سلام لکھا ہے۔

" اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میرا سلام باعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سیادت کے۔ ،،

باقر علی اور حسین علی اپنی دادی کے ساتھ ضیاءالدین خاں کی والدہ کے پاس قطب گئے ہوے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی اون کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں۔ اور ایک دعا۔ اور دو آداب ملتوی۔ ددا اور کلو اور کلیان کی بندگیاں پہونچیں۔ ،،

مرزا علاءالدین احمد خاں کے خط میں لکھتے ہیں۔

" استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اون کی چچی تھیں اور مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی۔ اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود۔ اور موافق اس مصرع کے سے ہمہ اللہ و اللہ باقی الوجود سجود۔ ،،

مرزا علاءالدین احمد خاں کے خط میں انہیں میر جان کی نسبت لکھتے ہیں

"استاد میر جان صاحب کو قدمبوس کہکر مجکو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام بلکہ دعا اون کو کہدینا۔"

انہیں نواب علاءالدین خاں کے خط میں نواب امین الدین خاں کو سلام لکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

"بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی و تاب گویائی سلام"

اگر مرزا کے بیان کو بے کم و کاست صحیح مان لیا جائے تو پھر اس میں کوئی شک ہی نہیں رہتا کہ وہ بڑے بدنصیب تھے مگر اون کے بیان میں شاعری۔ مبالغہ۔ بلکہ غلو۔ اور ظرافت اس طرح مل گئے ہیں کسی کو تہ تک پہونچنا آسان نہیں ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اوائل عمر ہی سے وہ مصائب کا شکار ضرور رہے۔ اور بڑھاپے میں خصوصاً غدر کے بعد وہ مصائب جو ایک وقت میں وہ بطریق تفنن طبع لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے آخر میں اُن کے حال پر صادق آنے لگے۔ باقی ابتدائی قصوں میں کچھ نہ کچھ مبالغہ اور شاعری ضرور شامل ہے۔ جب وہ اس داستان سوختہ بختی کو بیان کرتے ہیں تو سننے والے کو وہ لطف آتا ہے کہ محو حیرت ہو جاتا ہے

صاحب عالم مارہروی نے لکھا تھا کہ حیدر آباد کے نظام کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھیے کچھ نہ کچھ نفع ہوگا اوسکے جواب میں فرماتے ہیں۔

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اوسکی جائداد کی عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اونھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال۔ اون میں خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال تھا میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوگئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مرگئے۔ بعد ایک مدت کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مقرر کیا۔ اون کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچسو روپیہ مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنے اگرچہ ابتک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجکو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والئی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش

اُسکی ضائع جائے گی۔ اور والی شہر مجھکو کچھ نہ دے گا اور اگر احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائیگی ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے ۔،،

نواب علاء الدین احمد خاں نے دوسرے لڑکے کے پیدا ہونے پر مرزا سے تاریخ پیدائش نظم کرنے کی درخواست کی مرزا نے عذر بھی کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی سوختہ اختری کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمایا

"علاء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میر امدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے پرے پہونچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالےٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے"

انہیں کے ایک خط کے القاب میں یہ قصہ چھیڑ دیتے ہیں

"میری جان ناسازی روزگار۔ بیربطی اطوار و بطریق داغ بالائے داغ آرزوے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپیدا کنار۔ وقنا ربنا عذاب النار۔،،

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں

"جو شو بابو صاحب سے منگوائے تھے وہ صرف بابو صاحب کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہماری مذہب میں حرام اور تمھارے مذہب مشرب میں حلال ہے سو وہ دے گئے،،

میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا قوام پتلا دیکھو اس لغت کے معنے کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے ہاں فرہنگ سرور میں ہوں تو ہوں،،

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔ اور کس حسرت سے لکھتے ہیں۔

"جناب عالی آج دوشنبہ ۲ جنوری ۱۸۵۹ء ہے پہر دن چڑھا ہو گا کہ ابر گھر رہا ہے ترشح ہو رہا ہے ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے سہ

افق ہا پر از ابر بہمن مہی سفالینہ جام من از مے تہی،،

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے

رکھتا تھا اب میسّر نہیں،،

مرزا علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں

،، التوائے شرب شراب ۲۲ جون - شروع شراب ۱۰ جولائی،،

مولوی عبد الغفور سرور کو لکھتے ہیں

،، بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے - کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں -،،

مرزا چونکہ تہذیب و متانت مجسم تھے اس واسطے وہ تمام محاسن جنکی وجہ سے اخلاق کا نام اخلاق ہے ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے - خدا کے کفران نعمت سے تو دور رہتے ہی، اپنے دوستوں کا بھی وہ تہ دل سے شکریہ ادا کرکے احسان کا بدلہ دیتے تھے - مگر بالکل نئے انداز سے -

نواب میر غلام بابا جان نے کچھ بھیجا - ان کو جواب میں لکھا

،، عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہونچا - اور میں نے اوس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا علی مرتضےٰ علیہ التحیتہ والثنا آپ کا دادا میرا آقا - خدا کا احسان ہے میں احسانمند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا -،،

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں -

،، تیسری تاریخ فروری کی ڈیڑھ پہر باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط معہ رجسٹری لایا - خط کھولا سو روپیہ کی ہنڈوی بل جو چھ کئے وہ ملا - ایک آدمی رسید مہری لیکر نیل کے کٹرے چلا گیا - سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس - چوبیس روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے گئے - پچاس روپیہ محل میں بھیجدیے گئے - چھبیس روپیہ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لئے خدا تم کو جیتا رکھے - اور اجر دے - بھائی بُری آبنی ہے انجام اچھا نظر نہیں آتا،،

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں - اور ان کے خط میں میر سرفراز حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں -

،، شام ہوئی چراغ روشن ہوا - منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں - میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودماں یقین سید نصیر الدین ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ میں - اوس کے سر پر ایک ٹوکرا اوپر گھاس ہری بچھی ہوئی - میں نے کہا اہا ہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے یاں سے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے شراب نہیں آم ہیں - خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے - بلکہ نعم البدل ہے - ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا بادۂ انگوری سے بھرا ہوا مگر وہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ بیٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے میں نے کہا بھائی یہ کیا کم ہے مگر میں تمہاری تکلیف اور تکلف

سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں جو تم نے آم خریدے۔ خانہ آباد دولت زیادہ ،،

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں اور اُسی رنگ میں شکر خدا اور شکریہ صاحب موصوف بجالاتے ہیں۔

"پیر و مرشد اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیونکر بجالاؤں خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو اپنے خاصان درگاہ سے بھلا کہواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی۔ کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ رہا اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمائیے گا ورنہ بندہ دعوئے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا۔ ،،

منشی شیو نرائن نے مرزا کے لئے تحفتاً لفافے بھیجنے کو لکھا کہ جلد بھیجوں گا۔ مرزا نے جواباً لکھا

"صاحب خط پہونچا۔ لفافہ پہونچا۔ لفافوں کی خبر پہونچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہونچ جائیں گے۔ ہم آپ کا شکر بجالائینگے بہرچہ از دوست میرسد نکوست"

مرزا کا شکوہ ملاحظہ ہو:-

سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں۔ اور ان کے شکوۂ بیجا کا اپنے تہدید و شوخی آمیز شکوے سے جواب دیتے ہیں۔ وہ برابر خط نہ پہونچنے کی شکایتیں لکھا کرتے تھے۔ اور مرزا کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ کسی کے خط کا جواب روکتے لکھتے ہیں

"صاحب یہ پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمھارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا۔ اور میرا کوئی خط تم کو نہیں پہونچتا،،

سیف الحق سیاح نے ایک مرتبہ کسی کتاب کی قیمت کے لئے پانچ روپیہ کے ٹکٹ بھیجدیئے۔ مرزا نے خفا ہو کر لکھا

"صاحب یہ تم نے پانچ روپیہ کے ٹکٹ کیوں بھیجے ہیں نہ کتاب فروش نہ دلال یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ ،،

ایک مرتبہ مرزا تفتہ کا خط پہونچنے میں دیر ہوئی۔ مرزا نے لکھا

"کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا اگر یہ حکم ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا۔ کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے بہرحال کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم۔ ،،

ایکمرتبہ مرزا نے ایک خط جوابی مرزا تفتہ کو لکھا۔ شاید تفتہ نے یہ شکایت کی کہ آپ نے جوابی خط کیوں لکھا۔ مرزا نے جواب دیا۔

"کیوں صاحب یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا۔ اور وہ بھی دلی سے سکندرآباد کو آیا حاتم کے اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا۔ کیا ہنسی آتی ہے تمھاری باتوں پر۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے ،،

ایک مرتبہ تفتہ کو لکھا۔

"منشی ہر گوپال صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم تو آپ کو سکندرآباد قانونگویوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں۔ اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مداریہ کا حقہ پی رہے ہیں اور منشی نولکشور سے باتیں کر رہے ہیں"

ایک مرتبہ مرزا تفتہ کو لکھا

"کیوں مہاراج کول (ضلع علیگڈھ) میں آنا اور جناب منشی نبی بخش کے ساتھ غزلخوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا۔ کہ تم کو مجھ کو بھول گئے کول میں آئے اور مجکو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی نہ لکھا کہ میں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر جو میں نے بیحیائی کر کے تم کو خط لکھا ہے لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو۔ اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو"

شاہزادہ بشیر الدین نے خط کا جواب نہ دیا تو لکھا

"حضرت پیر و مرشد برحق سلامت۔ تقصیر معاف۔ میں مُدعی۔ اور آپ مدعا علیہ بھی۔ اور حاکم بھی۔ وجہ استغاثہ یہ کہ آپ نے مجھے حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا عرایض جواب طلب کا جواب نہیں دیا۔"

صاحب عالم مارہروی کا خط کچھ ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ مرزا اُس کے پڑھنے سے عاجز تھے اسی لئے لکھ دیا تھا کہ جب آپ مجھکو خط لکھیے چودھری عبد الغفور صاحب سے لکھوا لیجئے۔ مگر انہوں نے خود ہی خط لکھا مرزا نے چودھری صاحب کو لکھا۔

"آگے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ جو کچھ لکھیں بقلم چودھری صاحب لکھا جائے حضرت نے نہ مانا اور پھر عبارت بہ دستخط خاص لکھی۔"

میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مرزا کو خط لکھا ہے اور خط میں تمام میرن صاحب کا جھگڑا ابھر دیا ہے۔ مرزا اس پر ستم ظریفی کرتے اور لکھتے ہیں

"سنو میاں سرفراز حسین۔ ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا وہ بھی اس طرح کا کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے ؎ بہ غیر در شکر آب است ور نہ مادارد۔ پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے مجھکو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یارب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تحریر میں القاب میرا۔ پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سیر ہے۔ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں۔ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لئے سلام تک نہ ہوگا تو میں اُس کا جواب آنکھوں سے لکھونگا۔"

ایک مرتبہ صاحب عالم اور چودھری صاحب مارہروی کے خط میں دیر ہوئی۔ مرزا نے شاہ عالم صاحب کو شکایتاً لکھا

"ہمارے حضرت ہمکو بھول گئے۔ ہاں سچ ہے ادن کا لطف چودھری عبد الغفور صاحب کے جوہر محبت کا عرض تھا

جب جوہر نہ رہا تو عرض کہاں ‘‘

ایک مرتبہ صاحب عالم کے خط میں چودھری عبدالغفور صاحب کی بابت لکھا

’’خورشید عالم کو سلام۔ چودھری صاحب کو نہ سلام نہ نیاز۔ صرف یہ پیام کہ ہم تمھارے خط کو مفرح روح سمجھتے تھے وہ وظیفہ روحانی منقطع کیوں ہوا ‘‘

ظہیر الدین کو ان کے باپ حکیم غلام نجف خاں کے خط میں لکھتے ہیں۔

’’کیوں ظہیر الدین کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھکو الگ لکھتا۔ یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے اپنی بندگی لکھتا۔ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے تیری بندگی لکھدی تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی ‘‘

ایک خط میں حکیم نجف خاں کو میاں فضل حسن کی شکایت اس طرح لکھتے ہیں

’’ہائے قسمت اس قسمت پر لعنت میاں فضل حسین میرے مربی و محسن نہیں اور پھر وائے محرومی کہ مطلب برآری نہ ہو خدا کرے نہ ہو لونڈوں کا احسان زہر قاتل ہے ‘‘

مرزا چونکہ اپنا کلام خود جمع نہ کرتے تھے بلکہ ان کے بعض شاگرد مثلاً ضیاء الدین احمد خاں وغیرہ لکھ لیتے تھے اس لئے جب دیوان کے چھپنے کی نوبت آئی تو ادھر ادھر سے مانگنا پڑا۔ مگر بعض جگہ سے انکار ہو گیا تو مرزا صاحب کو سخت کوششیں کرنی پڑیں چنانچہ اسی بارہ میں تفضل حسین کو لکھتے ہیں

’’کیوں صاحب یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار یا سو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سودہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو تم کو مبارک رہے۔ مجھکو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں۔ جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو واپس بھیجدوں اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل ہے اس کی کہ مجھکو جھوٹا جانتے ہو میرا اعتبار نہیں۔ یا یہ کہ میرا ستانا اور مجھکو آزار دینا بدل منظور ہے وہ کتاب اس میرے آدمی کو دیدو ‘‘

مرزا حاتم علی مہر کے خط پہونچنے میں دیر ہو جانے کا یوں شکوہ کرتے ہیں

’’یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں تم مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد بیس دن بعد اگر میرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں میں بھی شادہ ہوں اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے بھی خیال میں آتا کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابل سماعت کے ہو میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو ‘‘

مرزا مہر کو شکوہ کی تعریف لکھتے ہیں اور شکوہ کا طریقہ بتاتے ہیں

’’خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است۔ آید بزبان ہر انچہ از دل بردد۔ بندہ پرور فقیر شکوہ سے برا نہیں مانتا۔ مگر

شکوہ کے فن کو میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منھ نہ موڑے منھ اور دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے"

مرزا سے کسی نے کہا کہ خواجہ غلام غوث بے خبر ۔۔ کی قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ یوں تو بیسیوں آدمیوں نے جواب لکھا تھا۔ مگر چونکہ خواجہ صاحب مرزا کے دوست تھے اس واسطے رنج ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ انہوں نے شکوہ کیا۔ خواجہ صاحب ایک وضعدار آدمی تھے اون کو بڑا صدمہ ہوا اور مرزا سے اس بدگمانی کی شکایت کی۔ مرزا نے جواب میں لکھا کہ

"میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں ۔ یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے یوں سنا مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا۔ جھگڑا استعجاب پر ہے محل استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیا کا یہ حال ہے۔ وائے برحال ہم اشقیا کے۔ یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیا داری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں۔ لیکن فقر آزاد ہوں۔ نہ شیاد کیاد .... میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں

نگہم نقب ہمی زد بہ نہانخانۂ دل ۔ مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم"

نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں

"حضرت کیوں آپ نے مراسلے اور میرے مکتوب کا حال پوچھا ہاں ہم کہ جواب نہ نویسند جواب است۔ سمجھ لو اور چپ ہو رہو"

منشی شیو نرائن کو کئی خط لکھے جواب نہ آیا تو یہ لکھا

"کیوں میری جان تم نے خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔ یا لکھنا ہی بھول گئے۔ ہو شہر میں ہو یا نہیں"

نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں

"میری جان کیا کہتے ہو کیا چاہتے ہو۔ ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سبحہ و سجادہ کا یہاں پتہ نہیں ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہونچ گئے۔ آخر اکتوبر میں نیر رخشاں کو بھی وہیں لو پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر۔ آبان ماہ و آذر سے کیا غرض ؎

بسے تیر و آبان و اردی بہشت ۔ برآید کہ ما خاک باشیم و خشت

خط نہ بھیجنے کا شکوہ کرتے ہیں

"مرزا علائی مولائی نے لاہور سے خط لکھا۔ نہ لوہارو سے۔ بقدر سادہ حمق محو انتظار۔ بلکہ امیدوار رہا۔ اب

جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک شکوہ کے دفع میں طوطی نامہ کے برابر ایک رسالہ لکھو گے۔ اور ہزار وجہیں موجہ بیان کرو گے میں اس تصویر کا مزا اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو ''

لاہور اور لوہارو کی تجنیس۔ بقدر مادۂ حمق انتظار۔ شکوہ کا موقع ہاتھ آنا۔ طوطی نامہ کی برابر رسالہ تصویریں مزا اٹھانا۔ سب ظریفانہ جملے ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں

''میری جان شکوہ کرنا سیکھو۔ یہ باب میں نے ابھی تم کو پڑھایا نہیں کوئی خط تمھارا نہیں آیا کہ میں نے اسی دن یا دوسرے دن جواب نہ لکھا ہو ''

نثر مسجع اور نثر مرجز کی بحث تھی مرزا کچھ اور کہتے تھے اور صاحب عالم علی الرغم مرزا کے قتیل کے قواعد اور غیاث سے دلائل پیش کرتے تھے مرزا نے جواب میں لکھا

''اس سے زیادہ نہ مجھکو علم۔ نہ یارائے کلام۔ قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتبر سمجھے ''

شوخی کلام مرزا کا خاص حصہ ہے۔ اس کے لئے کچھ لکھنا بیکار ہے۔ صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ شوخی کلام اگر دل آزاری کے قریب پہونچ گئی۔ یا اس میں پھکڑ اور ہجو کا شمول ہوا تو شوخی کی اصلی غرض و غایت فوت ہوجاتی ہے اور پھر وہ شوخی شوخی نہیں رہتی کچھ اور ہی چیز ہوجاتی ہے۔ مرزا کو اس بارہ میں ید طولےٰ حاصل ہے۔ اور یقیناً اُردو میں تو کیا شاید فارسی میں بھی ان کا جواب مشکل سے ملے۔

نواب میر غلام بابا خان نے تصویر بھیجی۔ مگر مرزا... فوٹو کو پسند نہ کرتے تھے اسی بارہ میں سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں۔ اور اپنی فطری شوخیوں سے کام لیتے ہیں

''حال تصویر کا یہ کہ میں نے اوسے سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا۔ گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا۔ لیکن اسکا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسر ہوا۔ گفتار بھی اگر خدا چاہے گا تو سُن لینگے دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر کی صنعت کو سب پسند کرتے ہیں فقیر اس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پہنچے اور پنجہ کا پتہ نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔ ''

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اوسی زمانہ میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاف نہ وہ انبساط بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اوس کا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اوس کا نام بھی دلی اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔"

ایک خط کو ختم کرتے ہوئے میر مہدی کو لکھتے ہیں

"لو بھئی اب تم جاؤ ہو بیٹھے رہو جاؤ اپنے گھر۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علیخاں یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں جسکا روز مرہ ہے۔ کھلونے منگا دو میں بھی بجار جاؤں گا۔"

ایک خط میں شفق کو وسیم الدین و ظہیر الدین کی بابت تحریر کرتے ہیں

"وسیم الدین و ظہیر الدین کو منشی میر شیخ خواجہ کیا کر کے لکھوں۔"

میرن صاحب کو لکھتے ہیں

"خط پہونچا۔ اگرچہ میں نے صرف پڑھا۔ میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا تمہارا خط پہونچا آنکھوں سے لگایا۔ آنکھوں میں نور آیا۔ دل پر رکھا۔ راحت پایا۔ کل تک اوس کو سنکر شرماتے تھے اور آپ ہی کھلے جاتے تھے۔ اب بن بن کر باتیں بناتے ہو۔ اور ہم کو کہانیاں سناتے ہو کاشکے تم یہاں آجاؤ تب اس تحریر کا مزہ پاؤ۔"

مرزا نے احتشام الدولہ بہادر کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اور جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے دو ہم سن بڈھے باہمی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں مصروف و مشغول ہیں۔ ان کی روانگی الور کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔ اور یوسف مرزا کو مخاطب فرماتے ہیں

"آؤ صاحب میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج یکشنبہ کا دن ہے ساتویں تاریخ رمضان کی اور تیسویں اپریل کی صبح کو بھائی ضیاء جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتشام الدولہ خطاب دیا ہے وہ تین پاؤ کھجوریں اور ایک ٹین کا لوٹا۔ اور دو سوت کی رسیاں لے کر بھٹیارے کے ٹٹو پر سوار ہو کر الور کو روانہ ہوئے۔"

مرزا کو اپنے کلام کی علی حسب مراتب داد نہ ملنے کا صدمہ عمر بھر رہا۔ اور اس صدمہ سے وہ کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ ایک جگہ کچھ ایسے ہی دل شکن حالات کو ظریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ علائی نے اپنے داد نہ پانے کی فریاد مرزا سے کی مرزا کہتے ہیں۔

"بھائی اس مرض میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں اگرچہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں۔ اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف میں جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی۔ جس شہر میں رہوں۔ اوس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

نواب علاء الدین احمد خاں نے آنے کو لکھا اور نہ آئے۔ تو مرزا نے لکھا کہ شاید تم عید میں آسکو۔ یہیں سے ظرافت کی طرف قلم کو موڑ دیا۔ کہتے ہیں

"ہے ہے میں تو کہتا ہوں نہ آسکو اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشین کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی کی دلہنڈی کا سماں لہارو میں بندھ جائے۔ ایک خر سوار کی سواری بڑے دھوم سے نکلے۔ حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور کشاکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے۔ اور خر سوار کو بضرب تازیانہ دوڑائے۔ علاء الدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ ارے ظالم اس کوسہ برنشین کی داد دے۔ عقل کرامت ہے۔ الہام ہے۔ لطف طبع ہے۔ کیا ہے۔ یہ رسم کس قدر مناسب ہے۔"

علائی نے مرزا کو لکھا کہ غزل بعد اصلاح جلد بھیج دیجئے۔ مرزا ہمیشہ کے عوارض سے تنگ آگئے تھے لکھتے ہیں

"میاں تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیائے مراسم و معمول ہیں خیر تمہارا حکم بجا لایا۔ غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے۔"

غالباً علاء الدین خاں نے ایک مرتبہ مرزا کو اپنے یہاں بلانے کے لئے لکھا اور درمیان میں کچھ اچھے اچھے کھانوں کا بھی لالچ دلایا۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں۔

"خصی بکروں کے گوشت کے قلئے دو پیازے پلاؤ کباب جو کچھ تم کہا رہے ہو۔ مجھکو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ جب کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں۔"

خواجہ غلام غوث بیخبر نے ایک مرتبہ خط میں کچھ اپنے بڑھاپے کا حال لکھا۔ مرزا نے جواب میں تحریر کیا۔

"پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔ فقرہ۔ کیا جانئے بڑھاپے میں کہاں کی حرارت مزاج میں آگئی ہے فقط۔ کیوں صاحب تم نے بڈھوں میں اپنا نام لکھوایا تو مجھکو لازم ہے کہ میں اپنے کو اموات میں گنوں"

مرزا طنزیات کے بادشاہ ہیں۔ سیدھے سیدھے ہنستے ہنسانے والے لفظوں میں بلا کی چٹکیاں لیتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلما اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں۔"

میر مہدی کی عادت تھی کہ جب مرزا کو خط لکھتے تو عبارت میں اچھا خاصا بنا ؤ چنا ؤ کیا کرتے تھے۔ اور تفنن عبارت کے طرح طرح کے الفاظ لکھتے۔ ایک مرتبہ مرزا نے مدح کو طنز کے ساتھ سمو کر یہ فقرے لکھے

"تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود ؔ قتیل بن گئے ہو۔"

میرن صاحب کو خرچ بھیجنے میں دیر ہوئی۔ اون کی اہلیہ نے مرزا صاحب سے شکایت کی مرزا نے میر مہدی کو لکھا۔ اور باتوں باتوں میں کھوٹی کھری بھی سنا دیں اور پھر کچھ نہیں۔ لکھتے ہیں

"اجی وہ یوسف ہند نہ سہی یوسف دہر سہی یوسف عصر سہی یوسف کشور سہی اون کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپیہ مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اون کا تقاضہ ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپا جان کو لکھو کہ پھوپی جان بھوکی مرتی ہیں خرچ جلد بھیجو ورنہ نالش کی جائے گی۔ اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔"

اسی خط میں لکھتے ہیں اور میر مہدی پر طنز کرتے ہیں

"میرن صاحب کے خط کے لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضہ کیوں نہیں کرتے۔ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے تم اُن سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔"

میر مہدی کو یہ دُھن تھی کہ مرزا صاحب کو جلد جلد خط لکھا کریں۔ ادھر مرزا صاحب کو عدیم الفرصتی، بیماری، آرام و افکار غرضکہ ایک بار لکھتے ہیں۔

"میری جان۔ تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے اگر خط پہونچا ہے تو جواب ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے سر منڈوا ڈالا ہے مجلفین و مقصرین

پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" واللہ اُن کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔"

میر مہدی آشوب چشم میں مبتلا ہوئے۔ مرزا صاحب کو حال لکھا۔ ان کو دل لگی کا ایک مسالہ ہاتھ لگا جواب میں لکھا۔

"میاں کیوں ناسپاسی وحق نا شناسی کرتے ہو چشم بیمار ایسی چیز ہے جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمہارا منھ چشم بیمار کے لائق کہاں۔ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں۔ جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو۔ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو عوارض چشم سے تم کو کیا علاقہ میرے نور چشم کی آنکھ کیوں دُکھی۔"

میر مہدی نے ایک مرتبہ اپنی غزل میں ایک مقطع لکھا جس کا مصرع آخر یہ تھا "میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے"۔ مرزا صاحب نے پہلے تو اسی مصرع پر لکھا کہ میر مہدی تجھ کو شرم نہیں۔ پھر شہر کی حالت لکھتے ہوئے لکھتے ہیں

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار۔"

میر مہدی کی عبارت کے متعلق ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ چاہے امر واقعہ سمجھئے۔ خواہ مذاق جانئے۔ خواہ مدح سمجھئے۔ خواہ طنز کہیے جامع فقرے ہیں سب رنگ جھلک رہے ہیں

"میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں اُردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجکو رشک آنے لگا۔ سنو دلی کے تمام مال ومتاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اوس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں

"میری جان خدا تجھکو ایک سو بیس برس کی عمر دے بوڑھا ہونے آیا داڑھی میں بال سفید آ گئے مگر بات سمجھنی نہ آئی پنشن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بیجا اُلجھے ہو۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر سے مرزا کے ہم وطنانہ دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔ اگر اُدھر سے تھوڑی سی بے توجہی یا استغنا دیکھتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے شکوہ رنگیں کرتے ہیں۔ جس میں محبت طنز، شکوہ سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں

"اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعات عالمگیری۔ انشاء خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت

اوس میں سے پسند آیا کرے وہ خط میں لکھدیا کرد - خط مفت میں تمام ہوجایا کرے گا۔ اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہوجایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا۔ اوس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا سے

برات عاشقاں بر شاخ آہو

واقعی جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھکو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں فرنچ اور شامپین کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر جواہر اور روپیہ بھرے ہوئے ہیں۔ میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا۔ اور وہ مال کیونکر اٹھاؤں گا۔ بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے اور قصیدہ مجھ کو بھجوائیے ''

نواب انوار الدولہ شفق کا خط ذرا دیر میں آیا۔ تو لکھتے ہیں

'' حضرت پیر و مرشد اگر آج میرے سب دوست و عزیز یہاں فراہم ہوتے اور ہم اور وہ باہم ہوتے۔ تو میں کہتا کہ آؤ رسم تہنیت بجالاؤ خدا نے پھر وہ دن دکھایا کہ ڈاک کا ہرکارہ انوار الدولہ کا خط لایا ع

اینکہ مے بینم بہ بیدار یست یارب یا بہ خواب

منھ پیٹتا ہوں۔ اور سر پٹکتا ہوں۔ کہ جو کچھ لکھا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیات جاودانی نہیں مانگتا۔ پہلے انوار الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کردوں پھر اس کے بعد مروں۔ ''

نواب علاء الدین خاں مرحوم کی اپنے والد سے کچھ شکر رنجی تھی اسی وجہ سے اکثر اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں جو نہ ہونا چاہئے تھیں۔ چنانچہ مرزا اسی بارہ میں علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں کہ تمھارے والد یہاں آئے تھے اون سے ملاقات ہوئی یہ باتیں ہوئیں

'' میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے تو بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اوس کو چاہتے تھے۔ ہنسنے لگے غرضکہ میں نے بظاہر اون کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔ ''

ایک جگہ انھیں کو کسی بات پر لکھتے ہیں۔ اور غصہ کے ساتھ نصیحت اور نصیحت کے ساتھ ظرافت کو ملا کر ایک خوشنما الفاظ کا گلدستہ بنادیتے ہیں۔ فرماتے ہیں

'' برخوردار علی حسین خاں آیا۔ مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اُس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالےٰ اپنا فضل کرے۔ الولد سرّ لابیہ تم اس کے مصداق کیوں بنے۔ خفقان اور مراق اگرچہ تمھارا خانہ زاد موروثی ہے۔ لیکن آجتک تمھاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ اب کیوں آیا۔ اگر آیا تو ہرگز ہرگز اوس کو ٹھہرنے نہ دو۔ ہانک دو۔ خبردار اوس کو اپنے پاس رہنے نہ دینا۔ ''

انہیں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی۔ اور تم پر باایں ہمہ بُعد آشکار۔ دُوران باخبر در حضور۔ و نزد مکان بے بصر دور۔ روپیہ آگیا۔ دل سے نکلا۔ مخزن سے نکلا۔ ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گندکٹ جائیگا۔ تب ترساں ترساں پیشگاہ نادری میں تمھارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں مردو بجھی ؟ ہوں۔"

اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مرزا کے خاص دوست صاحب عالم مارہری کا خط نہایت الجھا ہوتا تھا۔ مرزا بار بار لکھتے تھے کہ کسی اور سے لکھوایا کرو۔ وہ سنتے نہ تھے۔ محبّت کے مارے آپ ہی لکھنے بیٹھ جاتے۔ مرزا نے عاجز ہو کر ایک دفعہ لکھا۔

"حضرت کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اس کا جواب لکھتا ہوں۔ اور جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تعویذ بازو کر رکھتا ہوں۔ اگر بفرض محال کبھی ملاقات ہوگی تو آپ سے دریافت کرکے پاسخ گزار ہوں گا۔"

بعض باتوں یا کاموں کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو عذر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر وہ لوگ جو عذر کرنا نہیں جانتے اس فن کو بھی بدنام کرتے ہیں انھیں حضرات کی بدولت عذر لنگ، اور عذر بارد کے الفاظ کا وجود دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ مرزا کے عذر و معذرت ایسے پُر زور ہیں کہ کہنے والا کبھی یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں تصنع اور تکلف یا بناوٹ کو بھی کوئی دخل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ عذر میں جھوٹ اور مبالغہ کو دخل ہی نہیں دیتے۔ اور اگر ضرورتاً کہیں ایسا کرتے ہیں تو ظرافت کا عنصر اتنا غالب کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن اس طرف سے منتقل ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ذیل میں آپ دیکھیں گے کہ بیسیوں جگہ میں سے ایک جگہ بھی اُن کے عذر آمیز الفاظ میں کمزوری نہیں معلوم ہوتی۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میاں داد خاں سیّاح مُصر ہیں کہ جس طرح ممکن ہو تصویر کھنچوا کر بھجوائیے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں

"تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھی پر سے اتروں پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹے دو گھنٹے کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں"

نواب مرزا علاء الدین خاں فرط محبّت میں مرزا کو لوہارو بُلاتے ہیں۔ مرزا ٹالتے عذر کرتے اور یہ جواب دیتے ہیں

"لوہارو ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھر دوں۔ آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں دو ساتھ لوں۔ چلدوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں، روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں محلسرا سے کہ وہ بہت قریب ہے جب جاتا ہوں، تو

ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے، اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے"

جس طرح مرزا، صاحب عالم مارہروی کو عزیز رکھتے تھے اسی طرح وہ بھی مرزا سے عقیدت وخلوص رکھتے تھے - دل سے متمنی تھے کہ غالب مارہرہ آئیں - ہنگامۂ صحبت گرم ہو - چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے ذکر کیا کہ مرزا صاحب کا مارہرے آنے کا ارادہ تھا، سنکر بے تاب ہوگئے، اور فوراً مرزا کو خط لکھا - ارادہ یاد دلایا - کہ اب آئیے آموں کا زمانہ ہے - مرزا نے جواب میں لکھا

"خداوند - مجھے مارہرے بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں - ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریق تمنا کہا گیا تھا - کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں - اب وہ دل کہاں سے لاؤں - طاقت کہاں سے پاؤں نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجایش - نہار منھ میں آم نہ کھاتا تھا - کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا - رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں - بین الطعامیں ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا - بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا - پیٹ بھر جاتا تھا - اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا - اب بھی اسی وقت ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہد جوانی گزشت   جوانی گلو زندگانی گزشت

اب اس کے واسطے کیا سفر کروں - مگر حضرت کا دیکھنا - اس کے واسطے متحمل رنج سفر ہوں تو جاڑے میں نہ برسات میں - اے وائے زمحرومی دیدار دگر ہیچ"

چودہری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں، اور صاحب عالم کے خطوں کے جواب نہ دینے کا یوں عذر کرتے ہیں

"دو خط حضرت صاحب کے آئے - جواب نہ لکھ سکا - آج اپنے کو طعنے دے کر مردبنایا جب یہ عبارت لکھی"

میر مہدی مجروح کو میرن صاحب کی بابت لکھتے ہیں - اور کیا خوب لکھتے ہیں - کہیں میر مہدی صاحب نے لکھا ہوگا - کہ میر نصیر الدین صاحب کو جب تک کہ میں نہ کہوں دلی نہ بلائیے - مگر مرزا صاحب کا خود ہی یہ ارادہ نہ تھا - کہ بلائیں - اس لئے انہوں نے جواب میں لکھا اور ایک خاص طریقہ سے عذر کیا

"میرن صاحب کو جب تک تم نہ کہو میں دلی نہ بلاؤں - گویا ان کے عاشق تمہیں ہو میں نہیں - بھائی ہوش میں آؤ - اور غور کرو - یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہو تو تیس روپیہ مہینہ مقرر کردوں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو - اور اگر دو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو"

میر سرفراز حسین مرزا کے ایماء یا ان کی خواہش کے مطابق اور بغرض تلاش روزگار گئے - مگر وہاں کچھ کاربراری نہ ہوئی - مرزا صاحب کو یہ اطلاع ہوئی تو انہوں نے میر مہدی کو لکھا -

"دو سو روپیہ کی زیرباری ہوئی۔ اور چونکہ یہ زیرباری میرے بھر دسے پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی۔ میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں ایک ہزار ایک سہی"

آخری فقروں سے جو درد و حسرت اور دلی رنج کے ساتھ عذر کے پہلو ظاہر ہو رہے ہیں - وہ غالب کا حصّہ ہے۔

ایک مرتبہ میر مہدی نے کسی کتاب کے لئے مرزا کو لکھا کہ وہ اب تک چھپی یا نہیں چھپی یا مرزا نے جواباً لکھا

"میاں کیا باتیں کرتے ہو۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف توشک کی فکر ہے کتابیں کیا چھپواؤں گا۔"

قاضی عبدالجمیل صاحب جنوں نے غزل بھیجی۔ اتفاق سے گم ہو گئی۔ اُنھوں نے اصلاح کے لئے تقاضہ کیا۔ مرزا کہاں سے اصلاح دیتے۔ غزل کہاں سے لاتے۔ یوں عذر کیا

"وہ غزل جو کمار لایا تھا۔ وہاں پہونچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنے عدم مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔"

قاضی عبدالجمیل جانتے تھے کہ مرزا آم کے عاشق زار ہیں۔ لہٰذا ہر سال آم بھیجتے تھے ایک سال آم پیدا نہ ہوئے بھیج نہ سکے تو عذر کیا۔ مرزا نے لکھا

"آموں کے باب میں جو کچھ لکھا یہ کیوں لکھا۔ اہداکو دوام کیا ضرور ہے۔ خصوصاً جبکہ بنات خود حادث ہو۔ حضرت اب کے سال ہر جگہ آم کم ہے۔ اور جو ہے وہ خشک و بے مزہ ہے۔ آم کہاں سے ہو۔ نہ ہوا دت نہ برسات دریا پایاب ہو گئے۔ کنویں سوکھ گئے۔ اشجار میں طراوت کہاں سے ہو۔ جناب اس کا خیال نہ فرماویں۔ اپنے کشف کو غلط کر دوں گا، بر شگاں آئندہ تک جیوں گا۔"

ایک مرتبہ مولوی احمد حسن قنوجی نے خط لکھا۔ مرزا ان کو بھول گئے تھے۔ سرسری ملاقات ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد ذہن سے اُتر گئے ہوں گے۔ اس کے بعد اُن کا خط آیا۔ مرزا سوچتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔ کسی طرح یاد نہیں آتا کہ بھیجنے والے سے کب کی ملاقات ہے۔ آخر جواب میں یوں عذر کرتے ہیں

"یا رب یہ ایک خط جو مجھکو بڑودہ گجرات سے آیا ہے۔ کاتب نے اپنے کو احمد حسن قنوجی بتایا ہے۔ اُدھر سے اظہار آشنائی ہے میری طرف سے یہ بے حیائی ہے کہ مجھکو اپنی اور ان کی ملاقات یاد نہیں آتی۔ سوچتا ہوں کچھ کی بات یاد نہیں آتی۔ خانۂ نسیاں خراب عشرۂ قتالہ کے مرحلہ کارہ پیما ہوں۔ اگر جیوں گا تو اس کا بھی مجھکو علم نہ ہیگا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ خدایا کیا اس عمر میں سب ایسے ہی خرف ہو جاتے ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ کو سیّد لکھوں۔ مولوی لکھوں۔ خان لکھوں۔ خط میں تو کچھ لکھ دوں گا۔ خط کا کیا عنوان لکھوں۔ بندہ پرور تقصیر معاف رہے۔ حضرت کا دل غبار کدورت سے صاف رہے۔"

سیّد احمد حسین مودودی کے شکایتی خط آئے اور انہوں نے لکھا کہ خط پر خط بھیج رہا ہوں جواب نہیں ملتا۔ مرزا صاحب نے جواب یہ لکھا۔

" پیر و مرشد تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی آپ کے خطوط آئے ہوں گے۔ کوئی خط پڑھ لیا ہوگا۔ کوئی عنوان ناکشادہ پڑا رہا ہوگا۔ البتہ حاجی مصطفےٰ خاں کا آنا مجکو یاد ہے یقین کرتا ہوں کہ انہوں نے از روئے مشاہدہ میری خستگی تن کا حال حضرت کو لکھا ہوگا۔ اب میں اپنی زبان سے یہ کیونکر کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا بہرا۔ اپاہج۔ بدحواس۔ ناتوان۔ فلک زدہ آدمی ہوں عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا اوس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی اوس کو دیکھ کر بھیجوں گا۔ مگر حضرت کے مسکن کا پتہ بھول گیا ہوں۔ "

تمام باتیں لکھکر آخر میں یہ کہنا کہ آپ کے مسکن کا پتہ بھول گیا۔ ایک عجیب پر لطف بات ہے۔

ایک مرتبہ اور انھوں نے غزلوں کی اصلاح کی دیر کی شکایت کی مرزا صاحب نے عجیب لطف سے جواب دیا فرماتے ہیں

" پیر و مرشد آپ کو میرے حال کی خبر بھی ہے۔ ضعف نہایت کو پہونچ گیا۔ رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہوگئے۔ جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا۔ اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے۔ نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سُنت معاف کردی تھی میں متوقع ہوں کہ میرے احباب و دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھدیا کروں گا۔ "

اور ایک جگہ اسی بارہ میں انہیں کو لکھتے ہیں

" حضرت یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مرلیا۔ کثرت احکام۔ تواتر ورود اشعار۔ پھر یہ ہنجار۔ کہ سو روپیہ کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔

غزلیں آپ کی برستی ہیں۔ کہاں تک دیکھوں آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہوجاتی ہیں۔ بہتر برس کا آدمی پھر بجور دائمی۔ غذا ایک علم معقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی۔ نہ بوٹی۔ نہ پلاؤ نہ خشکا۔ آنکھ کی بینائی میں فرق۔ ہات کی گیرائی میں فرق رعشہ مستولی، حافظہ معدوم جہاں جوکا عذر رہا۔ وہ ن وہیں رہا۔ میر عالم علی کی دو غزلیں آئی ہوئی کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ "

بیرنگ خط بھیجنے کا مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے یہ عذر فرماتے ہیں

" آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام۔ معاف رکھنا زیادہ والسّلام "

منشی شیو نرائن صاحب کی فرمایش تھی کہ آپ اردو میں کوئی عمدہ قصہ لکھئے۔ بار بار مرزا صاحب کو مجبور کرتے تھے۔ تنگ آگئے تو ایک مرتبہ یہ لکھکر عذر کیا۔

"میاں اُردو کیا لکھوں۔ میرا یہ منصب ہے۔ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں زیادہ زیادہ۔"

نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے صاحبزادہ مرزا علاء الدین احمد خاں مرزا کے بڑے پیارے عزیز اور شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے مرزا صاحب سے وعدہ لے لیا کہ علاء الدین احمد خاں کو دہلی بھیجئے۔ وہ بھول گئے اور یا کچھ اور ایسے ہی امور مانع ہوئے مرزا صاحب نے ان الفاظ میں یاد دلایا۔ جس میں علائی کے عذر کو ایک دلکش انداز سے یوں بیان فرمایا

"لو صاحب وعدہ کب وفا کرو گے۔ علائی کو کب بھیجو گے۔ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا میں رہرو چالاک ہوں۔ تیراک نہیں۔ لوہارو سے دلی تک کشتی بغیر کیونکر جاؤں ؎ اے زفرصت بیخبر در ہرچہ باشی زود باش"

نواب علاء الدین احمد خان نے اپنے بچے کی تاریخ لکھنے کی فرمایش کی تو مرزا صاحب نے عذر کر کے ٹال دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تاریخ سے ہمیشہ گھبراتے اور دور بھاگتے تھے۔ اور تاریخ گوئی کو دون مرتبت شعر و شاعری سمجھتے تھے۔ اسی واسطے نہایت دلچسپ معذرت کی ہے۔ کہتے ہیں

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ نام تاریخی کیوں نہ نکال لو۔ کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھکو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی ایک ایک قصیدہ میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدہ کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا۔ نہ نام تاریخی ڈہونڈوں گا۔"

ایک جگہ علائی کو لکھتے ہیں

"علی حسین خاں آئے دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آ سکتے ہیں اور نہ میں جا سکتا ہوں۔ وہ لنگڑے میں لولا۔"

ایک مرتبہ علاء الدین احمد خاں نے کوئی کتاب مانگی۔ مرزا نے جواب میں یہ عذر کیا۔

"سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا۔ نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ ہم سے کتاب مستعار مانگتے ہو یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ دساتیر اور برہان قاطع کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازانجملہ برہان قاطع تمکو

دے چکا ہوں۔ دستا نبو میرا ایمان و حرزِ جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے مجھکو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا۔ خلعت پاتا تھا خلعت موقوف بھٹی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔"

انھیں کو کسی اور بات پر لکھتے ہیں۔ عُذر کے ساتھ کچھ خفیف سی برہمی بھی شامل ہے۔

"میاں مَیں تمھارے باپ کا تابع تمھارا مطیع فرخ مرزا کا فرماں بردار مگر ابھی اٹھا ہوں۔ اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔"

میکش کو بیمار پُرسی کے لئے نہ آسکنے کا عذر لکھتے ہیں

"میاں عجیب اتفاق ہے۔ نہ مَیں تمھارے دیکھنے کو آسکتا ہوں نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو۔ وہ قدم رنجہ کہاں سے کرو سراپا رنجہ ہو۔ لاحول ولاقوۃ۔"

ایک خط میں چودہری عبدالغفور صاحب سرور کو لکھتے ہیں

"جب آپ لالۂ قتیل کے گڑھے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجھکو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔"

مہر نیمروز کا ایک نسخہ چودہری عبدالغفور سرور کو بھیجتے ہیں۔ مگر چونکہ اون کو دینا منظور نہیں ہے۔ لہذا اس طرح عذر فرماتے ہیں۔

"ایک نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم کی اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں۔ جرأت نہ کرسکا کہ آپ کی نذر کروں اور سیر میں اون کو مشترک لکھوں نذر اُن کی ہے اور فیض یابی آپ کے مطالعہ سے۔"

بڑھاپے کا اقتضا ہے کہ وہ رنگین مزاجوں کے مزاج میں بھی غصہ پیدا کردیتا ہے۔ بڑے مرد ہیں وہ لوگ جو ان اثرات سے متاثر نہیں ہوتے۔ مرزا بھی اُنھیں لوگوں میں سے ہیں۔ حلیم المزاج متحمل دور اندیش ہیں مگر بیماریوں کی کثرت۔ اور آلام و افکار کے ہجوم نے انھیں چڑچڑا بنا دیا ہے۔ گو وہ تند مزاج نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں جھلا اُٹھتے ہیں۔ مگر اس جھلاہٹ کا اثر دل پر نہیں ہوتا۔ جو بات لب تک آئی ہے وہ اب تک ہی رہتی ہے۔ دل پر اثر تو کیسا۔ دل کے قریب بھی نہیں پہونچتی۔ مگر اون کے اعجاز کلام اور تاثیر بیان کو دیکھئے کہ غصہ کی آتش فشانی میں بھی اون کے منہ سے ظرافت کے رنگین و خوشنما پھول جھڑتے جاتے ہیں، اور حقیقتاً یہی وہ کمال ہے جو سوائے بڑے بڑے معدودے چند باکمالوں کے اور کہیں نہیں پایا جاتا منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ اور اس بارہ میں تاکید کرتے ہیں کہ میرا عرف مرزا نوشہ کتاب پر نہ لکھا جائے۔

"صاحب مطبع نے خط کے لفافہ پر لکھا ہے۔ مرزا نوشہ صاحب غالب۔ للہ غور کرو یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اُردو یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز چھاپے کی یہ کوئی کتاب اوس شہر میں نہیں پہونچی جو وہ میرا نام لکھدیتے تم نے بھی اون کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلی کے حاکم کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمہ میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا پس اگر صاحب مطبع نے مرزا نوشہ صاحب غالب لکھدیا تو میں غارت ہوگیا کھویا گیا۔ میری محنت رائگاں گئی گویا کتاب کسی اور کی ہوگی۔"

کسی قاضی کی طرف اشارہ کرکے نواب شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"میاں قاضی تو چوتیا مسخرہ ہے۔ اون کا خط دیکھ لیا خیر ہاں علاء الدین خاں کا خط گھنٹہ بھر بھانڈ کے طایفہ کا تماشا ہے۔"

ایک جگہ نواب شہاب الدین خاں کو لکھتے ہیں اور غصہ کو نرمی اور رنج کے ساتھ ملا کر کہتے ہیں

"رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے — ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکے بیوجہ جواب — غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے"

غدر کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔ اور انتہائی رنج کے غصہ کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں

"ارتضےٰ خاں ابن مرتضےٰ خاں کی پوری دو سو روپیہ کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپیہ مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمھارے بھائی مجرم تھے تمھاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا میں خود موجود ہوں۔ اور حکام صدر کا رو شناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔"

نواب علاء الدین خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں اور نہایت خفگی کے عالم میں لکھتے ہیں مگر غصہ میں ایک تمثیلیہ جملہ مذاق کا شامل کرکے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں

"سنو صاحب حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے۔ لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اوس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت و متحقق ہے۔ اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اوس سے قطع نظر نہ کرو۔ اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو۔ تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا

نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہ سہی اہل حرفہ سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھدیا کیجئے خط کے پہونچنے کا میں ضامن"

ایک مرتبہ مرزا نے کوئی اصلاح دی جس کے خلاف صاحب عالم نے عبد الواسع ہانسوی کے رسالہ اور غیاث کے حوالے سے استناد کیا۔ مرزا نے جواب میں لکھا

"نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچہ سے اور اس معلم سے مجھکو کتر نہ جانو عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ۔ غور کرو۔ اور سمجھو عبدالواسع پیغمبر نہ تھا۔ قتیل برہمانہ تھا۔ واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں۔ شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو۔ نہ مانو۔ تم جانو"

اسی طرح نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ایک مرتبہ اپنا دیوان اس لئے مانگا کہ اہل مطابع کا تقاضہ تھا اور وہ لوگ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد مرزا صاحب کا کلام چھپ جائے۔ مرزا نے نواب ضیاء الدین خاں سے کہا۔ انھوں نے بڑی محنت سے دیوان جمع کیا تھا۔ اور اب وہ لخت جگر کا حکم رکھتا تھا۔ آسانی کے ساتھ اس کو جدا کرنا مشکل تھا۔ مگر مرزا صاحب کے سامنے انکار بھی آسان کام نہیں تھا۔ لہٰذا ٹالنا شروع کیا۔ مرزا کو غصہ آیا۔ ایک رقعہ لکھا۔

"جناب قبلہ وکعبہ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اوس کے دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ ایک جلد ایکہزار جلد بنجائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہوجائے۔ تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں۔ تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی۔ تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا۔ اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لادوں گا۔"

مرزا کے دیوان میں کسی نے کچھ ردوبدل کی اور وہ دیوان مرزا کی نظر سے گزرا۔ مرزا نے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھا۔

"بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا

ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھدئیے ہیں خلاصہ یہ کہ جس مفسد نے یہ شعر ہیں اوس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام اس کے سوا اور کیا لکھوں ایک تو لڑکے میاں غلام نجف دوسرے تم۔ میری کمبختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا "

قسم ایک طریقہ ہے حریف یا مخاطب کو یقین دلانے کا۔ مرزا اس میں بھی اپنے اصلی مذاق مطائبت و خوش طبعی کو شامل رکھتے ہیں۔ اور کبھی پروا نہیں کرتے کہ قسم کے ساتھ جب ظرافت شامل ہو جاتی ہے تو اس کا کیا اثر ہو جاتا ہے اور کس درجہ پر آجاتی ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں نے دو تین مرتبہ کسی قصیدے اور رباعیوں کے لئے تقاضہ کیا۔ مرزا نے جواب دیا۔ کہ بسبب افکار و علایق کے کچھ کہا ہی نہیں ہے بھیجوں کیا۔ انھوں نے نہ مانا۔ اور پھر لکھا۔ مرزا کو غصہ آگیا۔ جواب میں برس پڑے۔ اور ایسے برسے کہ توبہ ہی توبہ ہے۔ ایک جگہ اسی جوش و خروش کے عالم میں قسم بھی کھا بیٹھے۔ لکھتے ہیں۔

" بدست مرگ دلے بدتر از گمان تو نیست۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدہ کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کونسی رباعیاں مانگتے ہو پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج قصیدہ بھیج۔ معنی اسکے یہ ہیں کہ تو جھوٹا ہے اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم۔ انجیل کی قسم۔ توریت کی قسم۔ زبور کی قسم ہنود کے چار بید کی قسم۔ دساتیر کی قسم۔ ژند کی قسم۔ پاژند کی قسم۔ استا کی قسم۔ گرد گرنتھ کی قسم۔ نہ میرے پاس وہ قصیدہ ہے نہ مجھے وہ رباعیاں یاد "

قیاس کہیں صحیح ہوتا ہے اور کہیں غلط۔ یہ تعریف منطقیوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہو تو ہو۔ مرزا کو اپنے قیاس سے بھی صرف مطائبۃ اور ظرافت کا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ منشی شیو نراین نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال لکھتے ہوئے قے اور دستوں کے آنے کا حال بیان کیا۔ مرزا نے خط کے جواب میں لکھا۔

" قے کا ہونا اور دستوں کا آنا یہ چاہتا ہے کہ تم نے رات کو بری قسم کی شراب مقدار میں زیادہ پی ہوگی۔ کچھ تدبیر کرو اور شراب زیادہ نہ پیا کرو "

ایک مرتبہ چودھری عبدالغفور سرور نے عرفی کا ایک شعر لکھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔ ع

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

اور غالباً یہ شعر بطور استناد پیش کیا تھا۔ دیکھتے ہی مرزا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصہ میں جواب لکھا۔

"ہیہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں گویا مسخ کر دیتے ہیں۔ ان سے بعید نہیں۔ لیکن تم سے اور حضرت صاحب سے بعید ہے۔ کہ سہو کاتب کا نہ سمجھ لیا" من آں دریاے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت" دو کافوں کا علی التواتر آنا۔ دوسری بات ہے۔ دریاے آشوب کیا ٹکسال باہر لفظ ہے استعارہ بالکنایہ صحیح مگر بے محل نہیں ہے۔ یہاں تو دریا چاہیئے بے شائبہ استعارہ وکنایہ۔ عیاذاً باللہ۔ عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیئے ہوئے ہوتا تو بھی یوں نہ لکھتا۔ اس غریب کا مصرع یوں ہے۔ من آں دریا بہ آشوبم کہ الخ"

اگرچہ مرزا کی عبارت اور ان کی تمامتر گفتگو لطیفہ ہوتی ہے۔ اور ان کے حرف حرف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لطیفۂ قدرت ہیں۔ مگر کہیں کہیں تفنن عبارت کے طور پر وہ متقدمین کے لطایف بھی بیان کرتے اور اپنی ظرافت کی شراب کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے ہی واقعات کو لطایف کی صورت میں پیش کرتے ہیں جیسا کہ آگے سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مرزا پر ایّام غدر میں یہ جرم بھی لگایا گیا تھا کہ انہوں نے بادشاہ دہلی کا سکہ کہا۔ اور مرزا یہ کہتے تھے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ وہ سکہ ذوق مرحوم نے کہا تھا۔ اور اردو اخبار میں چھپا تھا اسی بنا پر وہ اردو اخبار جس میں یہ سکہ نکلا تھا تلاش کر رہے تھے۔ مگر نہ ملتا تھا۔ چودہری عبدالغفور سے پوچھا کہ تمھارے پاس اوس اخبار کا فائل تو نہیں ہے اونھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ مرزا نے انھیں کو ایک خط میں اسی زمانہ میں لکھا۔

" ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا پنشن بھی گئی۔ اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضاے الہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔ چون جنبش سپہر بفرمان داور است۔ بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد۔ یہ تحریر بطریق حکایت ہے نہ بسبیل شکایت۔ از ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری۔ فرمود کدام حال خواہد بود کسی را کہ خدا ازوے فرض طلبد۔ و پیمبر سنت۔ وزن نان خواہد و ملک الموت جان"

عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

" بھائی ہوش میں آؤ میں نے تم کو کب خط بھیجا اور رقعہ میں کب لکھا کہ میں شیر زماں کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اس رقعہ میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی وہی بندگی لکھی ہوئی گویا لپیٹی ہوئی تھی۔ سو حضرت کو پہونچ گئی۔ خاطر عاطر جمع رہے"

نواب میر ابراہیم علی خاں وفا کو ایک لطیف واقعہ لکھتے ہیں۔

"دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں پہنچیں۔ مزا یہ ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا۔ کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے۔ اور کہاں کا ہے۔ شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی"

انوار الدولہ شفق کو ایک واقعہ سناتے ہیں۔ اور اس کو ایک لطیفہ کرکے بیان کرتے ہیں۔

"ایک لطیفہ نشاط انگیز سنئے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ ان دنوں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھک داس ہے۔ میں بالاخانہ پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا۔ اور اس نے دیکر مجھ سے کہا۔ کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو۔ جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشاں لکھا تھا۔ اوس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے کیشاں کو کپتان پڑھا"

نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں اور غدر کا ایک واقعہ سناتے ہیں

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون۔ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون عرض کیا کہ میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممو بھی تم۔ سارا جہان بھی تم جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کسے دیں مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے"

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب صحت یاب ہوئے تو نواب علاء الدین خاں کو لکھا

"میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی۔ زحیر۔ تپ۔ صداع بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جاتے جائیگا۔ آگے کون سے قوی تھے کہ اب ان کو ضعف کہا جائے"

"ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا ہائے بڑھاپا۔ ادھر ادھر دیکھا جب جانا کوئی نہیں ہے۔ کہتا ہوا اٹھا کہ جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے۔"

انھیں کو ایک خط میں فارسی کے ایک محاورہ کے متعلق لطیفہ سناتے ہیں

"نشستن استعارہ ہے ریدن کا چنانچہ ایک تذکرہ میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعراء کی

دعوت اپنے باغ میں کی - مرزا صائب اور اس عصر کے کئی شعرا جمع ہوئے - ایک شاعر کے تذکرہ میں اُس کا نام مندرج ہے - اور میں بھول گیا ہوں - اکول تھا - مگر معدہ اس کا ضعیف تھا حرص وشرہ کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا ہضم نہ کر سکتا تھا - کھانا کھا کر شراب پی کر دروازہ باغ کا مقفل کر کے سب سو رہے - اس مرد اکول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا - نہ ایک جگہ بلکہ کبھی اس کیاری میں کبھی اُس روش پر کبھی اس درخت کے تلے کبھی اس دیوار کی جڑ میں قصہ مختصر غائت شرم وحیا سے دو چار گھڑی رات رہے دیوار سے کود کر چلا گیا - صبح کو جب سب جاگے اُس کو ادہر اُدہر ڈہونڈا کہیں نہ پایا - مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا - مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا - این شمارا چہ افتادہ است کہ میگوئید فلانے در باغ نیست مے بینم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جا نشستہ است "

چودہری عبد الغفور کو لکھتے ہیں -

" جلالائے طبا طبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا - عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر یہ مضمون اوس کا ہے کہ ایک دن مولانا عرفی علیہ الرحمۃ اور ابو الفضل میں مباحثہ ہوا - شیخ نے عرفی سے کہا کہ ہم نے تحقیق کو بہ سرحد افراط پہونچا دیا - اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا - عرفی نے کہا کہ اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گھر کے بڈھوں اور بڑھیوں سے جو بات سنی فارسی میں سُنی - شیخ گفت ما فارسی از انوری وخاقانی فرا گرفتہ ایم - شما از پیرزالاں آموختہ آید - عرفی فرمود انوری و خاقانی از پیرزالاں آموختہ باشند "

خواجہ غلام غوث بیخبر کو ایک لطیفہ سناتے ہیں -

" حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا لو ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغاں لایا ہوں صحیح یوں ہے ؎

تم کیے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائی نہیں

مرزا اپنے خلوص ومحبت کے جوش میں کہیں کہیں اپنے احباب کی مدح بھی کرتے ہیں - مگر اس میں مبالغہ بالکل نہیں ہوتا انھیں مدح سے اپنے ممدوح کو وہ حقیقی مسرت پہونچانی مقصود ہوتی ہے جس سے دل کو خوشی اور روح کو بالیدگی نصیب ہو - وہ کسی ممدوح کے شرمندۂ احسان ہو کر اس کی مدح نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں حقیقتاً وہی انکی بے لاگ رائے ہوتی ہے -

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں -

" صاحب تم تو اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے - میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں - تمھارا خط کل شام کو آیا آج جواب لکھا گیا "

دیکھئے مدح ہے۔ مگر اس طرح کی مدح کہ مدح کا شائبہ بھی نہیں بات یہ ہوگی کہ تفتہ کے خط میں لکھا ہوگا۔ کہ آپ میرے عریضہ کے منتظر ہوں گے۔ جس کا جواب مرزا صاحب نے یہ دیا۔

مرزا تفتہ کو نواب یوسف علی خاں کی مدح میں چند کلمات لکھتے ہیں۔ اور کیا خوب لکھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً نواب موصوف مرزا کی ممدوح اور محسن تھے۔ مگر اُن کا انداز خاص کہاں جاسکے۔ لکھتے ہیں۔

"نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم اور بہ اعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اُس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی"

چودھری عبدالغفور سرور ایام غدر میں دہلی آرہے تھے۔ چونکہ نہایت ہی آشوب ناک زمانہ تھا۔ اس لئے اُن کے چچا نے اُن کو دلی جانے سے روکا۔ انھوں نے یہ حال مرزا صاحب کو تحریر کیا۔ مرزا نے جواب میں اُن کے چچا کی تعریف کی۔ اور اُن کی ذہانت کی ان الفاظ میں داد دی۔

"آپ کے خواب کا ماجرا۔ اور صبح کو ادہر کا قصد۔ اور پھر اپنے چچا صاحب کے کہنے سے نظر تابستاں پر اس عزم کا ملتوی رکھنا۔ معلوم ہوا۔ آپ کے چچا صاحب نے کرامت کی جو آپ کو منع کیا۔ سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا مگر رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہو تو نہو اور اگر خبر ہوجائے تو البتہ قباحت ہے۔ زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجئے گا"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"صاحب دو خط تمھارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے داڑھی منڈے بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے تمھارا خط دیا"

بات یہ تھی کہ مجروح مرزا کے بے تکلف منھ لگے گستاخ شاگرد تھے اس قسم کا مذاق اُن سے ہوتا تھا۔ میرن صاحب پر ڈھال ڈھال کر ایسے فقرے اکثر اُن کو سنایا کرتے تھے انھیں کے ہنسانے کے لئے نامہ بر کا حلیہ درج کردیا۔ اور ضمناً اس مدح سے مجروح کو بھی خوش کردیا۔ اسی طرح مرزا حاتم علی مہر نے مرزا صاحب کی فرمائش کی بموجب بعض طلائی کام جلدیں تیار کرائیں تو مرزا نے شکریہ میں یہ مدحیہ فقرے لکھے۔

"بھائی صاحب آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوح طلائی کا آوازہ یہاں تک پہونچایا بلکہ مجکو ان کی لوحوں کا خط طلائی مانند شعاع آفتاب نظر آیا۔ کیا پوچھنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ مجکو تو بموجب اس مصرع کے خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ دل میں خوش ہوکر چپ رہنا ہے۔ حضرت مدح کو ایک موقع ضرور ہے مجھ کو آپ کے حکم کا بجالانا منظور رہے۔ اس نذر کے پہنچنے کے بعد جب کوئی ان کا عنایت نامہ آئیگا۔ تو بندۂ درگاہ مدح گستری کا جوہر دکھائے گا اوس نظم میں آپ کا ذکر خیر بھی آجائے گا"

بجائے اس کے کہ مدح کرتے مدح کا وعدہ کرکے اک قسم کی مدح کردی۔ اور پھر کچھ نہیں۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد یہ خط ہے یا کرامت ہے صاف صفائی ضمیر و کشف حجت کی علامت ہے۔ مدعائے ضروری التحریر اور نشان مسکن دامنگیر اگر یہ خط کل نہ آجاتا تو آج خط کیونکر لکھا جاتا۔ سبحان اللہ یہاں جس دن مجھ کو وہ مطلب خطیر در پیش آیا ہے اُسی دن آپ نے وہاں خط لکھنے کو قلم اٹھایا ہے۔ آپ کو عارف کامل کیونکر نہ کہوں اور کیا کہوں ولی اگر نہ کہوں مدعا بیان کرتا ہوں مگر یہ گمان کرتا ہوں کہ یہ خط نہ پہنچنے پائیگا کہ وہ راز سربستہ آپ پر کھل جائے گا"

ایک روز منشی نول کشور صاحب مرزا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نواب نے شہاب الدین خاں کو مخاطب کرکے.. منشی جی کی ان الفاظ میں تعریف کی

"اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں ساڑھے باسٹھ روپیہ یعنے ۷۵۰ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور سے اور چوبیس روپیہ سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینہ میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں قیمت نہیں لیتے۔ ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہونچا دیا کرتا ہوں"

ملا نورالدین ظہوری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مشتری اور عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی اُس کا اسم نورالدین اور تخلص ظہوری تھا"

منشی ممتاز علی خاں کو لکھتے ہیں اور چودھری عبدالغفور کو مخاطب کرتے ہیں

"اہا ہا جناب منشی ممتاز علی خانصاحب مارہرہ پہونچے صاحب یہ تو سیاح گیتی نورد ثانی مخدوم جہانیاں جہانگرد ہیں"

لوگوں نے شعر میں محاکات پر ناز کیا ہے اور حقیقتاً شعر میں اگر مکمل طریقہ سے محاکات ہو تو اس کو بہترین شعر کہیں گے۔ مگر مرزا نے اسی فن میں نثر میں وہ وہ کمال دکھایا ہے کہ دیکھ کر بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے

میر مہدی مجروح کو خط لکھ رہے ہیں اور اپنی تصویر کھینچ کر دکھاتے ہیں۔

"میری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا باتیں کرلیں"

میر مہدی ایام غدر میں وطن مالوف کو چھوڑ چھاڑ کر پانی پت انصاریوں کے محلے میں جا رہے تھے۔ مگر محبت وطن دل سے جائے کہاں۔ آتے جاتے سے احباب سے دوستوں سے اپنوں سے بیگانوں سے ہر وقت پوچھتے رہتے۔ کیوں بھئی کہو

اب دلی کا کیا حال ہے مرزا کو بھی جب خط لکھتے اکثر باتوں باتوں میں اُس اُجڑے دیار کی کیفیت پوچھ ضرور لیتے تھے۔ مرزا بھی جواب دیتے رہتے۔ ایک مرتبہ لکھتے ہیں اور اُجڑی ہوئی دلی کے پھر بسنے کی یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

"جویائے حال دہلی سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش مولوی صدر الدین مفضل حسین خاں تین یہ سات اور ۷ رجمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف۔

دھوپ میں بیٹھا ہوں یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے خط لکھ کر بند کرکے آدمی کو دوں گا۔ اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ ہوتی ہے اوس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منھ دھوؤں گا ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگوکر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا کیا صحبت ہوگی"

میر مہدی نے شاید محرم میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر آشوبناک زمانہ تھا۔ کچھ طبیعت بھی لاابالی سی تھی آنہ سکے۔ مرزا نے پہلے انتظار کیا انتظار سے کام نہ چلا تو خط میں شکایت لکھی۔

"محرم تمام ہوا آج سہ شنبہ غرہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا۔ برسات کا نام آگیا۔ سو پہلے تو مجملاً سنو ایک آشوب غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کی ایک آفت وبا کی ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جیسے بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو اگر کبھی کبھی تارے دکھائی دیتے ہیں لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکانات گر گئے سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینھ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے"

برسات کا حال دوبارہ میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

" برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے۔ جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی . . . .

ہو گئی ہیں - منھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے - کتابیں قلمدان سب توشے خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا - کہیں چلمچی دھری ہوئی - خط کہاں بیٹھ کر لکھوں -"

حکیم غلام نجف خاں کو سردی کا حال لکھتے ہیں - اور کچھ حال بیان فرماتے ہیں

"جاڑا خوب پڑ رہا ہے - تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے - آبکاری کے بندوبست جدید نے مار ڈالا - عرق نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا - ادہر انسداد دروازۂ آبکاری ہے اُدہر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے - انا للہ وانا الیہ راجعون -"

مرزا حاتم علی مہر کو مخاطب کرکے ان کے نقشے کے ساتھ اپنی تصویر کھینچتے ہیں اور دو مردانہ حسن ایک صفحۂ کاغذ پر اس طرح دکھادیتے ہیں

"بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی - اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا - تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے - اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھکو دکھائے - بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا - کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے - تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا - اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے - اب جو کبھی مجھکو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے - ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے - وہ مزے یاد آگئے - کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں -

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں — شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے - تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے - ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی - مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام - ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا، منھ پر داڑھی سر پر بال فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اوسی دن سر منڈایا - لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا بک رہا ہوں -"

برسات کی شدت کا حال ایک دو جگہ آپ دیکھ چکے ہیں اب اُسی مصیبت کو نواب علاء الدین خاں سے یوں بیان کرتے ہیں -

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں - محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھہ گیا - چھتیں ٹپک رہی ہیں تمھاری پھوپی کہتی ہیں ہائے دبی - ہائے مری - دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے - میں مرنے سے نہیں ڈرتا - فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں - چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ......

اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھکو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ معہ دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہ مروت کا احسان بپایاں عمر یں اور بھی سہی -،،

لوگ اس پھیر میں پڑے ہوئے ہیں کہ مرزا سنی تھے - یا شیعہ - ایک فریق کہتا ہے وہ یقینی اہل تسنن میں سے تھے، دوسرا کہتا ہے وہ اثنا عشری تھے کیونکہ ان کا یہ شعر صاف صاف بتاتا ہے

منصور فرقۂ علی اللّٰہیاں منم　　آوازۂ انا اسد اللّٰہ برافگنم

تیسرا گروہ تفضیلیہ بنا کر ہنگامہ برپا کرتا ہے - مگر میں غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور　　میں اور یار اور مرا کاروبار اور

میں خیال کرتا ہوں کہ مختلف اوقات میں ان کی طبیعت میں مختلف جذبات جوش زن ہوتے ہیں اور ان میں مذہب کا خیال بھی آتا ہے - شیعہ سنی کے جھگڑے سے تو وہ خیال بالاتر ہوتا ہے - مگر حلقۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا -
مرزا حاتم علی مہر کو ایک تعزیت کے خط میں نصیحت کرتے اور اس کے بعد لکھتے ہیں

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی - اقامت جاودانی ہے - اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے - اس تصور سے جی گھبراتا ہے - اور کلیجہ منہ کو آتا ہے - ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی - طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی - وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبٰے کی ایک شاخ - چشم بددور - وہی ایک حور - بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ -

زن نو کن اے دوست در ہر بہار　　کہ تقویم پاریں نیاید بہ کار ،،

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو نصیحت کرتے ہوئے پھر اپنا بھی حال لکھتے ہیں

"خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی - دم غنیمت ہے - جان ہے تو جہان ہے - کہتے ہیں کہ خدا سے نا امیدی کفر ہے - میں تو اپنے باب میں خدا سے نا امید ہو کر کافر مطلق ہو گیا موافق عقیدۂ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی - چل بھئی نہ دنیا نہ دین - مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو - اور خدا سے نا امید نہ ہو - ان مع العسر یسرا کو اپنا نصب العین رکھو -،،

ایک جگہ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں - اور اپنے عقاید بیان کرتے ہوئے یہ فقرے بھی لکھتے ہیں

"اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں - اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو

میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا کہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اوس میں جلیں۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اور اپنی روزہ داری کا ثبوت دیتے ہیں

" دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

آخر عمر میں امراض و آلام کی کثرت۔ عوارض کے ہجوم نے مرزا کی زندگی کو بے لطف کر کے زندہ در گور کر دیا تھا آخر میں اُن کی دلچسپی کا مشغلہ اگر کوئی تھا تو یہی تھا کہ احباب کے خطوط اطراف و جوانب سے آجائیں۔ وہ پڑے پڑے سُن لیں۔ اور کوئی آجائے تو اُس کا جواب لکھوا دیں۔ مگر یہ حالت صرف چند روز رہی۔ جب تک کہ وہ بالکل مجبور نہ ہو گئے تھے اس وقت تک اس خوشگوار فرض کو وہ خود ہی انجام دیتے رہے۔ اُن کے امراض مزمن ہی بڑھتے بڑھتے امراض شدید کی صورت اختیار کر گئے پہلے یہ حالت رہی کہ دو برس کو اچھے برس دن کو صاحب فراش۔ پھر ایک طرف حالت بڑھتی رہی ایک طرف کم ہوتی رہی تا اینکہ یہ کہنے کا وقت آگیا کہ

دم واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

انھیں امراض کے حالات بیماری کے واقعات کو وہ اپنے احباب سے بیان کرتے ہیں۔ مگر اُن کی وہ خونابہ افشانی دوسروں کے لئے رنگیں نوائی بنجاتی ہے۔ مرزا نے طرح طرح سے امراض و آلام کا بیان کیا ہے اپنی حالت سے احباب کو باخبر کیا ہے مگر ایک جگہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ پڑھنے والا اُسے پڑھ کر متاثر نہ ہو۔ یا ایک جگہ بھی اس کو لطف نہ آیا ہو جیتا نواب میر غلام بابا خاں نے کسی جشن مسرت میں بُلایا تو مرزا نے اس طرح امراض و اسقام کا بیان کر کے عذرخواہی کر لی اور ... نواب صاحب کو خوش کر دیا فرماتے ہیں

" رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھائی۔ یہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج کانوں سے بہرا۔ ضعف بصارت۔ ضعف دماغ۔ ضعف دل۔ سب ضعفوں پر ضعف طالع کیونکر قصد سفر کروں۔ جسم میں حالت جان میں جان نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت جیز امکان میں نہیں"

انھیں کو ایک جگہ مصائب امراض کا حال لکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" ایک ادنےٰ مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۱۲ھ کی میری ولادت ہے۔ ایک رجب کے مہینے سے سترواں سال

شروع ہوگا۔ ستر ابہترا بہرا بوڑھا اپاہج آدمی ہوں۔"
میاں دادخاں سیاح کو لکھتے ہیں۔
" ناتوانی زور پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف سستی کاہلی گرانجانی۔ گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔
باگ پر ہاتھ ہے بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔"
ایسے ہی خیالات کا نظم میں بھی اعادہ کیا ہے ؎

ضعف نے غالب نکما کر دیا ۔۔۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دوسری جگہ میاں دادخاں سیاح کو یوں لکھتے ہیں اور ضعف بینائی کو عجب لطف سے تحریر فرماتے ہیں۔
" اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار اصلاحوں کے لئے چلے آتے ہیں اور
میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا اپاہج پورا بہرا۔ آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔"
یہی حال منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں۔ اور اس پر دوسرے الفاظ کا رنگ دیتے ہیں۔
" میرے محب۔ میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا
اب اندھا ہوا چاہتا ہوں"
دوسری جگہ انھیں سے کہتے ہیں۔
" غذا بالکل مفقود۔ اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"
مرزا تفتہ کو حال سناتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

" گمان زلیست بود بر منت ز بیدردی ۔۔۔ بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

سامعہ مرگیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس
سراسر مختل حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی"
ایک جگہ انھیں سے خط لکھنے کا حال کہتے ہیں کہ
" اتنی سطریں تجھ سے بہزار جر ثقیل لکھی گئی ہیں"

دوسری جگہ
" میرا حال بدستور ہے ؎ ہماں بستر ہماں پہلو ہماں درد"
ایک جگہ انھیں کو کھانے کا حال لکھتے ہیں
" دس دن میں دوبار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا

پینا۔ اور آلو بخارے کا افشردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے۔ اور صورت زلیست کی نظر آئی ہے "

دوسری جگہ۔

" میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اس سے زیادہ میرا حال مجھکو بھی معلوم نہیں "

" میرا حال اب اس فن میں یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے کلام ہندی میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؂

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے "

چودھری عبد الغفور سے آلام زمانہ کا یوں حال بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے کہیں کہا تھا کہ بوستان خیال دیکھا کیجئے انھوں نے جواب دیا۔

" حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت سچ تو یوں ہے۔ کہ غمہائے روزگار نے مجھکو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی روتا رہوں گا۔ دوسرے یہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغرائے دکبرائے دلنشین ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے "

میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔

" اب تھوڑے دنوں تک شاید میں خط نہ لکھ سکوں تفصیل اُس کی یہ کہ رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی۔ پھنسی پھوڑا ہو گئی۔ پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا۔ زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مُردار ہو گیا "

میر مہدی مجروح کو ایک جگہ بیماری کی یوں خبر دیتے ہیں اور آخر میں ایک دلچسپ پیشین گوئی کرتے ہیں

" جان غالب اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا۔ کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ اب اچھا ہوں تندرست ہوں ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے "

قاضی عبدالحمید کو حال لکھتے ہیں

"میں نہ تندرست ہوں نہ رنجور۔ زندہ بدستور ہوں۔ دیکھئے کب بلاتے ہیں اور جب تک جیتا ہوں کیا دکھاتے ہیں"

خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں

"قبلہ پیری وصد عیب۔ ساتویں دہاکے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا اب دائمی ہو گیا ہے مہینہ بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں اگرچہ جرعہ جرعہ پیتا ہوں مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا کتنا پانی پی جاتا ہوں"

نواب سعد الدولہ شفق کو لکھتے ہیں

"سال گذشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا ۱۲۔۱۴ مہینے صاحب فراش رہا۔ اوٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا۔ نہ تپ۔ نہ کھانسی۔ نہ اسہال۔ نہ فالج۔ نہ لقوہ ان سب سے بدتر ایک صورت پر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک ۱۲ پھوڑے ہر پھوڑہ ایک زخم۔ ہر زخم ایک غار، سال بھر میں سے تین حصے دن یوں گزرے پھر تخفیف ہونے لگی لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سر سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی، اب اگرچہ تندرست ہوں۔ مگر ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کی خبر کی تقریب اور مثلہ میری یہ تحریر کہ آدھی سچ اور آدھی جھوٹ در صورت مرگ نیم مردہ و در حالت حیات نیم زندہ ہوں"

یوسف مرزا کو اپنے حالات سے مطلع کرتے ہیں

"فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں دیو نہیں بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا۔ ضعف قویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں"

نواب علاء الدین احمد خاں کو حال لکھتے ہیں

"علی حسین خاں آئے دو تین بار مجھ سے مل گئے اب نہ وہ آسکتے ہیں نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمناں وہ لنگڑے۔ میں لولا" آغاز فسق مزید علیہ۔ یا مستزاد"

مرزا کی مسرت بھی اور ہی طرح کی ہے۔ جس میں واقعیت کی بہ نسبت ہنسی اور مذاق کا پہلو زیادہ ہے اول تو اُن کے ہر خط کا منشا ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ہنسائیں۔ آلام کے بیان میں بھی وہ اس کا خیال رکھتے ہیں پھر بھلا مسرت کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

شاہزادہ بشیرالدین کو اپنی تصویر بھیجی۔ شاید اس کی رسید آئی تو آپ نے جواب میں لکھا

" عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا۔ اور کیونکر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو بھیجوا کر بصورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا "

تفتہ سے اپنی خوشی اور فائزالمرامی کا حال بیان کرتے ہیں

" بھائی جس دن تم کو خط بھیجا۔ تیسرے دن ہرد یو سنگھ کی عرضی اور رعسہ کی رسید اور صما کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے بابو صاحب نے صہ ہرد یو سنگھ کو دیئے اور تجھ سے مجرانہ لئے۔ بہر حال ہنڈوی ۱۲ دن کی میعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے ۶ دن باقی تھے مجھکو صبر کہاں مئی کاٹ کر روپئے لے لئے قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہوگیا۔ آج میرے پاس معللعہ نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں الحمدللہ علیٰ احسانہ "

میر مہدی سے اپنی خوشی اور مسرت کا حال بیان کرتے ہیں۔

" مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں

کسے کیں مرادش میسر بود اگر جم نباشد سکندر بود

جس طرح مرزا دوسروں کو مختلف ناموں مختلف القابوں سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مخاطب و مکتوب الیہ کو اپنے بھی طرح طرح کے نام بتاتے ہیں۔

میاں دادخاں کو ایک جگہ غالب علی شاہ لکھا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں

" نام میرا جس طرح چاہو لکھدو سے بنام آنکہ آں نامے ندارد بہر نامے کہ خواہی سر برآرد۔ "

مکتوب الیہ کے نام میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

" از غالب جان وجاناں وازجان وجاناں عزیز تر حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالےٰ۔ "

نواب مرزا علاء الدین احمد خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں

"تاریخ اوپر لکھ آیا - نام اپنا بدل کر مغلوب لکھ لیا ہے"

ایک جگہ لکھتے ہیں

"کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے"

ایک جگہ بابو ہر گوبند سہائے کو ولایتی شراب کی فرمایش کے بعد "غالب جاں بلب" لکھتے ہیں -

ایک جگہ نواب مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں

"بوڑھا ناتوان مفلس قرضدار - کانوں کا بہرا قسمت کا بے بہرا زیست سے بیزار مرگ کا امیدوار غالب"

مرزا کبھی کبھی ناصح مشفق بنکر اپنے دوست احباب کو نصیحتیں بھی کرتے رہتے ہیں - لیکن وہ نہیں جو تلخ ہوتی ہیں - مرزا تفتہ کو شعر و شاعری کے ساتھ وہ شغف تھا کہ سب کام دھندے چھوڑ بیٹھے تھے - اور رات دن بس اسی فکر میں مستغرق رہتے تھے - گھر کا اندوختہ سب اٹھا چکے تھے - نہ کہیں آنا تھا نہ جانا - شعر و سخن یا اُستاد کی خدمت بس یہی دو چیزیں ان کی دلچسپی کی تھیں - اور بس - اسی بارہ میں مرزا اُن کو ایک جگہ لکھتے ہیں

"بس اب تم سکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے - بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو - اب کہاں سے کھاؤ گے - میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے - نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے - ایک خرچ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے - اختیار ہو تو کچھ کیا جائے - کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے - مرزا عبد القادر بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام زیں ہوسہا بگزر یا مگزر، مے گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مُردہ ہوں نہ زندہ جئے جاتا ہوں - باتیں کئے جاتا ہوں - روٹی روز کھاتا ہوں - شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں - جب موت آئے گی مر رہوں گا - نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے"

دوسری جگہ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں - اور دنیا کی بے مائگی کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں -

"اچھی گزری - ہے اچھی گزر جائے گی - میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصاید کی شہرت سے عرفی کے کیا ہات آیا جو میرے قصاید کے اشتہار سے مجھکو نفع ہو گا - سعدی نے بوستاں سے کیا پھل پایا - جو تم سنبلستان سے پاؤ گے - اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے - نہ سخن ہے نہ سخنور ہے نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے"

تفتہ پر ایک زمانہ میں ایسا اثر پڑا کہ قصد مصمم کر لیا کہ اب لباس نہ پہنوں گا - مرزا کو بھی یہ ارادہ معلوم ہوا فوراً نصیحت آمیز

جملے لکھے - اور ایسے جملے لکھے جیسے کسی روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے کوئی شخص بالارادہ استعمال کرتا ہے کہتے ہیں

"کیوں ترک لباس کرتے ہو پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا - جس کو اتار کر پھینکوگے - ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی بغیر کھائے پیئے گزارا نہو گا - سختی و سستی رنج و آرام کو ہموار کر دو"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی معشوقہ مر گئی جس کی وجہ سے اون کو بڑا سخت صدمہ پہنچا مرزا کو خبر ہوئی - بہت خفا ہو کر دوستانہ نصیحت پر اتر آئے -

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ وبو کی سیر کی - ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں - ہم مانع فسق وفجور نہیں - پیو کھاؤ - مزے اوڑاؤ - مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو - سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے - کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے - کیسی اشک فشانی - کہاں کی مرثیہ خوانی - آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی مناجان سہی - میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا - اور ایک حور ملی - اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے - اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے - ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائیگی - طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی - وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبےٰ کی ایک شاخ - چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ - کہیں اور دل لگاؤ ؎

زن نو کن اے دوست در ہر بہار کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

اور ایک جگہ انھیں کو اسی قسم کی نصیحت فرماتے ہیں -

"پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم واندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے - پس اگر کسی بیدرد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجایش ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں در خور افزائش ہے بقول غالب علیہ الرحمۃ ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

اور اگر خدانخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو - ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو"

نواب انوار الدولہ شفق کا کوئی نقصان ہوا - مرزا کو خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا - فوراً ایک دلچسپ نصیحت نامہ تحریر فرمایا -

"روپیہ کا نقصان اگرچہ جانکاہ وجانگزا ہے - بر بموجب تلف المال خلف العمر عمر فزا ہے - جو روپیہ ہاتھ سے گیا ہے اوس کو عمر کی قیمت جانئے - اور ثبات ذات وبقائے عرض ناموس کو غنیمت جانئے"

ذوالفقار الدین حیدر کو ایک نصیحت کی نقل کس مزے سے سناتے ہیں۔

"تمہارا فرضخواہ آیا تھا تمہارا حال پوچھا تھا کچھ سچ کچھ جھوٹ کہکر اوس کو اس راہ پر لایا ہوں کہ سود در سود روپیہ تم کو بھیجدے بنیوں کی طرح کی تقریر اوس کو سمجھائی ہے کہ لالہ جس درخت کا پھل کھانا منظور رہتا ہے۔ تو اُس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمھارے کھیت ہیں پانی دو تو اناج پیدا ہو"

نواب مرزا علاء الدین احمد خاں کو کسی بارہ خاص میں لکھتے ہیں۔

"اس امر فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بیجا صلگی ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر کوئی اور کہے مانع نہ آؤ۔ نہ اشتہار نہ استتار"

واقعات کے بیان میں مرزا کو وہ ید طولے حاصل ہے۔ کہ بڑے بڑے مورخ اور اچھے اچھے داستان گویوں کو شرما دیتے ہیں۔ کوئی واقعہ ہو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا نقش حیرت اور محو سکوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اکثر واقعات میں محاکات کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اکثر کو سادہ چھوڑتے ہیں۔ اکثر میں اپنی طبیعت کے جوہر خاص یعنی ظرافت کو بھر دیتے ہیں۔ اکثر میں درد و اثر پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ خصوصیت کسی خاص بیان میں نہیں ہوتی بلکہ اون کی بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ دلّی کے اُجڑنے کا ماتم ہو۔ یا غدر کی پریشانی کا افسانہ ہو۔ شور انگیزی۔ جوانی کی حکایت ہو۔ دوست کا شکریہ ہو یا دشمن کی شکایت ہو۔ تندرستی کا بیان بیماری کا حال۔ سب کا ایک رنگ ہے

منشی سیف الحق میاں داد خاں سیاح نے اپنی غزلوں کا تقاضا لکھا۔ مرزا نے اپنے واقعات بیان کرنا شروع کر دئے۔

"بھائی میرا حال اسی سے جانو کہ میں اب خط نہیں لکھ سکتا آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا جب یہ حال ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیونکر دوں۔ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ صبح کو دو آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اُس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اُس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں"

تفتہ کو غدر کے بعد کے واقعات اور اپنے حالات سناتے ہیں۔

"حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع عیال اُن مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں سو تو بیکسی و غریبی ترا کہ مے پرسد۔ نہ جزا نہ سزا نہ نفرین نہ آفرین۔ نہ عدل نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر

نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم یہ لکھ بھیجو کہ تم نے میری خبر کیا سُنی۔ مجھے اس کے معلوم ہونے سے مزہ ملے گا"

۱۸۶۲ء میں برسات نہایت ہی شدت سے ہوئی تھی گلی کوچے ندی نہریں بنگئے تھے۔ جب وہ موسم گزر گیا تو تفتہ کو اطلاع دیتے ہیں کہ

"برسات کی مصیبت گزر گئی۔ لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی"

ہنگامۂ غدر کا حال لکھتے ہیں

"ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں یا حافظ یا حفیظ وردزبان ہے"

چودھری عبدالغفور کو لکھتے ہیں۔

"یہاں شہر ڈھ رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار۔ خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینھ نہیں برسا۔ اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر باجرہ بارہ سیر گیہوں ۱۲ سیر چنے سولہ سیر گھی ڈیڑھ سیر ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینہ جسے جاڑے کا دوا کہتے ہیں۔ پالی گرم۔ دھوپ تیز۔ روز لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے"

"یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے یہ خلاف واقعہ کسی نے آپ سے کہا ہے۔ میں معہ زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا۔ نہ نکالا گیا۔ نہ قید ہوا نہ مارا گیا"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ یوں لوٹی کوئی چیز ہے۔ وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں۔ حویلیاں۔ ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی رہے نام اللہ کا"

میر مہدی کو اپنے حالات لکھتے ہیں۔

"میر مہدی، تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے۔ اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر میں بھائی ایسے انداز سے چلا کہ چاندرات کے دن یہاں آ پہونچا۔ یکشنبہ کو

غرہ ماہ مقدس ہوا۔ اوسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتی ہے۔ تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں واہ واہ کیا اچھی عمر بسر ہوتی ہے"

غدر کے بعد دلی میں وبائے ہیضہ پھیلی۔ میر مہدی نے پوچھا کہ کیا حال ہے مرزا نے جواب میں کہا۔

"وبا کو کیا پوچھتے ہو قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت کال ایسا بڑا۔ وبا کیوں نہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے"

غدر کی لوٹ مار اور گیر ودار سے اکثر قدیمی خاندان بھی دلی چھوڑ کر ادہر اُدہر چلے گئے۔ انھیں میں حکیم غلام نجف خاں تھے کہ اپنے وطن مالوف میں جا رہے تھے۔ مگر دلی اور دلی کے حالات سے غافل نہ تھے برابر احباب سے دریافت حال کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مرزا سے حالات دریافت کئے تو انھوں نے جواب دیا

"میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں کسی محکمہ میں ابھی تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے"

مرزا نے اپنی بیوی کے بھانجے اور اپنے عزیز نسبتی اور شاگرد جوانمرگ عارف مرحوم کے دونوں بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اسی کے متعلق حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔

"خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اُسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے یہ قید جاودانی ہے"

"میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ واشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچے گا۔ اس سے مجھ کو جو دوست اب باقی ہیں۔ بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو"

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں

"تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہو سکتا۔ کہ جاؤ اور پڑھکر سناؤ اب اون کو خیال ہوگا۔ کہ اس انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا ہاتھ میں لئے جاؤ اور حرف بحرف پڑھو سناؤ۔ لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں۔ کبوتر

بٹیریں۔ بکل۔ کنکوا سب سامان درست ہے "

مرزا حاتم علی بیگ مہر صاحب کو اپنے حالات موجودہ تحریر فرماتے ہیں۔

" اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ دو سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے "

مرزا رام پور کا سفر کر رہے ہیں دونوں صاحبزادے ساتھ ہیں۔ اوس سفر کے دلچسپ حالات میں سے کچھ فقرے سنئے جو نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو معہ برخورداران ایک قافلہ سمجھتے ہیں۔

" قصد یہ تھا کہ بلکھوے[1] سے رہوں۔ وہاں قافلہ کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چلدئے چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہونچا دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ پہر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا دو شامی کباب اُس میں ڈال دئے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی لی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دال کے واسطے سادہ سالن بنوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ یارو آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے اتنی بات زاید ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر باپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں "

نواب انور الدولہ سعد الدین شفق کو حال لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

" پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اوس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اُس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اُس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا اُس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا اُس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی "

علائی کو لکھتے ہیں

" کل تمھارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں "

---

[1] ضلع میرٹھ میں ایک قصبہ کا نام ہے جو اس سڑک پر پڑتا ہے جو دلی سے الہ آباد جاتی ہے

"منہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھکو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ
اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یاد تھا۔ جب تمھارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے
سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محلسرا بنایا تھا۔ کہ گاڑی ڈولی۔ لونڈی۔ اصیل۔ کاچھن تیلن
تنبولن کہاری پسنہاری ان فرقوں کا مرہ دروازہ رہے گا۔ میرے اور میرے بچوں کی آمد و رفت
دیوانخانہ سے رہیگی۔ عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانے میں سے آئیں جائیں اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھلپائیاں
نظر آئیں۔ بی وفادار جنکو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمھاری پھپی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا
ہے۔ باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو نیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہیں رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں
جب وہ محل سے نکلیں گی۔ ممکن نہیں کہ اطراف محل کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں
سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لیجا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں۔ کہ یہ پھول تمہارے
چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔ شرح تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔ ہے ہے ایسے عالیشان
دیوانخانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت"

اگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا صاحب کو ہجو سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا سودا کو کسی کی خالص تعریف سے مگر ضرورت
کے لئے جیسے سودا بجا بجا مختلف اصناف سخن میں تعریف و توصیف کرتے ہیں ایسے ہی مرزا رمز و کنایہ یا باتوں باتوں میں
ہجو کر جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی بڑا فرق ہے۔ سودا کا مقصود یہ ہوتا ہے۔ اُس کی فضیحت کی جائے اس کی بوٹیاں نوچ کر چیل
کوؤں کو کھلا دی جائیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دل سے اس قسم کی باتوں کا اثر لیتے ہیں اور دل ہی پر اثر ڈالنا
چاہتے ہیں۔ مرزا اس سے کوسوں دور ہیں۔ اول تو ہجو اُن کا شیوہ ہی نہیں اور اگر کہیں ضرورت پڑتی ہے تو اس میں سب
سے پہلے اون کا خیال بھی ہوتا ہے کہ سننے والا بُرا نہ مانے لیکن یہ ضرور ہے کہ دلی کے رہنے والے ہیں۔ کہتے کہتے کہیں بڑھ جاتے
ہیں تو جان جیڑانی دو بھر ہو جاتی ہے۔ پھکڑ تک کی خبر لاتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وہ اس قسم کی گفتگو کے عادی
ہیں یا ان کو کسی کی دل آزاری منظور ہوتی ہے۔ یا وہ ذاتیات پر حملے کرتے ہیں بعض فقرے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

ایک شخص مسمی عظیم الدین خاں نے مرزا سے ان کا دیوان چھپوانے کے لئے لیا۔ اور اس میں لیت و لعل شروع
کی۔ نہ دیوان چھپوایا نہ واپس بھیجا۔ مرزا سے میاں داد خاں سیاح نے پوچھا کہ کیسے دیوان چھپا یا نہیں تو مرزا نے جواب
دیا۔

"دیوان کا چھاپا گیا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھسے دیوان منگا بھیجا۔ آدمی نہیں
ہے بھوت ہے پلید ہے۔ اور غول ہے قصہ مختصر سخت نامعقول ہے"

مرزا نے برہان قاطع کے رد میں جب قاطع برہان لکھی تو چاروں طرف سے اعتراضات کی بھرمار ہوئی۔ مخالفت کا طوفان امنڈ آیا۔ بہت سے لوگوں نے جواب لکھے۔ منجملہ اُن کے حافظ رحیم بیگ ساکن سردھنہ نے بھی ساطع برہان اُس کے جواب میں لکھی۔ شائع ہوئی تو میاں داد خاں سیاح کو بھی معلوم ہوا انھوں نے مرزا صاحب کو لکھا۔ مرزا نے جواب دیا۔

"وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اوس کا نام میرٹھ کا رہنے والا۔ کئی برس سے اندھا ہو گیا۔ باوجود نابینائی احمق بھی ہے"

اسی کتاب کے متعلق سیاح کو لکھتے ہیں۔

"طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھکر جانو گے کہ مولف اوس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھکر متنبہ نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے"

مرزا دلی کی کتابت اور وہاں کے چھاپے خانے سے بہت ناراض اور کشیدہ خاطر تھے اور جا بجا اس کی مذمت کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"دیوان اُردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اوس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے بانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے"

قاضی عبدالجمیل صاحب کو لکھتے ہیں اور مطلع کرتے ہیں کہ اکثر لوگ بیکار غزل کے مقطع میں میرا نام ڈال دیتے ہیں۔

"سنئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل لوگ میرے نام پر پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں میں ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیجدیجئے ؎

اسد اور لینے کے دینے پڑے

میں نے کہا لاحول ولاقوة اگر یہ میرا کلام ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانہ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ۔ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سنکر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اس کے رحمت خدا کی۔ اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت"

مرزا کسی ایسے مکان میں رہتے تھے جو حکیم غلام نجف خاں کو پسند نہ تھا اسی وجہ سے وہ مرزا سے برابر خواہش کرتے

رہتے تھے کہ یہ مکان چھوڑ دیجئے۔ ایک مرتبہ جھنجھلا کر لکھا۔

" حضرت غور کی جگہ ہے ایک مکان دلکشا۔ کوچہ کی سیر۔ بازار کا تماشا۔ دو کمرے۔ دو کوٹھریاں آتشدان صحن وسیع کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے۔ دروازے پر وہ تاریکی کہ دن کو بغیر چراغ کے راہ نہ ملے۔ اور پھر ڈیوڑھی پر حلال خوروں کا مجمع۔ گوہ کے ڈھیر۔ کہیں حلال خور کا بچہ ہگ رہا ہو کہیں بیل بندھا ہوا ہے کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذاً باللہ۔ خدا نہ لیجائے ایسے مکان میں "

نواب انوار الدولہ شفق کو۔ ملا غیاث الدین رام پوری اور اُن کی تصنیف کی بابت لکھتے ہیں

" غیاث اللغات ایک نام موقر معزز جیسے الفر بہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا۔ فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام۔ انشائے خلیفہ اور منشآت مادہو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادہو رام۔ و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے شعر کہتے تھے "

اور ایک جگہ نواب انوار الدولہ کو دلی کی ہجو میں لکھتے ہیں

" ایک قاعدہ کلیہ دلی کا سمجھ لو۔ خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو اس شہر پناہ کے اندر پیدا ہوا مرد یا عورت خفقان و مراق اس کی فطرت میں ہو۔ آٹھ دس برس کے بعد ساون کے اخیر مینھ خوب برسا۔ لیکن نہ دریا جاری ہوئے۔ نہ طوفان آیا۔ ہاں شہر کے باہر ایک دن بجلی گری۔ دو ایک آدمی۔ کچھ جانور تلف ہوئے مکان گرے۔ دس بیس آدمی دبکر مرے۔ دو تین شخص کوٹھے پر سے گر کر مرے۔ مراقیوں نے غل مچانا شروع کیا۔ اپنے اپنے عزیزان بسفر رفتہ کو لکھا۔ جابجا اخبار نویسوں نے اون سے سنکر درج اخبار کیا۔ لو اب دس بارہ دن سے مینھ کا نام نہیں۔ دھوپ آگ سے زیادہ تر تیز ہے۔ وہی خفقانی صاحب روتے پھرتے ہیں کہ کھیتیاں جلی جاتی ہیں "

نواب علاء الدین خاں کو ایک جگہ لکھتے ہیں

" تمسخر سمجھئے یا ہجو۔ یا دلی میں رہنے کا اثر۔ سنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علت مشایخ کا زور ہی اور سعدی کی اس بات پر عمل کرتے ہیں ؎

کسانے کہ یزداں پرستی کنند بر آواز دولاب مستی کنند

خدا مبارک کرے "

مرزا نے نواب علاء الدین احمد خاں کا تخلص نسیمی تجویز کیا۔ وہ نواب نازک مزاج تو تھے ہی اوس کی تصحیت کا وہم

کرکے بدگمان ہوئے کہ الیسا نہو نسیمی کو کوئی لیشمی پڑھے۔ مرزا کو لکھا۔ مرزا نے اول اول میں تو نہایت ٹھنڈے دل سے نصیحت کی آخر بڑھے اور بڑھتے ہی اس حد پر پہونچ گئے کہ آپ پھر اس خط سے اندازہ کریں گے لکھتے ہیں

"میری جان تمہارا تخلص بہت پاکیزہ اور میری پسند ہے۔ لیشمی کو بہ تکلف اوس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بتقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا تخلص ہے۔ رہڑو اس کی تجنیس موجود ہے۔ شیون ایک اچھا تخلص ہے ستون اُس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بہ مناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں نامی سامی یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ تمہارے واسطے خاص فخری تخلص بہتر ہے۔ کہوگے کہ آزادپور کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے۔"

ایک جگہ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

"آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور میاں شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھدیا ہے .... مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور اُن کے ہوا خواہوں کی رائے میں قصد اس استعلاج کا مذبذب ہے نسخہ کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں استاد میر جان بھی تھے نیم نامعقول مرزا اسد بیگ تھے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں اور عجیب طریقہ سے اہل زمانہ کی ہجو کرتے ہیں

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے

پلادے اوک سے ساقی جو ہمسے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اسنے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کرکے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔ جب شاعر کی زندگی ہیں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا عجب الخ"

نواب علاء الدین خاں کے معرفت حمزہ خاں کے کسی طنز کا جواب دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

"اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا۔ کہ اے خبر ز لذت شرب مدام ما۔ دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے مارنا اور

ہے اور عُرفا کے کلام سے حقیقت حقّہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے .... تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو　　رندی وخراباتی در عہد شباب اولے

اور پھر بڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اوس کی نظم کا دفتر حافظ سے دوچند سہ چند ہے - اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں - ''

دیکھئے تعریض کے جواب میں تعریض اور جواب الزامی اسی کا نام ہے - سب کچھ کہہ گئے - سب کچھ اعتراض کر گئے اور پھر کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے کوئی واعظ جلال کے ساتھ منبر پر وعظ کہہ رہا ہے کبھی کبھی ہنسی کی بات آتی ہے تو ہنس بھی دیتا ہے -

——— نواب امین الدین احمد خاں کچھ بیمار ہوئے - دوران علاج میں کہیں کسی مولوی .... نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سحر کیا ہے - نوابی دربار امیرانہ کاروبار - اسے لیجئے سب کو یہی خیال پختہ ہوگیا - بیماری آزادی کو بھول بھال کر سب جادو ٹونے کے پھیر میں پڑ گئے - نواب علاء الدین خاں نے مرزا سے بھی اس خیال کا اظہار کیا - مرزا نے جواب لکھا اور ضمناً ایک دو لفظوں سے ملانوں کی بھی خبر لے لی - ذرا دیکھئے فرماتے ہیں -

" اسماء و آیات شفا بخش مقرر ہیں - ردِ سحر و دفع بلا اُن کے ذریعہ سے متصور ہے - لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تہ توڑ دی ہے - کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں - تمھارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا - بیچارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک کوئی وہاں کا قصد نہ کرے - کبھی کوئی وہاں نہ جائے - یہ خیال عبث - "

حروف فارسی اور بعض قواعد مقررہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم کو لکھتے ہیں - اور ملا عبدالواسع ہانسوی کا خاکہ اڑاتے ہیں -

" وہ میاں ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط - ارے تیرا ستیاناس جائے - بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے - نامراد وہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو بر نہ آوے - بے مراد وہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو از قسم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب "

ایک جگہ فرہنگ نویسوں کی خبر لیتے ہوئے لکھتے ہیں -

" رہے فرہنگ لکھنے والے خدا ان کے بیچ سے نکالے اشعار قدما آگے دھر لئے اور اپنے قیاس کے مطابق چلدئے - وہ بھی نہ کوئی ہمقدم نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ - رہنما ہو تو راہ بتائے استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے - نہ آپ شیرازی - نہ استاد رمضانی - زہے رگ گردن و خے دعوی زباں دانی میرا یہ

قول خاص ہے نہ عام ہے - مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے - یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگ رشید کی وجہانگیری ہے - عبدالرشید کی کیا عجمی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے قطب شاہ وجہانگیر کے عہد میں ہوتا اگر ملشائے برتری ہے - تو بیچارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے - ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے - جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں - تو بتو - اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس - پیاز کے چھلکے جسقدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا - مغز نہ پاؤ گے - فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم - فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو ورق ہی نظر آئیں گے معنی موہوم - ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے - آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دلنشین ہے - فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ہے البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے - خصوصاً دکھنی تو عجیب جانا نہ ہے - لغو ہے پوچ ہے پاگل ہے دیوانہ ہے - الخ "

ایک حکیم کا مقولہ ہے اور بالکل صحیح ہے کہ انسان زمانہ حال پر کبھی قانع نہیں رہتا - ہمیشہ ماضی کو یاد کرتا اور مستقبل کی اُمیدیں رکھنا اوس کا نصب العین ہوتا ہے - اور یہ جذبہ ایسا بے اختیاری ہے کہ . . . . بڑے بڑے صابر وشاکر بھی اس میں پھنسے ہوئے ہیں - کہیں کہیں مرزا کے قلم سے ایسے ہی جملے نکلے ہیں جن میں بعض صرف گزشتہ زندگی کے واپس آنے کی تمنا میں ہیں - اور بعض شباب کے پلٹ آنے کی تمنا میں گو ان الفاظ ان جملوں ان فقروں کو درد میں ڈوبا ہوا - زہر میں بجھا ہوا نشتر ہونا چاہئے - مگر مرزا کی ظرافت اون میں وہ شگفتگی پیدا کر دیتی ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں زمین وآسمان کا فرق ہو جاتا ہے -

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں -

" مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے - اس چرخ کج رفتار کا برا ہو - ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا - ملک و مال جاہ وجلال کچھ نہیں رکھتے تھے - ایک گوشہ و توشہ تھا - چند مفلس وبے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک   اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا "

مرزا تفتہ کو عجیب طرح سے ایام گزشتہ کی یاد دلاتے ہیں - اور تعلقات باہمی کو قدیم ثابت کرتے ہیں -

" صاحب تم جانتے ہو - یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا - وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے - اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے - شعر کہے - دیوان جمع کئے -

اُسی زمانہ میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش نام تھا۔ اور حقیر تخلص تھا۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ اور چند مدت کے بعد پھر دوسرا جنم ہمکو ملا"

میر مہدی نے لکھا .... کہ میر سرفراز حسین کو جو کوئی قبلہ وکعبہ لکھتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں مرزا نے جواب دیا کہ

"خوش کیوں نہوں خوشی کی بات ہے۔ تمھارے سر کی قسم میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کرنا۔ اور مسکرانا۔

نواب علاء الدین خاں کو ایک زمانہ یاد دلا کر لکھتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرزا کثرت افکار و آلام کے ہجوم سے پریشان ہیں فرماتے ہیں۔

"بھائی کو سلام کہنا۔ اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادہر متھرا داس سے قرض لیا۔ اُدہر دربا مل کو مارا ادہر خوب چند سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود۔ شہد لگاؤ چاٹو۔ نہ مول نہ سود اس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل میاں کے سر۔ باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپیہ رامپور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اوس کو دینی پڑے۔ انکم ٹکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا گزاران مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں کہاں سے گنجایش نکالوں قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے۔ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے۔ جواب دیا جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی اون کو یہ عبارت پڑھا دینا۔"

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس ڈاک منشی کرنال باآنکہ مجھ سے اُس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا بعد اپنے مرنے کے میں نے

اُس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیجدیا کرو۔"
چودھری عبدالغفور سرور کو لوگوں کی ماہ نیم ماہ کی پرسش پر یہ جواب دیتے ہیں۔

"اس کتاب کا نام پرتوستاں ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقت عالم سے ہمایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے حصہ میں اکبر سے بہادر شاہ کی سلطنت تک کا بیان۔ پہلے حصہ کا نام مہر نیم روز دوسرے حصہ کا اسم ماہ نیم ماہ۔ بارے پہلا حصہ تمام ہوا چھاپا گیا۔ جابجا بھیجا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا۔ کہ امیر تیمر تک کا نام ونشان مٹ گیا۔ آن دفتر را گاؤ خورد۔ وگاؤ را قصاب برد وقصاب در راہ مُرد۔

صاحب عالم نے یاد دلایا کہ آپ نے مارہرہ کا ارادہ کیا تھا۔ اوسی کے جواب میں انھوں نے چودھری عبدالغفور کو یہ لکھا جوانی کی یاد ایک ایک حرف سے ٹپک رہی ہے۔

"شیخ محی الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرے جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منھ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔ ؎

دریغا کہ عہد جوانی گزشت جوانی مگو زندگانی گزشت"

حسرت وارمان کی روزانہ ناکامی کا انجام یاس ہوتا ہے۔ مرزا نے بھی وہ وہ غم والم۔ اور پیہم ناکامیاں جھیلی ہیں کہ آزادروی کے باوجود بھی وہ کہیں کہیں اس جذبۂ بے اختیار سے چیخ اٹھے ہیں۔ مگر نہ اس طرح کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ بلکہ اس طرح کہ سننے والے کے دل پر جتنا اس فریاد وفغاں کا اثر ہوتا ہے اتنا ہی وہ اُس ظرافت مضمر سے ہنسنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ مختلف جذبوں میں ملا جلا یہ جذبہ بہت زیادہ میرزا کے یہاں... موجود ہے۔

لوگ کہتے تھے کہ راجۂ الور کی تعریف میں کوئی قصیدہ کہئے۔ کچھ تعریف کیجئے فلاح کی امید یقینی ہے۔ مگر مرزا اپنے نصیب وتقدیر کو خوب پہچانتے تھے اور ان کا عقیدہ ہو گیا تھا کہ مجھے کسی سے کچھ لینا نہیں ہے۔ اگر اتفاقاً میں کسی دامن سے وابستہ ہوا بھی تو وہ دامن ہی نہ رہے گا۔ جیسا کہ بعض بعض جگہ اس خیال کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ؎

"غالب کچھ اپنی سعی سے لینا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو"

حکیم غلام نجف خاں کو الور کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

"صاحب تم سچ کہتے ہو بھائی فضل اللہ خاں کی غمخواری کا کیا کہنا ہے۔ مگر الور سے مجھ کو لینا نہیں یاد رکھنا کہ وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ بفرض محال اگر ملا تو ڈہائی سو روپیہ سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں کا دینا ہے۔ ان کا قرض ادا ہو جائے گا۔ احیاناً اگر خلاف میرے عقیدہ کے پانچسو روپیہ کا حکم ہوا۔ اور وہ آجائیں تو تم بعد اطلاع ڈہائی سو نیاں فضل کو دے کر مجھ کو لکھنا باقی کے واسطے میں جس طرح لکھوں اوس طرح کرنا۔ لو صاحب شیخ چلی نے نیا خیالی پلاؤ پکایا۔"

نواب امین الدین خاں کی تعریف کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخرالدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں میری زوجہ تمھاری بہن۔ میرے بچے تمھارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے وہ بھی تمھاری ہی اولاد ہے۔ نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمھارا دعاگو ہوں۔ اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشا اللہ تعالےٰ ایسا ہی ہوگا۔ کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مرجاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دوگے جیتے تو دوگے۔ اور اگر جینے بھی نہ دوگے اور بات بھی نہ پوچھوگے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

جب آدمی انتہائی مایوس ہو جاتا ہے تو یاس کے کلمہ اُس کی زبان و قلم سے نکلا کرتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس مضبوطی اور استقلال کے ساتھ کہ یاس میں بھی مزاحیہ رنگ نمودار ہے۔

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق نے کچھ اپنے عزیزوں کے جور و جفا کے حالات لکھے۔ مرزا پہلے ہی اُن کے ظلم اٹھائے ہوئے تھے۔ تڑپ اُٹھے اور جواب میں یہ یاس انگیز فقرے لکھے۔

"سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی میرا ہمقوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں سمرقند میں دو چار یا دشت خفچاق میں سو دو سو ہوں گے۔ مگر اقربای سببی ہیں سو پانچ برس کی عمر سے اون کے دام میں اسیر ہوں اکسٹھ برس ستم اٹھاتے ہیں ؎

گرد ہم منتج ستمہاے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا زجہاں برخیزد

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو۔ نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ اللہ دریا سارا اتر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے۔ دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔"

مرزا قربان علی بیگ سالک الور میں تھے۔ کوشش کر رہے تھے کہ مرزا کو ریاست سے کچھ نفع پہونچے مرزا کو معلوم ہوا تو یہ یاس انگیز فقرے لکھے۔

"مجکو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات اور احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔"

غالباً آخری یاس انگیز فقرے ایسے ہیں جو تمام رنج و غم کو دریا بُرد کر دیتے ہیں

حقوق خسروانہ یا تعلقات دوستانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جی چاہتا ہے تو مرزا کہیں کہیں دعائیہ فقرے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس رنگ میں کہیں بزرگ بنجاتے ہیں۔ کہیں پہونچے ہوئے فقیر نظر آتے ہیں۔ کہیں رندلا ابالی یا۔۔ قلندر منش جار ابرو صاف رکھنے والوں کی طرح کچھ اس قسم کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ سننے والا دعا سنتا ہے اور یقیناً اگر اس کو غالب کے مستجاب الدعوات ہونے اور دعا کے باب اجابت تک پہونچنے کا یقین بھی نہیں آتا پھر بھی تھوڑی دیر کے لئے وہ اتنا خوش ہوجاتا ہے کہ درویشی و شاہی میں فرق نہیں کر سکتا۔

میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں۔

"سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہونچے"

حکیم غلام نجف خاں نے ہنگامۂ غدر کے اختتام کے بعد جب بالکل امن و امان ہوگیا۔ اور وہ بے گناہ قیدی چھوٹنے لگے جو در اصل ناکردہ گناہ تھے۔ غالباً جنوری ۱۸۶۰ء میں غلام فخرالدین خاں کی بریت اور رہائی کی مرزا کو خبر دی۔ مرزا نے جواب میں اور تو خیر جو کچھ لکھا ہے وہ ہے ہی مگر دو دعائیہ فقرے بہت مزے دار ہیں۔ ایک تو یہ

"بھائی ہاں غلام فخرالدین کی رہائی زندگی دوبارہ ہے خدا تم کو مبارک کرے۔ سنا ہے لوہارو بھی اُن دونوں صاحبوں کو مل گیا یہ بھی ایک تہنیت ہے خدا سب کا بھلا کرے"

معلوم ہوتا ہے بڑے کامل پہونچے ہوئے درویش ہیں جن کی بھوؤں سے آنکھیں تک ڈھنکی ہوئی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے سے۔۔۔۔ بالوں کی چلمن اُٹھا کر فرما رہے ہیں۔

حکیم ظہیر الدین حکیم غلام نجف خاں کے فرزند تھے۔ مرزا اُن کو بچوں کی طرح چاہتے تھے۔ اگر کبھی خط میں دیر ہوتی یا اُن کا حال نہ معلوم ہوتا تو حکیم غلام نجف خاں سے شکایتیں کرتے۔ اور خیریت وغیرہ دریافت کرکے چھوڑتے۔ غرضکہ مرزا کو ان سے دلی تعلق تھا۔ ایک مرتبہ ظہیر الدین نے خط لکھا مرزا نے جواب بھیجا اوسی دوران میں حکیم غلام نجف کو بھی خط لکھنے کا اتفاق ہوا۔ معمول کے موافق دعا کا لکھنا ضروری تھا۔ اور کچھ دلجوئی کے فقرے بھی۔۔ حسب العادۃ کہنا تھے۔ اور حال یہ تھا کہ تھک گئے تھے شام ہوگئی تھی لہذا یہ لکھا۔

"حکیم ظہیر الدین کو دعا۔ بیٹا اب اسوقت مجھ میں دم نہیں دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت۔ تو بھی کہہ بیشں باد"

ایک مرتبہ غلام نجف خاں ہی کے خط میں ظہیر الدین کو لکھا۔

"ظہیر الدین دعا سے خفا ہوگا اس کو میری بندگی کہنا"

میر سرفراز حسین سے ہمیشہ نوک جھوک ہوا کرتی تھی۔ اور میر مہدی کے خط اسی کے لئے وقف تھے ایک مرتبہ اُن کو خط میں لکھتے ہیں۔

"مجتہد العصر کو دعا لکھوں بندگی لکھوں کیا لکھوں۔ بھئی وہ مجتہد ہیں ہوا کریں۔ میرے تو فرزند ہیں میں دعا ہی لکھوں گا۔ اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو کہ وہ اُن کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپیہ کو لے گئے میری دعا کہدینا۔"

دیکھئے یوں تو ایک معمولی دعا ہے۔ مگر ایک جملہ معترضہ لکھ کر کس قدر لطف پیدا کر دیا ہے۔

(۲)

غالب کی شوخیاں اُردو نظم (شاعری) میں

جیسے داد دینے والوں کے دو جملے مشہور و معروف ہیں 'واہ اور آہ' اسی طرح بہ لحاظ تاثیر شعر کی بھی دو قسمیں ہیں انبساطی۔ و انقباضی۔ انبساطی سے یہ مراد ہے کہ اوس میں کچھ مضمون ایسے نظم کئے جائیں۔ جنکا ماحصل اور مآل شگفتگی ہو۔ اور جن کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ایک بے حس سے بے حس بھی انھیں جذبات طرب سے متاثر ہو جائے جنکا ذکر اکثر شاعر نے کیا ہے۔ اس قسم کے شعروں میں کچھ وصل کا بیان کچھ اپنے حوصلے اور ارادے۔ کچھ معشوقوں کی... شوخیاں ستم ظریفیوں کا رونا۔ کچھ ساقی کی کرامات کا مذکور کچھ پیر مغاں کی دریا دلی کے حالات۔ کچھ پینے پلانے کا ذکر۔ کچھ اپنے حسن کی تعریف وغیرہ شگفتہ زبان کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ طعن۔ طنز۔ تشنیع۔ پھبتی۔ آوازے وغیرہ بھی اسمیں شامل ہوتے ہیں۔ واعظوں پر چوٹیں بھی اسی میں کی جاتی ہیں۔ وصل کی دعائیں بھی اسی میں مانگی جاتی ہیں۔ خم کے خم چڑھا کر نہ بہکنے کا شیخی بھی اسی میں مذکور ہوتا ہے۔ مگر یہ سب بہت ہلکی ظرافت اور معمولی سی شوخی کے ساتھ۔

انقباضی اشعار میں ہجر کے سوز و ساز۔ جدائی کی تکلیفوں شب غم کی مصیبتوں تنہائی کی جانستاں اذیتوں معشوقوں کی بے وفائیوں کج ادائیوں۔ ستم آشنائیوں۔ رقیبوں کی کارفرمائیوں۔ آسمان کی کجروی بدنصیبی کے جور و الم۔ صیاد و گلچیں کے

ظلم کی داستان - آشیاں کے عین موسم بہار میں اُجڑتے ، . . . . وصل کی رات کے چھوٹے ہونے اور ہجر کی رات کے بڑھ جانے کا بیان ہوتا ہے یا اسی قسم کے دوسرے مضامین نظم کئے جاتے ہیں - ان شعروں کے کہنے میں شاعر اپنے آپ کو اُن مصیبت زدوں میں فرض کر لیتا ہے - جن کا دین و دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں اور جنھیں کہیں کوئی پوچھنے والا نہیں - ایسے شعروں کا مآل تاثیر و تاثر - سوز و گداز پیدا کرنا ہوتا ہے - اور بیشتر انھیں شعروں کو غلط طریقہ پر نشتر قرار دیا جاتا ہے -

قدما کے یہاں یہ دونوں رنگ ملے جلے پائے جاتے ہیں - جتنا کسی کے یہاں سوز ہے - اتنا ہی ساز ہے اور جس قدر انبساط ہے اوسی قدر گداز ہے - ولی سے لے کر داغ و شیفتہ و حالی تک اور ناسخ و آتش سے صبا و زیر وغیرہ تک برابر اس قسم کا رنگ ملتا ہے - صرف طرز بیان - اور انداز نظم کا فرق ہے - لکھنؤ والے جو بات الفاظ - استعارات - تشبیہوں ضلع جگت - مراعات النظیر کے ساتھ کہتے ہیں - دلی والے اس کو جذبات و کیفیات انسانی سے مطابق کر کے لکھتے ہیں -

دلی والوں کے یہاں چونکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ جذبات سے منطبق کرتے ہوئے کہا گیا ہے اس واسطے ذرا تعجب بھی نہیں اگر ہم کو اُن کے یہاں انبساطی رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے - اور حق یہ ہے کہ اُن لوگوں نے رسماً - اتباعاً - مجبوراً اس رنگ کو نہیں کہا ہے بلکہ جو کچھ کہا ہے دل سے اور دل کی خواہش سے - وہ اصل میں یہ چاہتے تھے کہ غزل کا دیکھنے والا جب دس جگہ جذبات حزن و یاس سے متاثر ہو کر - آہ کرے ایسی حالت میں کچھ نہیں تو پانچ جگہ تو اسے واہ کا موقع اور ہنسنے کی دعوت دی جائے - یہی وجہ ہے کہ آپ کو پوری غزلوں میں دو دو اور چار چار شعر اس قسم کے ملیں گے - جو اس رنگ میں کہے گئے ہیں اور دانستہ کہے گئے ہیں -

سودا کو جانے دیجئے - وہ ہجو گو تھے - شوخ تھے - بیباک تھے - لاابالی تھے میر تقی میر کو لے لیجئے - اُن کو دیکھئے ان کے وقار اون کے مرتبہ - اُن کی بلند خیالی کو دیکھئے - اُن کے انداز بیان ان کی غزل کو دیکھئے - اس شعر کو دیکھئے

وے دن گئے کہ آنکھیں ندیاں سی بہتیاں تھیں - سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا - اور پھر اس کے بعد یہ شعر ملاحظہ فرمائیے -

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر　　یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دوخوابہ
نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں　　ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے　　میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

اسی طرح سیکڑوں غزلوں میں ایسے شعر ملیں گے جن کا مقصد اس کے سوائے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہنسنے اور ہنسانے کے لئے کہے گئے ہیں - اور زہر میں چٹکی بھر شکر بھی ملا دی ہے -

میر سوز کو دیکھئے اور ان شعروں کو دیکھئے بس ہنسی آتی ہے اور کچھ نہیں ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں یکھے کئی طفل پری رو ارے لے لے اے رے رے ارے لے

میں تو کہتا ہوں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ کہے کہ برجستہ مصرع تھا کہدیا۔ اس میں انبساط کو دخل نہیں اسی طرح زینہ بہ زینہ حالی تک چلے آئیے تو ان کے یہاں بھی یہ شعر نظر آئے گا

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار

متقدمین لکھنؤ پر نظر ڈالئے تو سب سے پہلے ناسخ کو دیکھئے جنھوں نے شیخ پر پھبتی کہکر بالکل چونچ بنا دیا ہے

دیکھنا ناسخ سر شیخ معجم کی طرف کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

آتش کہتے ہیں
ہوتا ہے خوشنوائی بلبل سے آشکار یہ مشت پر بھی شاعروں کا احتلام ہے

"
بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا اُن کو منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

خلیل
وصل کی شب پلنگ کے اوپر مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

فلق
پٹی کے نیچے بیٹھا رہا رات بھر فلق سوئے وہ اینڈ اینڈ کے سارے پلنگ پر

ناسخ
تیار رہتی ہیں صف مژگاں کی پلٹنیں رخسار یار ہے کہ خریدہ فرنگ کا

الغرض متقدمین میں وہ دلی کے ہوں یا لکھنؤ کے کوئی ایک شاعر بھی ایسا نہیں جس کا کلام اس قسم کی ظریفانہ آمیزش سے پاک ہو۔ ہاں اس میں کلام نہیں کہ افراط و تفریط نے اس رنگ کو بعض جگہ نہایت بدنما بنا دیا ہے

مگر غالب کی منظوم شوخیاں سب سے علیحدہ ہیں اور حد درجہ لطیف۔ وہ گھرے سے گھرے خیال میں بھی اپنے انداز بیان سے ایک بات ایسی پیدا کر جاتے ہیں کہ اگر کوئی چاہے تو بہت لطف لے سکتا ہے۔ ذیل کے شعروں سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے:—

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاشکے تم مرے لئے ہوتے

اس شعر میں جو شوخی انداز بیان سے پیدا کی گئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

منھ نہ دکھلائیے نہ دکھلا پر بانداز عتاب کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے
تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

ایک شاعر کو ایک عاشق کو استدعا کی سو سو جگہ ضرورتیں پڑتی ہیں اور جا بجا وہ اس رنگ سے کام لیتا ہے انھیں میں مرزا بھی ہیں۔ مگر ادائے خاص کے ساتھ وہ اس جذبہ کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ اور اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو خواہش رہتی ہے کہ ابھی اور کچھ کہتے۔

دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر　　کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

استہزا کے معنی لغت میں تمسخر کرنے کے ہیں۔ اور عوام کا یہ دستور ہے کہ دوسروں پر اکثر استہزا کرتے ہیں۔ مگر مرزا کہیں کہیں اس حربہ کو اپنے خلاف بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس وقت وہ اپنے آپ کو اپنا دشمن خیال فرماتے ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اسد یہ عجز و بے سامانی فرعون توام ہے　　جسے تو بندگی کہتا ہے دعوے ہے خدائی کا

بندگی و خدائی کا ذکر جس شوخی سے اس شعر میں ہوا ہے وہ غالب ہی کا حصہ ہے ؎

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب　　جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پہلے مصرع میں چار گرہ کا لفظ رکھ کر شوخی کی روح پھونک دی ہے ؎

جاتا ہوں جدھر اٹھتی ہے سبکی ادھر انگشت　　یکدست جہاں مجھسے پھرا ہے مگر انگشت

میں جہاں جاتا ہوں سب کی ادھر ہی انگلی اٹھتی ہے گویا سارا جہاں مجھ سے پھر گیا ہے بس انگلی ہی انگلی میرے ساتھی رہ گئی ہے کسقدر لطیف ظرافت ہے

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی　　بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

دوسرا مصرعہ بالکل ظرافت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے

مرزا کے آزادانہ جذبات میں بھی ایک ہلکا سا شوخ رنگ پنہاں ہے جو دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس طرح اپنی آزادی کو اسی انداز کی متین شوخی کے ساتھ فرماتے ہیں

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہمسے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

اس میں رنگ خاص بہت واضح ہے مندرجۂ ذیل شعر کے شوخ ارادے کو دیکھئے ؎

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام　　قدرت حق سے اگر حوریں یہی واں ہو گئیں

یا یہ:۔

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن		دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے		لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

عشق کی شان دیکھئے اور پھر یہ طنز یہ اطمینان

ظرافت اور افسوس دو مختلف النوع جذبوں کا جمع کرنا آسان نہیں مرزا ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرکے فرماتے ہیں ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا		اے دریغا وہ رند شاہد باز

مندرجۂ ذیل شعروں کی شوخی کو دیکھئے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں		رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

دہول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں		ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایکدن

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ		سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن		بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچہ سے ہم نکلے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں		آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ میرا ایمان ہے لیکن غالب		خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

اس میں شک نہیں کہ مرزا کی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کو معانی سے خالی سمجھ کر کہیں لفظ کا پابند بتانا بُرا ہے اور حقیقتاً ان کے کلام پر ایک تہمت تراشنا ہے ۔ مگر کیا کیا جائے کہنا ہی پڑتا ہے کہ دریا ہے جدہر بہہ نکلا بہہ نکلا پھر کسی کے روکے رک نہیں سکتا ۔ یہاں یہی غور کرنا چاہئے کہ ظرافت فی المعنی سے جدا ہوکر الفاظ میں کیونکر لطافت اور ظرافت کی روح پھونک دیتے ہیں ۔ جیسے

جادۂ راہ کشش کاف کرم ہے		لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

اسی طرح کا یہ شعر بھی ہے :۔

اسد قربان لطف جور بیدل		خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے	وحشت کدہ تلاش کرنے کے لئے
مغرور وفا نہو کہ جوں کاغذ باد	ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لئے

ایک جگہ بادشاہ کو دعا دیتے ہیں۔ مگر گڑگڑا گڑگڑا اور رو رو کر نہیں بلکہ ہنسکر۔ بات سیدھی کہتے ہیں مگر معنی آفرینی کی حد کر دیتے ہیں ؎

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے	تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ	ہے صفر کہ افزایش اعداد کرے

کسی کو دل دے کر مجبوراً لوگوں سے دل کا درد بھی کہنا پڑتا ہے۔ حالات معشوق سے بھی اطلاع دینی پڑتی ہے۔ مرزا بھی اس آئین عشق سے مجبور ہو گئے ہیں۔ جا بجا شکایات و حکایات کا دفتر کھولنا پڑتا ہے۔ لیکن اس طرح ؎

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد	مال سنی کو مباح اور خوان صوفی کو حلال

اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

سر کھجاتا ہی جہاں زخم سر اچھا ہو جائے	لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی	وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب	گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور	تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے	فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی
چھوٹی اسد نہ ہم سے گدائی میں دل لگی	سایل بنے تو طالب اہل کرم بنے

کہیں نواب علاء الدین خاں نے ایک غزل کی فرمایش کی آپ اظہار حال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی	ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

مندرجۂ ذیل شعروں کو افلاس میں سمجھئے یا بیان حال ؎

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو	اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہو	روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اسی طرح اس قطعہ میں افلاس اور بیان حال دونوں شامل ہیں مگر حد درجہ شوخی کے ساتھ ایک قصیدہ کے یہ شعر ملاحظہ ہوں

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں	ذوق آرایش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر	تا نہ دے باد زمہریر آزار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار
مری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
مری تنخواہ میں تہائی کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

مرزا کی بعض پھبتیاں ملاحظہ ہوں :-

معشوق کے دل لیجانے پر پھبتی ؎ شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
زاہد کی سیہ کاری پر پھبتی ؎ بسکہ ہیں در پردہ مصروف سیہ کاری تمام — استر ہے خرقۂ زہاد کا صوف مداد
خیالی پلاؤ پکانے والوں پر پھبتی ؎ تو پست فطرت اور خیال بسا بلند — اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

مرزا کہیں کہیں کسی کے خیال کو جھٹلاتے ہیں تو عجب پُرلطف اور نازک اور لطیف ظرافت کے ساتھ جھٹلاتے مندرجۂ ذیل اشعار کو دیکھئے۔

تکذیب چارہ گریا عوام ؎ پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا — یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
تکذیب بیان معشوق ؎ کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناسپاس ہیں — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
تکذیب نامہ بر ؎ طرف سخن نہیں ہے مجھ سے خدا نکردہ — ہے نامہ بر کو اس سے دعوائے ہمکلامی
تکذیب معشوق ؎ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا — بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

مرزا کہیں کہیں تنبیہ سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً مرزا زین العابدین کا انتقال ہوگیا ہے۔ مرزا اپنے تخیل میں اُن کو مخاطب کرکے کہہ رہے ہیں اور نوحہ کے ساتھ اپنے رنگ غالبؔ کو شامل کرتے ہیں کہتے ہیں

؎ تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
دوسری جگہ ؎ ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

معشوق کو ذکر غیر پر تنبیہ ؎ ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
دل کو امید حصول تمنا پر تنبیہ ؎ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

مرزا کی توجیہوں کا رنگ آپ نثر کے حصہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اب نظم میں دیکھئے :-

توجیہ کثرت مینوشی ؎ کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں : یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
توجیہ تخفیف عذاب ؎ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
توجیہ تیرہ بختی ؎ ہمیشہ مجھکو طفلی میں بھی مشق تیرہ روزی تھی سیاہی ہے مرے ایام میں لوح دبستاں کی
توجیہ بطلان قول معشوق ؎ مدعا در پردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
توجیہ رندی ؎ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
توجیہ ہیچمدانی ؎ دہن اوس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچ مدانی میری
توجیہ ناآشنائی ؎ کا نونپہ ہاتھ دہرتے ہیں کرتے ہوے سلام ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

متین آدمی اپنی حد سے گزر کر تمسخر پر بھی آجاتا ہے تب بھی وہ اپنی شان کو ملحوظ رکھتا ہے کیسا ہی کچھ کہے پھر بھی کچھ نہ کچھ متانت اُس میں ہوتی ضرور ہے۔ مرزا بھی کہیں کہیں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں ملاحظہ ہو

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

دعا مانگی۔ قبول نہیں ہوئی تو اب یہ تمسخر اپنی سوجھا ہے کہ وہ دعا مانگ رہے ہیں جو قبول ہو چکی شیخ سے تمسخر کرتے ہیں۔

شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

اپنے اوپر بھی کبھی کبھی ہنس لیا کرتے ہیں۔ اور غیروں کی طرح خوب بناتے ہیں ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

رندانہ۔ عاشقانہ۔ شاعرانہ چالاکیوں کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ اُن سے فی الواقع بہت بڑے اہم نتائج پیدا ہوں بلکہ برعکس اس کے شاعر کے فلسفہ کی طرح اون کا مقصد اصلی اکثر جگہ صرف دل خوش کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ مرزا کی بیان کی ہوئی چالاکیوں کو بھی ایک نظر دیکھ جائیے ؎

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
مگر لکھوائے اُسکو کوئی خط تو ہم سے لکھوائے　　ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

بیان حال اور حال کو قریب قریب ہی سمجھئے۔ مگر دونوں کو ایک نہ جانئے۔

حال اضطراب ؎　اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں　　کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا
حال خانمان عاشق ؎　خانمان عاشقاں دکان آتش باز ہے　　شعلہ رویاں جب ہوئے گرم تماشا جلگیا
حال وارادہ ؎　کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
حال دولت خانہ ؎　اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

حسن طلب اُسی طلب کا نام ہے جس میں کچھ شوخی ہو۔ کچھ ندرت بیاں ہو۔ کچھ ظرافت ہو۔ کچھ جدّت ہو۔ ان باتوں کی ضرورت ہر طلبگار کو ضرورت ہے اور خصوصیت سے ہر شاعر کو۔ اور مخصوصانہ طریق پر اوس کو جس کی طبیعت میں ظرافت خلقی مرزا کا ایک قطعہ بیان حال میں لکھا جا چکا اوس میں طلب جس شوخی اور حُسن سے کی گئی ہے اُسی کے لگ بھگ یہ شعر بھی ہیں مگر جذبات مختلف ہیں۔

حسن طلب توجہ ؎　بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات　　سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
〃　؎　غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض　　ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر
〃　؎　غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا　　وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
〃　؎　سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی　　مجھ پہ کیا گزریگی اتنے روز حاضر بن ہوئے
〃　؎　تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد　　تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے
حسن صفت　؎　ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مرزا کہیں کہیں عاشقانہ حماقتوں کا بیان کرتے ہیں تو لُطف آجاتا ہے۔ اول تو کسی کی حماقت یوں ہی ہنسنے ہنسانے والی چیز ہوتی ہے۔ مگر اوس وقت خصوصیت سے یہ شراب دو آتشہ ہوجاتی ہے جب اس میں ظرافت کا چھینٹا دیا جاتا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ آسمان کو غارت گر سبھی نے کہا ہے۔ مگر مرزا اُسے اپنی اسامی یا اپنا قرضدار کہکر اور فنی رنگ پیدا کردیتے ہیں۔

یاس ؎ فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

جیسا کہ نثر کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں اسی صورت سے یہاں بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ بمقتضائے بشریت کہیں کہیں مرزا کو خوشی بھی ہوتی ہے۔ مگر نظم میں فرق اتنا ہے کہ یہاں جسقدر جذبات ہیں انھیں محک عاشقی پر کسنا ضروری ہے اور وہاں سب جذبات صرف مرزا صاحب کی ذات سے مخصوص ہیں۔ پھر بھی رنگ ظریفانہ موجود ہے اور کچھ عجیب طرح کی خوشی ہے

فراغت کی خوشی ؎ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
خیریت کی خوشی ؎ میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
اضطرابی خوشی ؎ اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے — کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
مجبورانہ خوشی ؎ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

عاشق کو خوف کا ہر وقت سامنا ہوتا ہے اور ہر وقت آفت تازہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ مرزا اس سے کیونکر بچتے مگر اس جذبہ کے اظہار میں بھی وہی رنگ ہے ایک آدھ شعر نمونتاً دیکھئے ؎

تمھیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

دریافت حال تعجب کے ساتھ ؎ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

شوخی ہر حال میں شوخی ہے۔ اس کے متعلق چند شعر درج کئے جاتے ہیں

شوخی معشوقانہ ؎ کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا — خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت
" ؎ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
شوخی عاشقانہ ؎ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
شوخی معشوقانہ ؎ میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
شوخی ؎ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

طعن، طنز، رشک وغیرہ کے مضامین غالب سے بہتر شاید کسی نے مشکل سے کہے ہوں گے ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دل پر طنز	درس تپش ہے برق کو اب اسکے نام سے	وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا
عاشقانہ طنز	آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
زاہد پر طنز	ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا	وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
اپنے اوپر طنز	یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب	تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
" "	نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب	ترے بیمہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو
معشوق سے طنز	بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ	دل میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
واعظ پر طنز	کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ	پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
خضر پر طنز	وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
واعظ پر طنز	کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ	خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

غصہ کی حالت میں مرزا کی شوخی دیکھئے :-

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا | آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں | عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ایک جگہ تقدیر پر غصہ ہو کر کہتے ہیں

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی | مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

عشق کا قانون و آئین - اور مرزا صاحب کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے | قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

صحابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ | شہیدان وفا کا خونبہا کیا

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے | تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُسکی گردن پر | وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلا

بدقسمتی سے جیسے ہر شاعر میں تھوڑا بہت فلسفہ کا ذوق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی واعظ بھی ہو جاتا ہے

غالب نے اس رنگ کو جس شوخی کے ساتھ اختیار کیا ہے ملاحظہ ہو :۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں — اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ

بسمل اس تیغ دو دستی کا نہیں بچتا اسد — عافیت بیزار شغل کعبتین اچھا نہیں

سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بیخودی — منہ سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

مرزا کے انبساطی فقرے فارسی نثر میں

شوخی طبیعت نہ کسی زبان کی پابند ہوتی ہے نہ کسی آئین و مذہب کی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا کے جس رنگ کو دیکھنا ہو اُسے فارسی میں دیکھو کہ یہی چیز اُن کی مایۂ ناز تھی۔ اور اسی پر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر توجہ دلاتے تھے کہ ع

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ۔

مرزا اڑتیس اونتالیس برس کی عمر میں کلکتہ گئے۔ اون کے بعض دوست پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ مگر ان سے ملنے پر اور بھی نئے دوست پیدا ہو گئے۔ اور جس وقت کہ دلی میں واپس آئے تو ایک اچھی خاصی تعداد اون کے دوستو کی کلکتے میں موجود تھی۔ اونھیں میں سید علی اکبر خاں تھے جو ہوگلی بندر کے امام باڑہ کے متولی تھے۔ مرزا سے اور ان سے نہایت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی تھی۔ انھیں کے نام ایک خط میں آموں کی فرمایش کرتے ہیں۔ انداز بیان کی ظرافت آمیز ندرت دیکھئے۔ حسن طلب دیکھئے۔

"قبلۂ خدا پرستاں سلامت۔

ممدوح از ستایش مستغنی۔ و مادح در بیان نارسا۔ چہ گویم تا آبروئے خموشی نریزد و چہ گویم تا داغ کوتہ قلمی برنیز این عبودیت نامہ را قماش سلام روستائی است۔ و دائرہ ہر حرفش را پروا ز کاسۂ گدائی۔ شکم بندہ ام۔ و قدرے ناتواں۔ ہم آسایش خوان جویم۔ و ہم آسایش جاں۔ خرد وراں دانند کہ ایں ہر دو صفت با انبہ اندر است۔ و اہل کلکتہ بر انند کہ قلم و ہگلی بندر است۔ آرے انبہ از ہگلی۔ و گل از گلشن۔ ایثار از جناب۔ و سپاس از من۔ شوق می سگالد کہ ہر آئینہ تا پایان فصل دو سہ بار بخاطر ولی نعمت خواہم گزشت۔

وآزمی نالد۔ کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواہم گشت۔"

پہلے تو وہ اپنی شوخی القاب سے ظاہر کرتے ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو ان القاب آداب مزاج پرسی ظاہری تعریف سے قطع نظر کرکے کہتے ہیں۔ کہ بھئی نہ تمھیں تعریف سننے کا شوق۔ نہ مجھ میں تعریف کرنے کا دم۔ خط کو خط نہیں بتاتے بلکہ سلام روستائی کہتے ہیں یا کاسۂ گدائی پھر حسن طلب ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں۔ کچھ تو میں پیٹ کا بندہ ہوں اور کچھ ناتوان۔ لہٰذا اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ آرایش خوان۔ اور آسایش جاں۔ اب ایسی چیز کہاں ہے جس میں یہ دونوں صفات موجود ہوں۔ مگر لوگوں کی رائے میں یہ دونوں تعریفیں آم میں ہیں۔ اور کلکتہ والوں کا خیال ہے کہ آم ہگلی بندر میں ہوتا ہے۔ سچ ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ چار چیزیں چار جگہ ہیں۔ آم ہگلی میں۔ پھول باغ میں۔ ایثار جناب میں اور شکر خاکسار میں مگر ایک عجیب بات سنئے مجھ میں دو چیزیں ہیں۔ شوق اور حرص۔ دونوں مختلف الخیال۔ شوق تو کہہ رہا ہے کہ فصل بھر میں کم سے کم میرے آقائے نعمت دو تین بار مجھے یاد کریں گے۔ اور حرص کہتی ہے۔ کہ واہ۔ دو تین بار میں میرا کیا بھلا ہوگا۔

منشی محمد حسن مرزا کے کوئی خاص دوست تھے۔ اُن کے صاحبزادہ احمد حسن کی شادی ہوئی۔ مرزا کو قصیدہ نہیں تو کم از کم کوئی سہرا ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ مگر خدا جانے عدیم الفرصت تھے۔ یا فکر مند تھے۔ موقع نہ تھا۔ یا اور کوئی بات تھی کچھ بھی نہ کرسکے۔ آخر عذر میں ایک خط لکھا۔ جس میں سب کچھ لکھ گئے۔ کہتے ہیں کہ مجھ میں تصنع کی عادت نہیں۔ میری زبان میں ایک دل ہے اور دل میں ایک زبان ہے۔ ورنہ اس موقع پر میں بھی کچھ کہتا۔

"ہم در و دیوار را بسر جوش بہار اندودے۔ و ہم گوشہ و کنار گیتی را بفروغ نیر بخت چراغاں نمودے تار از طرۂ حور۔ و پود از بال پری آوردے۔ و نوآئیں نمطے درہم بافتہ بداں ہمایوں انجمن گستردے۔ بر بساط محفل میوہ و گل از طوبےٰ فشاندمے۔ و زہرہ را برامشگری و رضواں را بہ مہمانی خواندمے الخ"

مرزا کو اپنی جاگیر کے معاملہ اور مقررہ رقم کے لئے فرخ آباد جانا پڑا۔ وہاں نواب نے کچھ اُمیدیں دلائیں اور معاملہ کے انفصال کا اطمینان دلایا۔ اور مرزا صرف اسی وعدہ ...... پر مطمئن ہوکر دہلی چلے آئے۔ مدتیں ہوگئیں مگر کچھ انفصال معاملہ نہ ہوسکا۔ ناچار ہوکر مرزا علی بخش خاں کو جنھیں مرزا بھائی کہتے تھے۔ اور اپنا معین و مددگار سمجھتے تھے۔ ایک خط لکھا جس کا ہر فقرہ اُن کی دل برگشتگی اور انتظار کا پتہ دیتا ہے۔ دو تین فقرے غصہ اور انتظار کی انتہا کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اون کو اپنے خاص رنگ میں رنگا گیا ہے۔ جس سے اثر کم ہوا ہو یا زیادہ مگر لطف پیدا ہوگیا ہے فرماتے ہیں

"یکچند بامید نواب صاحب ساختم۔ و از تاب آتش انتظار گداختم۔ نشستہ ام بہ عذابے کہ مجرم بزنداں نشیند۔ و می بینم آنچہ کافر بہ جہنم بیند"

یک مرتبہ دوپہر کو ظہر کے وقت مرزا صاحب مفتی صدرالدین آزردہ کے یہاں پہونچے کنڈی ہلائی۔ اندر سے نوکر نکلا۔

جواب دے گیا کہ مفتی صاحب موجود نہیں ہیں۔ مرزا واپس آئے۔ اور آکر اسی روز مفتی صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں نوکر کے باہر نکلنے اور اپنے پلٹنے کو عجب دلکش انداز سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں۔

" همانا آں پرستار دراں بر آمدن کام دل دشمن بود۔ ومن دریں برگشتن بخت خویشتن "

شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کا دیوان طبع ہوا تو انہوں نے ایک جلد موسیٰ جان کی معرفت مرزا کے پاس بھی روانہ کی۔ مرزا نے جواب میں شکریہ لکھا۔ اور ایک نہایت لاجواب فقرہ بھی تحریر فرمادیا۔

" بخت را برسائی ستایم۔ وپندارم۔ کہ بہ طور معنی رسیدہ ام۔ خود را بہ گرانمائگی آفریں گویم وانگارم کہ موسیٰ را ید بیضا دیدہ ام "

مرزا کے ایک دوست لالہ ہیرالال ایک مرتبہ مولوی فضل حق خیر آبادی سے ملنے گئے۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا کے مکان کے قریب آگ لگی۔ مگر اتفاق سے مولانا کا نقصان بالکل نہ ہوا۔ یا ہوا تو اتنا کہ نہونے کے برابر تھا۔ جب واپس آئے اور مرزا سے ملاقات ہوئی تو اس حادثہ کی بھی خبر دی۔ مرزا نے فوراً مولانا کو ایک شکایتی خط لکھا۔ اور اس بات پر افسوس کیا کہ آپ نے اتنے بڑے جانکاہ حادثہ کی مجھے اطلاع بھی نہ دی۔ اور اسی ضمن میں چند فقرے دریافت خیریت کے لئے بھی لکھے۔

" ہائے اے وفا دشمن۔ بیگانگاں کامیاب پیام ونامہ۔ وآشنایاں جگر تشنۂ رشحۂ خامہ سہ

واے برمن کہ رقیب از تو مرا بنماید نامۂ واشدۂ مہر بہ عنواں زدۂ "

ایک مرتبہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا خط آیا۔ خط میں شعر وشاعری کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ مرزا نے پڑھ کر جواب دیا اور جواب میں دو ظرافت آمیز تشبیہیں بھی استعمال کر گئے اس زمانہ میں شانہ میں درد تھا فرماتے ہیں۔

" سحر گاہے کہ۔۔۔ دلم از درد شانہ چنانکہ مومن۔۔۔ مہر پیشہ از رنج ہمسایہ در آزار باشد بیقرار بود۔ سرشتے از در درآمد۔ وبہ سپردن بہار ساماں نامۂ گل بجیب تمنا ریخت۔

قدسی مفاوضہ از شعر وغزل چوں نامۂ اعمال زاہد از ذکرے وشاہد سادہ بود۔ "

دونوں جگہ تشبیہیں اسقدر نادر واقع ہوئی ہیں کہ خواہ مخواہ انبساطی رنگ میں آگئی ہیں۔ ایک جگہ دل کو مومن مہرپیشہ اور درد شانہ کو رنج ہمسایہ کہنا تو لطیف تھا ہی۔ خط میں جو شعر وشاعری کا ذکر نہ تھا اوس کو نامۂ اعمال زاہد کی طرح سادہ بنا کر قیامت کر دی۔

ایک مرتبہ شیفتہ مرحوم کا مدت تک خط نہ آیا مرزا نے اپنے رنگ میں یہ شکوہ کیا۔

مے رنجد از تحمل ما بر جفائے خویش ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

اگر بے پروائیست نمی بایست۔ واگر شکیب آزمائی است۔ نہ بدیں اندازہ روا بود۔ اگر از ناکسی با لتفات

نیرزم - ناکساں را بہ سخن دلیر کردن و ننگ شکوہ بے شکوہاں بخود پذیرفتن از چیست - و اگر ایں تغافلہاے بے محابا و فراموشیہاے جانگزا از عالم مکافات بمثل است مرا کہ بزہ مندم بہ گلہ نوا ختن و ساز پوزش مرا بہ نوا نیاوردن گناہ کیست ،،

الفاظ ایسے نہ سہی کہ اُن سے خندہ یا ضحک پیدا ہو۔ مگر پھر بھی یہ منطقی استدلال کسقدر لطیف ...... ہے کہ اگر بے پروائی ہی تو اتنی نہ چاہیے تھی - اور اگر صبر آزمائی ہو تو اتنی صبر آزمائی کی ضرورت نہ تھی - اور اگر نالائقی کی وجہ سے میں التفات کے قابل نہیں - تو پہلے مجھے دلیر نامہ و پیام کیوں کیا - اور اگر بدلہ لیا گیا ہے - اور میری غفلت کا جواب پا گیا تو پھر مجھے شکوہ سے کیوں محروم کیا گیا کیونکہ میں گنہگار تھا - مجھے متنبہ کیا جاتا۔

مفتی صدرالدین آزردہ سے ایک سفارش چاہتے ہیں اور عجیب طرح سے اپنا حق ثابت کرتے ہیں۔

" قبلۂ حاجات - اگر ایں بندۂ اندک شنو بسیار گوے - زود گستاخ - پریشاں را حق بندگی نیست - از کجا کہ بریں بے بضاعتی نتواں بخشود ۵

گیرم وفا ندارد اثر ہم بما گراے ۔۔۔ زیں سادگی کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما

سخن کوتاہ ہر گونہ عنایت کہ دراں کارسازی بکار رفتہ باقی درحق کرمی مرزا فاضل بیگ صرف گردد - اگرچہ آں صرف از اسراف بجائے رسد کہ بہرہ از بہر من نماند ،،

کسقدر عجیب استدلال ہے یہ کہ اگر میرا کوئی حق نہیں ہے تو میری بے بضاعتی پر رحم کیجئے - اس سے پہلے جو سفارش آپ کر چکے ہیں جو کچھ اس میں سے باقی بچی ہو وہ مرزا فاضل بیگ کے حق میں صرف کر دیجئے - چاہے یہ صرف اسراف کی حد میں آ کر یہاں تک پہونچ جائے کہ میرے لئے کچھ باقی نہ رہے۔

حکیم مومن خاں ہر سال تقویم بنایا کرتے تھے - اور اس فن میں کمال رکھتے تھے - مرزا کو اگرچہ نجوم میں بہت کم دخل تھا پھر بھی ایک مرتبہ حکیم صاحب کو لکھا کہ اگر اس سال کی تقویم تیار ہو تو ذرا بھیجدیجئے میں بھی نوروز کی کیفیت دیکھنا چاہتا ہوں - اور اس کے ساتھ ہی ایک مشہور و معروف لطیفہ اپنے انداز خاص میں بیان کر کے مزاحیہ رنگ پیدا کر دیا فرماتے ہیں

" زہے نادان ہوس پیشہ کہ می باشم - و بہ شرف نور خورشید خورسند گردم حقا کہ دل نہادن من بہ آثار نوروزی بچشم داشت فرخی و فیروزی از روے مثال بدا گویہ آں کنیز کم خرد و سال ماند - کہ چوں شب عید نشاطی تازہ در گرفت و بزمزمہ عید آمد و عید آمد نواے شادی بر گرفت خاتون گفت تن زن - اگر عید است و رمضان تو دُہماں نیم سوختہ نان ،،

یعنے بھلا میں نوروز دیکھ کر کیا کروں گا - میری بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی لونڈی نے عید کا چاند دیکھ کر خوشی کے جوش میں کہا کہ بیوی - بیوی - کل عید ہے - بیوی نے جھڑک کے کہا بیٹھ مردار عید ہو یا رمضان تجھے اپنی ٹکیہ ووئی سے کام۔

مسٹر اسٹرلینگ نے مرزا کی کار برآری کا وعدہ کر لیا تھا اور حتی الوسع وہ ان کے معاملہ میں کوشاں تھے اتفاقاً جوان ... مر گئے جس کا مرزا کو بیحد صدمہ ہوا - اسی زمانہ میں مولوی سراج الدین احمد کو جو غالباً لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں ملازم تھے ایک خط لکھا - جس میں اس جواں مرگ کی موت پر افسوس بھی ہے - اپنی بدقسمتی کا رونا بھی ہے - مگر بایں ہمہ جس رنگ سے اس کا اظہار کیا ہے - اس میں وہی خاص رنگ پیدا کر دیا ہے - فرماتے ہیں -

" حیرتے داشتم کہ بمرگ ناگاہ در گزشتن امیر چوں دولت جواں سال یعنی مسٹر اندر و اسٹرلنگ ستودہ خصال برائے چیست - و کار پردازان والا کدۂ قضا ازیں سانحہ سترگ کدام نتیجہ منظور دارند - حالیا حالے شد کہ بہ سیلاب فنا دادن بنائے امید داری غالب رمیدہ بخت میخواستند - وآں صورت نمی بست الا بظہور ایں طوفان ہوش ربا "

ذرا اس استدلال پر نظر ڈالئے - اور اس کے مختلف اثرات کو دیکھئے - کہ میں سوچ رہا تھا کہ مسٹر اسٹرلنگ کیوں مرے اور اس جوان موت سے کارکنان قضا و قدر کا مطلب کیا ہے - اب سمجھ میں آیا کہ اسٹرلنگ کے مار ڈالنے سے صرف میری امیدوں کو برباد کرنا منظور تھا - کیونکہ وہ امیدیں جو قایم ہو چکی تھیں اس کے بغیر فنا ہو ہی نہ سکتی تھیں -

مولوی سراج الدین احمد کو ایک جگہ القاب کے طریقہ پر یہ لطیف فقرے لکھتے ہیں -

" جانیکہ الطف اجزائے آں بہ تحلیل رفتہ وکدورتے چوں درد از بادہ و خاکستر از آتش نماندہ است اگر بپائے دوست افشانم ترسم کہ پائے نازنینش رنجہ گردد "

یعنے میرے پاس جان تو ہے مگر ایسی جان ہے کہ اوس کے تمام لطیف اجزا تو تحلیل ہو چکے - اب ایسی جان باقی رہ گئی ہے جیسے شراب میں سے دُرد - یا آگ میں سے خاکستر باقی رہ جاتی ہے - اوسے اگر آپ کے قدموں پر نثار بھی کروں تو اور یہ اندیشہ ہے کہ آپ کے قدموں کو بھی رنج پہونچے -

مولوی سراج الدین احمد نے ایک مرتبہ مدت دراز کے بعد خط لکھا - اور خط میں یہ تحریر کیا کہ میں سمجھتا تھا آپ مجھے بھول گئے ہوں گے اور وہ جوش و خروش محبت باقی نہ رہا ہوگا - مرزا صاحب نے جواب میں لکھا -

" نارسیدن نامہ ام را با افسردگی شوق حمل کردید چرا بمرگ من حمل نکردید تا از ادا شناسیہائے شما خورسند بودمے - و شمار اہل دل و دانشور شمردمے "

فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میرا خط نہ لکھنا افسردگی شوق کی وجہ سے ہے - یہ کیوں نہ سمجھا کہ میں مر گیا ہوں - تاکہ تمھاری ادا شناسیوں سے ذرا جی بھی خوش ہوتا اور تمھیں اہل دل سمجھتا "

مولوی سراج الدین احمد کے خط سے مرزا احمد کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی - ابھی مرزا صاحب کلکتہ جانے کا ارادہ ہی ارادہ رکھتے تھے - جا نہ سکتے تھے - سخت رنج ہوا اور جواب خط میں تعزیت کے طریق پر یہ دلچسپ فقرے لکھے - اتفاق

بالائے اتفاق یہ ہوا کہ مرزا احمد اپنے اور آخر ایام حیات میں دلی آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مرزا سے وعدہ بھی کر چکے تھے۔ کہ انتقال ہو گیا۔ اسی وعدہ سے متاثر ہو کر مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"میگفت کہ بدہلی می آیم۔ وعدہ فراموش بیمروت راہ گرداند۔ وناقہ بسر منزل دیگر راند گرفتم کہ خاطر دوستاں عزیز نداشت چرا بہ حال خورد سالان خود نپرداخت۔ ... ہنوز ہنگام مردن مرزا احمد نبود چرا آنقدر صبر نکرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے۔ دروے نظارہ فروزش وگر بارہ دیدمے۔ چرا آنمایہ درنگ نورزید کہ .. حامد علی جواں گشتے "

ایک مرتبہ مولوی صاحب موصوف نے مرزا کو لکھا کہ جو کچھ اس زمانہ میں کہا ہو وہ سب خط میں لکھ کر بھیجیے۔ مرزا صاحب نے جواب میں لکھا۔

"نفس در بادپیمائی درنگ ندارد۔ فزاواں خون خوردہ وجہاں جہاں پارۂ دل بدامن شمردہ می شود۔ اگر خواہم کہ ہمہ آں را بورق اندر آرم نامہ ازدرازی بہ کلکتہ رسد ورقم انجام گرائے نگردد"

فرماتے ہیں کہ کیا پوچھتے ہو بہت خون جگر کھایا ہے۔ بہت کچھ کہا ہے۔ اگر سب کو لکھنے کا ارادہ کروں تو کاغذ اتنا لمبا ہو جائے گا کہ دلی سے کلکتہ تک پہونچ جائے گا۔ اور پھر بھی سب نہ لکھ سکوں گا۔

ایک جگہ مولوی سراج الدین احمد صاحب کو خط نہ بھیجنے اور پہونچانے کا شکوہ لکھتے ہیں۔ اور یوں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں میدان حشر کا نقشہ کھنچ جاتا ہے فرماتے ہیں

"زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدین بترس از خدائے جہاں آفریں۔ کہ چوں قیامت قائم گردد۔ وآفرینہ گار بداد بہ نشیند۔ من گریاں وموبہ کناں دراں ہنگامہ آیم ودر تو آویزم۔ وگویم کہ ایں آنکس است کہ یک عمر مرا بہ محبت فریفت ودلم برد۔ من از سادگی بروفا تکیہ کردم۔ وایں را از دوستاں برگزیدم۔ نفس کم باخت۔ دمن بیوفائی کرد۔ خدا را بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد۔ وچہ عذر پیش خواہی آورد۔ وائے برمن کہ روزگارہا گزرد وخبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجا است وچہ حال دارد۔ اگر جفا پاداش وفا ست۔ بسم اللہ۔ ہر قدر توانی بیفزائے۔ کہ اینجا مہر ووفا فراوان است۔ لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ واگر خود ایں تغافل بیاد افراہ جرمے دیگر است نخست گناہ مرا خاطر نشان من باید کرد وآنگاہ انتقام باید کشید ما شکوہ درمیان نگنجد۔

دیکھئے باوجود اس سوز وگداز کے بھی اپنے مذاق کو اس طرح نباہا ہے۔ کہ غور کرنے پر وہ مذاق ہی مذاق رہ جاتا ہے۔ باقی کچھ نہیں ـــ

جب قاضی محمد صادق خاں اختر نے تذکرہ آفتاب عالمتاب لکھا تو مولوی سراج الدین احمد کی معرفت مرزا کو

بھی لکھا کہ کچھ انتخاب کرکے کلام بھیجئے۔ کچھ خاندانی حالات لکھئے۔ مرزا صاحب نے بہت سے عذر و معذرت کے بعد لکھا کہ جو کچھ بُرا بھلا کلام ہے وہ سب ایک دیوان میں جمع کر لیا گیا ہے۔ اوس سے انتخاب فرمائیے جب آپ خود صاحب ذوق ہیں، تو یہ کام آپ ہی کیجئے۔ رہا حالات لکھنا۔ سو میرے نزدیک تو یہ لکھ دیجئے تو مجھ پہ احسان ہوگا۔ اب ذرا اُن فقروں کو دیکھئے جو اپنی نسبت بتاتے ہیں۔

" از ناکساں روزگار۔ و بیکسان دہلی دیار مسلمان زادہ ایست کافر ماجرا۔ و گبرے است مسلمان نما۔ کہ از غلط نمائی غالب تخلص میکند "

مرزا اپنی پنشن وغیرہ کے معاملہ کے لئے جب فیروز پور پہونچے تو اتفاق سے نواب احمد بخش خاں صاحب تشریف فرما نہ تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مرزا انتظار ٹھہرے۔ مگر پڑے پڑے زمانہ گزر گیا نواب صاحب نہ آج تشریف لاتے ہیں نہ کل۔ عاجز آگئے۔ بیقرار دل اور ضرورت نے مجبور کیا۔ فوراً اُٹھے مجمل طرزی کو جو نواب صاحب کے معتمد خاص تھے ایک خط لکھا۔ اور دریافت کیا کہ خدا کے لئے سچ سچ اور جلد سے جلد لکھیے کہ نواب صاحب کب تک آئیں گے۔ میں پریشان ہوگیا۔ یہی لکھتے لکھتے چند فقرے لکھ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت کا گیت گاتے گاتے ظرافت کا مادہ ہیجان میں آگیا فرماتے ہیں۔

" ہویدا است کہ از قفس جستہ بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود۔ و از دست نے بناخن فرو رفتہ کدام عقدہ خواہد کشود۔ جلائے وطن۔ و عزم سفر۔ و احرام غربت۔ مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد دائے برنگوں طالعیہا۔ و رمیدہ بختیہائے کسے کہ اینہا را بارزو خواہد۔ ہرچند در وطن نیم اقرب نیز قیامت است۔ ہنوز با اہل کاشانہ راہ نامہ و پیام است۔ ہرچہ دیدہ میشد آشوب چشم بود۔ ہرچہ شنیدہ میشود زحمت گوش است۔ نیم جانے کہ از آں ورطہ بیروں آوردہ ام مگر و دلیعت خاک فیروز پور است۔ کہ مرا اینہمہ اقامت اضطراری اتفاق افتاد۔ و مرگے کہ منش بہزار آرزو از خدائے خواہم مگر ہمدریں سرزمین موعود است۔ کہ اینقدر درنگ افتاد گہار روداد "

نواب مصطفےٰ خاں کو ایک مشاعرہ کی بابت حال لکھتے ہیں۔ اور اس میں اپنے مشاعرے کی زبردستی شرکت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ کل جمعہ کا دن گزرنے کے بعد رات کو ایک مشاعرہ تھا۔ چونکہ میں نے غزل وزل کہی نہیں تھی۔ اسی تہی دستی کی شرمندگی کی وجہ سے بہت حیران تھا۔ اور مشاعرہ میں جانے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ نواب ضیاء الدین خاں سلمہٗ نے دو فرشتے میرے اوپر مقرر کر دئے۔ زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو۔ یہاں تک تو سیدھی سیدھی طرح حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنا وہی رنگ شروع کر دیا ہے فرماتے ہیں کہ

" ایں ہردو ابرام پیشہ شام گاہ بخلوت من آمدند و فیل آوردند۔ و بد انساں کہ شیر را جہل

شکار کنند بر فیل بار کنند مرا گمن بردند"

نواب علی بہادر مسند نشین باندہ نے جو مرزا کے نادیدہ دوست اور شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ منشی نادر حسین خاں آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں مرزا نے جواب میں یہ فقرہ لکھا۔

"بخدمت مشفقی شفیقی منشی نادر حسین خاں صاحب سپاس مے گزارم وسلام عرضہ میدارم دانستم کہ دیدن غالب را طالب اند حاشا کہ ایں داعیہ تنہا از انسو باشد۔ اگر بسیار فروتنی کنم گویم کہ شریک غالب"

ایک مرتبہ مولوی رجب علی خاں کو مارچ ۱۸۵۱ء میں ایک خط لکھا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں مولانا کا ایک خط آیا۔ جس میں انھوں نے ارقام فرمایا کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ فکر ہے۔ مرزا صاحب نے جواب میں وہ فقرے لکھے کہ حقیقتاً قیامت ہی کردی فرماتے ہیں۔

"یارب آں نیایش نامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و پنجاہ و یک عیسوی رواں داشتہ ام تا مارچ سال دیگر رواں۔ نہ نامہ ہرزہ عنواں۔ و نہ فرستندہ عبارت از مولانا محمد با قراست نا پرداہما ناآں نامہ خود از فراوانی بار مضامین شوق بر برندگان آں مایہ گرانی کردکہ آں بہ سبکروی گرامایگان یعنی بریدان ڈاک انگریزی راہے بطول دو صد کردہ جز بفرض یک سال نتوانستند برید"

یعنی یا اللہ جو خط مارچ ۱۸۵۱ء میں بھیجا گیا ہے۔ وہ مارچ ۵۲ء تک رواں ہے۔ یہ بات کیا ہے نہ خود خط بیہودہ نہ خط لکھنے والا۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نامہ مضامین شوق سے وزنی ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ خط لے جانے والوں کو اتنا بوجھل معلوم ہوا کہ دو سو کوس کا راستہ ایک سال کے بغیر طے نہیں کرسکتے۔

مرزا کی فارسی نظم میں ظرافت

فرماتے ہیں:۔

زانچہ دل زہم پاشد دل چہ طرف بر بندد   یا مجال گفتن دہ یا نہ گفتہ باور کن

ایسی چیز جو دل کے ٹکڑے اڑائے دیتی ہے۔ بھلا دل اس کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔ لہٰذا یا تو آپ اس کے کہنے کی مجھے اجازت دیدیجئے یا بغیر کہے یقین کرلیجئے۔

بخون من اگر ننگست دست وخنجر آلودن   نوید وعدہ کز انتظارم میتواں کشتن

اگر میرے خون میں دست و خنجر کو آلودہ کرنا باعث ننگ ہے تو اس کی آسان ترکیب ہے۔ ایک وعدہ کرلیجئے انتظار کرتے کرتے آپ مرجاؤں گا

طاق شد طاقت ز عشقت برکراں خواہم شدن		مہرباں شو ورنہ برخود مہرباں خواہم شدن

سنئے حضرت مجھ میں اب آپ کے ناز اٹھانے کی تاب و طاقت بالکل نہیں ہے۔ یا تو مجھ پر آپ مہربان ہو جائیے۔ ورنہ میں اب اپنے اوپر مہربانی کرتا ہوں ؎

جان داد بہ غم غالب خوشنودی روحش را		در بزم عزا میکش در نوحہ غزلخواں شد

غالب کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی روح پر فتوح کو یوں ثواب پہونچائیے۔ کہ مجلس عزا میں بیٹھ کر شراب پیجئے اور نوحہ میں غزل خوانی کیجئے۔

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بہ غارت بر		برخرمن ما برقے برمزرعہ باراں شو

اگر لوٹنے کا ارادہ ہے تو پہلے سرمایہ عنایت فرمائیے۔ خرمن پر آپ برق بنتے ہیں تو کھیت پر باران رحمت بنئے۔

یارب جہانیاں دل خرم دہ ؛		در دعوی جنت آشتی باہم دہ

شداد پسر نداشت باغش از تست		آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

اللہ تعالے سے استدعا کر رہے ہیں کہ اے خدا یہ دنیا والے جو جنت کے دعویدار ہیں۔ ان کو صلح کر لینے کی توفیق عنایت فرما۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شداد کا کوئی وارث نہیں تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کا باغ ضبط کر لیا گیا مگر جنت کا باغ ہمارے دادا آدم کا تھا۔ آدم کا مسکن بنی آدم کو مل جانا چاہئے۔ اون کی تو اولاد موجود ہے۔ شداد کی طرح وہ لاولد نہیں تھے۔

خروش حلقۂ زنداں زنا زنیں پسرے است		کہ سر بزانوے زاہد بہ بوریا خفت است

دلم بہ سبحہ و سجادۂ و ردا لرزد ؛		کہ دزد مرحلہ بیدار و یار ساخفت است

صہبا حلال زاہد شب زندہ دار را		اما بہ شرط آنکہ ہماں صبحدم کشد

آخری شعر میں فرماتے ہیں کہ صہبا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حلال نہ ہو حلال تو زاہد کے لئے بھی ضرور ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ رات کو نہ پیئے بلکہ..... صبحدم پیئے۔ اس شرط میں جو ایک ہلکا سا تبسم ہے غالباً اوس کا اعادہ اور اظہار بیکار ہوگا سمجھنے والے خود ہی جتنا غور کریں گے لطف اٹھائیں گے یعنی رات کو تو سبھی پیتے ہیں۔

نازم مومن و کافر برچہ دستگاہ آخر		سبحۂ و مسواکے تشقہ و زنارے

فرماتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر اتنے کس چیز پر اتراتے اور اینڈتے پھرتے ہیں ان کے پاس رکھا کیا ہے۔ ان کو مقدور کیا ہے مومن کے پاس ایک تسبیح اور مسواک ہے۔ کافر کے پاس ایک تشقہ اور زنار۔ لاحول ولاقوۃ یہ مایۂ بساط اور اس پر یہ جوش و خروش۔

بسکہ دیوار و در از دود دلم گشت سیاہ   کلبۂ من بہ سیہ خانۂ لیلیٰ ماند

اپنے گھر پر پھبتی کہتے ہیں کہ میرے دود آہ سے سیاہ ہو کر خیمۂ لیلیٰ بن گیا ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گذشت   رشتۂ عمر خضر مد حساب بیش نیست

فرماتے ہیں کہ خضر کا رشتۂ عمر - مد حساب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہنگامے سے علیحدہ مزے سے بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں

موئے کہ برون نامدہ باشد چہ نماید   بیہودہ در اندام تو جستیم میاں را

معشوق کی کمر کو ایک ایسا بال بتایا ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نداشت   خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

بہشت کو کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے رنگ فراہم ہوگئے تھے۔ اور مصرف کوئی تھا نہیں لہذا بھرتے اوس کو اپنے طاق نسیاں کی زیب و زینت بنا دیا ہے

آخر عمر میں مرزا کو دنیا سے حقیقی نفرت سی ہوگئی تھی اور وہ ہر وقت چاہتے تھے کہ زمانہ کی آشوبناکی سے علیحدہ دور بر طرف رہ کر زندگی بسر کریں۔ جابجا اسی خواہش اور تمنا کا ذکر کیا ہے کہ الگ ایک گوشۂ فراغت میں زندگی بسر کریں کوئی نہ ستانے والا ہو اور کوئی جی خوش کرنے والا ہو۔ اس کو فارسی نظم میں یوں ظاہر کرتے ہیں

غالب، روش مردم آزاد جدا است،   رفتار اسیران رہ و رزاد جدا است

ما ترک مراد را آرام میسر دانیم   دال با غنچۂ ضبطی شد جدا است

واعظ سفید پوش کی ایک تشبیہ ملاحظہ فرمائیے جو سنگ رخام کی لوح مزار سے دی گئی ہے فرماتے ہیں۔

گر واعظ دل مردہ سفید است ز دانش   خود لوح مزارے است کہ از سنگ رخام است

عید کا منظر دکھاتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ آج زاہد بھی حجرے سے نکل آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانور پنجرے سے چھوٹا ہے۔

زاہد بہ نشاطے زدہ از حجرہ بدر گام   کز کنج قفس مرغ گرفتار بر آمد

اس جگہ کہتے ہیں۔ کہ زاہد لوگ جو خلد یا لطیع جنت کے درختوں کی شاخوں سے میوہ کھاتے پھرتے ہیں یہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی بڑے سبزہ زار یا بڑی چراگاہ میں چند چوپائے حسب منشا گھاس چرتے ہوئے پھرتے ہیں

گر دیدن زاہداں بجنت گستاخ   وین دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ

چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ   مانند بہائم و علف زار فراخ

اس جگہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جس کو دیکھئے جاہل ہی نظر آتا ہے اگر تھوڑا تھوڑا فرق ہے بھی تو ایسا ہے جیسے خر عیسیٰ اور

خرد جال میں -

ہر چند زمانہ مجمع جہال است　　　وز جہل نہ حال شاں بیک منوال است
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے　　　فرق خر عیسیٰ و خر دجال است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی مصیبت میں ہیں ہماری تمنا اور خواہش بہشت سے آگے بڑھ گئی ہے یعنی جنت ہماری نگاہ میں کچھ بھی نہیں ہے - اور اُدھر حالت یہ ہے کہ جنت سے بڑھ کر کوئی جگہ پیدا نہیں ہوئی

یا تمنائے من از خلد برین نگزشتے　　　یا خود امید گہے درخور آں میبایست

ایک جگہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش آسمان گر پڑے - اور اس شوق میں یہ بھی پروا نہیں ہے کہ ہم دب جائیں گے - کہتے ہیں کہ آسمان گرے ضرور چاہے ہمارے ہی سر پر گرے -

خوشا کہ گنبد چرخ کہن فرو ریزد　　　اگرچہ خود ہمہ بر فرق من فرو ریزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں جو میں اُس سے کہنا چاہتا ہوں - مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ نازک مزاج ہے - بھلا یہ سب خرافات کاہے کو سنے گا کوئی ایسی ترکیب ہونا چاہیئے کہ یہ سو کی سو ایک ہو جائیں - اس کی ترکیب یہ ہے کہ اوس کے لب پر لب رکھ کر مر جانا چاہیئے -

لب بر لب دلبر نہم و جاں بہ سپارم　　　ترکیب یکے کردن صد ملتمس است ایں

ایک جگہ کہتے ہیں - میاں غالب ہم نے یہ مانا کہ آپ بڑے سخن گو ہیں - اور اس وقت کوئی آپ کا مدمقابل نہیں ہے - مگر جناب کے دماغ میں شے لطیف کی بہت کمی ہے - آپ کی خواہش یہ ہے کہ شراب مفت بھی ملے - نادر اور نایاب بھی ہو اور بہت سی بھی ہو - سو حضرت یہ تو ممکن نہیں ہے بادہ فروش کوئی ساقی کوثر تو ہے نہیں کہ یہ سب باتیں آسانی سے آپ کو میسر ہو سکیں -

غالب بہ سخن گرچہ کسے ہمسر نیست　　　از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
می خواہی و مفت و نغز وانگہ بسیار　　　ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

غالب میدان قیامت میں ہیں - اور تمام عمر کے گناہ معاف کر دئے گئے ہیں - آپ گناہ بخشنے والے سے کہتے ہیں - کہ ذرا میری بے مائگی پر رحم فرمائیے - کہ آپ کے دست کرم نے عمر بھر کے گناہوں کو ایک اشارہ میں برباد کر دیا - میں بھی کسقدر تنک مایہ اور کم حیثیت آدمی نکلا -

برتنک مائگیم رحم کہ یک عمر گناہ　　　ہم بتاراج سبکدستی بخشودن رفت

کسی شاعر سے کہتے ہیں کہ اگر آپکی غزل میری غزل سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے اور اُس پر چیخ پکار زیادہ ہوتی ہے تو تعجب کیا ہے - چنگ سے ہمیشہ ڈہول کی آواز زیادہ ہوتی ہے - حالانکہ چنگ چنگ ہے اور ڈہول ڈہول -

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ کے بہ بزم گوئی فلاں در شعر ہم سنگ من است
راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جا طعن کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ من است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بڑے بیوقوف ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں حسینوں میں وفا نہیں ہوتی - وضعداری نہیں ہوتی یہ جھوٹ ہے - اور بالکل جھوٹ ہے - ہمارا تجربہ ہے ہمارے معشوق نے جب سے جفا کرنا شروع کی ہے آجتک برابر جفا کرتا چلا جاتا ہے - عمر گزر گئی اور اس نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا -

عمرے بسر گذشت وہماں بر سر جفاست گویند بتاں راکہ وفا نیست چرا نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جاہتا تو میرا محبوب بھی یہی ہے کہ میں مرجاؤں - مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہتا - کہ ایسا نہو یہ سن کے میں خوشی سے جان دیدوں - کیونکہ اس کو میرا مرنا گوارا ہے مگر خوشی سے مرنا گوارا نہیں -

ز بیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی نگوید ارچہ بمرگ من آرزو منداست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب اگر میں التفات کے قابل نہیں ہوں تو نہ سہی - آرزو اور تمنا تو کرنے دیجئے - آپ تو جانتے ہیں غریب مفلس آدمی کی خوشی کیمیا سازی پر مبنی ہوتی ہے ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ سونا بنائیں - مگر عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں بنا سکتا - ایسے ہی میری آرزوئیں ہیں -

بہ التفات نیرزم در آرزو چہ نزاع نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی ست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم کو اس بات کا بالکل اطمینان ہے کہ جہنم کو ہمارے جلانے کی نوبت ہی نہ آئے گی - غم ہمکو روز گھلاتا جارہا ہے - لہذا اخیر عمر تک گھل جائیں گے - اور جہنم تک جانے کا قصہ ہی نہ رہے گا -

نیست وقتی کہ بما کاہشے از غم نرسد نوبت سوختن ما بہ جہنم نرسد

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کیا تم اس بات سے ڈرے جاتے ہو کہ میں حشر کے دن داور حشر کے سامنے شکایت کرنے بیٹھوں گا - یہ سب تمھارا خیال ہے - ہجوم نالہ کی وجہ سے اتنی بھیڑ ہوگی کہ میرے لب سے ایک نالہ بھی نہ نکل سکیگا -

زمن مترس کہ نالہ بہ پیش داور حشر ہجوم نالہ ہم را ز نالہ وا دارد

ایک جگہ زاہد یا اپنے کسی دوسرے ہم نشین سے کہتے ہیں کہ بھائی صاحب شیطان سے آپ ڈرئے - آپ کے پاس دین و ایمان ہے - ہمارے پاس نہ دین ہے نہ ایمان ہمیں خوف و فکر کی کیا ضرورت -

تو داری دین و ایمانے بترس از دیو رہزن نکش چو نبود توشہ راہے چہ باک از رہزنم باشد

ایک جگہ ناصح سے کہتے ہیں کہ بابا کیوں تو میرے سر ہو گیا ہے - میں کافر ہو گیا ہوں تو کیوں برا سمجھتا ہے - ذرا ابراہیم کو دیکھ

انھوں نے بھی تو دین آذری کو ٹھکرا کر ملت ابراہیمی جاری کردی تھی۔ بات یہ ہے کہ جو اہل نظر ہیں وہ پرانی لکیر کے فقیر نہیں رہتے ہیں۔

بامن میاویز ای پدر فرزند آذر را نگر　　ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ایک جگہ بتاتے ہیں کہ یہ جو صحرا میں ہم ہر خار پر اپنا خون دل چھڑک رہے ہیں یہ بیکار نہیں ہے۔ ہم فن باغبانی صحرا کی ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل　　قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

ایک جگہ منصور کے دار پر چڑھنے کے واقعہ کو اس شوخی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ جو واحد کو واحد ہی کہتے اوس کا انجام تو یہ ہوتا ہے جو منصور کا ہوا۔ اور جو دو کہتے ہیں ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے

منصور فرقۂ علی اللہیاں چہ بود　　در داستان خطر زہمنشیاں چہ بود
چوں عاقبت یگانہ بیناں دار است　　دریاب کہ انجام دو بیناں چہ بود

آپ کے ایک دوست مرزا الف بیگ کی پیرانہ سالی میں لڑکا پیدا ہوا۔ انھوں نے ہمزہ بیگ اوس کا نام رکھا۔ مرزا نے مبارکباد کا یہ قطعہ لکھکر بھیجا۔ جس میں توجیہ کی ایک ایسی ظرافت کی گئی ہے کہ شاید مرزا کے سوا دوسری جگہ نہ ملے۔ عربی میں الف کو بھی ہمزہ ہی کہتے ہیں۔ اسی کو مد نظر رکھ کر مرزا کہتے ہیں کہ الف بیگ کے لڑکے کا نام ہمزہ بیگ کیوں نہ ہوتا۔ الف جب منحنی ہوتا ہے تو ہمزہ کہلاتا ہے۔ الف کا منحنی ہونا الف بیگ کے بڑھاپے کی اولاد پر بہترین روشنی ڈال رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ باپ کے خصوصیات بیٹے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

چوں الف بیگ در کہن سالے　　پسرے یافت سر بسر غمزہ
نام او ہمزہ بیگ کرد بلے　　الف منحنی بود ہمزہ

ولیعہد رام پور کی جب شادی ہوئی تو نواب یوسف علی خاں کے حضور میں مرزا نے بھی ایک تہنیت کا قطعہ لکھکر گزرانا جس میں سے یہ دو شوخ شعر قابل انتخاب ہیں۔ جن میں فرماتے ہیں کہ خدا کرے ہر ضرورتمند کو اُس کی ضرورت کے موافق ملے۔ اور مجھے دو چار شراب کی بھری بوتلیں مبارک ہوں

بطالباں زر و سیم و زر سرخ　　بسائلاں تہی کاسہ ناں مبارکباد
بمن کہ تشنہ لب بادہ ہائے پرزورم　　از انمیاں دو سہ رطل گراں مبارکباد

کسی سے کوئی سوال کرنا۔ کچھ مانگنا۔ اپنی حاجت کا اظہار کرنا عیب ہے۔ مگر نہ اس طرح جیسے کہ مرزا کوئی سوال

کرتے ہیں۔ مگر مرزا یوں سوال کر رہے ہیں۔ کہ ساقی تجھے معلوم ہے میں پشنگ اور افراسیاب کی اولاد سے ہوں اور اس طریقہ سے تو نے سمجھ ہی لیا ہوگا کہ میں جمشید کی اولاد میں ہوں۔ لہذا مجھے میراث جمشید ملنا چاہیے۔ شراب جو جم کی طرف سے وراثتاً مجھ کو پہونچتی ہے وہ اب دے دے۔ اس کے بعد بہشت تو مل ہی جائے گی۔ کیونکہ میں آدم کی اولاد ہوں اور بہشت آدم کی میراث ہے۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ می بود اکنوں بمن سپار
زاں پس بہشت کہ میراث آدم است

پنشن کے بند ہونے پر مرزا نے جتنی جتنی کوششیں کی ہیں اوس کا حال اون کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں لیا۔ ہر دوست آشنا کو لکھا۔ جب حکام بالا تک ۔۔۔۔ یہ معاملہ گیا تو لندن میں اپنے کسی انگریز دوست کو اس معاملہ کی طرف یہ کہکر توجہ دلائی کہ جہاں تک جلد ممکن ہو میرا یہ کام کر دیجئے۔ اسی عرضداشت میں ممدوح یا مکتوب الیہ کی مدح۔ اپنی بدنصیبی کا نہایت خوش اسلوبی سے یہ کہکر بیان کر دیا ہے۔ کہ جناب جو کچھ کرنا ہے جلد کیجئے۔ اور کہیں میرے اس کہنے سے بدگمان نہ ہو جائیے کہ مجھپر بھروسہ نہیں کیا ہے۔

بہ التفات تو صد گونہ اعتمادم ہست
ولے شتاب کہ بر عمر اعتمادم نیست

نواب یوسف علی خاں مرحوم سابق والی رامپور کو جب گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ریاست عطا ہوئی تو مرزا نے مبارکباد کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ کچھ دے ڈالئے، میرا مطلب خلعت ریشمی نہیں حریر نہیں ایک کمبل ہی سہی۔

مقصود از لباس ہماں پوشش تنست
پوشش گر از حریر نباشد گلیم باد

معشوق سے آنے کی التجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا اگر تو میرے انتظار کا یقین نہیں کرتا تو نہ کر لڑنے کے لئے چلا آ۔ بہانے نہ کر۔

زمن گرت نبود باور انتظار بیا
بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

ایک جگہ معشوق کو بلانے کی یہ ترکیب نکالی ہے۔ کہتے ہیں ہاں صاحب ٹھیک ہے میں کہتا ہوں کہ پھول گلشن میں بہت عمدہ ہوتا ہے۔ پھر اس میں بحث کیا ہے۔ آپ غصہ میں باہر چلے آئیے اور آکر مجھ سے لڑئیے۔

بے پردہ سوز غصہ والزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش است بہ گلشن درین چہ بحث

ایک جگہ معشوق سے کہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمھیں آنا چاہیے۔ غیر کے گھر کی طرف سے نہ آؤ تو دوسرے رستہ سے آؤ۔ مگر آؤ ضرور۔ تم نے کہا تھا کہ تجھے بلانا نہیں۔ میں تمھاری موت ہوں۔ اچھا اب اپنے قول پر قائم رہو۔ میں نہیں بلاتا ہوں موت کی طرح بے بلائے چلے آؤ۔

ای دوست لب سوای فرو مانده بیا | از کوچہ غیر راه گردانده بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ توام | بر گفتہ خویش باش و ناخوانده بیا

شعرا کی دعا سراپا مبالغہ اور سراسر اغلاق وغلو میں ڈوبی ہوئی ہوا کرتی ہے۔ مگر مرزا نے کہیں کہیں اس روش کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور نہایت سادگی کی کوشش کی ہے۔ اس میں اگر اون کی کوئی کاوش ہے تو یہ ... کہ اُن کی ظرافت اور ہلکی ہلکی شوخی نہ جانے پائے۔ نواب یوسف علی خاں کی مدح میں جو ایک قطعہ کہا ہے اوس میں دعائیہ شعر یہ لکھا ہے ؎

ہر دم ترا بخلوت راز و ببزم انس | روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

مرزا کی سوگوارانہ زندگی پر نظر دوڑانے والے پہلی ہی نظر میں اُن کی برگشتہ بختی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کے مصائبِ حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مگر اس اندازِ کمال کو دیکھئے کہ مرزا جہاں کوئی اس قسم کا واقعہ بیان کرتے ہیں اسکو اسطرح رنگ دیتے ہیں کہ اس میں حزن و ملال ...... کے پہلو ہی میں ایک نشاط آمیز تصویر بھی بنا دیتے ہیں۔
ایک قطعہ میں اپنی بدنصیبی کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں۔ کہ میاں غالب آخر یہ بات کیا ہے کہ تم آج کل اسقدر مفلس و محتاج ہو رہے ہو۔ نہ کھانے کا سامان ہے نہ پینے کا۔ نہ کہیں سے پیسہ ملتا ہے نہ ٹکا نہ کوئی اپنوں سے نفع پہونچتا ہے نہ بیگانوں سے۔ جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا رزاق ہے اور بندوں کے رزق کا کفیل ہے پھر آخر تمھیں کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نہ تو خدا بخیل ہے۔ اور نہ آپ ابھی مر ہی گئے ہیں۔ تو یہ کیا قصہ ہے۔ کہ تم قوت لایموت کے لئے بھی محتاج ہو۔ کچھ نہیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عرصہ سے تمھارا آب و دانہ اٹھایا جا چکا ہے اور تمھارے مار ڈالنے کا حکم اللہ میاں کے یہاں سے جاری ہو چکا ہے۔ فرشتۂ رزق بالکل بے خطا ہے اگر تمھارا رزق ہوتا تو ضرور تم کو پہونچتا۔ مگر فرشتۂ موت حضرت عزرائیل۔ خدا انھیں زندہ رکھے کچھ ڈھیل ڈال رہے ہیں۔ اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ مکمل قطعہ ملاحظہ فرمائیے

آیا زیاں زدہ غالب کہ از حدائقِ بخت | نمی رسد بتو خار و خسے ز ہیچ سبیل
چو لازم است کہ پروردگار تا دمِ مرگ | بود برزق ضروریۂ عباد کفیل
چراست اینکہ نداری بخور از سیاہ و سپید | چراست اینکہ نیابی بر از کثیر و قلیل
فتادہ در سر این رشتہ عقدۂ ورنہ | نمردۂ تو و لے رازق العباد بخیل
ز چند سال بمرگ تو و تباہی رزق | شدا ست حکم خود از پیشگاہ رب جلیل
فرشتہ کہ وکیل است بر خزائن رزق | نکرد ہیچ توقف برزق در تعطیل
دوم فرشتہ کہ یادش بخیر معزول باد | روا نداشت در اہلاک شیوۂ تعجیل

لطیفۂ کنم از قول شاعرے تضمین　　که در لطیفہ مراد اکسے نبود عدیل
اگر خدائے بداند کہ زندۂ تو ہنوز　　سزا رمشت زند بر دہان عزرائیل

ایک جگہ اپنی بیکسی اور تنہائی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے دربان اور چوکیدار
مانده ام تنها بکنج از دورباش این وضع　　خانه دارم که پندارند دربانش منم

ایک جگہ اپنی بہشت کا حال بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے بہشت میں اگر کوئی پھلنے پھولنے اور بڑھنے والا درخت ہے تو دوزخ کا زقوم ہے۔
نور خرد در آگہی خواہش تن پدید کرد　　صرف زقوم دوزخ است نامیہ در بہشت ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ زمانہ کے غم و رنج نے ہمیں ہر طرح سے تباہ کیا۔ ایک طرف تو خاص لوگوں کے عیش و عشرت نے تباہ کیا دوسری طرف عوام کی آزادی اور فارغ البالی نے
غالب غم روزگار ناکام کشت　　از تنگی دل بحلقۂ دام کشت
ہم غیرت سربزرگی خاصم سوخت　　ہم رشک نشاطمندی عام کشت

اسی طرح کی یہ رباعی ہے اور اس میں بھی وہی شوخی بیان موجود ہے کہتے ہیں۔ کہ ساقی روز ازل نے میری قسمت کے پیمانہ میں زہر ہی زہر بھرا ہے کسی طرح چین نہیں ہے تو سعادت و نحوست کو لئے پھرتا ہے۔ یہ سب فضول ہے مجھے سعادت نے بھی مارا اور نحوست نے بھی۔
آنم که به پیمانۂ من ساقی دہر　　ریزد ہمہ دُرد درد و تلخابہ زہر
بگزر ز سعادت و نحوست کہ مرا　　ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

جن لوگوں نے مرزا کا یہ شعر پڑھا ہو گا۔
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
وہ یقینی واقف ہوں گے کہ شکوہ و شکایت میں مرزا کا کیا درجہ ہے۔ اور کس پایہ کے خیالات ان کی شکایتوں میں مخفی ہیں۔

مثنوی ابر گہر بار میں ان کے مناجات کا وہ حصہ جہاں خدا سے انھوں نے گفتگو کی ہے۔ غالب کا شاہکار شوخ بیانی ہے

قیامت قائم ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ نہ کوئی کسی کا یار ہے نہ غمگسار ہے۔ میزان عدل قایم ہے لوگوں کے

نامۂ اعمال وزن کئے جا رہے ہیں۔ کسی کا نیکی کا پلہ بھاری ہے۔ کسی غریب کی بدیاں نیکیوں پر غالب ہیں۔ آل کار پر نظر تصویر حیرت بنا ہوا کھڑا ہے۔ غرض کہ یہ ہنگامہ ہے اور اسی ہنگامۂ دار و گیر میں مرزا صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ بارگاہ کبریائی سے حکم ہوتا ہے۔ کہ اس بندے کے بھی اعمال تولو۔ مرزا سنتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں۔ کہ نامۂ اعمال میں بجز بدی کے کیا رکھا ہے۔ اور اس سے رسوائی کے سوا کیا نتیجہ ہے۔ بڑھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بارخدایا مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہو یہ عرض کرتے ہیں کہ اے میرے مولا۔ میں تیرا ایک بے بضاعت نالائق بندہ ہوں۔ میری خطائیں معاف کر۔ اور اعمال کے تولنے کی زحمت نہ فرما۔ اس کے تولنے میں کیا رکھا ہے۔ اور خواہ مخواہ میرے داغ ہرے ہوں گے۔ اگر ایسا ہی ضرور ہے تو میرے رنج و غم کو تول لے۔ میرا سرمایۂ عمر تو سوائے رنج و غم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور اب اس کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ وہ تو جو کچھ کیا دھرا ہے تیرا ہی ہے۔ جو رنج دئے ہیں تو نے ہی دئے ہیں۔ حسرت سے تو نے مجھے پیدا کیا اور ادسی سے میرا خمیر کیا۔ میرے لئے خود میرا دم سرد زمہریر کی برابر ہے تو پھر کیا اب مجھے دوزخ میں ڈالنے اور عذاب دینے کی فکر کر رہا ہے۔ اور اگر ایسا ہی عذاب دینا منظور ہے۔ تو پھر اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تو سمجھ لے حساب کتاب ہو گیا۔ اور مجھے دوزخ میں بھیجدیا۔ اور اگر تو یہ نہیں مانتا ہے۔ اور میرا حساب و کتاب ہونا ہی ضروری ہے تو پھر مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔ معاف کیجئے۔ میں بہت عاجز ہو چکا ہوں۔ اور جب آپ کو بغیر کہے ہی سب خبر ہے تو پھر کہنے کے کیا معنی ہے؟

سنئے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کافر نہیں ہوں۔ آتش پرست نہیں ہوں۔ سورج کو میں نے کبھی نہیں پوجا۔ کسی کو مار انہیں کہیں ڈاکہ نہیں ڈالا۔ البتہ اس سے مجھے انکار نہیں کہ شراب پی اور ضرور پی۔ لیکن اس طرح کہ خود مجھے اس پر شرم آتی ہے۔ اگر شراب ہی کا حساب و کتاب کرنا ہے تو جمشید۔ بہرام۔ پرویز وغیرہ سے حساب کیجئے کہ پیتے تھے اور مزا کرتے تھے۔

میں کیا اور میری مے نوشی کیا۔ یہ بھی کمبخت مستقل عذاب تھا۔ جب پی بھیک مانگ کر پی۔ چہرہ پر کالک لگائی اور پڑ رہے۔ نہ کوئی باغ۔ نہ شراب خانہ۔ نہ کوئی گانیوالا موجود۔ نہ کوئی معشوق۔ نہ ناچ نہ رنگ۔ نہ گوئیے نہ ساز نہ لے۔ یہ بھی کوئی مے نوشی تھی۔

مَیں نے زندگی تو گزار ہی دی۔ مگر کیا بتاؤں کہ کیسی کیسی مصیبت سے گزاری۔ مہینے کے مہینے عشق و محبت میں کاٹے سالہا سال بے پئے گزارے۔ ہائے کوئی مجھ سے پوچھے جب ساون بھادوں کی گھٹائیں جھوم کر آتی تھیں۔ اور میرا پیالہ شراب سے خالی ہوتا تھا۔ دنیا بھر سبزۂ خود رو کی بہار سے مست کیف عشرت تھی۔ اور میں اپنے گھر کا دروازہ بند کئے پڑا رہتا تھا۔ زمانہ بھر میں پھول کھلے ہوتے تھے۔ دنیا راگ رنگ میں سرشار رہتی تھی۔ اور میں غمزدہ اپنے حجرہ میں پڑا رہتا تھا۔

اگر اتفاقیہ طور پر کبھی شراب ملی تو پیالہ نہ ملا۔ اور پیالہ ملا تو شراب نہ ملی۔ کیا اس سے آلود گدڑی کو دیکھتا ہے۔ میرے جسم کو دیکھ کہ خمار کے مارے انگڑائیاں لیتے لیتے کمان بن کے رہ گیا ہے۔

ہمسایوں نے میرے ساتھ بدسلوکیاں کیں۔ تیمار داروں نے مجھے فریب دیئے۔ بے مایہ اور کم حیثیت لوگوں سے مجھے سوال کرنا پڑے۔ عمر بھر بینوا مجھے رہنا پڑا۔ نہ میرے زمانے میں کوئی ایسا بادشاہ بنا یا کہ ظہوری کی طرح مجھے انعام دیتا۔ اور میں اس کو فقیروں اور مسکینوں کو تقسیم کر دیتا۔ نہ تو نے مجھے کوئی ایسا معشوق دیا کہ میں اس کے ناز اٹھاتا اور خوش ہوتا۔

اب کیا کہوں کیا کیا مصیبتیں میں نے اٹھائی ہیں اور کیا کیا آفتیں مجھ پر پڑی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بہشت میں بھی میرا جی نہ لگے گا۔ پھر تو ہی انصاف کر کہ جو شخص بہشت کو بھی کچھ نہ سمجھے اُسے دوزخ میں بھیجنا کہاں تک جائز ہے۔

فرض کیجئے آپ نے مجھے جنت بخش دی۔ مگر جنت سے ہوتا کیا ہے۔ اور جنت میں وہ باتیں کہاں مان لیجئے کہ صبوحی کے طور پر صبح کے وقت شراب طہور پی۔ تو بلوریں جام اور زہرۂ صبح کہاں۔

معشوق کے بدلے حور ہے۔ مگر نہ اس سے غم ہجر کا لطف آسکتا ہے نہ ذوق وصل پورا ہو سکتا ہے۔ وہ جو دنیاوی معشوق ہمارے اور ہر ایک بوسہ کے بدلے ہزاروں احسان لاد دیتے تھے وہ جن کے وصل کے انتظار میں برسوں ہم کو گزارنا پڑتے تھے۔ وہ جو ہم میں اور ہمارے معشوق میں کشاکش ہوتی تھی۔ ہم کھینچتے تھے اور وہ بھاگتا تھا۔ وہ جو ہم کو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر فریب دیا جاتا وہ سب اس نیک بخت حور میں باتیں کہاں ہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے جو بات کہی مان لی اور کچھ تلخ بات نہیں کہی۔ جو حکم دیا بجا لائی۔ یہ بھی کوئی حسن کا انداز ہے۔ جنت نام کی جنت ہے۔ یہاں نظر بازی کا لپکا کہاں۔ یہاں ذوق دیدار کہاں۔ یہاں دیوار میں روزن کہاں کہ جھانک جھانک کر نظارۂ جمال سے شادکام ہوں۔ نہ یہاں کوئی دلالہ کہ پیغام سلام لے جائے۔ نہ یہاں کسی ماہ پر کالہ کی آرزو۔

اے میرے خدا یہی ساری باتیں تھیں جن کو ہمیشہ دل چاہتا تھا اور کبھی پوری نہ ہو سکی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اب تو میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو میں ہر گناہ کے مقابلہ میں ایک حسرت پیش کروں گا۔ پھر بھلا تو ہی بتا کہ جب گناہوں سے زیادہ میری حسرتیں ہوں گی تو کیونکر کام چلے گا۔ اور اس کا کیونکر حساب ہوگا۔ فارسی میں ان کے اشعار اس مضمون کے ملاحظہ ہوں۔

بد وش تر از و مسنہ بار من　　نسنجیدہ بگزار کردار من
اگر دیگراں را بود گفت و کرد　　مرا مایۂ عمر رنج است و درد

مرا نیز یارائے گفتار دہ　　چو گویم بر آں گفتہ زنہار دہ

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود　　چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم　　پرستار خورشید و آذر نیم
نکشتم کسے را بہ اہرمنی　　نبردم کسے مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست　　بہنگامہ پروانہ مورم ازوست
حساب مے و رامش و رنگ و بوے　　ز جمشید و پرویز و بہرام جوے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند　　دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ　　بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ　　نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط　　نہ غوغائے رامشگراں در رباط
شبانگہ بمے رہنمونم نشدے　　سحرگہ طلبگار خونم نشدے
تمنائے معشوقہ و بادہ نوش　　تقاضائے بیہودۂ میفروش

چہ گویم چو ہنگام گفتن گذشت　　ز عمر گرانمایہ بر من گزشت
بسا روزگاراں بدلدادگی　　بسا نو بہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باران و شبہائے ماہ　　کہ بُد دست بے مے بچشم سیاہ
افقہا پُر از ابر بہمن مہی　　سفالینہ جام من از مے تہی
بہاران و من در غم برگ و ساز　　در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بوے و رنگ　　من و حجرۂ و دامنے زیر سنگ
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست　　و گر یافتم بادہ ساغر شکست
چہ خواہی ز دلق مے آلود من　　ببیں جسم خمیازہ فرسود من

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد　　بہر بار زر بیل بارم دہد

نہ نازک نگارے کہ نازش کشم بہر بوسہ زلف درازش کشم

ہنوزم ہمان دل بجوش اندر است ز دل بانگ نوشم بگوش اندر است
چو آں نامرادی بیاد آیدم بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرو و پاے مستانہ کو بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانۂ بے خروش چہ گنجائی شورش نائے و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش کہ چہ غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا فریبد بہ سوگند دینش کجا
نظر بازی و ذوق دیدار کو بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند دلالہ نہ دل تشنۂ ماہ بہ رکالہ

ازینہا کہ پیوستہ میخواست دل ہنوزم ہمان حسرت آلاست دل

بہر جرم کز روئے دفتر رسد زمن حسرتے در برابر رسد

بفرمائے کیں داوری چوں بود کہ از جرم من حسرت افزوں بود

شراب کے متعلق مرزا کے یہاں اتنے شعر پائے جاتے ہیں کہ اگر سب شعر جمع کئے جائیں تو شاید اُن کی تعداد خیام وحافظ کے شعروں سے کم نہ رہے۔ مگر ہمارا یہاں نہ یہ مقصد ہے کہ ہم خیام وحافظ کے ساتھ مرزا کے اشعار کا مقابلہ کریں۔ اور نہ فلسفۂ خمریات سے بحث کرنا مقصود ہے۔ بلکہ ہم چند ایسے اشعار شراب کے متعلق چنکر پیش کرتے ہیں

جن میں ایک قسم کی ہلکی اور لطیف ظرافت موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم سے شراب پلانے کا وعدہ حشر کے لئے کیا گیا ہے۔ ادھر وعدہ کرنے والا شاید یہ سوچتا ہوگا کہ یہ وعدہ ہم کو بہت ہی گراں گزرے گا۔ اور ہم اس طول مدت سے گھبرا جائیں گے۔ مگر ہم کو اس سے اور زیادہ خوشی ہے اس لئے کہ شراب جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے۔ وہ اور بھی لطیف ہوتی جاتی ہے ؎

گفتی زمی بحشر و نجم ازیں درنگ   مستی دہد زیادہ چو صہبا کہن شود

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عید کا دن ہے خوشحالی اور سرور و خرمی کا دور دورہ ہے۔ پی اور خوب جی بھر کے پی۔ کیا تو گناہ سے ڈرتا ہے۔ اچھا یہی بات ہے تو گناہ میرے ذمہ رہا۔

عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عام است   می نوش گنہ بر من اگر بادہ حرام است

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شراب بھی کیا کوئی روزہ ہے جو آج کے دن حرام ہے

عید است و صلای خورد و نوش است ہمانا   می روزہ نباشد کہ دریں روز حرام است

ساقی سے کہتے ہیں کہ یہ تو تجھ کو معلوم ہی ہے کہ شراب صرف اندازہ سے پینا حرام ہے۔ بے اندازہ حلال ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ تو اٹھ کر اپنا شیشہ ہمارے پیمانہ پر پٹک دے۔

می باندازہ حرام آمدہ ساقی ورنہ   شیشہ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جتنی ہو بس اس کو آج ہی چڑھا جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ شریعت ہم کو یہی خبر دیتی ہے کہ شراب آج پانی ہے۔ مگر کل یہ آگ ہو جائے گی ؎

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ   در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اس جنگ و جدل کو چھوڑ کہاں کے فضول جھگڑوں میں پڑا ہے میخانہ کی باتیں کر کیونکہ وہاں نہ جنگ جمل کی باتیں ہوتی ہیں اور نہ کوئی فدک کا جھگڑا لے کر بیٹھتا ہے

بحث و جدل بجای ماں میکدہ جوئے کاندراں   کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب پی اور خدا کے کرم پر بھروسہ رکھ کیونکہ خط پیالہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنی پینی چاہئے۔ کب پینی چاہئے۔ کیونکر پینی چاہئے مطلب صرف پینے سے ہے پئے جا۔

می نوش و تکیہ بر کرم کردگار کن   خط پیالہ را رقم چون و چند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بس برسات صرف ان تین باتوں کے لئے آتی ہے۔ اور اس موسم کے پیدا کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ شراب چڑھائیے۔ آم کھائیے۔ اور برف کا شربت پیئے۔

غالب من و خدا کہ سرانجام برشگال   غیر از شراب و انبہ و برفاب قند نیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ابر کرم کا مشغلہ بس اتنا ہی ہے۔ کہ جن لوگوں کے خرقے پر شراب کے داغ ہوں انھیں دھو دیا کرے ؎

شستن دخو مشغلۂ شوخی ابر کرم است   دزم آں خرقہ کہ با داغ خیا سودن رفت

معشوق کو ہدایت کرتے ہیں کہ روزہ کے مہینے میں زلفیں کھولے ہوئے تو پریشان ہو کر کیوں پھر رہا ہے۔ مزہ کر شراب پی۔ کہ آج زمانہ میں تیری زلفیں پریشان ہونے کی وجہ سے یا تیرا چاند سا چہرہ دیکھنے سے عید کی چاند رات ہو رہی ہے۔

درماہ روزہ طرۂ پریشاں چہ میروی   مے خور کہ در زمانۂ شب بودہ است

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بھئی اب ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اتنی دور جائیں اور گھڑا بھر کر شراب لے کر واپس آئیں۔ ہمارا مکان تو بس میخانہ کے قریب ہی بننا چاہیئے تھا۔

بر تابم لبسبو بادہ ز دور آوردن   خانۂ من بسر کوے مغاں میبایست

ایک جگہ یوں منادی کرتے ہیں کہ بھائیو ولایتی شراب آگئی ہے اور بہت سستی ہو گئی ہے۔ ایک دین کے عوض ایک گھونٹ ملتی ہے۔ خریدو، دوڑو۔ دیکھو بہت سستی ہے شاید پھر نہ ملے

از فرنگ آمدہ در شہر فراواں شدہ است   جرعہ را دین عوض آمدہ ارزاں شدہ است

آپ کعبہ میں ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں۔ کہ ہے کوئی خدا کا ایسا نیک بندہ جو کعبہ میں ہمیں بھرا ہوا شراب کا ایک پیالہ پلائے۔ ضمانت کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم جامۂ احرام گرو رکھ سکتے ہیں۔

کیست در کعبہ کہ رطلے زنبیذم بخشد   در گروگاں طلبد جامۂ احرامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ بغدادی کون ہے اور بسطامی کون ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حسینان نازنین تاتار سے آتے ہیں۔ اور شراب لندن سے آتی۔

مے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار   ماندانیم کہ بغدادی و بسطامی ہست

ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ خلوت میں جو روزانہ دوست کے ساتھ شراب پیتا رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح حور اور کوثر اور بہشت کی حقیقت کو جانتا ہے اور اس شعبدہ بازی کا حال سب اوس پر کھلا ہوا ہے۔ یا یہ کہ اس کا لطف اس کو اچھی طرح معلوم ہے۔

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام   داند کہ حور و کوثر و دار السّلام چیست

اسی غزل میں کہتے ہیں۔ آج کل میاں غالب شراب کا نرخ دریافت کرتے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ مصحف اور خرقہ کہیں بک گیا ہے۔

از کاسۂ کرام نصیب است خاک را   تا از فلک نصیبۂ کاس کرام چیست

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت پرسد چرا کہ نرخ مے لالہ فام چیست

ایک جگہ کہتے ہیں شراب سب کو ایک ہی سبو سے ملتی ہے۔ مگر قسمیں سب کی الگ ہیں جمشید جام جم میں پیتا ہے۔ اور قلندر اپنی تونبی میں

از یک سبو است بادہ و قسمت جدا جدا است جمشید جام برد و قلندر کدو گرفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب جو بہشت میں گیا داروغہ بہشت نے شیر و شہد سے تواضع کی اس غریب نے کہا کہ معاف فرمائیے یہ نہیں ہمیں تو شراب چاہیئے۔

رضواں چو شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد بیچارہ باز داد و مے مشکبو گرفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی بہار برسات ہے۔ خیر خدا کا شکر ہے یہاں بھی شراب پینے کا ایک موسم ہے

بہار ہند بود برشگال ہاں غالب دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابے ہست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب سے جو منع کرتے ہیں اس کی وجہ معلوم ہے یا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ اور یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر اس میں آیا ہے اسقدر بلیغ ہے کہ سیکڑوں ظرافت آمیز معنے اس میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

باید زمی ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

ایک جگہ کہتے ہیں کہ نہ معلوم مجھے لوگ شراب پینے سے کیوں روکتے ہیں۔ میں کوئی محدث اور فقیہ تو ہوں نہیں کہ میری ثقاہت کو شراب نقصان پہونچائے گی۔ میں تو شاعر ہوں شاعر کو شراب سے کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔

بیادہ گر بودم میل شاعرم نہ فقیہ سخن چہ ننگ نہ آلودہ دامنی دارد

اسی غزل میں کہتے ہیں کہ ہم میکدے میں آئے ہیں تو ساقی بچھا جاتا ہے۔ ہم اپنے جی میں خوش ہیں۔ کہ ہماری بڑی تعظیم ہو رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ شراب رہی نہیں ہے ساقی صرف اس بزرگ داشت پر ہم کو ٹالنا چاہتا ہے۔

خوشم ببزم ز اکرام خویش وزیں غافل کہ مے نماندہ و ساقی فروتنی دارد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ یہ بے مزے واعظ سمجھے ہیں کہ جنت میں حوریں ہیں کوثر ہے کیونکہ اسی کی خبر دی گئی ہے اور احمق یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ حور و کوثر فقط ایک استعارہ ہے شراب و شاہد کا کھلم کھلا نام لینا منع ہے۔ ان کو صرف یہ نام لیکر کام میں پھنسا دیا ہے باقی مطلب وہی شراب و شاہد ہے۔

گفتند حور و کوثر زدداد ند ذوق کار بہ منع است نام شاہد و مے آشکار برد

ایک جگہ کہتے ہیں۔ کہ میں توبہ کرکرا کے مسجد میں آگیا تھا۔ اپنے ذوق عبادت میں مصروف تھا۔ ساقی آیا اور آکر مجھے کہا کہ کیا تسبیح لے کے بیٹھا ہے۔ آجکل شرابخانہ میں طرح طرح کی شرابیں آئی ہیں۔ بس یہ سنکے میرے منھ میں پانی بھر آیا۔

اور تسبیح و مصلے چھوڑ کر پھر میں میخانہ میں آگیا۔ اب جو یہاں آکے دیکھا تو یہ سب فریب تھا۔ یہاں ایک دو ساغر سے زیادہ موجود نہیں ہے۔

ساقی دگرم برُد بہ خانہ ز مسجد می یکدو قدح بود و فریبم بہ سبو داد

ایک جگہ واعظ سے کہتے ہیں۔ کہ ہمیں تو صرف شراب کا ایک مٹکا بھر کے بھیجدے باقی پھر تو چاہے جتنے دودھ کے دریا بہائی جا ہمیں اور پرہیز گاروں کو فریب دیئے جا

خمی از مے بہ بالغ مست دانگہ ہر قدر خواہی رواں کن جوے از شیر و دل از پرہیز گاران

کہتے ہیں کہ روزہ داروں کے اوپر بڑا رحم آتا ہے عید کے دن بھی غریب شیر و خرما میں مست ہیں بھلا اس شیر و خرما میں شراب کا لطف کہاں۔ بھئی خدا کے لئے کوئی بیچاروں کو ہمارے نشاط میں سے تھوڑا سا حصہ پہونچا دو

ندارد شیر و خرما ذوقِ صہبا رحم مے آید نشاط عید از ناہد بہ سوی روزہ داران

ایک جگہ کہتے ہیں کہ کیا کہنا ہے کوثر اور کوثر کی شراب مقدس کا۔ مگر ہمارے خمار میں وہ کام نہیں آسکتی بس اتنی ہی خرابی ہے۔

خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در دست ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

ایک جگہ کہتے ہیں کہ سنو بھئی غالب خیر یہ تو منظور ہے کہ ہم تم کو میخانہ کے پاس ہی کہیں رہنے کے لئے جگہ دلوادیں گے مگر شرط صرف یہ ہے کہ صرف سونگھنے پر قناعت کیجئے پینے کو نہیں ملے گی۔

ترا بہ پہلوئے میخانہ جا دہم غالب بشرط آنکہ قناعت کنی بہ بوئے رحیق

ایک جگہ کہتے ہیں کہ دوزخ اور کوثر میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ میرے سینہ میں بھی ایسی ہی آگ لگی تھی اور میرے ساغر میں بھی ایسا ہی پانی تھا۔

تا چہ سنجم دوزخ و کوثر کہ من نیز ایں چنیں آتشے در سینہ و آبے بہ کوثر داشتم

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم ذمی ہیں۔ یعنی وہ کافر ہیں کہ جنھیں بادشاہ نے پناہ دی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے اب اگر ہم رمضان کے مہینے میں بازار میں بیٹھ کر پئیں تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں کرسکتا

من کافر زنہاری شاہم بہ من ارزد مے در رمضان بر سر بازار کشیدن

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جنت مل بھی گئی تو کیا لطف اور وہاں شراب بھی لی تو کیا نتیجہ۔ نہ تو بادۂ طہور میں محتسب کا غم۔ اور نہ اوس عیش میں اندیشۂ زوال۔ پھر وہ شراب کس کام کی۔ اور اس عیش کا کیا مزا۔

در بادۂ طہور غمِ محتسب کجا در عیش خلد لذت بیم زوال کو

کہتے ہیں کہ حشر میں میری حسنات کا جائزہ لیا گیا تو سوائے ایسے روزوں کے جو شراب سے کھولے گئے تھے، ایک

نکلی بھی نہ ملی۔

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند   جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

ایک جگہ کہتے ہیں کہ غالب چاندنی رات ہے شراب پیو۔ اچھا یہ تو چاندنی رات ہے۔ فرض کیجئے کہ رمضان ہوتا تو کیا کرتے کیا یوں ہی خاموش بیٹھے رہتے۔

غالب سر خم بکشا پیمانہ بہ می در زن   آخر نہ شب ماہست گیرم رمضانستے

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم شہر عدم کے اطراف کے رئیس زادہ ہیں۔ عنقا کے انڈے ہمارے یہاں کے موتی ہیں۔ شوخی یہ ہے کہ عنقا خود معدوم ہے۔ لہذا اس کا انڈا بھی معدوم ہے۔ یعنی ہمارے پاس کچھ نہیں۔

محتشم زادۂ اطراف بساط عدمیم   گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

کاجل - سُرمہ - چُورن - منجن

اڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کرکے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے دوسری تازہ سند ملاحظہ:۔ سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لئے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیجدیجئے۔

(سید رضا، نزد سوینتھ) (دیوت محل)

کاجل - آشوب، سرخی، ضعف بصارت کیلئے از بس مفید ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ

سرمہ - یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جالا، دھند۔ موتیا بند، ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیہ (عہ) علاوہ محصول،

چورن - یہ وہ اکسیری چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوہضم دستوں کا آنا، سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھالینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ عہ علاوہ محصول۔

منجن - اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبہ ۸ تولہ ایک روپیہ علاوہ محصول۔

نوٹ: - سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

پتہ: - م بیگم دفتر رسالۂ نگار لکھنؤ۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم پیاسے مسافر ہیں سفر کرتے کرتے دریا پر پہونچے اور بھوک کے مارے پانی پینے کے لئے دریا میں کود پڑے اب ہمارا نشان یہی ہے کہ ہمارا توشہ دریا کے کنارے رکھا ہوا ہے۔ اور ہمارا کہیں نشان بھی نہیں۔

رہرو تشنہ در رفتہ بہ آبم غالب　　توشۂ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

ایک جگہ پیر مغاں کے ہاتھ جوڑ رہے ہیں قدموں میں سر رکھتے ہیں۔ خدا کے واسطے دیتے ہیں اور معافی چاہتے ہیں کہ للہ ہماری خطا معاف فرما دیجئے۔ ہم نے احرام مستی میں باندھ لیا تھا۔ آپ بیکار ناراض ہو گئے۔

بیگناہم پیر دیر از من مرنج　　من بمستی بستہ ام احرام را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ آج کل میں ہمارا معشوق ہمارے پہلو میں بیٹھنے والا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کو اپنے امتحان پاکبازی کا دھوکا دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ذرا دیکھئے تو ہم کو آزمائیے تو ہم بڑے پاکباز ہیں۔ اور اتفاق سے وہ ہمارے فریب میں آگیا ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے آزمانے کے لئے ہمارا پہلو گرم کرنے والا ہے۔ اور وہ بھی خلوت میں۔

بخلوت مژدۂ نزدیکی یار است پہلو را　　فریب امتحان پاکبازی دادہ ام او را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں ایک مسافر راہ نوردہ ہوں۔ اور حالت یہ ہے کہ تاریک رات ہے منزل دور ہے۔ راستہ میں کہیں کسی مسافر کا نقش قدم نہیں۔ سخت مصیبت ہے۔ وہ تو کہئے کہ کبھی کبھی جو میں شراب پی لیتا ہوں۔ اوس سے ایک بجلی سی چمک جاتی ہے اور دس بیس قدم چل لیتا ہوں ورنہ راہ قطع کرنا میرے لیے نہایت دشوار تھا۔
جہاں تک اندازہ کیا جاتا ہے شراب کے مضمون کو اس شوخی بیان کے ساتھ کسی نے نہیں کہا۔

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا　　ہلاکم جلوۂ برق شراب گاہ گاہی را

ایک جگہ بطریق تجرید کہتے ہیں۔ کہ کیا کہا جائے عجب دیوانے سے ہمارا واسطہ پڑ گیا ہے۔ غالب نہ تو مسلمان ہے اور نہ کافر ہے تعجب گومگو میں ہیں کہ آخر ہم اس سے کیا لکھ کر خطاب کریں۔

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا　　مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں بادشاہ کا وہ غلام ہوں جو کھاتا زیادہ ہے کام کم کرتا ہے۔

در پرستش سستم و در کامجوئی استوار　　بادشہ را بندۂ کم خدمت پرخوار ہست

ایک جگہ بتوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ کہ اے بتو خدا کے لئے جلدی غالب کو راضی کر لو۔ سنا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کو مرتا ہے۔ اگر کہیں سچ مچ مسلمان ہو گیا۔ تو پورے بتخانے کی آبرو پر پانی پھر جائے گا۔

خدا را ای بتاں گردولش گردیدنی دارد　　دریغا آبروے دیر گر غالب مسلماں شد

اللہ میاں سے کہتے ہیں کہ آپ کیا غضب کرتے ہیں کہ مجھے بہشت دے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں مجھے وہی گلی یاد آئے گی۔

میدہیم بجلد جارحم کجاست ای خدا — آب وہوائے ایں فضا کوئے کہ یاد میدہد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میرا نالہ وفغاں قابل رحم نہیں ہے۔ میں عاشق ہوں۔ لہذا مجھ پر کرم نہیں کیا جاسکتا۔ خیر اس کا مجھ کو کوئی شکوہ نہیں۔ مگر اس کا کیا جواب ہے۔ کہ منشی بے بدل بھی ہوں۔ شاعر خوش گفتار بھی ہوں۔ رند ہزار شیوہ بھی ہوں۔ مصاحب اور ندیم بھی ہوں۔ غرضکہ ہر فن مولا آدمی ہوں۔ اگر بحیثیت عاشق کے رحم نہیں کیا جاتا تو نہ کیا جائے۔ مگر ان کاموں کا مشاق سمجھ کے تو رحم کیجئے۔ کیا سرے سے ایک عشق کے ساتھ میری تمام عزتیں اور تمام استحقاق دریا برد کر دئیے گئے۔

دبیرم۔ شاعرم۔ رندم ندیم شیوہ ہا دارم — گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگر تیرے ناز کی بھی درازیاں جاری رہیں۔ تو یقینی دارا کی ملک سکندر کو نہیں پہونچ سکتی۔

گر چنیں ناز تو آمادہ یغما ماند — بہ سکندر نرسد ہرچہ ز دارا ماندا

ایک جگہ کہتے ہیں جو مئے ومعشوق کی تمنا لے کر دنیا سے جا رہا ہے گویا وہ شخص حور اور کوثر یہیں سے ساتھ لئے جاتا ہے اوس کو وہاں مے وکوثر کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمرہ رودش کوثر وحوراں کہ دم مرگ — ذوق مے ناب وہوس روے نکو برد

ایک جگہ معشوق کی شوخی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ظالم کی یہ کیفیت ہے کہ اوروں کو تو شراب دیتا ہے اور جب میرا نمبر آتا ہے تو پیالہ بھر کے مجھے دکھاتا ہے اور زمین پر گرا دیتا ہے۔

دہد بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبت من — بمن نماید و در انجمن فرو ریزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگرچہ نبیذ رطب ہی سے بنتی ہے۔ مگر پھر بھی دونوں میں بڑا زبردست فرق ہوتا ہے۔ رطب میں وہ مزا کہاں ہے جو نبیذ میں ہے۔ اسی طرح جب بوسہ دشنام بنجاتا ہے تو بات ہی اور پیدا ہو جاتی ہے۔

ہست تفاوت بسے ہم ز رطب تا نبیذ — لذت دیگر دہد بوسہ چو دشنام شد

ایک جگہ معشوق کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ یہ تو میں کہتا نہیں کہ یہ سب ظلم جو کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خدا تیرے زمانہ میں کسی پر رحم نہیں کرتا۔

نگفتہ ام ستم از جانب خداست ولے — خدا بعہد تو بر خلق مہرباں نشود

معشوق نے مرزا صاحب کی طرف ذرا التفات کی ہے۔ مرزا صاحب کے دوست احباب خوش وخرم چلے آتے ہیں۔ مبارک سلامت کا شور وغل ہے۔ جو آتا ہے وہ تہنیت کے الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ مرزا صاحب سب کو سنکر کہتے ہیں کہ بھئی یہ مقام تہنیت نہیں ہے۔ اللہ سے دعا کرو کہ یہ کوئی نئی قسم کا امتحان نہ ہو۔

بہ التفات نگاہم چہ جائے تہنیت است — دعا کنید کہ نوعے ز امتحاں نبود

معشوق سے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کیا کہا کہ ہماری حسرت دیدار خطا ہے۔ سُن لیجئے اگر یہ خطا ہے تو معاف فرمائیے۔ یہ خطا تو ہم قیامت تک کریں گے۔

گفتہ باشی کہ زما حسرت دیدار خطاست　　ایں خطائے است کہ در روز جزا نیز کنند

ایک جگہ خدا سے کہتے ہیں کہ مجھے چھوڑیئے میں قابل التفات اور لائق حساب کتاب نہیں ہوں۔ دنیا میں میرے آپ نے کون سے مقاصد پورے کئے تھے کہ اب گناہ کا حساب کرنے بیٹھے ہیں۔ کچھ میرے مقصد پورے کئے ہوتے طالع ور بنایا ہوتا تو اعمالنامے میں کچھ گناہ بھی ہوتے۔ جب پہلے ہی سے بدنصیب پیدا کیا تھا تو اب یہ گناہ کا حساب کیوں کیا جا رہا ہے۔

کام نہ بخشیدہ گنہ چہ شماری　　غالب مسکیں بہ التفات نیرزد

معشوق سے کہتے ہیں کہ مجھ سے جو آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ زہد و تقوے اختیار کرو۔ سبحان اللہ کیا خوب آپ کی فرمائش ہے۔ آپ ذرا آراستہ ہو کر بڑے بڑے تقوے شعار زاہدوں کے حجرے میں تو تشریف لے جائیے۔ پھر دیکھئے کہ کتنوں کا دعوئے تقوے و زہد قائم رہتا ہے۔

مرا گوئی کہ تقوے ورز۔ قربانت شوم خود را　　بیارا و بخلوت خانۂ تقوے شعاراں بر

اللہ میاں سے کہتے ہیں کہ یہ کن ناتجربہ کاروں ناقدروں زاہدوں کو بہشت دے رہا ہے۔ نہ کبھی انھوں نے کسی معشوق کے ظلم اٹھائے نہ ان پر کوئی مصیبت پڑی۔ پھر بھلا ان کی اور حوروں کی کیا بنے گی۔

یارب بزاہداں چہ دہی خلد رائیگاں　　جور بتاں ندیدہ و دل خوں نکردہ کس

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میاں غالب کیا پڑے ہوئے سو رہے ہو اٹھو صبح ہو گئی۔ زاہد مسجد میں پہونچ گئے اور رند باغ میں پہونچ چکے یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔

صحبت وگوناگوں اثر۔ غالب چہ خسپی بیخبر　　نیکاں بمسجد رفتہ و رنداں بگلشن گشتہ جمع

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مرگ پدر میں مجھے رونا پڑا۔ مگر میں تیرے غم کو یاد کر کر کے کہہ رہا ہوں کہ ہائے قضا کی وجہ سے ہے میرے یہ چند نالے بیکار برباد گئے۔

باغمت مرگ پدر سنجم و گویم ہیہات　　نالۂ چند کہ در کار قضا گشت تلف

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مجھے ہرگز یہ دعوے نہیں ہے۔ کہ میرا کہیں کوئی وجود ہے۔ بلکہ میں ایک ایسا نقش ہوں جس کے بنانے کا صرف نقاش نے ارادہ کیا اور رہ گیا۔ خارج میں میرا کوئی وجود نہیں۔

(نقش بضمیر آمدہ نقش طرازم)　　حاشا کہ بود دعوئی پیدائی خویشم

زاہد سے فرماتے ہیں کہ ہم نے جو یہ ایک انگور کا خوشہ تجھے دیا ہے اس کو حقارت سے نہ دیکھ یہ بہت ہے۔ یوں سمجھ کہ تجھکو

یہ خوشہ دے کر ہم نے پورے ایک ساغر شراب کا نقصان کیا ہے۔

زاہد از ما خوشۂ تاکے بچشم کم مبیں　　ہے ندانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

ایک جگہ کہتے ہیں کہ بس آجکل ہم کو یہ دھن لگی ہوئی ہے کہ ویران مسجدوں کی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے ہیں اور کوئے مغاں میں عمارت تیار کر رہے ہیں۔

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ مے آرم بہ شہر　　خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت میکنم

واعظ سے کہتے ہیں کہ آپ عجب احمق ہیں ہم سے آپ ناراض کیوں۔ ارے صاحب ہم گناہ کرتے ہیں تو صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بہشت میں تنہا آپ ہی رہیں اور ہم اس کے حصہ دار نہ ہوں۔ پھر بھلا خیال تو کیجئے کہ ہم گناہ کر کے آپ کی خیر خواہی کر رہے ہیں یا بدخواہی۔

گر گنہ کاریم واعظ گو مرنج　　را در روضہ تنہا خواستیم

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اچھا یہ ہم نے مان لیا کہ ضد میں آپ نے ہم سے ملنا چھوڑ دیا۔ مگر مہربانی کر کے یہ تو بتا ہے کہ اُس فخر کو آپ مجھ سے کیونکر چھین سکتے ہیں جو زمانہ گزشتہ پر مجکو ہے۔ ہم تو جب مانیں گے کہ آپ ہمارے اس ناز عہد ماضی کو بھی ہم سے چھین لیں۔

چہ غم از بعد گرفتی ز من احتراز کردن　　نتواں گرفتن از من بگزشتہ ناز کردن

معشوق سے کہتے ہیں کہ تم جو ہم سے یہ کہہ رہے ہو کہ غیر کے پاس سے میرے پاس کون پیغام لایا ہے وہ کہاں ہے ذرا دکھا تو سہی۔ یہ ٹھیک، ہی سہی۔ مگر ذرا یہ تو بتائیے کہ وہ خمیدہ پشت، سست قدم بڑھیا اگر دلالہ نہیں تھی تو کون تھی جو ابھی ابھی تمھارے پاس سے گئی ہے۔

گوئی بہ من کسیکہ ز دشمن رسیدہ کو　　آں پیرزال سست پے قد خمیدہ کو

کہتے ہیں کہ شیخ صنعان کے جاہ و جلال کو سن کر مجھے اس پر رشک تو ضرور آتا ہے۔ اور ویسی زندگی کو جی چاہتا ہے مگر صاحب اس شان و شوکت کا حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اُن کی طرح ستر برس عبادت کون کرے اور یہ ایک عمر کا جھنجھٹ کون پالے

داغم ز رشک شوکت صنعاں ولے چہ سود　　آں دستگاہ طاعت ہفتاد سال کو

ایک جگہ کہتے ہیں کہ آج کل غم عشق مجھے عشق الٰہی میں لے آیا ہے۔ اے داغ عشق تجھے چاہیے کہ تو دل سے ہوتا ہوا پیشانی پر چلا آ اور یہاں آکر ظاہر ہو جا۔ کیونکہ اب بس عشق الٰہی کی یہی پہچان رہ گئی ہے۔

آوردہ غم عشقم در بندگی ایزد　　اے داغ بدل در رو در جبہ نمایاں شو

معشوق سے کہتے ہیں کہ تو نوبہار نہیں ہے۔ نوبہار کے ساتھ اتنا سامان ناز کہاں ہوتا ہے۔ مجھے تو تو کسی کے

کارخانۂ یغمائی فہرست معلوم ہوتا ہے۔

بانو بہار ایں ہمہ سامان ناز نیست — فہرست کارخانۂ یغمائے کیستی

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تعلقات دنیاوی نہایت ہی بُرے ہوتے ہیں۔ اور ہم ہرگز ہرگز اس شخص کو عقلمند کہہ سکتے جو عیال کے مخمصوں میں پھنسے۔ جو ایسا کریگا اوسکو رنج وغم سے نجات نہیں ہوسکتی۔ اللہ میاں کو دیکھو کہ تمام دنیا میں اوس کا گھر ہے۔ مگر کسی گھر میں بیوی نہیں ہے۔ پھر بھلا وہ قوی کیوں نہو۔ بیوی بچے ہوتے پر قوی رہتے تو ہم جانتے اور ایسی حالت میں تو قوی وہ نہوں گے تو کیا ہم ہوں گے۔

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود — وز غصۂ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو — نازم بخدا اجرا تو انا نبود

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں نقل کئے گئے۔ قیمت عـٰہ

گہوارۂ تمدن — (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کسقدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ/

شہاب کی سرگزشت - حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندیٔ مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے قیمت علاوہ محصول عہ/

فراست الید۔ مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول عمر

شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ۔ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ علاوہ محصول ۱۰/

جذبات بھاشا۔ جناب نیاز نے ایک عجیب تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

تذکرۂ خندۂ گل۔ مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت عہ محصول ۳/

صحابیات جسمیں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات لکھے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے قیمت علاوہ محصول عہ/

مینیجر نگار

ایک جگہ گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے اللہ دنیا میں ہمیں کوئی فائدہ پہونچا۔ بہار کا زمانہ ہے بہت سا روپیہ دے کہ شراب اور پھولوں کے کام آئے۔ ان زاہدوں نے جو یہ خزانے جمع کر رکھے ہیں یہ سب ہمکو دلوا دے ان کا خرچ ہی کیا ہے نمک اور جو کی روٹی۔ سو اس کے لئے کیا خرچ کی ضرورت ہے۔

یارب سودے بروزگاراں مارا وجہ گل و مل بنو بہاراں مارا

صرف نمک و جو چہ قدر خواہد شد گنجینۂ ایں صومعہ داراں مارا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب اس میں شک نہیں کہ آپ شاعر تو بہت بڑے ہیں۔ مگر واللہ آپ کو عقل ذرا سی بھی نہیں ہے آپ شراب فروش کی دوکان پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور وہاں شراب مانگتے ہیں۔ عمدہ قسم کی مانگتے ہیں اور بہت سی مانگتے ہیں۔ بھلا خیال تو فرمائیے یہ سب شرائط کیوں کر پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ شراب فروشی ہے یا ساقی گری کہ بہت سی بھی دے۔ مفت بھی دے اور عمدہ بھی دے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ طنزیات اور شکوہ وغیرہ مرزا کے خاص مضامین میں سے ہیں۔ شکوہ ہر چند شکوہ ہے۔ اور طنز یقینی طنز ہے۔ مگر مرزا کا حسن بیان اُن کو اس قدر سبک اور رنگین کر دیتا ہے کہ پھر نہ شکوہ شکوہ رہتا ہے۔ اور نہ طنز طنز۔ بلکہ برعکس اس کے وہ بے انتہا رنگین بے انتہا لطیف چیزیں بنجاتی ہیں۔ اور ظرافت کا رنگ اُن سے چھلکنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کلکتہ گئے اور وہاں ان کے ساتھ شاگردان قتیل نے معارضہ کی صورت اختیار کی۔ تو مرزا نے علاوہ مثنوی باد مخالف کے ایک قطعہ کہا۔ جس میں ساقی بزم آگاہی یعنی عقل سے انھوں نے مختلف شہروں کے متعلق سوال کئے ہیں کہ فلاں شہر کیسا ہے اور فلاں کیسا ہے۔ اور عقل ان کو جواب دیتی رہی ہے۔ اسی میں انھوں نے کلکتہ کا حال دریافت کیا ہے اوسی میں ایک لطیف طنز کرتے ہیں۔

حال کلکتہ باز جستم گفت بایداش تسلیم ہشتمش گفتن

گفتم آدم بہم رسد دروے گفت از ہر دیار و از ہر فن

گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد گفت از ہر کہ ہست تہ دیدن

گفتم ایں جا چہ کار باید کرد گفت قطع نظر ز شعر و سخن

ایک جگہ طنز یہ کہتے ہیں کہ جب یہ راز طشت از بام ہو ہی گیا ہے۔ کہ ارم خلق سے چھپنا گیا ہے۔ پھر آخر اب ارم کے چھپانے سے کیا فائدہ ہے بات جو کچھ تھی وہ تو مشہور ہو ہی چکی ہے۔

چوں فاش شد آخر کہ ہم از خلق گرفتند بیفائدہ از خلق نہفتند ارم را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم مصیبت میں ہیں تو خیر یہ کہہ کے دل کو تسکین دے لیتے ہیں کہ مر جائیں گے تو ان جھگڑوں سے نجات ہو جائے گی۔ مگر یہ خضر و مسیحا کیا کریں جنھیں کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ واقعی ان کی حالت زار قابل رحم ہے۔

دل مایوس را تسکیں بمردن میتواں دادن چہ امیدست آخر خضر و الیاس و مسیحارا

کہیں کہیں مرزا صاحب محض ظرافت بھی لکھتے ہیں جس سے طنز و تشنیع وغیرہ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف ایک ظرافت ہے جس سے خود کو اور دوسرے کو خوش کرنے کے سوائے کوئی خاص مقصود مدِ نظر نہیں ہوتا۔

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہم آدم کی اولاد ہیں۔ ہم کو گناہ کرنا چاہئے لہذا کرتے ہیں

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام آشکارا دم ز عصیاں میزنم

ایک قطعہ میں کہتے ہیں کہ اب ہمارا بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ ہوش و حواس مسلوب ہو رہے ہیں عقل و خرد رفتہ رفتہ رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ نہ دماغ صحیح ہے۔ نہ حافظہ درست ہے۔ اوامر اور نواہی میں سے بس دو باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ نواہی میں سے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ۔ اور اوامر میں سے کُلُوا وَاشْرَبُوا۔

برخاست است گرد ز سرچشمۂ حیات وز حافظہ نماندہ نمے در سبو مرا
لا تقربوا الصلوٰۃ ز نہیم بخاطر است وز امر یاد ماندہ کلوا واشربو مرا

ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں ساری عمر زمانہ کے ہاتھوں عاجز و پریشان رہا۔ اور عمر بھر اپنے نصیب سے امیدیں لگائے بیٹھا رہا۔ بغیر پونجی کے ہمیشہ یہ فکر رہی کہ کچھ نفع ہونا چاہئے۔ اور بغیر وعدے کے ہمیشہ انتظار کرتا رہا۔

بازی خور روزگار بودم ہمہ عمر واز بخت امیدوار بودم ہمہ عمر
بے مایہ بفکر سود ماندم ہر جا بیوعدہ در انتظار بودم ہمہ عمر

مرزا کی مایوسیوں کے مناظر ان کی نثر و نظم میں برابر جلوہ افروز ہیں۔ مگر وہ مناظر چاہے خود کتنے ہی غم والم پر مبنی ہوں۔ مگر دوسروں کے واسطے سامان تفریح ضرور ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو ایک جگہ یہ رنگ بھی دیکھ لیجئے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر میں عزیزوں کے ظلم و جور کی تشریح لوگوں کے سامنے کردوں تو یقینی دنیا سے امید کی رسم اٹھ جائے۔ اور پھر کوئی امید کی ہمت ہی نہ کرے۔

گر دہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تیرے اور میرے زمانہ میں ہفت اقلیم سے امید و بیم اٹھ گئی ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ جلوہ باقی کہاں رہ گیا ہے جس سے قیامت کے مناظر کو رونق دی جائے گی۔ اور شعلے کہاں رہ گئے ہیں جن سے دوزخ کو زینت دیں گے۔ ان میں سے ایک چیز تیرے کام آچکی۔ اور ایک میرے کام آگئی۔ پھر یہ سب کیا ہنگامہ سن رہے ہیں

در عہد تو و منت در ہفت اقلیم برخاستن امید خون گشتن بیم
از جلوہ چہ ماند تا بسازند بہشت در شعلہ چہ ماند تا بتابند جحیم

مرض کے بیان و عنوان سے بھی مرزا کی تمام اردو و فارسی کی تحریریں بھری ہوئی ہیں۔ حد درجہ شوخی لئے ہوئے ہے۔

فرماتے ہیں کہ میرے نہ مرنے کو کہیں اس بات پر محمول نہ کیجئے کہ میں ابھی طاقتور ہوں۔ حاشا و کلا یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ہے یہ کہ ضعف کی کشاکش کی وجہ سے میری روح تن سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے میرا نہ مرنا ناتوانی کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ توانائی کی وجہ سے۔

درکشاکش ضعفم نگسلد روان از تن اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

ایک جگہ اپنی تعریف فرماتے ہیں اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے اپنی حالت کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم کا واقعہ تم نے سنا ہی ہوگا کہ وہ آگ میں بھی نہ جلے تھے۔ خیر۔ ایک تو وہ تھے ایک ہم کو دیکھئے کہ بغیر آگ، اور شعلہ کے جلے جاتے ہیں۔

شنیدۂ کہ بآتش نسوخت ابراہیم ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اچھا ہم نے مانا۔ غالب کے شعر وحی نہیں ہیں۔ اور ہم انھیں وحی بتاتے بھی نہیں۔ مگر تمھیں خدا کی قسم ذرا سچ کہنا کہ اگر وحی نہیں ہیں تو کیا انھیں الہام بھی نہیں کہہ سکتے۔

شعر غالب نبود وحی و نگوئیم و لے تو و یزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

احمد حسین میکش، اور جواہر سنگھ جوہر، مرزا غالب کے دو عزیز شاگرد تھے۔ مرزا نے اُن کی مدح میں ایک رباعی کہی ہے جس میں دونوں تخلصوں کو کمال خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

تا میکش و جوہر دو سخنور داریم شان دگر و شوکت دیگر داریم

در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

ایک جگہ کہتے ہیں میں بہت خوش ہوں آسمان سب سے زیادہ میری عزت کرتا اور مجھ کو مغتنم جانتا ہے جو غم کسی سے نہیں کھایا جاتا۔ وہ مجھے دیتا ہے۔ اور اس پر مجھے بڑا ناز ہے۔

نازم کہ نزد چرخ گرامی ترم بقدر چوں کس نخورد غمے بمن اندر نہاں دہد

سجدہ کی کیفیت کا یوں اظہار کرتے ہیں کہ میں اوس سجدے کا متمنی نہیں ہوں جس سے ماتھے پر گھٹا پڑ جائے۔ میں تو اُس سجدے کی تلاش میں ہوں جس میں میری پیشانی کا وجود ہی نہ رہے۔ اس خیال کی جستی۔ اور شوخی۔ پھر اس کے ساتھ اثر کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

سجدہ خواہم کہ ز سیما نگزارد اثرے اثر سجدہ چہ خواہی کہ بہ سیما ماند

ایک جگہ کہتے ہیں کہ تعالی اللہ۔ بارک اللہ۔ بھلا شان رحمت کی کیا تعریف ہو۔ کہ جن لوگوں نے گناہ نہیں کئے تھے اون کو بخش دیا۔ ٹھیک ہے۔ بخشنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ بیچارے اپاہج تھے۔ دنیا میں یہ کچھ کر نہیں سکے تھے اگر یہاں بھی بخشے نہ جاتے تو غریب شرمندہ ہوتے۔

تعالی اللہ رحمت شاد کردن بیگناہاں را خجل نپسند د آزرم کرم پرد سگاہاں را

ایک جگہ کہتے ہیں کہ یہ نہ کہو کہ رند نے طاعت حق نہیں کی۔ اس میں بڑا راز ہے طاعت حق اس کے لئے کچھ گراں نہیں

تھی۔ وہ تو ہزار شیوہ تھا۔ جہاں اور ہزاروں خرافاتیں کرتا تھا۔ یہ بھی کر لیتا۔ مگر راز یہ ہے کہ بتوں کو پیشانی کا مشترک اطاعت ہونا گوارا نہیں ہوا۔ اس لئے وہ طاعت حق نہ کر سکا۔

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود — لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل ناتواں کے لئے افتادگی ہی اب نماز ہے۔ یہ قعود و قیام کے جھگڑے کی تاب نہیں لا سکتا۔ رات دن پڑا ہوا ہے۔ اسی کو نماز سمجھو۔ سجدہ کہو۔ قعود جانو۔ غرض جو کچھ ٹھہراؤ اختیار ہے۔

افتادگی نماز دل ناتوان ماست — درد سر قیام و قعودش نماندہ است

معنی آفرینی ہی وہ شے ہے جس کو مرزا شاعری کے لئے سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ غالب میں اگر ہندوستان کے تمام شعراء سے زیادہ کوئی ممتاز چیز ہے۔ تو وہ معنی آفرینی ہی ہے۔ مگر اس معنی آفرینی سے جو ان کے دیوان کا جزو غالب ہے۔ ہم کوئی بحث نہیں کرتے۔ بلکہ سردست ہم کو اس معنی آفرینی کا مختصراً ذکر کرنا ہے جس میں انہوں نے اپنی فطری شوخی کو مد نظر رکھا ہے۔ جیسا کہ غمزۂ لاجوردی غمزہائے غیر مکرر کو کہتے ہیں۔ اور لاجورد ایک پتھر بھی ہے جو نیلا ہے۔ لہذا اسی لفظ تخییل کی بنا رکھ کر فرماتے ہیں۔

سراسر غمزہایت لاجوردی بود و من گفتم — بہ معشوقی پرستیدم بلائے آسمانی را

اسی کی طرح ذیل کے شعر میں بتاتے ہیں کہ آرہ چونکہ دوسرے لوگوں پر ظلم کرتا ہے لہذا آرہ کے سر پر بھی تشدد کا آرہ چل رہا ہے۔ اور یہ اس کی سزا ہے کہ ظالم کبھی خوش نہیں رہتا۔

ظالم ہم از نہاد خود آزار مے کشد — بر فرق آرہ ارۂ تشدید بودہ است

ایک جگہ اپنے تخلص سے فائدہ اٹھا کر معنی آفرینی کرتے اور کہتے ہیں کہ میرا تخلص ظاہرا غالب ہے لیکن در اصل میں مغلوب ہوں۔ لہذا جہاں کہیں غزل میں میرا تخلص غالب تجھے نظر آئے اس کو کاٹ کر اس کے بجائے مغلوب لکھدے۔

ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا — مے تراش آنرا و مغلوبے بجایش می نویس

مرزا کہیں کہیں شاعری کے درجہ سے تنزل کرکے ناصح کی حیثیت قبول کر لیتے ہیں مگر اس میں بھی وہی انداز ظرافت ہے۔ معشوق نے عاشق کو قتل کر دیا ہے۔ اور اب وہ وارثان قاتل کے بلوے سے خوف و ہراس کھا رہا ہے۔ اور پریشان ہے۔ تو اب اس کو سمجھاتے اور کہتے ہیں کہ آخر آپ اوس کے وارثوں سے کیوں پریشان ہیں لعنت بھیجئے۔ کہ موت بڑی ظالم چیز ہے۔ اس میں ہماری کیا خطا ہے۔ موت آئی مر گئے۔ ہماری ادا نے کیا کیا۔

ز وارثان شہیداں ہراس یعنی چہ — قویست دست قضا کشتۂ ادا تو کیست

ایک جگہ کہتے ہیں کہ عالم شباب میں زہد و تورع کی علت گویا کہ عالم ہستی کی ناقدری ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے

پارسا جوانوں کی جان پر آفت آتی ہے۔ خدا اس سے ہر مسلمان کو بچائے۔

شباب وزہد چہ ناقدر دانی ہستی است   بلا بجان جوانان پارسا ریزد

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ دولت سعی سے کبھی نہیں ملتی ہے۔ یہ سعی اس قابل ہے کہ آدمی کو اس سے پشیمان ہونا چاہیئے۔ آسان ترکیب یہی ہے کہ اگر کافر ہونا میسر نہیں ہوتا ہے تو مجبوراً انسان مسلمان ہو جائے۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو   کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

معذرت نامہ

رسالۂ نگار میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعائر مذہبی و اعمال اللہ تعالےٰ جل شانہ، و حضرات انبیاء کرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالت مآب صلعم و دیگر بزرگان دین و ائمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو۔ مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہونچا اور یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار برائت و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین استغفر اللہ الذی لا الہ الا ہو الحی القیوم من کل ذنب و اتوب الیہ و صلی اللہ تعالےٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین و علی جمیع الانبیاء والمرسلین و من اتبعہم باحسان الی یوم الدین والحمد للہ رب العالمین۔

---

۱۲ اکتوبر کے ہمت کے اعلان اور اکتوبر کے نگار میں جو کچھ ملاحظات کے تحت میں چھپا ہے اسکو اعلان معذرت سے قبل لکھنے کے باوجود کالعدم قرار دیتا ہوں کیونکہ اگرچہ وہ معذرت نامہ پر دستخط کرنے سے پہلے لکھے گئے تھے، مگر ان کی اشاعت بعد کو بھی ہوئی اور اس معذرت نامہ کی روح کی منافی تھی۔ نگار میں آئندہ کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کروں گا۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

نیاز

ملاحظات

غالب کا مطالعہ اس وقت تک اتنی مختلف نگاہوں سے ہو چکا تھا کہ بظاہر کوئی زاویہ ایسا نہ رہ گیا تھا، جس کو پیش نظر رکھ کر، بحث کا کوئی جدید پہلو اختیار کیا جاتا، لیکن ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالباری آسی نے آخر کار ایک اسلوب جدید گفتگو کا نکال ہی لیا۔ اور اس میں کلام نہیں کہ جس طرح انھوں نے غالب کی شوخ نگاریوں کا استقصا کر کے اس مضمون کو مرتب کیا ہے، وہ یقیناً کافی محنت و دردسری چاہتا تھا۔

غالب ایک فلسفہ طراز شاعر تھا یا نہیں؟ —— اس پر دو مختلف رائیں پیش کی جا سکتی ہیں — غالب، صحیح رنگ تغزل کے لحاظ سے بلند ترین مرتبۂ شاعری کا حامل تھا یا نہیں؟ —— اس مسئلہ پر علیحدہ علیحدہ مختلف دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں۔ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے کوئی خاص پیغام دنیا کو پہونچایا یا نہیں؟ —— یہ بھی محل اختلاف و نظر ہو سکتا ہے —— لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ غالب اپنی شوخ طبعی، فطری ذہانت، اور شوخ نگاری کی حیثیت سے ایک مخصوص امتیاز کا مالک تھا، تو یقیناً یہ ایک ایسا دعوے ہوگا جس کے ثبوت میں نہ کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ ملک میں دو رائیں اس مسئلہ پر نظر آئیں گی۔

اس کا کلام یکسر الہام فلسفہ تھا، مسلم —— اس کا رنگ تغزل جذبات محبت کے سوا کچھ نہ تھا حقیقت مبرہن — اس کا پیام شاعری بالکل پیام خداوندی تھا، لاریب فیہ —— لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ماننا پڑے گا کہ اگر اس نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ صرف فلسفۂ تفاؤل و مسرت تھا، اگر اپنی غزل سرائی میں اس نے جذبات محبت سے بحث کی تو وہ یاس و قنوط سے بالکل علیحدہ بھی اور اگر اس نے کوئی پیام الوہیت سنایا، تو وہ اُس خدا کا تھا جس کا مظہر یونانیوں میں باخوس (شراب کا دیوتا)

پھر اگر آپ اُس کے اس فطری رنگ کو تلخ یا شیریں حقیقت نہیں کہہ سکتے تو سوائے شوخی و شوخ طبعی کے کس چیز سے تعبیر کریں گے —— یہی سبب ہے کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے متعلق جس قدر شاعرانہ استہزاء اس نے کام لیا، شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نظر آئے۔ اور یہی اس کی فطرت ہے جو اس کے انتہائی ملول و حزین جذبات کو بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی کہ

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز
مگزارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ غالب نے اسی لئے دشنہ چھپا رکھا تھا کہ وہ اپنی جان دے دیگا۔ اور اس سے مقصود نمائش کے علاوہ کچھ اور تھا۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے یہاں نہ تو بیدل کا وہ عمیق فلسفہ تصوف ہے جو براہ راست روح انسانی کو متاثر کر کے کسی اور عالم میں پہونچا دیتا ہے، نہ درد کی سی وہ درد سرائی ہے جو انسان کو دل پکڑ کر بیٹھ جانے پر مجبور کرتی ہے، اور نہ کاروبار محبت میں مومن کی سی حقیقت نگاری ہے جو سینہ میں نشتر بر نشتر توڑتی چلی جاتی ہے، لیکن باایں ہمہ نہ آج بیدل سے کوئی اسقدر واقف ہے جتنا غالب سے اور نہ درد و مومن کا اتنا چرچا زبانوں پر ہے جس قدر غالب کا —— اس وقت تک جتنا لٹریچر اردو میں غالب پر فراہم ہو چکا ہے اور برابر ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی اردو یا فارسی شاعر کو نصیب ہوا ہو —— اس کا سبب صرف غالب کی رندانہ شاعری، آزاد نگاری، شوخ گفتاری و خوش طبعی ہے جو ہر جگہ اپنے لئے ایک نیا اسلوب بیان، ایک جدید طرز ادا، ایک بدیع شیوۂ گفتار پیدا کر لیتی ہے اور سننے والا کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ

گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یاد رکھئے زمانہ جس قدر ترقی کرتا جائے گا، غالب کے پرستار بڑھتے جائیں گے، کیونکہ یہ دور روحانیت و جذبات کا نہیں ہے، بلکہ مادی ترقی اور عشرت طلبی کا ہے۔ دنیا حزن و ملال سے بیزار ہو کر اب نشاط و مسرت کا تعاقب کر رہی ہے جس کے اسباب علوم جدیدہ نے ہر چہار طرف منتشر کر رکھے ہیں۔ اس لئے اب وہ کوئی بات دل دکھا دینے والی نہیں سننا چاہتی، بلکہ وہ صرف ایسی گفتگو چاہتی ہے، جس میں تفاول و مسرت ہو، نشاط و ولولہ ہو، اور چونکہ کلام غالب کی بنیاد اسی طربیہ جذبات پر قائم ہے، اس لئے اس کو مقبول ہونا چاہئے اور جوں جوں انسانیت دنیاوی ترقی میں آگے بڑھیگی، اتنی ہی زیادہ مقبولیت اس کو حاصل ہوتی جائے گی۔

دین و مذہب دو بالکل علحدہ چیزیں ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق ایک شخص کے ذاتی اعتقادات سے ہے۔ اور دوسرے کا سوسائٹی سے۔ اس لئے غالب مذہب کے لحاظ سے جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن دین کے لحاظ سے ان میں ابن الراوندی، ابوالعلاء المعری، یا کم از کم علامہ ابن تیمیہ کی روح ضرور کام کر رہی تھی۔ اور اس خصوص میں ان کی آزاد خیالی کا اب سے ایک صدی قبل وہی عالم تھا جس میں آج ہر شخص سرشار نظر آتا ہے اور جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ

بامن میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اس سے مقصود میرا یہ ظاہر کرنا ہے کہ غالب کی شاعری چونکہ صد درجہ آزاد شاعری تھی۔ اور وہ دین ایسی چیز کو بھی اپنی تنقید و آزاد خیالی سے مجروح کئے بغیر نہیں رہتے تھے، اس لئے دور حاضر کے انسان کو جو ہر چیز میں آزادی چاہتا ہے، ان کے کلام سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ اور یہ آزادی جس قدر ترقی کریگی، غالب اتنا ہی زیادہ ہر دلعزیز ہوتا

جائے گا۔

یہ درست ہے کہ غالب کے یہاں ایسے شعر بھی ہیں جو ان کے اصل مقام سے علیحدہ صرف دنیائے جذبات اور تاثرات حزن و ملال کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اوّل تو وہ بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں بھی غالب کی تنقیدی انفرادیت بدستور باقی رہتی ہے ——— ان کی ایک نہایت ہی پاکیزہ غزل ہے جس کے چند شعر یہ ہیں۔

بیا و جوشش تمنائے دیدنم بنگر — چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ میکردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم — ندیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر
دمیدہ دانہ و بالیدہ آشیاں گم شد — در انتظار ہماں دام چیدنم بنگر

دیوان غالب میں مشکل ہی سے اس سوز و گداز کے شعر اور مل سکتے ہیں، یہاں تک کہ بہ اوّل نظر ان کے فرمودۂ غالب ہونے پر بھی بآسانی یقین نہیں ہو سکتا، لیکن جنھوں نے غالب کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عالم یاس و نامرادی میں بھی ان اشعار کے اندر غالب کی انفرادیت بدستور قائم ہے اور اس کی فطرت کا وہ جوش جو دوسرے اشعار میں شوخی کی صورت سے نمودار ہے، یہاں اس نے الفاظ کے رکھ رکھاؤ، مضمون کی بلندی، خیال کی رفعت اور بندش و ترکیب کی صورت اختیار کر لی ہے اور اگر ان خصوصیات کو علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو وہ عالم تاثر یکسر محو ہو جاتا ہے۔

الغرض مدعا یہ کہنا ہے کہ غالب کی وہ خصوصیت جو اسے تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہے، صرف اس کی شوخی و رندی ہے اور بدقسمتی سے اسی چیز کو اس وقت تک اکثر نقادانِ فن نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ہم ممنون ہیں کہ جناب آسی صاحب نے بہت کاوش سے اس موضوع پر اتنا مسالہ فراہم کر دیا۔ اور آئندہ اگر کوئی شخص اس مبحث پر کچھ لکھنا چاہے گا تو اس کو ان صفحات سے بہت مدد ملے گی۔

نیاز

بسم اللہ

نگار

جلد۲۱ — فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۳۲ء — شمارہ۲

نگار

جلد ۲۱ فروری سنہ ۱۹۳۲ء شمارہ ۲

ملاحظات

سنتے ہیں کہ عہد عتیق میں جب خدا کسی ملک وقوم پر اپنی برہمی کا اظہار کیا کرتا تھا، تو کبھی صورتیں مسخ کرکے انسان سے بندر بنا دیتا تھا، کبھی "طیرا ابابیل" کی قسم کا کوئی آسمانی عذاب مسلط کرکے برباد کردیتا تھا اور کبھی من وسلویٰ کی فراہمی کو بند کرکے گرسنگی کے شدائد میں مبتلا کردیتا تھا۔ فرعون واہل فرعون کی غرقابیٔ نیل کی داستان کسے نہیں معلوم اور ساکنان سدوم آتشیں بارش کا افسانہ کس سے مخفی ہے ——— لیکن اب خدا ان طبیعی ذرائع سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ انسان کو خود کے اکتسابات سے تباہ کراتا ہے اور اس کی عقل خود اسی کی بربادی میں صرف کی جاتی ہے

آج یورپ کا ترقی یافتہ انسان، مہذب وشایستہ انسان، علوم وفنون کا ماہر انسان، اخلاق وانسانیت کے لحاظ سے جس رتبۂ بلند پر فایز ہے، اس کا حال ان محکوم ومغلوب جماعتوں، اُن مجبور ومقہور قوموں سے پوچھو جو اس کی سیادت وحکومت میں غلامانہ زندگی بسر کررہی ہیں اور پھر غور کرو کہ کیا نوع انسانی کا اپنے اخلاق کے لحاظ سے بندر ہوجانا اس سے زیادہ کوئی مفہوم اور رکھ سکتا ہے ——— گزشتہ محاربۂ عظیم میں ہوائی جہازوں نے دنیا کی جتنی بے گناہ آبادی کو خاک میں ملادیا، کیا اس کا اندازہ آسان ہے اور کیا "طیرا ابابیل" اس سے زیادہ سخت آسمانی عذاب ہوسکتا تھا؟ ——— پھر آج دنیا جن اقتصادی دشواریوں میں مبتلا ہوکر اپنی ذہنی ودماغی، معاشری واقتصادی، سیاسی واخلاقی توازن کو ہاتھ سے کھوتی جارہی ہے اور جس عسرت وافلاس نے اس کے جسم وروح کو شدید گرسنگی سے بیتاب بنا رکھا ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ من وسلویٰ کے بند ہونے پر اس سے زیادہ اضطراب کسی ساعت میں پیدا ہوا ہوگا ——— حقیقت یہ ہے کہ باوجود تمام ترقیوں کے انسان ہنوز ایک درندہ ہے اور دوسرے درندوں سے

اگر اسے کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف اسقدر کہ اُن کے ناخن وچنگال ہر شخص کو نظر آجاتے ہیں اور انسان کے ناخن وچنگال اس کے دماغ میں پنہاں ہیں، اگر شیر کے پنجے صرف جسم کو مجروح کرتے ہیں تو انسان کی خونخواریاں روح کو زخمی کر دینے والی ہیں۔ وہ اگر انسان کو تباہ کرتا ہے تو یہ انسانیت کو برباد کرنے والی ہیں

مغرب و متبعین مغرب کی ترقی کا نصب العین صرف دولت کی فراہمی اور سرمایہ داری کا قیام ہے، علوم وفنون کی ترقیاں، ایجادات واختراعات کا ہنگامہ، مشینوں کی گردش، صنعت وحرفت کی گرم بازاری، یہ سب نتیجہ ہے اس قارونی ذہنیت کا جس کے نزدیک دولت کا مصرف محض انفرادی عیش وکامرانی اور اجتماعی تباہی وبربادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دور اجتماعی احساس کا ہے، لیکن ذہن انسانی کے نتائج، اعمال وافکار انسانی کی خواہشات اسقدر خود غرضانہ ہیں کہ مشکل ہے ہم جاہ وثروت کی ترقی کو انسانی ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار چاہتا ہے کہ ساری دولت اسی کو مل جائے اور طبقہ عمال صرف زندہ رہنے کی حد تک اپنی ضروریات کو پورا کر سکے، مغربی حکومتیں جو صرف سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہیں چاہتی ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کو اپنی غیر ضروری مصنوعات کی منڈی بناکر محتاج ومفلس بنا دیں اور جس وقت کسی قوم یا ملک میں اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے تو تیغ وتفنگ کی مدد سے اس حق استبداد وملوکیت کو تسلیم کرایا جاتا ہے

پھر ہر چیز کی ایک حد وانتہا ہوا کرتی ہے، اور انتہا کا نام ردّ عمل ہے۔ جس میں آج تمام مغربی ممالک مبتلا ہیں اور جنکی وجہ سے انگلستان وامریکہ کے دولتکدوں کے سامنے آج خاک سی اُڑ رہی ہے۔ کارخانوں میں مصنوعات کی افراط سے تل رکھنے کی جگہ نہیں، لیکن خریدنے والے مفقود، ٹکسالوں میں زر وسیم کے انبار لگے ہوئے ہیں، لیکن بازار میں سکہ کی گردش کرنے کے اسباب موجود نہیں ضاعت گاہیں بند ہیں، بنکوں کے دیوالے نکل رہے ہیں، مزدوری فاقہ کشی میں مبتلا ہیں اور بڑے بڑے ساہوکار خود کشی پر آمادہ

چونکہ ترقی علوم وفنون سے صرف استحکام سرمایہ داری کا کام لیا جاتا تھا اس لئے کسی نہ کسی وقت اسکا نتیجہ وہی ہونا چاہئے تھا جو اب ظاہر ہو رہا ہے، لیکن جنگ عظیم نے جرمنی اور روس میں انقلاب پیدا کرکے دنیا کو اس انجام سے قریب تر کر دیا اور وہ زمانہ دُور نہیں جب دنیا کے گوشہ میں روس ہی کا سا اجتماعی انسان (COLLECTIVE MAN) نظر آئے گا اور دولت وثروت کا طلسم ٹوٹ کر نوع انسانی پھر اسی سطح پر آئے گی جس کا نام مساوات یا زیادہ اصطلاحی رنگ میں "اجتماعیات" و "اشتراکیت" ہے

ہندوستان کے موجودہ سیاسی لٹریچر میں، فن کا بہترین نمونہ جسے یقیناً "شاہکار" کا مرتبہ حاصل ہونا چاہئے، ہمارے ملک کے فرمانروا لارڈ ولنگڈن کا وہ پُر از معلومات خطبہ ہے جس میں جناب موصوف نے ہندوستان کے شاندار مستقبل اور اسکی موجودہ خوشحالی وترقی پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ صاحب موصوف نے سرزمین ہند کی جس "UTOPIA" کا نقشہ پیش کیا ہے وہ اصلاحات جدیدہ کے نفاذ سے قبل کا ہے اسلئے جس وقت گول میز کانفرنس اپنے تمام برکات وانعامات ارزانی فرماچکے گی تو پھر "ہندوستان جنت نشان" کی مسرت ونشاط کا کیا عالم ہوگا ——— فیہا فاکہۃ والنخل ذات الاکمام والحب ذو العصف والریحان

فسانے ناگفتنی بلکہ ناگفتنی ہیں۔ — واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کا اندازہ کرنے سے بالکل عاجز و درماندہ ہے

وہ کم فہم و کم بین حضرات جو دولت برطانیہ کی حکومت کو ایک ضغطہ و مصیبت جانتے ہیں، کیا حضور ویسرائے کی اس تقریر کے بعد بھی، ان کو غالب کے اس شعر پر ایمان لانے میں تامل ہوگا کہ

بالم بخویش بسکہ بہ بند کمند تو
مردم گماں برند کہ تنگم بہ بند تو

امریکہ میں ایک سیاہ فام جبشی قتل کا مرتکب ہوتا ہے لیکن خود بھی مجروح ہو کر اسپتال پہونچا دیا جاتا ہے اگر مجرم سپید چہرہ اور نیلگوں آنکھیں رکھنے والا ہوتا تو اس کی صحت کا انتظار کیا جاتا اور پھر باقاعدہ عدالت گاہ میں جرم کی تحقیق ہو کر سزا یا رہائی کی صورت میں کوئی نتیجہ پیدا ہوتا، لیکن وہاں اس کا انتظار نہیں کیا جاتا اور ایک جماعت اسے اسپتال سے زبردستی کھینچ کر باہر لے جاتی ہے۔ اور نذر آتش کر دیتی ہے —— یہ ہیں اخلاق اس قوم کے جو ہمارے لئے "بیرحمی جانوراں" کو بھی گوارا نہ کر کے اس کے انسداد کے لئے قانون نافذ کرتی ہے۔ پھر فرض کیجئے کہ اگر آج ہم سیاہ قوموں کے پاس بھی ہوائی جہاز، جنگی بیڑا، اور لوہ شکن توپیں کثیر تعداد میں موجود ہوں اور ہم بھی کسی سفید رنگ انسان کے ساتھ یہی سلوک کریں تو کیا کسی کو زبان ہلانے کی جرأت ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز دنیا میں صرف "قوت" ہے اور یہ نعمت جب تک کسی کو حاصل ہے اس کی ہر بات سراہے جانے کے قابل ہے، اس کا ظلم بھی ایک ادا ہے اور اس کی بے اعتنائی بھی ایک عشوۂ دل نواز

سرسید مرحوم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اگر نماز میں بجائے قرآنی آیات کے ان کا ترجمہ پڑھا جائے تو کیا حرج ہے۔ سرسید نے جواب دیا کہ "حرج تو کچھ نہیں، لیکن نماز نہ ہوگی" —— سرسید غریب کو کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے جب مسلمانوں ہی کی حکومت میں انھیں کا ایک فرمانروا قانوناً قرآنی آیات کا نماز میں پڑھنا ممنوع قرار دیگا اور بجائے اُن کے صرف ترجمہ کا پڑھنا کافی سمجھا جائے گا۔ پھر کیا ہے ہندوستان کے ۷ کرور مسلمانوں میں یہ جرأت جو دنیا کے اس سب سے بڑے راجپال کالی چرن کو اس فعل سے باز رکھ سکے اور کیا ہے کوئی مذہب کے نام پر جان دینے والا جو اس کافر اعظم، اس ملحد اکبر، اور اس زندیق دہریہ کو تہ تیغ کر دے

جس وقت ترکی کی مذہبی آزادی کی کوئی خبر آتی ہے تو یہاں کا مذہبی طبقہ اسے صرف غلط پروپاگنڈا کہکر ٹال دیتا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ واقعی اسے غلط سمجھتا ہے، بلکہ صرف اسی بنا پر کہ اس کو صحیح سمجھنے کے بعد وہ آخر کر بھی کیا کر سکتا ہے

جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی آزادیوں کو غلط ہی سمجھیں لیکن جس وقت ان لوگوں سے گفتگو کا موقعہ ملتا ہے جو وہاں جاکر خود اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات کا مطالعہ کر آئے ہیں تو پھر ہم اس فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہمارا

اسلام آنسو بہانے کے قابل ہے یا مصطفےٰ کمال کی بیدینی؟ اگر یہ پیشین گوئی صحیح ہے کہ دنیا سے مذہبیت کا اُٹھ جانا لازمی نتیجہ ذہن انسانی کی ترقی و آزادی کا ہے تو ممکن ہے عہد حاضر کی تاریخ میں مصطفےٰ کمال کے یہ کارنامے زریں حروف سے لکھے جائیں، لیکن کم از کم ہندوستان کے مسلمان کبھی اس سے متفق نہیں ہو سکتے

افسوس ہے کہ اس وقت تک کسی خانوادۂ علم و افتاء سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی کہ ان حالات میں حکومت انگورہ کی مسجد میں نماز جائز ہے یا نہیں اور وہاں کے مسلمان خاندانوں سے رشتۂ مناکحت قائم کرنا کیسا ہے؟

لاہور میں عرصہ سے ایک انجمن قائم ہے جو اپنے آپ کو "عقل پرست" کے نام سے موسوم کرتی ہے اور جس کے لائحۂ عمل میں سب سے پہلا فرض خدا کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ حال ہی میں ہمیں اس انجمن کا ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے، جس میں نہایت شد و مد سے انکار خدا کے دلائل پیش کئے گئے ہیں

اس میں شک نہیں کہ "عقل پرستی" نہایت معقول بات ہے اور کون ہے جو عقل سے کام لینے کو برا جانے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا ہی کو کیوں عقل کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی کے بہت سے معمے ایسے ہیں جو عدم استعمال عقل کی وجہ سے ہنوز لاحل پڑے ہوئے ہیں، سب سے پہلے ان پر کیوں نہ عقل صرف کی جائے۔ معاشرت و اقتصاد، تعلیم و تربیت، صنعت و تجارت، سیاست و تمدن سے متعلق کثرت سے ایسے مسایل ہمیں ملتے ہیں، جن پر ہم نے آج تک غور نہیں کیا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو تو نظر انداز کیا جائے جن سے ایک قوم کا مستقبل بنتا ہے اور خدا کو لے لیا جائے کہ اس کے وجود سے انکار کرنا کسی طرح صحت اخلاق کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ ایسے مسایل میں سر کھپانا سراسر تضییع اوقات ہے اور اب دنیا کو ان کی طرف متوجہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم اس خیال سے کہ ممکن ہے یہ پمفلٹ ناظرین نگار میں سے کسی کی نظر سے گزرا ہو، اس ماہ کی اشاعت میں ایک مضمون اس موضوع پر شایع کیا جاتا ہے

لندن کی ایک گلی سے جس کے دونوں طرف پختہ لیکن کثیف عمارات کا سلسلہ نظر آتا ہے ایک جماعت نکلتی ہے جن کے جسم پر کوٹ، ٹانگوں میں پتلون، سر پر ہیٹ، گلے میں کالر سبھی کچھ موجود ہے لیکن ذرا شکستہ و خستہ حالت میں ——— یہ جماعت اپنے افلاس کے بیان سے کلیسائے وسٹ منسٹر سے لے کر قصر ونڈسر تک ایک تہلکہ برپا کر دیتی ہے کیونکہ ان لوگوں کو صبح کے وقت توس کے ساتھ کافی مکھن نہیں مل سکتا، ناشتہ میں بھُنی ہوئی مچھلی ان کو میسر نہیں ہوتی، رات کو وہ تھیٹر و سنیما میں شریک نہیں ہو سکتے، اپنے کپڑے روزانہ دھوبی کو نہیں دے سکتے اور عمدہ قسم کا تماکو ان کے پائپ میں نظر نہیں آتا، ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ چند لاکھ ہے

ہندوستان میں ایک جماعت ایسی ہے جسے دو دو وقت تک خشک روٹی نہیں ملتی جس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی

نظر نہیں آتا، جو جاڑوں میں سردی کی شدت سے، گرما میں گرمی کی سختی سے اور برسات میں بارش کی نمی سے لاکھوں کی تعداد میں ہر سال مختلف عوارض کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہے، جس نے لہو لعب، سیر و تفریح کے سلسلہ میں کبھی سینما و تھیٹر کا نام بھی نہیں سنا - اور ان کی تعداد کروروں سے زیادہ ہے - لیکن لندن کی وہ چند لاکھ نفوس پر مشتمل ہونے والی جماعت جسے رئیسانہ زندگی بسر کرنے کے ذرایع حاصل نہیں ہیں، زیادہ اہم، زیادہ قابل توجہ اور زیادہ غریب ہے - اور ہندوستان کے وہ کروروں انسان جن پر آسمان و زمین دونوں تنگ ہیں، جو بقاء حیات کے لئے بھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے، زیادہ بہتر حالت میں ہیں اور زیادہ بے توجہی کے قابل ——— یہ ہے موجودہ دور کے عقل و حکمت کا فیصلہ اور یہ ہے عہد حاضر کی متمدن دنیا کی وہ ذہنیت جس کی بلندی کا راگ ہر طرف گایا جا رہا ہے اور جس کے سامنے ہماری خوئے تسلیم و رضا کا ہنوز یہ عالم ہے کہ:-

بردست و پائے بند گرانے نہادۂ
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادۂ

مسلمانوں کی دو تحریکیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں، ایک تحریک خلافت دوسری تحریک تبلیغ، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں نے کافی نقصان ملک کو پہونچایا - ہندوستان میں بیٹھ کر خلافت کے نام سے کسی جماعت کی تنظیم سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کہ مسلمانوں کو اندرون ملک کے مسائل کی طرف سے غافل و بے پرواہ رکھا جائے، چنانچہ جس وقت تک ترکی میں خلافت کا وجود باقی رہا، ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ اس سے دلچسپی لی - اور اپنی بڑی قوت اسی پر صرف کرتے رہے، درانحالیکہ قیام خلافت کے بہترین زمانہ میں بھی سلطنت ترکی مسلمانان ہند کی کوئی امداد کر سکی اور نہ کر سکتی تھی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسیات اندرونی میں وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے اور کبھی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ انھیں زندگی اسی ملک میں بسر کرنا ہے اور اسی ملک والوں کے ساتھ تعلقات تمدن قائم کرنا ہیں - لاکھوں روپیہ خلافت کے نام پر مسلمانوں سے جمع کیا گیا اور اس کا ایک پیسہ بھی کسی ایسے کام میں صرف نہ ہوا جسے ہم کو کوئی فائدہ پہونچتا - اگر یہ رقم محض مسلمانوں کی تعلیم ہی پر صرف ہوتی تو آج معلوم نہیں یہ جماعت ترقی کے کس زینہ پر ہوتی

اس کے بعد ہی بدقسمتی سے تحریک تبلیغ شروع ہو گئی جس کا عظیم ترین نقصان یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی شدھی و سنگھٹن کے نام سے نہایت ہی نامعقول تحریک مضبوط ہو گئی اور ہمیشہ کے لئے ملک کی ان دو بڑی جماعتوں میں ایک وسیع خلیج حایل ہو گئی - وہ لوگ جنھوں نے تاریخ ہند کا غائر مطالعہ کیا ہے - وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کوئی مذہب صحیح معنی میں نہیں پایا جاتا تھا - بلکہ صرف ایک معاشرتی نظام ملک کے اندر قائم تھا جس میں تمام قومیں برابر کی شریک تھیں - جب مسلمان یہاں آئے اور انھوں نے مذہب کی آواز بلند کی، تو ہندوؤں میں بھی اسی قسم کی تنظیم کا خیال پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ تعصب و احتراز، مغایرت و اجنبیت کی کیفیت

بڑھنے لگی

پھر اس میں کلام نہیں کہ ہر چند مُسلم حکومت یہاں آنے کے بعد بھی مُسلم ہی رہی، لیکن اس نے ہندؤں کو مُسلمان بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اس تفریق کی بنا پر اصول عدل وانصاف کو متاثر ہونے دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے سوائے دو چار کے، اسی ملک کو اپنا گھر بنالیا اور یہیں کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ہندؤں کے ساتھ تمدنی تعلقات قائم کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی مغائرت کا نظم حکومت پر کوئی اثر نہ پڑا اور نہ ہندؤں نے اس تفریق کو زیادہ محسوس کیا۔ جب یہ دور ختم ہو کر برطانیہ کی حکومت شروع ہوئی تو چاہیے تھا کہ یہاں کی مسلم آبادی تفریق مذہب کو بالکل بھلا دیتی اور معاملات ملکی میں دونوں کا اجتماع ہو جاتا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اور مسلمانوں نے اپنی عمر کا کافی حصہ صرف اس غرور و نخوت کی پرورش میں صرف کر دیا کہ وہ شاہان ہند کی یادگار ہیں اور اس لئے ان کو حق حاصل ہے کہ وہ ہندؤں کو اسی طرح محکوم سمجھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہونے لگی اور ہندؤں کی بعض جماعتوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمان تبلیغی مذہب کے پیرو ہونے کی وجہ سے اپنی جماعت کو بڑھانے کا زیادہ موقع رکھتے ہیں، اپنی اندر بھی ایک جماعت آریہ سماج کے نام سے پیدا کی جو بالکل مسلمانوں کی طرح دوسرے مذاہب والوں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی مدعی تھی اور ہے ——— مگر چونکہ ہندوؤں میں یہ تحریک بالکل ان کے مسلک قدیم کے خلاف تھی اس لئے اس کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور ان کی کوشش زیادہ سے زیادہ یہی رہی کہ کوئی ہندو مسلمان نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے بعد جب مسلمانوں نے ایک مستقل انجمن ہی تبلیغ کے نام سے قائم کر لی تو پھر ان میں بھی جوش پیدا ہوا اور اس طرح باقاعدہ دو محاذ تیار ہو گئے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں انجمن تبلیغ کے ابتدا اس وقت ہوئی جب پہلے آریہ جماعت نے آگرہ کے ایک گاؤں میں چند نو مسلم لوگوں کو شدھی کرنے کا اعلان کیا، لیکن اس کا جواب اگر مسلمان صرف خاموشی سے دیتے اور اس طرف کوئی توجہ نہ کرتے تو ان کی تحریک شدھی اسی وقت فنا ہو جاتی۔ اور سنگھٹن وغیرہ کے جھگڑے بھی نہ پیدا ہوتے جو شدھی سے زیادہ مضرت رساں مسلمانوں کے لئے ثابت ہوئے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر چند لاکھ دہقانی اور غیر تعلیم یافتہ ہندؤں کو مسلمان بنا بھی لیا جائے تو اس سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے جبکہ مسلمانوں کی موجودہ تعداد ہی کو منظم کر کے ان کی تعلیم و اصلاح کا اہتمام نہیں کر سکتے ——— عہد سعادت، عہد خلافت اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں کبھی یہ ذہنیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو تعداد میں زیادہ کر لیں، بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جتنے مسلمان ہیں انھیں کو صحیح معنی میں مسلمان قائم رکھیں۔ اسلام نے ہمیشہ کمیت کے مقابلہ میں کیفیت کو ترجیح دی ہے اور اسی بنا پر اس کے دس افراد نے مخالف کے سو افراد کو نیچا دکھایا ہے، لیکن اب ہماری ذہنیت یہ ہے کہ صرف تختۂ مردم شماری میں چند ناموں کا اضافہ دیکھنے کو کافی سمجھتے ہیں اور غالباً یہی بڑا ثبوت ان کے نزدیک اسلام کی صداقت کا ہے۔ اس وقت ضرورت تو اس کی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ ۷ کرور کی تعداد کو بھی گھٹا کر نصف کر دیا جائے تاکہ جلد سے جلد ان کی تنظیم ہو سکے، نہ یہ کہ اس میں اور ناکارہ افراد کا اضافہ کر کے اصلاح کو اور زیادہ دشوار بنا دیا جائے۔ یہ خیالات میں نے اس لئے

ظاہر کئے گئے اس دوران میں بعض مقامات سے تبلیغ وخلافت کے نام سے چند اشتہارات ورسائل بغرض اشاعت وتبصرہ میرے پاس آئے تھے اور اس لئے میں ان انجمنوں کو جنھوں نے یہ لٹریچر میرے پاس روانہ کیا ہے بتادینا چاہتا ہوں کہ میں ان دونوں تحریکوں کا مخالف ہوں اور مخالفت کے اسباب یہ ہیں جو عرض کئے گئے

اس ماہ کے رسالہ سے ایک نہایت ہی ضخیم وبسیط کتاب "تذکرۂ معرکۂ سخن" کا سلسلۂ اشاعت شروع کیا گیا ہے۔جب تک یہ کتاب ختم نہ ہوگی ہر ماہ ۱۶ صفحات اس کے شایع ہوتے رہیں گے۔ اس لئے میں ناظرین نگار کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ان اوراق کو بہت حفاظت سے رکھیں اور جب کتاب ختم ہوجائے تو سب کو ایک شیرازہ سے منسلک کراکے پوری کتاب تیار کرالیں ، ورنہ اخیر میں یہ مجموعہ کسی طرح چار روپیہ سے کم میں نہ ملے گا۔ یہ تالیف جس قدر اہم ومفید ہے ، اسکا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں ، لکھنے کی ضرورت نہیں

نگار میں آیندہ جیسے جیسے اہم مضامین شایع ہونے والے ہیں ان کا اندازہ ذیل کے بعض عنوانات سے ہوسکتا ہے:

(۱) مذاہب عالم اور اعضاء جنسی کی پرستش — یہ مضمون کئی جزو پر مشتمل ہے اور نہایت نادر واقعات وتحقیقات کا مجموعہ ہے

(۲) عریانی، تاریخ وفلسفہ، اخلاق ومذہب کی نظر سے — یہ مقالہ بھی کافی طویل ہے اور نہایت دلچسپ حقایق اپنے اندر رکھتا ہے

(۳) عہد نامۂ عتیق کی روایات کا ماخذ — یہ مضمون بھی کئی جزو کا ہے اور عجیب وغریب انکشافات تاریخی کا حامل ہے

یہ تمام مضامین اڈیٹوریل ہوں گے۔علاوہ ان کے شعبۂ ادب میں بھی نہایت معرکتہ الآرا مقالات پیش کئے جائیں گے

افسوس ہے کہ اس مرتبہ پریس کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے نگار چار چھ دن کی تعویق سے شایع ہو رہا ہے ہر چند نگار کی صحیح تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ ہے لیکن چونکہ ہمیشہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں اسکی اشاعت ہوجایا کرتی ہے اس لئے یہ معذرت ضروری تھی۔یقین ہے کہ آیندہ اہل مطبع اس شکایت کا موقعہ نہ دینگے۔

مسئلہ حسب و نسب خالص اسلامی نقطۂ نظر سے

ہمارے فاضل دوست مولوی عبد المالک صاحب آروی نے یہ مضمون جس کاوش و محنت، تحقیق و استقصار سے لکھا ہے اس کا اقتضار یہ تھا کہ اس کو علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا جاتا اور حقیقتاً فاضل مضمون نگار کا بھی یہی مقصود و مدعا تھا۔ لیکن محض ہمارے اصرار پر انھوں نے اس مقالۂ گرامی کو ہمارے پاس بھیجدیا۔ اور موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے ہم نے اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۳۱ء کے نگار سے شروع کردی

دسمبر کے نگار میں صرف تمہیدی حصہ اس اہم مضمون کا شائع ہوا ہے اسکے بعد جناب عبد المالک صاحب نے اقوام عالم کی تقسیم پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور پھر نسلی حفاظت، فلسفۂ معاشرت و ازدواج پر اپنی تحقیقات پیش کی ہے۔ ہم ان دونوں حصوں کو ابھی شایع نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس ماہ سے اس مضمون کی اشاعت اُس حصہ سے شروع کرتے ہیں جو بغیر طویل مباحث ذیلی کے اصل موضوع کی طرف منجر ہوجاتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ناظرین نگار اس میں کافی ذخیرہ معلومات تاریخی کا پائیں گے اور تفاخر نسب کا جو خیال بعض قوموں میں پیدا ہوگیا ہے اسکی حقیقت سے واقف ہوکر اس چیز پر فخر کرنا سیکھیں گے جسکا نام صرف انسانیت و اخلاق ہے۔ ہم نے اس تغیر کے ساتھ اس مضمون کا عنوان بھی بدل دیا ہے امید ہے کہ جناب عبد المالک صاحب اس سے اتفاق فرمائیں گے

تخیل نسب پر سیاسیات کا اثر

تاریخ کے صفحات ہمیں بتاتے ہیں کہ مرور ایام کے ساتھ مختلف ملتیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں دنیا نے نہ ہمیشہ کسی کا ساتھ دیا ہے نہ دیگی، اقوام کی تاریخوں اور افراد کے سوانح زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک قوم کسی مخصوص زمانہ میں انتہائی پستی سے نکل کر برسر اقتدار ہوتی ہے، اور دوسری کمال ترقی کے بعد تدریجاً منازل ہبوط سے گزرنے لگتی ہے۔ پھر عروج و زوال کے اس تغیر کے ساتھ صرف ہماری ذہنیت ہی نہیں بدلتی بلکہ

ہیئت اجتماعیہ کے روابط بھی اسی انقلاب کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص اپنی افتادگی و بیچارگی کی حالت میں دنیا کی ہر چیز کے ساتھ وابستگی اور ربط رکھنے پر مجبور تھا تو آج تغیر حالات کے ساتھ اس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس تعلق کو جو فرو تر اصحاب کے ساتھ قائم تھا، منقطع کر دے اور یہی خیال فخر نسبی کا سنگ بنیاد ہے، سیاسیات نے اس کو تین صورتوں سے بیان کیا ہے:-

(۱) حصول حکومت وطلب جاہ کے لئے نسب کے بارہ میں غلط بیانیوں سے کام لینا

(۲) حکومت و دولت حاصل ہونے کے بعد اثر قائم رکھنے کے لئے سلسلۂ نسب غلط وضع کرنا

(۳) مال و دولت، حکومت و ریاست کے ذریعہ سے اعلیٰ خاندانوں کو اپنے اندر جذب کرنا

تاریخ کے اندر ان تینوں صورتوں کے شواہد بکثرت ملتے ہیں

علویۂ مصر حضرت امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد، زیدیہ و روافض کے علاوہ شیعوں کے یہاں دو اہم جماعتیں اور پیدا ہو گئیں ایک حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی قایل ہوئی اور دوسری نے محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؑ کی امامت تسلیم کی، پہلی جماعت "اثنا عشری" کہلاتی ہے، دوسری "اسمٰعیلیہ" علویۂ مصر اپنا نسب محمد بن اسمٰعیلؑ سے ملاتے ہیں لیکن تاریخ اور انساب میں اس کے خلاف روایتیں موجود ہیں اور بعض نسابین، علویۂ مصر کو "سید" تسلیم نہیں کرتے،

۲۹۷ھ میں عبید اللہ المہدی نے حکومت کی بنا ڈالی اور ۵۶۲ھ میں اعضد الدین اللہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان میں چودہ حکمران گزرے ہیں، اپنی ڈھائی صدی کی حکومت میں وہ سلطنت کے ساتھ اسمٰعیلیہ مذہب کی بھی ترویج کرتے رہے، جسے ایک سیاسی پروپگنڈا کہہ سکتے ہیں اور اسی فرقہ وارانہ عصبیت نے ان کی حکومت عباسیہ جیسے زبردست حریف کے مقابل میں ڈھائی سو برس سے زیادہ قائم رکھی ان کے متعلق علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

الملوك عبيد يه مصر الذين وفدوا من المغرب ويقال انهم ينتهون الى محمد بن جعفر بن محمد بن اسمعيل بن الصادق عليه السلام وقد نفاهم العباسيون من النسب وكتبوا بذالك محضراً[1]۔

مصر کے ملوک عبیدی جنہوں نے مغرب سے وفد بھیجے اور جن کا نسب محمد بن جعفر بن محمد بن اسمٰعیل بن (جعفر) صادقؑ تک منتہی ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ عباسیہ نے ان کا یہ نسب نہیں تسلیم کیا اور اس کے خلاف ایک محضر تیار کیا۔

---

[1] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار ۱۲

فرشتہ نے برُہان نظام شاہ کے سلسلہ میں ایران کے ایک اثنا عشری مُبلغ شاہ طاہر کے ورود ہند اور شیعی نشر و تبلیغ کا تذکرہ کیا ہے، اور تاریخ حبیب السیر کے حوالہ سے ضمناً علویہ مصر کا بھی حال لکھا ہے - شاہ طاہر سلاطین اسمٰعیلیہ (علویہ) مصر کی اولاد سے تھے، اسمٰعیلیہ مصر کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں اس خاندان کے ایک پرہیزگار اور عالم فاضل شخص نے ترک دنیا کیا اور فقیروں کا لباس پہنکر لوگوں کو اثنا عشری مذہب کی دعوت دی اور اپنے جد امجد اسمٰعیلؑ کی امامت کا عقیدہ چھوڑ دیا - اہل مصر و مغرب اس سیّد کے بڑے معتقد ہو گئے، مریدوں کی کثرت ہو گئی، آپ کے فرزندوں میں یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوتے گئے، ۵۶۷ھ میں جب اسمٰعیلیہ مصر کی حکومت ختم ہو گئی اور ان کے ممالک محروسہ پر عباسیہ کا قبضہ ہو گیا تو اس مضافات میں علویہ کی بود و باش بہت دشوار ہو گئی، وہ ادہر اُدہر منتشر ہو گئے ایک سجادہ نشین سید نے موضع 'خوند' میں جو گیلان کے علاقہ میں قزوین کے جوار میں ہے، سکونت اختیار کی ان کی اولاد "سادات خوندیہ" کے نام سے مشہور رہوئی تین سو سال سے کچھ کم زمانہ تک یہ خاندان صوفیانہ تبلیغ و ارشاد کرتا رہا، سلاطین وقت اور حکام عصر ان کا احترام کرتے تھے، یہاں تک کہ شاہ طاہر سجادہ نشین ہوئے، یہ صورت و سیرت، علم و فضل، اور زہد و تقویٰ میں اسلاف سے بھی زیادہ ممتاز نظر آتے تھے، مصر و بخارا سمرقند و قزوین وغیرہ کے شیعہ شاہ طاہر کے حلقۂ ارادت میں آگئے ان کی بڑی شہرت ہوئی اس وقت شاہ اسمٰعیل صفوی کا زمانہ تھا چونکہ صفویہ نے خود بھی پیری مریدی کے ذریعہ حکومت حاصل کر لی تھی اس لئے وہ بیعت و ارشاد کی تحریکوں کو اپنے مقاصد کے خلاف جانتے تھے، آخر کار شاہ فارس نے شاہ طاہر پر پابندیاں عاید کیں اور بیعت و ارشاد کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اس کے بعد وہ کاشان میں درس دینے لگے، وہاں رفتہ رفتہ مُریدوں نے پھر ہجوم کیا ادہر غمازوں نے مختلف افواہیں اُڑائیں اب کی مرتبہ شاہ ایران نے قتل کا فرمان جاری کر دیا شاہ طاہر بھاگ کر ہندوستان میں آئے اسمٰعیل عادل شاہ سپاہیوں کے علاوہ کسی دوسرے طبقہ سے التفات نہیں رکھتا تھا، قلعہ پرندہ میں خواجہ جہان دکنی سے شاہ صاحب موصوف کی ملاقات ہو گئی انہوں نے ان کو اپنے ساتھ رکھا اور ملا پیر محمد آپ کے تلمذ میں داخل ہوئے، اور انھیں کی وساطت سے برہان نظام شاہ سے ملاقات ہوئی، برہان نظام شاہ کا لڑکا عبد القادر اتفاقاً سخت بیمار ہو گیا زیست کی امید نہ تھی، شاہ طاہر کو شیعیت کی ترویج کا اچھا موقع ملا انہوں نے برہان نظام شاہ سے کہا کہ عہد کیجئے کہ اگر آپ کا لڑکا اچھا ہو جاوے گا تو آپ اثنا عشری مذہب اختیار کریں گے اور اس کو رواج دیں گے، بادشاہ لڑکے کی زندگی سے مایوس ہو رہا تھا ایک صوفی منش کی زبان سے یہ خوش خبری سُنکر فوراً عہد کر لیا - رات کے وقت عبد القادر کے پلنگ کے نزدیک شاہ طاہر اور برہان نظام شاہ دونوں رہے، صبح کے وقت بادشاہ کی آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی بزرگ ہیں اور آپ کے دونوں طرف چھ چھ آدمی ہیں، بادشاہ نے نزدیک جاکر سلام کیا کسی نے کہا ان بزرگ کو جانتے ہو کون ہیں، یہ محمد مصطفیٰؐ ہیں اور آپ کے

اردگرد بارہ امام ہیں، ان حضرت نے فرمایا کہ اے برہان! خدا نے علیؑ اور ان کی اولاد کی برکت سے عبدالقادر کو صحت دی اب میرے فرزند "طاہر" سے جو کچھ تم نے وعدہ کیا ہے، اس سے تجاوز نہ کرو۔ فرشتہ نے اس خواب سے علویۂ مصر کی صحت نسبی پر استدلال کیا ہے، شاہ طاہر اسمٰعیلیہ خاندان سے ہیں اور آں حضرتؐ طاہر کو بیٹا کہتے ہیں صحیح حدیث "من رآنی فی المنام فقد رآنی" (جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھی کو دیکھا) کے مطابق برہان نظام شاہ کے خواب میں آں حضرتؐ کا تشریف لانا رویائے صادقہ ہے، لہذا اسمٰعیلیہ کا علوی ہونا پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے، لیکن اسی خواب کے متعلق خود آگے چل کر فرشتہ نے لکھا ہے کہ میرے خیال میں یہ رافضیوں کی افترا پردازی ہے بہرحال نسابین نے اسمٰعیلیۂ مصر کی علویت پر اعتراض کیا ہے، مغربیوں کی ایک جماعت ان کو عبداللہ بن سالم بصری کی اولاد بتاتی ہے، اور عراقیوں کا ایک فرقہ انھیں عبداللہ بن میمون قداح کی ذریت ثابت کرتا ہے، اسمٰعیلیہ کی ایک جماعت کہتی ہے، کہ آں حضرتؐ کی ایک حدیث علی رأس ثلاث مائۃ یطلع الشمس من مغربہا (تیسری صدی کی ابتدا میں آفتاب مغرب سے طلوع ہوگا) میں لفظ "شمس" سے مہدی (عبیداللہ اسمٰعیلی) مراد ہیں، بعض شیعوں کا یہ خیال ہے کہ مہدی مغربی کی ولادت ۲۶۰ھ میں ہوئی اور حضرت امام مہدی صاحب الزماں کی ولادت ۳ رمضان ۲۵۵ھ بمقام "سر من رأی" ہوئی، اور حدیث کے لفظ "شمس" سے محمد بن حسن عسکری (جن کا لقب مہدی صاحب الزماں ہے) مراد ہیں فرشتہ نے اسمٰعیلیہ کا جو نسب بیان کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

عبداللہ المہدی (سلطان مغرب) بن الرضا بن التقی قاسم بن الموفی احمد بن الرضا محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؑ

امیر علی نے جو نسب نامہ لکھا ہے وہ یوں ہے۔

عبیداللہ المہدی بن محمد الحبیب بن جعفر المصدق بن محمد المکتوم بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؑ۔

فرشتہ اور امیر علی کے شجرہ میں صرف یہی نہیں کہ اسماء کا اختلاف ہے، بلکہ فرشتہ نے ایک نام اور زیادہ لکھا ہے فرشتہ کی معلومات تاریخ حبیب السیر سے ماخوذ ہے، امیر علی نے ابن خلدون اور مقریزی سے یہ شجرہ نسبی درج کیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ ابن اثیر نے محمد الحبیب اور جعفر المصدق کے بدلے دو دوسرے نام لکھے ہیں۔ علامہ رفاعی نے جو اسماء لکھے ہیں وہ امیر علی سے مل جاتے ہیں، ان اختلاف کے باوجود یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی (۳۸۱ھ ۔ ۴۲۲ھ) کے زمانہ میں ان کے جعلی انتساب خاندانی کے متعلق سنی فقہا، اور ائمہ نے لعن طعن کیا۔ اور عباسیہ کے حکم سے ایک رپورٹ تیار کی گئی جیسا کہ رفاعی نے لکھا ہے، مورخ امیر علی اس کو خاندانی نزاع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عبیداللہ (اور اسمٰعیلی خلیفۂ مصر) کو مقریزی، ابن اثیر، ابوالفدا، اور ابن خلدون حضرت علیؑ کی صحیح النسب اولاد تسلیم کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے عباسیہ کے اس اتہام و افترا کی جو صراحت کی ہے وہ تاریخی تنقید کا شاہکار ہے،

اس میں شک نہیں امیر علی نے اس اعتراض کو خاندانی نزاع اور حسد پر مبنی کیا ہے۔ وہ ایک حد تک صحیح ہے، اسمٰعیلیہ، عباسیہ کے ایک زبردست حریف تھے، ان کی یہ آتش فشانیاں کسی نفسیاتی تحلیل کی محتاج نہیں عبید اللہ مہدی کا معاصر خلیفہ المقتدر عباسی (۲۹۵ھ تا ۳۲۱ھ) تھا اس کے بعد عباسیہ خاندان میں یکے بعد دیگرے القاہر، الرضی، المتقی، المستکفی، المطیع، الطائع تخت خلافت پر بیٹھے، لیکن کسی نے اعتراض نسبی کے متعلق کوئی محضر تیار نہ کرایا۔ اس کا خیال پیدا ہوا تو القادر کو اور وہ بھی تقریباً ایک صدی (۹۱ برس) کے بعد،

علویہ مصر کے انتساب خاندانی کے متعلق تاریخ اور انساب میں جو مختلف اور بعض متضاد روایتیں پائی جاتی ہیں وہ ایک بے لوث ناقد کو گرداب حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ فیصلہ کیا کرے، تنقیدی دیانت مقتضی ہے، کہ قدیم مورخین اسلام اور اس عہد کی ادبیات کا حوالہ و اقتباسات دیئے کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے، اور یہاں اس طول بحث کی گنجائش نہیں اس ساری بحث کے بعد اگر ہم علویہ کے سلسلہ نسبی کو جعلی نہیں کہہ سکتے، تو یہ بھی ہے کہ قطعی فیصلہ کی بنا پر انھیں اہل بیت میں شامل نہیں کر سکتے، اس واقعہ اور بحث کو میرے موضوع سے یہ علاقہ ہے کہ عہد ماضی میں "نسب" سیاسیات کے لئے کس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ عباسیہ نے نہ فوج سے کام لیا نہ اپنے وسیع اثر و رسوخ سے بلکہ انہوں نے ان کی تباہی کے لئے یہی ایک صورت نکالی، ظاہر ہے کہ جس عہد میں نسب کو یہ اہمیت حاصل ہو اس وقت سیاسی اغراض کے لئے نسبی افسانہ تراشیاں نہ کی گئی ہوں گی۔

دولت خلجیہ خلجیوں کا دور حکومت ہندوستان میں صرف ۳۴ سال (۶۸۷ھ تا ۷۲۱ھ) رہا، لیکن اس قلیل زمانہ میں اس خاندان نے ترقی و تنزل کے وہ عبرت انگیز مناظر پیش کئے کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں[۱]۔

خلجی خاندان کے ایک شخص محمود نے مالوہ میں حکومت کی اس دور کا ایک مورخ شہاب الدین حکیم کرمانی اپنی کتاب طبقات محمود شاہی میں سلطان جلال الدین خلجی اور سلطان محمود مالوی کا نسب چنگیز خاں کے داماد قالج خاں سے ملاتا ہے، عبد القادر بدایونی طبقات محمود شاہی کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اما ظاہر آنست کہ ایں معنی وقوعے نداشتہ باشد و صاحب طبع سلیم را باندک تاملے فساد دعوی او

[۱] اس موضوع پر میرا ایک مقالہ "دولت خلجیہ کا آخری نظارہ" کے عنوان سے "صوفی" بابت جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

معلوم میشود (اشارہ ہے کہ محمود شاہ کی خوشامد میں حکیم کرمانی نے یہ افترا پردازی کی ہے) ونیز درمیان قالج و خلج ہیچ نسبتے نیست باآنکہ قالج بہ زبان ترکی ملایمتے ندارد داگر باشد بہ معنی شمشیر ودر بعض تاریخ آوردہ کہ خلج نام یکے فرزندان یافث بن نوح است[1]

محمد علی خاں انصاری لکھتے ہیں۔

بقول صاحب سلجوقنامہ ترک بن یافث را یازدہ پسر بود یکے ازاں جملہ خلج نام داشت[2]،

بدایونی کی تنقید جو انھوں نے مصنف "طبقات محمود شاہی" کے بیان کردہ نسب پر کی ہے، دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بہمنیہ کو بہرام گور سے ملایا گیا اسی طرح خلجیہ کو بھی غلط طور پر چنگیز خاں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ اس لئے کہ موجودہ جاہ وجلال خاندان کی دیرینہ عظمت کے ساتھ مل کر رعایا کے قلوب میں مطیعانہ سپردگی کی کیفیت پیدا کردے

سید خاندان

عہد تغلق شاہی میں تیمور کے حملہ نے ہندوستان پر جو آفتیں ڈھائیں تاریخ کی دلگداز داستان ہے خاندان مٹ گیا اور خضر خاں بن ملک سلیمان تخت دہلی پر بیٹھا ۸۱۷ھ سے ۸۵۳ھ تک ان کی حکومت رہی بدایونی اور فرشتہ (فرشتہ نے "تاریخ مبارک شاہی" کے حوالہ سے لکھا ہے جو خضر خاں کے بیٹے مبارک خاں کے عہد میں اسی کے نام پر لکھی گئی تھی) دونوں نے خضر خاں کی ہاشمیت اور سیادت کے متعلق روشنی ڈالی ہے، بدایونی کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

درحقیقت سیدزادہ بود عالی تبار تا آنکہ روزے مخدوم جہانیاں سید السادات منبع السعادات شیخ جلال الحق والشرع والدین البخاری قدس سرہ، بجہت مہمے درخانہ ملک مروان دولت تشریف آوردند وطعام کشیدند و ملک سلیمان طشت و آفتابہ پیش مخدوم آوردہ تا آب بردست مبارک الشاں بریزد، و مخدوم خطاب بہ ملک مروان دولت فرمودند کہ ایں پسر سیدزادہ است وایں چنیں خدمت باد فرمودن مناسب نیست ازاں روز معلوم شد کہ ملک سلیمان سید بے شبہ است و باوجود ایں آثار سیادت وسعادت و اخلاق رضیہ و صفات حمیدہ در ذات مسند عالی خضر خاں معائن و مشاہد بود[3]

فرشتہ نے "تاریخ مبارک شاہی" کے حوالہ سے تقریباً یہی لکھا ہے، لیکن بعض ایسے الفاظ لکھے ہیں جن کے نکات کو بدایونی نے عقیدت کیشی میں نظر انداز کر دیا ہے مثلاً فرشتہ کی روایت ہے کہ ملک مروان دولت کے یہاں سید جلال بخاریؒ مہمان ہوئے اور ملک سلیمان نے آپ کا ہاتھ دہولانا چاہا تو آپ نے فرمایا

فرمود کہ ایں "سید" را بدین خدمت باز داشتن گستاخیست وچوں ایں سخن بر زبان اہل صلاح گذشتہ

---

[1] منتخب التواریخ [2] بحر المواج [3] منتخب التواریخ بدایونی

یقین کہ او سید خواہد بود[1]

بدایونی لکھتے ہیں کہ حضرت جلال بخاری نے "سید زادہ" کہا صاحب فرشتہ صرف "سید" لکھتے ہیں بہت ممکن ہے حضرت جلال بخاری نے ملک سلیمان کے ناصیہ فرخندہ میں آیندہ ملنے والی حکومت وسیادت کا مطالعہ کیا ہو اس لئے "سید" نسبی علاقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ جاہ ومرتبت کے اعتبار سے کہا ہو دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتہ کی روایت کے مطابق ملک سلیمان اس سے قبل کبھی "سید" ہونے کا دعوی نہیں کرتے تھے، خود بدایونی نے بھی لکھا ہے کہ

"ازاں روز معلوم شد کہ ملک سلیمان سید بے شبہ است"

اگر واقعی وہ سید زادہ تھے تو کبھی تو اس کا اظہار کرتے، اظہار نہ کرتے کسی کو تو معلوم ہوتا لیکن ایسی کوئی تاریخی شہادت نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک سلیمان، خضر خاں وغیرہ کی سیادت پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ محض حضرت جلال بخاری کی ایک پیشین گوئی پر مبنی ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ "سید" کی اصطلاح حکومت کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

ملک سلیمان کے اخلاق وفضایل کے متعلق فرشتہ اور بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے، میں مانتا ہوں لیکن کسی انسان کی پاک نفسی اور نیک طینتی اس کے سید زادہ ہونے کی دلیل نہیں ورنہ بڑے بڑے اولیاء اللہ، صوفیہ وزہاد تو چمار، لوہار، غلام اور غلام زادہ گزرے ہیں بلکہ حضرت جامی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ شیخ الاسلام کہتے تھے کہ ایک ہزار دو سو صوفی اماموں کو پہچانتا ہوں ان میں صرف ڈیڑھ صوفی "علوی" گزرے ہیں ایک ابراہیم سعد علوی، دوسرے حمزہ علوی[2]

شرافت نسبی کا تخیل انسان کے اخلاق جمیل کو جس طرح پامال کرتا ہے دنیا سے مخفی نہیں اس لئے نیک نفسی اور اخلاق حسنہ کی کثیر مثالیں عموماً خدا کے ایسے بندوں میں پائی جاتی ہیں جو دنیا میں نسلی امتیاز نہیں رکھتے، کیونکہ افتادگی وفروتنی کے بعد ان کے قلوب دنیا سے بیزار رہتے ہیں اور یہیں سے خالق ومخلوق کے حقیقی تعلق کی بنیاد پڑتی ہے،

"تاریخ مبارک شاہی"، خود سید خاندان کی حکومت کے زمانہ میں لکھی گئی اس لئے مورخ کو سید جلال الدین بخاری کے ایک مبہم جملہ کا بہانہ مل گیا اور اس نے اس کو دوسرے رنگ میں جلوہ دیا حاشا میں نکتہ چینی کے لحاظ سے یہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ نسب نامہ کی جو نوعیت بیان کی جاتی ہے، وہ قابل غور ضرور ہے، اور اس لحاظ سے ہر شخص اپنے فہم وادراک کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہے

سلاطین دکن

دکن کے اسلامی بادشاہوں کے حالات بھی عجیب وغریب ہیں - خاندان بہمنیہ (حکمران حسن آباد گلبرگہ واحمد آباد بیدر) کے بعد پانچ حکومتیں منصۂ شہود پر آئیں

عادل شاہیہ (سلاطین بیجاپور) نظام شاہیہ (شاہان احمد نگر) قطب شاہیہ (سلاطین تلنگ) عماد شاہیہ

---

[1] فرختہ ذکر سید خاندان [2] نفحات الانس جامی تذکرہ ابراہیم سعد علوی

(سلاطین برار) بریدشاہیہ (شاہان بیدر)

ان پانچوں حکومتوں کے بانی کسی شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اور نہ کبھی حکومت کی طرف سے ان کے اجداد اعلےٰ مناصب پر فائز تھے، حوادث زندگی نے ان کو غلامی کی ذلت انگیز زنجیر میں جکڑ دیا تھا ان تمام خاندانوں کے بانی مختلف بادشاہوں کے زرخرید غلام تھے اور محض اپنی اولوالعزمی، اپنی لیاقت طبع، اپنے اخلاق واوضاع کی بنا پر بادشاہ بن بیٹھے قدرت کی فیاضیاں ان پر زیادہ ہوئیں اور غلامی سے نجات پاکر بادشاہ ہوگئے تو سیاسیات نے ان کے اندر نسبی شرافت کا ادعا بھی پیدا کر دیا اور اسی کے ساتھ دنیا کے معزز خاندانوں نے ان میں بعض کے ساتھ نسلی تعلقات بھی قائم کر لئے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

بہمنیہ اس کا بانی علاء الدین حسن، سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے ایک برہمن کا نوکر تھا، جسے دربار شاہی سے لگاؤ تھا بخت نے مساعدت کی اور تدریجی ترقی کرتے کرتے وہ بادشاہ بن بیٹھا، جمعہ کے دن ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ میں اس کی تاجپوشی ہوئی اور ایک سو ستتر سال تک اس کے خاندان میں حکومت رہی، اسکی اولاد سے تقریباً بیس آدمی بادشاہ ہوئے، اس گھرانہ کا آخری فرمانروا کلیم اللہ بہمنی تھا،

حکومت ملنے کے بعد خوشامد گو شعرائے اس کا عجیب وغریب نسب نامہ بھی تیار کر دیا، تحفۃ السلاطین، سراج التواریخ اور بہمن نامہ دکنی کے مصنفوں نے صاف طور پر حسن گانگوی بہمنی کے نسب کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی لیکن بعض جگہ انھوں نے اسے شاہان کیانی کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض جگہ اسفندیار اور بہمن سے، مثلاً

"کلاہ کیانی بر سر نہادہ و پائے بر تخت کیانی گذاشتہ نشست،"

اور جیسے

"شاہ بہمن نژاد فرزندہ کاخ بہمنی،"

فرشتہ کو اس پر اعتراض ہے کہ بہمن نامہ شیخ آذری کی تصنیف ہے، چونکہ آذری ایک بے لوث عالم تھے، انکی شان سے بالکل بعید ہے کہ کسی امر کی تحقیق وکاوش کئے بغیر اسے لکھدیں، اس کے علاوہ "بہمن نامہ" کے اسلوب بیان اور طرز انشاء سے استادانہ متانت واضح نہیں ہے، اور نہ کسی جگہ شیخ آذری کا تخلص درج ہے، بہرحال فرشتہ کے نزدیک بہمن نامہ کا بیان کردہ نسب نامہ قابل وثوق نہیں وہ لکھتے ہیں کہ جب میں احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ کا ملازم تھا تو شاہی کتبخانہ سے ایک رسالہ مجھے دستیاب ہوا جس میں سلطان علاء الدین حسن گانگوی کے حالات نسبی درج تھے لیکن مصنف کا نام درج نہ تھا، اس رسالہ کے مطابق سلطان حسن گانگوی کا سلسلۂ نسب بہرام گور تک پہونچتا ہے،

علاء الدین حسن بن کیکاؤس بن محمد بن علی بن حسن بن سہام بن سیمون بن سلام بن ابراہیم بن نصیر بن منصور بن رستم بن کیقباد بن منوچہر بن نامدار بن اسفندیار بن کیومرث بن خورشید بن صعصاے بن فغفور بن فرخ بن

شہریار بن عامر بن سہید بن ملک داؤد، بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن نوح بن صانع و نسبت او به چند واسطه به بهرام گور می رسد و بهرام گور از نسل ساسانست و ساسان از نسل بهمن بن اسفندیار که از جمله پادشاهان کیاں بود۔

فرشتہ کے نزدیک یہ معتبر نہیں،

اما به خاطر ناقص این جامع اخبار میرسد آنست که چوں نام گانگوی بهمن جزو نام سلطان علاءالدین حسن گردیده او را بهمنی گفتند اما شعراء و مورخان خوشامد گوئے را دستاویزے بهم رسیده این معنی را در لباس دیگر جلوه دادند[۵۱]

عادل شاہیہ اس خاندان کا بانی یوسف عادل خاں تھا اس کے نسب کے متعلق مورخین نے مختلف روایتیں لکھی ہیں ابوالقاسم مصنف تاریخ فرشتہ اور محمد ابراہیم الزبیری مصنف لسانین السلاطین نے عجیب و غریب افسانہ لکھا ہے۔ لیکن محمد علی خاں انصاری صاف لکھتے ہیں کہ

یوسف عادل خاں غلامے بود چرکس و سلطان محمد شاہ بہمنی او را خرید بود[۵۲]

تمام روایات کو ملانے سے پتہ چلتا ہے کہ یوسف عادل خاں کا چرکسی غلام کی حیثیت سے محمد شاہ بہمنی کے یہاں فروخت ہونا ایک مشہور بات ہے، البتہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے افسانہ تراشی کی گئی ہے، فرشتہ خود ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے لکھی گئی اور اس کے مصنف ابوالقاسم کو شاہی وظائف نے بڑی حد تک گرانبار احسان بنا رکھا تھا، جیسا کہ خود انہوں نے خاندان بہمنیہ کا نسب بیان کرتے ہوئے اس جذبہ منت پذیری کا اظہار کر دیا ہے اس لئے انہوں نے آسانی کے ساتھ ایک طویل افسانہ اپنی تاریخ میں درج کر دیا ورنہ جس طرح انہوں نے علاءالدین حسن گانگوی بہمنی کے نسب کے متعلق ناقدانہ بے لوثی اور محققانہ غیر جانبداری سے کام لے کر حقیقت نفس امری کا اظہار کیا اسی طرح اس میں بھی کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ پر زور تائید کے ساتھ افسانہ کو حقیقت کے لباس میں پیش کیا جو ان کے دامن تحقیق پر ایک بدنما دھبہ نظر آتا ہے،

نظام شاہیہ اس خاندان کا بانی ملک نائب نظام الملک بحری بھی احمد شاہ بہمنی ———— کا غلام تھا لوگوں نے اسے ایران اور روم کے شاہی خاندانوں سے تو نہ ملایا، مگر "برہمن زادہ" بتایا گیا وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی نژاد تھے، چنانچہ فرشتہ میں ہے،

ملک نائب از اولاد برہمناں بیجانگر است نام اصلی "او تیا بہت" و نام پدر او "بہر" بود در عہد فرخندہ سلطان احمد شاہ بہمنی در ولایت بیجانگر اسیر مسلمانان گردیده و موسوم به ملک حسن گشته در سلک بادشاہان

---

[۵۱] فرشتہ مقالہ سوم روضہ اول [۵۲] بحر المواج

شاہی نظام اور انتظام یافت

ایک ہندی نژاد غلام کا ترقی کرتے کرتے مملکت تلنگ کا گورنر ہونے کے بعد خود کو "برہمن زادہ" بتانا وہ بھی ہندو رعایا کی جھرمٹ میں، یقیناً قابل بحث بات ہے، لیکن کوئی استحالۂ عقلی نہیں۔ اس خاندان میں پہلے پہل ملک نائب کا لڑکا "احمد نظام شاہ" کے نام سے مشہور ہوا ابتدائے دسویں صدی ہجری سے ان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس عہد میں بعض مجہول النسب حضرات کو شاہی خاندان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، جس کی حکایت بہت دلچسپ ہے، فرشتہ نے بسط کے ساتھ اس پر بحث کی ہے،

نظام شاہیہ خاندان میں بدترین قسم کی خانہ جنگیاں ہوتی رہیں اس خاندان میں حبشی امرا کو بڑا اثر و رسوخ تھا درباریوں کے باہمی تعلقات ناخوشگوار تھے، ہر شخص اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا چنانچہ ۱۰۰۳ھ میں جب ابراہیم نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی لشکر عادل شاہی کے ہاتھ سے مارا گیا تو نظام شاہیہ خاندان کے فوجی افسروں نے بہادر شاہ بن نظام شاہ کو جس کی عمر اس وقت ایک برس سات ماہ کی تھی بادشاہ بنانا چاہا لیکن منجھو نامی دربار کے ایک سربرآوردہ شخص اور بعض دکنی امرا نے بہادر شاہ کی کمسنی کے باعث اس امر سے اختلاف کیا میاں منجھو کی سعی سے احمد شاہ بن شاہ طاہر کو جو جوند جنیر کے قلعہ میں مقید تھا، لوگ احمد نگر میں لائے اور بقرعید کے دن ۱۰۰۳ھ میں اس کو بادشاہ بنا دیا اور بہادر شاہ بن ابراہیم نظام شاہ کو قلعہ جوند میں مقید کر دیا اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ احمد شاہ نظام شاہی خاندان سے نہیں، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

نظام شاہیہ خاندان کے بانی احمد نظام شاہ بحری نے انتقال کیا تو حسین نظام شاہ اس کا جانشین ہوا اس کے بھائیوں نے جن کا نام سلطان محمد خدابندہ، شاہ علی، محمد باقر، عبد القادر، اور شاہ حیدر تھا، مصلحت یہی سمجھی کہ موروثی ملک سے ہجرت کر جائیں، چنانچہ سب ادھر ادھر چلے گئے، مرتضیٰ نظام شاہ (۹۷۱ھ - ۹۹۶ھ) کے عہد میں شاہ طاہر نامی ایک شخص حیدرآباد میں آیا اور ظاہر کیا کہ محمد خدابندہ نے فلاں تاریخ بنگالہ میں وفات کی اور میں ان کا صلبی فرزند ہوں نظام شاہی دربار کے مدبر صلابت خاں نے کوشش کی کہ صحیح بات کا پتہ لگے لیکن ایک زمانہ کی بات تھی پتہ نہ لگا، اس لئے حزم و احتیاط کے خیال سے اسے ایک قلعہ میں مقید کر دیا کہ کہیں فتنہ پرداز اوباش لوگ اس کے ساتھ جمع ہو کر حکومت کے خلاف کوئی شورش نہ پیدا کریں آدمیوں کو برہان نظام شاہ کی خدمت میں جو اس وقت دربار اکبری میں ملازم تھے، روانہ کیا کہ صحیح حالات کا پتہ لگائیں برہان نظام شاہ نے جواب دیا کہ محمد خدابندہ کی زندگی میرے یہاں گذری اور ان کی اولاد میں فلاں فلاں لڑکیاں اور لڑکے میرے ساتھ ہیں اگر کسی شخص نے ان کی فرزندی کا دعویٰ کیا ہے تو یہ محض اس کی افترا پردازی ہے،

صلابت خاں اور دوسرے اعیان سلطنت کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے خیال کیا کہ عوام میں یہ

بات پھیل چکی ہے، کہ یہ محمد خدابندہ کا لڑکا ہے، اس لئے سب لوگوں کے اعتقاد کا بدلنا ناممکن ہے، بہتر ہے کہ بدت العمر قید میں رہے چنانچہ یہی ہوا شاہ طاہر نے قید ہی کی حالت میں وفات پائی اس کا ایک لڑکا احمد نامی تھا، میاں منجھو نے اسی کو غلط فہمی کی بنا پر ابراہیم نظام شاہ کے قتل ہونے کے بعد بادشاہ بنایا، میاں منجھو کے اس طرز عمل پر تمام حبشی امرا بگڑ گئے وہ بہادر شاہ بن نظام شاہ کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن منجھو کے اثر سے تھانہ دار بہادر شاہ کو حبشیوں کے سپرد نہیں کرتا تھا انھوں نے ایک مجہول النسب لڑکے کو احمد نگر کے بازار سے پکڑا اور اسے نظام شاہی خاندان سے منسوب کر کے اس کے نام پر سکہ و خطبہ جاری کر دیا، اس کے بعد امرائے حبشی میں اختلاف ہو گیا، اکثر منتشر ہو گئے، منجھو نے غلطی یہ کی تھی کہ حبشیوں نے اس کا محاصرہ کیا تو اس نے شاہزادہ مراد بن اکبر بادشاہ کو دعوت دیدی جو اس زمانہ میں اکبر کی طرف سے دکن کی مہم پر آئے ہوئے تھے لیکن ادہر لطیفہ غیبی نے منجھو کو فتح دلائی، حبشیوں میں مناصب اور جاگیر کے لئے جھگڑا ہوا بعض امرائے دکن منجھو سے مل گئے اور اس طور سے ۵ محرم الحرام ۱۰۰۴ھ میں حبشیوں کو شکست ہوئی لیکن پھر مغلوں نے حملہ کیا منجھو نے یہ بلا خود مول لی تھی عادل شاہ اور قطب شاہ سے مدد مانگنے کی غرض سے احمد شاہ کو لے کر وہ قلعہ اوسہ میں چلا گیا چاند بی بی نے مغلیہ حملہ کی مدافعت کی لیکن آخر کار مغل سپاہ نے شاہزادہ مراد سے بلا رائے لئے ہوئے احمد نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس وقت نظام شاہی امرا تین جماعتوں میں منقسم تھے، اول منجھو جو احمد شاہ کو نظام شاہی خاندان کا آدمی سمجھ کر عادل شاہی حکومت کی سرحد میں پڑا ہوا تھا۔ دوسرا اخلاص خاں حبشی جس نے موتی نامی ایک مجہول کو بادشاہ بنایا تھا، تیسرا آہنگ خاں حبشی جس نے شاہ علی بن برہان شاہ اول (جسکی عمر اس وقت ستر برس کی تھی اور بیجاپور میں رہتا تھا) کے سر پر چتر شاہی بلند کیا تھا اس کے بعد اور بھی سیاسی الجھنیں نظام شاہی خاندان میں پیدا ہو گئی تھیں لیکن مجھے یہاں صرف ان واقعات سے بحث کرنا ہے کہ حصول جاہ و حکومت کے لئے نسب کے معاملہ میں کس قدر افترا پردازیاں کی جاتی ہیں۔

قطب شاہیہ

اس خاندان کا بانی سلطان قلی تھا اس کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے،

"سلطان قلی از ترکان بہارلوست از قوم میر علی شکر و بعضی از منسوبان آں دودماں دعوی می کنند کہ سلطان قلی از احفاد میرزا جہاں شاہ مقتول است، اما روایت اول بصحت اقرب است"

یہ شخص ہمدان میں پیدا ہوا، اور وہیں نشوونما پائی، سلطان محمد شاہ لشکری کی سلطنت کے آخری زمانہ میں دکن میں آیا چونکہ محمد شاہ ترکی غلاموں کو زیادہ دوست رکھتا تھا، سلطان قلی نے خود کو ترکی ہی غلاموں سے وابستہ کرایا،

صاحب "تاریخ محمد قطب شاہ" لکھتے ہیں کہ قطب شاہی خاندان کے اجداد ترکستان کے حکمران گزرے ہیں اس خاندان میں اغز خاں مسلمان ہو گیا تھا اس کے متعلق صاحب "جہاں کشائے" کا بیان ہے کہ اس نے پیدا

ہونے کے بعد تین دن تک ماں کا دودھ نہ پیا اور ماں سے خواب میں آکر کہا کہ جب تک تم مسلمان نہو گی میں دودھ نہ پیوں گا چنانچہ وہ مسلمان ہو گئی اغزخاں نے تین شادیاں کیں اس کی اولاد میں امیر تور بیگ چنگیز خاں کا معاصر تھا یہ امیر ۵۹۹ھ میں گذرا ہے، یہ شخص امیر قرا یوسف کا جد ششم تھا،

قلی قطب شاہ محمد شاہ کی طرف سے تلنگ کا خراج وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا ۹۱۸ھ میں خود بادشاہ بن بیٹھا، اس وقت صفویہ کا سیاسی پروپگنڈا زوروں پر تھا، شیعی مبلغین، شاعر اور صوفی کے لباس میں ترویج مذہب کر رہے تھے، یوسف عادل شاہ، برہان نظام شاہ وغیرہما کی طرح اس نے بھی مذہب اثنا عشری قبول کیا۔

محمد قلی قطب شاہ (جو فرشتہ کا معاصر تھا) نے سادات کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرنا شروع کئے چنانچہ شاہ میرزائی اصفہانی (جو طبا طبائی سید تھے، سادات کی اس شاخ کا سلسلہ حضرت حسن مثنیٰ تک منتہی ہوتا ہے) کی لڑکی سے شادی کی اور اس طور سے گویا محمد شاہ بہمنی کے ایک غلام کی نسل میں بنی ہاشم کا خون جاری و ساری ہو گیا اسی طرح محمد قلی قطب شاہ اپنی ایک لڑکی کو شاہ عباس صفوی کے یہاں (اس کی اولاد میں کسی کے ساتھ مناکحت کے لئے) بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا فرشتہ میں ہے۔

> ازاں زماں کہ آفتاب رایات اسلام از افق ہندوستان طالع گشتہ ہیچیک از سلاطین سابق آں دیار را نسبت وصل و پیوند با پادشاہان عظیم الشان ایران دست نداده، درین عصر میمنت اثر آں شہنشاہ قوی بخت، جمشید تخت عباس والی ایران یکے از معتمدان درگاہ عرش اشتباہ خود را بہ دکن فرستادہ صبیہ فرمانده تلنگ را بجہت ازدواج و ہم بستری یکے از اولاد امجاد خود خواستگاری فرمود و آں حضرت شرف دنیا و آخرت در قبول آں دانستہ در سامان واستعداد آں نسبت کہ آں گرامیہ سعادتمند را بہ روش سلاطین کامگار روانہ ایران سازد۔

سلاطین صفویہ حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد ہیں اس لئے دو صورتوں سے قطب شاہی خاندان میں سادات کا خون شامل ہو گیا،

خاندان عماد شاہیہ کا بانی فتح اللہ عماد الملک کنار بیجانگر کی اولاد سے تھا۔ اسی طرح سلاطین بریدشاہیہ کا جد امجد قاسم برید گرجی نسل کا ترکی غلام تھا، جسے شہاب الدین علی یزدی نے سلطان محمد شاہ فاروقی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا عماد شاہیہ کی حکومت تو تاریخ فرشتہ کی تدوین کے وقت مٹ چکی تھی اور ان کے مقبوضات نظام شاہیہ کے تصرف میں آگئے تھے، لیکن ۱۰۱۸ھ میں جبکہ ابوالقاسم فرشتہ بریدشاہیہ کا تذکرہ لکھ رہے تھے، امیر برید حکمران تھا۔ لیکن مصنف کو اس خاندان سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لئے ان کے نسب کے متعلق کوئی ایسی بات درج نہیں کی جو تاریخی تنقید کے اعتبار سے دور از کار ہو، عماد شاہیہ اور بریدشاہیہ کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

حکایات عماد شاہیہ و برید شاہیہ در ہیچ از کتب متداولہ مسطور نہ گردیدہ آنچہ دریں کتاب نوشتہ ام از مردم کہن سال کہ معاصر ایشاں بودہ اند از زبان آنہا شنیدہ دریں اوراق ثبت نمودہ ام ہ[لہ]

سلاطین فاروقیہ اس خاندان میں سب سے پہلے جو خاندیس کی حکومت پر فائز ہوا، ملک راجہ فاروقی ہے، اس کے باپ کا نام خانجہاں فاروقی تھا جس کے آبا و اجداد، سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صاحب عزت امرا گزرے ہیں خانجہاں نے وفات کی تو اس کے لڑکے ملک راجہ کو نامساعدت بخت سے منصب امارت نہ مل سکا، وہ بڑی پریشانی اور افلاس سے زندگی گزارتا تھا۔آخر کار بڑی تدبیر سے سلطان فیروز شاہ باربک کے خاص شاہی نوکروں میں شامل ہوگیا اور ایک گھوڑے پر خدمت بجا لاتا تھا۔ ماہانہ مشاہرہ کم تھا اس لئے زندگی بڑی تنگی سے گزارتا تھا لیکن سیر و شکار کا بڑا دلدادہ تھا اور وقت بے وقت وہ شکار کھیلا کرتا تھا اس زمانہ میں جبکہ سلطان فیروز مندو سے ہوا گجرات میں آیا تھا ایک دن شکار گاہ میں ایک شکار کے پیچھے چند مخصوص حضرات کے ساتھ چودہ پندرہ کوس دور نکل گیا، بھوک کا غلبہ ہوا، چونکہ بستی دور تھی اور اس کے ساتھیوں میں کسی کے پاس کھانے کو نہ تھا سلطان بے تاب ہوکر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا دور سے دیکھا کہ ایک سوار دو تازی کتے اور چند شکاری کئے ہوئے جانور لئے شکار کے پیچھے جارہا ہے، سلطان چونکہ بھوک سے پریشان تھا اس سے پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے، اس نے کھانا اور جو کچھ تھا فقیروں کی حیثیت سے پیش کیا اور ادب کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں کھڑا ہو گیا جب بادشاہ کھاچکا تو پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو، اس نے زمین خدمت چومی اور عرض کیا کہ میں خان جہاں فاروقی کا بیٹا ہوں اور میرا نام ملک راجہ فاروقی ہے۔ بادشاہ خان جہاں فاروقی کو اچھی طرح جانتا تھا آج اس کے لڑکے کی ادائے خدمت بھی اسے بھا گئی، اس نے ایک مقرب امیر سے کہا کہ کل جب دربار لگے اس کو میرے سامنے حاضر کرو، جب یہ موقع آیا اور وہ سلطانی خدمت میں باریاب ہوا تو بادشاہ نے کہا کہ اس کے دو حقوق مجھ پر ہیں ایک تو سابق محبت کا تعلق ہے، دوسری یہ خدمت جو یہ شخص شکارگاہ میں بجالایا اس لئے بادشاہ اسی وقت اس کو منصب دو ہزاری اور تھالیز و کرونڈ کی جاگیریں جو مملکت خاندیس سے متعلق ہیں عنایت کیں ملک راجہ ۷۷۲ھ میں وہاں انتظام کے لئے چلا گیا اس کے بعد اس کے خاندان میں کچھ کم دو سو برس تک حکومت رہی فرشتہ نے ان کے نسب و حسب کے متعلق میرزا محمد علی اسفرائنی سے دریافت کیا (جو سلاطین فاروقیہ کا کتب خانہ دیکھ کر آئے تھے) کہ انھوں نے کوئی کتاب دیکھی ہے، انھوں نے کہا ایسی کتاب تو نظر سے نہیں گزری لیکن ایک ورق جس میں اُن کے نسبی حالات اور ان کی تاریخ جلوس و فوت لکھی ہوئی تھی، مجھے کتب خانہ سے ملا اس کی نقل میں نے کرلی، انھوں نے اسے بیان

لہ فرشتہ مقالہ سوم روضہ ششم

کیا، اس سے معلوم ہوا کہ ملک راجہ خود کو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد بتاتا تھا اس کے بعد فرشتہ نے ملک راجہ کا نسب نامہ بیان کیا ہے،

ملک راجہ بن خانجہاں بن علی خاں بن عثمان خاں بن شمعون شاہ بن اشعث شاہ بن سکندر شاہ بن طلحہ شاہ بن دانیال شاہ بن اشعث شاہ بن ارمیا شاہ بن سلطان التارکین و برہان العارفین ابراہیم شاہ بلخی بن ادہم شاہ بن محمود شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن اعظم شاہ بن اصغر بن محمد احمد بن محمد بن عبد اللہ بن فاروق عمر ابن الخطاب،

چند حیثیت سے اس نسب نامہ کی صحت مشکوک معلوم ہوتی ہے،

(۱) حضرت ابراہیم بن ادہم نے بروایت صحیح ۱۶۶ھ میں وفات پائی، اور ملک راجہ نے ۸۰۱ھ میں انتقال کیا، ملک راجہ سے حضرت ابراہیمؒ تک بارہ پشتیں ہوتی ہیں اس لئے اگر فی صدی تین پشت کے معیار حساب کو ملحوظ رکھیں تو اس حساب سے درمیانی زمانہ ۴۰۰ سال تک محیط ہوتا ہے، اس صورت میں حضرت ابراہیم کا زمانہ ملک راجہ کے جد امجد ارمیا شاہ کے زمانہ سے دو بتیس سال بعید ہو جاتا ہے، حالانکہ ارمیا شاہ کو حضرت ابراہیم ادہمؒ کا بیٹا بتایا گیا ہے،

(۲) حضرت ابراہیم ادہم کا سلسلۂ نسب یہ نہیں ہے جو تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے، یعنی ابراہیم بن احمد بن محمود بن احمد الخ بلکہ حضرت جامیؒ لکھتے ہیں

ابراہیم بن ادہم از طبقہ اولی ہست کنیت او ابو اسحٰق است و نسب او ابراہیم بن ادہم بن سلیمان بن منصور البلخی است (نفحات الانس)

اس سے ظاہر ہے کہ یہ نسب نامہ جعلی ہے اور دنیاوی جاہ و حکومت حاصل ہونے کے بعد سلاطین فاروقیہ کو دوسرے خاندانوں کی طرح اس افسانہ تراشی کی ضرورت پیدا ہوئی، صفویہ کی طرح ملک راجہ نے بھی حکومت کے ساتھ پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھا۔ فرشتہ نے اسے شیخ زین الدین کا مرید بتایا ہے، آپ سے اس کو خرقہ ملا، مرنے کے بعد اس نے یہ خرقہ اپنے لڑکے نصیر خاں فاروقی کو تفویض کیا اس کے بعد فاروقیہ خاندان میں حکومت کے ساتھ سلسلۂ بیعت بھی جاری رہا،

شاہان مغلیہ سرسید مرحوم کی ایک ابتدائی تصنیف "جام جم" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ اورنٹیل لائبریری میں موجود ہے، مصنف نے اس میں تاریخ کی مختلف کتابوں کی مدد سے بعض سلاطین افغانی چغتائی کی ہندو ماؤں کا نام لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر سلاطین مغلیہ ہند عورتوں کے بطن سے تھے،

نام بادشاہ	ماں کا نام
ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر شاہ بن اکبر بادشاہ	صبیہ راجہ بہارامل
شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ	نواب جودھ بائی
شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالمگیر	نواب بائی
محمد معظم الدین بن محمد معظم ملقب بہ بہادر شاہ	نظام بائی
محمد معز الدین جہاندار شاہ بن محمد معظم	نظام بائی
مجاہد الدین محمد بن محمد ابونصر بہادر شاہ	ادہم بائی (مخاطب بہ ممتاز محل)
عزالدین عالمگیر ثانی بادشاہ غازی بن معزالدین جہاندار شاہ	الوپ بائی
ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بن محمد اکبر شاہ ثانی	لعل بائی

علاء الدین خلجی کی ماں جاٹنی تھیں اسی طرح سکندر بن بہلول لودی کی والدہ سنارن تھیں ان کا نام ہیّا تھا فرشتہ نے سکندر بن بہلول کے وقت جلوس کا وہ واقعہ لکھا ہے جب اس کے چچا نے یہ کہکر مزاحمت کی تھی کہ سنارن کا بیٹا بادشاہ ہوگا باوجودیکہ علاء الدین غیر قوم کی عورت سے پیدا ہوا تھا اس کے چچا جلال الدین خلجی نے اپنی لڑکی اسے بیاہ دی اسی طرح سکندر بن بہلول لودی برادری سے خارج نہ ہوا مغلیہ تو بطناً بعد بطنٍ راجپوتن اور ہندو ماؤں سے تھے، لیکن باوجود اس اختلاط نسلی کے دنیا انھیں سلاطین مغلیہ ہی کے نام سے پکارتی ہے، مغلیہ نے صرف یہی نہیں۔ کہ سیاسی فضا سے متاثر ہوکر راجپوت قوم کی عورتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا بلکہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے بھی اپنے خاندان کی ایک لڑکی جہانگیر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی اس لڑکی کی شادی شاہزادہ خورم سے ہوئی معتمد خاں لکھتا ہے،

دریں تاریخ جشن طوی شاہزادہ بلند اقبال سلطان خوزم باصبیہ مظفر حسین مرزا ابن سلطان علی حسین مرزا صفوی آراستگی یافت (اقبال نامہ جہانگیری وقایع سال پنجم) (باقی آیندہ)

عبدالمالک آروی

فراست التحریر مکمل

یعنی اُردو اور انگریزی رسم خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن، مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اُردو میں بالکل پہلی کتاب، اُردو حصہ علاوہ محصول ۸ر انگریزی حصہ علاوہ محصول ۸ر ہر دو حصے معہ محصول عہ ر

منیجر نگار

تخلیق شاعر

اور عشق حسن ؟

(ایک ہندی گیت سے ماخوذ)

شاعر نے کرسی اپنی بیوی کی کرسی کے قریب کھینچ لی۔ اور محبت آمیز انداز سے اس کی شبگوں زلفوں میں شانہ کرنے لگا۔ اس نے کہا "افسانہ یقیناً دلچسپ ہوگا۔ تم مجھے پڑھ کر ضرور سناؤ گی۔ اور بتاؤ گی کہ اس نے ہماری زندگی میں کیونکر انقلاب پیدا کیا"

اس کی بیوی نے میز سے ایک کتاب اٹھالی۔ اور پڑھنے لگی۔

"ہندوستان کی کسی بستی میں ایک دوشیزہ رہتی تھی۔ جس کا نام کملا تھا۔ وہ کنول کے پھول سے زیادہ حسین تھی۔ مگر وہ کسی آدمی سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتی تھی، لوگوں میں مشہور تھا۔ کہ در پردہ اس کا کسی مرد سے ارتباط ہے۔ چنانچہ اس کی ماں بھی اس سے اکثر شادی کے متعلق استفسار کرتی رہتی۔

آخر کار ایک دن لڑکی نے اقرار کر لیا کہ

"بے شک میں اپنا دل ایک من موہن کی نذر کر چکی ہوں۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں۔ کہ وہ کون ہے۔ اور کہاں سے آتا ہے۔ کیونکہ وہ رات کی خاموشی اور تاریکی میں میرے پاس آتا ہے۔ اور صبح ہونے سے قبل مجھے چھوڑ کر روح کی طرح غائب ہو جاتا ہے"

اس کی ماں نے اسے مشورہ دیا۔ کہ وہ دروازے اور کھڑکیاں شام سے قبل بند کر دے۔ تاکہ وہ صبح کو اُسے دیکھ سکے۔

ہر چند کملا کو فریب کاری مرغوب نہ تھی۔ مگر وہ یہ بھی چاہتی تھی۔ کہ کسی طرح وہ اپنے معبود خیال کا پورا حال معلوم کرے۔ چنانچہ اُس نے ماں کے مشورہ پر عمل کیا۔ جب صبح مرغ نے بانگ دی۔ تو اس نے کملا سے کہا۔ کہ وہ اب جانا چاہتا ہے۔ مگر کملا نے اُسے یقین دلایا۔ کہ ہنوز صبح نہیں ہوئی۔ مگر جب اس نے جانے پر اصرار کیا۔ تو کملا نے جلدی سے کھڑکی کھول دی۔ تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ مگر اس پر روشنی کی کرن پڑتے ہی ایک ملکوتی صدا سنائی دی کہ "تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پا لیا ہے۔ اس لئے تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہوگا"

"چنانچہ اس طرح ایک فرشتہ کو فانی انسان میں تبدیل کر دیا گیا، اور گو اُسے کملا سے بہت الفت تھی۔ اور اس سے

شادی بھی کر چکا تھا۔ لیکن کملا کو تمام عمر اپنی اس حرکت پر تاسف رہا۔ جس کی وجہ سے اُس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کر دئے گئے "

پڑھنے والی کی سُریلی آواز ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی

وہ بولی " کہانی کا باقی حصہ ہم سے متعلق نہیں اب مَیں تمھیں اپنی زندگی کا افسانہ سنانا چاہتی ہوں "

شیاما کی سُرمہ سا آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ انا کو گھور رہی تھی۔ اور اپنا ننھا پاؤں زور زور سے فرش پر پٹخ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے پر اس شدت سے پیہم ضربیں لگا رہے تھے۔ کہ اس کشمکش میں اس کی ساری سر سے ڈھلک کر پشت پر آ رہی

" میں ضرور اندر جاؤں گی۔ مَیں اماں کے پاس جاؤں گی۔ حرامخور انا! جا، دفع ہو جا "

—— " بی بی تمھاری اماں نے کہا تھا۔ کہ تم باغ میں جا کر کھیلو۔ آؤ مَیں تمھیں ایک اچھا کھیل بتاؤں "

—— " مَیں کھیلنا نہیں چاہتی۔ مَیں اماں کے پاس جاؤں گی "

شیاما فطرتاً ضدی واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور گھر کے تمام آدمی اسے چاہتے تھے۔ بلکہ خایف بھی رہتے تھے

وہ یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ کہ اُسے کسی ایسے فعل کے علم سے تاریکی میں رکھا جائے۔ جو اُس کے مکان کی چار دیواری سے متعلق ہو۔ وہ غیر معمولی ذہنیت کی مالک تھی۔ اور وہ اس قوت سے اکثر کام لیا کرتی تھی

آج صبح اس کی والدہ نے اسے حکم دیا کہ وہ انا کے ساتھ باغ میں جا کر کھیلے۔ کیونکہ وہ بہت مصروف تھی۔ مگر جونہی شیاما کو یہ حکم ملا، وہ اس مصروفیت کی حقیقت معلوم کرنے پر تل گئی۔ اور انا سے تکرار کرنے لگی

چونکہ انا کسی طرح نہ مانتی تھی، اس لئے اس نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ وہ بولی:-

" اچھا انا، تم باغ میں چلو۔ میں اپنے کمرے سے گیند اور بلّا لے کر آتی ہوں "

انا اس فوری انقلاب پر حیران تو ہوئی۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کے خیال سے اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ شیاما کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ حتےٰ کہ وہ باغ میں غائب ہو گئی۔ اور اس کے بعد شیاما دبے پاؤں والدہ کے کمرے سے گذر کر ماں کی مصروفیت کا سُراغ لگانے کی غرض سے اس کے کمرے میں داخل ہو گئی

یہ تھی وہ فطرت جس کا مظاہرہ شیاما بچپن میں کیا کرتی تھی

جب شیاما جوان ہوئی۔ تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اُن کے خیال میں یہ اُن کی بہ

تذلیل تھی۔ کہ اُن کی لڑکی کو کوئی موزوں خاوند نہ ملے۔ شیاما کی رائے اُن سے مختلف تھی۔ لیکن بظاہر ان کی تجاویز سے اتفاق کرتی رہی۔

اسے اپنے گھر اور والدین سے عشق تھا۔ اس لئے یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اپنی زندگی کی مسرتوں کو کسی مرد کی نذر کردے خصوصاً ایسے آدمی کے جس سے اُس کی شناسائی بھی نہ ہو۔ اور وہ عمر میں بھی اس سے بڑا ہو۔

وہ اپنے آپ سے کہا کرتی۔

"مجھے سب سے پہلے خود اپنے شباب سے محفوظ رہنا ہے۔ مَیں شادی کرکے ناکارہ نہیں ہوجانا چاہتی۔ اور نہ مجھے بچے پیدا کرنا اتنا مرغوب ہے۔ میں کالج میں داخل ہونے کو شادی پر ترجیح دیتی ہوں"

شیاما اور اُس کے والدین میں خوب بحث ہوئی۔ وہ اپنی تجویز پر مُصر تھے۔ اور اُن کے نزدیک اس کا کالج میں داخل ہونا دولت اور وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔

شیاما نے کہا۔

"لیکن میں تحصیلِ تعلیم کے بعد شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ فی الحال مجھے کالج میں داخل ہونے کی اجازت دے دیجئے۔ خدا کے لئے۔ . . . ."

اُس کے دلائل غیر موثر ثابت ہو رہے تھے۔ مگر اُس کے والدین محسوس کر رہے تھے۔ کہ اُنھیں شکست تسلیم کرنی ہوگی۔ چنانچہ جب انھوں نے مجبوراً اپنی رضامندی ظاہر کی۔ تو اس کے ساتھ ہی شیاما کو سخت سُست الفاظ بھی سننے پڑے۔ اور یہ تنبیہ کردی گئی۔ کہ اس تعلیم کے نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

شیاما کو نتائج کی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے کالج میں داخل ہوگئی

اُس کا پہلا سال نئی فضا سے مانوس ہونے میں گذرا۔ وہ اپنی ہم عمر ہمجولیوں کی معیت میں بہت خوش رہتی۔ اور کالج کی دلچسپ مصروفیتوں اور علمی دلچسپیوں سے پورا پورا لطف اٹھاتی۔

اس کا مرغوب مضمون ادب تھا۔ اور اگر وہ جنبہ داری سے کام نہ لے۔ (یہاں افسانہ گو کے ہونٹوں پر ایک لطیف تبسّم کھیلنے لگا) تو اسے یہ اقرار کرنے میں باک نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ادب کا معلم بھی بہت دلچسپ انسان تھا۔ وہ کالج میں سب سے کم عمر معلم تھا۔ وہ ایک خوشرو نوجوان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت اندرونی ابتہاج کی وجہ سے مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس کا نام منوہر جی تھا۔ تمام طلبہ اُسے دوسرے پروفیسروں کی ضد سمجھتے تھے۔ اس کا لکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اور اس کی علمی قابلیت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً شیاما کے لئے وہ دیوتا سے کم نہ تھا۔ کیونکہ اسی پروفیسر کی بدولت اُس نے نظم کی خوبیوں کو سمجھنا سیکھا تھا۔

کالج کے تمام طلبہ اُسے چاہتے تھے۔ اور اُس کی عزت کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود شیاما کی طرح اس کے مضمون سے دلچسپی نہ لیتے تھے۔ چنانچہ نصف سال کے عرصے میں وہ اس مضمون کو اس قدر چاہنے لگی۔ کہ اس کا جی دوسری مصروفیتوں میں بالکل نہ لگتا۔

شیاما کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ ایک شام اس کی ہم جماعتوں نے اُسے ٹینس کھیلنے کی دعوت دی۔ اُس نے بخوشی منظور کر لی۔ کیونکہ اسے یہ کھیل بہت مرغوب تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنا وقت کسی نہ کسی طرح کاٹ دینا چاہتی تھی، کیونکہ منوہر جی چار دن سے رخصت پر تھے۔ اور اُن کے دلچسپ لکچروں کے بغیر وہ اپنی زندگی میں کچھ ناگوار خلا سا محسوس کر رہی تھی۔

تیسرا سٹ کھیلا جا چکا تھا۔ کہ ایک لمبا۔ پتلا خوش رو نوجوان جامعہ سے نکل کر ٹینس کے میدان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

شیاما کا دل قدموں کی مانوس چاپ سُن کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ تماشائی کی حیثیت سے آرہا ہے۔ اس نے اپنی تمام مساعی کھیل کے مظاہرہ میں صرف کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اس روز وہ اس عمدگی سے کھیل رہی تھی۔ کہ ایک انجان تماشائی بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

جب شیاما کی ایک کاری ضرب نے کھیل کا خاتمہ کر دیا تو پروفیسر نے بہت تعریف کی اور وہ اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی۔ پروفیسر بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ تم اس قدر اچھا کھیل سکتی ہو۔ اچھا کسی وقت میرے ساتھ کھیلنا"

اسنے کہا۔ "بہتر۔ آپ بخیریت ہیں؟"

"شکریہ، میں اچھا ہوں"

میں دراصل تمھیں وہ شعر بتانے آیا تھا۔ جس کے متعلق تم نے گذشتہ ہفتہ مجھ سے استفسار کیا تھا۔ وہ ارجن کے متعلق ایک رزمیہ نظم کا شعر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ آسکو۔ تو میں تمھیں کتاب بھی دے سکتا ہوں"

شیاما نے زیر لب اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے ساتھ ہولی۔

اس نے پوچھا۔

"تو تمھیں نظم سے رغبت ہے"

"جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تمھارا آخری مضمون خوب تھا۔ مگر صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ دلچسپی کا

اظہار یوں سب کرتے ہیں۔ لیکن صحیح طور پر دل سے محسوس کرنے والے کم ہوتے ہیں"

دونوں جامعہ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ پروفیسر نے الماری سے کتاب نکالی۔ اور بولا

"اسے لے جاؤ۔ مگر احتیاط سے رکھنا۔ کیونکہ اس کا دوسرا نسخہ ہمارے کتب خانہ میں نہیں ہے"

شیاما نے شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ ایک ثانیہ کے لئے پروفیسر کے ہاتھ میں رہا۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

راستہ بھر اس کا دل اچھل اچھل کر اس کی پسلیوں سے ٹکراتا رہا

"لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں۔ جو صحیح طور پر دل میں محسوس کرتے ہیں"۔۔۔۔ وہ دل میں دہرا رہی تھی

مگر میں تو محسوس کرتی ہوں۔ دنیا میں نظم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ خوبصورت خیالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے بہتر کیا کام ہو سکتا ہے؟

شیاما تین ماہ تک کالج کے وقت کے سوا پروفیسر سے نہ ملی۔ ایک دن باقی جماعت کے چلے جانے کے بعد اُسے اچانک پروفیسر نے بلایا۔

"تمھارا جواب مضمون بہت اچھا تھا" اُس نے کہا "مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ تم ایک قابل نقاد بن سکتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری چند مختصر نظموں کو ایک نظر دیکھ لو۔ کیا تم ایسا کر سکو گی؟"

شیاما کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ کہ وہ بمشکل گفتگو کر سکتی تھی۔

"یقیناً بڑی خوشی سے۔ مجھے اس میں راحت محسوس ہو گی"

کچھ دیر کے بعد اس کے ڈسک پر ایک چھوٹا سا پلندہ پڑا ہوا تھا۔

وہ پلندہ کو اس حفاظت سے گھر لے گئی۔ گویا دنیا کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس نے شام کا کھانا کھاتے ہی مطالعہ کا عذر کر کے والدین سے رخصت لی۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چند گھنٹے بعد وہ میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے لکھا۔

"یہ نہایت بلند نظمیں ہیں صحیح اور پاکیزہ جذبات سے لبریز۔ میں آپ کی اس عزت افزائی کی بہت ممنون ہوں۔ آپ نے میرے مطالعہ کے لئے جو گوہر پارے عنایت فرمائے ہیں ان میں صحیح مشرقی شاعری کا لوچ ہے۔ آپ نے مجھ سے صداقت کے اظہار کے لئے اصرار کیا تھا۔ سو میں سب کچھ سچ کہہ رہی ہوں آپ کا تخیل بہت بلند ہے"

دوسرے دن اس نے تمام نظمیں رقعہ کے ساتھ لوٹا دیں۔ پروفیسر نے رقعہ خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔ اس نے

شیاما کی طرف ایک نظر بھر کر بھی نہ دیکھا - اور پھر چند ماہ تک وہ ایک دوسرے سے بالکل نہ ملے - مگر یہ فراق دیرپا نہ تھا - وہ شروع ہی سے ایک دوسرے کی طرف آپس میں کشش محسوس کرتے تھے -

پروفیسر نے اسے ایک دن کی سیر کے لئے دعوت دے دی - وہ شرما گئی - اور کچھ سوچنے لگی آخر کار اُسے کہنا پڑا

" شکریہ - میں آپ کے ساتھ چلوں گی "

ان کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے - پہلے پہل ہر آنے والا دن دونوں کی زندگی میں ایک نئی مسرت کا اضافہ کرتا - دونوں اکٹھے رہتے - اور ہر کام باہم مل کر کرتے - مگر اب کچھ انقلاب پیدا ہو رہا تھا - وہ شام تک تو شیاما کے ساتھ رہتا لیکن کھانے کے بعد کام کرنے کے لئے چلا جاتا -

وہ کہتا " تمھیں بھی کچھ کام کرنا چاہئے ، مجھے یہ پسند نہیں کہ تم میرے دار المطالعہ میں آکر بیٹھ جاؤ ، پھر وہ گفتگو کا انداز بدلکر کہتا

" جب تم وہاں ہوتی ہو - تو مجھے ہر وقت تمھارا خیال رہتا ہے - اور چونکہ مجھے کام کرنا ضروری ہے - اس لئے تمھیں اس میں دخل نہیں دینا چاہئے . . . . . . "

شاید یہ حماقت آمیز رنج تھا - جو شیاما ان الفاظ کو سُن کر محسوس کرتی - مگر وہ مجبور تھی - اس لئے اسے اس تجویز سے اتفاق کرنا پڑتا تھا - اور اکثر اسے شام کو تنہا بیٹھنا پڑتا - مگر اس عمل سے اُسے غیر معمولی ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑتی - اُسے تنہائی سے نفرت تھی - اور اب بلا وجہ اسے تنہائی کی مصیبت اٹھانی پڑتی -

مگر کیا یہ تکلیف در حقیقت تنہائی کی وجہ سے تھی ؟ نہیں - بلکہ یہ اس کی بچپن کی وہ فطری بغاوت تھی - جو اب عود کر آئی تھی - وہ شام کے اکثر گھنٹے کرب میں گزار تی - اسے اپنی ذمہ داری اور اطاعت کا پورا احساس تھا - مگر یہ عذاب بھی ناقابل برداشت تھا - چنانچہ اس نے مجبور ہو کر خاوند سے درخواست کی - کہ وہ صرف اسے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدے اور وہ اس کے کام میں مداخلت نہ کرے گی

اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ

" اگر میں تمھیں کام بتا دوں - یا تمھیں اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دوں تو میرا سارا کام بگڑ جائیگا - اس لئے تمھیں اس کام میں دخل نہیں دینا چاہئے "

شیاما ان دلائل کو سمجھنے سے قاصر تھی - اسے اپنی خواہش پر قابو نہ تھا - چنانچہ ایک دن وہ دبے پاؤں دار المطالعہ کے باہر پہنچ گئی - اور بند دروازے کی کنجی کے روزن کے ساتھ کان لگا کر سننے لگی - شاید اس کا یہ فعل شرمناک حد تک قبیح تھا - مگر اس کے احساس کے باوجود وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی -

وہ سن رہی تھی - اور اس کے چہرے پر حیرانی سے شکنیں پڑ رہی تھیں - وہ ایک دبے سُر میں خود ساختہ اشعار

کار ہا تھا - اشعار صحیح جذبات کا عکس اور نظم کی بہترین رنگینیاں لئے ہوئے تھے - اس کے دل پر اتنا اثر ہوا - کہ وہ وہاں بُت کی طرح کھڑی ہو گئی

بالآخر آواز سنائی دینی بند ہو گئی - اور شیاما نے حرکت کی - اس کا ہاتھ دروازے کے دستہ پر تھا - وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اندر داخل ہو جائے - یا اسے اپنی تخلیق کی مقدس فضا میں تنہا چھوڑ کر چلی جائے -

اس تذبذب کے عالم میں اس کے کان میں اس کہانی کے الفاظ گونجے -

" تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پا لیا ہے - اس لئے تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہوگا " چنانچہ اس طرح پر ایک فرشتہ کو فانی انسان میں تبدیل کر دیا گیا - اور گو کملا سے اُسے بہت الفت تھی - اور اس سے شادی بھی کر چکا تھا - لیکن کملا کو تمام عمر اپنی اس حرکت پر تاسف رہا - جس کی وجہ سے اس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کر دئے گئے . . . . . . "

آہ ! وہ کیا کرنے والی تھی - کیا کملا کی طرح اپنے خاوند کے الہامی جذبات کو فنا کرنا چاہتی تھی - وہ دبے پاؤں نیچے اُتر آئی - اور گو اسے اس راز کے متعلق اپنے خاوند سے استفسار کرنے کی وجہ سے ہر وقت اندرونی خلش رہتی - تاہم اسے اس کا اجر مل کر رہا - کیونکہ اس کا خاوند دنیا کا ایک نامور شاعر ہو گیا - اور وہ وفاداری سے زندگی کے باقی ایام میں اس کا ساتھ دیتی رہی -

---

منوہر جی نے محبت آمیز انداز میں اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا -

" پیاری شیاما ، مجھے یہ معلوم نہ تھا - کہ تمھیں میری شاعری کے لئے کتنی قربانی کرنی پڑی ہے - اب میں اس کے متعلق ایک گیت لکھوں گا "

نسیم رضوانی

بڑا حصّہ سطحِ آب کے اوپر ہے۔ یہ جانور ہماری طرف اس قدر تیز رفتاری سے آرہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اُس کے سینہ سے جھاگ کی کوہ پیکر موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور جہاں سے وہ گذرتا تھا سمندر میں سفید جھاگ کی ایک وسیع سڑک ایسی بن جاتی تھی جیسے آسمان پر کہکشاں۔

جب وہ جانور زیادہ قریب آگیا تو بہت صاف نظر آنے لگا۔ اگر تین بڑے بڑے سر بفلک درخت ایک کے اوپر ایک کھڑے کیے جائیں تو شاید اس عجیب و غریب جانور کے طول کا اندازہ ہو سکے۔ اس کا عرض اتنا تھا جتنا کہ قصر امیر المومنین میں ایوان دربار عام کا۔ اس کا جسم مچھلیوں کا سا نہ تھا۔ بلکہ جس قدر حصہ اس کا سطحِ آب سے باہر تھا وہ نہایت چمکدار اور سیاہ تھا۔ اور تمام جسم چٹان کی طرح ٹھوس اور سخت تھا۔ ایک سرخ رنگ کی دھاری اس کے چاروں طرف محیط تھی۔ اس کا شکم جو سطحِ آب سے نیچے تھا۔ اور جس کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی۔ فلزئی چھلکوں سے پوشیدہ تھا۔ اور ان کا رنگ ایسا تھا جیسا کہر کی حالت میں شب کے وقت چاند کا ہوتا ہے۔ اُس کی پشت چپٹی اور قریب قریب سفید تھی اور اس پر چھ عدد کانٹے میناروں کی طرح بلند تھے۔ ان کانٹوں کا طول تمام جسم کے طول سے بقدر نصف ہوگا۔

طرفہ یہ کہ اس ہولناک جانور کے منہ نہیں تھا۔ یا کم از کم ہم کو نظر نہیں آتا تھا۔ مگر یہ کمی آنکھوں کی کثرت نے پوری کر دی تھی جن کی تعداد اسّی کے قریب ہوگی۔ یہ آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اور تمام جسم کے چاروں طرف دو قطاروں میں نمایاں تھیں۔ لیکن ایک آنکھ اوپر اور ایک نیچے تھی اور آنکھوں کی قطاریں سرخ لکیر کے متوازی چلی گئی تھیں۔ اسی طرح گویا وہ سرخ لکیر ابروؤں کا کام دیتی تھی۔ ان خوفناک آنکھوں میں سے دو تین بمقابلہ دوسری آنکھوں کے بہت بڑی تھیں۔ اور ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا ٹھوس سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ جانور ہماری طرف انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آرہا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ جادو کے زور سے چل رہا ہے۔ کیونکہ نہ اس کے مچھلیوں کی طرح پر تھے۔ نہ بط کی طرح جھلی دار پاؤں تھے۔ اور نہ پرندوں کی طرح بازو تھے۔ اُس کا سر اور دُم دونوں ایک وضع کے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ دُم کے قریب دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جو نتھنوں کا کام دیتے تھے۔ ان نتھنوں میں سے وہ ہولناک جانور نہایت سختی کے ساتھ سانس نکالتا تھا۔ اور سانس لیتے وقت نہایت ناگوار شور پیدا ہوتا تھا۔

اس خوفناک جانور کو دیکھ کر ہم پر بیحد دہشت طاری ہوئی۔ اور یہ دیکھ کر تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی کہ اس جانور کی پشت پر بہت بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تھی جن کے قد و قامت انسان جیسے تھے۔ اور صورت بھی انسانوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ ہماری طرح لباس پہنے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے ان کے جسم پر کچھ چھلکا سا پیدا کر دیا ہے جو کپڑے سے مشابہ ہے۔ جو ان کے جسم سے پیوست تھا۔ اِس قدرتی لباس کی وجہ سے اُن کی صورتیں مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں اور غالباً ان جانوروں کو اُٹھتے بیٹھتے تکلیف بھی ہوتی تھی۔

ان انسان نما جانوروں کے سروں پر مربع وضع کی ایک چیز تھی جو صندوقچہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ممکن ہے قدرت نے

ان کے لیے اسی قسم کے عمامے بنائے ہوں۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ صندوقچیاں نہایت وزندار اور ٹھوس تھیں۔ خیال گذرتا ہے کہ قدرت نے ان صندوقچیوں کے بوجھ سے ان جانوروں کے سروں کا توازن قایم رکھا ہوگا۔ اور انہی سے سر کی حفاظت بھی ہوتی ہوگی۔ ان جانوروں کی گردنوں میں سیاہ رنگ کے پٹے (غالباً طوق غلامی) تھے۔ مگر یہ طوق بہت سخت اور مضبوط تھے۔ اور ان کی وضع بالکل ہمارے کتوں کے پٹوں کی سی تھی۔ ان کی وجہ سے ان قابل رحم جانوروں کو اس قدر تکلیف ہوتی تھی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر اپنی گردن نہیں موڑ سکتے تھے۔ اس طرح وہ بیچارے ہمیشہ اپنے ناک کے سامنے دیکھنے پر مجبور تھے۔ اور ان کی صورتیں ایک حد تک مضحک ہوتی تھیں۔

جب وہ عجیب الخلقت جانور اس ساحل کے قریب پہونچ گیا جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے تو اُس نے دفعتاً اپنی ایک آنکھ بہت کچھ باہر نکالی۔ اور ایک آنکھ میں سے ایک خوفناک شعلۂ آتشیں نمودار ہوا۔ شعلے کے بعد دھوئیں کا تاریک بادل چھا گیا اور بادل کے گرجنے کی طرح ہولناک شور پیدا ہوا۔ دھوئیں کا بادل چھٹ گیا تو ہم نے دیکھا کہ ان عجیب و غریب انسان نما جانوروں میں سے ایک نرسنگے کی وضع کی کوئی چیز ہاتھ میں لیے ہوئے جانور کے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ اس جانور نے نرسنگے کا رخ ہماری طرف کرکے منھ لگایا اور اپنی زبان میں جو کرخت اور بعید از فہم تھی ہماری طرف خطاب کیا۔

میں اس کی کوئی بات نہ سمجھ سکا اسلیے حیران تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ اسی پریشانی میں حمال کی طرف متوجہ ہوا جس پر بوجہ خوف کے غشی طاری ہونے والی تھی۔ اور اس سے دریافت کیا کہ عجیب الخلقت جانور کس قسم کا ہے۔ اور وہ کیا چاہتا ہے اور جو انسان نما جانور اس کی پشت پر نظر آرہے ہیں وہ کیا ہیں۔ حمال نے بہت کچھ غور و خوض کے بعد بیان کیا کہ اس نے اس دابۃ البحر کا حال پہلے بھی سنا ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک دیو ہے۔ اس کے پیٹ میں گندھک اور اس کی رگوں میں خون کے بجائے شعلہ ہائے آتش دوڑتے ہیں۔ یہ جانور بنی نوع آدم کو ایذا دینے کے لیے جنوں نے بنایا تھا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے انسان نما جانور جو اس کی پشت پر نظر آرہے ہیں وہ اسی قسم کے خود رو جانور ہیں۔ جیسے کتوں اور بلیوں کے جسم پر پیدا ہوجایا کرتے ہیں یا جیسے انسان کے جسم پر جوئیں پیدا ہوجایا کرتی ہیں۔ اور جب یہ چھوٹے چھوٹے جانور اس دابۃ البحر کے جسم میں کاٹتے ہیں تو وہ شعلہ ہائے آتشیں پھینکتا اور تکلیف کی وجہ سے بادل کی طرح گرجتا ہے۔ اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اُسے اپنے نفس آتشیں سے جلا کر خاک کر دیتا ہے۔

جب حمال سے میں نے یہ بات سنی تو وہاں سے جان لیکر بھاگا۔ اور اس بُری طرح بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور پہاڑیوں میں جا گھسا۔ یہی حال اُس حمال کا بھی ہوا۔ مگر وہ دوسری طرف فرار ہوا۔ مگر بخت اس حالت میں بھی میرا تمام اسباب لے گیا۔

اس طرف تو میں بھاگا اور اس طرف ان انسان نما جانوروں نے دابۃ البحر کی پشت سے کود کر میرا تعاقب کیا۔ اور مجھے پہاڑیوں میں جا پکڑا۔ اسکے ان جانوروں نے جو کل کشتیوں میں بیٹھ کر ساحل پر آئے تھے میرے ہاتھ پاؤں

باندھے اور کشتی میں رکھ کر وہ پھر اُسی دابۃ البحر پر جا پہونچے۔ اسکے بعد وہ عجیب الخلقت جانور پھر کھلے سمندر کیطرف روانہ ہو گیا۔
اِس وقت بحالت قید و بند میں اپنی حالت پر سخت متاسف ہوا کہ گھر میں آرام و راحت سے بسر ہوتی تھی۔ نہ سیر و سیاحت کا سودا سر میں سماتا نہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتا۔ مگر اب پشیمانی سے کیا ہوتا تھا۔ بہرحال میں صبر و شکر کے ساتھ رہنے لگا اور حتی الامکان کوشش کرنے لگا کہ جس طرح ہو سکے اس نرسنگھے والے انسان نما جانور کی تالیف قلب کروں۔ کیونکہ یہی جانور اپنے ساتھیوں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال میں اپنی اِس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اور وہ میرے حال پر عنایت فرمانے لگا۔ اس نے مجھ پر یہاں تک مہربانی کی کہ اپنی زبان بھی مجھے سکھانے لگا۔ حتیٰ کہ کچھ دنوں بعد میں اِس قابل ہو گیا کہ اُن کی زبان میں باتیں کر سکوں اور میں نے اپنے قید کرنے والے کو سمجھایا کہ میں دنیا کی سیر و سیاحت کا بیحد شائق ہوں۔

ایک روز کھانے سے فراغت کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا: ”واشیش اسکواشیش اسکوٹیاک سندباد ہیڈ ہیڈل ڈیڈل گرنٹ انٹ ہس جس وِھس۔“

اس زبان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اِن لوگوں کی زبان گھوڑوں اور مرغوں کی زبان کے درمیان تھی۔ بہرحال میں ان الفاظ کا ترجمہ کیے دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ: ”میرے دوست سندباد میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ تم واقعی اچھے آدمی ہو۔ اب ہم لوگ ایک کام کرنے والے ہیں جسے ”سنسار چکر“ کہتے ہیں یعنی تمام دنیا کے گرد گھومیں گے۔ اور چونکہ تم سیر و سیاحت کے بیحد شوقین ہو اسلئے میں تم کو اس جانور کی پشت پر بٹھا کر خوب سیر کراؤں گا۔“

جب ملکہ شہرزاد یہاں تک قصہ بیان کر چکی تو بادشاہ نے کروٹ بدلی۔ اور فرمایا: ”ملکہ واقعی بہت حیرت انگیز قصہ ہے۔ مجھے اس جہازی کی سیر و سیاحت کے قصے سُنکر بہت لطف حاصل ہوا۔“

ملکہ شہرزاد نے پھر قصہ کا سلسلہ یوں جاری کیا

”میں نے اس انسان نما جانور کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس دابۃ البحر کی پشت پر اطمینان سے رہنے لگا۔ جو سمندر میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تیرتا تھا۔ اگرچہ اس طرف کے سمندر کی سطح چپٹی نہیں بلکہ انار کی طرح ہے۔ اسلئے ہم کبھی موجوں کی چوٹیوں پر چلتے تھے اور کبھی ہموار سطح پر۔

بادشاہ:۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔

ملکہ:۔ بایں ہمہ نہایت سچی بات ہے۔

بادشاہ:۔ مجھے بھی شک نہیں۔ بہرحال آپ قصہ کا سلسلہ جاری رکھیں۔

”بہت اچھا“ کہہ کر شہرزاد نے بیان کیا کہ وہ دابۃ البحر سطح سمندر پر تیرتا رہا اور کچھ دنوں بعد ہم ایک جزیرے[ع۵] میں پہونچے جس کا دور کئی سو میل کا تھا۔ لیکن اس میں یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس جزیرہ کو سمندر کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں نے بنایا تھا۔

ع۵۔ مونگے کا جزیرہ۔

اِس جزیرے سے روانہ ہوکر ہم اُس دوسرے جزیرے میں پہونچے جہاں ایک بہت بڑا جنگل سنگین درختوں کا تھا[ع۵] جو اس قدر سخت تھے کہ مضبوط سے مضبوط کلہاڑی بھی ان کے کاٹنے سے عاجز تھی۔

اِس جزیرہ کی سیر کرکے ہم ایک ایسے ملک میں پہونچے جہاں ایک غار زمین کے اندر تیس چالیس میل تک چلا گیا ہے۔ اور اس غار کے اندر اتنے عظیم الشان محل اور حویلیاں ہیں کہ بغداد اور دمشق میں بھی نہ ہونگے۔ ان محلات کی چھتوں پر ہزاروں لاکھوں جواہر، الماس وغیرہ قد آدم سے بھی بڑے لٹکتے تھے۔ اور بازاروں میں جگہ جگہ مینار اور اہرام اور برج بنے ہوئے تھے اور یہیں بڑے بڑے دریا بہتے تھے جن کا پانی اسقدر سیاہ تھا جیسے روشنائی۔ اور لطف یہ کہ ان دریاؤں کے اندر مچھلیاں بکثرت تھیں۔ مگر ان مچھلیوں کے آنکھیں نہیں تھیں[ع۶]۔

بادشاہ:۔ ہوں!

اس کے بعد ہم سمندر میں تیرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں ایک سر بفلک پہاڑ تھا۔ اور اس کے اطراف میں پگھلی ہوئی دھات کے چشمے بہتے تھے۔ بعض بعض چشمے ساٹھ میل لمبے چلے گئے تھے اور بارہ میل چوڑے تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمیق غار تھا جس میں خاکستر

ع۵ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ریاست ٹیکساس (Texas) کے اندر ایک عجوبۂ قدرت یہ ہے کہ دریائے پاسگنو کے مخرج کے قریب ایک متحجر جنگل ہے۔ یعنی جس کے درخت پتھر بن گئے ہیں، ان درختوں کی تعداد کئی سو ہے۔ اور جو درخت اب نکل رہے ہیں وہ بھی کسی حد تک متحجر ہو گئے ہیں (ملاحظہ ہو کنیڈی صاحب کی کتاب "ٹیکساس" جلد اول صفحہ نمبر ۱۲۰) پہلے تو اس واقعہ کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا مگر جب سے کوہستان راکی (Rocky) میں کالی پہاڑیوں (Black Hills) میں دریائے چائس کے مخرج پر ایک پورا جنگل متحجر دریافت ہوا ہے۔ اسوقت سے اس بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔

روئے زمین پر کوئی منظر اس قدر دلفریب نہ ہوگا جیسا کہ مصر کے شہر قاہرہ کے قریب متحجر درختوں کا جنگل ہے۔ جب سیاح شہر سے باہر گورغریبان سے گذرنے کے بعد جانب جنوب اس سڑک سے جو سویز کو جاتی ہے زاویہ قائمہ بناتا ہوا چلے گا تو تقریباً دس میل کے فاصلہ پر پہونچکر اسے ایک بحر نشیبی وادی ملیگی، جہاں ریت، چھوٹی چھوٹی پتھریاں، کوڑیاں، گھونگھے وغیرہ پڑے ہوئے ملیں گے۔ اس وادی سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی ریت کی پہاڑیوں کا گذرتا ہے۔ جو راستہ سے کچھ دور تک متوازی چلا گیا ہے۔ یہاں جو منظر سیاح کے پیش نظر ہوگا وہ عجیب و حیرت انگیز ہے یعنی میلوں تک سنگین درختوں کا ایک جنگل چلا گیا ہے جس پر اگر گھوڑے کا سم پڑتا ہے تو وہ ڈھلے ہوئے لوہے کی طرح بولتا ہے۔ ان درختوں کی لکڑی سرخی مائل بھورے رنگ کی ہے۔ اور اس میں لکڑی کی تمام خصوصیات اور اندرونی جوہر موجود ہیں۔ درخت عموماً ایک فٹ سے پندرہ فٹ تک اونچے اور بعض دو فٹ سے تین فٹ تک موٹے ہوتے ہیں۔ اور یہ درخت اسقدر گنجان ہیں کہ ایک مصری گدھا ان میں سے بمشکل گذر سکتا ہے۔ ان درختوں کی جڑیں اور شاخوں کے ڈنٹھ پوری طرح مکمل اور سالم ہیں۔ اور بعض میں چھال کے نیچے کیڑوں کے کھائے سوراخوں اور لکیروں کے بھی نشانات موجود ہیں۔ لکڑی کے اندر تمام حلقے اور خلا یا رطوبت صاف اور مکمل نظر آتے ہیں جنھیں خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جاچکا ہے، اور تمام درخت اسقدر سختگی سے پتھر بن گئے ہیں کہ شیشہ پر خط کھینچنا ایک لکڑی کی نوک سے بہت آسان ہے علاوہ ازیں اُن پر نہایت اچھی پالش بھی ہوسکتی ہے۔ (ایشیاٹک میگزین جلد سوم صفحہ ۵۰۹ سلسلہ سوم)

ع۶ کینٹکی واقع شمالی امریکہ کا غار ہے جسے انگریزی میں (Mammoth Cave of Kentucky) کہتے ہیں۔

ع۷ جزیرہ آئسلینڈ (Iceland) کے اندر ۱۷۸۳ء میں ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔

کی اس قدر مقدار اڑکر فضا میں پھیلتی تھی کہ چاروں طرف شب تاریک کا عالم طاری رہتا تھا۔ اور اس تاریکی کی شدت اس قدر تھی کہ جب ہم اس پہاڑ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھے اس وقت بھی ہم کسی دودھ کے مانند سفید چیز کو بھی آنکھوں کے قریب لاکر نہ دیکھ سکتے تھے۔[عٰ]

اس ملک سے روانہ ہو کر ہمارے دابۃ البحر نے اپنے سفر کا سلسلہ جاری رکھا حتی کہ ہم ایک ایسے ملک میں پہونچے جہاں کی دنیا ہی نرالی تھی۔ یعنی یہاں ہم نے ایک بڑی عمیق جھیل دیکھی جس کے اندر سطح آب سے سو فٹ نیچے درختوں کا ایک بڑا گنجان شاداب جنگل نظر آتا تھا۔[عٰ] جب ہم یہاں سے تقریباً سو میل آگے بڑھے تو وہاں کی ہوا ہم نے اس قدر کثیف دیکھی کہ اس میں لوہا اور فولاد اس طرح معلق تیرنے لگتا تھا جیسے ہماری ہوا میں پر یا کاغذ کا ٹکڑا اڑتا ہے۔[عٰ]

بادشاہ:- بالکل جھوٹ!

اسی سمت ہم کچھ اور آگے بڑھے اور ایک ایسے خوبصورت اور دلفریب ملک میں پہونچے کہ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس ملک کے اندر وسیع سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا ایک نہایت عظیم الشان دریا ہزاروں میل تک بہتا ہے۔ یہ دریا اسقدر عمیق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور پانی اسقدر شفاف ہے جیسے بلور۔ دریا تین میل سے چھ میل تک چوڑا ہے۔ اور اس کے کنارے بعض بعض مقامات بارہ سو فٹ بلند ہیں۔ سدا بہار درختوں کا سرسبز جنگل چلا گیا ہے جہاں خودرو گل ریاحین کی روح افزا خوشبو ہر وقت دوش صبا پر اڑتی رہتی ہے۔ الغرض یہ تمام ملک اپنی سرسبزی و شادابی اور خوبصورتی سے رشک جنت بنا ہوا ہے لیکن آب و ہوا یہاں کی اسقدر خراب ہے کہ وہاں کی سرزمین پر قدم رکھنا موت کے منھ میں جانا ہے۔[للعٰ]

عٰ ۱۷۸۳ء میں جب جزیرہ کا ہکلا (Hecla) نامی کوہ آتش فشاں جوش میں آکر پھوٹا تو خاکستر کے اس قدر گہرے بادل فضا میں چھا گئے تھے کہ شہر گلا مبا ([illegible]) میں جو پہاڑ سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اسقدر تاریکی چھا گئی تھی کہ لوگ ہاتھوں سے ٹٹول کر راستہ چلتے تھے۔ اور ۱۷۹۴ء میں جب اطالیہ کا آتش فشاں پہاڑ ویسو ویس (Vesuvius) پھٹا تو مقام تیفرتہ میں جو بارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس قدر تاریکی چھا گئی تھی کہ لوگ مشعلیں جلا کر راستہ چلتے تھے۔ یکم مئی ۱۸۱۲ء کو جزیرہ سینٹ ونسنٹ کے آتش فشاں پہاڑ سے خاکستر کا اس قدر گہرا بادل نکلا کہ تمام جزائر باربیڈوز پر چھا گیا اور تاریکی کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر کے وقت کھلے میدان میں لوگوں کو قریب کے درخت اور دیگر چیزیں نظر نہ آتی تھیں اور چھ انچ کے فاصلہ پر سفید رومال نہ دکھائی دیتا تھا (مرے انسائیکلوپیڈیا آف جیاگرفی صفحہ ۲۲۱)

عٰ ۱۷۹۰ء میں بمقام کاراکاس (Caraccas) اسقدر زبردست زلزلہ آیا کہ وہاں کی سنگلاخ زمین کا ایک طبقہ جو آٹھ سو [illegible] کے جنگل کا ایک حصہ تھا نیچے بیٹھ گیا۔ اور وہاں ایک جھیل پیدا ہوگئی جس کا قطر آٹھ سو فٹ تھا۔ اور جو اسی سے سو فٹ تک گہری تھی۔ جنگل کے درخت جو اس جھیل کی تہ میں تھے وہ کئی ماہ تک بدستور سرسبز و شاداب رہے۔ (مرے انسائیکلوپیڈیا جغرافیہ صفحہ ۲۲۱)

عٰ سخت سے سخت فولاد کو بھی دھونکنی کے ذریعہ سے آنچ دیکر اسقدر باریک سفوف کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہوا میں اڑنے لگے۔

للعٰ یہ ملک مغربی افریقہ میں وادی دریائے نائیجر ہے جسے نائیجریا (Nigeria) کہتے ہیں۔ یہ ملک قدرتی طور پر نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ مگر یہاں کی آب و ہوا یورپین اقوام کو ناموافق ہوتی ہے۔ اور وہ اس ملک کو موت کا ملک کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سائمنڈ کا کونیل میگزین۔

(Region of the Niger. Simmonds Colonial Magazine)

بادشاہ:- ہونھ!

الغرض ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہوگئے اور چند روز بعد ایسے ملک میں پہونچے جہاں ہم نے لاکھوں عجیب الخلقت جانور ایسے دیکھے جن کے سروں پر بنیئے کی وضع کے سینگ تھے۔ یہ گروہ عدیرت جانور اپنے رہنے کے لیے زمین میں بڑے بڑے غار کھودتے ہیں جن کی شکل مخروطی ہوتی ہے۔ اور غار میں چاروں طرف چٹانوں کے ٹکڑے اس طرح جھکاتے ہیں کہ جب کوئی دوسرا جانور ان پر پاؤں رکھتا ہے تو وہ فوراً پھسل کر گر پڑتا ہے۔ اور وہ خونخوار مخلوق فوراً اس جانور کا خون چوس لیتی ہے اور لاش کو حقارت کے ساتھ غار کے دہانہ سے جو در اصل "غار قضا" ہے۔ بہت دور پھینک دیتی ہے۔ عہ

بادشاہ:- واہیات!

ہم اپنا سلسلۂ سفر جاری رکھتے ہوئے ایک ایسے علاقہ میں پہونچے جہاں نباتات زمین میں نہیں بلکہ ہوا میں اُگتی ہے۔ عہ اور بعض درخت ایسے بھی تھے جو درختوں پر اُگے ہوئے تھے۔ عہ بعض درخت ایسے تھے جو جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ عہ بعض درخت ہم نے یہاں ایسے بھی دیکھے جو جڑ سے چوٹی تک آگ کی طرح چمکتے تھے۔ عہ اور بعض نباتات ایسے بھی تھے جن میں نقل و حرکت کی قوت بھی تھی اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ ان سب سے زیادہ عجیب و غریب ایک قسم کے پھول دیکھے جو سانس لیتے تھے، جان رکھتے تھے۔ اور پنکھڑیوں کو اپنی قوت ارادی سے حرکت میں لاتے تھے۔ ان پھولوں میں انسان کی طرح یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ اپنے حسن دلفریب سے جانوروں کو پھانس لیتے تھے جنھیں وہ بھیانک کال کوٹھڑیوں میں قید رکھتے تھے۔ عہ

عہ- ایک قسم کی چیونٹی ہوتی ہے۔ جسے انگریزی زبان میں "مرمیلین" (Myrmeleon) یعنی "شیر چیونٹی" کہتے ہیں۔ لفظ "عجیب الخلقت" جو استعمال کیا گیا ہے وہ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے جانوروں پر عائد ہو سکتا ہے۔ اور غار کیلئے جو لفظ "بڑے" استعمال کیا گیا ہے وہ اعتباری ہے کیونکہ معمولی چیونٹی کے سوراخ سے "شیر چیونٹی" کا غار نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ لفظ "چٹان" کا اطلاق سائنس کی اصطلاح میں ریت کے ذرہ پر بھی ہو سکتا ہے۔

عہ- اکاس بیل جسے انگریزی میں "Epidendron, Flos Aeris" کہتے ہیں۔ یہ بیل ڈورے کی طرح درختوں اور جھاڑیوں پر پھیلتی ہے اور ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے۔

عہ- طفیلی (Parasites) درخت جیسے ببول، پیپل، برگد اور شیشم وغیرہ پر اکثر ایک قسم کی نباتات اُگ آتی ہے جسے "بندہ" کہتے ہیں۔

عہ- مسٹر جے۔ بی۔ ولیمس ساکن سالم (امریکہ) نے ایسکس انسٹی ٹیوٹ کو ایک کیڑا نذر کیا جسے وہ نیوزیلینڈ سے لائے تھے اور اسکی نسبت یہ تحریر کیا کہ یہ جانور ہاٹ (Hotte) کہلاتا ہے جو ہزار پائی وضع کا ہے۔ اور یہ رآتا (Rata) درخت کی جڑوں میں ہوتا ہے۔ اور اسکے سر سے ایک پودا نکلتا ہے۔ یہ کیڑا درخت پر چڑھتا چلا جاتا ہے اور جب چوٹی پر پہونچتا ہے تو سوراخ کرتا ہوا جڑ تک اتر آتا ہے۔ جہاں وہ سوراخ کھود کر باہر نکلتا اور مرجاتا ہے۔ اور وہ پودا اس کے سر میں بڑھتا رہتا ہے۔ اس کیڑے سے ایک قسم کا رنگ بنایا جاتا ہے۔

عہ- معادن اور قدرتی غاروں میں ایک قسم کا بے پھول کا سمارو غ پایا جاتا ہے جس سے تیز روشنی نکلتی ہے۔

عہ- Orchis, Scabius & Vallisneria (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

بادشاہ:- بالکل جھوٹ۔

اس ملک سے روانہ ہو کر ہم بہت جلد ایک دوسرے ملک میں پہونچے جہاں کی چڑیاں اور شہد کی مکھیاں نہایت ہی زبردست ریاضی داں واقع ہوئی ہیں۔ اس ملک کے عقیل و فہیم لوگ ان جانوروں سے روز مرہ علم الھندسہ میں سبق لیتے ہیں، اس ملک کے بادشاہ نے دو سوال پیش کر کے بھاری انعام کا وعدہ کیا۔ ان سوالوں کا فوراً حل کر دیا گیا۔ ایک سوال شہد کی مکھیوں نے اور دوسرا چڑیوں نے حل کیا مگر بادشاہ نے ان سوالات کے حل مخفی رکھے۔ آخر سالہا سال کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزیوں کے بعد بڑی بڑی کتابیں لکھکر اس ملک کے ریاضی دانوں نے وہ حل معلوم کیے۔[عہ]

بادشاہ:- معاذ اللہ اس قدر جھوٹ!

ابھی ہم اس سلطنت کی حدود سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک دوسرے ملک میں پہونچے۔ یہاں ساحل بحر سے مرغوں کا ایک سفـ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ معـ) اس پھول کو انگریزی میں (ARISTOCHIA CLAMATITIS) کہتے ہیں۔ اس کا چہرہ نالی دار پھول کی جڑ کروی ہوتی ہے۔ نالی دار حصہ کے اندر سخت بال اس طرح ہوتے ہیں کہ ان کے سرے نیچے کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ کروی حصہ میں ایک حصہ ہوتا ہے جس میں بیضہ دان (GERMEN عـہ) اور سر نقچہ (STIGMA عـلہ) دونوں ہوتے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف زردان (STAMENS) ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ زردان بمقابلہ بیضہ دانوں کے چھوٹے ہوتے ہیں اسلیے وہ سر نقچہ پر زردانہ نہیں پھینک سکتے۔ کیونکہ پھول ہمیشہ سیدھا رہتا ہے تاوقتیکہ حاملہ نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک کوئی خارجی مدد حاصل نہ ہو زردانہ پھول کی تہ تک نہیں پہونچتا اسکے قدرت نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ایک چھوٹا سا کیڑا جسے انگریزی زبان میں (TRIPULA PENNICORIS) عـلہ کہتے ہیں بتلاش شہد پھول کی نالی میں داخل ہوتا ہے۔ اور کروی حصہ میں پہونچ جاتا ہے۔ اسکے بعد وہ چاروں طرف پھرتا ہے حتی کہ اس پر زردانہ لپٹ جاتا ہے۔ لیکن چونکہ نالی کے اندر بالوں کا رخ نیچے کی جانب ہوتا ہے اسلئے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ وہ گھبرا کر پھول کے اندر چاروں طرف مارا مارا پھرتا ہے۔ حتی کہ وہ سر نقچہ میں گھوم پھر کر اسکے اندر اپنے جسم سے کافی مقدار زردانہ کی پہونچا دیتا ہے۔ جس سے وہ پھول حاملہ ہو جاتا اسکے بعد پھول کا سر بہت جلد نیچے کی طرف جھک جاتا ہے اور نالی کے اندر بال بھی دیواروں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اب وہ کیڑا آسانی باہر جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو

عـہ - جب سے شہد کی مکھیاں وجود میں آئی ہیں۔ ہمیشہ اپنا چھتہ ایک ہی وضع کا سا بناتی چلی آتی ہیں۔ ہر خانہ کا طول و عرض اسکے اضلاع اور اضلاع کے درمیان زاویے ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ ان کے طول اور زاویوں میں سرِمو فرق نہیں ہوتا۔

گذشتہ صدی کے آخری زمانہ میں ریاضی دانوں میں یہ مسئلہ چھڑا کہ ہوائی چکی کے پنکھوں کو بہترین وضع کس طرح دی جائے۔ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ تھا۔ بہت سے مشہور و معروف ریاضی دانوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ بالآخر سخت کوششوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قدرت نے پرندوں کے بازوؤں کو جو شکل و صورت دی ہے اس سے بہتر صورت چکی کے پنکھوں کو نہیں دی جا سکتی۔

زبردست بادل اڑکر ہمارے سروں پر سے گذرا کہ اس بادل کا طول دوسو چالیس میل[ع۱] اور عرض ایک سو میل تھا۔ اگرچہ یہ مرغ ایک میل فی منٹ کی رفتار سے اڑ رہے تھے مگر ان کو گذرنے میں پورے چار گھنٹے لگے۔ اس بادل میں کئی کروڑ مرغ[ع۱] تھے۔

بادشاہ:- اُف اس قدر جھوٹ!

جب پرندوں کا یہ غول جس کی وجہ سے ہم کو سخت تکلیف ہوئی۔ ہمارے سروں پر سے گذر گیا۔ تو ایک اور مرغ نہایت ہیبت انگیز اور خوفناک نمودار ہوا۔ اسکی جسامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بغداد میں اتنا بڑا گنبد کوئی نہیں۔ اس خوفناک پرند کا سر نظر نہیں آتا تھا۔ فقط پیٹ ہی پیٹ تھا جو نہایت مضبوط اور گول تھا علاوہ ازیں وہ کسی قسم کے ملائم مادہ کا بنا ہوا تھا۔ تمام پیٹ نہایت چکنا اور چمکدار تھا۔ اور اس پر مختلف رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اپنے پنجوں میں یہ مرغ ہولناک ایک مکان بلا سقف و بام لئے ہوئے اڑا جاتا تھا۔ غالباً اسکا آشیانہ آسمان پر ہوگا۔ کیونکہ وہ بتدریج اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس نے مکان کی چھت توڑ کر پھینکدی ہے۔ مکان کے اندر ہم کو آدمی بھی بیٹھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے جو یقیناً خوفزدہ تھے۔ اور موت ان کی نظروں میں پھر رہی تھی۔ ہم نے ہر چند گلا پھاڑ پھاڑ کر شور و غل مچایا تاکہ وہ ڈر کر اپنا شکار چھوڑ دے۔ مگر اُس نے ہمارے سروں پر ایک بھاری تھیلا پھینک مارا جسمیں ریت[ع۲] بھری تھی

بادشاہ:- لاحول ولا قوۃ!

اس واقعہ کے بعد ہم ایک طویل و عریض بر اعظم میں پہونچے جس کے طول و عرض کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بر اعظم کی زمین نہایت ٹھوس واقع ہوئی تھی۔ مگر یہ نہایت حیرت انگیز بات تھی کہ اسے آسمانی رنگ کی ایک گائے اپنے سینگوں پر اُٹھائے ہوئے تھی۔ اور ان سینگوں کی تعداد چار سو[ع۳] سے کم نہ تھی۔

بادشاہ:- اس بات کا میں یقین کرتا ہوں کیونکہ میں نے یہی بات کسی کتاب میں بھی پڑھی ہے۔ اور کتابی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں۔

ہم فوراً اس بر اعظم کے نیچے گائے کی ٹانگوں میں ہو کر گذر رہے اور چند گھنٹے کے بعد ایک نہایت عجیب و غریب ملک میں پہونچے۔ اس انسان نما جانور نے مجھے بتایا کہ یہ ملک ان کا وطن ہے یعنی اس سرزمین میں اسی قسم کے انسان نما جانور رہتے ہیں۔ یہ بات سنکر میرے دل میں انسان نما جانوروں کی بیحد قدر و وقعت ہوئی۔ اور اب واقعی مجھے یہ خیال کرکے شرم آتی ہے کہ اب تک میں ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اب اس ملک میں پہونچکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ انسان نما جانور درحقیقت نہایت طاقتور جادوگروں کی

ع۱۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسنے فرانکفورٹ اور انڈیانا کے علاقہ کے درمیان کبوتروں کا ایک غول گذرتے دیکھا ہوگا۔ جو کم از کم ایک میل چوڑا ہوگا۔ یہ غول چار گھنٹہ میں گذر سکا۔ اگر ان کی رفتار ایک منٹ فی میل لگائی جائے تو تمام غول کا طول ۲۴۰ میل ہوتا ہے۔ اور اگر ایک مربع گز کے اندر تین کبوتر فرض کیے جائیں تو تمام کبوتروں کی تعداد ۲۲۳۰۲۷۲۰۰۰ ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو سیاحت کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ مرتبہ لفٹنٹ ایف۔ ہال)

ع۲۔ یہ مرغ ہیبتناک جدید قسم کا غبارہ تھا جب ہوا میں زیادہ بلند ہونا منظور ہوتا ہے تو غبارہ سے ریت کی بھری ہوئی بوری پھینکدی جاتی ہے تاکہ سبک ہو کر اوپر چڑھ سکے۔

ع۳۔ قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ زمین ایک نیلگوں گائے کے سینگوں پر قائم ہے۔ اور ان سینگوں کی تعداد چار سو[ع۴] ہے۔

ایک قوم ہے۔ ان لوگوں کے مغز میں کیڑے ہوتے ہیں[عہ] جب یہ کیڑے کلبلاتے ہیں تو ان لوگوں کا دماغ میدان خیال میں خوب کام کرتا ہے۔

بادشاہ:۔ توبہ! توبہ!!

ان جادوگروں نے بہت سے عجیب و غریب جانور پال رکھے تھے۔ مثلاً ایک بہت عظیم الجثہ گھوڑا تھا۔ جس کی ہڈیاں لوہے کی تھیں اور خون کی جگہ اس کی رگوں میں کھولتا ہوا پانی دوڑتا تھا۔ دانہ کے بجائے وہ گھوڑا سیاہ پتھر کھاتا تھا۔ اور باوجود اس قدر سخت غذا کے بھی وہ نہایت تندرست اور طاقتور رہتا۔ حتیٰ کہ وہ اس قدر وزن گھسیٹ لیجاتا تھا کہ بغداد بھر میں کوئی مسجد اس قدر وزنی نہ ہوگی اور تیز رفتار اس قدر تھا کہ بہت سے پرندے اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے[عسہ]۔

بادشاہ:۔ لغو اور غلط!

اسی قوم کے یہاں میں نے ایک مرغی بھی دیکھی جس کے جسم پر ایک بھی پر نہ تھا۔ لیکن جثہ میں وہ اونٹ سے بھی بڑی تھی۔ اسکے جسم میں بجائے گوشت و استخواں کے لوہا اور اینٹیں تھیں۔ اور مندرجۂ بالا کی طرح اس کا خون بھی کھولتا ہوا پانی تھا۔ اور اسی کی طرح یہ بھی سیاہ پتھر یا لکڑی کھاتی تھی۔ یہ مرغی ایک دن میں اکثر یکصد انڈے سیکر بچے نکالتی تھی۔ اور انڈوں سے باہر نکلنے کے بعد وہ چوزے کئی ہفتہ تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہتے تھے[مسہ]۔

بادشاہ:۔ توبہ توبہ!

جادوگروں کی اس زبردست قوم کے ایک طاقتور ساحر نے پیتل، لکڑی اور چمڑے کا ایک انسان بنایا اور اس میں اس قدر عقل پیدا کی کہ وہ شطرنج کھیلنے میں خلیفہ ہارون الرشید اعظم کے سوائے دنیا کے تمام شاطروں کو مات دیتا تھا[للعہ]۔ اسی قوم کے ایک دوسرے جادوگر نے ایک ایسا پتلا بنایا جو حساب کتاب میں بڑے بڑے ماہرین کو شرمندہ کر دیتا تھا۔ یعنی وہ ایک سکنڈ میں اس قدر بڑے بڑے حساب صحت کے ساتھ لگا دیتا تھا کہ ان کے حل کرنے میں پچاس ہزار آدمیوں کی متفقہ محنت و جانفشانی کو ایک سال درکار ہوتا[صہ]۔ اس قوم کے ایک تیسرے جادوگر نے ایک اور عجیب و غریب چیز بنائی جو نہ انسان ہے نہ حیوان لیکن اس کا مغز سیسہ کا ہے اور سیسہ میں قیر کے

عہ۔ ان کیڑوں کو انگریزی زبان میں (ENTOZOA) کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ویاٹ صاحب کی کتاب "زیالوجی" صفحہ ۱۴۳

عسہ۔ ریلوے انجن (LOCOMOTIVE) لندن اور اکسیٹر کے درمیان جو "گریٹ ویسٹرن ریلوے" چلتی ہے اس پر اکھتر میل فی گھنٹہ کی رفتار پوری کی جا چکی ہے۔ ایک ٹرین پاڈنگٹن اور ڈیڈکوٹ کے درمیان جس کا وزن ۹۰ ٹن (ایک ٹن = ۲۸ من) ۵۳ میل کے فاصلہ پر ۵۱ منٹ میں پہونچائی جا چکی ہے۔

مسہ۔ مرغی کے انڈے سینے کی بھٹی۔

للعہ MAELZEL'S AUTOMATIC CHESS PLAYER

صہ BABBAGE'S CALCULATING MACHINE

ندایک سیاہ چیز ملی ہوئی تھی۔ اور اس کی انگلیاں بلا تکلف ایک گھنٹہ کے اندر پچاس ہزار قرآن لکھ دے سکتی ہیں۔ اور وہ بھی اس قدر صحت کے ساتھ کہ ایک نسخہ دوسرے سے اعراب میں بھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز اس قدر طاقتور واقع ہوئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو زبردست سے زبردست سلطنت کو بھی تہ و بالا کر دے سکتی ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک معمولی جماعت کو قوم اور قوم کے لئے ایک وسیع سلطنت قائم کر سکتی ہے۔ الغرض خیر و شر دونوں باتیں اسی چیز کے ہاتھ میں ہیں۔

بادشاہ:۔ لاحول ولا قوۃ! اس قدر جھوٹ!!

ساحروں کی اس قوم میں ایک شخص ایسا بھی گذرا ہے جس کی رگوں میں سمندر (آگ کا جانور) کا خون دوڑتا تھا۔ کیونکہ وہ جلتے ہوئے تنور میں بیٹھ کر اپنا حقہ پی سکتا تھا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا کھانا بھی پکا لیتا تھا۔ ایک اور جادوگر ایسا تھا جو ملمع کی اشیاء کو سونے میں تبدیل کر دیتا تھا اور ان پر نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ ایک اور شخص ایسا گذرا ہے جس نے تار کشی کے ذریعہ سے ایسا باریک تار بنایا جو آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اور ایک شخص تو اس قدر عجیب و غریب دماغ والا ہے کہ وہ ایک چکدار چیز کے اہتزاز کا شمار ایسی حالت میں کر سکتا تھا جبکہ وہ ایک سکنڈ میں نو لاکھ مرتبہ حرکت کرتی تھی۔

بادشاہ:۔ جھوٹ کی حد ہو گئی۔

انہی جادوگروں میں سے ایک شخص نے ایک غیر مرئی سیال شئے کے ذریعہ سے یہ کمال دکھایا کہ انسانی ڈھانچوں میں جان ڈال دی اور وہ چلنے پھرنے، ہاتھ پاؤں ہلانے اور ناچنے کودنے لگے۔ ایک اور جادوگر نے اپنی آواز کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اگر وہ چاہے تو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک اپنی بات سنا سکتا ہے۔ ایک جادوگر نے اپنا ہاتھ اس قدر بڑھایا ہے کہ اگر وہ دمشق میں بیٹھا ہو تو بغداد میں خط لکھ سکتا ہے۔ بلکہ بغداد تو کیا وہ ہر جگہ یہ کام کر سکتا ہے۔ ایک جادوگر نے بجلی کو حکم دیا کہ وہ آسمان سے اتر اس کے پاس آئے۔ چنانچہ وہ اتری اور اس ساحر کے ساتھ کھیلتی رہی۔ ایک اور ساحر نے دو آوازیں لیں اور ان دونوں سے سکوت پیدا کر دیا۔ دیگر ساحر نے دو نہایت درخشاں روشنیاں لیں اور ان دونوں کو ملا کر تاریکی پیدا کر دی۔ ایک جادوگر نے دہکتے ہوئے تنور کے اندر برف

سہ پریس (PRESS) عہ (CHABERT) اور اس کے بعد صدہا دیگر اشخاص سہ الکٹروٹائپ ELECTRO TYPE

عہ ولاسٹن (WOOLASTON) نے دوربین کے لیے ایک تار ایک انچ کا اٹھارہویں ہزار حصہ کے برابر بنایا تھا۔ یہ تار اس قدر باریک تھا کہ صرف خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سہ نیوٹن نے دکھایا تھا کہ شبکیہ (RETINA) بنفشئی شعاعوں کے زیر اثر ایک سکنڈ میں نوے کروڑ مرتبہ اہتزاز کرتی ہے۔ سہ برقی رو (VOLTAIC PILE) عہ الکٹرو ٹیلیگراف (ELECTRO.TELEGRAPH) جس کے ذریعہ سے فوراً پہونچ جاتی ہے۔ سہ THE ELECTRO TELEGRAPH PRINTING APPARATUS لعہ طبیعیات کا ایک معمولی تجربہ ہے کہ اگر دو منور نقطوں سے دو سرخ شعاعیں کسی تاریک کرہ میں کسی سفید چیز پر اس طرح ڈالی جائیں کہ ان کے طول میں ۰۰۰۰۲۵۸ ۰۶ انچ کا فرق ہو تو ان شعاعوں کی تنویر الٹی مضاعف ہو جائیگی۔ اسی طرح اگر طول کا فرق ½ ۲ یا ½ ۳ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو تنویر میں شدت پیدا ہوتی رہیگی لیکن اگر (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

پیدا کردی۔ دوسرے [عہ۵] نے آفتاب کو حکم دیا کہ وہ اسکی تصویر کھینچے چنانچہ آفتاب نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اسکی تصویر کھینچ دی [عہ۶]
ایک اور جادوگر نے شمس و قمر اور دیگر سیاروں کو لیا اور ان کو نہایت صحت کے ساتھ وزن کیا، ان کے تمام اجرام معلوم کیے
اور جن مادّوں کے وہ بنے ہوئے ہیں اُن کی کثافت معلوم کی۔ الغرض یہ تمام قوم اس قدر زبردست ساحر واقع ہوئی ہے کہ انکے
بچے بلکہ کتے بلیاں تک بھی ان چیزوں کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں جن کا وجود نہیں۔ یا جو اس قوم کے وجود میں آنے سے بھی بیس ہزار سال
پیشتر صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئی تھیں [عہ۷]۔

بادشاہ:- لاحول ولا قوۃ!

ان عظیم الشان اور زبردست جادوگروں کی بیویاں اور بیٹیاں انتہا درجہ کی شائستہ، سلیقہ شعار، عالمہ، فاضل اور دانشمند
ہوتی ہیں۔ الغرض جس قدر خوبیاں بلحاظ فضائل خیال میں آسکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں حُسن و جمال ہی بھی قدرت نے
ان کو زبردست حصّہ مرحمت فرمایا ہی۔ مگر ایک سخت عیب ان میں پایا جاتا ہی جو باوجود کوشش بسیار ان کے شوہروں اور
والدوں سے کبھی دور نہ کیا جا سکا۔

بادشاہ:- وہ کیا عیب ہی؟

کسی خبیث جن نے جو ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ انسان کو مضرت پہونچائیں۔ ان شائستہ خواتین کے دل میں یہ بات
ڈال دی ہی کہ جس چیز کو حُسن و جمال سے تعبیر کرتے ہیں محض اس قدر ہے کہ جسم کا وہ حصہ جو ناف سے نیچے ہے کوہان شتر کی طرح اُبھرا ہوا ہو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) شعاعوں کے طول کے فرق ½ ۲ یا ½ ۳ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو قطعی تاریکی پیدا ہو جائیگی۔ اسی قسم کے تجربات اگر آواز
کے ساتھ کیے جائیں تو یہی نتائج پیدا ہونگے۔

عہ۵- پلاٹنم کی ایک کٹھالی اسپرٹ لیمپ پر رکھوا در سُرخ آنچ دو بعد ازاں اسمیں گندھک کا تیزاب ڈالو۔ اگرچہ معمولی ٹمپریچروں میں یہ تیزاب
سب سے زیادہ اُڑتا ہی لیکن وہ اس وقت کٹھالی میں قائم رہیگا۔ اگر اس وقت پانی کے چند قطرے کٹھالی میں ڈالدیے جائیں تو تمام تیزاب اسقدر
تیزی سے غائب ہو جائیگا کہ پانی کے قطروں حرارت مستور بھی اسی کے ساتھ اڑ جائیگی۔ اور پانی کے قطرے منجمد ہو کر بصورت برف رہجائینگے۔ اسطرح
گویا دہکتے ہوئے تنور میں برف بنجاتی ہی۔ عہ۶ DAGUERREOTYPE سے عہ۷ اگرچہ روشنی کی رفتار دو لاکھ میل فی سکنڈ ہی لیکن
کرۂ ارض سے قریب ترین ثابت جس کا نام "کلب اکبر" (DOG STAR) ہی، وہ اس قدر دور ہی کہ اسکی روشنی کو کرۂ ارض تک پہونچنے میں کم
از کم تین سال لگیں گے۔ اور اس سے بھی آگے جو ستارے ہیں اُنکی روشنی بیس سال بلکہ بعض کی ایک ہزار سال میں ہم تک پہونچیگی۔ برعکس ازیں یہ
سمجھکر کہ اگر وہ ستارے بیس بائیس ہزار سال پیشتر فنا ہو جاتے تو ان کی روشنی ہم کو ابتک نظر آتی یعنی وہی روشنی جو انکی سطح سے بیس ہزار
سال پیشتر چلی تھی کرۂ ارض پر ابتک نظر آتی ہی۔ (ایڈ ووے جنرل نوٹ)

بقول ہرشیل کبیر (ELDER HERSCHEL) جو روشنی خفیف ترین سدیم کی اسکی دوربین کے ذریعہ سے نظر آتی ہی
وہ تیس لاکھ سال پیشتر چلی ہوگی اور جو سدیم لارڈ راس (ROSS) کی دوربین سے دکھائی دیتی ہی وہ کم از کم دو کروڑ برس قبل چلی ہوگی

وہ کہتی ہیں کہ جس قدر بڑا کوہان ہوگا اُسی قدر زیادہ ایک عورت حسین و جمیل ہوگی۔ الغرض باوجود اس قدر زیادہ شائستگی اور علم و فضل کے وہ خود کو مادہ شتر بنانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

بادشاہ:۔ بس بند کرو اپنی لغو داستان! میں اس سے زیادہ ہرگز سننا نہیں چاہتا، تمھاری دروغ بیانیوں سے میرے سر میں درد ہوگیا ہے۔ اب صبح بھی ہونے والی ہے۔ آہ ہو ہماری شادی ہوئے کس قدر عرصہ گذرا؟ میرا ضمیر اب مجھے پھر لعن طعن کرنے لگا ہے۔ بس اب تمھاری عمر ختم ہوگئی۔ اور اب تمھیں بھی میری دوسری بیویوں کے پاس جانا پڑیگا۔"

بادشاہ کا یہ حکم سنکر ملکہ شہرزاد کانپ اُٹھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ اس کے شوہر کے منھ سے نکل گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا اس لیے اس نے اپنے آپ کو حوالۂ جلاد کردیا۔ اور اس طرح سندباد جہازی کی سرگذشت کا بہت حصّہ باقی رہ گیا جس کے سُننے سے دُنیا ابد تا ابد محروم رہے گی۔

(اڈگر ایلن پو)

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۶۸ ۱۳۱ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج ماتحت مقام اناؤ

چندر بھوکن ولد گوبردھن داس قوم برہمن ساکن سکاجو پرگنہ بھگوت نگر ضلع اُناؤ .... مدعی

بنام
ماتا بدل سنگھ

بنام ماتا بدل سنگھ ولد گیا بخش سنگھ قوم ٹھاکر ساکن دنیکولی مزرعہ کسری کھیڑہ پرگنہ در ہدسہ کھیڑہ ضلع اناؤ .... مدعا علیہ

ہرگاہ مدعی نے تمھارے نام ایک نالش بابت مدار کے دائر کی ہے۔ لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ دس ماہ فروری ۱۹۳۲ء بوقت ۱۰ بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حالات سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو۔ اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمھارے احضار کیلئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اُسی روز اُن کو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمھارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۴ ماہ جنوری ۱۹۳۲ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

وقت حاضری بدفتر سب ججی اناؤ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

مہر عدالت　　　　دستخط حاکم بخط انگریزی

شبنمستاں کا قطرۂ گوہریں

اس افسانہ کا سلسلہ دسمبر ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور اس کی دو قسطیں نومبر و دسمبر ۱۹۳۱ء کے پرچوں میں شایع ہو چکی ہیں۔ اس لیے جن حضرات کی خریداری جنوری سے شروع ہوتی ہے وہ دفتر سے نومبر و دسمبر کے پرچے منگا لیں۔ اس طرح اُن کی خریداری بجائے جنوری کے نومبر ۱۹۳۱ء سے محسوب ہوگی۔

پھولوں سے لدی ہوئی مسہری پر ملکۂ ناہید منھ پر ہلکی نقاب ڈالے ہوئے پڑی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے۔ خاموش ہے۔ خوابگاہ میں سوائے اُس نوواردہ کنیز کے جو پائیں میں بیٹھی ہوئی ملکہ کا منھ تک رہی ہے اور کوئی موجود نہیں۔ دفعتہً ملکہ ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بولی "نوبہار کیا سوچ رہی ہے، اور کیا دیکھ رہی ہے"۔

—"کچھ نہیں ملکۂ عالم۔ یہ دیکھ رہی ہوں کہ مسہری کے پھولوں میں ایک گلاب کا پھول کیسا پیارا، کیسا شگفتہ اور کس قدر حسین ہے"

ملکہ نے چہرے سے نقاب ہٹا کر پوچھا "کہاں ہے"

——"یوں نہیں ملکۂ عالم۔ آپ پھر نقاب چہرہ پر ڈال لیجئے، تو بتاؤں کہ وہ کہاں ہے"

ملکہ نقاب سے چہرہ چھپاتے ہوئے —"ہاں بتا کہاں ہے"

نوبہار "مسہری کے اُس کنارے پر میری دسترس سے دور ایک گلاب کا پھول ہے اور نقاب کے اندر ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی نے آنچل میں اسے باندھ لیا ہو"

ملکہ —— شریر میں سمجھی — اچھا اور کیا سوچ رہی ہے

نوبہار —— اور یہ سوچ رہی ہوں کہ سنسان جنگل کی جھاڑیوں میں جب صبح کو کلیاں کھلتی ہیں، شبنم کے قطرے پھولوں کی پنکھڑیوں پر جھلملاتے ہیں، تو وہاں اُن کا دیکھنے والا کون ہوتا ہے۔ اور قدرت کا حسن کی اس رائیگاں آفرینش سے کیا مدعا ہے۔

ملکہ —— "بیوقوف — اچھا اور کچھ؟

نوبہار —— "اور ہاں یہ سوچ رہی ہوں کہ آج کی رات بھی ملکۂ عالم مجھے یہیں پائیں میں سونے کا حکم دیں گی، اور پھر میں اس ڈر سے ساری رات جاگتی رہوں گی کہ کہیں میرے لب ملکہ کے تلوؤں سے نہ چھو جائیں"۔

ملکہ —— "نہیں، آج میں بجائے پائیں کے تجھے اپنے پہلو میں جگہ دوں گی اور رات بھر تجھ سے باتیں کروں گی۔ جب تک تو میرے پاس رہتی ہے میں ایسا لطف محسوس کرتی ہوں جیسے برفباری کے وقت شعلہ کی گرمی، اور جب تو نہیں ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا ہے۔ آ، اِدھر آ، میرے پہلو میں میرے جسم سے اپنے جسم کو لا کر لپٹ جا"

نوبہار ــــــ "ملکۂ عالم میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ میں کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ جو ملکہ کے قدموں تک پہونچنے کے خیال سے کانپنے لگے اس کا کیا حال ہوگا۔ اگر اس کا جسم ملکہ کے جسم سے مس ہو جائے"

یہ سنکر ملکہ دفعتہً اُٹھ بیٹھی اور بولی کہ "نوبہار نہیں آج میں نہ مانونگی۔ تیرا کوئی عذر نہ سنونگی۔ میں نے تجھے کنیزوں کے حلقہ سے نکالکر مشیرانِ خصوصی کے زمرہ میں اسی لیے شامل کیا ہے کہ تیرے دل سے کنیز ہونے کا بار ہلکا ہو جائے، اور تو ایک معزز خاتون کی حیثیت سے میری جلوت و خلوت میں میرے جسم و روح دونوں کی شریک ہو سکے۔ لیکن تیری تہذیب تو میرے لیے ایک عذاب ہو کر رہگئی ہے۔ ایک آہنی دیوار ہے جو مجھے تجھ سے ملنے ہی نہیں دیتی"

نوبہار ــــــ "ملکۂ عالم کی ان شاہانہ عنایات کا شکریہ ادا کرنا حقیقتاً میرے امکان سے باہر ہے۔ اور میں واقف ہوں کہ ملکہ نے میرے مرتبہ کو استحقاق سے بہت زیادہ بلند کر کے کس طرح ایک ذرہ کو دفعتہً آفتاب بنا دیا لیکن باوصف اس کے جب ملکہ مجھے اپنے نرم و نازک جسم چھونے کا حکم دیتی ہے تو میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ میرا دل۔ میری روح اور میرے جسم کا تمام خون اس سرِ انگشت کو توڑ کر باہر نکل جانا چاہتا ہے جسے ملکہ کے معطر جسم کے چھونے کا فخر حاصل ہونے والا ہے۔ اس وقت میرے اعصاب میرے ہاتھ کی رگیں اور میری قوت گرفت سب میرے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ اور اس ہیجان کو ضبط کرتے وقت میری وہی حالت ہوتی ہے جیسے دفعتہً کسی کی گردن پر چھری پھیر دی جائے اور ایک بھیانک آواز کے ساتھ خون کا فوارہ اس کے حلقوم سے بلند ہو۔ لے ملکۂ عالم میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہے، لیکن اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں کہ ملکہ کے حضور میں، میں اپنی نسائیت بالکل کھو دیتی ہوں، اور میں اپنے اندر کچھ ایسے مردانہ جذبات پیدا ہوتے دیکھتی ہوں، جن کے اظہار کی مجھ میں جرأت نہیں۔ اور...."

ملکہ ــــــ "مردانہ جذبات! میں نہیں سمجھی۔ کس قدر عجیب بات ہے۔ ایک عورت میں مردانہ جذبات! صاف صاف کہہ یہ مردانہ جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ میں سننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کیفیت ہے جو صرف مردوں سے مخصوص سمجھی جاتی ہے، لیکن ہاں تو نے ایک عورت ہو کر یہ کیسے معلوم کیا کہ وہ جذبات مردانہ ہیں؟ مردانہ، مردانہ! اُف کس قدر مکروہ، کیسا قابلِ نفرت لفظ ہے۔ (چیں بجبیں ہو کر) اے نوبہار، یہ تو نے کیا کہا۔ میری خلوت میں یہ کس نامبارک چیز کا ذکر کیا۔ (نوبہار کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھ میں پکڑ کر) بتا، جلد بتا، وہ کیا کیفیت ہے جسے تو اس نابکار جنس سے منسوب کرتی ہے، میں بھی......"

(ملکہ کے ہاتھوں کی گرفت دفعتہً ڈھیلی پڑ جاتی ہے، لہجہ کی خشونت نرمی میں تبدیل ہونے لگتی ہے، اور کچھ خوفزدہ سی ہو کر، پھر مسہری پر منھ ڈھک کر پڑ جاتی ہے۔ پندرہ منٹ تک دونوں جانب سکوت طاری رہتا ہے۔ اور پھر ملکہ نوبہار کو مخاطب کر کے کہتی ہے)

" نہیں، میں نہیں سننا چاہتی، اپنے سوال کا جواب تجھ سے نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ واقعی تیرے جسم میں وہ خون نہیں ہے، جو عام عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ میں خود تیرے جسم کو چھو کر کپکپی سی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ ایک خاص قسم کی گرم رو میرے جلد کے اندر سے ہو کر قلب تک دوڑنے لگتی ہے۔ خیر ہوگا۔ اب تو مجھے کوئی کہانی سنا، لیکن اس زمانہ کی نہیں، بلکہ اس قدیم عہد کی جب ایک بادشاہ اپنے شہزادہ کو وزیر زادہ کی معیت میں شکار کی اجازت دیتے ہوئے نصیحت کیا کرتا تھا کہ فلاں جنگل میں پہونچکر

داہنے ہاتھ کا راستہ مت اختیار کرنا۔ لیکن وہ نہیں مانتا تھا، اور جب آگے بڑھ کر دریا میں اسے لعل بہتے ہوئے ملتے تھے تو وہ ان کا پتہ چلاتے ہوئے کسی باغ میں پہونچتا تھا۔ جہاں ہر شخص پتھر کا ہوتا تھا۔ اور پھر وہ محل کے اندر پہونچکر کسی شاہزادی کا کٹا ہوا سر چھت سے معلق پاتا تھا جس خون کے قطرے نیچے پانی میں ٹپک ٹپک کر لعل بنجاتے تھے۔ اور بہہ بہہ کر دریا میں چلے جاتے تھے۔

نوبہار —— "لیکن ملکۂ عالم! ان کہانیوں میں ایک بڑی خرابی ہے اور وہ یہ کہ ہمیشہ شاہزادہ دیو سے جنگ کر کے اس شاہزادی کو آزادی دلاتا تھا اور پھر اس سے شادی کر کے خوش و خرم اپنے گھر واپس آتا تھا۔"

ملکہ —— "ہاں، یہ تو ہے۔ میں اُس وقت بھی جب بہت چھوٹی تھی اور میری دایہ اس قسم کی کہانیاں سنایا کرتی تھی تو میں اُس سے لڑا کرتی تھی کہ نہیں ان کہانیوں کا آخری حصہ جھوٹ ہے۔ شاہزادی نے کبھی اس سے شادی نہ کی ہوگی۔ بلکہ صاف جواب دیدیا ہوگا یہ کہانیاں مردوں کی بنائی ہوئی ہیں، ورنہ کیا شکار کے لیے باہر نکل کر کبھی کوئی شاہزادی داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار نہ کر سکتی تھی کہ وہ کسی شاہزادہ کو مصیبت سے نجات دلائے اور پھر جب وہ شادی کی درخواست کرے تو یہ برہم ہو کر چلی آئے۔ اچھا اسے جانے دو، کوئی اور کہانی سہی۔"

نوبہار —— "اجازت ہو تو میں خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں، لیکن اس میں بھی مرد کا ذکر ضرور آئیگا، کیونکہ دنیا کی کوئی بات اس وقت تک مکمل ہوتی ہی نہیں جب تک مرد عورت دونوں نے ملکر اس کو واقعہ نہ بنایا ہو۔"

ملکہ —— "اگر کوئی ایسا واقعہ تیری زندگی کا ہے تو سنا۔ میں اُسے سنونگی، لیکن اگر مجھے اس درمیان میں نیند آجائے تو تو چلی نہ جانا یہیں سو رہنا۔"

نوبہار —— "ملکۂ عالم، اس وقت میری عمر ۲۲ سال کی ہے، اب سے ۵ سال قبل کی بات ہو کہ میرے محلہ میں ایک نو وارد شخص آکر رہا، اُسکی عمر بھی تقریباً وہی تھی جو میری۔ یہ اپنے پیشہ کے لحاظ سے ایک نقاش تھا۔ لیکن اپنی صورت کے اعتبار سے وہ خود قدرت کا ایک بہترین نقش تھا۔ ہمارا قصبہ چونکہ مناظر فطرت کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اسلیے وہ وہاں کے نقوش لینے آیا تھا اور کم از کم چھ ماہ اسے ٹھہرنا تھا۔ چونکہ میرے والدین کو بھی اس فن سے خاص لگاؤ تھا، اس لیے آپس میں بہت جلد مراسم پیدا ہو گئے اور اس کی آمد و رفت شروع ہو گئی

وہ بات بہت کم کرتا تھا۔ لیکن جو بات کرتا تھا ایک شاعر کی طرح اس کے دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ میری طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تو اُسکی آنکھیں مجھے ایسی نظر آتیں جیسے کوئی عمیق سمندر ہے جس کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔"

ملکہ (بات کاٹ کر) بالکل صحیح یہی کیفیت تیری نگاہوں کے سامنے میری ہوجاتی ہے۔ لیکن مجھے اس وقت تک یہ الفاظ اس کیفیت کے ظاہر کرنے کے لیے نہ ملے تھے، میں زیادہ سے زیادہ شعلہ کی گرمی سے شمع کا پگھلنا کہہ سکتی تھی۔ اچھا پھر کیا ہوا؟

نوبہار —— "دن گزرتے گئے، معلوم نہیں کتنی شامیں میں نے اس سے باتیں کر کے گزار دیں۔ ایک صبح وہ میرے مکان پر آیا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ لیکن بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ میرے والدین کسی تقریب سے دوسری جگہ گئے ہوئے تھے۔ میں گھر پر

تنہا تھی۔ اُس نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ اور ایک ایسی نگاہ سے جس میں حزن و ملال کے ساتھ خاص قسم کا جذباتی جوش بھی پنہاں تھا۔۔۔"

ملکہ ــــ "یہ جذباتی جوش کیا چیز ہوتی ہے"

نوبہار ــــ "ملکۂ عالم بس اب آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے کس کیفیت کا اظہار ان الفاظ سے کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس کی نگاہوں میں کوئی ایسی کیفیت تھی۔ جیسے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہو، کوئی پیام پہونچانا چاہتا ہو۔ اگر بغیر الفاظ کی مدد کے کوئی گفتگو ہو سکتی ہے تو اسکی نگاہیں یہی گفتگو کر رہی تھیں اور اگر بغیر سامعہ کی مدد کے کوئی بات سنی جا سکتی ہے تو ملکۂ عالم کو باور کرنا چاہیے کہ میں وہ بات سن رہی تھی۔

ملکہ ــــ "وہ کیا بات تھی؟

نوبہار ــــ "کیا عرض کروں وہ کیا بات تھی۔ بات کیا تھی ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی۔ خون میں سُرعت دوران کی، روح میں بالیدگی کی اور احساس میں اُس شگفتگی کی جو صبح کو نسیم کے چھو جانے کے بعد کلی میں پیدا ہونے لگتی ہے، اُس کی ہر نگاہ مجھ پر وہ اثر کر رہی تھی جو شعاع آفتاب کسی پارۂ یخ پر کر سکتی ہے۔ اس نے دیر تک مجھے دیکھتے رہنے کے بعد کہا کہ "آج میں رخصت ہونے آیا ہوں ــــ میں جو کبھی اس کے سامنے آزادی سے بات نہ کر سکتی تھی۔ یہ سنکر دفعتہً گھبرا گئی اور بولی "ابھی سے" وہ یہ سنکر مسکرایا اور میں شرما گئی۔

وہ دیر تک خاموشی سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی ساحل پر بے خبر کھڑا ہو۔ اور دفعتہً سیلاب آکر اُس کو بہا لیجائے۔ اُس نے مجھ سے قریب آکر میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیلئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اعضا کی جان کسی نے نکال لی ہے۔"

ملکہ یہ سنتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ نوبہار کے ہاتھوں میں دیکر بولی "سچ بتا، یہ تو اپنا حال بیان کر رہی ہے یا میرا؟

نوبہار ــــ "ملکۂ عالم جو کیفیتیں مجھ پر گزری ہیں۔ وہی عرض کر رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کے ساتھ میں کسی دوسرے کا حال کیونکر بیان کر سکتی ہوں۔"

ملکہ ــــ "نوبہار، یقین کر۔۔۔۔ کہ اگر میں کچھ کہہ سکتی، تو زیادہ سے زیادہ یہی کہتی جو تو کہہ رہی ہے۔ آہ تو نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تو نے کبھی شراب پی ہے؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ شراب پینے کے بعد جب رات کو دفعتہً خمار کے عالم میں آنکھ کھل جاتی تو تشنگی کا کیا عالم ہوتا ہے اور اس وقت سرد پانی کا ایک ایک گھونٹ کس قدر لطف دیتا ہے۔ باور کر کہ تیری طرف سے میری تشنگی کی کیفیت بالکل یہی ہے اور جب تو میرے پاس نہیں ہوتی تو میرا حال وہی ہوتا ہے جو پانی سے دور رہنے والے مستسقی کا۔

نوبہار ــــ "یہ ملکہ کی عنایت ہے، شاہانہ التفات ہے جس پر میری خوش بختی جس قدر ناز کرے کم ہے لیکن اے میری معبودۂ قلب و روح۔ یہ مہربانیاں جس قدر بڑھتی جا رہی ہیں، میرا خون اسی قدر خشک ہوتا جاتا ہے کہ اگر مبادا کسی وقت ملکہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ، یہ الطاف و عنایات بالکل رائیگاں صرف کیئے گئے اور اُس ہستی کو مورد کرم بنایا گیا جو اسکی اہل نہ تھی تو پھر میرا کیا انجام ہوگا۔ اور ملکہ کی برہمی کا کیا عالم"

ملکہ —" اے نوبہار جس وقت تک تو میرے پاس نہ تھی، میں سمجھتی تھی کہ زندگی نام ہے صرف ریگزار کی سی وحشت کا - بے آب وگیاہ سرزمین کی سی خشکی کا - لیکن تیرے آتے ہی میں دیکھتی ہوں کہ اس ریگستان سے بہت سے چشمے پھوٹ نکلے ہیں - جو میری زندگی کے صحرا، میری ہستی کے ویرانہ کو دعوتِ بہار دے رہے ہیں - میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا چیز ہے جو مجھے تیری طرف اس قدر کھینچ رہی ہے، تجھ میں وہ کونسی بات ہے جو میرے دل میں خاص قسم کا گریہ آمیز گداز پیدا کرتی ہے، جب تو پاس نہیں ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندر ہی اندر میرے دل کو مسوس رہا ہے، بھینچ رہا ہے - اینٹھ رہا ہے اور اس وقت جو سانس میرے سینہ سے نکلتی ہے وہ غیر معمولی طویل اور عجیب قسم کی سردی لیے ہوتی ہے - پھر یہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتی ہوں کہ اگر واقعی محبت بھی کسی ایسی مجبور کن کیفیت کا نام ہے تو دنیا میں کسی محبت کرنے والے کا جان دیدینا بالکل قرین عقل ہے اور اسکو ستانا انصاف سے دور ہے -"

نوبہار —" ملکۂ عالم، کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ کل مرزا شاہرخ کے کاغذات پر کیا فرمان شاہی نافذ ہوا؟"

ملکہ یہ سنکر مسکرائی اور پھر سنجیدگی کے ساتھ بولی " اس میں شک نہیں کہ شاہرخ کا نیلوفر کے ساتھ یوں مخفی طور شادی کر لینا، میرے ذاتی جذبات کی بنا پر نہایت سنگین جرم ہے - اور نیلوفر کے والدین کی برہمی بالکل حق بجانب ہے، لیکن جو مرافعہ شاہرخ اور نیلوفر کی طرف سے پیش ہوا ہے، وہ ہر چند اس سے قبل مجھ سے کوئی رحم نہ حاصل کر سکتا تھا - اور اب بھی شاید زیادہ کامیاب نہ ہو لیکن کم از کم مجھے یہ خیال ضرور پیدا ہو چلا ہے کہ انسان واقعی بسا اوقات مجبور ہو جاتا ہے اور مجبوری کی معصیت ایک حد تک ضرور قابل غور ہے - میرا ارادہ تھا کہ تجھے میں وہ کاغذات دکھاؤنگی، لیکن بھول گئی - کل میں نے شاہرخ اور نیلوفر دونوں کی حاضری کا حکم دیا ہے - اور تیرے ہی سامنے میں اس معاملہ کا فیصلہ کروں گی -"

نوبہار —" کیا ملکۂ عالم، مجھے بتائیں گی کہ نیلوفر کے والدین نے بارگاہ ہمایوں میں کیا فریاد پیش کی ہے؟"

ملکہ —" یہی کہ بغیر ان کی رضامندی کے شاہرخ نے نیلوفر کو اپنی طرف مائل کر کے شادی کر لی -"

نوبہار —" تو کیا سرزمین شبنمستان میں یہ کوئی جرم ہے؟"

ملکہ —" یقیناً سخت جرم ہے اور اس کی سزا مرد کے لئے قصاص ہے اور عورت کے لئے ہمیشہ کے لئے مجرد رہنے کا عہد و پیمان"

نوبہار —" تو کیا واقعی ملکہ، شاہرخ کے قتل کا حکم دیدینگی اور کیا نیلوفر، نوجوان نیلوفر ایک راہبۂ معبد کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جائے گی؟"

ملکہ —" انصاف اور قانون کا منشا تو یہی ہے؟"

نوبہار —" کیا یہ قانون ملک شبنمستان کا دیرینہ قانون ہے؟"

ملکہ —" نہیں، یہ صرف میں نے اپنے عہد میں نافذ کیا ہے -"

نوبہار —" تو کیا ملکہ ایسے قانون کو منسوخ نہیں فرما سکتیں؟"

ملکہ ——— "لیکن منسوخی کا سبب"

نوبہار نے غور سے ملکہ کو دیکھا۔ اور پھر اپنا ہاتھ ملکہ کے ہونٹوں تک لیجا کر ان کو ایک نہایت نرم جنبش سے مل کر کہا کہ "آہ ان خوبصورت ہونٹوں سے یہ کریہہ الفاظ، ان نرم و نازک لبوں سے ایسی کرخت و درشت باتیں۔ اُن گلاب کی پنکھڑیوں سے یہ نکہت تلخ و ناگوار۔"

نوبہار کے ہاتھ کا ملکہ کے ہونٹوں سے مس ہونا تھا کہ وہ بیتاب ہو گئی۔ اور بالکل بے اختیارانہ نوبہار کو اپنی آغوش میں کھینچکر اس کے لبوں کا ایک طویل اور گرم بوسہ لیا اور اسطرح بے قابو ہو کر گر پڑی جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

(باقی) نیاز

نگارستان (دوسرا ایڈیشن) حضرت نیاز کے وہ متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں، نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت ۲ؔ

گہوارۂ تمدن۔ (دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ رفتار تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے، اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ؔ

شہاب کی سرگزشت۔ حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخئیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ؍

فراست الید۔ مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اُسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ؍

شاعر کا انجام۔ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، قیمت علاوہ محصول ۱۰؍

جذبات بھاشا۔ جناب نیاز نے ایک عجیب تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اُنکی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲؍

تذکرۂ خندۂ گل۔ مؤلفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰ سے زائد اُردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع اُنکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت عہ محصول سے

صحابیات۔ جس میں عہد سعادت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات لکھکر دیئے گئے ہیں، اسکا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ؔ

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

کشمیر

(جناب مرتضیٰ علی صاحب)

اس وقت کشمیر کا مسئلہ ہر شخص کی زبان پر ہے، غالباً بے محل نہ ہوگا اگر آپ نگار میں اس سرزمین کے تاریخی حالات مختصراً قلمبند کر دیں۔

(نگار) کشمیر نام ایک وسیع وادی کا ہے جو ہمالیہ کے شمالی مغربی حصہ میں واقع ہے۔ اس کا طول تقریباً ۸۴ میل اور عرض ۲۰ اور ۷۵ میل کے مابین ہے۔ اس کا رقبہ ۱۹۰۰ مربع میل ہے۔ اور اس کی سطح تقریباً ۶۰۰۰ فٹ سطح آب سے بلند ہے۔

کشمیر کے بالکل ابتدائی حالات نامعلوم ہیں، اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار سال کی تاریخ کا علم اس وقت تک حاصل ہو سکا ہے۔ قدیم ترین ذریعہ معلومات، کلہان کی منظوم تاریخ۔ راج ترنگیتی ہے، جو اب بالکل نایاب ہے اور جسے اسٹین نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ علاوہ اس کے چینی سیاح یو انگ چو انگ کا سیاحت نامہ، تاریخ البیرونی آئین اکبری، تزک جہانگیری اور تاریخ برنیر سے بھی یہاں کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ سکوں کا جو ذخیرہ ہے ان سے بھی سلسلہ دار ہندو، مسلمان، مغل، درانی اور سکھ فرمانرواؤں کے حالات کا کچھ نہ کچھ پتہ چلتا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب بات تاریخ کشمیر میں یہ نظر آتی ہے کہ بڑے بڑے فاتحین میں سے کسی نے اس حصۂ زمین پر قبضہ نہیں کیا، سکندر اعظم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، محمود غزنوی اس پر قابض نہ ہوا۔ چنگیز خاں، تیمور، اور بابر بھی یونہی اس سے گزر کر چلے گئے۔ البتہ جب اکبر نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کیا تو اس سلسلہ میں کشمیر بھی آ گیا۔ اسی طرح نادر شاہ نے بھی اس وادی کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ احمد شاہ درانی اور اس خاندان کے دوسرے فرمانرواؤں نے البتہ یہاں مستقل حکومت قائم کر لی تھی، جسے آخر آخر سکھوں نے ختم کر دیا۔

افلاطون سے قبل یہاں کے عہد عتیق کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ کیونکہ سکندر اعظم کے مورخین نے اس کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ افلاطون نے البتہ ظاہر کیا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں یہاں ایک قومی حکومت قائم کی تھی، جو شمالی ہند کی سلطنت خاندان کُشن کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ اس نے اس حصۂ زمین کا نام کسپیر یا بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ دریائے بداسپس (یعنی جہلم)، سنداِس (دریائے چناب) اور ایرونی (دریائے راوی) کے منبع سے نیچے واقع ہے۔

اس سے قبل کا کوئی حال صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن یقین کرنے کے اسباب موجود ہیں کہ مسیح سے ۲۵۰ سال قبل کشمیر سلطنت اشوکا کے زیر اثر تھا۔

شہنشاہ اشوک کے زمانہ میں ۲۴۵ ق م کے قریب بدھ مذہب کے داعی کشمیر بھیجے گئے تھے، اور کشمیر اشوک کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ بارہ مولا کو جانے والے راستہ کے قریب ہی بمقام مانسہرہ اشوک کا ایک کتبہ پایا جاتا ہے۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ شہر سرینگر اشوک نے آباد کیا تھا۔ اگرچہ اس کا اصلی مقام "پراناد ھستان" جو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے بعد کشانی خاندان کے راجاؤں ہوشک، جشک، اور کنشک نے سن عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں کشمیر پر حکومت کی۔ پانچویں اور دسویں صدی کے درمیان کشمیر میں ہندو مندر تعمیر ہوئے چھٹی اور ساتویں صدیوں کے درمیان کشمیر میں چینی سیاح آئے۔ ان میں سے ایک چینی سیاح کشمیر کے راجہ کا مہاوت تھا۔ ہوان چوانگ کشمیر میں ۶۳۱ء سے ۶۳۳ء تک رہا۔ اس نے اسکا نام "کاسی میلو" تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد کی صدی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرمانروایان کشمیر کچھ عرصہ تک چین کے باجگذار رہے تھے۔

چھٹی صدی کے اوائل میں کشانی خاندان کی حکومت کا تختہ ہن قوم نے اُلٹ دیا۔

ساتویں صدی میں جب مشہور چینی سیاح یوان چانگ کشمیر میں پہونچا تو اس وقت وہاں کا راجہ درلبھ تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہاں ایک سو بودھ مذہب کی خانقاہیں تھیں آٹھویں صدی میں کشمیر سے چین کے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے چنانچہ ۷۱۳ء میں چین سے وہاں ایک سفارت بھی آئی تھی ۷۲۰ء کے بعد سلطنت چین نے کشمیر کے راجہ کو باقاعدہ تسلیم کر لیا۔ چین کی سب سے آخری سفارت ۷۵۹ء میں کشمیر آئی اس وقت وہاں کارکوٹک خاندان کی سلطنت تھی ۷۱۳ء میں کشمیر پر عرب حملہ آوروں نے یورش کا ارادہ کیا۔ اسی وجہ سے وہاں کے راجہ نے شہنشاہ چین سے امداد طلب کی تھی اور وہاں سے سفارت آئی تھی۔ محمد بن قاسم یلغاریں کرتا ہوا دامن کوہ ہمالیہ تک جا پہونچا تھا مگر اس سے آگے نہ بڑھا

بلاذری نے لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے زمانہ میں ہشام بن عمر التغلبی امیر سندھ نے کشمیر اور ملتان فتح کر لیا۔ بعد ازاں کشتیوں کے ذریعہ سے نیچے اُتر کر اُس نے قندھار پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ اس واقعہ کی تصدیق یعقوبی نے بھی کی ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفتوحہ علاقہ وہ حصہ تھا جو وادی جہلم کے جانب مغرب واقع ہے۔ خاص کشمیر نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی صدیوں تک کشمیر میں ہندوؤں کی حکومت جاری رہی۔ ان ہندو راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور راجہ اَونتی وَرمن تھا جس نے اونتی پور آباد کیا تھا۔ اس راجہ نے ۸۵۵ء سے ۸۸۵ء تک حکومت کی تھی ۱۰۱۳ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے شاہی خاندان کے آخری راجہ ترلوکن پال پر حملہ کیا تو راجہ مذکور کی مدد کشمیر نے بھی اپنی فوج بھیجکر کی تھی۔ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کشمیر کا راجہ ہرش (۱۰۸۹ء لغایتہ ۱۱۰۱ء) مسلمانوں کے زیر اثر آ گیا۔ اس راجہ نے اپنی فوج میں ترک سپاہی بھرتی کئے۔ اور ہندوؤں اور بودھوں کے بت توڑ دیئے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلسل سازشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے ملک کی حالت خراب ہو رہی تھی اسی وجہ سے راجہ نے ترکی سپاہی بھرتی کیے تھے۔ ورنہ ہندو راجہ بت شکن کیونکر ہو سکتا ہے۔

۱۳۰۵ء میں تاتاریوں نے ذوالقدر خاں کے ماتحت کشمیر پر حملہ کیا اس کے بعد ۱۳۲۴ء شاہ میر سواتی افغانوں کی فوج لیکر چڑھ آیا۔ تخت و تاج چھین لیا اور خود شمس الاعظم کے نام سے سلطنت کرنے لگا۔ اس وقت سے کشمیر میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ مگر مسلمانوں نے نہایت بے تعصبی اور رواداری سے کام لیا۔ اور ہندؤں کے ہاتھ میں بڑے بڑے عہدے رکھے۔

سکندر شاہ کے زمانہ میں (۱۳۸۶ء لغایۃ ۱۴۱۰ء) معاملات بدل گئے۔ یہ بادشاہ سخت پابند مذہب اور متعصب تھا اس نے ہندؤں کو ستایا اور ان کے مندر توڑ دئے۔ یہ بادشاہ "بت شکن" کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن سلطان زین العابدین کے زمانہ میں (۱۴۱۷ء لغایۃ ۱۴۶۷ء) حالت پھر بدلی۔ یہ بادشاہ ہر صورت سے نہایت اچھا تھا۔ ہندؤں سے بے تعصبی اور رواداری برتتا تھا۔ اس کا عہد کشمیریوں میں بہترین عہد کہلاتا ہے۔ یہ بادشاہ نہایت عدل گستر اور رعایا پرور تھا۔ اس نے سڑکیں، نہریں اور پل بھی تعمیر کئے اس وقت تک کشمیر کے سکوں پر لفظ "سلطان" درج ہوتا تھا مگر اس کے بعد حسین شاہ محمد علی اور محمد یوسف نے اپنے سکوں پر لفظ "بادشاہ" لکھوایا۔

جب بابر شاہ نے شمالی ہند پر تسلط قائم کیا تو اس کی توجہ کشمیر کی طرف ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک مہم بھیجی جسے کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے مقابلہ سے فرار ہوا تو کاشغر کے فرماں روا خاندان کے ایک رکن حیدر مرزا نے ہمایوں کو ترغیب دی کہ وہ کشمیر پر حملہ کرکے قابض ہو جائے۔ مگر ہمایوں اس وقت ایسا نہ کر سکا۔ لیکن خود حیدر مرزا نے شمال کی جانب سے کشمیر پر حملہ کیا اور فتح کرکے بنام ہمایوں سلطنت کرنے لگا۔ ۱۵۵۱ء میں بغاوت ہوئی اور حیدر مرزا قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد شہنشاہ اکبر نے کشمیر پر حملہ کیا اور ۱۵۸۶ء میں فتح کرکے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا، اس کے بعد شہنشاہ جہانگیر نے وادی کشمیر کو اس قدر پسند کیا کہ اسے اپنا گرمائی صدر مقام بنا لیا۔ اس بادشاہ نے وہاں بہت سے محل تعمیر کئے اور باغ لگوائے اور ڈل کے کنارہ باغ لگاکر کشمیر کو جنت نظیر بنا دیا۔ اسی بادشاہ نے کشمیر میں درخت چنار لگوایا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں بہت سی سرائیں علی مردان خاں نے تعمیر کرائیں۔ اور ڈل کے کنارے پہاڑ پر دارا شکوہ نے پری محل تعمیر کرایا۔ اورنگ زیب نے وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں جو اب تک موجود ہیں۔

تقریباً ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۷۵۶ء میں اس نے بلند خاں سدوزئی کو کشمیر میں اپنا گورنر مقرر کیا۔ مگر ۱۷۶۰ء تک شہنشاہ عالمگیر ثانی ہی کے نام کا سکہ جاری رہا۔ احمد شاہ کے نام کا پہلا کشمیری سکہ ۱۷۶۰ء کا ہے۔ ۱۸۱۴ء تک کشمیر میں درانیوں کی حکومت رہی۔ مگر اسی ۱۸۱۴ء میں فتح خاں بارکزئی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا، اگرچہ اس وقت بھی برائے نام سلطنت محمود شاہ اور ایوب شاہ کی تھی مگر در اصل سیاہ و سفید کے مالک بارکزئی سردار تھے۔

۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کرکے اس کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا اور اس طرح وہاں مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۸۲۰ء میں رنجیت سنگھ نے جموں راج کو ضبط کرکے وہاں کا انتظام ایک ڈوگرا راجپوت

مسمی گلاب سنگھ کے سپرد کردیا - اس شخص نے چھوٹی چھوٹی پہاڑی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرکے اپنی ریاست کو خوب وسعت دی - اور کشمیر میں بھی اپنا اثر قائم کرلیا - راجہ گلاب سنگھ نے کشتواڑ اور لداخ کے علاقہ بھی فتح کرلئے ۔

۱۸۴۵ء میں جب سکھوں سے انگریزوں کی جنگ چھڑی تو راجہ گلاب سنگھ بالکل الگ رہا اور جب مہاراجہ دلیپ سنگھ سے صلح ہوگئی تو میجر لارنس کے مشورہ سے وادی کشمیر اور وادی سندھ کے درمیان کا کل علاقہ پنجاب سے علیحدہ کرکے ایک ریاست بنادی گئی ۱۸۴۶ء میں ایک عہدنامہ ہوا جس کی رو سے مندرجۂ بالا ریاست راجہ گلاب سنگھ کو دے دی گئی - گلاب سنگھ نے خراج دینا اور برطانوی گورنمنٹ کی سیادت کو قبول کرلیا اور کئی کرور روپیہ بھی انگریزوں کو دیا اس زمانہ سے " ریاست جموں وکشمیر " کی جدید تاریخ شروع ہوتی ہے

مہاراجہ گلاب سنگھ کو کشمیر پر تسلط جمانے میں بڑی دقتیں پیش آئیں - وہاں کی سرکش بومبا قوم نے امام الدین گورنر کی ماتحتی میں سخت مزاحمت کی اور گلاب سنگھ کی فوج کو شکست دیدی - مگر جب انگریزی فوج جموں میں بھیجی گئی تو مہاراجہ گلاب سنگھ نے رفتہ رفتہ اپنا تسلط تمام ریاست پر جمالیا - مگر اس کو کئی سال لگے - ۱۸۵۷ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کا انتقال ہوگیا - اور ان کی جگہ ان کے صاحبزادہ مہاراجہ رنبیر سنگھ تخت نشین ہوئے - اور اس طرح یہ حکومت اسوقت تک ڈوگرا خاندان میں چلی آتی ہے -

---

مطبوعات موصولہ

تجلیات فرخ

ناظرین نگار جناب فرخ بنارسی کے نام نامی سے نا آشنا نہ ہوں گے کیونکہ نگار میں اکثر ان کی غزلیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ مجموعہ انھیں کے قصاید و غزلیات و رباعیات کا ہے۔

جناب فرخ اس عہد کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بہت سنجیدہ ہیں اسی طرح انکی شاعری بھی متین خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ وہ معمولی پیش پا افتادہ جذبات کی طرف بہت کم اعتناد کرتے ہیں اور چونکہ وہ ہمیشہ بلند اور اچھوتی فکر کے ساتھ اپنے شعر کی ابتدا کرتے ہیں اسلئے لازماً ان کے اسلوب بیان کو بھی بدیع ہونا چاہئے اور ہوتا ہے چنانچہ وہ اگر کبھی کوئی معمولی بات ظاہر بھی کرتے ہیں تو اپنے انداز بیان سے اس میں خاص شگفتگی و ندرت پیدا کر دیتے ہیں مثلاً عاشق کا افسانہ ہمیشہ سوز شمع و بیتابی پروانہ سے شروع ہوتا ہے لیکن فرخ صاحب محض اپنے انداز بیان سے اس میں اس طرح تازگی پیدا کر دیتے ہیں کہ

اضطراب برق، سوز شمع، پروانے کا شوق مختلف عنوان نے کر میرا افسانہ بنا

داستان عشق کے اختصار و اطناب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن فرخ صاحب کا انداز بیان ملاحظہ ہو:-

فرخ اک آہ کھینچ کے خاموش ہو گیا پھر بھی انھیں گلہ ہے کہ قصہ دراز تھا

میں اس وقت کسی بسیط تبصرہ کے لئے تیار نہیں اس لئے اسکو کسی صحبت آیندہ پر ملتوی کرتے ہوے صرف چند اشعار یہاں نقل کئے دیتا ہوں جس سے ارباب نظر کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی شاعری کس قدر بلند، ان کی تلاش کس درجہ وسیع اور ان کے جذبات اپنے معنی کے لحاظ سے کتنے عمیق ہیں:-

ہوش جب آیا فنا کا اور سودا بڑھ گیا نشۂ ہستی اُترنے پر بھی اتنا تیز تھا
اجل نے قصۂ غم نا تمام چھوڑ دیا یہیں سے سلسلۂ داستاں نہیں ملتا
جس نے دیکھا ہی نہیں وہ مجھکو کیونکر جانتا دیکھنے پر بھی تو کوئی حسن کا محرم نہ تھا
ہو گیا دم بھر میں فرخ کچھ سے کچھ رنگ چمن خندۂ گل میں خدا معلوم کیسا پیغام تھا

الغرض تمام دیوان اسی قسم کے نادر افکار سے لبریز ہے اور وہ حضرات جو صحیح رنگ تغزل کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُن کو ضرور ایک نگاہ اس پر ڈال لینا چاہئے۔ شروع میں جناب رضی بدایونی کا تبصرہ اور مولوی ضیا احمد صاحب ایم۔ اے کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ جناب فرخ کی تصویر بھی ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کے کس دور شاعری سے متعلق ہے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور علی ہادی صاحب لپسر مصنف سے محلہ انصار اناؤ کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

آنکھ کا نور اور دوسرے افسانے

جناب افسر میرٹھی کے نو افسانوں کا مجموعہ جسے ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس میرٹھ نے نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں جناب افسر کے جتنے

ہیں وہ سب مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں اور ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ جناب افسر کی فسانہ نگاری کی خصوصیت زبان کا سُبک و لطیف اور پلاٹ کا عامۃ الورود واقعات پر منحصر ہونا ہے اس لئے قدرتاً وہ ہر شخص اور ہر عمر کے انسان کو پسند آتے ہیں میں تو جب انکو پڑھتا ہوں تو مجھے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی الاؤ کے پاس بہت سے لوگوں کے ساتھ میں بھی بیٹھا ہوا ہوں اور گاؤں کا کوئی تجربہ کار فرزانہ نہایت مشفقانہ انداز میں یہ دلچسپ کہانیاں سُنا سُنا کر رات کی سردی کو پُر لطف بنا رہا ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲؍ زاید نہیں۔

مولود ہمایوں

سیرۃ نبوی کے متعلق جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شروانی رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں مختصراً جناب سرورِ کائنات صلعم کی حیاتِ مبارک کے حالات ولادت سے ہجرت تک درج کئے گئے ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ سیرۃ نبوی پر اردو میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود اس کتاب کو کسی خاص نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اسرا یا معراج پر گفتگو کرتے ہوئے مخالفین اسلام کی نکتہ چینیوں کا بھی جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن صرف اس طرح کہ ہندوؤں کی بعض کتابوں سے اُنکے اکابر کا بھی اپنے خاکی جسم کے ساتھ خدا کے پاس پہونچنا دکھایا ہے۔ ہماری رائے میں اس نوع کے استدلالات تمثیلی پیش کرنے سے بہتر یہ تھا کہ اس موضوع کو ہاتھ ہی نہ لگایا جاتا، کیونکہ ایک بڑا اعتراض واقعۂ معراج پر یہی ہے کہ یہ خیال دوسرے مذاہب سے لیا گیا ہے علاوہ بریں اس استدلال کی رُو سے پہلے ہندوؤں کی روایات مذہبی کو صحیح ماننا ضرور ہوجائے گا لیکن وہ شخص جو اُن کو بھی نہ مانتے وہ کیونکر اس دلیل سے مطمئن ہوسکتا ہے۔ یہ استدلال زیادہ سے زیادہ ہندوؤں کے سامنے پیش ہوسکتا ہے، وہ شخص جو کسی مذہب کا ماننے والا نہ ہو اُس پر اس کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب مطبع عہد آفریں حیدرآباد سے ۱۲؍ میں مل سکتی ہے۔

جام صہبائی

جناب عبدالسمیع صاحب اثر صہبائی بی۔ اے کے رباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے اور ۸؍ میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے۔ غالب کے زمانہ میں فارسی نظم و نثر کے نہایت مشہور اُستاد امام بخش صہبائی ہوئے ہیں جنکے متعلق غالب کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ "مولانا نے بھی کیا عجیب و غریب تخلص رکھا ہے۔ عمر بھر ایک چلو بھی پینا نصیب نہیں ہوئی اور صہبائی تخلص رکھا ہے، قربان جایے اس اتقا کے اور صدقے جائیے اس تخلص کے" لیکن ہمارے اثر صاحب صہبائی کے متعلق اس قسم کی تنقید نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اگر انھوں نے کبھی پی نہیں، تو کم سے کم پینے والوں کا سا کلام ضرور کہتے ہیں اور پورے لطف و سرور کے ساتھ۔ اس مجموعہ کی اکثر رباعیاں خمریات سے متعلق ہیں اور خوب ہیں۔

اقبال نامۂ جہانگیری

جہانگیر کے بخشی معتمد خاں کی اس مشہور تصنیف پر ایک بسیط ریویو نگار کے فاضل مقالہ نگار خصوصی مولوی عبدالمالک آروی کے قلم سے حال ہی میں نکل چکا ہے۔ اب یہ کتاب مولوی

محمد رفیع صاحب کی تصحیح وادارت سے رائے صاحب رام دیال اگروالہ الہ آباد کے مشہور پبلشر نے شائع کی ہے اور ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔ مولوی محمد رفیع صاحب نے اس کتاب کی تصحیح وتہذیب میں بہت کاوش سے کام لیا ہے اور نہایت اچھے اسلوب کے ساتھ اس کی ترتیب کی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب تقریباً نایاب تھی اس لئے ارباب ذوق کو رائے صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ ان کی کوشش سے یہ مفید تاریخی کتاب ہر شخص کے دسترس سے قریب ہو گئی یہ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں رائے صاحب سے مل سکتی ہے۔

احقاق حق

یہ رسالہ مولوی محمد ادریس خاں صاحب نجیب آبادی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کی خود نوشتہ سوانح عمری پر (جس کا اردو ترجمہ تلاش حق کے نام سے ہو چکا ہے) ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے لیکن زیادہ تر مذہبی خیالات وعقائد کو سامنے رکھ کر۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اور وہ بھی ایسا مسلمان جس کے نام کا ضروری جزو لفظ مولوی بھی ہو وہ بھی کسی غیر مذہب والے کے خیالات وعقاید پر انصاف کے ساتھ تنقید نہیں کر سکتا، کیونکہ تنقید کے لئے پہلے اپنے آپ کو ہر مذہب وملت کے خیالات و اثرات سے بالکل خالی الذہن کر لینا ضروری ہے، اور یہ کم سے کم ایک مولوی سے کسی طرح ممکن نہیں،

اس تنقید کا ماحصل صرف یہ ہے کہ مہاتما گاندھی خواہ کتنے ہی آزاد خیال اور صاحب اخلاق حسنہ ہوں، لیکن ہیں بہر حال ہندو اور بت پرست، اور یہ ظاہر ہے کہ بت پرستی خواہ اس سے مراد خدا کی پرستش ہی کیوں نہ ہو، ایسا گناہ عظیم ہے کہ اگر ایک انسان ایک بار اپنے اخلاق کے لحاظ سے فرشتہ ہی کیوں نہ ہو جائے تو بھی دوزخ کا مزہ چکھے بغیر چھوٹ نہیں سکتا وہ لوگ جو مذہب کی اس مخصوص ذہنیت کے مطالعہ سے لطف اٹھانا چاہتے ہوں وہ ۲؍ کے ٹکٹ بھیجکر منیجر عبرت نجیب آباد سے طلب کر سکتے ہیں۔

محمد بیرم خاں ترکمان

اس کتاب میں ہمارے عزیز دوست مولوی حکیم علی نور صاحب چاندپوری نے اکبر کے اتالیق محمد بیرم خاں ترکمان کے حالات تاریخ کی معتبر ومتداول کتابوں سے تحقیق کرکے یکجا کر دئے ہیں۔ اس کتاب کی زبان سلیس، انداز تحریر شگفتہ اور طرز استدلال پاکیزہ ہے۔ مسرت کی بات ہے کہ جناب نور چاندپوری نے افسانوں کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر تاریخ کے مفید موضوع کو اختیار کیا اور ملک کے سامنے اپنی سعی وکاوش کا اچھا نمونہ پیش کیا۔ یہ کتاب جناب قاضی عزیز الدین صاحب وزیر دتیا کے نام معنون کی گئی ہے اور ان کی تصویر کے ساتھ عبدالرحیم خانخاناں (بیرم خاں کے بیٹے) کی بھی تصویر شامل کی گئی ہے، کتابت طباعت وغیرہ بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت کہیں درج نہیں ہے جن حضرات کو ضرورت ہو وہ خود جناب مؤلف سے تحصیل بیگم گنج ریاست بھوپال کے پتہ پر خط وکتابت کریں۔

فروغ بیاں

یہ مجموعہ ہے جناب شاد صابری کے منظومات کا۔ جناب شاد قصبۂ انبہٹہ ضلع سہارنپور کے ایک معزز ومعتمد خاندان کے فرد ہیں اور آجکل بسلسلۂ ملازمت کراچی میں مقیم ہیں۔ آپ جناب افسر امروہوی کے تلمیذ رشید ہیں، اور اپنے استاد کے رنگ سخن کے پیرو۔ جناب افسر امروہوی کے مجموعۂ نظم پر نگار ہی میں اس سے قبل کسی زمانہ میں ریویو شائع ہو چکا ہے۔ اور میں ان کے ذوق شاعری کا معترف ہوں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں ان کے کسی ایسے تلمیذ کے رنگ شاعری

پسند نہ کروں جس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ بالکل اپنے استاد کا متبع ہے۔ جناب قمر بدایونی کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے اور جناب شاد کی تصویر بھی ہے۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں خود مصنف سے میونسپل آفس کراچی کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

گناہ کی دیوار

یہ ایک ڈرامہ ہے جسے جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم۔ اے نے تحریر فرمایا ہے۔ اس سے قبل آپ کے ایک ڈرامہ "علم" سو پر نگار میں ریویو ہو چکا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مشکل ہی سے اردو میں فن تمثیل نگاری کے تمام داعیات کا کسی نے اتنا لحاظ کیا ہو جس قدر جناب قریشی کے پیش نظر رہتا ہے۔ اس ڈرامہ کا مقصود یہ ہے کہ اگر بعض حالات سے مجبور ہو کر کسی نیک نفس خاتون کی زندگی آلودۂ معصیت ہو جائے تو سوسائٹی کو اس پر رحم کرنا چاہئے ڈرامہ مختصر مگر مکمل، سادہ لیکن معنی خیز ہے۔ زبان بہت پاکیزہ ہے۔ لیکن کہیں کہیں غالباً نظر ثانی نہ کرنے کی وجہ سے یا کاتب کی اصلاح سے "قابل گردن زدنی" قسم کے فقرے نظر آجاتے ہیں۔ طباعت و کتابت وغیرہ کے متعلق کہنا بیکار ہے۔ کیونکہ اس خصوص میں جامعۂ ملیہ دہلی کافی داد حاصل کر چکا ہے۔ قیمت ۸ رہے۔

ہمزاد

یہ ڈرامہ بھی جناب قریشی ایم۔ اے کا لکھا ہوا ہے۔ جو پلاٹ کے لحاظ سے مختصر، گفتگو کے لحاظ سے پُر مزاح اور نتیجہ کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ سن و سال اور ذوق و مزاج کا خیال کئے بغیر شادی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اس کی قیمت ۶ر اور ملنے کا پتہ وہی مکتبہ جامعۂ ملیہ دہلی۔

کھیتی

یہ ڈرامہ جناب محمد مجیب صاحب بی۔ اے کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جس میں مسائل ملک و ملت، مذہب و اخلاق اور انسانی زندگی کے صحیح معیار کو پیش کیا گیا ہے۔ زبان نہایت سلیس ہے قیمت ۶ر ہے اور جامعۂ ملیہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

پُرانا خواب اور دو افسانے

جناب سید سجاد حیدر نے ایک ڈرامہ اور دو افسانے جو حال ہی میں ترکی زبان سے ترجمہ کئے ہیں، اس نام سے ایک مجموعہ میں شایع کئے گئے ہیں۔ ترکی زبان کی لطیف تخیل اور جناب سجاد حیدر صاحب کی مہارت ترجمہ جب دونوں کا اجتماع کسی لٹریری کتاب میں ہو جائے تو پھر نہ اُس پر کسی تنقید کی ضرورت ہے نہ تعارف و تقریب کی۔ یہ مجموعہ ۸ر میں مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڈھ سے مل سکتا ہے۔

صحیفۂ ولا

ملک کے مشہور شاعر جناب عزیز لکھنوی کے قصاید و مدحیات کا مجموعہ ہے جسے صدیق بکڈپو لکھنؤ نے نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ ۸۰ صفحات پر شایع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں علاوہ اُردو کے فارسی منظومات بھی ہیں اور قطعات و رباعیات و رثائیات بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ اور اس طرح یہ مجموعہ جناب عزیز کے مذہبی منظومات کا شیرازہ بند ہے۔

جناب عزیز کی شاعری پر اظہار خیال بیکار ہے کیونکہ ملک میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے یہ مجموعہ تین روپیہ میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

کس کی نظر سے دیکھوں تیری تجلیوں کو ‌ ‌ ‌ ‌ تو کب ملا ہے مجھ سے جب میں نہیں رہا ہوں
سب تار بج رہے ہیں اب تیرے ساز ہستی ‌ ‌ ‌ ‌ ہر سانس کہہ رہا ہے میں درد آشنا ہوں
میں اپنی زندگی کو تجھ پر نثار کرتا ‌ ‌ ‌ ‌ اے کاش تو نہ کہتا میں صبر آزما ہوں
میں نامرادِ عالم اب کس سے دل لگاؤں ‌ ‌ ‌ ‌ حد ہو گئی کہ خود سے بیزار ہو گیا ہوں
کافر ہو جس کے دل میں ہو لطف کی تمنا ‌ ‌ ‌ ‌ میں تو جفائے جاناں دلدادۂ وفا ہوں
اب تو ذہن میں بھی دنیائے جستجو ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ تصویر نارسی ہوں تعبیر خواب یا ہوں

فرخ بنارسی

اثرِ فریبِ الفت کوئی میرے دل سے پوچھے ‌ ‌ ‌ ‌ غمِ جاوداں بنا ہے ترا التفات کرنا
یہی رازِ سرخوشی ہے یہی درسِ زندگی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ غمِ جانِ مضطرب کو طربِ حیات کرنا
ترے ذکر نے زباں کو یہ کیا ہے محوِ لذت ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی کچھ ہی کیوں نہ پوچھے مجھے تیری بات کرنا
کبھی کاش دردِ دل کا وہی دور پھر بھی آتا ‌ ‌ ‌ ‌ وہ تڑپ کے صبح کرنا وہ تڑپ کے رات کرنا
نہ تلونات ہوتے نہ حیاتِ عشق ہوتی ‌ ‌ ‌ ‌ ترا شیوۂ تغافل بھی ہے التفات کرنا
ابھی کیا ہوا ہے فرخ یہ جنوں کی پہلی حد ہے ‌ ‌ ‌ ‌ کبھی بات کرکے رونا کبھی رو کے بات کرنا

غنی بنارسی

مجھے روز اس کے غم میں یونہی سارا دن گزرنا ‌ ‌ ‌ ‌ کبھی چپکے چپکے رونا کبھی دل سے بات کرنا
شبِ وصل صبح کر دی مری حال پر سیو نہیں ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی میرے دل سے پوچھے ترا التفات کرنا
نہ کرے تڑپ تڑپ کے دل زار خون پانی ‌ ‌ ‌ ‌ ہے ابھی تو آہ و زاری مجھے تا حیات کرنا
یہ غنی کو کیا ہوا ہے کئی دن سے دیکھتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ نہ کسی کی بات سننا نہ کسی سے بات کرنا

خوشتر منگروی

کریم دیکھ کے تیری یہ بے طلب بخشش ‌ ‌ ‌ ‌ کسی کے سامنے دامن دراز ہو نہ سکا
خموش ہو کے بھی دل نالہ کش رہا ہر دم ‌ ‌ ‌ ‌ نوائے سوز سے خالی یہ ساز ہو نہ سکا
سزائے جرم و معاصی کا درک تھا لیکن ‌ ‌ ‌ ‌ نہ اختیار رہا احتراز ہو نہ سکا
بس ایک آہ نے قصہ ہی کر دیا کوتہ ‌ ‌ ‌ ‌ فسانۂ غمِ ہستی دراز ہو نہ سکا
فغاں تو بابِ اثر تک پہونچ سکی نہ مگر ‌ ‌ ‌ ‌ درِ قبولِ دعا سے کبھی باز ہو نہ سکا
کسی کے جلوۂ رنگیں میں یہ دو رنگی تھی ‌ ‌ ‌ ‌ نظر نواز ہوا دل نواز ہو نہ سکا
مطیعِ حکمِ قضا و قدر رہا خوشتر ‌ ‌ ‌ ‌ کشیدۂ بندۂ ناز و نیاز ہو نہ سکا

معلومات نسائی

حسنِ مغرب کا ایک نمونۂ بدیع

اس وقت مغرب کے مشاغل تفریح میں ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ وہ دیگر فنون اکتسابی کی طرح حسن وجمال میں بھی مسابقت ومقابلہ کی دعوت دیتا ہے چنانچہ وہاں ہر سال مختلف ممالک یوروپ کی عورتیں جمع ہوتی ہیں اور ہر ملک سے ایک ایک ملکۂ حسن کا انتخاب کرکے اُن میں سے بھی ایک "گل سرسبد" چھانٹ لیا جاتا ہے، اور اُسے "سرخیل حسینان عالم" کا خطاب دیا جاتا ہے - یہ انتخاب ایک عورت کے چہرہ کی ساخت، قامت کی رعنائی، قد کی موزونی، اعضاء کے تناسب کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی ہوا کرتا ہے اور گویا یہ انتخاب ایک عورت کی عام دلکشی سے متعلق ہوتا ہے - لیکن اسی کے ساتھ بعض انتخابات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق علٰحدہ علٰحدہ اعضا جسمانی سے ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ پنڈلیاں کس کی خوبصورت ہیں، آنکھوں میں کس کے زیادہ سحر وافسوں پایا جاتا ہے - بالوں کے لحاظ سے کون زیادہ "دام بردوش" ہے، کس کے شانہ و گردن کی عریانی جذبات کے لئے زیادہ ہیجان انگیز ہے وغیرہ وغیرہ - اس وقت تک کا تجربہ ان حسن کے جائزہ لینے والوں کا یہ تھا کہ تا ایندم کوئی نمونہ جمال نسائی کا ایسا نہیں ملا، جو اپنے ہر ہر عضو کے لحاظ سے مکمل قرار دیا جائے - اگر کسی عورت کی آنکھیں فسوں خیز ہوتی ہیں، تو اس کی ناک ویسی نہیں ہوتی، کسی کے لب بادہ چکاں ہوتے ہیں، تو گردن میں کوئی بات نہیں ہوتی، قامت اگر قیامت انگیز ہوتا ہے تو تناسب اعضا مفقود ہوتا ہے - لیکن اب اتفاق سے اطالیہ میں ایک خوش نصیب عورت ایسی نظر آئی ہے، جو بہ حیثیت مجموعی بھی قیامت ہے اور اعضا کی انفرادیت کے لحاظ سے بھی بے پناہ ـــــ اس آیۃ الجمال کا نام مدموزیل ساندرینی ہے۔

اس کے متعلق یوروپ کے تمام نقاشوں، مصوروں اور بُت تراشوں کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک تفصیلی حسن کا ایسا نادر وجمیل امتزاج کہیں نظر نہیں آیا - اور سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک ہر ہر چیز اپنی جگہ ایسا عجیب وغریب نمونہ تکمیل آفرینش کا ہے - کہ بالکل "لیلۃ القدر" کی پیدائش معلوم ہوتی ہے۔

پھر اگر یہ آیۂ حسن، یہ روح جمال، یہ سحر متشکل، ہندوستان میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ یا تو حرم کے اندر تو بر تو پردوں میں پایا جاتا یا حجابات قلب کے اندر مستور اور دونوں صورتوں میں ایک فرمانروایانہ انداز سے پورے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتا، لیکن چونکہ بدقسمتی سے یہ خاتون یوروپ نژاد ہے، اس لئے یہ حسن اس کیلئے بلائے جان ہو گیا ہے اور روزانہ دن میں دس دس گھنٹے اس کو تمثال کی صورت سے نقاشوں، مصوروں اور بت تراشوں کے سامنے مختلف ہیئتوں سے بیٹھنا اُٹھنا پڑتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ سرزمین مغرب کی مادہ پرست دنیا میں حسن وعشق

کی جلیسی مٹی پلید ہوئی ہے، شاید ہی کسی کی ہوئی ہو اور اگر کوئی اور حجت شرعی موجود نہ ہو تو یہی ایک دلیل یورپ کے کافر اور کافر نعمت سمجھنے کے لئے کیا کم ہے؟

پست ترین قامت کی عورت

اب اطالیہ کی اس برمی جمال خاتون کے ساتھ انگلستان کی بھی ایک خاتون کا حال سُن لیجئے جس کا نام مس مانزی راکس ہے اور جو وہاں کے اسٹیج پر کام کرتی ہے۔ اس کی عمر ۲۶ سال کی ہے، لیکن آپ کا قامت صرف ۲۶ انچ سے زیادہ نہیں ہے، یعنی اگر نگار کی دو چند لمبائی میں آپ صرف ۱۱/۱ انچ کا اضافہ اور کر دیں تو اس خاتون کے قد کی ناپ معلوم ہو جائے گی۔ اس کا وزن ۳۳ پونڈ یعنی تقریباً ۱۶ اسیر ہے جو ۲، ۴ سال کے بچہ کا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے میں بھی بالکل صغیر سن بچہ معلوم ہوتی ہے اور لوگ اسے تحائف بھی وہی دیتے ہیں جو عام طور پر بچوں کو دئے جاتے ہیں لیکن اسکی دماغی وسعت و پہنائی کا یہ عالم ہے کہ متعدد زبانوں کی ماہر ہے، بڑی وسیع المطالعہ ہے اور تمام واقعات عالم پر اسی طرح رائے زنی کرتی ہے جیسے کسی کالج کا پروفیسر۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسکے والدین کا قد و قامت ویسا ہی ہے جیسا عام انسانوں کا ہوتا ہے اور اسکے ایک بھائی بہن خاصے طویل القامت ہیں، اور خود اسکا بھی نشو و نما ابتدائی ۵ سال تک عام بچوں کی طرح ہوتا رہا، لیکن اس کے بعد وہ دفعۃً بند ہو گیا۔ اور ۵ سال کی عمر تک پہونچ کر یہ ایک "مستقل جوہر بالذات" چیز ہو کر رہ گئی۔

دولت حسن

چند سال ہوئے، جب امریکہ کی ایک نوجوان لڑکی وہاں کی ملکۂ جمال منتخب ہوئی تو ۵۰۰ ڈالر اور ایک رکار ملبوس اسکو اعتراف جمال کے طور پر ہدیۃً پیش کیا گیا۔ وہ ہنوز اس انعام کو گھر لیجا کر اطمینان و سکون کیساتھ بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ محکمۂ ٹیکس کا افسر آیا اور اس انعام کا ٹیکس طلب کیا۔ خیر، یہ تو اس زمانہ کی بات تھی جب دنیا موجودہ اقتصادی مشکلات میں مبتلا نہ تھی اور اگر وہ اس ٹیکس کو نہ ادا کرتی تو بھی شاید چنداں پروا نہ کی جاتی، لیکن اب کہ دنیا کی ہر دولت معرض تحقیق میں آکر ادارۂ ٹیکس میں آگئی ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دولت حسن بلکہ محض نسائیت عام اس سے کہ وہ انتخاب ملکۂ جمال کے کام آئے یا نہ آئے، ٹیکس سے علیحدہ رہے۔ جب یورپ کی عورت اپنی آواز کے لحن کا، اپنی نازک انگلیوں کے لوچ کا، اپنے "موئے میاں" کے اہتزاز کا اور اپنے لچیلے قدموں کی حرکات رقصیہ کا بیمہ ہزاروں لاکھوں روپیہ میں کراتی ہے، اور جبکہ وہ محض اسلئے کہ ایک عورت ہے، اسٹیج پر آکر دین و ایمان، اخلاق و انسانیت ایسی قیمتی چیزیں بھی لوٹ لیجاتی ہے، کیوں نہ اُس سے خراج حسن حاصل کیا جائے۔ یہ ایک تجویز ہے جو عورت کی بڑھی ہوئی آزادی سے تنگ آکر امریکہ کے بعض ارباب نظر نے پیش کی ہے اور حقیقتاً وہ وقت عجیب ہوگا۔ جب مرد، دنیا کی عورت سے اپنی محرومی جنت کا انتقام اس طرح لینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا

بلغاریا اور اسباب جمال

بلغراد پایۂ تخت بلغاریہ کے زنانہ مدارس ثانوی کے ناظم نے حکم نافذ کیا ہے کہ طالبات آیندہ سے نہ ہونٹوں پر سرخی کا استعمال کریں، نہ عطریات لگائیں اور نہ ایسے اسباب زینت و آرایش اختیار کریں، جو حیا و عفت کے منافی ہیں۔ اس حکم پر وہاں کی لڑکیوں نے سخت احتجاج کیا ہے کہ ہم کبھی اسکو گوارا نہیں کر سکتے کہ ہماری تربیت قرون وحشت کی لڑکیوں کی طرح ہو۔ ہمارے لئے ہونٹوں کو سُرخ کرنا، عطریات کا استعمال، ناخنوں کی تزئین، بالوں کی آرایش اور اسی نوع کے اور اسباب زینت و آرایش لاطینی اور یونانی زبانوں کی تعلیم اور اسیطرح کی اور بہت سی خرافات سے زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے لئے سب سے بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی مستقبل زندگی کے لئے بہترین انیس

حاصل کر سکیں، اور یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ہم پہلے اپنی نمایش کیطرف پوری طرح توجہ نہ کریں۔ اگر آج ہم دنیا بھر کی زبانیں حاصل کر لیں اور دماغی تربیت کے لحاظ سے فلاطون و ارسطو بن جائیں تو کیا نتیجہ ہے اگر ہمکو کوئی بہتر شوہر نہ مل سکے"

ہم لڑکیوں کی اس صدائے احتجاج پر تعجب نہیں ہے بلکہ حیرت ہے اس تاثر تعلیم پر جس نے یورپ کی سرزمین میں نشو و نما پانے کے بعد شرم و حیا کا نام لیا اور وہاں کی لڑکیوں پر تزئین جسم کے مقابلہ میں تہذیب و اخلاق و دماغ کو مرجح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں کی حکومت اس شخص کو جس کا دماغ یقیناً خراب ہو گیا ہے، زیادہ عرصہ تک اس خدمت پر قائم نہ رکھے گی۔

دنیا کی مسلمان عورتیں

اگر گذشتہ انیسویں صدی کا سا سلسلہ جاری رہتا اور مسلمانوں کی ذہنیت میں بھی وہ انقلاب پیدا ہو جاتا جو اسوقت مغرب و مشرق کے ممالک متمدنہ میں نظر آتا ہے، تو اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مصطفٰے کمال پاشا کا احترام ایک رسول ہی کی حیثیت سے کیا جاتا، کیونکہ اس وقت تک کسی ملک و زمانہ کی تاریخ میں کوئی ہستی ایسی نہیں گزری جس نے مصطفٰے کمال کیطرح چند دنوں میں قرنوں کے جمود کو دفعۃً دور کر دیا ہو اور صدیوں کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی روایات کو اس طرح مٹا دیا ہو گویا وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ایک ملک کی اصلاح میں عورتوں کا ہوتا ہے، سو اس بارہ میں بھی اس کے اعجاز کا قائل ہونا پڑے گا کہ اب ترکی کی وہ روایات حرم جو نسائی حجاب و تحفظ میں زبان زد تھیں، آج ان کا کہیں نشان بھی نہیں ملتا۔ ترکی کی عورت نے صرف اپنا نقاب ہی دور کر کے نہیں پھینکا بلکہ اسی کے ساتھ ان تمام اوہام باطلہ، مراسم سخیفہ اور اعتقادات رکیکہ کو بھی اپنے دل سے نکال دیا ہے جنھوں نے قوم کی قوم کو تباہ کر رکھا تھا۔ آج وہ ہر جگہ مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہے اور حکومت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں وہ سرگرم کار نظر نہ آتی ہو۔ علم و ادب میں، فنون لطیفہ میں، اصلاح مسایل جنسی و معاشری میں، ریاضت جسمانی و دماغی میں، قضا کے دفاتر میں، صنعت و حرفت کے کارخانوں میں، طیران و فنون سپہگری میں، الغرض زندگی و تمدن کے ہر ہر شعبہ میں آج وہ پیش پیش ہے، اور آیندہ جنگ میں اگر ترکی قوم برسرپیکار ہوئی، تو دنیا حیرت کرے گی کہ ان کی عورتوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے۔

ترکی کے بعد مصر کی عورتوں کا درجہ ہے جو تقریباً ترکی ہی کے اصول پر کام کر رہی ہیں لیکن چونکہ مصر کو وہ آزادی حاصل نہیں ہے جو ترکی کو میسر ہے۔ اس لئے وہاں اسی نسبت سے ترقی میں کمی ہے۔ تعلیم، فنون لطیفہ، رقص و تمثیل میں بیشک یہاں ترقی ہے لیکن زیادہ مفید کاموں کی طرف ہنوز توجہ نہیں ہوئی۔ ایران میں بھی بہت بیداری پیدا ہو گئی ہے، اور پردہ مفقود ہو گیا ہے۔ حکومت ایران بھی بالکل ترکی کے قدم بہ قدم چل رہا ہے، اور اس نے بھی سب سے پہلے مولوی جماعت کو محو کیا جو ہر جگہ ترقی کے مانع آتی ہے۔

عراق کی لڑکیاں بھی تعلیم پا کر باہر نکل رہی ہیں اور مشکل ہی سے دن کو دیکھ کر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ سرزمین عرب کی خواتین ہیں۔ افغانستان و ہندوستان کا حال آپ کو معلوم ہی ہے، دکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہندوستان کی ہندو عورتیں میں علمی و سیاسی بیداری بھی ضرور پیدا ہو گئی ہے اور مسلمان عورتوں میں بھی بہ نسبت پہلے کے تعلیم زیادہ پھیل گئی ہے

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول
〃 دوم
〃 سوم
الفاروق
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
سوانح مولانا روم
سفرنامہ مصر و شام
علم الکلام
الکلام
رسائل شبلی
مقالات شبلی
شعر العجم جلد اول
〃 دوم
〃 سوم
〃 چہارم
〃 پنجم
موازنہ انیس و دبیر
اورنگ زیب عالمگیر
آثار اسلام
کلیات فارسی شبلی
کلام شبلی اردو

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلہ پانچ ناول
کامنی

سوانح عمری عیار

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی
حاجی بغلول
پیاری دنیا
کایا پلٹ
میٹھی چھری
طرحدار لونڈی

طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق

نرمالتی
مار آستین
بنگالی دلہن
معشوقۂ فرنگ
[illegible]
[illegible]

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی
ملک العزیز
فردوس بریں
محمودات
[illegible]
[illegible]
فاتح و مفتوح
بابک خرمی
الفانسو
ایام عرب
قیس و لبنیٰ
یوسف و نجمہ
زوال بغداد

مینا بازار
مقدس نازنین
رومۃ الکبریٰ
فلپانا
شوقین ملکہ
منصور موہنا
حسن انجلینا
ملک العزیز ورجنا
فردوس بریں
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
غیب دان دلہن
بدر النساء کی مصیبت
[illegible]
[illegible]

شوق قدوائی

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ

نیرنگ خیال

ظفر عمر بی اے

[illegible]
[illegible]
بہرام کی گرفتاری

دلچسپ جاسوسی ناول

شعلۂ رنگین
[illegible]
تیغ چلی
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس

قزاقی جاسوس
ترکی حرم سرا
جنگ طرابلس
بہرام چودر
زر پرست
گنجی کا راز
عبدالرحمن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
سیاحت زمین
سیاحت ہوا
نازنین مراکش
سمندر کی سیر
[illegible]
[illegible]
[illegible]
تحائف یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
بہرام کی رہائی
بہرام کی آزادی
بہرام کی سرگزشت
لال کنور
[illegible]

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
آتش خموش
مکاتیب محسن الملک

لیلیٰ مجنوں ڈرامہ

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی
گلشن
سراپا سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان بیدل
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
دیوان ناصر علی
کلیات سعدی
کلیات حزیں
دیوان عنصری
دیوان غنی کشمیری
دیوان ہلالی

دواوین اردو

کلیات ظفر
کلیات مومن

دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
[illegible]

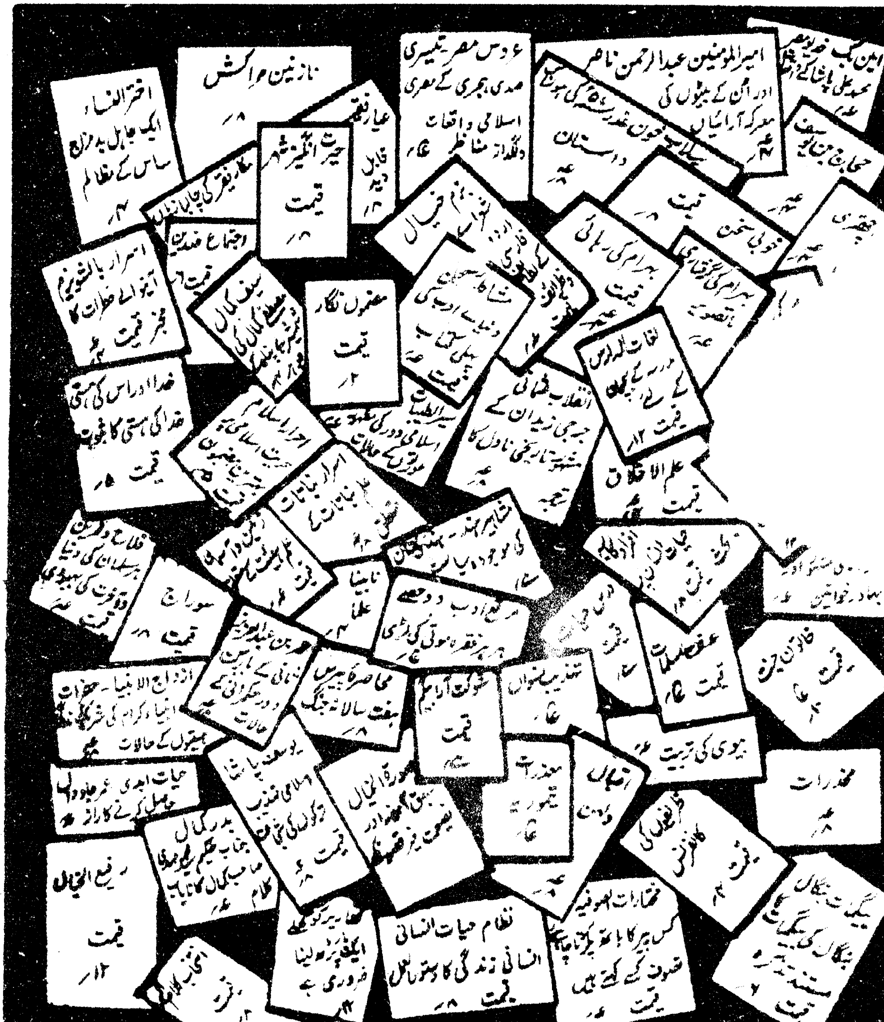
رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

[illegible]
[illegible]
سوزش عشق
روز ایمبرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴



مینیجر رسالہ "نگار" لکھنؤ

مطبوعہ ... پرنٹنگ پریس نگار لکھنؤ باہتمام ...



قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جن پر نمبر درج نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں
۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں
۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی قیمت

پاؤ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ	تعداد اشاعت	نرخنامہ اجرت اشتہارات	پاؤ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ	تعداد اشاعت
۱۲ روپیہ	۲۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	تین مرتبہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) دو ماہ یا اس سے زائد اشتہار دینے والے کو ... مضمون دیا جائیگا (۳) ...	۴۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	بارہ مرتبہ
۵ روپیہ	۸ روپیہ	۱۲ روپیہ	ایک مرتبہ	اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	۲۲ روپیہ	۳۵ روپیہ	۶۰ روپیہ	چھ مرتبہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان
(دوسرا ایڈیشن)
حضرت نیاز کے وہ معرکۃ الآرا مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔
قیمت عگار

گہوارۂ تمدن
(دوسرا ایڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا نے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل نئی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگذشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان کی دلکشی، تخیل کی نزاکت، بیان کی بلندی، مضمون کی دلکشی، انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیریں دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت، بیماری، شہرت، شکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات لئے ایک ایک جملہ میں موجود ہے۔ علاوہ محصول ۱۲

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک نہایت مفید مقدمہ کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں اور ان کی تشریح کی ہے، اول بیتا یہ مجموعہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲

صحابیات
جس میں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات لکھے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نیاز فتحپوری نے لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۳۰ سے زائد فارسی کی طرف اور شاعرات کے حالات اور انکے لطائف و ظرائف اور انتخاب کلام درج ہیں۔ قیمت علاوہ محصول عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

جلد ۲۱ فہرست مضامین ماہ مارچ ۱۹۳۲ء شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

ایڈیٹر:- نیاز (فتحپوری)

جلد ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء شمار ۳

ملاحظات

اب سے ۳۸ سال قبل ۱۸۹۴ء کا زمانہ ہے کہ سلطنت روس کے بعض اکابر ایشیائی حصۂ مملکت میں ریل لیجانے کی تجویز پر غور کرتے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی توجہ اس طرف مبذول ہوجاتی ہے۔

فرانس کے اصحاب جاہ وثروت جو بحر پاسیفک سے وسط ایشیا تک ذرائع نقل وحرکت کی تشکیل وتکمیل کے بہت متمنی تھے فوراً آمادہ ہوجاتے ہیں اور آخرکار حکومت روس کی ضمانت پر فرزندان فرانس روپیہ فراہم کردیتے ہیں اور وہ ریلوے لائن بننا شروع ہوجاتی ہے جو "Trans - Siberian" کے نام سے مشہور ہے۔

جسوقت یہ خطِ آہنی بڑھتے بڑھتے حدود "چین" تک پہونچتا ہے، توسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومتِ چین اپنی سرزمین میں ریل لیجانے کی اجازت دیگی یانہیں۔ چنانچہ دونوں حکومتوں میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور آخرکار حکومت چین منچوریا میں ریل لیجانے کی اجازت اس شرط سے دیدی ہے کہ حدود چین کے اندر جو ریلوے لائن بنائی جائے اس کا نام "Southern China Ry" یعنی جنوبی چین کی ریل" قرار دیا جائے۔ روس نے اس شرط کو فوراً منظور کرلیا کیونکہ محض نام کی تبدیلی سے اصل مقصد فوت نہیں ہوتا تھا اور سرمایہ داروں کی جماعت وہی تھی۔ چین کا محض نام ہی نام تھا

اس کے دو سال بعد جب ریلوے لائن طیار ہوگئی تو چین کی اجازت سے حدود منچوریا میں ریلوے لائن کے دونوں جانب پچاس پچاس میٹر (meter) زمین پر بھی روس نے قبضہ کر لیا اور ریلوے لائن کے حفاظت کی غرض سے فوج کے قیام اور اس کے لئے بارکیں بنوانے کی بھی اجازت لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں روس کا اثر منچوریا میں بہت بڑھ گیا۔ اور ایک شہر اُس نے آباد کر لیا جس کا نام حربین ہے۔ پھر چونکہ منچوریا کا یہ حصہ اپنی زرخیزی، شادابی اور معدنوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا، اس لئے روس کا یہ اقتدار سب سے زیادہ جاپان کو ناگوار ہوا، جو عرصہ سے سرزمین چین پر اپنے دانت لگائے ہوئے ہے۔

روس، منچوریا سے زیادہ عرصہ تک متمتع نہ ہوا تھا کہ ۱۹۰۴ء میں روس و جاپان کی مشہور جنگ شروع ہوگئی جب روس کو شکست ہوئی تو حسب معاہدہ پورٹس موتھ (۱۹۰۵ء) ہیں وہ مراعات جو جنوبی منچوریا میں اس کو حاصل تھیں جاپان کو ملگئیں اور چین کو بھی بادل ناخواستہ اس پر راضی ہونا پڑا۔ اس معاہدہ کی رو سے جاپان کو جنوبی منچوریا کی ریلوے مل گئی وہاں فوج کے قیام کا حق مل گیا وہ تمام معدنیں بھی ہاتھ آگئیں جو ریلوے لائن کے آس پاس تھیں، اور صوبۂ کوانٹنگ پر بھی ۹۹ سال کے لئے قبضہ ہوگیا جس میں بندرگاہ پورٹ آرتھر و ڈایرن شامل ہیں۔

جاپان نے یہ اقتدار ملتے ہی، منچوریا کو تمام جدید ذرایع سے ترقی دینی شروع کی۔ ۵ ہزار کیلومیٹر کے طول میں جدید ریلوے لائن بنالی اور بندرگاہ ڈایرن کو اتنا وسیع کر لیا کہ بندرگاہ "ولاڈ واسٹاک" کی اہمیت بالکل جاتی رہی۔

جاپان یہ سب کچھ کرتا جارہا تھا لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ تمام استعماری دراز دستیاں اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہوسکتیں جب تک چین باقاعدہ طور پر معاہدہ پورٹس موتھ پر دستخط نہ کردے۔ چنانچہ اتفاق سے اسی دوران میں یورپ جنگ عظیم چھڑ گئی اور حلفاء نے جاپان کی امداد کا عوض اس طرح دیا کہ چین کو مجبور کرکے معاہدہ پورٹس موتھ پر دستخط کرا اور ایک نئی شرط یہ بڑھادی کہ "جاپان کو منچوریا میں ہر قسم کی تجارت اور اراضی کی خریداری کا حق حاصل ہوگا اور بغیر جاپان منچوریا میں کوئی نئی ریل نہ بنائی جائے گی"۔ یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔

ہر چند چین نے اس وقت اپنے ملک کے اندرونی مصائب و مشکلات کو دیکھ اس عہدنامہ پر دستخط تو کردیئے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رعایتیں ایک دن اس کے حق میں سم قاتل ثابت ہونگی اور بلاد چین پر جاپانی اثر وا بہت بڑھ جائیگا۔ جب جنگ عظیم ختم ہوگئی اور جاپان کے اثرات حدود چین میں بہت زیادہ بڑھنے لگے تو چین کے سرمایہ داروں کی مدد سے خود اپنی ایک نئی ریل علاقہ منچوریا میں بنانا شروع کردی اور جاپان کا ایک روپیہ بھی ا نہ شامل ہونے دیا۔

جاپان نے یہ دیکھکر صدائے احتجاج بلند کی اور چین کے اس طرز عمل کو خلاف معاہدہ قرار دیکر تحریک شروع کردی اور یہ وہی مخالفت ہے جس نے گزشتہ اگست میں چین و جاپان کی فوجوں کو متصادم کردیا اور باقاعدہ

کی صورت اختیار کرلی۔

جب جمعیتہ الاقوام (لیگ آف نیشنس) نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ طول کھینچتا جا رہا ہے تو انھوں نے ان دونوں سے مطالبہ کیا کہ جنگ کو ختم کر دیا جائے اور دنیا کے امن وسکون کو خطرہ میں نہ ڈالا جائے۔ اس پر جاپان نے جواب دیا کہ جاپان کو جو حقوق منچوریا میں حاصل ہوئے ہیں اور جو آبادی جاپانیوں کی اس علاقہ میں پائی جاتی ہے ان کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریلوے لائن محفوظ رہے۔ اور چین کی وہ تمام تحریکیں جو جاپانی تجارت کے لئے مضرت رساں ہیں یک قلم روک دی جائیں۔ چین نے کہا کہ جب تک جاپانی افواج حدود چین میں داخل ہیں اور جب تک چین کے نقصانات کا معاوضہ جاپان سے نہ دلایا جائے وہ کسی شرط کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔

جاپان نے یہ دیکھکر کہ جمعیتہ الاقوام بعض مصالح کی بنا پر عملی حصہ لینے سے مجبور ہے اور اس کے پاس جدید اسباب حرب سے آراستہ فوج ایسی موجود ہے کہ چین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فوراً شنگھائی اور اس کے مضافات پر حملہ کر دیا تاکہ چین مجبور ہو کر اس کے تمام مطالبات کو تسلیم کرلے۔ چنانچہ اس وقت شنگھائی پر تمام دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں اور نتیجہ کی منتظر ہیں ——— یہ تو ہوا مختصر سا بیان ان تمام واقعات و حالات کا جو چین وجاپان کی موجودہ آویزش کا سبب ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس جنگ کی اصل روح یہی ہے اور کیا جمعیتہ الاقوام کی خاموشی بے سبب ہے؟

وہ لوگ جو جاپان کی وسعت تجارت، اور اس کی ترقیوں سے بے خبر نہیں ہیں، انھیں بخوبی معلوم ہے کہ ایشیا میں جاپان ہی ایک ایسی سلطنت ہے جو صحیح معنے میں مغرب کے استعماری اصول پر کام کر رہی ہے اور جو دن رات اس فکر میں سرگرداں ہے کہ نئی نئی منڈیوں پر اس کا تسلط قائم ہو جائے۔ نئی نئی زمینیں اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے حاصل ہو جائیں۔ اور وہ دنیا کی دولت کھینچ کر اپنے قبضہ میں کرلے یعنی اس کی حالت بجنسہ وہی ہے جو کسی وقت جرمنی کی تھی پھر ظاہر ہے کہ اس کی ان ہوسکاریوں کی جولانگاہ سرزمین چین سے بڑھکر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی، جہاں کی زمین وسیع ہے اور آبادی باوجود کثیر ہونے کے جاہل و بے خبر ہے۔ چنانچہ روس سے جنگ کرنے کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ منچوریا پر اس کا اثر واقتدار قائم ہو جائے۔ اور منچوریا پر اثر واقتدار صرف اس لئے چاہتا تھا کہ اپنی تجارتی واستعماری ستیزہ کا ہدف بنائے۔

اسمیں شک نہیں کہ گزشتہ جنگ نے جس قدر تباہیاں روئے زمین پر پھیلائیں اتنی ہی برکات بھی وہ اپنے ساتھ لائی، یعنی اگر ایک طرف اس نے بہت سی جیتی جاگتی ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے سُلا دیا تو دوسری طرف بعض سوتی ہوئی قوموں کو اس نے بیدار بھی کر دیا اور دنیا میں ایک عام احساس استعماری واستبدادی حکومتوں کے خلاف پیدا کر کے اشتراکیت جمہوریت کی روح زمین کے ہر گوشہ میں دوڑا دی، چنانچہ جرمنی کا انقلاب، روس میں بالشیوک حکومت کا قیام، ترکی

میں جمہوری سلطنت کی تشکیل، سب اسی جنگ کی برکتیں ہیں، جن سے چین بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور وہاں بھی قدیم شخصی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہر چند اس وقت تک چین میں کوئی منظم آئین حکومت قائم نہیں ہوسکا اور مختلف جماعتوں کے باہم اختلافات نے طوائف الملوکی کی سی کیفیت پیدا کر رکھی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ملک میں عام بیداری ضرور پیدا ہوگئی ہے اور قومی حکومت کے مفہوم سے وہاں کے لوگ بیگانہ نہیں رہے، چنانچہ اس کا سب سے پہلا ثبوت جو اہل چین نے دیا یہ تھا کہ انھوں نے ملکی صناعت کو ترقی دینے کے لئے، جاپان کی مصنوعات کا مقاطعہ شروع کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جاپان، جو سرزمین منچوریا پر قابض ہونے کے بعد چین کی تمام ۶۰ کروڑ آبادی سے اپنی صناعی ترقیوں کا خراج وصول کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا، کس طرح اس طرز عمل سے خوش ہوسکتا تھا۔ وہ خلاف توقع اپنی اُمیدوں کا قصر گرتے ہوئے دیکھ کر بیتاب ہوگیا اور اس نے وہی کیا جو ایسی صورتوں میں اُس کا استاد یورپ ہمیشہ کیا کرتا ہے۔

اس لئے جاپان اس جنگ کے چھیڑنے کی وجہ جو چاہے ظاہر کرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ چین سے صرف اس لئے لڑ رہا ہے کہ وہ کیوں اس کی مصنوعات کے خلاف پروپاگنڈا کر رہا ہے اور اپنے ملک کا روپیہ جاپان کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتا۔

جمعیتہ الامم میں جتنی بڑی قوتیں شامل ہیں وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ زیادتی جاپان کی ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ اسوقت چین پر ظلم ہو رہا ہے، لیکن ان میں ہمت نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر جاپان کو روکیں یا اُس سے اس ظالمانہ پیشقدمی کا اجتناب کریں۔ کیونکہ خود ان کا طرز عمل بھی ان کے مستعمرات میں یہی ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی مصنوعات کے لئے منڈیاں پیدا کرنے میں اس سے زیادہ ظلم کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ پھر یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ جمعیتہ الامم جاگ جاگ کر سو سو جاتی ہے، یہ جو آج تک اس کے اعضاء منچوریا یا شنگھائی پہونچکر کوئی تدبیر صلح کی پیدا نہیں کر سکے، اس کا سبب صرف اخلاقی بزدلی اور ضمیر کی ملامت ہے کہ جس چیز کو وہ خود اپنے لئے روا رکھتے ہیں، اسپر جاپان سے مطالبہ کرنے کا ان کو کیا منھ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود اس لیت و لعل کے بھی جمعیتہ الامم کوئی نہ کوئی صورت اس جنگ کو ختم کرنے کی نکالے گی اور یہ بھی صحیح ہے کہ جہاں تک آلات حرب و فن حرب کا تعلق ہے، چین بہ نسبت جاپان کے بہت ضعیف ہے، کیونکہ اس کے پاس نہ جدید آلات حرب ہیں نہ کوئی منظم فوج، نہ بحری بیڑہ ہے نہ ہوائی جہازوں کی معقول تعداد، اور بالکل ممکن ہے کہ آخر میں شکست کے نقصانات اسی کو برداشت کرنا پڑیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ واقعہ چین کی بیداری کے لئے صدائے غیب ثابت ہوگا اور چین کی تاریخ مستقبل میں ۱۹۳۲ء کو وہی اہمیت دیجائے گی جو تاریخ فرانس میں ۱۷۸۹ء کو حاصل ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج جاپان منچوریا کے تمام علاقہ پر قبضہ کرلے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بزور دہشت وہاں اپنی مصنوعات کو بھی پھیلا سکے، لیکن کل جاپان کے لئے وہ دن آنا ہے اور آکر رہنا ہے کہ چین اُس کو مچھر کی طرح اپنی چٹکی میں لئے ہوگا اور یہی جمعیتہ الامم جو آج جاپان کے خلاف زبان ہلاتے ہوئے پس و پیش کر رہی ہے، کہہ رہی ہوگی کہ یقیناً اس کو مسل ڈالنا چاہئے کیونکہ ایشیاء کا امن و سکون ہمیشہ اسی کی وجہ سے خطرہ میں رہا ہے۔

اس وقت چین کے اندر جو عام جوش جاپان کے خلاف پیدا ہو رہا ہے وہ اپنے اندر بڑا شاندار مستقبل لئے ہوئے ہے اور اگر جنگ نے طوالت اختیار کی تو اسی وقت ورنہ آئندہ بہت جلد دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ جاپان نے جو دشمنی کا بیج آج بویا ہے وہ کل اسی کے لئے کیسا تلخ حنظل ثابت ہوا - کیا جاپان اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اب غلام ممالک میں بھی تیغ و تفنگ کی مدد سے استعماری و تجارتی حقوق عرصہ تک قائم نہیں رکھے جا سکتے چہ جائیکہ چین ایسا ملک جو خود مختار ہے اور ترقی کی تمام راہیں اختیار کرتا جا رہا ہے -

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر یہ جنگ کچھ عرصہ تک اور قائم رہی تو ساری دنیا کی سلطنتوں کو اس میں شامل ہو جانا ہے مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کیونکہ اس وقت کی اقتصادی حالت کسی سلطنت کو مصارف حرب برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیسکتی، لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت آئندہ عالمگیر جنگ کی داغ بیل ضرور پڑ جائے گی اور ایشا کا وہ زرد خطرہ جس سے یورپ ہمیشہ خائف رہا اُن سے قریب تر ہو جائیگا -

اسوقت عام اقتصادی و تجارتی کساد بازاری کا بڑا سبب تاوان جنگ ہی جو جرمنی پر عاید کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ قرض کی وہ مقدار جو یورپ کی دوسری سلطنتوں نے زیادہ تر امریکہ اور کچھ برطانیہ سے حاصل کیا تھا - ہر چند بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس تاوان و قرض کا اثر ساری دنیا پر کیوں اثر پڑا لیکن جو لوگ مسایل اقتصاد سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اب اسباب نقل و حرکت کی وسیع اشاعت اور بین الاقوامی تعلقات صنعت و تجارت نے ساری دنیا کو ایک نظام سے وابستہ کر رکھا ہے اور موجودہ ترقی تمدن کی مشین میں تمام سلطنتیں ایک دوسرے سے اس طرح متعلق ہیں جیسے گھڑی کے پہیئے کہ اگر ایک پہیئے کی بھی چول ڈھیلی ہو جائے تو سب پُرزے بند ہو جائیں اور گھڑی بیکار ہو کر رہجائے - جرمنی پر جو تاوان جنگ عاید کیا گیا ہے اسکی مقدار ۲۷ ارب ۶۴ کروڑ ۱۹ لاکھ ۴۲ ہزار آٹھ سو ڈالر (ڈالر تقریباً ساڑھے تین روپیہ کے برابر) ہے جو ۵۷ سال کی مدت میں بالاقساط اُسے ادا کرنا ہیں - ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم ادا کرنا کسی ملک سے ممکن نہیں - خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اور یہی وہ احساس ہے جو اب جرمنی کو پیدا ہوا ہے اور جس کی بنا پر اس نے تاوان جنگ کے بقیہ سے معذوری ظاہر کی - اس لئے اب بہت بڑی گتھی یہ ہے کہ اگر جرمنی تاوان جنگ برطانیہ و فرانس وغیرہ کو ادا نہ کرے تو یہ ممالک اس قرضہ کو کیونکر ادا کریں جو انھوں نے امریکہ سے لیا ہے اور امریکہ کیوں اپنی رقم چھوڑ دے - ہمارا خیال ہے کہ اس اُلجھن کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ممالک یورپ یا تو ایثار سے کام لیکر اپنے اپنے مطالبات سے باز نہ آئیں یا پھر دوبارہ جنگ ہو کر ساری دنیا پھر ایک بار اس دور وحشت میں نہ چلی جائے جب انسان دولت کو دولت کے لئے حاصل نہ کرتا تھا - آئندہ ایک مفصل مضمون اس موضوع پر شایع کیا جائیگا تاکہ اس مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں -

حال ہی میں مصر کے جو مصور رسالے موصول ہوئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ رمضان میں ترکی زبان میں تلاوت کلام مجید کی رسم ادا ہو گئی - تصویروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کوٹ پتلون پہنے ہیٹ لگائے مسجد میں بیٹھے ہیں اور امام ایک اونچی میز کے سامنے کھڑا ہوا برہنہ سر بالکل اس طرح خطبہ پڑھ رہا ہے جیسے کسی کلیسہ میں کوئی پادری وعظ کہہ رہا ہو - اذان بھی ترکی

زبان میں دی گئی اور اذان دینے والا بھی فرنگی لباس میں برہنہ سر اذان دے رہا ہے یہ ذکر میں نے اس لئے کیا کہ ہندوستان کے بعض اخبار جو ترکی کے متعلق اس نوع کی خبروں کو دشمنوں کا پروپاگنڈا قرار دیتے ہیں ان کو حقیقت کا علم ہوجائے اور دوسرے یہ کہ مغربی تعلیم و تہذیب کا جو اثر شعائر اسلام پر آہستہ آہستہ ہوتا جارہا ہے اس کا اندازہ ہمارے علماء کرام کو ہوسکے جو ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے طیار نہیں۔

دین اسلام نام ہے صرف تعلیمات قرآنی کا اور فقہ ایک قانون ہے جس میں ہمیشہ اختلاف رائے پایا گیا اور پایا جائیگا، اس لئے اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہیں کہ جماعت اسلامی کے رشتۂ اتحاد کو صرف قرآن مجید سے وابستہ کیا جائے اور "تشریع وافتا" کی دنیا کو اس سے بالکل علحدہ کردیا جائے۔ یعنی اگر ایک شخص ہاتھ کھولکر آمین بالجہر کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو اسکو غیر مسلم نہ ٹھرانا چاہیئے اور اگر کوئی کچھوے اور مینڈک کا کھانا جائز سمجھتا ہے تو اُسے بھی اپنی جماعت سے علحدہ نہ کرنا چاہیئے اس قسم کے اختلافات پر مسلمانوں میں بہت کافی جنگ ہوچکی ہے اور ناقابل تلافی نقصان اُٹھایا جاچکا ہے۔ آئندہ اسکو محو کردینا چاہیئے، کیونکہ جب خود قرآن پاک کی افہام و تفہیم میں تمام دنیا کے مسلمان کسی ایک بات پر متفق نہیں ہوسکتے تو فروعی مسائل پر اجماع کیونکر ممکن ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ نماز میں قرآن پاک کی اصل عبارت کے بجائے کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ پڑھنا سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ اعتقاد پیدا ہوجائے کہ کلام پاک "بلفظہ" نہیں بلکہ صرف اس کا مفہوم "وحی" ہوا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اب عہد عباسیہ تو ہے نہیں جو قرآن پاک کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ کوئی زبردست سیاسی اہمیت اختیار کرے، اس لئے اب بجز اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ یا تو ترکوں کی اس اُپج کو نظر انداز کرکے اُنھیں بدستور جماعت اسلامی میں شامل رکھا جائے یا انھیں ملحد و مرتد قرار دیکر کفر کا فتویٰ ان کے خلاف صادر کردیا جائے۔ پھر ظاہر ہے کہ کفر کا فتویٰ کوئی تیغ و تفنگ تو ہے نہیں جس کا اُنھیں ڈر ہو اور اس کے خوف سے اُن کی موجودہ ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہوسکے۔ (جبکہ یہ ذہنیت نہ صرف ترکی بلکہ مصر، ایران اور خود عراق و شام اور نجد و حجاز میں پوری قوت کے ساتھ نشو و نما پارہی ہے) اس لئے لامحالہ ہم کو یہ تمام بدعتیں گوارا کرنا پڑینگی اور زہر کھانے کے بعد جینا پڑے گا اگر زمانہ یہی چاہتا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہمارے ہندوستان کے علماء کرام ترکی کے مقابلہ میں اپنی ان مجبوریوں کو رواداری کی صورت دے سکیں تاکہ دنیا کو معلوم ہوجائے کہ اسلام کا مفہوم "بیکسی و بیچارگی" کے سامنے گردن جھکانے کا نہیں بلکہ "معقولیت و آزادیِ رائے" کے سامنے سر اعتراف خم کردینے کا ہے۔

اس ماہ کے نگار میں آپ غالباً بہت زیادہ سامان دلچسپی پائیں گے اور وہ تمام خصوصیات آپ کو بدرجۂ اتم نظر آئیں گی جو نگار کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

شروع سے نگار کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ پبلک کے سامنے ایسی چیزیں پیش کیجائیں جو ان کے معلومات میں اضافہ کا باعث ہوں اور ایک خاص قسم کا تحقیقی و تنقیدی ذوق مطالعہ پیدا کرسکیں، چنانچہ اس وقت تک جن جن مباحث پر نگار

میں گفتگو ہوئی وہ اسی نصب العین کے ماتحت تھی اور آئندہ بھی اسی اصول پر کاربند رہنے کا عزم ہے۔ لیکن اگر گزشتہ دس سال کا مکمل فائل نگار کا آپ کی نگاہ سے گزر چکا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان خصوصیات کے قائم رکھنے کے لئے مجھے کتنی محنت صرف کرنا پڑی اور اگر نگار کا شعبۂ تحریر خود ہی اس ذمہ داری کو اپنے سر نہ لیتا تو اس کا التزام مشکل تھا کیونکہ ملک میں کسی خاص معیار کے مضامین لکھنے والے بہت کم ہیں اور محض دوسروں کے اعتماد پر کوئی رسالہ نگار کے معیار کا نہیں چل سکتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گزشتہ ماہ کا رسالہ بھی نصف سے زیادہ شعبۂ تحریر کے مضامین سے پُر تھا۔ اور ماہ رواں کے رسالہ کا بھی یہی حال ہے۔ پھر اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اگر واقعی یہ خدمات آپ کے نزدیک مستحسن ہیں تو کیوں آپ اس کی اشاعت کی طرف توجہ نہ فرمائیں اور کیوں نہ ہمیں موقعہ دیں کہ اس سے زیادہ بہتر صورت میں ہم اس خدمت کو انجام دے سکیں۔ یقیناً نگار میں کوئی ظاہری دلکشی "نقش و رنگ" کی موجود نہیں، یہ بھی درست ہے کہ اسکی قیمت بھی اکثر مصور و خوشنما رسالوں سے زیادہ ہے لیکن اگر دنیا کے معاملۂ "بیع و شری" اور "داد و ستد" میں "سیرت" کو کوئی اہمیت حاصل ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ نگار کے باب میں کیوں مغز کو چھوڑ کر پوست کی دلکشی کا سوال اُٹھایا جائے

موجودہ مضامین میں سے ایک نہایت اہم مضمون "فلسفۂ عریانی" اس ماہ میں شایع کیا جا رہا ہے اور آئندہ ماہ سے "مذاہب عالم اور عصناء جنسی کی پرستش" کا سلسلہ شروع کیا جائے گا جو اردو کی دنیا میں بالکل اچھوتی اور نئی چیز ہے۔ دیگر مضامین جو مرتب ہو چکے ہیں انکی فہرست حسب ذیل ہے:-

۱۔ عہدنامۂ عتیق (توریت) کی روایتوں کا ماخذ اصلی۔

۲۔ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی حذت اردو کا ایک حیرت انگیز کارنامہ۔ گالسوردی کے ایک ڈرامہ کے ترجمہ (فریب عمل) پر سرسری نگاہ

۳۔ تاریخ کا ایک گمشدہ ورق۔ صلاح الدین ایوبی کے دو آنسو۔

۴۔ کیا سیارے آباد ہیں۔

۵۔ کشاکش حیات پر ایک تحقیقی نظر۔

۶۔ لا ادریت

۷۔ روس کا اجتماعی انسان۔

۸۔ مسئلۂ تاوان جنگ اور موجودہ اقتصادی مشکلات (۹) "ڈرامہ شکنتلا" موجودہ فن تنقید کے معیار سے (۱۰) ترجمہ ڈرامۂ قلوپطرہ (برنارڈ شا)۔ (۱۱) شریعت مسیحی اور عورت کا زوال۔ (۱۲) جغرافیہ اور عہد اسلام وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ ان کے دلچسپ افسانوں، مفید استفسارات دلکش معلومات اور اعتبارات و تفریحات کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو برابر پیش ہوتا رہیگا

نیاز

مسئلہ حسب ونسب خالص اسلامی نقطۂ نظر سے

(سلسلۂ ما سبق)

شاہان صفویہ

تقی اوحدی نے عرفات العاشقین میں شیخ صفی الدین اردبیلی کے سلسلہ میں صفویہ کا مختصر تذکرہ کیا ہے، تاریخ فرشتہ کے اندر سلاطین دکن کے سلسلہ میں صفویہ کے حالات جستہ جستہ ملتے ہیں "پرشین آرٹ" کے تاریخی مقالہ نگار ڈینیسن کی تاریخی شہادت کی بنا پر صفویہ نے سنہ ۱۵۰۲ سے سنہ ۱۷۳۶ء تک حکومت کی جو مشہور صوفی شیخ صفی الدین کی اولاد تھے اور جنکا سلسلۂ نسب موسیٰ کاظم تک منتہی ہوتا ہے، صفویہ نے پیری مریدی کے ذریعہ رفتہ رفتہ حکومت حاصل کرلی ان کی پوری حکومت کا زمانہ اثنا عشری مذہب کی تبلیغ اور سیاسی پروپگنڈا میں گزرا خصوصیت کے ساتھ ان کی توجہ دکن کی طرف مبذول رہی، برہان نظام شاہ، یوسف عادل شاہ، قطب شاہ وغیرہ شیعہ تھے، نظام شاہیہ اور قطب شاہیہ کو تو شیعی حکومت ہی کہہ سکتے ہیں، اس کے علاوہ صفویہ کی تبلیغ سلاطین گجرات کے یہاں بھی ہوتی رہی، مغلیہ کے ساتھ بھی انکا یہی رویہ رہا، ان کے صناع ومصور، ان کے شاعر ومغنی، ان کے علماء زہاد عہد بہ عہد آتے رہے، اور اپنی مذہبی تبلیغ کرکے روانہ ہوگئے[۵۱]، صفویہ نے عباسیہ کی طرح اپنی عظیم الشان خلافت قائم کرنا چاہی تھی، اور ساری اسلامی دنیا پر اپنا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے مغلیہ اور قطب شاہیہ کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرلئے، اور اس طور سے سادات کا خون منگولین نسل اور ترکی غلام کے خون سے مل گیا

قدیم عربوں کا افتخار نسبی

بعثت اسلام کے قبل عرب جن وحشیانہ فکر وعقاید میں مبتلا تھے ان کے مفصل حالات "جاہلی شعرا" (جاہلی، اُن شعرا کو کہا جاتا ہے جو عہد اسلام سے قبل گزرے ہیں) کے کلام سے معلوم ہوتے ہیں اس عہد کی شاعری میں کثرت کے ساتھ، نسب وحسب کے متعلق طعن وتشنیع، فخر ومباہات کے تخیلات ملتے ہیں کوئی شاعر اپنے قبیلہ کی نجابت بیان کر رہا ہے، کوئی حریف قبیلہ کے نسب وحسب کی مذمت کر رہا ہے، الغرض نسب وحسب کا تخیل بھی ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع تھا شعرا

---

۵۱ میں اپنے مقالہ "دیوان شمس تبریز مرتبہ ڈاکٹر نکلسن" کے اندر اس کے متعلق اظہار خیال کرچکا ہوں۔ یہ کتاب "ایوان اشاعت گورکھپور" سے شایع ہو رہی ہے،

اسکے ذریعہ سے اپنے قبیلہ کو جنگ وجدال کے لئے اُبھارتے تھے، اور اپنے مخالف قبائل کو ذلیل کرتے تھے

بنی قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے،

انا بنی نھشل لاندعی لاب　　عنہ ولا ھو بالابناء یشرینا

ترجمہ:- ہم لوگ بنی نہشل کی اولاد ہیں اس کے سوا کسی دوسرے کو اپنا باپ نہیں بتاتے، اور نہ وہ ہم لوگوں کو غیروں کی اولاد کے بدلے بیچتا ہے

مطلب یہ ہے کہ نہشل تو خود بڑا شریف ونجیب ہے، اس لئے ہم لوگوں کو ضرورت نہیں کہ اظہار شرافت کے لئے کسی دوسرے شخص تک اپنا سلسلۂ نسب پہونچائیں اور اس کو بھی ہم لوگوں پر فخر ہے اس لئے وہ بھی ہمیں اپنی معزز اولاد بتانے سے اغماض نہیں کرتا

قبیلۂ طے کا ایک جاہلی شاعر انیف بن زبان النبہانی کہتا ہے،

جمعنا لکم من حی عوف ومالك　　کتائب یردی المقرفین نکالہا

ترجمہ:- ہم نے تمہارے لئے قبیلہ عوف ومالک سے مع تمام سازوسامان کے فوجیں جمع کر رکھی ہیں جنکی عبرت انگیز سزا دو دوغلوں کو تباہ کردے گی

عرب کے اندر "مقرفین" اور "ہجین" کی دو اصطلاحیں تھیں اسکے متعلق علامۂ تبریزی لکھتے ہیں

المقرف الذی امہ عربیۃ وابوہ مولی ـــ والھجین الذی ابوہ عربی وامہ امۃ　|　"مقرف" وہ شخص ہے جس کی ماں عربیہ ہو اور باپ غلام ـــ اور "ہجین" وہ ہے جسکا باپ عربی ہو اور ماں لونڈی

آیندہ سطور سے آپ کو پتہ چلے گا کہ قرآن مجید کی پاک تعلیم نے اس ناپاک تخیل کو کس حد تک مٹایا، سرور کائنات صلعم اور آپ کی اولاد امجاد نے خود اپنے خاندان میں لونڈیوں اور غلاموں کو جذب کرکے دنیا کو کون سا پیام دیا، اور عرب جس انسان کو مقرف اور ہجین پکار کر ذلیل سمجھتے تھے اسے اسلام نے کس حد تک محترم بنادیا

عمرو بن معدیکرب ایک "مخضرمی" شاعر کہتے ہیں

ان الجمال معادن　ومناقب اورثن مجدا　|　ترجمہ:- انسان کا جمال نسب و حسب ہیں جو اسے بزرگی عطا کرتے ہیں

یہاں "معادن" کے اصطلاحی معنی نسب کے ہیں جیسا کہ خود ایک حدیث کے اندر آں حضرت صلعم نے بھی فرمایا ہے، تبریزی نے "مناقب" کے معنی انسان کے خصایل جمیلہ لکھے ہیں مولانا فیض الحسن سہارنپوری اس کے معنی "حسب" (مادری نسب) بتاتے ہیں ـــ ایک اور عربی شاعر کہتا ہے،

مسنا من الآباء شیئا وکلنا　　الی حسب فی قومہ غیر واضع

ترجمہ:- ہم نے آباواجداد میں جستجو کی تو ہم نے دیکھا کہ ہم اور تم اپنی قوم میں صاحب جاہ وشریف ہیں

فلما بلغنا الامھات وجدتم بنی عمکم کانوا کرام المضاجع

جب ہم ماؤں تک پہونچے تو تم نے اپنے چچازاد بھائیوں کو (شاعر اپنے قبیلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) شریف ماؤں کی اولاد پایا

بنی عمنا لا تشتمونا وادفعوا علی حسب ما فات قید الاکارع

ترجمہ:۔ ہمارے چچازاد بھائیو! ہمیں گالیاں نہ دو اور ہماری نجابت و شرافت کو جو چوپاؤں کی نلی کے برابر بھی تم سے کم نہیں ملحوظ رکھتے ہوئے (نزاع کو) دور دفع کرو،

اسی طرح عہد جاہلیت کا ایک اور شاعر جابر بن اسلان السنبسی کہتا ہے،

لعمرک ما اخزی اذا ما انتسبنی اذا لم تقل بطلا علی ومینا

ترجمہ:۔ تمہاری زندگی کی قسم جب تم میرا نسب صحیح صحیح بغیر جھوٹ و افترا بیان کروگے تو مجھے ذلت نصیب نہ ہوگی

بنی اسد کا ایک شاعر کہتا ہے

الا اکن ممن علمت فاننی الی نسب ممن جھلت کریم

ترجمہ:۔ اگر میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جن سے تو واقف ہے تو کیا؟ میں ان اعلیٰ نسب (والوں) سے منسوب ہوں جنکو تو نہیں جانتی

ومن یفتقر فی قومہ یحمد الغنی وان کان فیھم واسط العم مخولا

ترجمہ:۔ اپنی قوم میں جو شخص فقیر و مفلس ہوتا ہے اگرچہ عالی خاندان نجیب الطرفین ہو لیکن مال و دولت ہی کو اچھا پاتا ہے

اسی طرح ایک قدیم جاہلی شاعر سعد بن مالک کہتا ہے

وتساقط الاوشاظ والذ نبات اذ جھد الفضاح

ترجمہ:۔ جب فضیحت و رسوائی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو اوباش کم رتبہ اور دوغلے درماندہ ہوکر گر جاتے ہیں

تلاش کرنے سے ایام جاہلیت کے شعرا کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ملیں گے جن میں نسب و حسب کو اپنی نواسنجیوں کا دلچسپ موضوع بنالیا تھا لیکن اس ظلمت کدہ میں جہاں انسانوں کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا جاتا تھا، جہاں مساوات واخوت مفقود تھی، بساط آرائے شہود نے ایک ایسا مبلغ بھیجا جس نے اپنی پرسوز نوحہ طرازیوں سے، اپنے مؤثر اسلوب خطابت سے، اپنی وسیع انسانی ہمدردیوں سے صرف یہی نہیں کہ ان کی انانیت کا خاتمہ کردیا بلکہ سارے ملک کو قومیت و اخوت کے نشہ سے سرشار بناڈالا، اب وہی قوم جو "ثار" اور "انساب" کی لغویات و مہملات میں پھنسی ہوئی تھی ایک منظم جماعت بنکر انسانیت کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور قلیل مدت میں چار دانگ عالم میں اپنے پیغمبر کی پاک تعلیم پہونچادی

عربوں کے تخیل نسبی پر اسلام کا اثر

تاریخ و سیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ؐ کس طرح کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ میں آئے آپ کے بعد قریشی مسلمانوں

نے بھی ہجرت کی، مدینہ کے رہنے والے صرف یہی نہیں کہ قریشی قبیلہ سے نہ تھے بلکہ وہ آل مضر میں بھی شامل نہ تھے وہ بنی حمیر تھے، آل مضر اور بنی حمیر کی نزاع اگلے سطور میں لکھی جا چکی قریش اہل مدینہ کو اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے، لیکن اسلام جب مدینہ میں آیا تو مہاجرین (قریشیوں) اور انصار میں شادی بیاہ ہونا شروع ہوا اس کے بعد کثرت سے غربا اور اجنبی نسل کے لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے ان انصار اور مہاجرین کے پیوند سے جو اولاد پیدا ہوئی انھیں زمانہ اور اسلامی سیاسیات نے مجبور کیا کہ وہ انھیں اجنبیوں غلاموں اور لونڈیوں کو اپنے اندر جذب کریں اور یہی ہوا چنانچہ قرآن مجید نے سیاسی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو قانون ازدواج پیش کیا وہ قابل غور ہے، اور اگر ہمارے زمانہ کے مسلمانوں نے اس پر توجہ کی تو عمدہ نتائج مترتب ہو سکتے ہیں

ولا تنکحوا المشرکت حتی یومن ولامۃ مومنۃ خیر من مشرکۃ ولو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا ولعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم (بقرہ)

مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں نکاح نہ کرو مسلمان لونڈی مشرکہ (کنبہ کی عورت) سے بہتر ہے گو (مشرکہ) تم کو بھلی ہی کیوں نہ معلوم ہو (اسی طرح) مشرک مردوں سے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ نکاح نہ کرو اور مسلمان غلام، مشرک (اعلیٰ خاندان) مرد سے بہتر ہے، گو وہ (مشرک اعلیٰ خاندان والا) تم کو محبوب ہو

یہاں یہ قابل غور امر ہے کہ اسلام نے ایسی تعلیم کیوں دی؟ ظاہر ہے کہ اس وقت نسلی امتیاز کا خیال رکھا جاتا تو یقیناً اسلام کی اشاعت ہی ناممکن ہو جاتی کیونکہ قریش جو اسلام لاچکے تھے تعداد میں بہت کم تھے، شادی بیاہ کرنا فطری تقاضا تھا اگر قریش کنبہ کا خیال کرتے تو ان کو کفار مکہ سے شادی بیاہ کرنا پڑتا اور اگر اسلام اس کی اجازت دیتا تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلم قریشیوں کی جو لڑکیاں مکہ کے قریشی کافروں سے بیاہی جاتیں ان کی اولاد اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم رہتی اسی طرح اگر قریش کی کافرہ عورتوں سے مسلمان قریشی شادی کرتے تو ان کی اولاد کے ذہنی رجحانات پر ان کی تربیت اور ان کے افکار و عقائد کا اثر پڑتا ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں مقاصد اسلام کے منافی تھیں، پہلی صورت میں مسلمانوں کی تعداد پر برا اثر پڑتا دوسری صورت ان کے عقاید کے لئے زہر ہلاہل تھی اس لئے اسلام نے ایک سرے سے اُن کے ساتھ ازدواجی تعلق کرنا ہی حرام قرار دے دیا اس سے ایک تیسری صورت اور پیدا ہو جاتی جو اشاعت اسلام کے لئے خطرناک اور مہلک ثابت ہوتی عرب کے چند گوشوں میں اس کے ماننے والے ہوتے اور ان کی زندگی کے بعد یہ مذہب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا وہ صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کے ساتھ نسلی علاقہ نہ ہوتا تو وہ اخوت و خلوص باہم نہ پیدا ہوتا جس کی بدولت قلیل عرصہ میں مسلمان دنیا پر چھا گئے قرن اولیٰ کے مسلمانوں نے نسب و حسب کے امتیازات کو بالکل خیر باد کہہ ڈالا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اجنبی نسل کے مسلمانوں کو اپنے اندر کیوں کر جذب کرتے،

اور اگر اجنبی لوگ دیکھتے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایک تو کفار کی طرف سے جور و تشدد ہو رہا ہے، وہ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان بھی انانیت پرست ہیں یہاں بھی امتیازی شان ہے شادی بیاہ کے مواقع پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسلام کو اس شوق سے قبول نہ کرتے۔ اگر انسان کے مقابلہ میں کبریائی کا یہی عالم ہوتا تو آخر اسلام میں کون سی خوبی باقی رہ جاتی — کہ غیر مسلم اس سے متاثر ہو کر اس کے حلقہ بگوش ہوتے قرآن مجید نے دوسری جگہ صاف اعلان کر دیا کہ مسلمان عورتیں جو بھاگ کر مدینہ میں آئیں انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو، کفار ان پر حرام ہیں

"اذا جاءکم المومنٰت مھٰجرٰت فامتحنوھن اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مومنٰت فلا ترجعوھن الی الکفار لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن"

جب تمھارے پاس عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو تم ان کی آزمائش کر لو، خدا ان کے ایمان سے زیادہ باخبر ہے پس جب تم جان لو کہ وہ مومنہ ہیں تو انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو۔ یہ (عورتیں) ان کے لئے حلال ہیں نہ وہ (کفار) ان کے لئے"

نبی اکرمؐ نے اپنی وسعت قلبی اور خلوص نیت سے محض قلیل عرصہ میں صدیوں کا پندار ختم کر دیا آپ نے خود اپنے گھرانہ کے اندر اجنبی نسل کے لوگوں کو جذب کر لیا آپ کے خاندان میں غلام بھی مل گئے اور لونڈیاں بھی یہ خلوص دیکھ کر کون تھا جو آپ کا پیام نہ سنتا آپ نے جو کچھ زبان سے فرمایا اسے خود کرکے بھی دکھایا آج ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سید و شیخ صاحبان عبائے دراز پہنکر ممبر پر کھڑے ہوتے ہیں، بڑے دردمند قوم بنتے ہیں اخوت اسلام کا درس دیتے ہیں ان کا ریاکارانہ وعظ و پیام صرف اسی لائق ہوتا ہے کہ سامعین سنکر تلخ تبسم سے کام لیں، یہ یہودیوں کی طرح سب سے ملتے ہیں لیکن خود کو سب سے ممتاز رکھنا چاہتے ہیں معاشرت کے رسوم و قیود نے انھیں حد درجہ مرعوب بنا رکھا ہے وہ کبھی کبھی اپنا ذاتی اثر و وقار پیدا کرنے کے لیے زبان سے تو اس کے خلاف نوحہ طرازیاں کر لیتے ہیں لیکن عمل کا وقت آتا ہے تو رسم و رواج کے خلاف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، ان کی انانیت اور ان کا پندار پوشیدہ طور پر ان پر مسلط رہتا ہے، پھر بھی اضطراری طور پر یہ اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے، جب کبھی جذبات ان کے تصرف سے باہر ہو جاتے ہیں

آں حضرتؐ کو نسب و حسب میں طعن کرنا نہایت گراں گزرتا تھا مسلم شریف میں ایک حدیث ہے جس میں "لطعن فی النسب" سے آپ نے منع فرمایا اس قسم کی حرکات سے خواہ مخواہ دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے، اور اخوت و محبت باقی نہیں رہتی امام بخاری نے ایک حدیث روایت کی ہے جس سے آپ کے قلب مبارک کی عجیب و غریب کیفیت پر روشنی پڑتی ہے حضرت زید ابن حارثہ آپ کے غلام تھے آپ ان کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے، محبوب کا محبوب بھی پیارا ہوتا ہے، حضرت زیدؓ کے لڑکے اسامہ پیدا ہوئے تو ان کو بھی آپ بہت زیادہ پیار کرتے تھے، چنانچہ احادیث میں ہے، کہ آپ حضرت اسامہ بن زید اور امام حسنؓ کو اٹھا لیتے اور فرماتے "اللھم احبھما فانی احبھما" (خداوندا، میں بھی انھیں پیار کرتا ہوں تو بھی انھیں پیار کر)

یہ تھے غلاموں اور غلام زادوں کے ساتھ آپ کے تعلقات، قربان جائیے ایسے ہادی پر، کیسے دردمند اور کیسے وسیع القلب تھے، بخاری میں ہے کہ ایک دن حضرت زیدؓ اور آپ کے صاحبزادہ اسامہ ایک ہی چادر میں لپٹے ہوئے سو رہے تھے دونوں صاحبوں کا پاؤں باہر نکلا ہوا تھا عرب کا ایک قیافہ شناس (مدلجی) اس طرف سے گزرا اس نے کہا یہ پاؤں تو ایک دوسرے سے نکلے ہیں نبی اکرمؐ نے سنا تو آپ خوش ہو گئے، آپ کو یہ بات بھلی معلوم ہوئی فسر بذلک النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اعجبہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے اس کا تذکرہ کیا[1] حضرت زیدؓ گورے تھے اور حضرت اسامہؓ کالے دنیا میں مختلف طبیعت اور مزاج کے آدمی ہیں، منافقوں کو شک ہوا کہ حضرت اسامہ زید کی اولاد نہیں ہیں آں حضرتؐ کی خوشی کی حالت پڑھکر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو لوگوں کے اس شک و شبہ سے صدمہ تھا کیونکر اگر یہ بات نہ ہوتی تو اسقدر خوشی کے کیا معنی؟

مسلمانو! پیغمبر صلعم نے یوں اسلام کو پھیلایا آپ کی محبت و ہمدردی کا یہ عالم تھا تب عرب جیسے سخت دل انسان مالوف ہوئے آج ہم ہیں کہ اپنوں کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اپنے سے جدا کرتے ہیں اور صحابہؓ نے اپنے خون سے سینچ کر نخل اسلام کو تر و تازہ بنایا خدا کے لیے اس کی شاداب و قوی ڈالیوں کو کاٹ کاٹ کر نخل کو باد حوادث کے حوالہ نہ کرو،

اس سلسلہ میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو عام مسلمانوں کے سننے کے لائق ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دولت و حکومت حاصل ہونے کے بعد لوگ خواہ مخواہ شیخ یا سید بن بیٹھتے ہیں اسلام نے یہ حرکت سخت مذموم قرار دی ہے حدیث شریف میں ہے،

عن ابی ذر انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیس من رجل ادعی لغیر ابیہ وھو یعلمہ الا کفر ومن ادعی قوما لیس لہ فیھم فلیتبوأ مقعدہ من النار

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی صلعم سے سنا کہ جس نے جان کر اپنے باپ کے علاوہ خود کو کسی دوسرے کا بیٹا بتایا اس نے کفر کیا اور جس نے جھوٹ موٹ کسی قوم کی طرف منسوب کیا اس نے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا

یہ قابل غور بات ہے کہ اسلام نے اس سے کیوں منع کیا؟ کیا اسلام ہماری ترقی نہیں چاہتا کیا وہ چاہتا ہے کہ ہم نسلاً بعد نسل سوسائٹی میں فروتر ہی سمجھے جائیں؟ حاشا یہ بات نہیں اگر نسبی شرافت اسلام کے نزدیک قابل قدر چیز ہوتی تو یقیناً اسلام ہمیں اس "نعمت" کے حاصل کرنے سے منع نہ کرتا لیکن اسلام چونکہ نسلی امتیاز کو مٹانے کے لئے آیا تھا اس لئے اوس نے ابن الوقت قسم کے لوگوں کو اس حرکت ذمیمہ سے منع کر دیا تاکہ لوگ خواہ مخواہ نسب کی افسانہ تراشیاں کر کے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ارباب جاہ و حکومت کے سامنے نسب و حسب کے بڑے بڑے مدعیوں کا سر خم ہوگا جیسا کہ ہوتا ہے اور دولت و مال و زر جاہ و منصب کے زیر اثر ان حضرات سے رشتہ جوڑیں گے، جن کو کوئی نسلی امتیاز نہیں، اور اس صورت سے خود بخود تخیل نسب میں اعتدال پیدا ہو جاوے گا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو سوسائٹی میں فروتر

---

[1] بخاری کتاب المناقب

سمجھا جاتا ہے، مال و دولت، علم وفضل حاصل کرنے کے بعد خود کو قریشی یا ہاشمی بتا کر مفلس شیخ سید کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے ظاہر ہے کہ یہ سخت ذلیل حرکت ہے اور اس سے ہماری سوسائٹی میں برُے نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں جھوٹ موٹ کی نسبی افسانہ تراشی آج عام طور پر مروج ہے، اور مسلمانوں کے اکثر گھرانے جو اپنی شرافت ونجابت کا پندار رکھتے ہیں، غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں نسبی تخیل کو مٹانے کی ہرگز یہ صورت نہیں ہو سکتی اس سے چند در چند بُرائیاں ہوتی ہیں اول تو یہ کہ راز طشت از بام ہوتے کے بعد جانبین کے حسیات ہمیشہ کے لئے مجروح ہو جاتے ہیں اور ازدواجی تعلقات سے جو باہمی ارتباط ہونا چاہئے نہیں ہوتا دوسری بُرائی یہ ہے کہ ایسی طبیعتوں کے اندر جن کے گھرانوں میں اس قسم کا واقعہ ہوتا ہے، نسبی شرافت کا ادعا اور بڑھ جاتا ہے اور وہ نسبی تخیلات کی الجھنوں اور طعن وتشنیع میں زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں اسلام نے عام اجازت دیدی ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے کفو ہو سکتے ہیں البتہ فقہائے متاخرین کے رجحانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کفو کی تعیین کردی ہے ۔ لیکن اس سے اسلام کا عام قانون نہیں بدل سکتا، ایسے غداروں کو جو جھوٹ موٹ نسب نامہ گڑھ لیتے ہیں سعی سیاہی اور بھی فروتر سمجھتی ہے، اس لئے چاہیئے کہ انسان نسبی افسانہ تراشی کرنے کے بجائے، اپنی اخلاقی اور اقتصادی حالات پر نظر کرے اور اسی کی اصلاح میں لگا رہے، اس طور سے خود بہ خود یہ تخیل اعتدال پر آجائے گا ۔ اور جب ازدواجی رشتہ داریاں ظاہر طور پر عام ہو جاویں گی تو پھر نسبی امتیاز باقی نہیں رہے گا، نجابت وشرافت کے مدعی پوشیدہ طور پر تو آج بھی مال وجاہ کی طمع میں ازدواجی رشتہ قائم کر لیتے ہیں لیکن چونکہ یہ خفیہ کارروائی ہوتی ہے، اور اس کے بعد سوسائٹی کے وہ (اصطلاحی) فروتر اصحاب جو اعلیٰ طبقات میں داخل ہو جاتے ہیں اپنی اصلیت کو محجوب کر لیتے ہیں اس لئے اس کا اثر عوام پر کچھ نہیں ہوتا اگر یہی بات بہ بانگ دہل کی جاتی، تو اسلامی سوسائٹی کے مبارک ایام دُور نہ تھے کیونکہ اس سے اوروں کو ترغیب ہوتی اور پھر کسی کو فخر ومباہات کا موقعہ ہی نہ تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا بعض غدار لوگ شرافت ونجابت کے دعویداروں کو دھوکہ دیتے ہیں اور اپنی سعی باطل سے اصلاح کے بجائے چند در چند خرابیاں پیدا کر لیتے ہیں جس سے دنیا اور دین دونوں کا خسران ہے،

حضرت جامیؒ نے ایسے لوگوں کی ہجو میں ایک پُر لطف نظم لکھی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے،

ہیچوں این جاہلان جاہ طلب　　که غلو کردہ در علو نسب
پدر و مادر از نسب عاری　　پسر افتادہ در نسب داری
دی پسر از اراذل قدری　　پسر امروز سید علوی
مادرش لولی و پدر لالہ　　او زند دم ز حیدر و زہرا
سازد از آل مصطفیٰ خود را　　گوید از نسل مرتضیٰ خود را
گوید این لیک خلق دفعل فنش　　می کند دم بدم دروغ زنش
پسرے کش پدر مغیرہ بود　　مرنبی را چساں نبیرہ بود

کے بود زاہل بیت آں نااہل — کہ گریزد ز جہل او بوجہل
زد خرے لاف با خران دگر — کہ مرا ارثش رستمست پدر
داد ز انہا یکے جوابش باز — کہ گواہ تو بس دو گوش دراز

می ندانم کہ با ولی و نبی — ایں چہ گستاخیست وبے ادبی
ناکساں چوں کنند بے باکاں — نسبت خویش با چناں پاکاں
مایۂ زرق وقلبی و دغلی — چوں بود نقد جان مصطفےٰ وعلی
مرغ بایل بہ دانہ تلبیس — چوں بود ز آشیانۂ تقدیس
میوۂ بد مذاق تلخ سرشت — چوں بود از درخت بہشت
کے چوں نافہ خریطۂ سرگیں — فتد از ناف آہوئے مشکیں
ہذیان مسیلم کذاب — چوں بود زادہ حدیث کتاب

لعن اللہ تارک الادب — داخلا بینھم بغیر نسب
باد لعنت براں کہ مہرۂ خر — کرد پیوند سلک دُر و گہر
باد لعنت براں کہ دیدہ بدوخت — خاک تیرہ بہ زخ مشک فروخت
پیش ازیں فاضلاں لیسے بودند — کہ زکسب ہنر نیا سودند
بود در ہر زماں و در ہر حال — سعی شان در مزید فضل وکمال
ہنرے جائے گرد در دل شان — کہ بہ کوشش نہ گشت حاصل شان
نسب اہل بیت برخواندند — لیک در کسب آں فرو ماندند
با کمال جلی و قدر سنی — نہ حُسینی شدند و نے حسنی
حبذا قابلان ایں دوراں — کز حسب آنچہ بود در امکاں
عمر در جستجو بسر بُردند — تا ز امکاں بہ فعلش آوردند
بعد ازاں پائے سعی فرسودند — در نسب راہ کسب پیمودند
از نسب نامہائے آل رسول — ہر نسب شاں کہ او فتاد قبول
نسبت خویشتن بداں کردند — گوہر خویش راعیاں کردند

شد ز جولاہگی و والگری — حال شان منتقل بہ آل گری
ایک با شد بہ حکم عقل محال — کہ گلیم سیاہ گردد آل
آں خساں کین محال می طلبند — زر درونی آل می طلبند

مجھے یہاں تک تو مولانا جامی سے اتفاق ہے لیکن آپ کے مفصلۂ ذیل ابیات قابل احتجاج ہیں

ابفرست اے خدائے حاجے — بر سر او ز معدلت تاجے
تا چناں کاولین نفس جہول — کردجد در زوال آل رسول
کند ایں آخریں بہ دانش وداد — دفع ایں زادگان شر و فساد
شوید از آب تیغ تیز آثار — از شعار جمال آل ایں عار

منقولۂ بالا ابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف کو یہ گوارا نہیں کہ جائز طور پر بھی آل رسول سے اتحاد ہو کیونکہ جب کسی شخص کے علوی یا آل رسول بننے سے آپ کے نزدیک سادات کرام کا زوال ہوتا ہے تو پھر کیونکر خاندان رسالت سے کوئی (اصطلاحی) فروتر درجہ کا مسلمان ازدواجی رشتہ قائم کر سکتا ہے جامی نے شاعرانہ غلو سے کام لیا ہے میرے خیال میں نہ کسی کے جھوٹ موٹ آل رسول بننے سے سادات کرام کی توہین ہوتی ہے نہ ان کے شاتھ خاندانی لگاؤ قایم ہونے کے باعث سادات کی نسلی خصوصیت بدل سکتی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو "زوال آل رسول" کے کیا معنی؟ جو شخص آل رسول یا علوی بنتا ہے، وہ البتہ ہماری تمدنی زندگی کے اعتبار سے ایک ناقابل عفو معصیت کوشی کر رہا ہے؛ کیونکہ اس کا اثر ہماری قومی ذہنیت و اخلاق پر پڑتا ہے، اس قسم کی افترا پردازیوں سے نسلی امتیاز کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اور ہمارے اندر فرقہ دارانہ عصبیت کی پرورش ہوتی ہے پس ایسے افراد سے "زوال آل رسول" تو نہیں ہوتا لیکن ہماری قومی حیات کے اوراق ضرور پریشان ہو جاتے ہیں

باعث مدعی بریں وسواس — نیست جز حب جاہ عند الناس
تا بیابد ز عام و خاص قبول — می کند خویش را ز آل رسول
چوں ندارد قرابت دینی — دم زند از قرابت طینی
نسبت جان و دل چو باشد سست — نسبت آب و گل چہ سود درست
بود بوطالب آں تہی ز طلب — مر نبی را عم و علی را اب
خویش نزدیک بود با ایشاں — نسبت دیں نیافت با خویشاں
ہیچ سودے نداشت آں نسبش — شد مقر در سقر چو بولہبش

اس کے بعد جامی نے ایک عمدہ حکایت لکھی ہے، جو سادات و شیوخ کے لئے عبرت آموز ہے،

شیخ منّ کہ در فضائے وجود — کش از دمہ بود زاہل شہود
بود صافی ز زنگ کبر و ریا — تافتی و عکس کبریائے خدا
بادشاہانہ مجلسے می ساخت — نہ ز صحبت بہ ہر کسے می باخت
بر رو زنے ز ذوق راہروی — رہ بداں جمع سیّد علوی
شوکت و جاہ شیخ را چو بدید — شوک آں شوکتش بہ سینہ خلید
گفت ہستم من آل پیغمبر — ایں بزرگی مرا بود درخور
با چنیں رفعت نسب کہ مراست — ایں بزرگی نصیب شیخ چراست
ہر خیالے کہ در مقابل شیخ — گرد اندیشہ تافت بر دل شیخ
شیخ آئینہ ہست لیک کری — رویش از زنگ احتجاب بری
ہر چہ ظاہر شود ز جملہ جہات — منعکس گردد اندران مرآت
پیش ایں شیخ گر روی زنہار — خاطر از زشت و خوب خالی دار
کانچہ باشد بداں دل تو گرو — بر دل شیخ افگند پرتو

گفت القصہ شیخ با علوی — کاے فروغ چراغ مصطفوی
نہ از نسب یافتی آنچہ جد تو یافت — از نسب کس بہ قرب حق نشتافت
گر نسب ساختے سر افرازش — بولہب نیز بودے انبازش
من ہم ایں از نسب نیافتہ ام — بلکہ در پے روی شتافتہ ام
مصطفی را ز فضل ربانی — گشتہ ام در متابعت فانی
بر رہ سنتش فرو شدہ ام — تا بحدے کہ جملہ او شدہ ام
ہستی من در وجود او برسید — حق بہ محبوبی خودم بگزید[۱]

---

[۱] پٹنہ اورنیٹل لائبریری میں جامی کی غزلیات و نظموں کا ایک مجموعہ ہے، اس قلمی نسخہ کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ خود جامی کا لکھا ہوا ہے کیونکہ اس کتاب کے اول صفحہ پر آپ کے صاحبزادہ ضیاء الدین کی تاریخ ولادت ثبت ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ اکثر غزلیں اور مقطعات جو اس کے حاشیہ پر ثبت ہیں خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، بہرحال یہ کتاب حضرت جامی کی نظروں سے گزری تھی، اور اسلئے بہت گرانمایہ و نادر ہے، یہ چند اشعار بالا ابیات اسی نسخہ سے لئے ہیں،

مشجرہ اہل بیت

اگلے سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایام جہالت میں نسب و حسب کے متعلق عربوں کا کیا تخیل تھا اور اسلام نے اپنی تعلیمی ضیا باریوں سے کون سی فضا پیدا کر دی آں حضرت صلعم کی پاک سیرت اور وسعت قلبی نے سارے عربوں کو اخوت کے نشہ میں سرشار کر دیا اب وہی مغرور قریشی و ہاشمی عرب و عجم کے نو مسلموں کو اپنے اندر جذب کرنے لگے، صہیب رومیؓ، حضرت بلال حبشی، مقداد ابن اسود، زید بن حارثہ کو قریشیوں نے جس نگاہ احترام سے دیکھا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے، مقدادؓ کا نکاح بی بی صفیہ (قرشیہ) سے ہوا۔ زیدؓ کا زینب بنت جحش (ہاشمیہ) سے اسی طرح تاریخ میں بہت سی نظیریں ہیں لیکن یہاں مجھے اپنے موضوع کے لحاظ سے صرف ''امومت'' (ماں کے متعلق) پر بحث کرنا ہے، جانے دیجئے بخاری کی اس روایت کو جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے سارے عربوں کو خطاب کر کے کہا ہے کہ اے بنی ماء السماء!

(پانی کی اولاد) تم ابراہیم کی لونڈی کے بطن سے ہو، جانے دیجئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہالی رشتہ داروں بنی نجار (جو قریشی نہ تھے بلکہ انصاری تھے) کے تذکرہ کو آئیے آں حضرت صلعم کے بعد آپ کے اہل بیتؑ کے مشجرات پر غور کریں تاریخ و انساب کا ایک طالب العلم سخت حیران رہ جاتا ہے جب وہ روایات کے خلاف اپنے تنگ معاشرت پر غور کرتا ہے، حقیقۃً زندگی نام ہے ایک فریب خیال کا ایک مغالطۂ نفس کا اور ایسے اوہام و ظنون کی بیجا پرورش کا جو زندگی کے آلام و مصائب میں انسان کے لئے سامان سکون ہو جاتے ہیں نسب کا تخیل اور اس کا پندار انسان کے اندر صرف اسی لئے پیدا ہوا تاکہ اس کی آرزوہائے پامال کے لئے تعزیت کا کام دے انسان اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک سہارا تلاش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس فریب خیال سے بڑی حد تک انسان کو سیرابی ہو جایا کرتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان اس مغالطہ سے صرف اپنی غمناک گھڑیاں ہی خوشگوار بنا لیتے پر قانع نہیں بلکہ اس کو اس نے اپنی اخوت کی تباہی، اجتماع کے انہدام، قومیت کی بیخکنی کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان ''مے شبانہ'' کو بھول کر جس نے ان کو نشۂ قومیت میں سرشار کر دیا تھا آج اس تباہ کن ''بادۂ صبوح'' کے دلدادہ بنے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنی اجتماعی قوت اپنے قومی نشو و ارتقا کو محض فریب نفس اور مغالطہ خیال پر قربان کرتے جاتے ہیں ع بنگر وظیفۂ سحر و ورد شام ما

مسلمانوں کے تمام طبقات میں عام ازیں کہ سوسائٹی میں وہ بالاتر سمجھے جاتے ہوں یا فروتر یہ مرض پایا جاتا ہے کہ جہاں اپنی ذات کے کسی فرد نے کسی دوسری ذات کی عورت سے عقد کیا پھر وہ ''برادری'' سے خارج سمجھا جانے لگا، اور صفت یہ ہے کہ اس طبقہ کے علما بھی ان ''خارج برادری'' افراد سے ازدواجی و معاشرت و معاشرانہ تعلقات نہیں رکھتے شیوخ و سادات کو لے لیجئے وہ بہت زیادہ اس بلا میں مبتلا ہیں اور روزانہ اپنی قبائلی خصوصیات کو کھوتے جاتے ہیں نہ ان کے پاس علم ہے نہ دولت نہ تنظیم ہے نہ قرینہ اگر کسی سید یا شیخ نے کسی غیر نسل کی عورت سے شادی کی تو اس کی اولاد کو طرح طرح کے برے القاب سے یاد کرتے ہیں جس طرح جہالت عرب میں ''ہجین'' اور ''مقرفین'' کی اصطلاحیں تھیں اور جس طرح ہنود ''سر لوا الال'' اور ''غلا'' پکارتے ہیں اسی طرح ایک سید اور شیخ اپنی برادری کے ان افراد کو ذلیل نگاہ سے دیکھتا ہے جو غیر برادری کی عورتو

کے بطن سے ہوں حالانکہ تمام سادات اور شیخ آں حضرتؐ کے زمانہ سے آجتک اپنے وضعی معیار نجابت کے مطابق اصل حالت میں بھی نہیں اور میں اس وقت تاریخ اور انساب کے اسی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں،

عام طور پر مسلمان شریف و نجیب اس کو کہتے ہیں جس کے ماں اور باپ پشتہا پشت اور ایک غیر معلوم زمانہ سے ایک ہی نسل کے ہوں اور کوئی واقعہ جدات پدری (دادیوں) اور جدات مادری (نانیوں) کے سلسلہ میں ایسا نہ ہو جو غیر نسل کے ساتھ آمیزش پر دلالت کرتا ہو، اگر ایسا ہے، تو پھر نہ تو اس کی شرافت باقی رہتی ہے نہ نجابت بلکہ " دوغلا " کہلاتا ہے، اگر معیار نجابت یہی ہے تو آئیے دیکھیں اہل بیت اطہار جن کی سیادت و شرافت دنیا میں مسلم ہے اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

(باقی آیندہ)

عبدالمالک آروی

شبنستان کا قطرۂ گوہریں

(بہ سلسلۂ ماسبق)

ملکۂ ناہید ایک قد آدم آئینہ کے سامنے خاموش کھڑی ہوئی اپنے سراپا کو غور سے دیکھ رہی ہے اور کوشش کر رہی ہے۔ کہ دربار میں جانے سے قبل خشونت و برہمی کے پورے آثار اپنے اوپر طاری کر لے، تاکہ وہ شہرت جو مردوں کی طرف سے اظہار بیزاری میں اسے حاصل ہو چکی ہے، بدستور قائم رہ سکے کبھی وہ اپنی پیشانی میں شکنیں ڈال کر اپنے چہرہ کو دیکھتی ہے۔ ابروؤں کے درمیاں کی گرہ کو چٹکی سے پکڑ کر اسے قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی وہ اپنی آنکھوں کے انداز خیرگی سے خشونت کی کیفیت طلب کرتی ہے کبھی سانس روک کر چہرہ میں سرخی اور گردن کی رگوں میں ابھار پیدا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اسے کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا، کہ آج وہ اپنے آپ کو اسی ناہید کی حیثیت سے پیش کر سکے گی، جو مرد کا نام آتے ہی اپنے غصہ سے تمام دربار کو رعشہ براندام کر دینے میں مہارت تامہ رکھتی تھی ——— نوبہار جو دور سے کھڑی ہوئی اس "اہتمام دل آزاری" کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی، آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اور سر جھکا کر بولی کہ "ملکۂ عالم کا انتظار ہو رہا ہے اور وزرا حاضر ہیں، مرزا شاہرخ بھی معہ اپنی محبوبہ کے پابزنجیر لایا گیا ہے اور جلاد بھی حکم شاہی کی تعمیل کے لئے شمشیر بکف موجود ہے"

ملکہ ——— (آستینیں چڑھاتے ہوئے) حاضر رہنے دو۔ (آئینہ میں پھر ایک بار اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے) لیکن اے نوبہار! مجھے یہ آج کیا ہو گیا ہے، کیا میرا احساس مٹتا جا رہا ہے، کیا میری فطری غیرت و خودداری محو ہو رہی ہے ——— مجھے معلوم ہے، یقین ہے کہ ایک ظالم و شفاک مرد کے سر قلم کئے جانے کا حکم مجھے دینا ہے، لیکن نہ میری دل میں کوئی کیفیت برہمی کی پیدا ہوتی ہے، نہ چہرہ سے آثار جلال ——— تمام اہل دربار جو ایسے مواقع پر مجھے دیکھتے ہوئے تھرا اٹھنے کے عادی ہیں آج وہ مجھے دیکھ کر کیا کہیں گے ——— میں ابھی تک اسی اولین حصۂ شب کے خیال سے لذت اندوز ہو رہی ہوں جو تیری معیت میں بسر ہوا تھا۔ میرے اندر ہنوز وہی تبسم مسرت موجود ہے جو کل شام کی گلگشت میں تجھے دیکھ دیکھ کر میرے عروق کے اندر خون کے ساتھ ملا ہوا دوڑ رہا تھا ——— تو پھر کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں شاہرخ کے قتل کا حکم دوں اس کیفیت کے ساتھ کہ تبسم میرے لبوں پر کھیل رہا ہو، ایک فوارۂ خونیں کے بلند ہونے کا منظر دیکھوں اس حال میں کہ میری پیشانی پر ایک شکن بھی موجود نہ ہو۔ دنیا مجھے کیا کہے گی، میں دنیا کو کیونکر منہ دکھاؤں گی

نوبہار ——— "ملکۂ عالم، کیا ہنس ہنس کے ذبح کرنے سے زیادہ پر لطف صورت جور و ستم کی کوئی اور ہو سکتی ہے۔ یہ مجبوری تو صرف مرد ہی کو ہے کہ جب وہ کسی کو قتل کرے گا تو اس کی آنکھوں سے خون بھی ضرور ٹپکے گا، لیکن عورت تو اتنی بے بس نہیں کہ وہ کسی کو ذبح کرے اور مسکرائے بھی نہیں، علی الخصوص ملکۂ عالم کی سی کوئی عورت کہ اس کا تبسم ہی دیت و خونبہا بھی ہو ——— اگر

ملکۂ عالم کو اس کا علم ہوتا کہ بعض کا تبسم بھی عریاں خنجر سے کم نہیں ہوتا، تو شاید اس اہتمام کو ضروری نہ سمجھا جاتا ،،

ملکہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر نو بہار کے قریب آگئی اور اپنے ریشمی معطر بالوں کو جو گھڑی گھڑی پیشانی پر آجاتے تھے ہٹاتی ہوئی بولی " ہاں، نو بہار، اس داستانِ محبت کو ختم کر، جو کل رات تو نے شروع کی تھی، تو جب وہ نقاش آیا اور اس نے تجھ سے جانے کی اجازت طلب کی تو کیا جواب دیا، غالباً تو پہلے بہت ہنسی ہوگی اور پھر کہدیا ہوگا کہ جاؤ ،،

نو بہار ——— " ملکۂ عالم ایسی کہانی رات ہی کو کہی جاتی ہے اور خاصکر اُس رات کی کہانی، جس رات میں سب سے پہلے کسی کو شباب و محبت کی کیفیت کا علم حاصل ہوا ہو ——— لیکن یہ بتائے دیتی ہوں کہ میں نے اس سے وہ نہیں کہا جو ملکۂ عالم نے سمجھا ہے بلکہ میں خاموش ہوگئی اور جب اس نے مجھ سے اس خاموشی کا سبب دریافت کیا تو میں اس کے شانہ پر سر ڈال کر رونے لگی ——— لیکن خیر اس کی تفصیل تو میں پھر عرض کروں گی، فی الحال تو ملکۂ عالم کو فسانہ سننا نہیں ہے، بلکہ باہر دربار میں جا کر ایک نیا فسانہ پیدا کرنا ہے خواہ وہ کیسا ہی خونیں و الم انگیز کیوں نہ ہو"

ملکہ ——— " مگر اے نو بہار، کیا کروں ہمت نہیں ہوتی کہ باہر جاؤں اور لوگوں کو اس سرگوشی کا موقع دوں کہ ملکۂ ناہید شاید اپنے قانون کی غلطی کو محسوس کرنے لگی ہے ——— اچھا تو جا، دربار کو برخاست کردے اور شاہرخ و نیلوفر کو یہیں میرے حضور میں لے آ ،،

شاہرخ، شبنمستان کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے کا نوجوان تھا، اور تمام اُن صفات سے متصف تھا جو ایک بلند خاندان کے انسان میں پائی جانی چاہئیں ——— وہ فنونِ سپہ گری کا ماہر تھا اور مردانہ کھیلوں میں بارہا اہلِ ملک سے تحسین حاصل کرچکا تھا، بلکہ اس کی داستانِ محبت کی ابتدا ہی اس طرح ہوئی تھی کہ میدانِ مسابقت میں جب ایک خونخوار شیر چھوڑا گیا اور شاہرخ کی تلوار نے اس کو دو نیم کرکے رکھدیا تو سب سے قیمتی انعام جو اسے ملا وہ نیلوفر کا دل تھا، لیکن چونکہ بدقسمتی سے ان دونوں خاندانوں میں عرصہ سے مخالفت چلی آرہی تھی اس لئے نیلوفر کا باپ کامران شادی پر راضی نہ ہوا اور آخرکار شاہرخ نے مجبور ہوکر نیلوفر کے والدین کی اجازت حاصل کئے بغیر اس کو اپنا بنالیا ———

شاہرخ اور نیلوفر دونوں قصر کے ایک کونہ میں اس طرح خاموش کھڑے ہوئے ہیں، گویا کسی ہیکل میں دو مجسمے قائم ہوں اور اپنے پجاریوں کا انتظار کر رہے ہوں۔ کیونکہ اگر شاہرخ مردانہ حُسن کا مکمل نمونہ تھا تو نیلوفر بھی حُسنِ انسانی کی ایک بے مثل مورت تھی اور ان دونوں کو یکجا دیکھنے سے ہر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو دو علیحدہ فرصتوں میں بنایا ہے ملکۂ ناہید دور سے ان دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح اپنی برہمی کا اظہار ان پر کرے نو بہار جو اس منظر کی تمام کیفیات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، ملکہ کے پاس کھڑی ہوئی منتظر تھی کہ دیکھئے ملکہ کیونکر گفتگو کا آغاز کرتی ہے اور کس نتیجہ پر پہونچتی ہے ———

ملکہ دفعۃً ٹہلنے لگتی ہے اور پھر کچھ دیر کے بعد ایک جگہ ٹھہر کر نیلوفر کی ذات بڑھتی ہے اور اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی

کو اوپر اٹھا کر پوچھتی ہے۔ " نیلوفر یہ تو نے کیا کیا۔ کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ شاہرخ، کامراں کے خاندان کا دوست کبھی نہیں ہو سکتا؟"

نیلوفر —— (آنکھوں میں آنسو لاکر) ملکۂ عالم، مجھے کامراں کے خاندان اور شاہرخ کو اپنے خاندان سے اب کیا واسطہ ——

نوبہار —— (بات کاٹ کر) کیوں واسطہ کیوں نہیں —— ملکۂ عالم نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ اس کی رعایا میں باہم خاندانی نزاع قائم رہے اور اس لئے اگر کوئی صورت کسی ایسی مخالفت کے دور کرنے کے پیدا ہو سکتی ہے تو ارادۂ شاہی اُسے نگاہِ استحسان سے دیکھنے میں کبھی پس و پیش نہیں کر سکتا۔ نیلوفر، تم کو عطوفت شاہانہ سے درخواست کرنا چاہئے کہ وہ اس واقعہ کو ان دونوں خاندانوں کی نزاع دور کرنے میں مثال کے طور پر قائم کرے اور اگر کوئی قانونی فروگذاشت ہوئی ہے تو اس کو اپنے رحم و کرم سے معاف فرما دے۔"

ملکۂ ناہید، نوبہار کی یہ تقریر سنکر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ایک ایسے تبسم کے ساتھ جس میں لطف سے زیادہ تنقید کا عنصر شامل تھا بولی کہ " اے نوبہار، اگر تجھے شبنمستان پر حکومت کرنے کا شوق ہے، تو میں وہ بھی تیرے سپرد کر دینے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن قبل اس کے کہ تجھے یہ اختیار ملے، اس کے صرف کرنے میں اس قدر عجلت سے کام لینا مناسب نہیں۔ یقیناً میں پسند نہیں کرتی کہ ملک کے امن و سکون میں اضطراب پیدا ہو، اور ہو سکتا ہے کہ رشتۂ ازدواج کو دو مخالف خاندانوں میں باہم صلح پیدا کرانے کا بہانہ قرار دیا جا سکے، لیکن کیا شاہرخ کو معلوم نہیں تھا کہ ایسی صورت میں اسے سب سے پہلے رخصتِ شاہی حاصل کرنا چاہئے تھی، علی الخصوص ——"

نوبہار —— (بات کاٹ کر) [illegible] اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ ملکۂ عالم سے بارہا اس قسم کی اجازت طلب کی گئی اور کبھی نامنظور نہیں ہوئی۔ رہا شبنمستان پر حکومت کرنے کا شوق ہو، اس کی تمنا مجھے کیا ہو سکتی ہے جبکہ میں جانتی ہوں کہ عورت نام ہے صرف "لغزش" کا، جو تخت شاہی پر نہیں بلکہ خلوت ہی میں کچھ اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

نوبہار کا یہ جواب ایسا زبردست طنز رکھتا تھا کہ ملکۂ ناہید میں تھوڑی دیر کے لئے اُس غضبناک شیرنی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جس کے لئے راہ فرار بالکل مسدود ہو، لیکن نوبہار کی نگاہوں سے تصادم ہوتے ہی وہی عالم ہوا جیسے کوئی چھوئی موئی کے درخت کو چھو لے اور اس کی شاخیں جھک کر رہ جائیں۔ وہ دیر تک خاموش رہی، سر پکڑ کر کچھ سوچتی رہی۔ اس کے چہرہ پر ایک خاص قسم کا حزن و ملال طاری تھا، اس کی صورت اداس تھی اور آنکھوں سے عجیب طرح کی تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا نوبہار نے اُس کی توہین نہیں کی اور کیا یہ اس کو برداشت کرنا چاہئے۔ اس نے ایک بار ارادہ کیا کہ نوبہار کو باہر چلے جانے کا حکم دے، لیکن اسی خیال کے ساتھ ہی معاً وہ تمام لذتیں و سرشاریاں یاد آنے لگیں جو نوبہار کی معیت میں اسے حاصل ہوتی تھیں اور پھر ضبط کر کے ایسے انداز کے ساتھ جس میں معقولیت سے زیادہ مغلوبیت پنہاں تھی، شاہرخ سے مخاطب ہو کر بولی کہ ——

" اے شاہرخ، نیلوفر میں وہ کیا بات تھی جس نے تجھے احکام شاہی کی مخالفت میں شدید ترین عقوبت برداشت کرنے پر جری بنا دیا؟"

شاہرخ ——— "ملکۂ عالم میں کیا عرض کر سکتا ہوں، جب کہ آج تک کسی کو بھی دنیا میں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مقناطیس لوہے کو کیوں کھینچ لیتا ہے، چاند کو دیکھ کر چکور کیوں دیوانہ ہو جاتا ہے، شمع پر قربان ہونے کے لئے پروانہ کیوں مجبور ہے"

ملکہ ——— "میں اس وقت شاعری سُننے کے لئے آمادہ نہیں، اور نہ میں ان دُور از کار مہمل تشبیہات سے مطمئن ہو سکتی ہوں (نیلوفر سے مخاطب ہوکر) تو بتا کہ شاہرخ میں وہ کونسی خصوصیت تھی کہ تو نے اس کے لئے فرمان شاہی سے سرتابی کی بھی پرواہ نہ کی، کیا تجھے معلوم نہیں کہ مرد نے اس وقت تک عورت پر کیا کیا ظلم توڑے ہیں اور یہ قوم عورت کی کمزوری سے کس قدر فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کی محبت یکسر فریب اور اس کی شیفتگی سراپا مکر و خود غرضی ہے، اس کا عورت سے محبت کرنا اپنے نفس سے محبت کرنا ہے اور اس کا ایثار عورت کے لئے ایک صیاد کا سا دام ہے جس سے وہ شاہین کا شکار کرنا چاہتا ہے پھر جب تک عورت پر اس کو اقتدار حاصل نہیں، وہ ایک غلام سے زیادہ تابع فرمان نظر آتا ہے، لیکن ایک بار اس پر قابو پانے کے بعد وہ ایک گرسنہ شیر ہے جو کسی طرح اپنے صید زبوں کے جسم سے اپنے پیوست ہو جانے والے ناخن و چنگال جدا کرنے کے لیے طیار نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ تو اس حقیقت کو معلوم کر کے، شاہرخ سے اپنی بیزاری کا اعلان میرے سامنے کر دے، تاکہ میں رشتۂ ازدواج کے قطع کر دئے جانے کا حکم دیکر تجھ کو پھر ایک بار دُنیا میں مسرور زندگی بسر کرنے کا موقعہ دوں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی غور کروں کہ قصاص سے کم وہ کون سی سزا ہے جو شاہرخ کو دی جا سکتی ہے"

نیلوفر ——— "اے ملکۂ عالم، اگر شاہرخ کی جان بخشی اسی طرح ممکن ہے تو میں اس کے لئے بھی ———"

نیلوفر یہیں تک کہنے پائی تھی کہ شاہرخ نے آگے بڑھ کر اس کے منھ پر ہاتھ رکھدیا۔ اور ملکہ سے مخاطب ہوکر بولا ——— "کیا شبنمستان کے خاندان شاہی کے افراد اسقدر عقل سے دور ہیں کہ جس وقت وہ دوسروں کی داستان مکر و فریب بیان کرنے لگتے ہیں، تو ٹھیک اسی وقت وہ خود اپنے مکر و فریب کو بھی چھپانے پر قادر نہیں ہو سکتے؟ مرد کا عورت کو دھوکا دینا تاریخی حقیقت سہی لیکن کیا ایک عورت دوسری عورت کو اس سے زیادہ دھوکا دے سکتی ہے جو اس وقت شبنمستان کی ایک جلیل القدر ملکہ، غریب شاہرخ کی معصوم بیوی نیلوفر کو دینا چاہتی ہے ——— جان کے قیمتی ہونے کا ذکر نیلوفر سے کیا جاتا ہے جس کی حیات کا تنہا مقصود، مرد کی..... پرستش ہے۔ لیکن ملکۂ ناہید "میرزا شاہرخ بیگ" سے استمزاج کی تکلیف گوارا نہیں فرماتیں، تاکہ وہ بتاتا کہ حیات انسانی جس کا سودا کبھی صرف "نیم نگاہ محبت" سے ہو جاتا ہے کسی وقت اسقدر گراں ہو جاتی ہے کہ اُسے شبنمستان کی صاحب لعل و گہر ملکہ بھی نہیں خرید سکتی"

ملکہ یہ سنکر غصہ سے بیتاب ہوگئی اور نہایت بلند آواز سے بولی کہ "شاہرخ خاموش ہو جا قبل اس کے کہ جلاد کی تلوار تجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کرے"

شاہرخ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) اپنے غصہ اور جلاد کی تلوار سے اس بُزدل کو ڈرا، جو تجھ سے اس عارضی زندگی کے لیے چند سانسوں کی بھیک لینے کا آرزومند ہو۔ وہ شخص جو "گرانبار کرم" زندگی کو موت سے بدتر جانتا ہے، اس کے لیے تیری پیشانی کی یہ شکنیں، بستر کی وہ شکنیں ہیں جن پر نگاہ ڈالے بغیر صبح کو سو کر اٹھنے والا باہر نکل جاتا ہے ——— کیا تجھے

یقین ہے کہ نیلوفر، مجھ سے جدا ہو کر کسی اور کی آغوش کو قبول کر لے گی اور کیا میں اس سے جدا ہو کر اسقدر ضعیف وناتوان ہو جاؤں گا کہ اگر جلاد کی تلوار میرے گلے تک نہ پہونچے تو میں خود اپنے حلقوم کو اس تک پہونچا سکوں۔ اے ملکہ، ہوش میں آ، اپنے لطف وکرم کا جاد صرف اُن بے غیرت ہستیوں پر ڈال جو تیرے دروازہ پر کتوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، جان دینے والوں سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں "

ملکہ نے جس کا سارا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے شاخ بید سے کوئی طایر اڑ کر چلا جائے اور وہ دیر تک تھرتھرایا کرے، میز پر جلدی جلدی فرمان قصاص لکھا اور نوبہار کو بلا کر حکم دیا کہ " یہ فرمان وزیر اعظم تک ابھی پہونچا دیا جائے "

نوبہار نے اسے دیکھا تو سر سے پاؤں تک کانپ گئی کیونکہ اس میں نہ صرف شاہرخ بلکہ نیلوفر کے بھی تہ تیغ کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی تعمیل کی گئی تو ملک میں جو پہلے ہی سے برافروختہ تھا، بہت زیادہ ہیجان پیدا ہو جائیگا۔ اس نے جانے میں کچھ تامل کیا تو ملکہ نے غضب آلود نگاہوں سے اُسے دیکھ کر پوچھا کہ یہ پس وپیش کیسا؟ "

نوبہار نے کہا کہ " اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں اور وہ یہ کہ ان مجرموں نے جسقدر گستاخی ملکہ کے حضور میں کی ہے، وہ اس سے زیادہ سزا کی مستحق تھی "

ملکہ —— " قصاص سے زیادہ سزا سخت اور کیا ہو سکتی ہے "

نوبہار —— " ملکۂ عالم، سزا سے مقصود مجرم کو اذیت میں مبتلا کرنا ہے اور سب سے بڑی اذیت وہ ہے جو عرصہ تک احساس انسانی کو بے چین رکھے۔ اگر ان دونوں کو قتل کر دیا گیا تو انھیں بجائے تکلیف کے اس خیال سے مسرت ہوگی کہ مصیبت سے جلد چھٹکارا مل گیا، لیکن اگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے مقید کر دیا گیا تو یہ ایک مستقل تکلیف واذیت ہوگی، جو ایسے گستاخ لوگوں کو پہونچنی چاہئے۔ اس لئے میری رائے تو یہی ہے کہ ان کو قلعہ کے اندر علیحدہ علیحدہ محبوس کر دیا جائے اور قید وبند کے لئے فی الحال کوئی میعاد نہ مقرر کی جائے "

ملکہ، جو نوبہار کے سامنے ہمیشہ اپنے آپ کو مجبور سی محسوس کرنے لگتی تھی، یہ سنکر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر فرمان کو چاک کر کے دوسرا حکم تحریر کیا اور حد درجہ خستگی کے ساتھ کرسی پر ایک طرف کو گردن ڈال کر خاموش پڑ رہی

ملکۂ ناہید اپنی فطرت کے لحاظ سے خواہ کیسی ہی قابل عزت کیوں نہ ہو، لیکن ملک کے نظم ونسق کا جہاں تک تعلق تھا وہ سخت ناکام ثابت ہوئی۔ وزرا اور ارکان حکومت یہ ضرور چاہتے تھے کہ جو بدنامی ملکۂ ناہید کی ہو رہی ہے، اُسے کسی طرح حسن اسلوب کے ساتھ دور کر دیا جائے، لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ وہ چاہتے کچھ تھے اور ناہید کرتی کچھ تھی —— سب سے زیادہ اعتراض اہل ملک کو یہ تھا کہ حسب رواج سلطنت ملکۂ ناہید نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور دوسرا سبب برہمی کا یہ تھا کہ وہ مردوں سے سخت متنفر تھی اور اس سلسلہ میں نہایت سخت قوانین نافذ کر کے اُس نے بعض نہایت قیمتی ہستیوں سے

اہل ملک کو محروم کر دیا تھا۔ اس وقت اہل ملک کا خاموش رہنا ایک تو اس وجہ سے تھا کہ وہ واقعی ناہید سے محبت کرتے تھے اور اس کا حسن و جمال ایک ایسا سحر تھا کہ اس کے دیکھتے ہی ہر شخص سر بسجود ہو جانے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور دوسرے اس سبب سے کہ طبقۂ امرا کے نوجوان، جن میں سے ہر ایک ملکۂ ناہید کی محبت دل میں لئے ہوئے اس سے شادی کرنے کا آرزومند تھا، یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملکہ کو کوئی زخم جسم بھی پہونچے، چہ جائیکہ اس کی ذات یا حکومت کے خلاف بغاوت کرنا۔ لیکن شاہرخ اور نیلوفر کے مقید کر دیئے جانے سے ملک کی ایک بڑی جماعت سخت برافروختہ ہو گئی اور آخرکار اُس نے مقابلہ کرنے کا ارادہ کر ہی لیا

ملک کے مختلف حصوں میں ملکۂ ناہید کے خلاف جلسے ہو رہے ہیں، عوام میں اشتعال پیدا کیا جا رہا ہے اور وزرا کو دھمکایا جا رہا ہے کہ اگر ملکۂ ناہید نے جلد سے جلد شادی کر کے اپنی حکومت میں کسی مردانہ دماغ کو شامل نہ کیا تو اس کی معزولی کا مطالبہ کیا جائے گا — ملکۂ ناہید، سخت اضطراب کی حالت میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہے، اراکین سلطنت خاموش کھڑے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر رہے ہیں، نوبہار بھی سر جھکائے ہوئے ایک گوشہ میں دم بخود کھڑی ہوئی ہے — کچھ دیر کے بعد دفعتہً ملکہ کچھ سوچ کر میز کے پاس آئی اور سب کو مخاطب کر کے بولی کہ " اگر اہل ملک کا مطالبہ یہی ہے تو میں اپنی معزولی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن شادی کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے دوسرے کی کنیز بنا دینا میرے اختیار سے باہر ہے "

وزیر اعظم — " لیکن اے ملکۂ عالم، میں بھی عرض کروں گا کہ ملکہ کا شادی کر لینا، کنیز بننا نہیں ہے بلکہ دوسرے کو غلام بنا لینا ہے "

دوسرا وزیر — " علاوہ اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے اختیارات حکومت چھین لئے جائیں اگر ملکہ کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت اس سے ظاہر ہو "

یہ سنکر ملکہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ دفعتہً قصر شاہی کے چاروں طرف سے ہنگامہ کی آواز بلند ہوئی اور نسرین نے گھبرائے ہوئے آکر اطلاع دی کہ باغیوں نے محل کا محاصرہ کر لیا ہے اور فوج کا محافظ دستہ انھیں اندر آنے سے روک رہا ہے، یہ سنتے ہی ملکہ کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا اور سلطنت ہاتھ سے جاتے دیکھ کر اس کے تمام عزائم مضمحل ہو کر رہ گئے۔ وزرا نکل کر باہر گئے تھے کہ نوبہار آگے بڑھی اور عرض کیا کہ " ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ کہ ملکہ اپنی شادی کی کوئی تاریخ مقرر کر کے اعلان کر دیں اور کسی عورت کو مردانہ لباس پہنا کر تاریخ مقررہ پر اسی سے شادی کی رسم ادا کر لیں "

ملکہ — " لیکن اگر بعد کو یہ راز ظاہر ہو گیا تو پھر کیا ہوگا "

نوبہار — " میرے پاس ایک تدبیر اور ہے جو اس راز کو ظاہر نہ ہونے دے گی "

ملکہ — " تو کیا تو اس کے لئے آمادہ ہے کہ میرے لئے ایک ساعت کے لئے مرد بن جائے "

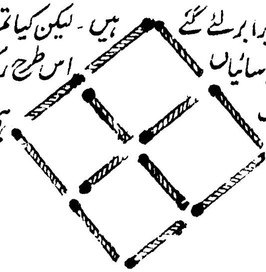
نوبہار — " اگر ملکہ کا فرمان یہی ہے تو مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے "

صفحۂ تفریحات و انعام

(صرف طلبہ کے لئے)

-:(۱):-

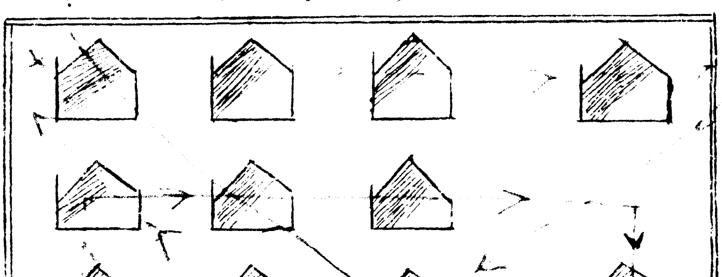
بارہ دیاسلائیاں ہیں جن سے حسب ذیل صورت پیدا کی گئی ہے :-



یعنی چار مربع برابر برابر لئے گئے ہیں - لیکن کیا تم ان مربعوں کو ہٹا کر یہی بارہ دیاسلائیاں اس طرح رکھ سکتے ہو کہ چھ مثلث ایک ہی ناپ کے بن جائیں -

-:(۲):-

ایک گاؤں کے بارہ خاندان ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک میں چلے گئے اور وہاں جنگل میں بارہ جھونپڑے طیار کئے۔ ان خاندان کا ایک سردار بھی ہے جسے ہر رات ان جھونپڑوں کا چکر لگا کر دیکھنا پڑتا ہے کہ سب خیریت سے ہیں یا نہیں اس غرض کیلئے یہ سردار اس طرح روانہ ہوتا ہے کہ اس کو صرف پانچ خط مستقیم بنانا پڑتے ہیں اور زیادہ چلنے کی زحمت نہیں ہوتی کیا تم اُن خطوط کو متعین کر سکتے ہو



-:(۳):-

ایک شخص کو دو لڑکے نظر آئے اس نے ان سے اُن کی عمر دریافت کی تو بڑے لڑکے نے جواب دیا کہ "میری عمر میری ماں کی عمر کی تہائی ہے" چھوٹے نے کہا "اس وقت میری عمر میری باپ کی عمر سے چوتھائی ہے۔ پھر بڑے لڑکے نے کہا کہ "بارہ سال کے بعد میری عمر باپ سے نصف ہو گی" اور چھوٹے نے کہا کہ "میری عمر بھی اس وقت میری ماں سے نصف ہو گی"

بتاؤ کہ دونوں لڑکوں اور ان کے والدین کی کیا عمر تھی جب اُن سے سوال کیا گیا۔

-:(۴):-

مشہور ہے کہ دو اور دو کا مجموعہ چار ہوتا ہے، یعنی جب ۲ اور ۲ کو جوڑیں گے تو حاصل جمع ۴ ہو گا۔ لیکن کیا کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ دو اور دو کا مجموعہ چار سے کم ہو۔

نوٹ:- جن کے چاروں جواب صحیح ہوں گے، انھیں "تذکرۂ خندۂ گل" جس کی اصل قیمت چار روپیہ ہے ذریعۂ بیرنگ مفت روانہ ہو گا۔ جن کے صرف تین جواب صحیح ہوں گے، ان کو کتاب "شاعر کا انجام" مصنفۂ نیاز فتحپوری مفت بیرنگ روانہ کیجائیگی اور ایک صحیح جواب والوں کو کتاب "سائنس کے عجائب" مفت دی جائے گی۔

ان کے جوابات ۲۵ مارچ تک آجانا چاہیئے۔ اگلے مہینے میں ان کا حل نگار میں شائع ہو گا۔

اور بیماروں کے لئے ایسے تکئے بنادئے جن کے اندر خود بخود لاسلکی رو دوڑ جاتی ہے اور بغیر کسی زحمت کے ان پر سر رکھے رکھے آپ ہی آپ گانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ کسی ملک کا اس حد تک ترقی کرجانا منحصر ہے حکومت، پبلک کے باہمی تعاون پر اور پبلک میں اس کا احساس اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس میں تعلیم عام ہو جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پبلک میں اس حد تک تعلیم عام کرنا کس کا فرض ہے اور کیا کبھی کسی غیر ملکی حکومت نے اپنے اس فرض کو پوری طرح ادا کیا ہے یا کر سکتی ہے۔

دو کرور فرانک کا عمل جراحی

کیا آج تک کبھی کسی نے سنا ہے کہ کسی عمل جراحی پر دو کرور فرانک صرف ہوئے ہوں اور کیا اس کا یقین آسکتا ہے کہ کسی شخص نے اتنی رقم خطیر عمل جراحی پر صرف کرنا گوارا کی ہو۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو حال ہی میں نیویارک کی سرزمین میں پیش آیا

یہ عمل جراحی شاہ سیام کی ایک آنکھ پر کیا گیا تھا، جس کی قیمت اس کو دو کرور فرانک یا تقریباً ۳۲ لاکھ روپیہ ادا کرنی پڑی شاہ سیام اپنے ساتھ ۱۶۰ آدمی لیکر گئے تھے، اور نیویارک کے بہترین ہوٹل میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ شاہ سیام کو عمل جراحی کے سلسلہ میں عرصہ تک وہاں ٹھہرنا پڑا اور اس طرح کل مصارف کی مقدار اس حد تک پہونچ گئی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔

یہ ہیں ہمارے ایشیا کے حکمراں طبقہ کی وہ ادائیں جنھوں نے یہاں کی سرزمین کو "دنیائے زر و جواہر" اور سرزمین "سحر و افسوں" مشہور کر رکھا ہے اور یہ ہیں ہمارے فرمانرواؤں کی وہ "غلط بخشیاں" جن پر یہاں کی عام آبادی کے افلاس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ سیام کے اس احمق فرمانروا سے کوئی پوچھے کہ کیا خود اس کے ملک میں یہ عمل جراحی نہ ہو سکتا تھا کیا دنیا کا بہتر سے بہتر ڈاکٹر سیام میں نہ بلایا جا سکتا تھا، اور اگر نیویارک ہی جاکر "آنکھیں کھلنا" مقدر میں لکھا تھا تو کیا صرف چند خدام ساتھ لیکر وہ نہ جا سکتا تھا اور اگر اُس کی ایک بیمار آنکھ کی تیمارداری کے لئے حقیقتاً ۱۶۰ زریں کمر غلاموں کی ضرورت تھی، تو کیا کسی اوسط درجہ کے فردوگاہ میں قیام ناممکن تھا۔ مگر یہ سوال اُس سے کون کر سکتا ہے جبکہ خود یہاں کی جاہل و ذلیل آبادی ابتک ایک انسان کو خدا سمجھکر اس کے ہر ظلم کو خوشی سے برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہے اور وہ کیوں جواب دے جبکہ اس کے پاس غریب کاشتکاروں کی کافی جماعت ایسی موجود ہے جن کے خون سے وہ اپنے تاج درلہیم کے لئے دنیا کا قیمتی لعل شب چراغ فراہم کر سکتا ہے؟

پھر یہ انسانی تذلل و بیچارگی کا منظر صرف سیام ہی کے سرزمین کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ایشیا کا بہت بڑا حصہ اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ اور اگر یقین نہ ہو تو ہندوستان کو دیکھو، یہاں کی ریاستوں کا جاکر مطالعہ کرو کہ جس وقت یہاں کا فرمانروا نینی تال یا شملہ کی چوٹی پر "وسٹ اینڈ کمپنی" سے دو لاکھ کی گھڑیاں خرید کر لوگوں کو بطور انعام تقسیم کرتا ہوتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کی رعایا کا بڑا حصہ مرطوب دلدلی زمین میں آباد ہونے کی وجہ سے ملیریا اور نمونیا کا شکار ہو رہا ہے

اور کوئی ایک متنفس ایسا نہیں جو اُن کے بے یار و مددگار، فاقہ زدہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک ہی دن کے لئے جو کی خشک روٹی دینے کا ذمہ دار بنجائے۔

پھر کوئی ان ملاعنہ سے پوچھے کہ یہ دو لاکھ روپیہ جو ولایت کی ایک کمپنی کو دیدیئے گئے، یہ ۳۲ لاکھ روپیہ کی رقم جو نیویارک میں تقسیم کی گئی کہاں سے آئی تھی؟ کیا یہ موتی اس تباہ حال طبقہ کی عرق پیشانی سے چن چن کر جمع نہیں کئے گئے ہوتے جو اپنی جانیں دے دینے کے بعد بھی تمھارے ظلم و ستم کی شکایت نہیں کرتا اور کیا تمھاری ان "عیش کوشیوں" کی بنیاد اسی جماعت کی فاقہ کشی پر قائم نہیں ہے جس کے ہاتھ محنت کی زخموں سے خون آلود ہیں۔ اور جسکے سینے مصائب کے ہجوم سے شق ہوجانے کے لئے بیتاب؟ پھر عقل حیران ہے کہ کیوں ابتک انتقام خداوندی محو خواب ہے اور اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہوسکتا ہے جس کا آسمانی قہر و غضب انتظار کر رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فرعون و شداد نے وہ وہ مظالم انسان پر روا رکھے کہ تاریخ ان کے اعادہ سے مجبور رہے۔ ہکو بتایا جاتا ہے کہ چنگیز و ہلاکو نے ایسی بیدردیوں سے انسانی خون کو بہایا کہ دنیا اب اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن جنھوں نے یہاں کے بعض مستبد حکومتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرعون و شداد کے ذہن میں بھی وہ اخلاقی گندگیاں نہ آئی ہونگی، جن سے ان کی ہرارت معمور رہتی ہے اور چنگیز و ہلاکو کے خواب میں بھی انسانی پامالی کی وہ صورتیں نہ آئی ہوں گی جو یہاں ہر وقت اور ہر آن ہر شخص کو نظر آسکتی ہیں۔ فصل من مل کس!

مکڑی مقیاس موسم ہے

یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مکڑی جو مکان کے گوشوں میں باغ کے کنجوں میں لوگوں کی نگاہوں سے دور اپنا گھرور گھر طیار کرتی ہے، وہ انسان کی بڑی خدمت انجام دیا کرتی ہے جس سے ہم غافل رہتے ہیں۔ ہم جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو موسم کے متعلق پیشین گوئیاں کرنا بھی اس گفتگو کا دلچسپ موضوع ہوتا ہے، لیکن اگر ہم اسی وقت کسی مکڑی کے جالے کو جاکر دیکھ لیں تو پورے وثوق کے ساتھ آئندہ موسم کے متعلق حکم لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ مکڑی کا قاعدہ ہے کہ جب بارش ہونے والی ہوتی ہے یا آندھی آنے والی ہوتی ہے تو وہ بہت چھوٹے چھوٹے تار نکالتی ہے اور جب موسم کا یہ تغیر زیادہ دیرپا ہونے والا ہوتا ہے تو بالکل خاموش ہوکر بیٹھ جاتی ہے لیکن اگر موسم ابر و باد سے صاف آنے والا ہے تو وہ اپنے جالے کو لانبے لانبے تاروں سے بننے لگتی ہے یعنی اگر وہ مصروف عمل ہو تو سمجھئے کہ موسم صاف رہیگا اور اگر بیکار و مضمحل ہوکر بیٹھ گئی ہے تو جان لیجئے کہ موسم میں تکدر ضرور پیدا ہوگا۔

مکڑی ہر چوبیس گھنٹے میں اپنا جالا بنکر طیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنا جالا غروب آفتاب کے وقت مکمل کرے تو رات کو پانی نہ برسنا یقینی ہے۔

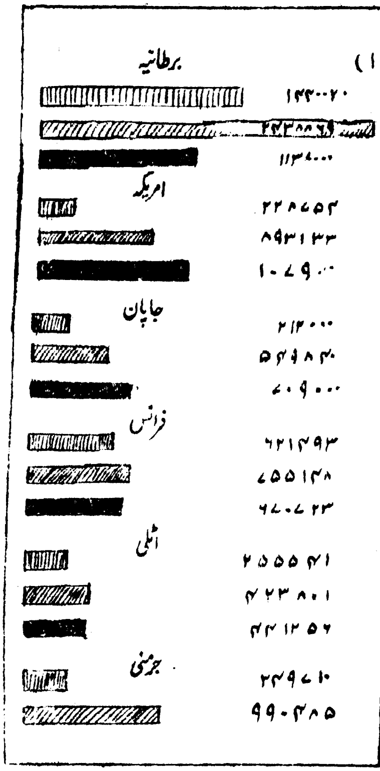
زبان اور اخلاق انسانی

علماء فراست اس سے قبل اخلاق انسانی کا مطالعہ کان، آنکھ، پیشانی اور سر کی ساخت سے کیا کرتے تھے، لیکن اب ایک جدید علم رونما ہوا ہے جس کی مدد سے زبان دیکھ کر اخلاق

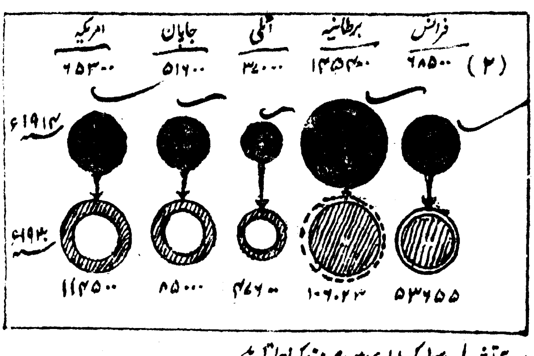
دول یورپ کی بحری قوت اور فوجی مصارف

نقشہ نمبر (۱) میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کی بحری قوت ۱۹۱۴ء میں کیا تھی ۱۹۳۱ء میں کیا ہوگئی اور ۱۹۳۶ء میں کیا ہوگی اگر کوئی اور جدید معاہدہ نہ ہوا —— ہر حکومت کے لئے تین خط ہیں پہلا خط ۱۹۱۴ء کے لئے، دوسرا ۱۹۳۱ء کے لئے اور تیسرا ۱۹۳۶ء کے لئے۔ ہندسوں سے جہازوں کا وزن ٹن میں بتایا گیا ہے۔

نقشہ نمبر (۲) میں بتایا گیا ہے کہ ہر ملک کے پاس ۱۹۱۴ء میں کتنی بحری فوج تھی اور ۱۹۳۰ء میں وہ کتنی ہوگئی۔ سیاہ دائرے ۱۹۱۴ء کی قوت کو ظاہر کرتے ہیں اور نیچے کے دائرے ۱۹۳۰ء کو ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ، جاپان، اور اطالیہ کی بحری فوج زیادہ ہوگئی اور برطانیہ و فرانس کی کم ——



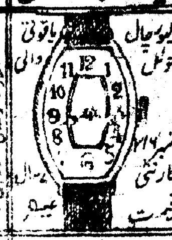
جنگ عظیم سے قبل جو فوجی مصارف دول یورپ کے تھے اُن کے مقابلہ میں ۱۹۳۱ء کے مصارف امریکہ میں ۱۹۷ فی صدی زیادہ بڑھ گئے، جاپان میں ۱۳۲ فی صدی، برطانیہ میں ۴۲ فی صدی فرانس میں ۳۰ فی صدی، البتہ جرمنی میں ۴۶ فی صدی کی کمی ہوئی اس وقت سب سے بڑی فوج فرانس کے پاس ہے۔ یعنی ۳ لاکھ سترہ ہزار مستعمرات کی فوج اور مسلح پولیس اس کے علاوہ ۵۲۲۶۵۱ اور ہے۔ فرانس نے ۱۹۳۱ء میں اپنی فوج پر ۵ کرور ۴۰ لاکھ گنی صرف کیں۔ برطانیہ نے اپنی تمام افواج پر ۳ کرور ۷۹ لاکھ گنی صرف کیں۔ اطالیہ کے پاس ۲ لاکھ ۵۱ ہزار فوج باضابطہ ہے اور ۳ لاکھ ۶۹ ہزار والنٹیر ہیں، بلجیم کے پاس ۶۵ ہزار فوج ہے اور جاپان کے پاس ۲ لاکھ ۵۹ ہزار ——

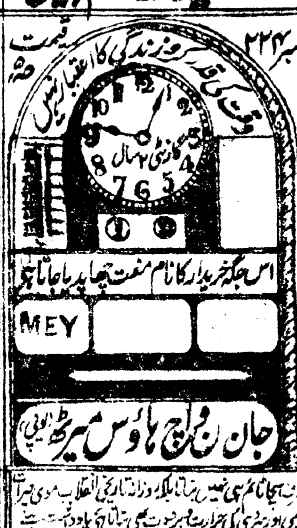
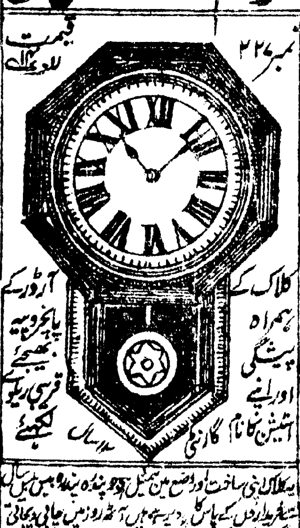


گذشتہ سال امریکہ نے اسلحہ پر ۱۴۱۳۸۵۰۰۰ گنی صرف کیں، روس نے ۱۱۵۷۸۸۵۴۳۰۰ گنی، فرانس نے ۹۳۳۹۲۰۰۰ گنی، برطانیہ نے ۹۳۰۲۵۰۰۰ گنی، اٹلی نے ۴۹۷۸۹۳۰۰ گنی اور جاپان نے ۴۷۳۷۲۳۰۰ گنی یہ ہیں یورپ کے مہذب و متمدن ممالک کی وہ سرگرمیاں جو دنیا میں امن وسکون کے قیام کے لئے ظاہر ہو رہی ہیں ایک طرف دنیا کو یہ دھوکا دیا جا رہا ہے کہ آلات حرب کے کم کرنے کی کوشش عمل میں آ رہی ہے۔ اور دوسری طرف امن پسند آبادی سے حاصل کیا ہوا روپیہ آتش بار اسلحہ کی طیاری میں صرف کیا جاتا ہے۔

سالانہ انتہائی رعایتی اعلان

شائع کر کے ہم مقامی احباب کی طرح بیرونی معزز خریداران کو بھی ... کا موقع دیتے ہیں چنانچہ اس سال بھی حسب معمول گھڑیوں کی قیمتوں میں بے حد کمی کر دی ہے تاکہ پبلک اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائے
اگر آپ نے کبھی ہماری خدمات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے تو آ... بطور تجربہ کوئی گھڑی منگا لیجئے تو پھر آپ ہمیشہ کیلئے ہمارے گاہک بن جائیں گے گھڑیوں کے متعلق ہمارا تیس سالہ وسیع تجربہ ہماری شہرت
اور ہماری عمدگی کا ضامن ہے۔ ذیل میں چند قسم کی منتخبہ گھڑیاں درج کی جاتی ہیں ورنہ ہمارے یہاں صدہا قسم کی مختلف قیمتوں کی گھڑیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ گذارش ہے کہ (نمبر ۱) ہر گھڑی کا محصول
ڈاک و پیکنگ و فیس منی آرڈر بذمہ خریدار ہوگا (۲) ہر گھڑی کے ہمراہ ... کی تحریری گارنٹی روانہ کی جاتی ہے (۳) فرمائش لکھتے وقت گھڑی کا نام ... قیمت ضرور تحریر کیجئے تاکہ کوئی غلطی نہ ہو

بیگمات پسند رسٹ واچ	فینسی طلائی میرج رسٹ واچ	ہفت روزہ لیور رسٹ واچ	گولڈ پلیٹڈ جڑاؤ رسٹ واچ	نو ایجاد نازنین رسٹ واچ
				
خواتین بڑے شوق سے استعمال ... ہیں۔ خوبصورتی، نفاست ... پر لاجواب ہے بہت چھوٹا سائز قیمت ... بھنا ۲۱۷ اعلیٰ قسم ... کے کیس اعلیٰ قسم	باوجود پائیدار اور دیدہ زیب ہونے کے قیمت میں بے حد ارزاں ہے مضبوط لیور مشین ہے ۱۵ اسٹون جڑے ہوئے نصب ہیں فولادی کمانی کی جس پر موسمی اثر نہیں ہوتا اور وقت صحیح دیتی ہے زنانہ اور مردانہ دونوں کلائیوں کیلئے موزوں ہے قیمت ۲۱۸ سلور کیس ... ۹ کیرٹ گولڈ ۲۱۹ قیمت	اس گھڑی میں آٹھویں دن چابی لگائیں اور ہفتہ بھر تک بلا تکلف صحیح ٹائم دیتی رہے اصلی ہیلدا مس کارخانہ کی لیور جوئل دار سالہا سال تک کام دینے والی قیمت ۲۲۰ نکل سلور کیس ایضاً ۲۲۱ سلور کیس	اس گھڑی کے ہر طرف خوشنما چمکدار نگ جڑے ہوئے ہیں۔ عورتوں کیلئے خاص تحفہ نازک کلائی کی زینت بھی اور وقت کا اندازہ بھی کم خرچ بالا نشین قیمت ۲۲۲ ... روپیہ	زمانہ حال کی نئی فیشن ایبل زنانی گھڑیاں جن پر سائنٹفک جواہرات کا جڑاؤ کیا ہے جنکی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ مشین کی تعریف فضول قیمت ۲۲۳ ... روپیہ

خوشنما کلینڈر ٹائم پیس	بلند آواز کا پائدار لیور الارم	نئی قسم کا خوبصورت آفس کلاک
		
صرف اچھا ٹائم پیس ہی نہیں بتاتا بلکہ روزانہ تاریخ ... بھی ... کیلئے سیٹ ... ہیں موجود ہیں ...	کیا ہوا سو جو ہے یہ ٹائم پیس تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے ... کی جاسب الارم کی ... دیگر ٹائم پیسوں سے زیادہ ... الارم دیتا ہے قیمت ۲۲۵ ساڑھے ... ایضاً قیمت ۲۲۶ ...	یہ کلاک اپنی ساخت اور وضع میں بے مثل ہے ... خریداروں کے پاس ... آٹھ روز میں چابی دی جاتی ہے گھنٹہ و آدھ گھنٹہ ... بجاتا ہے رعایتی قیمت ۲۲۰ سائز ۱۹ انچ لمبائی اور ۱۱ انچ چوڑائی ... ایضاً ۲۲۶ درمیانہ سائز ۱۲ انچ لمبائی ۱۴ انچ چوڑائی ... روپیہ



قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے - جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردئے جاتے ہیں

۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

۶ سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۲ روپیہ	۲۳ روپیہ	ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

(دوسرا اڈیشن)

حضرت نیاز کے ادبی متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے -

قیمت عہ

گہوارۂ تمدن

(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیاے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے - اردو میں بالکل نئی کتاب ہے - قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے - اس زبان کی اسکی تخییل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون و اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱۰ ر

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک نہایت مبسوط تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل لیتا ہوا جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ ر

صحابیات

جسمیں عہد رسالت کی ۵۸ خواتین کے مستند حالات لکھکر دیے گئے ہیں اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے، قیمت علاوہ محصول عہ

تذکرۂ خندۂ گل

مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰ سے زائد وفارسی ظریف شعرا کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف و انتخاب کلام کے درج ہیں قیمت عہ محصول سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

جلد ۲۱　　فہرست مضامین ماہ اپریل ۱۹۳۲ء　　شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز (فتحپوری)

جلد ۲۱	اپریل ۱۹۳۲ء	شمار ۴

ملاحظات

غالب کا مشہور مطلع ہے :-

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

یہ خیال غالب نے اس وقت ظاہر کیا تھا، جب شاید بازار میں "حُسن" کی طلب کم تھی یا عشق کی فراہمی محدود - ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ غالب کی موت کاروبار "حسن و شباب" کو اس قدر سرد کر دیتی کہ دل محبت کی کشمکش اور حسن، غمزہ کی کشاکش سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ جاتا - - - - آج اگر غالب زندہ ہوتے تو شاید وہ اس رشک سے مرنا بھی گوارا نہ کرتے کیونکہ اب تو اگر حسن کے لئے ایک در بند ہوتا ہے تو سو در اور کھل جاتے ہیں - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہ اندازۂ "عشق" اب "حسن" کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ہے ——— لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں نہ عشق سے مراد وہ "کیفیت مجہول" ہے جس نے دنیا میں قیس و فرہاد ایسی "ناکارہ" ہستیاں پیدا کیں اور نہ حسن سے مقصود وہ "ادائے عصمت و حجاب" ہے جسے چلمن کی اوٹ سے بھی اپنے آپ کو دکھانا گوارا نہ ہوتا تھا، یعنی وہ چیز کہ :-

نظارہ نے بھی کام کیا واں حجاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

بلکہ اب "عشق" نام ہے اُس فراست و تدبر کا جو یہ سوچے کہ دنیا کی اور تمام خام پیداوار کی طرح حسن سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور عشق نام ہے اُس "اہلیت و کیفیت" کا جو ہر مصنوعی یا کیمیاوی طریقہ سے ایک عورت کو شیشہ کی الماری میں ایک لیونڈر کی خوبصورت شیشی کی طرح پیش کر سکے۔

پھر جس طرح اب "عشق" اس مادی دنیا کے عشق میں ضروریات انسانی و داعیات نفسانی کے تنوع کے لحاظ سے حُسن کی طلب بڑھ گئی ہے، اسی طرح حسن بھی اب مختلف حیثیتوں سے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہے۔ یعنی اگر اس سے قبل فن "مشاطگی" نام تھا صرف زلف و کاکل کی آرائش کا، رخ پر مالش غازہ کا، آنکھوں میں تحریر سرمہ کا، گوشۂ ابرو کے پاس نقش خال کا، اور مانگ میں تزئین افشاں کا، تو اب "فن تجمیل" ایک مستقل علم ہے جو برق و کہربا کی مدد سے، عقاقیر و ادویہ کی وساطت سے علم الکیمیا اور ریاضی کے ذریعہ سے، آلات و مشین کی استمداد سے سیاہ کو سفید بنا دینے کا ضامن ہوا اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب امتیاز حسن کے لئے ایک قبیح چیز کی تلاش میں وہی زحمتیں اُٹھانا پڑیں گی جو کسی وقت کوہکن و قیس عامری نے جستجوئے جمال میں برداشت کی تھیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لئے عورت کو کیا قربانیاں کرنا پڑتی ہیں، کن کن ضغطوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اس کا جواب کشاکش غمزہ کی وہ طویل و دردناک داستان ہے جس سے اس وقت کی "حسن طلب" دنیا بھی بہت کم واقف ہے، چہ جائیکہ عہد غالب جب دل کے معاملہ کے لئے صرف ایک نگاہ غلط انداز ہی کافی سمجھی جاتی تھی اور عورت پر وہ عذاب نازل نہ ہوا تھا جو اب "تحسین و آرائش" کی غرض سے اُسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اسمیں کلام نہیں کہ عورت کی یہ خصوصیت کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں اس سے منفک نہیں ہوئی کہ وہ حسین نظر آئے اور اُس سے محبت کی جائے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی اس تمنا کو محض قدرت کے عطا کردہ ذرایع سے پورا کر لیتی تھی لیکن اب اُسے قدرت کا مقابلہ کر کے یہ خواہش پوری کرنی پڑتی ہے۔

چونکہ پہلے اُس کے فرائض نسائی میں، صرف "محبت کیا جانا اور حکومت کرنا" ہی داخل تھا، اس لئے اس کا محض عورت ہونا، یعنی صرف "خصوصیت نسائی" کافی سبب اس کو دل میں جگہ دینے کی تھی، لیکن اب چونکہ وہ محکوم ہونے کی حد تک اپنی ترقی کو کھینچ لائی ہے اس لئے اُسے صرف یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ عورت ہو یا نہ ہو لیکن جمیل ضرور ہے — جب تک عورت حرم کی ملکہ بنی رہی کسی نے توجہ نہ کی کہ وہ عورت ہونے سے زیادہ کوئی چیز ہے یا نہیں، لیکن جب اُسنے اپنے حدود حکومت گھر کی چار دیواری سے باہر وسیع کئے تو عورت ہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک "جنس خوش گل" ہونے کی حیثیت سے نگاہوں نے اُسے دیکھنا شروع کیا، اور آخر کار وہ ایک ایسی مادی چیز ہو کر رہ گئی جسے ہر شخص کی ضرورت کے

موافق نئے سانچے میں ڈھل جانا چاہئے۔

گزشتہ جنگ عظیم نے جرمنی کو تباہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن نسائیت کو تو یقیناً تباہ کر دیا اور اُس سے زیادہ سخت انتقام شاید ہی مرد نے کبھی اُس سے لیا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ عورت کی آزادی کا یہی علاج تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی آزادی، مجبوری کا نتیجہ نہ تھی، جب دوران جنگ میں لاکھوں مرد امن و سکون کی دنیا کو چھوڑ کر آگ اور خون کے جہنم زار کو آباد کر رہے تھے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ عورت گھر میں بیٹھی رہتی اور وہ ان خدمات کو انجام دیتی جو مردوں کے سپرد تھیں۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ جب ردِ عمل کسی میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اُس وقت تک چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک تباہ نہ ہو جائے اس لئے اگر عورت اختتام جنگ کے بعد اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں گئی تو اس کی یہ سزا تو نہ ہونی چاہئے تھی کہ اس کے تمام محاسن نسائی کو نظر انداز کر کے صرف اس کے قامت و جسم اور چشم و ابرو کا سودا کیا جاتا۔

آج مغرب کی عورت کے سامنے نہ سوال اس کی نسائیت کا ہے نہ امومیت کا، نہ ملکۂ بیت ہونے کا نہ تربیت اولاد کا نہ اس کے لئے عصمت و دلداری کا کوئی مفہوم رہ گیا ہے نہ شرم و وفاداری کا، بلکہ وہ تختۂ بازار کی ایک ایسی مومی تصویر ہے جس کو صرف اس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ نقاش نے اس کی تعمیر میں کس قدر تکمیل ذوق سے کام لیا ہے اور اگر کہیں ایک رگ بھی نامناسب طور پر ابھری ہوئی بن گئی ہے تو ہنس کر اس کی طرف سے نگاہیں پھیر لی جاتی ہیں۔

ممکن ہے ایشیا کی عورت، یورپ کی آزاد عورت کو دیکھ کر رشک کرتی ہو، لیکن خود اُس سے پوچھو کہ یہ آزادی اسکے لئے کس قدر بلائے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ زندگی کے کس دردناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتی ہو یا کارخانہ میں، وہ مدرسے کی معلمہ ہو یا متعلمہ، کسی گھر کی خادمہ ہو یا مخدومہ، سنیما میں ایکٹ کرتی ہو یا تھیٹر میں، الغرض وہ جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں ہو، سوسائٹی نے اُسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ "حسین و جمیل" نظر آئے، پر شباب نظر آئے، کچھ ایسی چیز نظر آئے جو ذوق نظر کو پورا کرنے والی ہو، ورنہ وہ ایک جنس ناکارہ ہے اور دنیا کو اس کے وجود کی ضرورت نہیں ——— پھر آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی عورت مرد کی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے کس کس عذاب کو برداشت کرتی ہے اور سخت سے سخت عمل جراحی میں، ایک مرغ بسمل کی طرح گھنٹوں تڑپتی رہتی ہے۔

گزشتہ جنگ کے دوران میں جب بیکار و مجروح یا مقطوع الاعضاء لوگوں کے علاج کا سوال سامنے آیا تو اس سلسلہ میں فن طبابت و جراحی کا ایک جُداگانہ شعبہ معیوب اعضا کے درست کرنے کا پیدا ہو گیا اور اس میں اس قدر کامیابی ہوئی کہ اب وہ ایک مستقل علم ہو گیا ہے جسے "فن تجمیل و تزئین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور سچ پوچھئے تو مغربی عورت اب اسی کے سہارے زندگی بسر کر رہی ہے۔

" فنِ تجمیل " کے دو شعبے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق ادویہ و آلات کہربائی سے ہے اور دوسرے کا عمل جراحی سے - اور ان دونوں کا مقصود یہ ہے کہ تمام وہ ظاہری خوبیاں جو قدرت بھی عطا نہیں کر سکی ایک عورت کے جسم و اعضاء میں پیدا کی جائیں - ناخنوں کی پالش، بالوں کی توجی آرائش، لبوں کی سرخی، عارض کی گلگونی، ابرو کا تناسب، خنجری گردن کی مینا پروری، آنکھوں کی بارہ چکانی، جسم کی بید آسا لچک، کمر کی رشتہ آسا نزاکت، جلد کی نعومت و صباحت، الغرض تمام وہ مظاہر حسن و جمال جو کبھی حسرت پریوں کی کہانیوں میں بیان کئے جاتے تھے ایک انسانی وجود نسائی کے اندر مستقل جوہر بالذات چیز ہو کر رہ جائیں -

---

فرض کیجئے کہ وہاں ایک لڑکی جوان ہوتی ہے اور تمام ضروریات حسن و تناسب سے آراستہ ہو کر جوان ہوتی ہے لیکن اس کی کان کی لو بدنما طور پر ملی ہوئی ہے تو اس وقت تک جبین سے نہ بیٹھے گی جب تک نشتر فصاد اُسے جدا نہ کر دے، یا اگر وہ نامناسب طور پر علیحدہ ہے تو اس وقت تک مضطرب رہیگی جب تک عمل جراحی اُسے جلد سے نہ ملا دے - اسی طرح اگر ناک کی ہڈی زیادہ اُبھری ہوئی ہے تو وہ اُسے ترشوا دیگی، اگر زیادہ بیٹھی ہوئی ہے تو اس میں پیوند لگوائے گی - یہ تو خیر وہ معمولی نقائص ہیں جن کا چارہ دشوار نہیں اور اگر دشوار ہو بھی تو عہد شباب کی فطری مستیاں اور رنگینیاں کافی سے زیادہ تلافی انکی کرتی رہتی ہیں، لیکن یقیناً وہ وقت ایک عورت کے لئے بہت سخت ہوتا ہے جب اس کے چہرہ میں جھریاں پڑنے لگتی ہیں اور اس کی رعنائی کو فنا کی غارت کرنے لگتی ہے - آپ یقیناً حیران ہوں گے جب سنیں گے کہ وہ ان مصائب کے دور کرنے کیلئے اپنی کھال کھنچوا لیتی ہے - بیکار رگوں کے جال کو قطع کرا دیتی ہے، جلد کھرچوا ڈالتی ہے، لوتھڑوں کے لوتھڑے گوشت کے نکلوا دیتی ہے اور مہینوں تک ریش و جراحت کی کرب و اذیت کو صرف اس توقع پر برداشت کرتی ہے کہ جب وہ اپنے بستر الم سے اُٹھے گی تو اس کے چہرے کی کھال تنی ہوئی نظر آئے گی - اس کے جسم کی رعنائی عود کر آئی ہو گی - پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تمام صعوبتیں بیکار ثابت ہوتی ہیں یعنی وہ پہلے سے زیادہ بدصورت و بدنما ہو جاتی ہے، اور اُس کا آخری علاج وہ زہر کی شیشی یا پستول کی گولی سے کر کے اپنے عیب کو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن کر دیتی ہے -

اس نمود و نمائش اور اس " سطح " کا نام ہے یورپ کی عورت جس کی آزادی ایک معمہ ہو کر رہ گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے - اس لئے ہندوستان کی عورتیں شوق سے تعلیم حاصل کریں - پردہ کو خیرباد کہدیں آزاد ہو کر تمام علوم و فنون کی ماہر بنیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھیں کہ عورت نام اس کے جسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی روح کا ہے، جو عبارت ہے، عصمت و عفت سے، محبت و الفت سے، نہ کہ اس کشاکش غمزہ سے جس کی مختصر سی داستان ابھی بیان کی گئی -

---

ہمارے پاس ایک استفسار جناب احمد علی صاحب کا حیدرآباد سے موصول ہوا ہے جس میں ایک خاتون کی نہایت ہی دردناک حالت بیان کرکے ہم سے رائے طلب کی گئی ہے۔ چونکہ باب الاستفسار کی کتابت کے بعد یہ تحریر موصول ہوئی اس لئے اسکی اہمیت کو پیش نظر رکھکر ملاحظات میں ذکر ضروری خیال کرتے ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ عرصہ ہوا ایک شریف خاتون کی شادی ہوئی اور باوجود شوہر کی بے اعتنائی کے وہ اسی گھر میں زندگی بسر کرتی رہیں کیونکہ خسر زندہ تھے اور اس کو بظاہر کوئی تکلیف نہ تھی۔ لیکن خسر کے انتقال کے بعد ان کے شوہر نے پہلے تو غریب کا سارا زیور بیچ کھایا اور پھر جسمانی اذیت دینی شروع کی یہ مجبوراً اپنے میکہ آگئیں۔ شوہر نے دعویٰ کردیا اور محکمۂ قضا نے بے توجہی سے کام لیکر رخصتی کی ڈگری کردی، اس کا مرافعہ کیا گیا لیکن بیکار۔ آخر کار خاتون مذکور تنگ آکر مجبور ہوکر اپنے مرتد ہونے کا اعلان کردیا لیکن محکمۂ قضا اب بھی مُصر ہے کہ وہ اپنے ظالم شوہر ہی کے پاس اپنی دردناک زندگی بسر کریں۔ یہ ہے حال ہماری معاشرتی تباہیوں اور ہمارے علمائے کرام کے جہل کا جو ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں عورتوں کی زندگی کو برباد کرچکا ہے اور کررہا ہے

میں بارہا نگار میں ظاہر کرچکا ہوں کہ ہماری معاشری و تمدنی زندگی کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے لیکن ہمارے یہاں کے تنگ نظر کم فہم و کم بیں حضرات جن کو ہماری جاہل و احمق قوم نے ایک "برہمن و پروہت" کی حیثیت دیکر خود اپنے لئے عقل و فراست کو شجر ممنوع قرار دے رکھا ہے، مطلقاً بے خبر ہیں اور کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ "رعایت الاصلح فی الشرع" ہمیشہ سے اسلام کا شعار رہا ہے اور اس لئے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے احکام فقہی کی ترمیم و تنسیخ کو گوارا کرنے کے لئے وہ ہر وقت آمادہ ہے ———

انھیں مسائل میں سے ایک نہایت اہم مسئلہ طلاق و خلع کا بھی ہے تاکہ وہ مظالم جو نفس پرست و بدکار مرد کی طرف سے عورت پر توڑے جاتے ہیں انکا سد باب ہوجائے لیکن کسی کو اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اس مسئلہ میں مرد و عورت دونوں کو برابر کی آزادی دیدی ہے یعنی اگر کسی سبب سے مرد عورت کو چھوڑ سکتا ہے تو عورت کو بھی ویسا ہی حق مرد کو چھوڑ دینے کا ہے جس کا نام خلع ہے، لیکن کسقدر افسوسناک امر ہے کہ مرد تو اپنے اس حق کو ناجائز حدود تک استعمال کرسکے اور عورت جائز صورتوں میں بھی اس پر عمل نہ کرسکے۔ اس سے زیادہ دردناک داستان ایک اسلامی عدالت گاہ کی انصاف پسندی کی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک مسلمان عورت تنگ آکر اپنے ارتداد کا اعلان کرنے پر طیار ہوجاتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ طویل الذیل عبائیں استعمال کرنے والے مفتی و قاضی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ شرعاً محض بدسلوکی کی بنا پر ایک عورت مرد سے خلع طلب کرسکتی ہے۔ چہ جائیکہ ارتداد کہ اس صورت میں تو نکاح از خود بغیر کسی رسم کے ٹوٹ کر رہجاتا ہے اور مرد طلاق دے یا نہ دے وہ مطلقہ ہوجاتی ہے

اس نوع کے مردانہ مظالم اور عدالت گاہوں کی غیر منصفانہ روش سے تنگ آکر کسی مسلمان عورت کا ترک اسلام کردینا پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی کئی واقعات اسی قسم کے رونما ہوچکے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تا ایندم شاذ و نادر

کی طرح کوئی قانون اس قسم کا مرتب نہیں کیا گیا جو عورتوں کو مردوں کی اس "رندی و ہوسناکی" سے محفوظ رکھ سکے۔
حال ہی میں ریاست بھوپال نے ایک جدید ضابطہ طلاق و خلع کے متعلق جاری کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ان خرابیوں کے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن پھر بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا اس ضابطہ کے مطابق احکام نافذ کرنا اُنھیں حضرات کے سپرد نہیں کیا گیا جنھوں نے اس سے قبل کبھی اسلام کے کسی حکم کی صحیح روح کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی اور جو مہارت قرآن کے مدعی ہونے کی حیثیت سے "الرجال قوامون علی النساء" کی زبردست دلیل عورت پر ظلم توڑنے کی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ قانون بالکل مہمل چیز ہے اگر اُس کے نفاذ کی خدمت اُن لوگوں کے سپرد کی جائے جو خود اس کا احترام نہیں کرتے۔ اور اس لئے ہمارے "مفتیان دین متین" دوسروں کی بیویوں کی فریاد کو کیا پہونچیں گے جبکہ خود ان کی بیویاں اُن کی چیرہ دستیوں سے یکسر نالہ و شیون نظر آتی ہیں۔
شاردا ایکٹ کی مخالفت مولویوں کی جماعت نے اسی لئے کی تھی کہ وہ خود کمسن عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کے بہت شایق ہیں۔ اور اگر آج کوئی قانون ایسا نافذ کیا گیا جس میں عورت کو خلع کے لئے آسانیاں پیدا کی گئیں تو یہی گروہ اس کی مخالفت کریگا کیونکہ جنت سے نکل کر حوروں سے جدا ہونے کا انتقام، حوا کی بیٹیوں سے جس قدر سختی کے ساتھ یہ لے رہا ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

اس وقت ہندوستان کے مُسلم رہنماؤں کی وہی حالت ہے جو عہد عتیق میں برج بابل بنانے والوں کے متعلق بیان کی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی ہانک رہا ہے اور اُن میں سے کوئی نہ دوسرے کی سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ روز نئی خیال کی نئی جماعتیں پیدا ہوتی جارہی ہیں اور ہر جماعت کا قائد و رہنما اپنی جگہ ساحل تک پہونچا دینے کا دعویدار نظر آتا ہے، لیکن حالت یہ ہو کہ جسوقت نتیجہ و منزل پر نگاہ جاتی ہے تو سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ:-

کشتی ما بورطۂ گرداب فتنہ رفت
صد دیدباں اگرچہ بہ ہرسو گماشتیم

جب ایک مرغی کا صرف دو ملاؤں کے جھگڑے میں حرام ہوجانا یقینی ہے تو اندازہ کیجئے کہ کیا عالم ہونا چاہئے جب کسی مسئلہ میں سیکڑوں ملا اور ہزاروں غیر ملا باہم دست و گریباں نظر آتے ہوں۔
ایک جماعت ذریعۂ نجات صرف یہ قرار دیتی ہے کہ حکومت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے کیونکہ وہی "قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے" کی صحیح مخاطب ہوسکتی ہے۔ دوسری جماعت کا نظریہ ہے کہ جب تک ہم غیرت و خودداری سے کام لے کر ایثار و قربانی کو ذریعہ نہ بنائیں آزادی کا ملنا دشوار ہے۔ ایک گروہ صرف کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت کو تمام دشواریوں کا حل سمجھ رہا ہے۔ دوسرا صرف ناقوس و اذان، مسجد و مندر کی تفریق قایم رکھنے کو کلید امن و سکون قرار دیتا ہے،

کوئی کہتا ہے ہندوؤں سے ملکر کام کرنا ہی صحیح طریق کار ہے، کوئی سمجھا تا ہے کہ ان سے جدا ہو کر اپنی دنیا علیحدہ بسانا ہی تنہا وسیلۂ فلاح ہے الغرض "یکے بذزدی دل بُرد و یرده داریکے"

یاں سے واں، واں سے یہاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

جہاں تک مذہبی اختلاف کا تعلق ہے ہم نے ارباب وطن کو وہی مشورہ دیا جو ہمیشہ سے ہمارا مسلک رہا ہے اور اب بھی ہے کہ

ہم کعبہ و ہم بتکده سنگ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سر محراب شکستیم

وطن و ملک کے مسائل کا تعلق مذہب سے نہیں ہے اور سیاسیات کو مذہبیات سے متعلق کرنا سخت اصولی غلطی ہے لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک نہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ سکے ہیں نہ ہندو اور چارہ سازوں کے ہجوم نے دوست و دشمن کی تمیز کا احساس بھی ہم سے چھین لیا ہے حالانکہ

لشتان مابین الیزیدین فی الندے
یزید سلیم والاغر ابن حاتم

اس میں شک نہیں کہ یہ وقت انتہائی حزم و احتیاط، استقلال و ثبات کا طلبگار ہے اور اس کے بعد پھر کوئی دوسرا زمانہ ایسا آنے والا نہیں جس پر کشود کار کا انحصار ہو، لیکن افسوس ہے کہ ٹھیک اُسی وقت جبکہ تمام کام ملتوی کر کے سب کو "خم طرہ یارے گیرند" پر عمل کرنا چاہئے تھا، ہماری پریشان خیالی اور پریشان نظری "ہر آئینہ وار" کو سکندر سمجھ کر اس کا اتباع کرنے لگتی ہے اور منزل مقصود سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ کاشکے ہم میں عقل ہوتی، غیرت و خودداری ہوتی، اور ہم سمجھ سکتے کہ :۔

بیکان ترا بجاں خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

اس ماہ میں ہمارے عزیز دوست مولوی عبد المالک صاحب کا فاضلانہ مضمون "مسئلہ حسب و نسب" پر ختم ہو گیا ماہ آئندہ مضمون "مذاہب عالم اور عضاء صنفی کی پرستش" ختم ہو جائیگا۔ اور اسی کے ساتھ ایک اور مضمون انتہائی اچھوتا اور دلکش شروع ہوگا۔ اقتصادیات سیاسی کے مسئلہ میں محمد عاقل صاحب ایم اے کا مضمون "تاوان جنگ" پر مطالعہ کے قابل ہے۔ باب الاستفسار، میں عالم برزخ پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی غائر نگاہ سے دیکھے جانے کا محتاج ہے "گمشدہ ورق" کا سلسلہ ابھی جاری رہیگا کیونکہ ناظرین نے اُسے بہت پسند کیا ہے۔

نیاز

مسئلہ حسب و نسب خالص اسلامی نقطہ نظر سے

(مسلسل)

سادات کرام، ائمہ معصومین اور ان کی اولاد کے حالاتِ نسب موجودہ رسوم و قیود کی دنیا میں تہلکہ ڈالدینے والے ہیں لیکن یہ نقوش تاریخ کے بیشمار صفحات میں بھرے ہوے ہیں اس لئے آپ انھیں پڑھ کر جیں بجبیں ہوں تو اس کا اثر علمی و تحقیقی دنیا پر کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ تاریخ کے صفحات سے ان حقیقتوں کا محو کر دینا آپ کے بس کی بات نہیں ناچار خود آپ کو اپنے نظریات بدلنا پڑیں گے ورنہ دنیا آپ کو بتائے گی کہ آپ کی یہ خیال آرائیاں اب حقیقیات کو محجوب نہیں کر سکتیں۔

حضرت علیؑ کے ایک صاحبزادہ کا نام عمر الاطرف تھا آپ کے متعلق سراج الدین رفاعی لکھتے ہیں۔

قیل امہ ام ولد وھو الملقب بالابلہ ویقال لولدہ بنو الابلہ	آپ کی والدہ لونڈی (ام ولد) تھیں، آپ کا لقب "ابلہ" تھا اس لئے آپ کی اولاد بنو ابلہ کے نام سے مشہور ہے

اس سے پہلے علامہ موصوف نے لکھا ہے، کہ انکا نام "صہبا" ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ علقمی تھا حضرت علیؑ نے آپکو مول لیا تھا اور آزاد کرکے شادی کرلی آپ کی اولاد کے متعلق علامہ رفاعی موصوف لکھتے ہیں۔

ولعمر الاطرف ھذا ذیل ببلخ وحران وواسط والیمن وطبرستان والھند وملتان والسند وغیرھا	ان عمر الاطرف کی اولاد بلخ، حران، واسطہ، یمن طبرستان ہند ملتان اور سندھ وغیرہ میں ہے،

خیال ہو سکتا ہے کہ آپ کی والدہ لونڈی تھیں تو بلا سے حضرت امیر نے آزاد کرکے شادی کر لی تھی آئے ایسی نظیریں دیکھئے کہ سادات اہل بیت نے لونڈیاں خریدیں اور ان سے نہ نکاح کیا نہ آزاد کیا پھر بھی اُن سے اولاد پیدا ہوئی اور سادات نجیب کے نام سے دنیا میں پھیلی حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے عمر الاشرف اور زید شہید ایک ہی ماں سے تھے، سابق الذکر کی اولاد طبرستان، بطحا، اور بغداد میں پھیلی، آخر الذکر تاریخ کی مشہور شخصیت ہیں آپ کی طرف شیعوں کا ایک فرقہ "زیدیہ" منسوب ہے، علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

یروی ان زید ادخل علی ھشام ابن عبد الملک فقال لیس احد من عباد اللہ دون ان یوصی بتقوی اللہ ولا احد فوق ان یوصی بتقوی اللہ سبحانہ وانا اوصیت بتقوی اللہ	روایت کی جاتی ہے کہ زید (شہید) خلیفہ ہشام اموی (۱۲۵ھ) کے حضور میں آئے اور فرمایا خدا کے بندوں میں اس سے کمتر کوئی نہیں جو تقوی کی وصیت کرے اور نہ برتر جسے تقوی کی وصیت

فقال هشام انت زيد الموصل للخلافة الراجي لها وما انت والخلافة لا ام لك وانت ابن امة

کریں اور میں تم کو اللہ سے ڈرنیکی وصیت کرتا ہوں ہشام بولا تم ہی زید ..... خلافت کے امید وار ہو اور .... تم لونڈی بچہ ہو[۱]

حضرت زید کی رگوں میں نبی اکرم صلعم کا خون تھا، آپ خانوادۂ نبوت میں پلے تھے جواب دیا اور سبحان اللہ کیا اچھا جواب ہے:-

لا اعلم احداً اعظم منزلة عند الله من نبي بعثه وهو ابن امة اسمعيل ابن ابراهيم وما يقصر برجل جده رسول الله صلی الله تعالی علیه وسلم وابوه علی ابن ابی طالب علیه السلام

کوئی شخص اللہ کے یہاں نبیؐ سے بڑھکر کسی کا مرتبہ نہیں ہو سکتا سو وہ حضرت اسمعیل ابن ابراہیم کی لونڈی کے بطن سے تھے، اور تمہاری نگاہ میں اُس شخص کے اندر کیا کمی نظر آتی ہے جس کے جد بزرگوار حضرت نبی اکرم اور باپ حضرت علی ہوں

اسی ایک واقعہ پر اگر سادات اور شیوخ غور کریں تو ساری مصیبتیں ختم ہیں جو آج بلائے مبرم کی طرح زیادہ تر قریشی الاصل مسلمانوں پر مسلط ہوگئی ہیں خلیفہ ہشام نے حضرت زید ابن علی بن حسین بن علی پر طعن کیا تھا۔ اُنھوں نے کیا دنداں شکن جواب دیا اس سے ملتا ہوا ایک واقعہ خود آنحضرتؐ کی زندگی میں بھی واقع ہوا غزوہ خیبر میں بی بی صفیہؓ گرفتار ہوئیں آپ نے ان کو زوجیت میں لیا ازواج مطہرات اُن کو چڑانے کے لئے یا تحقیر کے خیال سے "یہودن" کہا کرتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے آنحضرت سے اس کا شکوہ کیا آپ نے فرمایا کہ تم نے کیوں نہیں جواب دیا کہ میرے دادا ابراہیم تھے

---

[۱] آج آپ مسلمانوں کی جس سوسائٹی میں جائیے اسی قسم کی مغلظات، اور دریدہ دہنیوں کی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی، لونڈی بچہ، دوغلا، فلاں بیٹا اور اسی قسم کی ناپاک اصطلاحیں بڑے شد ومد سے بولی جاتی ہیں۔ عوام کو جانے دیجئے ان کے پاس کوئی اور سرمایہ خیال تو ہے نہیں وہ یہ نہ کریں تو اور کیا کریں۔ ذرا "آب حیات" کے صفحات پڑھ جائیے، کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم بڑے پایہ کے عالم تھے لیکن اکثر انکی کتاب میں نجیب الطرفین عالی حسب والنسب کی اصطلاحیں ملتی ہیں۔ وہ ہندو کی شرافت کے معترف ہیں کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں طرف سے ایک ہی نسل کے ہوتے ہیں۔ لیکن سید انشا کے سلسلہ میں نواب سعادت علی خاں پر جو پھبتیاں اُڑائی ہیں وہ غور سے پڑھنے کی چیز ہیں، وہ تنقید کے سلسلہ میں "ولد الجاریۃ النجب" لکھ مارتے ہیں لیکن انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوئی کہ سید انشا کی اس تہی مایگی پر تنقید تو کرتے کہ نواب موصوف کو "انجب" کہکر انھوں نے کس درجہ پست ذہنیت کا ثبوت پیش کیا۔ سید انشا نے یا تو عمداً اس کی پرواہ نہیں کی کہ جو تنقید وہ نواب پر فرمائے ہیں وہ ان پر کس حد تک صادق آتی ہے، یا تاریخ اور انساب سے بالکل نابلد تھے۔

میرے والد یعقوب تھے اور میں حضرت محمدؐ کی بیوی ہوں (دیکھو مسلم فضایل بی بی صفیہؓ) اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی کسی انسان پر مصیبت آئے تو وہ اپنے حقیقی فضایل بیان کرسکتا ہے ورنہ فخر کے لئے تو کسی کو نسب کا نام بھی نہ لینا چاہئے

حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کو عام طور پر مسلمان حسنی سید تسلیم کرتے ہیں لیکن نسابین کے یہاں آپکی ہاشمیت متنازع فیہ ہے، اکثر محققین نے آپ کو عجمی الاصل بتایا ہے۔ آپ کا نسب نامہ جو بیان کیا جاتا ہے حسب ذیل ہے

شیخ عبدالقادر بن محمد بن جنگی دوست بن عبداللہ بن محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن احمد بن یحییٰ بن محمد بن احمد بن عبداللہ بن موسی الجون ابن عبداللہ المحض بن حسن مثنی بن حسن السبطؑ

لیکن اس شجرۂ نسبی کے متعلق سید سراج الدین رفاعی کا بیان ہے کہ یہ دعوئ نسبی نہ تو خود حضرت قطب الاقطاب نے کیا نہ آپ کے صاحبزادوں میں سے کسی نے، اس کا اعلان قاضی ابوصالح بن ابی بکر نے کیا اسی طرح مشہور نسابہ علامہ عمری اپنے مشجرات میں لکھتے ہیں شیخ عبدالقادر جیلانی کو عبداللہ بن محمد بن رومیہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ محمد بن الرومیہ کے بیٹے خود محمدؐ کی طرح "بنو الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں مگر اس نسب کا دعوی نہ خود شیخ عبدالقادر نے کبھی کیا نہ آپ کے صاحبزادوں نے۔ اس کے دعویدار آپ کے پوتے قاضی ابوصالح تھے لیکن انھوں نے نہ تو اس کے متعلق کوئی دلیل پیش کی اور نہ کسی نے اس کو پہچانا عبداللہ ابن محمد یحیی حجازی شخص تھے اور آپ کبھی حجاز سے باہر تشریف نہیں لے گئے ——— اور "جنگی دوست" ظاہر ہے کہ عجمی نام ہے جب قاضی ابوصالح نے یہ دعوی پیش کیا تو علمائے نسب کی ایک جماعت نے اسپر اعتراض کیا اور چونکہ یہ دعوی بلا دلیل تھا اس لئے لوگوں نے انکار کیا اسباب انکار میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ قاضی ابوصالح نصر بن عبدالرزاق نے جب اس نسبت کا دعوی کیا تو اپنا نسب یوں بیان کیا۔

ابوصالح نصر بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانی بن ابی صالح جنگی دوست بن موسی بن عبداللہ بن یحییٰ بن محمد۔

تمام علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ جن عبداللہ کی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے وہ ابن محمد یحییٰ ہیں اور ان عبداللہ بن محمد نے جو "ابن الرومیہ" کے نام سے مشہور ہیں کوئی اولاد نہیں چھوڑی بلکہ ان کے بھائی یحییٰ بن محمد کے اولاد ہوئی؛ نام کے اختلاف اور لاولدی کے ساتھ انتساب کے باعث لوگوں نے اس نسبت کا انکار کر دیا۔ انکار کی ایک وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن محمد رومیہ نے جنکی طرف "جنگی دوست" کی نسبت دیجاتی ہے، ۲۵۰ھ اور بروایت اصح ۲۶۰ھ میں وفات کی اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ آپ کی عمر اسوقت بیس سال سے کم تھی اور آپ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی جیساکہ عمیدی وغیرہ نے بیان کیا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت ۴۷۱ھ میں ہوئی، اس لئے یہ نسب نامہ مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں علامہ واسطی مشہور نسابہ عمری کے حوالہ سے لکھتے ہیں ۔

ولو ثبت لی بطرق صحیحۃ ادعاء الشیخ عبدالقادر ؒ اور اگر صحیح طریقوں سے یہ ثابت ہوجائے کہ حضرت شیخ عبدالقادر

قدس سرہ ہذہ النسبۃ بصدق قبلتها انما تثبت عندی من صدق حالہ وعلو مقامہ ولا نیتہ

اس نسبت کے مدعی ہیں تو ہم تصدیق کریں گے کیونکہ ہمارے نزدیک آپ کے حالات کی سچائی اور بزرگی کا مرتبہ سچ ہے۔

مصنف "صحاح الاخبار" نے اعتراضات بالا کا مفصلہ ذیل جواب دیا ہے۔

۱ - یہ روایت کہ اس نسب کے مدعی نہ تو حضرت عبدالقادر ہیں نہ آپ کے فرزند متواتر ہے، با ایں ہمہ انکار محل نظر ہے کیونکہ ممکن ہے حضرت شیخ نے عبادت الٰہی اور ریاضت قلب میں مستغرق ہونے کے باعث اس طرف توجہ نہ کی ہو اور یہ صوفی عارف کی شان بھی نہیں کہ نسبی تذکرہ اور اس پر فخر کرے۔

۲ - دوسری روایت یہ ہے کہ اس نسبت کا دعویٰ آپ کے پوتے قاضی ابوصالح بن ابی بکر عبدالرزاق نے کیا اسکا جواب اول تو یہ ہے کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کے والد و جد نے اپنی نسبت کو چھپایا ایسا نہ ہو یہ ضایع ہو جائے دوم یہ کہ وہ قاضی تھے اس لئے انھوں نے اپنی نسبی شرافت کا فخریہ اعلان کیا تاکہ اہل زمانہ کے نزدیک آپ کی شان بڑھے،

اس سے زیادہ دلچسپ وہ نامہ و پیام ہے جو قاضی ابوصالح اور مشہور نسابہ ابن میمون کے درمیان ہوا قاضی ابوصالح نے ابن میمون کو لکھا تھا کہ وہ اپنے شجرہ کے اندر آل حسن میں ان کو بھی شامل کر لیں - ابن میمون نے مفصلہ ذیل جواب دیا۔

اما انت فنعم فنالك قاضیا واما ابوك عبدالرزاق فهو رجل فقیہ صالح واما جدك الشیخ عبدالقادر فهو شیخ صوفی تقی یتبرك بہ ویطلب صالح دعائہ وانما نسبہ فکما انت اطلقت فی بعض کتبك بشتبری ینتهی الی بشتبر بطن من الهرمزۃ بفارس فاتق اللہ ودع الهاشمیۃ لاهلها۔

جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے آپ قاضی ہیں آپ کے والد ماجد ایک صالح فقیہ ہیں آپ کے جد بزرگوار شیخ عبدالقادرؒ پاکباز صوفی ہیں آپ ان سے دعا و برکت کے طالب ہوجئے اور آپ کا نسب جیسا کہ آپ نے بعض خطوط میں لکھا ہے "بشتبری" ہے جو فارس میں آل ہرمز کی ایک شاخ "بشتبر" سے ملتا ہے پس اللہ کا خوف کیجئے، اور ہاشمیت کا دعویٰ ہاشمیوں کے لئے چھوڑ دیجئے۔

مصنف "صحاح الاخبار" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن میمون نے یہ جواب شیخ کی نسبت سے ناواقفیت کی بنا پر دیا۔

فیمکن اتصالہ بآل بشتبر من جہۃ الامومۃ وکثیرا ما ینتمی الرجل العلوی بنسبۃ امہ اذا کانت من بیت ریاسۃ وتقدم وهذا انما لا یقدح فی نسب الرجل۔

ممکن ہے آپ کا سلسلۂ نسب ماں کی طرف سے آل بشتبر سے ملتا ہو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک علوی اپنے ماں کے نسب کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے اگر ماں صاحب حکومت اور ترقی یافتہ گھرانہ سے ہو اور اس سے مرد کے نسب میں کوئی خرابی

واقع نہیں ہوتی۔

سید احمد عمید الدین نجفی نے تو قطعی طور پر لکھدیا کہ شیخ عبدالقادرؒ کی ہاشمیت کے قایل جاہل لوگ ہیں جو شیخ کی طریقت کے پیرو ہیں اور صوفیہ و فقہا کے بعض وہ احمق جن کو علم النسب سے واقفیت نہیں۔

نجفی چونکہ متعصب شیعی عالم تھے اس لئے ان کی یہ دریدہ دہنی خلاف توقع نہیں عام نسابین نے اس باب میں بحث کرکے سکوت اختیار کیا ہے، رفاعی نے عمری کے حوالے سے واسطی کی یہ رائے لکھی ہے کہ شیخ عبدالقادر کے مقولات سے آپ کا دعوی ہاشمیت ثابت ہوجائے تو ہم تسلیم کرلیں گے اور یہ ایک معقول بات ہے لیکن مجھے یہاں آپکو حسنی سید مانتے ہوئے یہ دکھانا ہے کہ بقول رفاعی آپ کا مادری سلسلۂ نسب عجمیوں سے ملتا ہے، پھر بھی دنیا کسی طرح آپ کی سیادت و ہاشمیت، نجابت و شرافت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔

اسی طرح ادارسہ (بنی ادریس حکمرانان مغرب) کا سلسلہ بھی جنھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک حکومت کی لونڈی ہی سے چلا، عباسیہ کے تیسرے خلیفہ ہادی (۱۶۹ھ ۱۷۵ھ) کے زمانہ میں سید ادریس بن عبداللہ محض بن حسن مثنی بن حسن السبط نے بربریوں کی مدد سے مغرب میں ایک سلطنت قائم کی اور ۳۰۹ھ تک اس حکومت کا قیام رہا علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

واما ادریس بن عبد اللہ المحض المکنی بابی عبد اللہ ملک المغرب وھو الذی فتح علی یدیہ الغرب و عقبہ فی ولدہ ادریس وحدہ وھو لام ولد بربریۃ توفی ابوہ وھو حمل و وضعت المغاربۃ التاج علی بطن امہ وھو اول ملک تلد الملک حملا فی الاسلام،

اور ادریس بن عبد اللہ محض سلطان مغرب جنکی کنیت ابو عبداللہ ہے ـــ وہ شخص ہیں جنھوں نے مغرب کو فتح کیا اور ادریس نامی صرف ایک بیٹا چھوڑا جو ایک بربری لونڈی کے بطن سے تھے ابھی یہ پیٹ ہی میں تھے کہ ان کے والد نے وفات کی اہل مغرب نے انکی والدہ کے شکم (مبارک) پر تاج رکھا اور اسلامی دنیا کے یہ پہلے بادشاہ ہیں جنھوں نے ولادت سے پہلے حکومت پائی،

اگر سیاسی نزاکتوں پر ذرا غور کیا جائے تو پتہ چل جائیگا کہ خاندان رسالت کی اس شاخ یعنی ادارسہ کو جاہ و جلال نصیب ہوا تو صرف اسلئے کہ یہ بربریہ لونڈی کے بطن سے تھے ورنہ عباسیہ تو ان کے خون کے پیاسے تھے اور ظلم و جور ہی کی بنا پر ادریس مدینہ سے بھاگ کر مغرب پہونچے بربریوں نے ساتھ دیا کیوں ؟ ظاہر ہے کہ بربریوں نے دیکھا ہوگا کہ ادریس آل رسول ہیں اور ان کی بیوی بربری قوم کی ہیں اس لئے ادریس کے ساتھ ان کو قدرتی طور پر ہمدردی ہوئی ہوگی اور اس ہمدردی کی غایت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ بربریہ کے بطن سے ابھی ادریس ثانی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ بربریوں نے شکم مادر پر تاج رکھکر اُن کی تاجپوشی کا جشن بھی منا ڈالا، تاریخ اسلام نے آج تک ایسی نظیر نہیں پیش کی - اگر ادریس ثانی کسی علویہ یا عربی خاتون کے بطن میں ہوتے تو ظاہر ہے کہ ادریس اول کی وفات کے بعد بربری

خود اپنی حکومت قایم کر لیتے اور اُن کو اس جنین مسعود کے ساتھ جسکے متعلق ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مرد ہے یا عورت کوئی خاص ہمدردی نہ ہوتی، خاندان عباسیہ میں بھی ہم کو ایسی ہی ایک سیاسی فضا نظر آتی ہے، ہارون رشید کے بعد امین اور مامون کی معرکہ آرائیاں تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں امین زبیدہ ہاشمیہ کے بطن سے تھے اور مامون خیزران جاریہ (لونڈی) کے بطن سے، تمام ہاشمیوں اور اکثر قریشیوں کو امین سے ہمدردی تھی مامون کو اکثر رشید نے بھی ذلیل کیا اور زبیدہ نے بھی۔ مامون اور زبیدہ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ تاریخ میں پایا جاتا ہے، امین احمد رازی لکھتے ہیں۔

> گویند کہ مامون روزے نزد خاتون رفت و او را دلتنگ یافت گفت اے مادر بہر فرزند خویش محمد امین دلتنگ ہستی کہ او انگشتنہ گفت نہ لیکن از کردۂ خود پشیمانم گفت چہ کردہ گفت اگر گویم دلتنگ شوی مامون گفت بگوئے گفت روزے با پدرت شطرنج می باختم پدرت ببرد مرا گفت عریاں شو وگرد قصر طواف کن ہر چند الحاح نمودم ناچار چناں کردم پس دیگر بار با او شطرنج باختم و ببردم گفتم بمطبخ رو و بہ جاریہ خیزران کہ انجاست جماع کن و خیزران کنیز کے قبیح منظر بودہ پدرت ہر چند زاری کرد سودے نداشت و چنداں الحاح کردم کہ با او کرد و تو بوجود آمدی در رسید بہ من و بپسر من آنچہ رسید[1]

مسطورہ بالا روایت سے مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید ایک ایرانی لونڈی خیزران کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، مامون اور امین کے درمیاں معرکہ آرائی ہوئی تو ایرانیوں نے مامون کا ساتھ دیا اس لئے سیاسی انقلابات کا مطالعہ کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ مامون کو فتح و نصرت جاریہ ہی کے بطن سے پیدا ہونے کے صدقہ میں میسر آئی ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ امین جو ماں اور باپ دونوں طرف سے ہاشمی تھے وہ شکست کھاکر مارے جاتے اور مامون اسلامی دنیا کے عظیم الشان خلیفہ ہو جاتے، ایرانیوں نے محض اس بنا پر ساتھ دیا کہ مامون کے جسم میں ماں کی طرف سے ایرانی خون شامل ہے مامون کو دنیا نے جس نگاہ احترام سے دیکھا اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ ان کی صاحبزادی ام الفضل سے حضرت امام علی الرضاؑ نے شادی کی۔

اب آئیے ذرا ائمہ معصومین کے شجرات پر غور کریں دنیا جانتی ہے کہ سادات کرام حضرت امام حسن و حسین کی اولاد سے دنیا میں پھیلے، علامہ شیخ مفید امام حسنؑ کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

---

[1] ہفت اقلیم قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری، کے مصنف نے اسی سلسلہ میں رشید و مامون کے سوال و جواب کا بھی نہایت پُر لطف واقعہ لکھا ہے رشید نے غصہ میں مامون کو ایک دن حرامزادہ (ولد الزانیہ) کہدیا، مامون نے برجستہ تلمیح قرآنی سے کام لیا اور کہا "الزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک"۔ مطلب یہ ہے کہ میری والدہ آپ کی اہلیہ ہیں اگر وہ زانیہ ہیں تو آپ خود بھی زانی اور مشرک ہیں۔

زید بن حسن ام الحسن اور ام الحسین کی ماں کا نام ام بشیر بنت ابی مسعود بن عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ ہے' حسن بن حسن کی والدہ کا نام خولہ بنت منظور الفراریہ ہے' عمرو بن حسن' قاسم وعبداللہ یہ تینوں حضرات لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے' عبدالرحمٰن بن حسن لونڈی سے تھے' وحسن بن حسن ملقب بہ اثرم' طلحہ بن حسن اور فاطمہ بنت حسین تینوں اولاد ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمی سے پیدا ہوئیں ام عبداللہ' فاطمہ' ام سلمہ' رقیہ مختلف ماؤں سے پیدا ہوئیں -

عمرو' قاسم' عبداللہ اور عبدالرحمٰن (جو لونڈیوں کے بطن سے تھے) کی اولاد کے حالات صحاح الاخبار میں نہیں ملتے لیکن خیر یہی کیا کم ہے کہ حضرت حسنؑ کی اولاد بھی لونڈیوں کے بطن سے ہوئی

حضرت حسینؑ کی تمام اولاد منکوحہ بیویوں سے تھی صرف حضرت امام زین العابدین جاریہ کے بطن سے تھے' علامہ شیخ مفید لکھتے ہیں:-

ام شاہ زنان بنت یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ ویقال ان اسمہا کان شہربانویہ وکان امیر المومنین ولی حریث بن جابر الحنفی جانبا من المشرق فبعث الیہ بنتی یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ فنحل ابنہ حسین شاہ زنان منہا فاولدھا زین العابدین ونحل الاخری محمد ابن ابی بکر فولدت لہ القاسم ابن محمد بن ابی بکر فھما ابن خالۃ[۵۱]

آپ کی والدہ "شاہ زناں" یزدجرد بن شہریار بن کسریٰ کی صاحبزادی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ آپکا نام شہربانو تھا حضرت امیر المومنین (علی) نے حریث بن جابر حنفی کو مشرق کی طرف حاکم بنا کر بھیجا تھا انھوں نے شہریار بن یزدجرد بن کسریٰ کی لڑکیاں جناب امیرؑ کی خدمت میں روانہ کیں آپ نے شاہ زناں کو اپنے صاحبزادہ حضرت حسین کے سپرد کیا اور اُن سے حضرت زین العابدین پیدا ہوئے۔ دوسری لڑکی محمد بن ابی بکر کو بخشدی جن سے قاسم بن محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں -

شیخ مفید کی روایت لفظ بہ لفظ علامہ رفاعی سے ملتی[۵۲] ہے' علی بن حسن الزواری امام زین العابدین کے متعلق لکھتے ہیں -

مادرش اُم ولد نام او غزالہ گویند نام او شاہ زنان بود دختر یزدجرد وغیر از زین نیز گفتہ اند[۵۳]

لیکن روایات بالا کے بعض پہلو "غایۃ المہمہ" میں مختلف نظر آتے ہیں مصنف لکھتا ہے'

ابوالقاسم زمخشری در کتاب ربیع الابرار آوردہ کہ صحابہ در خلافت امیر المومنین عمرؓ چوں سیدیان فارس

---

[۵۱] الارشاد شیخ مفید - [۵۲] صحاح الاخبار - [۵۳] کشف الغمہ -

بہ مدینہ آوردند سہ دختر از بنات یزدجرد در ان میاں بود امیر المومنین عمرؓ حکم کرد تا بفروشند اینہارا امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ گفت با اولاد ملوک معاملہ مانند سائر الناس نباید کرد بیں قیمت ہر سہ دختر کردہ امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ گرفت یکے را بہ عبداللہ بن عمر داد و دیگرے را بہ پسر خود حسین و سیومے را بہ محمد بن ابی بکر از ان دختر کہ بہ عبداللہ بن عمر داد و نامش "گیہاں بانو" بود سالم بن عبداللہ متولد شد و از ان کہ بہ امام حسین بخشید و نام او شہر بانو بود امام زین العابدین بوجود آمد و از انکہ بہ محمد بن ابی بکر صدیقؓ داد قاسم بن محمد تولد یافت[۱]

مصنف غایۃ الجہد کے نزدیک یہ واقعہ عہد فاروقی میں ہوا علامہ رفاعی اور شیخ مفید نے اس کو حضرت علیؓ کے عہد خلافت کی طرف منسوب کیا ہے، حضرت امام زین العابدین ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت علی ۳۵ھ میں تخت خلافت پر بیٹھے اس لئے معلوم ہوتا ہے رفاعی و شیخ مفید کی روایات کا وہ حصہ جس سے اس واقعہ کا حضرت علی کے عہد خلافت میں ہونا مستنبط ہوتا ہے، نامعتبر ہے اس کے بعد "غایۃ الجہد" کے مصنف تبصرہ کرتے ہیں

بیش ازین اہل مدینہ سریہ گرفتن (لونڈی سے ازدواجی تعلق رکھنا) را عیب می کردند چون این سہ بزرگ از سراری بہ وجود آمدند و در فقہ و ورع فائق شدند مردم را ترغیب سراری پیدا شد۔

ہر چند شہر بانو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے عوام کہہ سکتے ہیں کہ لونڈی بننے کے بعد ان کے خاندانی اعزاز میں کوئی فرق نہیں آسکتا، لیکن مجھے دکھانا یہ ہے کہ حضرت حسین کی اولاد میں قریشی خون کے علاوہ دوسرا خون بھی شامل ہونا شروع ہوا اور یہی "مختالاً فخوراً" قسم کے حضرات کا دل دکھانے کے لئے کیا کم ہے آگے دیکھئے تمام ائمہ معصومین انھیں امام زین العابدین کے خاندان سے تھے اس لئے جد امجد کے خون کے ساتھ اگر غیر قریشی خون شامل ہوگیا ہے تو پھر تمام آئندہ نسلیں عام نظریۂ نجابت کے مطابق مخلوط قرار پائیں گی کیونکہ کسی سید نے غیر برادری میں شادی کرلی ہو تو اس کی اولاد کو (خواہ اس کے بعد اس کی اولاد نے دوسرا خون شامل ہونے سے احتیاط کی ہو) عام مسلمان ذلیل نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پس آج شرافت کا مروجہ معیار حضرت امام زین العابدینؑ اور آپکی اولاد امجاد کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے؟ لیکن ہیں یہاں آپ کو الجھن میں نہیں پڑنے دونگا اور آگے دیکھئے کہ حضرت امام زین العابدین کی تقریباً تمام اولاد بہ استثنائے حضرت امام باقر لونڈیوں کے بطن سے ہوئی علامہ رفاعی لکھتے ہیں :-

---

[۱] غایۃ الجہد مصنفہ علیم بیانی۔

کان لہ خمسۃ عشر ولد اً ابو جعفر محمد الباقر امہ فاطمہ بنت الحسن ابن علی بن ابی طالب وابو الحسین زید الشہید وعمر الاشرف امہما ام ولد وعبد اللہ والحسن والحسین امہم ام ولد والحسین الاصغر وعبد الرحمٰن وسلیمان لام ولد علی الاصغر و کان اصغر ولد ابیہ وخدیجہ امہما ام ولد محمد الاصغر امہ ام ولد و فاطمہ وعلیہ وام کلثوم

آپ کے پندرہ اولاد تھی، ابوجعفر محمد الباقر آپ کی والدہ فاطمہ بنت حسن بن علی بن ابی طالب تھیں، اور ابوالحسین زید شہید اور عمر الاشرف ان لوگونکی والدہ لونڈی تھیں، عبد اللہ، حسن اور حسین یہ بھی لونڈی کے بطن سے تھے، حسین اصغر، عبد الرحمٰن وسلیمان ان کی ماں بھی لونڈی تھیں علی صغر اور یہ اپنے والد کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ تھے اور خدیجہ لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئیں اور محمد اصغر اُن کی والدہ بھی لونڈی تھیں، اور فاطمہ، علیہ اور ام کلثوم (یہ سب حضرت امام زین العابدین کی صاحبزادیاں تھیں)

علامۂ رفاعی نے آخری تینوں صاحبزادیوں کی والدہ کا تذکرہ نہیں کیا لیکن شیخ مفید نے لکھا ہے۔

وفاطمہ وعلیہ وام کلثوم وامھن ام ولد

اور فاطمہ، علیہ اور ام کلثوم کی مائیں لونڈی تھیں۔

یہاں پر ایک مسئلہ اور قابل غور ہے حضرت ابوجعفر امام باقر کی والدہ ہاشمیہ تھیں اس لئے نسابین نے ان کے متعلق نہایت فخریہ جملے لکھے ہیں۔

فھو اول ھاشمی ولد من ھاشمین علوی من علویین

پس وہ پہلے ہاشمی ہیں جن کے ماں باپ دونوں ہاشمی تھے اور پہلے علوی ہیں جن کے باپ بھی علوی تھے اور ماں بھی علویہ تھیں۔

آج نجیب الطرفین کا جو معیار قرار دیا جاتا ہے وہ ہماری تاریخی روایات سے بالکل مختلف ہے، ظاہر ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ نہ قرشیہ تھیں نہ ہاشمیہ، وہ ایرانی تھیں آپ کے صاحبزادہ امام باقر کو (جن کی دادی عجمی الاصل تھیں) نجیب الطرفین بتایا جارہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں لیکن بحث یہ ہے کہ ہمارے یہاں نجیب الطرفین تو ایسے شخص کو کہتے ہیں جسکے مادری یا پدری سلسلہ میں کسی دوسرے خون کی آمیزش نہوئی ہو مثلاً، ویدماں اور باپ دونوں طرف سے سید تھے اُنھوں نے غیر قوم کی کسی عورت سے نکاح کرلیا بکر پیدا ہوئے بکر نے ایک نجیب و شریف سیدانی سے بیاہ کیا اُن سے اولاد پیدا ہوئی اَب ہماری سوسائٹی ایسے خاندان کو نجیب الطرفین تو کیا شریف بھی نہیں تسلیم کرتی ہندوؤنکی دیکھا دیکھی مسلمان بدترین قسم کی قومی سیہ کاری میں مبتلا ہوگئے اور کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ اُن کی افتادگی وسراسیگی اُنھیں عجیب وغریب تخیلات کی پیداوار ہے۔

امام باقر کی والدہ تو ہاشمیہ تھیں لیکن خود امام باقر کی شادی بی بی ام فردہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ سے ہوئی یعنی حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے کی صاحبزادی آپ کی زوجیت میں آئیں اور امام جعفر صادقؓ پیدا ہوئے کون کہہ سکتا ہے آپ کی ماں اور باپ دونوں قریشی نہ تھے لیکن قابل غور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کے نانا قاسم بن محمد کی

والدہ ایرانی تھیں اور حضرت علی کا عطیہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا اب یہاں خاندان رسالت میں مادری سلسلہ کے اندر دوسرا اختلاط ہوا حضرت امام جعفر صادق کے دادا (زین العابدین) کی والدہ بھی ایرانی اور آپ کے نانا (قاسم بن محمد) کی والدہ بھی ایرانی یعنی دو پشت میں اختلاط ہوا، امام جعفر صادق کہا کرتے تھے،

ولدنی الصدیق مرتین　｛ حضرت صدیقؓ سے مجھے دوہرا نسلی علاقہ ہے۔

یہ اس لئے کہ آپ کے نانا قاسم بن محمد ابی بکر تھے اور آپ کی نانی اسماء بنت عبد الرحمٰن بن ابی بکر تھیں اس لئے نانا اور نانی دونوں طرف سے آپ آل صدیق ہیں، حضرات شیعہ امام جعفر صادق کے اس فخریہ جملہ "ولدنی الصدیق مرتین" پر غور کریں اور سوچیں کہ بقیہ ائمہ معصومین موسیٰ کاظم، علی رضا، نقی، تقی، عسکری، مہدی (علیہم السلام) تمام حضرات کے اندر امام جعفر کی وساطت سے حضرت صدیق اکبر کا خون جاری اور ساری ہے یا نہیں؟ اگر حضرت صدیق اہل بیت کے دشمن تھے تو آل صدیق سے ایسا گہرا ارتباط اور ازدواجی تعلقات کیا معنی رکھتے ہیں؟

امام باقر کے صاحبزادہ حضرت امام جعفر صادقؑ تو ام فروہ بنت قاسم قرشیہ صدیقہ سے پیدا ہوئے تھے لیکن امام باقر کی اور اولاد بھی تھی جو لونڈیوں سے پیدا ہوئی تھی چنانچہ آپ کے صاحبزادہ و صاحبزادی علی و زینب لونڈیوں سے تھے اور آپ کی دوسری صاحبزادی ام سلمہ بھی لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔

امام جعفر صادق کے بعد امامت آپ کے صاحبزادہ حضرت موسیٰ الکاظم کو ملی آپ کے بارہ میں علامہ رفاعی لکھتے ہیں

امہ حمیدۃ البوبریۃ اخت صالح البوبری وکانت تکنی ام ولد　｛ آپکی والدہ حمیدہ بربریہ ہمشیرہ صالح بربری تھیں اور آپ کی کنیت ام ولد تھی،

حسن الزواری لکھتے ہیں۔

مادرش ام ولد بود کہ او را حمیدہ بربریہ می گفتند وغیر ازین نیز گفتہ اند (کشف الغمہ)

آپ کے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے متعلق شیخ مفید فرماتے ہیں۔

وموسیٰ واسحٰق ومحمد لام ولد والعباس وعلی وفاطمہ لامہات اولاد شتی (الارشاد)　｛ موسیٰ (الکاظم) اسحٰق اور محمد کی ماں ام ولد تھیں اور علی، عباس اور فاطمہ مختلف لونڈیوں کے بطن سے تھیں،

موسیٰ کاظمؑ کو خدا نے بہت کثیر الاولاد بنایا تھا اور آپ کی تمام اولاد لونڈیوں ہی کے بطن سے وجود میں آئی چنانچہ علامہ رفاعی لکھتے ہیں۔

وکان لابی الحسنؑ سبعۃ وثلاثون ولداً ذکراً وانثی منہم الامام علی ابن موسیٰ الرضا و ابراہیم والعباس والقاسم لامہات اولاد الخ (صحاح الاخبار)　｛ اور ابو الحسن (موسیٰ کاظم) کے ۳۷ بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں ان میں علی بن موسیٰ رضا ابراہیم عباس اور قاسم کی مائیں لونڈی تھیں

آپ کے بقیہ صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

اسمٰعیل، جعفر، ہارون، حسن، احمد، محمد، حمزہ، عبد اللہ، اسحٰق، عبید اللہ، زید، حسن، فضل، حسین، سلیمان، فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ، رقیہ، حلیمہ، ام ابن، رقیہ صغریٰ، کلثوم، ام جعفر، لبانہ، زینب، خدیجہ، علیہ، آمنہ، حسنی، بدیہہ، عائشہ، ام سلمہ، میمونہ، ام کلثوم۔

شیخ مفید اور علامہ رفاعی ان تمام حضرات کی ماں کو "امہات اولاد" (لونڈیاں) بتاتے ہیں اکثر سادات کا سلسلۂ نسب حضرت موسیٰ کاظم تک پہونچتا ہے[1]، آج اپنے نام کے ساتھ کاظمی لکھنے والے غور کریں اور عہد حاضر کے وضعی معیار شرافت کو دیکھیں کیا اُن کی غیرت اسے قبول کرتی ہے کہ اگر وہ کسی نامعلوم زمانہ سے ماں اور باپ دونوں طرف سے کاظمی مشہور ہیں تو اپنے دوسرے بھائی کی اولاد کو (جن کی مائیں ہند یا مسلمانوں کے نیچ طبقات سے متعلق ہوں) مخلوط النسل اور حقیر سمجھیں؟

امام موسیٰ کاظم کے بعد امامت آپ کے صاحبزادہ حضرت امام ابو الحسن علی بن موسیٰ الرضا کو ملی آپ کے متعلق علامہ رفاعی کا قول امام کاظم کے سلسلہ میں لکھا جا چکا، محمد علیم یحیائی افضلی الہ آبادی لکھتے ہیں۔

مادر وے کنیز است، ہمچنیں مادران باقی ائمہ نیز کنیز بودہ اند مادر رضاؑ را مادر پدرش (حمیدہ بربریہ) خریدہ بود، از اشراف عجم و بہترین زنان بودہ در فعل و دین و بہ اسامی بسیار موسوم است از اں جملہ، اروی، و نجمہ و سمان .... و در آخر مش "برنکتم" قرار گرفتہ مولاۃ خود حمیدہ را بغایت بزرگ می داشت و بہ حضورش گاہے نمی نشست[2]

علی بن حسن الزواری لکھتے ہیں کہ آپ کی والدہ ام ولد (لونڈی) تھیں اور خیزران مرسیہ شقراے نوبیہ اور اروی وغیرہ اسماء سے موسوم تھیں[3]

اسی طرح امام ابو جعفر محمد بن علی موسیٰ (محمد تقی) کی والدہ بروایت علی بن حسن الزواری لونڈی تھیں اور آپ کا نام سکینہ مرسیہ یا خیزران تھا۔ صاحب "غایۃ الھدیٰ" نے خزران لکھا ہے، لیکن میر محمد باقر مجلسی اصفہانی فرماتے ہیں

---

[1] علامہ رفاعی لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کاظم نے اپنے بعد چودہ بیٹے چھوڑے ان میں بارہ صاحبزادوں کی اولاد اقصائے عالم میں پھیلی اُن کے اسماء یہ ہیں۔ علی رضا، ابراہیم، مرتضیٰ، محمد العابد، جعفر (ان کی اولاد کثیر ہے) زید النار، عبد اللہ، عبید اللہ، حمزہ، (انکی اولاد دو درجہ میں پھیلی) عباس، ہارون، اسحٰق اور اسمٰعیل (انکی اولاد قلیل ہے) حضرت جعفر ابن کاظم کو اکیس بیس اولاد ہوئی، آپ کی اولاد "رضیوں" (رضوی) کہلاتی ہے (دیکھو صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیہ الاخیار)

[2] غایۃ الھدیٰ فی ذکر الصحابۃ والائمہ

[3] کشف الغمہ

مادرش ام ولد است و نام او سبکہ است و ریحانہ و خیزران و مشہور آنست نوبیہ است و بعضی گویند مرسیہ است از ملت ماریہ (قبطیہ) مادر ابراہیم فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[۵۰]

امام محمد تقی کے بعد آپ کے صاحبزادہ ابو الحسن علی ابن محمد بن الرضا معروف بہ امام نقی کرسی امامت پر بیٹھے آپکی والدہ کا نام سمانہ مغربیہ تھا اور یہ بھی لونڈی تھیں اسی طرح امام ابی محمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی رضاؑ (جو امام حسن عسکری کے نام سے مشہور ہیں) کی والدہ ام ولد تھیں اور آپکا نام "سوسن" تھا باقر مجلسی سنبل اور غزالہ بتاتے ہیں آپ کے صاحبزادہ محمد بن حسن عسکری (معروف بہ محمد مہدی) تھے جن پر اثنا عشریہ کے عقیدہ کے مطابق امامت ختم ہوجاتی ہے، بقول صاحب کشف الغمہ آپ کی والدہ کا نام صیقل اور حکیمہ تھا آپ بھی لونڈی تھیں میر باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

مادرش ملیکہ دختر یشوعان فرزند قیصر روم بود از نسل شمعون الصفا وصی حضرت عیسیٰ ملقب نرجس (نرگس) خاتون و بعضی گویند دختر زید علویہ[۵۱]

شیخ مفید فرماتے ہیں:۔

وامہ ام ولد یقال لھا نرجس — آپ کی والدہ لونڈی تھیں جن کو "نرگس" پکارا جاتا تھا

خواجہ معین الدین سجزی چشتیؒ کا نسب حضرت موسی کاظمؑ تک پہونچتا ہے، وہی موسی کاظم جنکی والدہ حمیدہ بربریہ (لونڈی) تھیں اور جن کے بعد بقیہ تمام ائمہ کی مائیں لونڈیاں تھیں امام علی رضا کی دادی لونڈی تھیں آپ کی والدہ (ازدی یا خیزران مرسیہ) کو آپ کی دادی نے خرید اتھا۔

امام رضا کے صرف ایک صاحبزادہ محمد تقی ہوئے محمد تقیؑ کے دو صاحبزادے علی ہادی اور موسی مبرقع ہوئے انھیں "مبرقع" کی اولاد میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ تھے امام علی الرضا کی اولاد کے متعلق رفاعی لکھتے ہیں۔

ویقال لولدہ الرضیون، — آپ کی اولاد "رضوی" کہلاتی ہے،

ہندوستان میں آج ہزاروں کی تعداد میں رضویہ موجود ہیں اور وہ امتیاز کے لئے اپنے نام کے ساتھ "رضوی" لکھتے ہیں چشم ما روشن کوئی اعتراض نہیں لیکن کیا وہ ہندوستان کے موجودہ نظریۂ نجابت پر غور کریں گے؟ اور پھر کیا وہ اپنی برادری کے اندر ان "خانماں برباد" رضویوں پر ایک نگاہ ڈالنے کی فیاضانہ سعی کر سکتے ہیں جن کو انکی ناعاقبت اندیشیوں

---

۵۰ تذکرۃ الائمہ میر باقر مجلسی۔

۵۱ تذکرۃ الائمہ۔

نے اپنی قومیت سے عضو معطل کی طرح کاٹ کر الگ کر دیا ہے صرف اس جرم پر کہ ـــــ کسی زمانہ میں ان کے آبا نے غیر قوم کی عورتوں سے شادی کر لی تھی!

تنزل کی خطرناک گھٹاؤں میں گھرے ہوئے ضعیف مسلمانو! ان واقعات پر غور کرو اس وجہ سے نہیں کہ تاریخ کے ان صفحات سے اپنے تخیلات نسبی کا موازنہ کر کے خفت محسوس کروگے، بلکہ اس لئے کہ ناروا انتخاب صناعی کی بنا پر جو تم نے خود کو گوشت کا ایک "مضغہ" بنا لیا ہے اس پر پشیماں ہو اور پھر کوشش کرو کہ تمھاری قوم کے اندر وہی شیرازہ بندی وہی خلوص وہی اخوت ہو جائے جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی ہے۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا (آل عمران) — اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ تم باہم دشمن تھے خدا نے تمھارے دل ملا دیئے اور تم نعمت خداوندی کی بدولت بھائی بھائی ہو گئے۔

آج مسلمانوں کی حالت بالکل یہودیوں کی سی ہو گئی ہے، جنکے متعلق تیرہ سو سال قبل "تحسبہم جمیعا وقلوبہم شتّٰی" (تم ان کو متحد خیال کرتے ہو حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے جدا ہیں) کہا گیا تھا مسلمانوں کی قومیت آج اسی آشفتگی اور پریشان حالی میں ہے انانیت اور خود پرستی نے ان کو منتشر کر دیا ہے، ان کے قلوب ایک دوسرے سے پھرے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے سے ہمدردی باقی نہیں رہی ہر شخص اپنے فضل وخودی کے خبط میں مبتلا ہے، علما کا گروہ جو کبھی اپنے کردار اور روحانی قدس سے قوم کو پیام زندگی دیتا تھا خود طرح طرح کے روحانی امراض میں مبتلا ہے، نہ ان میں محبت ہے نہ خلق ہے نہ خشیت الٰہی ہے نہ تقویٰ ان کے اعمال آج سلف سے مختلف ہیں ان میں اب نہ کوئی سچا دردمند قوم پیدا ہوتا ہے نہ پاکباز رہبر دین ذوق تن آسانی اور جلب زر کی حوصلہ پیمائیوں نے ان کو عام شہریوں سے بھی فروتر بنا دیا ہے۔ اب ان کی وہی مجلسیں جن میں جانے کے بعد کبھی خدا یاد آتا تھا جذبات اسفل کی صحیح آئینہ داری کر رہی ہیں کیا ایسی قوم کی تباہی کسی سیاسی ونفسیاتی تحلیل کی محتاج ہے، ؟ آج خلافت بھی موجود ہے اور مسلم لیگ بھی دینی تبلیغ کی بھی گرما گرمی ہے اور سیاسی تحریکوں کا جوش وخروش بھی لیکن کیا تھوڑی دیر کے لئے آپ اس مسئلہ پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ ان تمام مذہبی وسیاسی جمعیتوں کے باوجود مسلمان قعر مذلت میں کیوں گرے جاتے ہیں؟ یقیناً ہر محب وطن اور رہبر دین کی عظمت ہمارے دل میں ہونی چاہئے اور ایک حد تک ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ مسلمانوں کی قومیت کی تعمیر نہ تبلیغ کانفرنس کے ذریعہ ہوئی تھی اور نہ نیشنل پارٹی کے ذریعہ بلکہ افراد کی پاک سیرت، خلوص ورواداری، خلق ومحبت نے ہم کو دنیا کی تمام قوموں کے سامنے ایک قلیل عرصہ میں ممتاز بنا دیا تھا۔ آج مذہبی یا سیاسی قیادت محض حصول جاہ اور طلب شہرت کے لئے کیجاتی ہے، آپ اپنی روحانی دردمندیوں سے مجبور ہو کر عام جلسوں میں تقریریں نہیں کرتے بلکہ اپنی قوت خطابت اور آتش بیانیوں کی لوگوں سے داد لیتے ہیں اور اس طور سے گویا ملک کے اکثر قایدین عام ازیں کہ وہ سیاسی رہنما ہوں یا دینی مبلغ اپنی خود غرضی!

اپنی عصبیت کی قربانگاہ پر قوم کی بھینٹ چڑھاتے جاتے ہیں۔ کیا رہنمایان ملت اسپر غور کریں گے کہ زبان سے چشمۂ بلاغت رواں کرنے سے زیادہ قوم کو آپکے مخلصانہ اخلاق اور پاکبازانہ طریقہ زندگی کی ضرورت ہے۔ اور آپ کی زحمت لب کشائی سے کہیں زیادہ' آپ کی خموشِ طرزِ فغاں قوم کو فائدہ پہونچا سکتی ہے'

مسلمانوں کی پستی و اضمحلال' انتشار و افتادگی کے کون سے اسباب ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو اسوقت بہت اہمیت رکھتا ہے' جہاں تک مینے غور کیا ہے' مسلمانوں کے قومی زوال کا سبب صرف ایک ہے' اگر ہمارے وطنی بزرگوں نے اپنی کوششین اس طرف مبذول کیں تو ممکن ہے ہماری نشأۃ الثانیہ کا دور شروع ہو جائے۔ میرا خیال ہے صرف "مغایرت" نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے' اور یہ مرض نسلی عصبیت سے پیدا ہوا ہے جس کو مٹانے کے لئے اسلام دنیا میں آیا اور پیغمبر اسلام کی پاک زندگی' اور آپ کی وسعت ہمدردی نے اپنے قلیل زمانہ بعثت میں وہ کر دکھایا جو دنیا کے اندر انسانیت کا کوئی دردمند نہیں کر سکا۔ شاید قدرت نے اسلام کے لئے سرزمین عرب کا انتخاب ہی اس لئے کیا تھا کہ وہاں نوع انسانی کے ساتھ مساوات و مواخات ناپید تھی اور نبی صلعم کو قریش میں مبعوث کیا تاکہ وہ عرب کے سب سے زیادہ مغرور قبیلہ کے اندر انسانیت کی محبت اور درد پیدا کر کے دنیا کو اخوت کا پیام دیں۔

یہ تو قریب قریب ناممکن ہے کہ صدیوں کا پندار ہم سے یک بیک رخصت ہو جائے اس لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تمام قبایل بلا نسلی نزاع یگانہ حیثیت سے اپنی اصلاح کریں اس طور سے جب وہ متحد ہو جائیں تو پھر ہر قبیلہ کے سربرآوردہ اور عاقل لوگ اپنے اپنے اثر سے تمام قبایل کے اندر یگانگت پیدا کرنے کی سعی کریں۔ یاد رکھئے کہ جب تک مسلمانوں کے تمام قبایل (میری مراد قبیلہ سے "ذات" ہے) نسلی رشتہ میں منسلک نہ ہوں گے مسلمان نہ کبھی ترقی کر سکتے ہیں اور نہ اس نظریہ سے الگ ہو کر انھوں نے کبھی ترقی کی ہے' تاریخ کے صفحات الٹ جایئے آپ کو اسکے شواہد بکثرت ملیں گے' ادریس (ادارسہ مصر کا بانی) مامون الرشید وغیرہ کو جاہ و جلال اسی اصول کے تحت نصیب ہوا تھا۔

یک بیک تو یہ ہو نہیں سکتا اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ ہر قبیلہ عام ازیں کہ وہ سوسائٹی کے اندر معزز سمجھا جاتا ہو یا ذلیل ان رسمی قیود کو مٹا دے جنکے تحت قبایل کے وہ افراد خارج برادری سمجھے ہیں' جن کا مادری سلسلہ نسب غیر قبیلہ سے متعلق ہے' خصوصیت کے ساتھ شیوخ و سادات اسپر غور کریں' چونکہ ہندوستان کے اندر انھیں کو سب سے زیادہ شرافت کا ادعا ہے' اور وہ آئے دن اپنے قبیلہ کے مایۂ ناز فرزندوں کو برادری سے خارج کر کے دن بدن اپنے کو زیادہ کمزور اور افتادہ بناتے جاتے ہیں۔

عبدالمالک آروی

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی خدمت اردو کا ایک عجیب و غریب کارنامہ
"گلستاں" سے "بہار" کا قیاس

گالسوردی کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ——— مشتے نمونہ از خروارے

غالباً سال گزشتہ یا اس سے قبل میں نے نگار میں ہندوستانی اکاڈیمی اور اس کی خدمات اردو پر تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا تھا۔ اور انھیں میں سے ایک شاید گالسوردی کے ڈراموں کے متعلق بھی تھا۔ یہ میرے بعض محترم بزرگوں کو ناگوار ہوا اور انھوں نے صوتی گفتگو سے علحدہ ہو کر بعض ایسی ناخوشگوار بحثیں چھیڑ دیں کہ میں نے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔
میں نے اکاڈیمی کے ارباب حل وعقد سے ایک سوال تو یہ کیا تھا کہ گالسوردی کے ڈراما کیوں ترجمہ کے لئے تجویز کئے گئے اور دوسرے یہ کہ مترجمین کا انتخاب کن اصول پر کیا گیا ہے۔
ان سوالوں کا جواب دیا گیا یا نہیں اور دیا گیا تو کیا؟ میں اس وقت اس امر کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو پیشین گوئی میں نے ان ترجموں کے متعلق کی تھی وہ کس حد تک صحیح ثابت ہوئی اور مثلاً گالسوردی کے ایک ڈراما (Skin Game) کے ترجمہ (فریب عمل) کے محاسن پیش کرنا چاہتا ہوں۔
یہ ڈراما "تین ایکٹ" پر مشتمل ہے اور ہر ایکٹ میں متعدد "سین" ہیں۔ اولیں ورق الٹتے ہی سب سے پہلی فروگزاشت تو نگاہوں کے سامنے یہ آتی ہے کہ نہ لفظ ڈرامہ کا ترجمہ کیا گیا اور نہ ایکٹ وسین کا، درانحالیکہ فاضل مترجم نے امیں، حرکی پوری کوشش کی ہے کہ انگریزی کا کوئی لفظ بغیر ترجمہ کئے ہوئے نہ بچ جائے خواہ وہ عبارت کو کتنا ہی مہمل و بے معنی کیوں نہ بنادے اور جس کی مثالیں آگے آئیں گی۔ خیر تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ یہ تینوں الفاظ اردو ہی کے ہیں جن کے ترجمہ کی ضرورت نہ تھی اور ایک سرسری نگاہ ترجمہ پر ڈال جائیے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک ناقص ترجمہ کی اس سے زیادہ مکمل مثال کوئی اور مل سکتی ہے۔ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں چند در چند غلطیاں نظر نہ آئیں۔ اور وہ بھی ایک قسم کی نہیں۔ زبان و محاورہ کی، ترتیب الفاظ کی، جملوں کی ترکیب کی اور (اگر فاضل مترجم صاف فرمائیں تو میں کہوں کہ) اخذ مفہوم کی اور املا کی۔ صرف دو گھنٹے کی سرسری ورق گردانی سے بغیر کسی کاوش کے جو غلطیاں مجھے نظر آئیں ان کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہونچتی ہے جن میں سے بعض آج کی اشاعت میں درج کی جاتی ہیں:-

اصل عبارت	اصلاح
صفحہ ۲ - "ٹل کریسٹ ایک گھومتی کرسی پر بیٹھا ہے اُس کو گٹھیا بائی کی شکایت ہے"	"گھومنے والی کرسی چاہیئے گٹھیا کافی ہے - گٹھیا بائی - جہلا کی زبان ہے -
" "اس ہارن بلوئر کو بے کہیے، دور کیوں جائیے"	ہارن بلوئر کے بعد لفظ ہی ضروری ہے -
" ۳ - یہ نام تو پھر اور ناموں کو دیکھتے ہوئے اچھا ہے خرابی سے دور کسی قدر زد میں تو ہے	نام کا خرابی سے دور ہونا اور اس کا زد میں ہونا معلوم نہیں کیا مفہوم رکھتا ہے -
" ۴ - بڑا جیٹ بٹا نام ہے -	جیٹ بٹا، بازاری لوگوں کا محاورہ ہے، جس کیرکٹر کی زبان سے یہ لفظ ادا کیا گیا ہے وہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے بازاری عورت نہیں ہے -
۵ - بڑے میاں تو بڑے چھوٹے میاں سبحان اللہ	محاورہ یوں ہے: - بڑے میاں تو بڑے میاں الخ -
" "شوقین مزاج"	اراذل کا محاورہ ہے حالانکہ کہنے والی وہی معزز خاتون ہے
۸ - جب تک ایک بڈھا بھی دنیا میں رہیگا تو جوانوں کی زندگی وبال رہیگی -	تو زاید ہے
ان کو کل کو کسی اونچے درخت پر چڑھا دینا چاہیئے - پرانے چنڈول"	جاہلوں کا سوقیانہ محاورہ ہے جو اسی معزز خاندان کی لڑکی کے زبان سے ادا کرایا گیا ہے -
۹ - ان کے باپ جان کا خیال ہے -	ابا جان چاہیئے - باپ جان کوئی نہیں بولتا
بلکہ الزبیتھ کے زمانہ سے تو مستقل طور سے رہتے ہیں -	مستقل طور پر لکھنا چاہیئے - تاکہ دو سے نہ جمع ہوجائیں
۱۰ - آپ لوگوں کا یہ برتاؤ کیوں رہتا ہے -	"برتاؤ ہے" کافی ہے - برتاؤ کے بعد "رہتا ہے" غلط ہے -
۱۱ - ہاتھ پیر مارنے لگیں	ہاتھ پانوں چاہیئے - ہاتھ پیر غلط ہے -
۱۲ - تمھیں دیکھو کہ ہارن بلوئر وغیرہ کے جیسے لوگوں کو جب میں نے شاگرد پیشہ ان کے ہاتھ بیچ کیا تھا جب اُن میں اتنی خود غرضی نہ تھی	وغیرہ کا لفظ بالکل بیکار ہے - دوسرا جب بالکل غلط ہے -
۱۳ - پہلے یہ لوگ گل کٹ طریقے جانتے ہی نہ تھے	گل کٹ بالکل مہمل ترکیب ہے یوں لکھنا چاہیئے تھا کہ "پہلے یہ لوگ ایسی گلا کاٹنے والی باتیں جانتے ہی نہ تھے"
" ۱۴ - یہ سب بیل اسی کے بوئے ہیں	محاورہ بیج بونا ہے - علاوہ اس کے بیل کو مذکر لکھا ہے حالانکہ وہ

بالاتفاق مونث ہے ۔

صفحہ ۱۷ - تین سال ایک جگہ رہتے ہوئے اور کبھی امی جان..."

رہتے ہوئے کے بعد "ہوگئے" ضروری ہے ۔

" ۱۸ - معانی کا تو انھوں نے سبق ہی نہیں سیکھا

"سبق ہی نہیں پڑھا" چاہئے سیکھا غلط ہے ۔

" ۱۹ - مجھے موج آگئی ہے

مجھے کا استعمال بالکل غلط ہے صرف "موج آگئی ہے" ہونا چاہئے ۔

کاگ کلائی
بوتلوں کی کاگ

ترجمہ ہے اس کلائی کا جس کی مدد سے کاگ کھولا جاتا ہے'!
کاگ مذکر ہے ۔

" ۲۱ - جیکسن صاحب اور ان کی بیگم آپ سے ملنا چاہتے ہیں

"ملنا چاہتی ہیں" ہونا چاہئے۔ ہمیشہ آخری فاعل کے لحاظ سے فعل کی تذکیر و تانیث متعین کی جاتی ہے ۔

" ۳۷ - اپنا عندیہ دیدیں ۔

"عندیہ ظاہر کردیں" ہونا چاہئے'۔ عندیہ دینا محاورہ نہیں ہے

" ۳۹ - ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جیسے سر پر چھوٹی ہوگی

ہوگی کے بجائے صرف ہو ہونا چاہئے

اس کی آواز میں عجب بھناٹا ہے نہ شمالی نہ اسکاٹلینڈ کی آواز معلوم ہوتی ہے ۔

بھناٹا وادطلب ہے ۔ غالباً بھیانک کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔ دوسرا ٹکڑا بالکل مہمل ہے یوں ہونا چاہئے ۔ نہ اہل شمال کی آواز معلوم ہوتی ہے نہ اہل اسکاٹلینڈ کی ۔

" ۴۲ - وہ تو نہیں جن کی گنج سی ہوی ہے' زبان قینچی سی چلتی ہو بس بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیتی ہے

کہاں گنج اور کہاں بزم اور شعلہ نوائی !!

" ۴۶ - ضرور وعدہ خلافی بدعہدی تو ان کا شعار ہی رہا ہے

ضرور کا استعمال کس قدر لغو طریقہ سے ہوا ہے ۔ وعدہ خلافی کے بعد اور کا آنا ضروری ہے ۔

" ۴۸ - باتیں مارنا شیخی کی اڑانا

دونوں محاورے غلط ہیں ۔ باتیں بنانا اور شیخی بگھارنا کہنا چاہئے

" ۵۱ - اس کو نوچ کھسوٹ نہیں کہتے تو اور کیا ؟

کیا کے بعد کہتے ہیں ضروری ہے

" ۵۲ - آپ ہی ہماری سدراہ ہیں

ہمارے لئے سدراہ چاہئے

" ۵۴ - خیر میں ہو تو میں ہی سہی' میں خورشید صبح آپ ہیں آفتاب شام بقول کسی شاعر

فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے

" ۵۵ - چھوٹا آدمی ہو خواہ بڑا آدمی ہو وہ کوئی بھی دوسروں کا محتاج ہونا نہیں پسند کرتا ۔

کوئی بھی کے بعد ہو ضروری ہے ۔ نہیں لفظ پسند کے بعد آنا چاہئے

صفہ ۵۶ ۔ ڈھول کے اندر سوا پول کے اور ہے ہی کیا ؟

"ہتی" چاہیئے

" ۶۱ ۔ تو نہیں میں ان کو ٹھیک ہی کر دونگا۔

"تو نہیں جو اُن کو ٹھیک نہ کر دوں" چاہیئے

جب تک آپ ہمارے یہاں چلئے رہیئے

کہنے والا اپنے ہی گھر میں ہے اس لئے چلئے کے بجائے آئیے ہونا چاہیئے

" ۶۴۔ ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

"ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی" ہونا چاہیئے

" ۷۱ ۔ اگر ابھی تک بولی ختم نہیں ہوئی جب تو ہم بھی لیں گے

جب کا استعمال غلط ہے ۔ بھی کے بجائے ہی ہونا چاہیئے

" ۷۴ ۔ آپ لوگ اس کو جانیں کیا جو بیچ میں کترنے لگے۔

"بیچ میں کترنا" اردو کا محاورہ نہیں ۔ اس موقعہ پر دخل در معقولات کرنا" بولتے ہیں

" ۷۶ ۔ زندگی زہر ہو جائے گی

بجائے زہر کے دوبھر چاہیئے

" ۹۳ ۔ کسی کو محض اس لئے متروک کر دیا جائے کہ وہ باہری ہیں

متروک آدمی کے لئے نہیں آتا ۔ باہری بھی غلط ہے ۔ "متروک کر دیا جائے" کے بجائے چھوڑ دیا جائے ۔ اور باہری کے بجائے اجنبی چاہیئے ۔ ہیں بھی غلط ہے ۔ ہے ہونا چاہیئے

" ۹۸ ۔ ستمبر کے مہینے کی دلخوش کن دھوپ

"دلخوش کن" غلط نہیں ہے ۔ لیکن زیادہ تر ایسے موقعہ پر خوشگوار کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

" ۹۹ ۔ یہ تو نہ اپنی ٹانگ لڑائیں گے

اڑائیں گے چاہیئے ۔

" ۱۰۰ ۔ جیسے آخری بولی ہو چکے تو اگر مجھے آگے بڑھنے کی اجازت ہو تو رومال ناک میں لگا لیں

نہایت الجھا ہوا جملہ ہے ۔ یوں ہونا چاہیئے ۔ جیسے ہی آخری بولی ہو چکے تو رومال ناک پر رکھ لیں ۔ اگر مجھے آگے بولی بولنے کی اجازت ہو۔

" ۱۰۶ ۔ جانوں تو آج رہ رہ گئے

"رہ رہ گئے" ۔ غلط ہے ۔ صرف رہ گئے ہونا چاہیئے

" ۱۰۸ ۔ ان کو سلبٹ چرخہ کو دیکھئے

بالکل نیا لفظ ہے اور معلوم نہیں کس مفہوم میں لکھا گیا ہے ۔

" ۱۱۱ ۔ اک ذرا سا مزاج مفرح کرنیجیئے

مزاج کا مفرح کرنا خدا معلوم کہاں کی زبان ہے

" ۱۳۳ ۔ گھماسان دام ہیں

گھمسان کی لڑائی تو سنی تھی لیکن دام اور وہ بھی گھماسان بالکل نئی چیز ہے !

" ۱۳۵ ۔ یہ دام معمولی اچھے ہیں لیکن ایسی نایاب جائداد کے نایاب دام بھی ہونے چاہیئے ۔

بجائے غنیمت کے معمولی اچھے کا استعمال ہوا ہے ۔ اور دام کے ساتھ نایاب بالکل بے معنی سی بات ہے ۔

" ۱۴۶ ۔ میری بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے اور جوار بھی بائک ہو جائے

یعنی ؟ !

عبارت	اصلاح
صفحہ ۱۴۷ - یہ آپ لوگوں کا میری ہوسکے ساتھ برتاؤ ہی سبب ہے کہ کہ جو میں نے یہ جائداد تحریر دی ہے	قربان جائیے تسلسل عبارت اور فصاحت ترجمہ کے !
" " - سنا جی ان معاملوں میں تم نہ پڑو یہ ہم ہی لوگ ٹھیک کرلیں گے۔	"ہمیں سے یہ ٹھیک ہوں گے" ہونا چاہئے۔
" ۱۵۰ - نیم تبسم چہرہ	متبسم کے بجائے تبسم استعمال کیا گیا ہے
" ۱۵۱ - عمارت بنائے گا تو آپ جانئے گا پھر ہمارا تصور نہ دیجیگا	تصور دینا کوئی محاورہ نہیں "پھر ہمیں قصوروار نہ ٹھہرائیگا یا ہمیں دوش نہ دیجئے گا یا ہم پر الزام نہ رکھئے گا" ہونا چاہئے
" " - مجھے آپ دھمکاتے ہیں کہ یہ ہوگا وہ ہوگا اس کا میرے اوپر گدا بھی نہیں پڑتا	یعنی بہرے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ گدا پڑنا بالکل مہمل ہے۔
" ۱۵۹ - اور کچھ نہ ہوگا تو اپنے لڑکے کی مدد تو کرتے	کرتے کے بجائے - کریں گے ہونا چاہئے۔
" ۱۶۶ - سنٹری (نگہ کا نام) واپس نہ لے لی تو ہم کاہے کے	ہم کاہے کے غلط ہے۔ ہمارا نام نہیں ہونا چاہئے
" " - تگنی ناچ نچاؤں جب تو بات ہے۔	یوں ہونا چاہئے تگنی کا ناچ نچایا ہو جب تو بات ہے
" ۱۷۱ - یونہی نکال دینا ہو تو کہہ دیجئے	نکالنا ہو تو یونہی کہہ دیجئے" ہونا چاہئے
" " - میں نے ایسی ایسی سرکاروں میں بندگی بجائی ہے جہاں ایک دم کے لئے ان باتوں کی گنجائش نہیں	ایک دم کے لئے کا استعمال کس قدر مکروہ طور پر ہوا ہے
" " - تم اپنی راہ نہ لو۔ اب بس زیادہ بات چیت نہیں	"زیادہ بات چیت کی ضرورت نہیں" چاہئے
" ۱۷۲ - کنپٹیاں بڑی لپ لپ کرتی ہیں آج کچھ نہ کھاؤنگی	درد سر کی کیفیات کو بڑی لپ لپ سے ظاہر کیا گیا ہے یوں لکھنا چاہئے تھا کہ "کنپٹیاں پھٹی جارہی ہیں"
" ۱۷۳ - کان و کان خبر بھی نہ ہوگی۔	یہ کانوں کان کی خرابی ہے۔
" ۱۷۵ - دو تین ٹکلے رکھے ہوئے ہیں	ٹکیہ مونث ہے اس لئے اس کی جمع ٹکیاں آتی ہے۔ یوں لکھنا چاہئے تھا:- دو تین ٹکیاں رکھی ہوئی ہیں۔
" ۱۷۹ - کتنے ہی آدمی دوالیہ ہوتے ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے	تو زائد ہے اور ہوتے کے بجائے ہوجاتے ہونا چاہئے
" ۱۸۲ - کس کس پریشانیوں	"کن کن" چاہئے
" ۱۸۳ - جھگڑے کی شروعات تو انھوں نے نہیں کی	شروعات غلط ہے - ابتدا چاہئے
" ۱۹۲ - ہماری شطرنج میں تم ایک مہرہ ہو اور تمھاری شہ مات ہوگی	یوں ہونا چاہئے:- ہماری شطرنج میں تھیں تو ایک مہرہ ہو جس سے

حوالہ	تبصرہ
	شہ مات ہوگی۔
صفحہ ۱۹۳ -	ابتدائی سات سطریں بالکل مہمل ہیں
" ۱۹۴ - یہ چالیں مجھ سے نہ کھیلو	چال کھیلنا محاورہ نہیں ہے - چال چلنا بولتے ہیں -
" ۲۰۸ - بوسہ کا چٹخارہ لیتا ہے -	کس قدر مکروہ زبان استعمال کی گئی ہے
" ۲۱۱ - لڑائی میں مٹھائی نہ پھیلیگی	محاورہ لڈو بٹنا ہے - مٹھائی پھیلنا بالکل غلط ہے
" ۲۱۴ - کچھ نہ جھاڑیئے -	کچھ جھاڑنا کوئی محاورہ نہیں
" ۲۲۱ - صاحب کے نام چار ہزار پر انتقال نامہ ہوتا ہے	انتقال نامہ کوئی محاورہ نہیں - بیع نامہ ہونا چاہیئے
" " - میرے اوپر تو تو خار ہی کھائے ہے	"مجھ پر تو خار ہی کھائے بیٹھا ہے" ہونا چاہیئے
" ۲۳۲ - اب کھل جاؤ کیوں بھانڈا پھوڑاتی ہو	"پھوڑواتی ہو" یا پھوڑواؤگی ہونا چاہیئے
" ۲۳۵ - تو یہی حاصل تمھارے خاندان میں شادی کرکے	تو یہ ملا چاہیئے
" " - ہائے رے یہ ہل کرائسٹ لوگ	ہل کرائسٹ والے چاہیئے
" ۲۳۸ - جو چٹکی کاٹے گا، اس کو بچہ مارا جائے گا -	یہ کوئی محاورہ نہیں - یوں ہونا چاہیئے "جو چٹکی کاٹے گا اس کے بکوٹے لئے جائیں گے
" ۲۴۶ - ہم نے حلف لی ہے	حلف مذکر ہے - لیا ہونا چاہیئے
" " - پہلے تو انکار کیا لیکن جب ہمارے گواہ کو دیکھا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے -	"ہاتھ پاؤں پھولنا" خوشی کے محل پر بولا جاتا ہے - یہاں "حواس گم ہوگئے" چاہیئے
" ۲۶۵ - میں جانتی تھی کہ سن گن ہو رہی ہے	محاورہ سن گن لینا ہے
" " - وہ حلق نکلی خلق پھیلی	کسی بات کے پھیلنے کے متعلق محاورہ یہ ہے "ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی"
" " - اب تو ہوگئی جو ہوتی تھی ہوگی	اخیر میں بجائے ہوگی کے ہونا تھی لکھنا چاہیئے
" ۲۶۸ - کوئی پکی پھبتی ہوئی بات ہو جسے وہ جان لیں	یوں ہونا چاہیئے :- کوئی ایسی جچی تلی بات ہو کہ وہ یقین ہی کرلیں
" ۲۶۹ - تم نے ہمارے لڑکے کی بیاہی زندگی پر جھاڑو پھیر دی	بچہ پہلے آگیا تھا، جھاڑو یہاں آگئی - یہ فقرہ مرد کی زبان کا ہے مترجم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جھاڑو پھیر دینے کا محاورہ صرف عورتوں کا ہے، مرد کبھی استعمال نہیں کرتے -
" " - پخی بتاؤنگا	پخی دینا محاورہ ہے

صفحہ ۲۸۹ - اچھے گھر نوید دیا تھا	محاورہ نیوتہ دینا ہے - نوید نہیں

الغرض یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں صرف زبان و محاورہ کی ہیں جو نہایت سرسری نگاہ سے ہر شخص کو نظر آ سکتی ہیں۔ ... جنھیں سیکڑوں روپیہ دیکر اکاڈمی نے خریدا ہے۔ رہا ترجمہ کا حسن، جملوں کی خوبی ترکیب، عبارت کا تسلسل، مفہوم کی صحت سو اس کا ذکر ہی کیا کیونکہ اگر ان باتوں کو سامنے رکھا جائے تو پھر اس ترجمہ پر تنقید کا رنگ یہ نہ ہوگا کہ اس میں غلطیاں دیکھی جائیں بلکہ صحیح جملوں کا شمار کر کے چند صفحات میں ان کی فہرست دیدینا کافی ہوگا ۔

آرڈر ۵ رول ۲ ضابطہ دیوانی

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۲ء

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر جج ماتحت اوناؤ مقام اوناؤ

لال بہادر بالغ و سرجو سنگھ و گجودھر سنگھ و شیو شنکر و ہر دیال سنگھ نابالغان پسران حکم سنگھ اقوام ٹھاکر ساکنان ساہ پور پرگنہ جھلوترا جگین تحصیل حسنگنج ضلع اناؤ
ہردیو سنگھ وغیرہ مدعی

بنام

بنام ہردیو سنگھ و شیو رام سنگھ پسران جیت سنگھ اقوام ٹھاکر ساکنان ساہ پور پرگنہ جھلوترا جگین تحصیل حسنگنج ضلع اوناؤ .... مدعاعلیہ

ہرگاہ مدعیان نے تمھارے نام ایک نالش بابت دعوی صحات کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۱۳ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء بوقت ۱۰ دس بجے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جواب دہی دعوی مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمھارے احضار کے لئے مقرر ہے واسطے قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعوی کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو ÷

مطلع رہو کہ اگر روز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمھارے مسموع اور فیصل ہوگا ÷

آج بتاریخ ۳ ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا

جنبیہ :- اگر بیانات تحریری کی ضرورت ہو تو کہا جاتا ہے کہ تم کو رما فلاں نمبر تی کو یعنی کہ صورت ہو احکم دیا جاتا ہے کہ بیان تحریری تاریخ ۲ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء تک گذرانو ÷ دقت عدالت مدعی ... جمی اوناؤ ۱۰ بجے دن　　دستخط . بخط انگریزی　　[مہر عدالت]

ایک خط

جو ایک خودکشی کرنے والے نوجوان کے سینہ پہ ملا!

(عورت اور نفسیات محبت کے بہترین شارح موپاساں کے قلم سے)

محترم خاتون! تو آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں یا تو اس موضوع کو سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث لانا نہیں چاہتا، یا یہ کہ میں ایک نہایت سخت جھوٹ سے کام لیکر آپ کو فریب دے رہا ہوں۔ آپ کو کبھی یقین نہیں آ سکتا کہ کوئی انسان اس دنیا میں بغیر محبت کے بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ بیشک ہوگا، لیکن میں ایک ایسا انسان ہوں جس نے تمام عمر میں کبھی کسی عورت سے محبت نہیں کی۔

میں نے محبت کیوں نہیں کی اس کی وجہ کیا بتاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنے جذبات و محسوسات کو عقل و دانش سے کبھی آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ عقل محبت کی دشمن ہے اور محبت کو ہمیشہ اندھا ہونا چاہئے۔

چناں چنیں کا جہاں گذر ہوا اور محبت ختم ہوئی۔ میں نے آج تک کسی عورت کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ سیکڑوں عورتوں کو دیکھا، مگر کسی سے محبت نہیں کی۔ آپ جس صنف سے تعلق رکھتی ہیں اس کے کسی رکن نے مجھے دیوانہ نہیں بنایا۔ میں کبھی آپ لوگوں سے مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کبھی محبت کی دردناک آہوں نے نہیں ستایا۔ میں نے فراق کی بےچین گھڑیاں کبھی بسر نہیں کیں اور میں دن رات خوش و خرم زندگی بسر کرتا رہا۔

—— ہاں میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔ امید و بیم میرے لئے ہمیشہ بے معنی الفاظ رہے کیونکہ میں نے کسی سے الفت کی راہ و رسم پیدا ہی نہیں کی۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے محبت کیوں نہیں کی۔ میں نے کامل غور و خوض کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ میں عورت کا اتنا زبردست نقاد ہوں کہ کسی عورت کا اثر قبول ہی نہیں کر سکتا، طبیعت کی نکتہ چینی ہر عورت کو پُرعیب دکھاتی ہے اور مزاج کی برہمی — اُلفت کے احساسات قائم ہی ہونے نہیں دیتی!

—— خاتون محترم! آپ میری صاف گوئی پر ناراض نہ ہوں آپ کو معلوم ہے کہ ہر انسان میں دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک جسمانی دوسری روحانی۔ پس میں سمجھتا ہوں کہ "محبوب" کے لئے سب سے زیادہ ضروری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یہ دو شخصیتیں بیک وقت نہایت بلند پائی جائیں اور دونوں میں اس قدر ہم آہنگی و یک جہتی ہو کہ انسان اس ہستی سے محبت حقیقی و سچی محبت کرنے پر مجبور ہو۔ لیکن آپ سوچئے ایسا حسن اتفاق کب ہوتا ہے! آپ دیکھیں گی کہ ایک عورت جسمانی حیثیت سے تمام خصوصیات کی حامل ہے۔ جوانی اور رعنائی کی تمام بے پناہ قوتیں اپنے میں پوشیدہ رکھتی ہے لیکن اخلاق

لحاظ سے وہ بے بہا ادنیٰ ہے۔ ایک عورت اخلاقی حیثیت سے بہت خوبصورت ہوتی ہے مگر جسمانی پہلو سے قابل توجہ نہیں ہوتی۔

اگر مرد محبت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اندھا ہو جانا چاہئے۔ الفت کی راہ میں بصارت گمراہی کی ضامن ہے! مرد کو اگر محبت کرتی ہے تو چاہئے کہ اپنی محبوبہ کی برائیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرے اور ایک قوی جذبہ کے ساتھ عورت پر پروانہ کی طرح ٹوٹ پڑے اور مر جائے۔ مرد اگر اپنی محبوبہ کے ساتھ سنجیدہ معاملات پر بحث کریگا تو رومان زائل ہو جائیگا، محبت کی توہین ہوگی، دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں کے لئے آپ خود فکرمند رہئے لیکن عورت کو اس سے دور رکھئے۔ لیکن میں اندھا بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ دنیا کا مطالعہ کروں، مرد عورت کا اسی طرح مشاہدہ کروں جیسے وہ ہیں نہ اس طرح کہ محبوب دکھانا چاہے اور میں دیکھوں۔

خوبصورت لڑکیاں بالخصوص مایوس کن ثابت ہوتی ہیں، رہیں معمولی اور سادہ عورتیں تو ان سے کبھی مایوسی نہیں ہوتی کیونکہ آپ اُن سے کسی چیز کے متوقع نہیں ہو سکتے!

لیکن ایک عرصہ ہوا، میں نے یہ سمجھا تھا کہ میں محبت کرتا ہوں ——— ہاں، میں نے یہ "خیال" کرنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے! ——— صرف ایک ساعت کے لئے ——— ایک خوشگوار دن ——— ہاں، میں نے بھی کسی سے چند لمحے الفت کی ہے! ——— اگر آپ محبت کرنے پر مجبور ہوں لیکن آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تمام حالات و ماحول مجھے محبت کے جال میں پھنسانے کے لئے تیار تھے اور میں بےبس تھا، آپ جب واقعات سنیں گی تو میری تائید کریں گی اور میری بیچارگی کو معلوم کرکے "محبت" کرنا ایک ضروری فعل سمجھینگی میں اس واقعہ کے چند حقایق بیان کرتا ہوں۔

ایک دن شام کو میری ملاقات ایک جمیل لڑکی سے ہوئی، حسین و خوبصورت لڑکیاں ہر وقت اور ہر جگہ مل جاتی ہیں اسلئے اس لحاظ سے اس میں کچھ ندرت نہ تھی لیکن اس لڑکی کے متعلق یہ کہدینا نہایت ضروری ہے کہ وہ نہ صرف بہت حسین نہ صرف دلکش بلکہ ایک "حقیقت" تھی! جرأت و دلیری کے کام کرنے کی دیوانی تھی، ندرت و جدت اس کے ساتھ ساتھ ہی تھی اس وجہ سے یہ لڑکی اور لڑکیوں سے کسی قدر ممتیز کہی جاسکتی ہے۔

چنانچہ اس کی سب سے پہلی فرمائش یہ ہوئی کہ ایک رات ہم سمندر میں بسر کریں .... خود مجھے اسپر تعجب لیکن محض تفریح جان کر اس دعوت کو قبول کر لیا۔ جون کی رات تھی اور چاندنی۔ تمام کائنات ایک سیل نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی، ہم دس بجے کشتی میں بیٹھے۔ لڑکی بہت مسرور تھی، اور خوشی سے بار بار تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے چپو ہاتھ میں لئے اور کشتی آہستہ آہستہ روانہ ہوگئی۔ منظر بہت ہی دلفریب تھا، سمندر میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آتے تھے جنپر درختوں کا جھنڈ اور اُن میں چڑیوں کے چہچہے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ہماری کشتی

آہستہ آہستہ بہتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ سرکنڈوں کے جھنڈ سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور سیٹی کی سی آواز پیدا ہوتی تھی، بید کے درخت ہوا کے گزرنے کے بعد دیرتک لرزتے رہتے تھے۔ الغرض یہ رات اس قدر دلفریب، خوبصورت، خاموش و پرسکون تھی کہ ہم پر شباب کا نشہ مسلط ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندہ رہنے کا مقصد کیا ہے اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک پرسکون سمندر کی لہروں پر ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ رات کو کشتی میں جانا زندگی کا حقیقی مقصد کہا جاسکتا ہے!

میں سینہ میں جذبات کا ایک طوفان موجزن دیکھ رہا تھا، چاندنی نے مجھے بالکل مسحور کردیا تھا اور اپنے پاس ایک خوبصورت ——— اور تنہا ——— لڑکی کو پاکر میں کس منزل میں پہنچ گیا ہونگا اس کا اندازہ کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ لڑکی نے کہا۔ آؤ کچھ دور بہتے ہوئے چلیں، چپو چھوڑدو میرے پاس آجاؤ اور کشتی کو یونہی چھوڑ دو"۔

میں نے ایسا ہی کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی اس وقت میں منظور کرلیتا۔ "مجھے کچھ اشعار سناؤ!" لڑکی نے پھر ایک فرمائش کی اور میں نے ابتدا میں اس سے انکار کیا لیکن وہ اصرار کرتی رہی، واقعہ یہ ہے کہ وہ اشتعال جذبات کے لئے تمام قوتیں تمام بے پناہ ہتیار جو اس کے پاس تھے استعمال کرنا چاہتی تھی، چاندنی رات، کنار دریا، شعر، رومان اور ایک حسین و نوخیز لڑکی کا قرب اب اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ میں اُسے چھیڑنا چاہتا تھا اس لئے ایک غزل شروع کی جس میں حسن کی بے چارگی اور عارضی زندگی، محبت کی سطحیت اور محبوبوں کی بے وفائی کا ذکر تھا، یہ غزل محض لوگوں کے جذبات محبت کی تذلیل و تضحیک کے لئے لکھی گئی تھی۔

لڑکی نے اپنا خوبصورت سر ہلایا گویا وہ ان اشعار سے لطف اندوز ہورہی تھی اور احساس کررہی تھی۔ مجھے سخت تعجب تھا کہ یہ کس طرح کی لڑکی ہے۔ کیونکہ کوئی خاتون محبت و حسن کی توہین برداشت نہیں کرسکتی ——— کس قدر حقیقت ہے!
لڑکی نے میرے اشعار پر عاجزانہ تبسم سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا میں بہت ہی متعجب تھا، اصل یہ ہے کہ عورت اور نوجوان عورت کا سمجھنا بے انتہا دشوار ہے، حسن اور شباب ایک معمہ ہے!

———— ————

ہماری کشتی بہتی ہوئی چلی جارہی تھی چاندنی رات تھی اور لانبے لانبے درختوں کا سایہ سطح آب پر ایک مہیب اثر ڈال رہا تھا کشتی کبھی چاندنی میں تیرتی ہوئی اور کبھی تاریک قطعوں سے گزرتی ہوئی دور تک بہہ نکلی تھی۔ ایک جگہ اندھیرا آگیا، کشتی بید کے نیچے سے گزر رہی تھی میں بے بس ہوچکا تھا۔ اپنا ہاتھ لڑکی کی کمر اور گردن حائل کردیا اور اپنے لبوں سے اس کی گردن چومنا چاہتا تھا کہ میری رفیقہ نے مجھے علیحدہ کردیا ایک سخت درشتی کے ساتھ اور کہا مجھ سے الگ رہو اتم تو سارا لطف برباد کئے دیتے ہو" میں نے بڑی جد و جہد کی کہ وہ میرے منشا کو سمجھ سکے، بہت کوشش کی کہ وہ مجھے پیشانی چومنے دے۔ لیکن اس نے بجلی کی طرح تڑپ کر مجھے علیحدہ کردیا۔ اور کہا اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو اس وقت تمھیں پانی میں پھینک دیتی! مگر کس قدر

بے حس ہوتے ہیں۔ لطافت و نزاکت کو اپنی بہیمیت سے مجروح کرنے میں دریغ نہیں کرتے" لڑکی نے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا۔
میں اپنی حرکت سے کچھ اس قدر پریشان اور محجوب ہو گیا تھا کہ ایک لفظ منھ سے نہ نکال سکا۔
بہتی ہوئی چلی جارہی تھی اور کبھی کبھی مجھے رفتار قابو میں رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی لڑکی نے پھر باتیں شروع کر دیں
اس نے کہا " میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں"
میں نے کہا۔ " بیشک، آپ فرمائیں"۔
"وعدہ کیجیے کہ آپ بالکل خاموش رہیں گے اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جو مجھے دق کرے۔ اگر میں آپ کو اجازت دوں کہ ...." میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہاں، آپ کیا اجازت دیں؟ "اگر میں آپ کو اجازت دوں کہ آپ کشتی کے اندر میرے قریب نہایت خاموشی کے ساتھ لیٹے رہیں اور کسی قسم کی شرارت نہ کریں، ہم لیٹے لیٹے ستاروں کو دیکھتے ہوئے دور تک چلے جائیں گے اور ایک ایسا خواب دیکھیں گے جس پر صدیوں کی مسرت قربان کی جا سکتی ہے"۔
میں اس انوکھی رومان کی داد دینے سے قاصر تھا، سمجھ رہا تھا کہ صورتِ حال حد سے زیادہ مضحکہ انگیز ہوتی چلی جارہی ہے لیکن پھر بھی میں نے جواب دیا۔ بہت اچھا! میں اس کا وعدہ کرتا ہوں، لڑکی نے کہا۔ لیکن دیکھئے۔ اور خوب اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ کو میرے پہلو میں صرف لیٹنے کی اجازت ہوگی۔ اور آپ میرا بدن چھو بھی نہ سکیں گے" "میں وعدہ کرتا ہوں"۔ حقیقت میں میرا ذہن اس حسین معمہ میں گم ہو چکا تھا"۔
"اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو میں کشتی کو الٹ دونگی"۔ لڑکی نے نہایت بیباکی سے کہا۔

آپ کو یہ بات بالکل طفلانہ حرکت معلوم ہوگی۔ لیکن خیر، مجھے واقعہ سنا لینے دیجئے، ہم کشتی میں لیٹ رہے۔ کشتی بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی آہستہ روی اور کنار دریا کے پار سے آنے والی ہلکی ہلکی۔ انسانی آوازوں نے ہم پر ایک خواب سا طاری کر دیا ہم یونہی بہتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ معلوم نہیں اس وقت تک کہاں پہنچ گئے تھے۔
——— آہ! یہ وقت! میری زندگی کا بس یہی لمحہ تھا جس میں میں کسی ذی روح سے محبت کرنا چاہتا تھا! — اف میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سے اپنا دل لگانا چاہتا تھا، کسی کو اپنی ساری روح دیدینا چاہتا تھا ——— اپنے افکار اپنا جسم، اپنا دل، اپنی زندگی غرض جو کچھ میرا تھا سب کچھ محبت کی مقدس قربان گاہ پر چڑھا دینا چاہتا تھا! دفعتہً "میری رفیقہ نے ایک نہایت خفیف آواز میں کہا گویا کہ وہ بہت دور سے مجھے پکار رہی تھی ——— "ہم کہاں ہیں؟ ——— ہم کہاں جا رہے ہیں ——— بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے زمین کو چھوڑ دیا ہے! کس قدر حسین و دلنشین ہے یہ خیال! کاش تم مجھ کچھ محبت کرتے!!"
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں لڑکی کو کچھ جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوتا ——— صرف محسوس سا ہو رہا تھا

کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں! لیکن باوجود اس احساس الفت کے میرے دل میں جذبات بہیمیت پیدا نہیں ہو رہے تھے! مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں بہت پُرسکون ہوں، اس کے پہلو میں لیٹنا نہایت سکون خیز اور حیات پرور ہے اور اس سے زیادہ کی مجھے خواہش نہیں۔ ہم خاموش لیٹے رہے اور کشتی بہتی رہی تھوڑی دیر بعد لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کھیلنے لگی۔ آہ! کس قدر لطیف و دلنواز حرکت تھی! اس وقت ہم پر ایک پراسرار مسحور کن حیرت زا جذبہ مسلط تھا معلوم نہیں یہ غیر محسوس طاقت کیا تھی ——— شاید محبت اسی کو کہتے ہونگے!

رات ختم ہوگئی، پو پھٹنے لگی ——— سپیدی صبح نمودار ہو رہی تھی کہ کشتی کسی چیز سے ٹکرائی اور لڑکی چونک کر اٹھ بیٹھی! — یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ تھا! میں متحیر تھا، آسمان پر سُرخ نارنجی اور سنہرے رنگ یکے بعد دیگرے بدلتے جا رہے تھے آفتاب کی زرباز کرنیں پھیل رہی تھیں — سطح آب میں آگ سی لگ رہی تھی، کنارے — ابھی ایک سیل آتشین میں ڈوبتے ہوئے نظر آ رہے تھے میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے بھی اس نظارہ کے لطف میں شریک کروں، لیکن میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ میں لڑکی کے حسن میں گم ہوگیا۔ وہ اس وقت بھی بے انتہا حسین نظر آ رہی تھی .... اس کا چہرہ بھی صبح نور کی طرح نور و گلاب کی آمیزش سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا! اس کے رخسار، اس کا تبسم — لباس، غرض سب کچھ اس سیل رنگیں میں حد درجہ مسحور کن معلوم ہو رہا تھا، میں اُسے **شہزادی گل** ! سمجھ رہا تھا بلکہ خود **صبح نو!**
لڑکی آہستہ سے اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی ہوئی اُٹھی اور مجھے اپنے لب پیش کر دیئے۔ میں آگے بڑھا مسرت اور تعجب سے لرزتا ہوا ——— آہ! میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میں "فضائے نور" کو چومنے جا رہا ہوں، ہاں ایک خواب سے ہم آغوش ہونے کے لئے جسکو قدرت نے ایک حسین لڑکی میں تبدیل کر دیا تھا! ——— لڑکی نے مجھ سے کہا ——— اوہ! دیکھنا تمہارے بالوں میں ایک تیتری پھنسی ہوئی ہے!" اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بار بار کیوں مسکرا رہی تھی! میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے سخت کاری ضرب لگائی ہو۔ تمام لطف ختم ہوگیا۔ میرا خواب آسمان سے پھر زمین پر آ رہا —

بس یہ ہے میرا قصہ، میری داستان محبت — اگر آپ اسے محبت کہ سکیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اسے احمقانہ طفلانہ حرکت کہیں گی یا ایک چالاک لڑکی کی شرارت، مگر میں اُسے تو صرف محبت کہونگا۔ اس لڑکی نے مجھے جنس لطیف سے بالکل متنفر کر دیا اور جب آپ کسی چیز سے نفرت کرنے لگیں تو ضرور ہے، کبھی وہ چیز آپ کو بہت محبوب رہی ہوگی! اس کے بعد میں نے پھر کسی سے محبت نہیں کی!!!

یہ خط ایک خودکشی کرنے والے نوجوان کے سینہ پر رکھا ہوا ملا جو ایک عورت کے نام لکھا گیا تھا، ایسی عورت جو مردوں سے سخت متنفر تھی!

ظفر قریشی

مدت العمر کے لئے اپنا نفس اسکے سپرد کر دونگی میں ایک ایسا شخص چاہتی ہوں جو شریف ہو، بنیل ہو ذکی ہو
مہذب ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ اگر کسی میں یہ صفات موجود ہوں تو مجھ کو لکھے میں اس کے
رنج و مسرت میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہوں، تاکہ ہم دونوں ساتھ ہی شاہراہ حیات کو طے کریں
ساتھ ہی ہماری قبریں جائیں اور مرمر احمر کی ایک ہی لوح ہماری قبروں پر قائم کی جائے

ہندوستان کی ایک خاص نظر بندی

ہندوستان کا ایک شعبدہ بہت مشہور ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ بازیگر رسی لیکر سامنے آتا ہے اور رسی کو اوپر کی طرف پھینکدیتا ہے جو قائم ہوجاتی ہے۔ پھر اسی رسی پر ایک لڑکی چڑھتی ہے اور غائب ہوجاتی ہے۔ بعد کو وہ ٹوکرا یا صندوق کھولتا ہے اور وہ لڑکی اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔

اس شعبدہ کا ذکر سلاطین مغلیہ نے بھی کیا ہے اور اہل مغرب نے بھی نہایت حیرت و استعجاب سے اس کا حال اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ کیونکہ اس شعبدہ کی کوئی علمی توجیہ اس وقت تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کلکتہ پولیس کے افسر کرنل برنارڈ نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس شعبدہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ایک بار اس کے سامنے بھی یہ تماشا ہوا اور اُس نے کیمرا سامنے رکھ کر پلیٹ پر عکس لیا، لیکن وہ سخت متحیر ہوا جب اُس نے دیکھا کہ تصویر میں نہ کہیں رسی نظر آتی ہے اور نہ لڑکی بلکہ صرف بازیگر تنہا سامنے کھڑا ہوا ہے۔

کرنل مذکور کا بیان ہے کہ تماشہ شروع کرنے سے قبل بازیگر نے کوئی دوا سلگائی تھی اور غالباً اُسی نے حاضرین کے دماغ پر کوئی ایسا اثر کیا کہ ان پر نظر بندی آسانی سے ہوگئی۔

کہا جاتا ہے کہ کسی ہندی بازیگر نے انگلستان میں بھی یہی تماشہ کیا لیکن وہاں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ وہاں اسے وہ چیزیں نہ ملی ہوں جن کا دھواں انسانی حس کو خیال کا مقناطیسی اثر قبول کرنے کا اہل بنا دیتا ہے۔

حال ہی میں ایک انگریز بودیس نے بھی بالکل یہی تماشہ دکھایا اور جب تصویر لی گئی تو اُس میں لڑکی کا کہیں پتہ نہ تھا، لیکن رسی موجود تھی۔ بودیس کا بیان ہے کہ یہ کھیل ایک نہایت ہی نادر ترکیب پر قائم ہے جس کی تفصیل وہ کسی دوسرے وقت بتائے گا۔

انسان کی قیمت

ماہرین علم الکیمیا کی تحقیق ہے کہ جسم انسانی جن مواد سے طیار ہوتا ہے اُن کی مجموعی قیمت کسی طرح تین روپیہ سے زائد نہیں ہوتی۔ آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کو لیجئے اور تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے جسم میں جس کا وزن ستر کیلو گرام ہے، چکنائی صرف اتنی پائی جاتی ہے کہ اس سے سات ٹکیاں صابون کی طیار ہوسکتی ہیں۔ کاربن کے حصہ اتنا ہے کہ اُس سے ۹۰۰۰ پنسلیں بن سکتی ہیں اور فاسفورس کی

مقدار سے ۲۲۰۰ سینکیں دیا سلائی کی ——— لوہے کا حصہ اتنا ہے کہ صرف ایک معمولی کیل اس سے بنا سکتے ہیں، چونا اتنا ہوتا ہے کہ ایک مرغی کے دربہ پر اس سے سفیدی ہو سکتی ہے۔ گندھک کی مقدار اس سے زیادہ نہیں کہ چند کیڑے ہلاک ہو سکیں، مگنیزیم اس سے بھی کم ہوتا ہے اور ان سب کی قیمت چار شلنگ یا ایک ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتی جو تین روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔

جسم انسانی کی تعمیر کے لئے صرف ۱۶ مواد کیمیائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ متذکرۂ بالا اشیاء کے علاوہ نمک کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے، خون میں سوڈا بھی شامل ہوتا ہے اور کچھ اعصاب میں پوٹاس بھی ——— نٹروجن بھی پایا جاتا ہے۔ عضلات قلب میں چاندی کا کچھ جزو رہتا ہے اور جگر میں سیسہ کا۔

الغرض انسان نام اگر صرف اس کے جسم کا ہے تو اس کی قیمت ایک بکری کے بچہ سے زیادہ نہیں، لیکن اگر انسان سے مراد وہ قوت ہے جسے "نفخِ روح" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو پھر اس کی قیمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جبکہ وہ اس حیثیت سے "خدا کا نائب و خلیفہ" ہے۔

دنیا کا طویل ترین انسان

امریکہ کا ایک شخص جس کا نام کلیفورڈ تامسن ہے اور جو حال ہی میں ہالی ووڈ کے سینما کمپنیوں میں کام کر رہا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے دراز قامت انسان ہے۔ اس کا قد ۸ فٹ، ۷ انچ ہے، اسی کے ساتھ اس کا جسم بھی بہت وزنی ہے یعنی ۴۲۵ پونڈ یا ۴ من ہے۔ اس کے سینہ کا دور ۴ فٹ ۴ انچ ہے، اور اسکا جوتا اور کپڑے خاص طور سے طیار کئے جاتے ہیں۔ یہ دو چارپائیوں پر سوتا ہے۔ عام انسانوں سے دونی غذا کھاتا ہے اس کی بیوی کا قد صرف ۵ فٹ ۱۳ انچ ہے۔

اس سے قبل ہالینڈ میں ایک شخص داؤزون تھا جس کا قد آٹھ فٹ ۹ انچ تھا۔ اسی طرح آئرلینڈ کا ایک نوجوان اوبریاں نامی تھا جس کا قد ۲۳ سال کی عمر میں ۸ فٹ آٹھ انچ تک پہونچ گیا تھا۔ اگر یہ اس قدر کمسنی میں نہ مرجاتا تو اطباء کا خیال ہے کہ ۹ فٹ تک پہونچ جاتا۔

آئرلینڈ میں ایک اور شخص کورنلیوس نامی تھا جس کا قد ۸ فٹ ۷ انچ تھا۔ اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی کہ اس کا جسم دفعۃً ۱۸ انچ بڑھ گیا اور یہی اس کی موت کا باعث ہوا کیونکہ یوں اچانک بڑھ جانے سے اس کے قلب کو صدمہ پہونچا

سفری کتب خانے

انگلستان میں بچوں کی دماغی و ذہنی تربیت کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ بچوں کے لئے مختلف ذوق کی کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں ایک بڑے موٹر میں رکھ کر گاؤں گاؤں لے جاتے ہیں۔ دو عورتیں اس کتب خانہ کی نگراں ہوتی ہیں۔ یہ موٹر جب کسی گاؤں یا قصبہ میں پہونچتا ہے تو بچوں کو ان کے ذوق کے لحاظ سے کتابیں چھانٹنے کا موقع دیا جاتا ہے اور ان کو اجازت ہوتی ہے کہ جو کتاب جی میں آئے دو ہفتہ کے لئے مستعار لے لیں۔ اگر کوئی کتاب کسی بچہ کی فرمائش کے مطابق موجود نہیں ہوتی تو دوسرے پھیرے میں مہیا

کر دی جاتی ہے۔

کہربائی زندگی گزشتہ پچاس سال کے اندر برق و کہربا سے جس قدر کام لیا گیا وہ تاریخ ایجاد و اختراع کی حیرت انگیز داستان ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس سے کسی نہ کسی طرح بجلی کا تعلق نہ ہو اور ہماری کوئی اہم ضرورت ایسی نہیں جسے بجلی انجام نہ دیتی ہو۔ چنانچہ حال ہی میں اہل امریکہ نے بعض ایسے مکانات طیار کئے ہیں جن میں کسی خادم کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور تمام کام بجلی ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ تمام کو بستر بچھانا، صبح کو بستر لپیٹنا، پانی گرم کرنا، داڑھی مونڈنا، غسل کرانا، کپڑے بدلوانا، کھانا پکانا، کھلانا، مکان صاف کرنا۔ الغرض تمام خدمات بجلی انجام دیتی ہے، جس کے لئے صرف ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس وقت دن کو کوئی مہمان آتا ہے تو خود بخود موٹر کا سایہ مکان کے اندر نمودار ہو جاتا ہے جس سے گھر والوں کو علم ہو جاتا ہے اور موٹر خانہ اپنے آپ کھل جاتا ہے جہاں مہمان اپنے موٹر کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اگر رات کو کوئی مہمان آتا ہے تو خاص قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور خبردار کر دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ خیر مقدم کا بینڈ بھی آپ ہی آپ بجنے لگتا ہے۔

مخصوص کاموں کے لئے مخصوص اوقات پر گھنٹی بھی آپ ہی آپ بجتی ہے۔ اور ضرورت کے وقت تمام چیزیں محض بٹن دبانے سے سامنے آ جاتی ہیں۔

باورچی خانہ میں برتن دھونا، انھیں خشک کرنا، میز پر ان کو چن کر کھانا لانا، صاف رکابیاں بدلنا، پانی گرم کرنا، چاء طیار کرنا، سب بجلی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کوئی انسانی ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ مطبخ کو ۲۹ آلات کہربائی سے آراستہ کیا گیا ہے جو اپنی خدمات علیحدہ علیحدہ انجام دیتے ہیں۔

کپڑے دھونے، ان کو تہ کرکے رکھنے اور پھر ضرورت کے وقت سامنے لانے کا کام بھی بجلی سے لیا جاتا ہے۔ ان مکانوں میں ریڈیو بھی لگا ہوا ہے جس کے ذریعہ سے مختلف اوقات میں تمام دنیا کی خبریں از خود پہونچتی رہتی ہیں اور مقررہ وقت پر گانا بھی سنا جا سکتا ہے۔

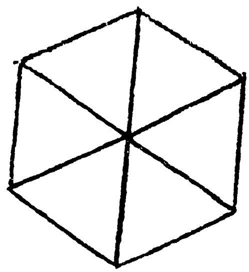
سونے کے وقت ایک خاص قسم کی نرم و شیریں موسیقی بھی اسی ریڈیو سے حاصل کی جاتی ہے تاکہ فوراً نیند آ جائے۔ صبح بیدار ہونے کے وقت بھی ایک دلکش نغمہ اس آلہ سے پیدا ہوتا ہے اور کھانے کے وقت بینڈ بجانا بھی اسی کے سپرد ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان تمام آلات پر کسی طرح دو سو ڈالر (۶۰۰ روپیہ) سے زیادہ صرف نہیں ہوتا۔ اور ماہانہ مصارف ۱۵ - ۱۶ ڈالر (تقریباً ۵۰ روپیہ) سے آگے نہیں بڑھتے حالانکہ یوں ان تمام انتظامات کے لئے اگر ملازم رکھے جائیں تو اس سے چار چند صرف بھی کافی نہیں ہو سکتا۔

صفحۂ تفریح و انعام

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں دوسرا سوال غلط درج ہوا تھا۔ اس لئے اس ماہ کے سوالات میں اسے مکرر درج کیا جاتا ہے

سوال نمبر ۱ کا حل یہ ہے



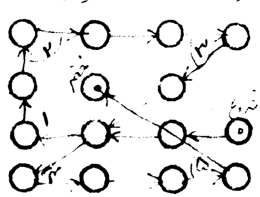
سوال نمبر ۳ کا حل یہ ہے:۔ باپ کی عمر ۳۰ سال۔ ماں کی عمرے ۲ سال۔ بڑے لڑکے کی عمر ۹ سال اور چھوٹے لڑکے کی عمرے ½ سال ہے۔

سوال نمبر ۴ کا جواب یہ ہے:۔ دو لٹر پانی اور دو لٹر الکحل کو جب ملائیں گے تو نتیجہ ۴ نہ ہوگا بلکہ ۳٫۸ لٹر ہوگا۔ (لٹر ایک فرانسیسی پیمانہ ہے)

جن طلبہ کے جتنے جواب صحیح ہیں ان کی فہرست اخیر میں دیدی گئی ہے اور انعامی کتابیں روانہ ہو چکی ہیں

اس ماہ میں پھر تین سوالات دئے جاتے ہیں:۔

۱۔ پندرہ جھونپڑوں سے کیونکر ایک شخص اس طرح گزر سکتا ہے کہ صرف چھ خطوط مستقیم اُسے بنانا پڑیں۔ اور صرف پانچ مرتبہ اسے مڑنا پڑے۔



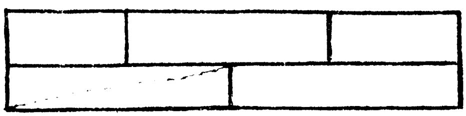
۲ - ذیل کے ۱۶ خانوں میں ۱۶ ہندسے ہیں۔ کیا آپ ان کو ان خانوں میں اس ترتیب سے رکھ سکتے ہیں کہ جب کسی خط مستقیم سے انکا شمار کریں تو مجموعہ ۱۸۰ ہو (خط مستقیم خواہ عمودی ہو یا افقی یا قطری) اسی طرح درمیان کے مربع کے چاروں ہندسوں کا مجموعہ ۱۸۰ ہو اور کناروں کے مربعوں میں جو ہندسے ہوں ان کا مجموعہ بھی ۱۸۰ ہو۔

۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸
۱۲	۳۴	۵۶	۷۸

حل =

۵۶	۱۲	۷۸	۳۴
۳۴	۷۸	۱۲	۵۶
۱۲	۵۶	۳۴	۷۸
۷۸	۳۴	۵۶	۱۲

۳ - ذیل کی شکل پانچ مستطیلوں پر مشتمل ہے جو پندرہ خطوط مستقیم سے بنتی ہے ایک لکیر ایسی کھینچئے جو ہر خط کو قطع کرتی ہوئی گزر جائے اور دوبارہ اُس خط سے نہ گزرے :-



انعامات میں دس روپیہ سے لیکر ایک روپیہ کی کتابیں روانہ کی جائیں گی۔ جنکی تعیین منیجر کے اختیار میں ہوگی۔ جوابات ۲۵ اپریل تک آجانا چاہیئے۔

جن حضرات کے جوابات ۲۵ مارچ تک صحیح موصول ہوئے اُن کی فہرست حسب ذیل ہے ۔

۱ - دو سوالوں کا صحیح جواب دینے والے

۱ - سلطان الزماں صاحب زبیری درجہ ہشتم - مارہرہ
۲ - رحمت شاہ صاحب ٹونک
۳ - اشفاق حسین صاحب رضوی - سلطان پور
۴ - عبدالحق صاحب درجہ ہشتم - کلر سیداں
۵ - سراج احمد رضا صاحب درجہ ششم - گونڈا
۶ - عبدالمجید صاحب - بڑا دہرہ
۷ - محمود الرحمان صاحب درجہ ہفتم کارنجہ
۸ - محمد ارشد صاحب درجہ " "
۹ - محمد ابراہیم صاحب " " "
۱۰ - شفیق احمد صاحب درجہ دہم اجمیر
۱۱ - اللہ رکھا صاحب اجمیر
۱۲ - محمد الیاس صاحب متعلم فرسٹ ایر ہزاری باغ

۱۳ - بختیار حسن صاحب کلکتہ
۱۴ - احمد علی اکبر صاحب - مومن آباد
۱۵ - امرناتھ صاحب لاہور
۱۶ - شاہ نجم الدین صاحب بانکی پور
۱۷ - لیاقت حسین صاحب میرٹھ
۱۸ - محمد یونس صاحب الہ آباد
۱۹ - حامد علی صاحب جماعت دہم ہوشیارپور
۲۰ - مصطفیٰ احسن صاحب جماعت ہشتم بہاولپور
۲۱ - بشیر احمد صاحب جلندھر
۲۲ - عبدالوہاب صاحب جماعت نہم گورکھپور
۲۳ - محمد تفضل امام صاحب مونگیر
۲۴ - حفیظ الرحمان صاحب نگرا - چھپرا
۲۵ - محمد لطیف صاحب درجہ ہشتم - پادشاہاں
۲۶ - محمد سمعیل صاحب مرچی گنج پٹنہ
۲۷ - عبدالرؤف صاحب فرخ آباد
۲۸ - سید ادبخت صاحب گجراتی
۲۹ - عبدالرشید صاحب گونڈا
۳۰ - محمد بشیر صاحب - غازیپور
۳۱ - حشمت علی صاحب متعلم فرسٹ ایر رہتک
۳۲ - محمد بشیر صاحب سیالکوٹ
۳۳ - سعید الدین صاحب منوری - الہ آباد

۲ - ایک سوال کا صحیح جواب دینے والے

۱ - سید محمد افضل شاہ صاحب درجہ ہشتم چک عبدالخالق
۲ - احمد خاں صاحب - کارنجہ اکولہ
۳ - زین العابدین صاحب - حیدرآباد (دکن)
۴ - سید ضمیر حسین صاحب درجہ ہفتم - پونڈری کرنال
۵ - عبدالباری صاحب - بریلی
۶ - شریف احمد صاحب جماعت عالم - میرٹھ
۷ - بشیر احمد صاحب جماعت ششم دہلی
۸ - عبدالجبار صاحب درجہ ہشتم جونترہ - کیمبل پور
۹ - بتول بانو صاحبہ متعلم درجہ پنجم - سلطانپور
۱۰ - محمد فاروق لطیف اللہ خاں صاحب خالدی درجہ نہم جہانسی
۱۱ - محمد فرحت اللہ صاحب درجہ ہفتم ستنا
۱۲ - زبیر احمد صاحب - گیا
۱۳ - شرافت علی صاحب - آگرہ
۱۴ - محمد لیاقت علی صاحب الہ آباد
۱۵ - محمد مونس صاحب مظفرنگر
۱۶ - سید منظر عالم صاحب طالبعلم فرسٹ ایر
۱۷ - عبدالوحید خاں صاحب درجہ نہم کھوتا

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول
- " دوم
- " سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- " پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مقدمات عالمگیر
- آغاز اسلام
- کلیات فارسی شبلی
- کلام شبلی اردو

رتن ناتھ سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی

- سوانح عمر عیار

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق

- مرالنبی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۸ر
- پرتاب ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

- جنید بغدادی
- ملکۂ زنوبیہ
- قرۃ العین
- مقدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- الفانسو ۱۲ر
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد

- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومتہ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا ۸ر
- ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- غیب دان دلہن
- بدر النساء کی مصیبت
- میوۂ تلخ ۸ر
- نیکی کا پھل

شوق قدوائی

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

- شعلۂ رنگین ۸ر
- محاصرۂ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- حسن بنارس ۸ر

- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۸ر
- بہرام چور
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبدالرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشویزم
- روح لیلیٰ
- امین بیگ
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی سرگزشت
- لال کھنگور
- پراسرار قتل

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- انشائے نسواں ۶ر
- مکاتیب محسن الملک

- لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعراء

- تذکرۂ حسینی
- گلشن ۱۰ر
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی ۱۲
- دیوان حافظ
- دیوان بیدل
- دیوان عرفی ۱۲
- کلیات جامی
- کلیات غالب
- کلیات صائب
- دیوان ناصر علی
- کلیات سعدی
- کلیات حزیں
- دیوان عنصری ۱۴
- دیوان غنی کشمیری ۶ر
- دیوان ہلالی ۶

دواوین اردو

- کلیات ظفر
- کلیات مومن

- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات انشا
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- گلزار داغ
- دیوان رند ۹ر
- دیوان ذوق ۱۳ر
- کلیات اسمٰعیل
- مرآۃ الغیب
- صحیفۂ عشق
- فریاد داغ ۴ر
- دیوان قائم ۸ر
- دیوان شہیدی

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات
- تصویر رنگین
- " باتصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین ڈیلی
- فریب حسن
- سوز عشق
- روز ایمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- طلسمی فانوس

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴



مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

جلد ۲۱ | فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۳۲ء | شمارہ ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۱	مئی سنہ ۳۲ء	شمارہ ۵

ملاحظات

اگر کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا ارتکاب نہایت بیباکی و دلیری سے کرتا ہے تو ایسے موقع پر ضرب المثل کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ

چہ دلاور ست دزدے کہ بہ کفِ چراغ دارد

یقیناً یہ ایک مضبوط کیرکٹر ہے گو معیوب سہی اور "احتساب وقضا" کے عالم میں خواہ وہ کتنی ہی سخت تعزیر کا مستوجب کیوں نہ ہو لیکن اقدام وجرارت کی فضا میں یہ سیرت انسان کو کسی دن ہنی بال و نپولین بنا دیتی ہے۔ مگر اسی "بغاوت و عصیان" کی دنیا میں ایک کیرکٹر اور بھی نظر آتا ہے جو "بے نقاب" ہو جانے کے بعد نہ اپنے مکروہ اعمال پر منفعل ہوتا ہے اور نہ انکے ارتکاب کو جائز قرار دیتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے نہایت ہی ذلیل قسم کا جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ رکیک سخیف تاویلیں شروع کر دیتا ہے تاکہ اس کا جرم دوسرے پر عاید ہو جائے اور وہ اپنے معیوب خط وخال پر تقدس وطہارت کا پردہ ڈال کر پھر اپنی ساکھ کو قائم رکھ سکے۔ اس کا صحیح نام مکر و فریب ہے، دھوکا ہے، ریا ہے۔ اس کی مثالیں آپ کو نہ قمار خانوں میں ملیں گی نہ بادہ خواروں میں بلکہ بعض خانقاہوں کے زاویوں میں ملینگی

زاہدوں کی بعض اعتکاف گاہوں میں نظر آئیں گی اور اُن "مسجین وصلین" کے حلقہ میں نظر آئیں گی جنکی زاہبانہ قمیص پنڈلیوں تک پہونچی ہوئی ہے اور جنکی پیشانیاں "سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود" کی سب سے نمایاں علمبردار ہیں۔

جہاں تک کسی شخص کی صورت اور اس کے خط وخال کا سوال ہے، کوئی گفتگو کرنا فضول ہے، کیونکہ اس کا تعلق [illegible] سے ہے اور ہوسکتا ہے کہ محض چہروں کی ویرانی وسوگواری ہی "مہبط انوار الٰہی" قرار دیجائے، لیکن جس حد تک ایک انسان کے وضع وقطع اور اس کے اعمال ومراسم کا تعلق ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہمارے یہاں بعض ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں کہ اگر کبھی "زہد وورع"، "طاعت وعبادت"، اتقاء وپرہیزگاری کا کوئی مجسمہ بنایا جانے والا ہو تو ان سے بہتر ماڈل (models) میسر نہیں آسکتا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہندوستان میں اس فن کی طرف لوگوں کو توجہ نہ ہو اور قطرت کے یہ عجیب وغریب "نمونے" یونہی بیکار پڑے رہیں۔

ملک کے ایک مشہور بزرگ عبدالماجد دریابادی ہیں ـــــــ نبی آخرالزماں کی برگزیدہ ہستی کے متعلق اپنی کتاب فلسفۂ اجتماع میں فرماتے ہیں :۔

(۱) دیکھو کہ ان کا ساہمہ تن مذہب شخص اپنی سطوت کے بقاء وتحفظ کے لئے ناگزیر انہ کیا کیا وسائل اختیار کرتا ہے ـــــ

(۲) سرزمین حجاز میں ایک یتیم بچہ پیدا ہوتا ہے جسے مکتب کی معمولی تعلیم تک نصیب نہیں ہوئی ـــــ

(۳) جس نے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ کو دنیا سے اس کی رسالت تسلیم کراتے اور قائدین عظام کی صف میں اُسے اس قدر ممتاز جگہ دینے میں اس کی تمام خصوصیات سے زیادہ مدد دی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوتا ہے :۔

(۱) بیت اللحم میں ایک مجہول النسب بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی والدہ کی عصمت کو اہل وطن مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں

انبیاء عظام اور ظالم وجابر بادشاہوں کو ایک ہی صف میں جگہ دیتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں :۔

۱۔ محمد، مسیح، بودھ، سکندر، سیزر، نپولین ..... وغیرہ صرف گنتی کے چند اشخاص اب تک دنیا میں ایسے پیدا ہوئے ہیں جو اول درجہ کے قائدین کے لقب کے مصداق ہوسکتے ہیں

لیکن دنیا انبیاء کرام کے حضور میں ان تمام گستاخیوں، دریدہ دہنیوں، اور توہین واستہزاء کو دیکھتی ہے، سنتی ہے اور گزرجاتی ہے، کیونکہ اب سے چند سال قبل پروپاگنڈا کے وہ اصول مرتب نہ ہوئے تھے جو اس وقت پائے جاتے ہیں ـــــ

اس کے بعد ہی بزرگ ایک صوفی کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ ڈھول بج رہا ہے، قوالی ہو رہی ہے، تالیاں بج رہی ہیں کیفیت طاری ہے، آنکھ ناک جاری ہے ـــــ شریعت حقۂ اسلامیہ کے علمبردار اس لہو ولعب کو بھی دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے، کیونکہ ان کو ابھار کر کام لینے کا فن اُس وقت تک پوری طرح مدوّن نہ ہوا تھا۔

چند دن کے بعد ہی حضرت، قومیات کے ناخدا اور سیاسیات کے خدا بنکر، منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں جلسوں میں وہی قائدین سیاست کی سی سرگوشیاں، خطبہ ومقالات میں وہی اشتعال انگیز گرمجوشیاں، کسی سے ملیں تو حد درجہ شرمساری کا اظہار، گفتگو کریں تو ہر ہر طریق سے نمائش انکسار ـــــ لیکن یہ راہ پرخطر تھی، معاملہ "دار ورسن" کا تھا، علاوہ بریں یہ بھی اندیشہ تھا کہ حیدرآباد کی وظیفہ خواری معرض خطر میں نہ پڑجائے اس لئے بہت جلد رجعت فرمائی اور افسوس ہے کہ سوائے ایک آدھ مقامی مجالس کی صدارت کے کوئی نمایاں امتیاز حاصل کرنے تک طالع بیدار کی رسائی نہ ہوسکی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد صرف ایک ہی منزل ارتقاء کی رہگئی تھی، یعنی مذہبیات کی قیادت اور روحانی ارشاد وہدایت، سو بحمد اللہ آج کل آپ اسی اوقیانوس کی شناوری فرما رہے ہیں اور اسی میدان کی "رستاخیز" میں مصروف نظر آرہے ہیں۔ وہی بات بات میں آیات قرآنی سے استشہاد، ہر ہر فقرہ میں احادیث نبوی سے استناد، حق وصداقت کی حمایت میں وہی خونخواریاں اور اسلام کی غریب الوطنی پر ہر دم آنکھوں سے اشک باریاں، دوسروں کے تمام اخلاقی معائب کو ہمیشہ دہرانا اور جب خود ان کے خط وخال کو بے نقاب کیا جائے تو منھ میں کف لے آنا۔ پھر کون ہے جو ان حالات کے ماتحت آپ کے بلند اخلاق پر ایمان نہ لائے اور کس میں ہمت ہے جو حضرت کے خلاف زبان ہلائے۔ چنانچہ حال ہی میں جب ایک خاتون نے جن کو ہمارے محترم بزرگ کی مطلقہ ہونے کا فخر حاصل ہے ایک پمفلٹ کے ذریعہ سے اپنی دردناک داستان دنیا کو سنائی تو آپ کو پھر وہی کافر وملحد نیاز یاد آگیا اور اس بوجھ کو اپنے سر سے یہ کہکر گرا دینا چاہا کہ یہ تو نیاز فتحپوری کا (انھیں کے الفاظ ہیں)

"انوکھا انتقام ہے اور محدثین کرام روایت سے قبل راوی کو جانچتے تھے اور راوی ضعیف یا مجروح نکل آیا تو اس کی روایت سرے سے ناقابل التفات ٹھہر جاتی تھی"

گویا جو کچھ اس پمفلٹ میں لکھا گیا ہے خواہ وہ کتنا ہی درست ہو لیکن محض اس لئے ناقابل التفات ہے کہ اس کا راوی اصول حدیث کے مطابق ضعیف ومجروح ہے، مدعا یہ تھا کہ جس وقت دنیا مولانا کی زبان سے اصول حدیث کا یہ نظریہ سن لیگی تو خاموش ہوجائے گی اور پھر اُن کے زہد وورع کے سامنے سر جھکا کر "سبوحٌ قدوسٌ ربنا ورب الملائکۃ والروح" کی تسبیح پڑھنے لگے گی ـــــ لیکن اصول حدیث کے اس ماہر بے بدل، فن قضا وافتا کے اس علامۂ وحید العصر سے کوئی پوچھے کہ کیا حقیقتاً اس تاویل سے اس کا ضمیر مطمئن ہوگیا ہے، کیا یہ کہکر واقعی وہ اپنے نفس لوامہ کو خاموش کرسکا ہے اور دنیا باور کرے یا نہ کرے ـــــ لیکن کیا وہ خود اپنی روح کو اس فریب میں مبتلا کرکے سکون بخشنے میں کامیاب ہوسکا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو میں نہایت خوشی سے اس الزام کو اپنے سر لینے کے لئے تیار ہوں، ورنہ کیا فائدہ کہ اس تہمت سے وہ اپنے نفس کے اضطرابات میں ایک اور حرکت مذبوحی کا اضافہ فرما رہے ہیں۔ وہ حضرات جنھوں نے اس پمفلٹ کو دیکھا ہے (اور جنھوں نے نہیں دیکھا وہ مولوی محمد رفیع صاحب نمبر ا منفو رڈ گنج الہ آباد سے طلب کر کے دیکھنے کے بعد) سمجھ سکتے ہیں کہ اس پمفلٹ کو سوائے اُن خاتون کے کوئی دوسرا مرتب ہی نہ کر سکتا تھا۔ یا پھر کوئی ایسا شخص جو واقعات عقد و طلاق کے تمام جزئیات اور اندرونی حالات کا رازدار ہو۔ نہ کہ میں جسے کوئی دور کا علاقہ بھی اس خاندان سے نہیں ہے۔

اس پمفلٹ میں علاوہ ان تمام چھوٹے چھوٹے واقعات کے جو شادی و طلاق کے سلسلہ میں پیدا ہوئے حسب ذیل مراسلات کی نقلیں بھی دی گئی ہیں:—

(۱) سب سے پہلے عبدالماجد صاحب کا خط حبیب الرحمان صاحب (برادر خاتون) کے نام جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ایک شخص غائب کی صورت سے شادی کے لئے پیش کیا۔

(۲) پھر انھیں کا دوسرا خط جس میں صیغۂ غائب نے متکلم کی صورت اختیار کر لی اور صاف صاف اپنی خواہشات کو ظاہر کیا

(۳) عقد کے تقریباً ایک ماہ بعد خاتون کی محبت بھری تحریروں کے جواب میں عبدالماجد صاحب کا عتاب نامہ جس میں انھوں نے اپنی شوہرانہ سطوت کا اظہار فرماتے ہوئے حکم دیا کہ "ہفتہ میں ایک بار خط آنا چاہئے، اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے میں باہر جا رہا ہوں تم اپنے میکہ چلی جاؤ"

(۴) عبدالماجد صاحب کا خط حبیب الرحمان صاحب کے نام جس میں انھوں نے خاتون پر "سہارنپور چلے جانے" کا الزام قائم کیا۔ (درآنحالیکہ خود عبدالماجد صاحب نے انھیں اپنے بھائی عبدالمجید صاحب کے پاس سہارن پور بھجوایا تھا)

(۵) خاتون کا تعلق خاطر سے مجبور ہو کر پھر عبدالماجد صاحب کو خطوط لکھنا اور ایک ماہ کے سکوت برہم کے بعد پھر عبدالماجد صاحب کا یہ جواب خاتون کے نام آنا کہ "تمھارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں یا کوئی تار ہوتے ہیں"۔

(۶) چار ماہ کے بعد خاتون کی دریاباد بلائے جانے کی خواہش پر عبدالماجد صاحب کا تحریر فرمانا کہ "ابھی موقع نہیں ہے، جب موقع ہوگا بلا لونگا"۔

(۷) عبدالمجید صاحب (برادر عبدالماجد) کا خط حبیب الرحمان صاحب برادر خاتون کے نام کہ ——— "عبدالماجد صاحب کی پہلی بیوی کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے اس لئے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپکی بہن کو الگ کر دیا جائے"۔

(۸) طلاق کے بعد خاتون کے ماموں محفوظ الرحمان صاحب کی تحریر حبیب الرحمان صاحب کے نام اظہار افسوس کیلئے

(۹) طلاق کے ایک ہفتہ بعد عبدالماجد صاحب کا خط خاتون کے نام جس میں اُنھوں نے بجائے اپنے کسی اور شوہر کی تلاش کا وعدہ فرمایا ہے۔"

(۱۰) حسیب الرحمان صاحب کا خط عبدالماجد کے نام شکایت کا

(۱۱) عبدالماجد کا جواب جس میں یہ لکھتے ہوئے کہ طلاق کوئی بُری چیز نہیں ڈراتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دل شکنی کے خیال سے بیاں نہیں کی۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے اور آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کروں۔" گویا طلاق کا کوئی نامناسب سبب خود خاتون کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔

(۱۲) عبدالماجد کی تحریر خاتون کے نام جس میں تحریر نمبر ۱۱ کے الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مہر کی رقم (جو صرف اکیاون روپیہ تھی) تیار رکھی ہے صرف تمھاری رسید کا انتظار ہے۔"

(۱۳) مولوی حسین احمد صاحب (عبدالماجد کے پیر) کا خط خاتون کے نام جس میں اُنھوں نے عبدالماجد صاحب کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے خاتون کو صبر کی تلقین کی ہے۔

(۱۴) مولوی حسین احمد صاحب کا پھر دوسرا خط خاتون کے نام جس میں عبدالماجد کا اپنی والدہ ماجدہ کے حکم سے مجبور ہو جانا طلاق کا سبب بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "عبدالماجد مصارف روانہ کرتے ہیں مگر آپ کی طرف سے واپس ہوتے ہیں" درآنحالیکہ عبدالماجد نے طلاق کے بعد علاوہ مہر کی رقم کے ایک پیسہ بھی مصارف کے لئے روانہ نہیں کیا۔

(۱۵) مولوی حسین احمد صاحب کا خط حسیب الرحمان صاحب کے نام جس میں پھر عبدالماجد کی مجبوریوں کا افسانہ دہرایا گیا ہے۔

اس پمفلٹ کو خاتون نے ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے:۔

بہر حال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علماء دین و اکابر ملت کے سامنے رکھکر متمنی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت گلیم پوش تسبیح خوان صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر و فریب اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ نہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کئے جاتے کیونکہ عبدالماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے۔ دق وسل جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن گن رہی ہوں، لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جانگداز واقعہ سے میری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں۔"

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جس پمفلٹ میں ایسے پوست کندہ حالات درج ہوں جس میں اتنے پرائیوٹ خطوط کی نقلیں شامل ہوں اور جو خود مطلقہ خاتون کے نام و دستخط سے شایع ہوا ہو کیا وہ کسی اور کے دماغ کا نتیجہ ہو سکتا ہے، پھر تماشہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی وہ خاتون محترم تمام اخبارات میں اس پمفلٹ کی تحریر و اشاعت کو اپنی آپ سے منسوب ہونیکا اعلان کرتی ہیں، لیکن عبد الماجد صاحب کا اصرار دنیا سے یہی ہے کہ نہیں یہ سب کچھ نیاز کا کرادھرا ہے اور اس لئے قابل التفات نہیں، پھر کیا عبد الماجد کے نزدیک دنیا اس قدر احمق ہے کہ نیاز کا نام ہی دینے سے وہ ان تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کر دیگی، نکاح و طلاق کے واقعات کو بھی غلط ٹھہرا دیگی اور اس واقعہ کو "بوستان خیال یا طلسم ہوشربا" کے کسی داستان کا ٹکڑا باور کر کے پھر ان کے بلند اخلاق کا راگ گانے لگے گی۔ کسی عورت سے نکاح کرنا اور اسکو طلاق دیدینا، دنیا کی کوئی نئی بات نہیں جسپر دنیا حیرت کرے، روز ہر جگہ متعدد واقعات ایسے ہوتے ہیں اور کسی کو پرواہ بھی نہیں ہوتی، لیکن چونکہ یہ حرکت ایسے شخص سے سرزد ہوئی ہے جو خود رات دن اخبار سچ میں یورپ کے واقعات طلاق کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت و اخلاق پر آنسو بہایا کرتا ہے جو اپنے ارشادات و مواعظ کے پردہ میں گویا اپنی ملکوتیت و طہارت کا اعلان کیا کرتا ہے اور جو رشد و ہدایت کی خدمات گرانمایہ انجام دیتے ہوئے خود اپنی خضر طریقت ہونے کی حیثیت کا مبلغ ہے اسلئے دنیا کو اخلاقی حق حاصل ہے کہ وہ اُن سے باز پرس کرے اور پوچھے کہ یہ

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

کیا معنی رکھتا ہے ——— تھوڑی دیر کے لئے آپ ان تمام بیدردیوں اور تلخ تحریروں کو نظر انداز کر دیجئے جو عبد الماجد کیطرف سے ایک خاتون کے حق میں استعمال کی گئیں یہ بھی فراموش کر دیجئے کہ انھوں نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے جب دوسرا نکاح کیا تو کیوں تمام ماحول پر نگاہ نہیں ڈال لی، اور جب ایک بار عہد وفا کر لیا تھا تو اسپر استوار کیوں نہیں رہے۔ اسی کے ساتھ آپ اکیاون روپیہ کے مہر کو بھی بھول جائیے اور اُس بقالانہ ذہنیت کو بھی نظر انداز کر دیجئے کہ مہر ادا کرنے سے پہلے ہی پوری رقم کی رسید طلب کیجاتی ہے۔ لیکن اُن متضاد بیانات کو کیونکر دنیا بھول سکتی ہے جو اس سلسلہ میں عبد الماجد کی طرف سے دئے گئے، طلاق کے بعد جب خاتون کے اعزہ شکایت کرتے ہیں تو انھیں دھمکاتے ہیں کہ "سچائیوں کے اظہار پر مجبور نہ کیجیے" اور جب خود خاتون دریافت کرتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ "تہمتوں کی تردید میں جو کچھ میں لکھ بھیجوں، جھوٹی تہمت لگانے والے خود اپنا نامہ اعمال سیاہ کریں گے" ——— اسی کے ساتھ جب مولوی حسین احمد صاحب دریافت کرتے ہیں تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ "والدہ ماجدہ کے حکم سے مجبور ہو گیا" تین آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ تین سبب طلاق کے بتائے جاتے ہیں اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایسے سبب تلاش کئے جاتے ہیں جو اثر قائم کئے بغیر نہ رہیں۔ چونکہ خاتون کے اعزہ کی طرف سے اندیشہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں اس لئے انھیں تو دھمکی دیدی کہ "سچائی کے اظہار پر مجبور نہ کرو" ایک عورت کا نازک و معصوم دل چونکہ ہمدردی سے جلد متاثر ہو جاتا ہے اس لئے انھیں لکھدیا کہ تم پر تہمت لگانے والے خود اپنا نامہ اعمال سیاہ کریں گے، اور مولوی حسین احمد صاحب کو سمجھانے کے لئے چونکہ کسی شرعی بہانہ کی ضرورت تھی اس لئے اُن سے کہدیا کہ "کیا کروں والدہ نے مجبور کیا" ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں سے کس سبب کو صحیح قرار دیں اور کس کو غیر صحیح۔ اگر والدہ کی برہمی اصل سبب تھا تو پھر سوال یہ پیدا

پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالماجد نے پہلے اپنی والدہ سے اجازت حاصل نہیں کی تھی اگر نہیں حاصل کی تو کیوں اور اگر حاصل کی تھی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایک بار اجازت دینے کے بعد پھر طلاق کے لئے مجبور کرتیں۔ قدیم وضع کی خواتین سے کبھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی سلسلہ میں انکی ایک صداقت بیانی اور ملاحظہ ہو اور وہ بھی خود اپنے پیر سے کہ "میں مصارف روانہ کرتا ہوں لیکن وہ نہیں لیتیں"۔ خاتون کا بیان ہے کہ سوائے مہر کی رقم کے ایک پیسہ بھی مصارف کے لئے روانہ نہیں کیا۔ جب پمفلٹ شایع ہو کر ملک میں تقسیم ہوا تو اڈیٹر صاحب پیشوا کو بھی بھیجا گیا۔ اُنھوں نے عبدالماجد صاحب سے اصل واقعہ دریافت کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ تمام سازش نیاز کی ہے۔ کیونکہ وہ خاتون تو ایک حرف نہیں پڑھ سکتیں"۔ یہ اور تازہ شگوفہ تھا جو عبدالماجد نے چھوڑا، حالانکہ وہ خاتون نہایت اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہیں اور اُنھوں نے خود بھی اڈیٹر صاحب پیشوا کو ان کے خط کے جواب میں عبدالماجد کے اس جھوٹ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اُس کی نقلیں دوسرے اخبارات میں بھی شایع کرائیں ہیں۔

جسوقت یہ پمفلٹ میرے پاس آیا تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنی رائے کا اظہار نہ کرونگا اور بالکل خاموش رہونگا کیونکہ ملک کے اخبارات ورسائل اس کی نقل شایع کر رہے تھے، لیکن جب عبدالماجد نے خواہ مخواہ اس سلسلہ میں میرا ذکر چھیڑ دیا اور اپنے اوپر سے الزامات دور کرنے کے بجائے صرف "راوی وروایت" کی بحث میں پھنسا کر لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہا تو میں مجبور ہوا کہ اصل واقعات وحالات کو پیش کردوں۔ اُمید ہے کہ عبدالماجد صاحب دریابادی معاف فرمائیں گے اور آئندہ اس مسئلہ میں پھر میرا نام لیکر مجھے مجبور نہ کریں گے کہ میں نگار کے قیمتی صفحات کو جنھیں اس سے زیادہ مفید کام میں صرف ہونا چاہئے دوبارہ اس نوع کی گندہ داستان سے آلودہ کروں۔ حبیب الرحمان کی طرف سے جو خط عبدالماجد نے حقیقت میں شایع کرایا ہے اور جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ میں نے حبیب الرحمان صاحب کو کوئی خط لکھا تھا کہ واقعہ عقد وطلاق کے جزئیات سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اس میں صداقت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

میں نہ حبیب الرحمان صاحب سے واقف نہ ان کا صورت آشنا اور نہ میں نے کبھی کوئی خط اُنھیں لکھا —— اگر وہ یا عبدالماجد سچے ہیں تو اُنھیں چاہئے کہ بجنسہ میرا خط شایع کریں ورنہ یوں کذب ودروغ بافی، اور جھوٹی تاویلوں سے حقیقت پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ اِسوقت تک مرد نے عورت پر ہزار ہا مظالم توڑے ہیں اور کبھی ظاہر نہیں ہوئے، اگر اُن میں سے کوئی ایک طشت از بام ہو بھی جائے تو کیا ہوتا ہے اور مرد کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ کرے جبکہ وہ "قوامون علی النساء" کی سند رکھتے ہوئے اپنے پندار میں عورت کے ساتھ ہر ناروا سلوک کو جائز قرار دے سکتا ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ بھاگلپور کی ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ پٹنہ کے ایک عربی مدرسہ کے صدر مدرس نے بھی جو بڑے عالم و فاضل سمجھے جاتے ہیں، اپنی سوتیلی ساس کو عقد سے تین ماہ گذرنے کے بعد اپنی لڑکی کے اصرار سے طلاق دیدی۔

یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء دین کے اور یہ ہیں داستانیں اُن کی خلوتگاہوں کی۔

نیاز

کشش

(۱)

آدمیوں کا ایک سمندر نظر آتا تھا، "مہاتما گاندھی کی جے!" کے ہزاروں غلغلہ انداز نعرے بلند ہو رہے تھے، موٹر میں سے ڈاکٹر ہارون بے اختیار کھڑا ہو گیا، انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگا ——— "وہ دیکھو! وہ ہیں مہاتما جی، پنڈت مدن موہن لاوی کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کیسی بلا کی چمک ہے! اوہ! کتنے دُبلے ہیں، گویا مدت کے بیمار ہوں!"

جس وقت ڈاکٹر ہارون اضطراری کیفیت کے ماتحت موٹر کا اسٹیرنگ وہیل، چھوڑ کر اگلی نشست پر بے ساختہ کھڑا ہو گیا تھا، سلیمہ نے موٹر چلانا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ موٹر بانی کا لائسنس اسے نہیں ملا تھا، تاہم ایسے جم غفیر میں وہ اپنی ذہانت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

ابھی اسٹیرنگ وہیل ہاتھ میں لئے سلیمہ کو چند لمحے گزرے تھے کہ مجمع میں سے چیخ سنائی دی "اے! ہوشیار! ہوشیار!"

یہ آواز سنکر ڈاکٹر ہارون کی نظر مہاتما جی کی طرف سے اسٹیرنگ وہیل کی جانب منعطف ہو گئی اور اس نے بڑی پھرتی سے بیٹھ کر سلیمہ کے ہاتھ سے وہیل لے لیا۔ لیکن انھیں چند لمحات میں ایک المناک حادثہ رُونما ہو گیا۔ "سنبھالو! سنبھالو!" کے نعرے بلند ہونے لگے اور آن واحد میں موٹر کار کے قریب لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ بیچارہ ایک قلی موٹر کی زد میں آگیا تھا۔ اگلے پہیوں نے اسکی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی جو اپنے مجروح شوہر کی حالت پر کرب انگیز بین کر رہی تھی۔ سب کی آنکھوں کے سامنے قضا کا فرشتہ اپنی کارفرمائیوں میں مصروف تھا۔ سلیمہ یہ نظارہ دیکھ کر کانپ اٹھی، دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپالیں، اور موٹر کار کی پچھلی نشست پر جا کر پڑ گئی۔ ڈاکٹر ہارون نے موٹر پیچھے ہٹائی، پھر مجروح قلی کا سر اپنے زانو پر رکھ کر دیکھ بھال کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ اسے معلوم کرنے میں زرا دیر نہ لگی کہ قلی بہت طرح مجروح ہوا ہے، اس کا بچنا محال ہے، اور وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔

حسب دستور امبولینس اور پولیس کے کارکن موقع واردات پر پہونچ گئے، زخمی کو ہسپتال پہونچایا گیا، ڈاکٹر ہارون کی موٹر کا نمبر نوٹ کرلیا گیا۔ اور اسے فہمایش کی گئی کہ کل مع اپنی ہمراہی خاتون کے منصف حوادث کے اجلاس میں حاضری دینی پڑے گی۔

ڈاکٹر ہارون نے پہلے اس امر پر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ الزام اسی کے سر ہے، لیکن جب مجمع میں سے یہ آواز بلند ہوئی کہ موٹر وہ عورت چلا رہی تھی تو اس کی پریشانی پھر عود کر آئی۔ اور اس پر ایک گونہ سراسیمگی طاری ہو گئی۔

تشویش کے عالم میں اس نے موٹر کو اپنے گھر کی سمت چلانا شروع کیا۔

کھادی کو مقبول عام بنانے کے لئے سابرمتی آشرم کے قائدِاعظم ——— مہاتما گاندھی آج دہلی تشریف لائے ہیں، ان کا پیغام سننے، ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کی خاطر مخلوق امنڈی چلی آرہی ہے، مرد، عورت، بچے بوڑھے، جوش اور شادمانی کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عین اسی وقت اپنے گھر کی سمت واپس جانے والے یہ دونوں میاں بیوی ——— ڈاکٹر ہارون اور سلیمہ ——— بہت ہراساں اور چپ ہیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ بہت دن کے بعد آج میاں بیوی کو ایک ساتھ سیر کے لئے نکلنے کا موقع ملا تھا، لیکن خبر نہیں کس منحوس ساعت میں انھوں نے باہر قدم رکھا تھا کہ یہ افسوس ناک سانحہ رونما ہوا۔

——— دونوں پاس پاس بیٹھے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے خیالات میں مستغرق، وہ کیا کہیں اور کیا بات چیت کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر ہارون نے اپنی بیوی کی جانب نظر کی اور بے اختیار کہنے لگا ——— "ارے سلیمہ! رو رہی ہو، بھئی!"

سلیمہ نے اب اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا، جوش گریہ سے اس کے آنسو نہیں تھمتے۔ اس نے رقت آمیز لہجے میں یہ بھی کہا ——— "میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، مجھے خدا کے لئے فیروز پارک پہونچا آئیے۔"

ہارون متعجب ہوکر کہنے لگا ——— "کیوں، کیوں۔ فیروز پارک کیوں؟ آخر ہم گھر کیوں نہ چلیں؟"

سلیمہ نے کہا ——— "نہیں، نہیں، اماں کے پاس جاؤں گی۔ میرا جی معلوم نہیں کیسا ہو رہا ہے"

ہارون نے دریافت کیا ——— "تو کیا ابھی؟"

سلیمہ نے جواب دیا ——— "ہاں ابھی!"

ہارون نے افسردہ دلی کے ساتھ کہا ——— "کیوں سلیمہ! مصیبت کے وقت تم میرا ساتھ چھوڑنا پسند کرتی ہو"

سلیمہ نے خفیف ہوکر کہا ——— "یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں مجھے فیروز پارک پہنچا دیجئے۔ میرا جی بگڑ رہا ہے۔ میں صرف دو دن وہاں رہنے کی اجازت چاہتی ہوں"

ہارون تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر بولا ——— "سلیمہ! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اماں کے پاس جانے سے کیا حاصل۔ ان کیا کریں گی۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اپنے گھر چلیں۔ دونوں ایک تسلی دیں ——— اور اگر ماتم ہی کرنا مقصود ہے تو ایک ساتھ بیٹھ کر خوب سینہ کوبی کرلیں۔ کہو کیا رائے ہے؟"

سلیمہ نے اس کی پوری بات سنی کہ نہیں، البتہ اس نے بے ساختہ ہارون کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے ——— پھر درد انگیز آواز سے کہنے لگی ——— "کیا اس آدمی کی جان بچ سکتی ہے؟ جلدی بتاؤ میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ وہ بوڑھیا جو وہاں

کھڑی ـــ رو رہی تھی، اس کی بیوی تھی یا رشتہ دار۔ ہائے اس کی آواز کیسی دردناک تھی۔ اب تک میرے کانوں میں اس کے رونے کی آواز گونج رہی ہے، اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سلیمہ اپنی بات ختم کرنے کے پہلے ہی چلا چلا کر رونے لگی۔

ہارون چونک اٹھا۔ وہ غور کرنے لگا کہ یہ عورت ـــ سلیمہ ـــ مخلوق کی کتنی غمگسار ہے۔ ایک نازنین جس کی پرورش عشرت اور تنعم کے گہوارے میں ہوئی ہے، مصیبت زدہ قلی اور اس کے لواحقین کے لئے ہمدردی کے آنسو بہا رہی ہے! وہ کتنی حوصلہ مند ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں موٹر چلاتے ہوئے ذرا نہیں جھجکی، اور اب محض چند ساعتوں کے بعد ایک کمسن سادہ لوح، لڑکی کی طرح زار و قطار رو رہی ہے! لیکن اب رونے سے کیا ہو سکتا ہے۔ آج اوس کی آنکھوں سے گو اتنے طوفان جاری ہوں کہ ہزاروں سمندر بن جائیں، پھر بھی وہ حادثہ نہیں مٹ سکتا۔

سلیمہ نے اپنے شوہر کو خاموش دیکھ کر پھر کہا ـــ "ہاں بتاؤ۔ وہ زندہ ہو جائے ایسی کونسی تدبیر ہے؟"

ہارون سمجھ گیا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جانے میں عافیت ہے۔ اسی واسطے وہ سلیمہ کی گریہ وزاری میں زیادہ مخل نہیں ہوا آنسوؤں کی ایک دھار قلب کی آگ کو بجھا دیتی ہے۔ آدمی اسی ساحل پر نہا کر سکون خاطر حاصل کرتا ہے۔ آج سلیمہ کا نسوانی دل بھی اسی دریا میں نہا کر پاک وصاف ہو رہا ہے!

ہارون کو سب سے بڑا پس و پیش یہ ہے کہ فیروز پارک کا ماحول سلیمہ جیسی پاک سیرت لڑکی کے حسب حال نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسی جگہ سے ہارون کو یہ دُر بے بہا ملا ہے، لیکن وہاں کی امیرانہ طرز معاشرت، تکلفات اور تصنع سے مملو ہے دل کیا چیز ہے، وہاں کا کوئی باشندہ نہیں جانتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ شادی کے بعد سے برابر ہارون کی یہ سعی بلیغ رہی کہ سلیمہ فیروز پارک کی فضا سے بالکل علیحدہ رہے۔ اسے یہ تجربہ بھی اپنے سہ سالہ دور تاہل میں ہو چکا ہے کہ سلیمہ جب تک اس کے ہاں رہتی ہے، بڑی خلیق، بڑی ہمدرد اور نیکیوں کا مجسمہ بن جاتی ہے، لیکن فیروز پارک کی فضا میں پہنچتے ہی اس کی حالت بدل جاتی ہے۔

(۲)

آج سر محمود کی طبیعت بہت اداس ہے۔ نازوں کی پالی ہوئی ان کی اکلوتی لڑکی سلیمہ تین دن سے بیمار ہے۔ اسے بڑے زور کا بخار آتا ہے اور بے ہوشی کے دورے ہوتے ہیں۔ خواب میں وہ بڑاتی بہت ہے۔ وہ رہ رہ کر چلانے لگتی ہے ـــ "ہاں میرے سرتاج بتاؤ، اس آدمی کو کیسے زندہ کیا جائے؟" ڈاکٹر اور حکیم تھوڑی تھوڑی دیر میں اسے دیکھنے آتے ہیں۔ خود سر محمود کے سر میں درد ہے۔ تمام کوٹھی میں اُداسی پھیلی ہے۔

جو احباب روزمرہ سر محمود کے ڈرائنگ روم میں چائے، کیک، بسکٹ، اور قیمتی سگار، کی طلب میں جمع ہوتے ہیں، آج بھی موجود ہیں۔ البتہ جہاں ہمیشہ قہقہے بلند ہوتے تھے، چائے کی پیالیوں اور کیک کی طشتریوں کی جھنکار سے کمرہ گونج اٹھتا تھا، وہاں آج بہت آہستہ آہستہ بات چیت ہو رہی ہے۔ سب جج بہادر ہاشمی صاحب مزے لے لے کر چائے پی رہے

ہیں، اور دھیرے دھیرے خان بہادر سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔ ہائی کورٹ کے مشہور بیرسٹر مسٹر سلیمان صاحب خانہ کے سامنے ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔

نواب صاحب فرماتے ہیں ——— "کیا وہ ہسپتال جاتے وقت راستہ ہی میں جاں بحق ہو گیا؟"

خان بہادر نے جواب دیا ——— "نہیں، یہ غلط افواہ ہے۔ وہ کچھ دیر ہسپتال میں بھی زندہ رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بے وقوف کو موٹر کے سامنے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ اخبار والے اور بے طرح سر پیٹ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب مطمئن طریقے سے موٹر کی سواری کوئی کاہے کو کر سکے گا!

مسٹر سلیمان نے آہستہ سے کہا ——— "خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ متوفی کے پسماندگان ضرور قابل رحم ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ سلوک کرنا چاہئے۔ کیوں خان بہادر صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟

خان بہادر نے ناک بھوں چڑھا کر مسٹر سلیمان کی تجویز پر اظہار نفرت کیا اور پھر سر محمود کی طرف مخاطب ہو گئے ———

——— کیوں سر محمود! لڑکی کا کیا حال ہے؟"

سر محمود نے انتہائی پریشانی کا اظہار کیا اور بولے ——— ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ رات کو بھی بہت چیخنی رہی۔ اسے اپنی صحت سے زیادہ مقدمے کا خیال ہے۔

خان بہادر نے منہ بنا کر کہا ——— اونھ! تم بھی یونہی ہو۔ مقدمے کا کیا خیال۔ کیا کوئی سنگین واردات ہوئی ہے؟ ایک معمولی قلی تھا۔ ہارن بجانے کے باوجود اس نے موٹر کے سامنے آنے کی جرأت کی، اپنی غلطی سے مر گیا۔ اگر زیادہ ضرورت ہوئی تو پسماندگان کی مٹھی گرم کر دی جائے۔ سب معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

نواب صاحب نے آہستہ آہستہ منہ چلاتے ہوئے کہا ——— اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

سر شتہ دار کہنے لگے ——— اونھ، اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ سلیمان! تم بھی تو کچھ بولو۔ تم تو قانون کے پتلے ہو۔ منصف حوادث کا یہ فقرہ سنا "غفلت اور لاپرواہی سے آدمی مار ڈالا گیا!" لیکن اس پر مستزاد یہ ہے کہ سلیمہ کے نام موٹر چلانے کا لائسنس نہیں ہے۔"

خان بہادر گرج کر کہنے لگے ——— "سلیمہ کا قصور کہاں سے آیا۔ وہ تو پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ تمہارے داماد نے خلیل سے خود کہا ہے کہ وہ سب الزام اپنے سر لے گا۔ اور پھر سلیمہ کو موٹر چلانا کب یاد ہے"

اسی وقت سر محمود کا لڑکا حامد نوجوان بیرسٹر، اپنے دوست خلیل احمد کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ خلیل احمد خان بہادر کا لڑکا ہے اور ہائی کورٹ کا نیا وکیل ہے۔ وہ ڈاکٹر ہارون کا بھی گہرا دوست ہے۔ چنانچہ اسی کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے کہ سر محمود نے اپنی بھتیجی بیٹی سلیمہ کے ساتھ ہارون کا عقد منظور کیا تھا۔ خلیل اور ڈاکٹر ہارون ایک ساتھ پڑھتے تھے۔

ان دونوں کو اندر سے آتا دیکھ کر سب کے سب بے تحاشا پوچھنے لگے ——— کیا حال ہے؟ نیند اچاٹ ہو گئی؟"

حامد نے کہا ــــــ جی نہیں۔ سو رہی ہے۔ اب طبیعت سنبھل رہی ہے۔ بہت کچھ افاقہ ہے۔ ہاں خان بہادر "سلمو" کے موٹر چلانے کی نسبت کیا کہنا ہے؟"

خان بہادر کہنے لگے ــــــ یہی خلیل کہتا ہے کہ ہارون عدالت میں اظہار دے گا کہ موٹر میں چلا رہا تھا"

خلیل نے کہا ــــــ جی ہاں ہارون نے اسی طرح کہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر بدقسمتی سے سچ کہنے کا موقع آیا تو بادل ناخواستہ واقعہ بیان کرنے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔"

حامد نے جوش کے ساتھ کہا ــــــ آپ لوگوں کا کدھر خیال ہے۔ وہ میری بہن کی خاطر دنگو کیوں بننے لگا۔ یہ مروت اس میں نہیں ہے۔ ہمارے تمام احسانات کا عوض وہ نالائق یہی دیگا۔ کہ عدالت میں کہہ گزریگا کہ ہم دونوں سامنے بیٹھے چلا رہے تھے۔ ہم دونوں برابر تقصیروار ہیں۔ اگر وہ اقبال نہ کرلے تو کہئے گا۔ ہاں آپ نے کچھ اور سنا؟ اس قلی کی بیوہ نے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔"

خان بہادر کو یہ سنکر اتنا غصہ آیا کہ وہ آپے میں نہیں نہ تب گرج کر بولے ــــــ مقدمہ؟ اور کس پر؟ پھر ایک قلی کی طرف سے؟ اللہ اللہ کیا زمانے کی نیرنگی ہے!" خان بہادر نے طیش کے مارے میز کا پینٹنے لگی، چائے کا چمچہ، پیالہ، اور طشتری سے، جھنکار پیدا ہونے لگی۔

نواب صاحب فرمانے لگے ــــــ واقعی کیا شان ایزدی ہے۔ ایک ذلیل قلی اور نالش فریاد کرے

حامد نے کہا ــــــ نہیں یہ نہ فرمائیے۔ اب قلی ذلیل نہیں رہے،

خلیل نے کہا ــــــ ٹھیک ہے۔ کل تھوڑی دیر کے لئے عدالت پولیس میں گیا تھا۔ میں نے بھی یہی سنا ہے۔ کہ مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔

مسٹر سلیمان بیرسٹر نے کہا ــــــ بالکل صحیح۔ کل میں نے بھی حادثے کی تفصیل اور مقدمہ دائر ہونے کی خبر سنی تھی۔

خان بہادر کو اب تک اعتبار نہیں ہوتا تھا کہ ایک ذلیل قلی ایسے شریفوں کے نام نالش دائر کرے۔

حامد نے کہا ــــــ خان بہادر چچا! دراصل نالش دائر ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ اس کے بھائی کو سمجھا کر معاملہ ٹھنڈا کیا جائے، لیکن اس بدمعاش نے کچھ لینا منظور نہیں کیا۔ حرام زادہ نرم ہی نہیں ہوتا، کہتا تھا ــــــ دلی کی بیگم صاحبہ کو جیل نہ بھیجا ہو تو نام نہیں!"

نواب صاحب اور مسٹر سلیمان ایک زبان ہو کر کہنے لگے ــــــ "ایں! افوہ با آزادی کی جے!"

خان بہادر نے جو باتیں کبھی خواب میں بھی نہ سنی تھیں وہ آج سن رہے ہیں۔ وہ ایک دم حواس باختہ ہو کر کہنے لگے ــــــ اب مزدور طبقہ لال پیلی آنکھیں دکھانے لگا۔ یہ سوائے بالشویت کے اور کچھ نہیں ہے! یہ سب بالشویکی سازش ہے ہے!"

مقصود تمام گفتگو خاموشی اور متانت سے سن رہے تھے۔ بولے ــــــ "مجھے اور کوئی فکر نہیں۔ صرف یہ اندیشہ ہے کہ آیا لڑکی و داماد ملزم گردانے جائیں گے؟"

خان بہادر مارے جوش کے اٹھ کھڑے ہوئے اور خطاب کیا ـــــ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، سر محمود تم کس خیال میں ہو۔ مجال ہے جو ایسا ہو جائے۔ تم ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور تمھاری لڑکی اور داماد اگر ملزم گردانے گئے تو برٹش راج عبث ہے اور ہم سب بھی عبث ہیں!

جس وقت ڈرائنگ روم میں یہ گرم مباحثہ ہو رہا تھا، سلیمہ اسی وقت بیدار ہو گئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے رٹ لگا رہی تھی ـــــ میرے سرتاج! تمھارے قدموں پر سر رکھتی ہوں اسے زندہ کر دو

(۳)

پیشی کے دن علی الصباح قلی کی عورت اپنے بھائی کے ہمراہ ڈاکٹر ہارون کے گھر آئی۔ اس نے ڈاکٹر ہارون کے پاؤں پکڑ لئے، اور کہنے لگی ـــــ "بابو جی ستیاناس مت کرو۔ دیکھو سب رہ جائے گا۔ سچ ساتھ جائے گا۔ آج میرے مقدمے کی پیشی ہے۔ بابو جی میں عدالت میں تم کو قسم دوں گی کہ موٹر کون چلا رہا تھا"

ڈاکٹر ہارون کانپ اٹھا۔ اس کی ذہنی اذیت کا ٹھکانا نہیں رہا۔ پہلے وہ جو کچھ بھی اظہار دیتا، لیکن اب اس نے عزم کر لیا کہ میں سوا سچ کے کچھ نہ کہوں گا۔ بے شک آدمی کے ساتھ سچ جاتا ہے۔ حق و صداقت کو ہمیشہ فتح حاصل ہوتی ہے۔

عدالت میں جب ہارون کے اظہار ہوئے تو سننے والے انگشت بدنداں ـــــ تھے کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ پہلے جسقدر دروغ بیانی اور حق پوشی کے اس نے منصوبے باندھے تھے وہ سب رہ گئے، اور اس کی زبان سے صداقت کے سوا ایک کلمہ بھی جھوٹ کا نہ نکلا۔

سلیمہ بیمار تھی۔ لہذا کمیشن پر اس کے اظہار لئے گئے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر کے بھی اظہار ہوئے۔ سلیمہ نے اپنے اظہار میں انھیں باتوں کا اعادہ کیا جو اسے طوطے کی طرح رٹائی گئی تھیں۔

ہارون کی راست گوئی سے قلی کی بیوی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب، سلیمہ اور متعدد گواہوں کے بیانات زیادہ وقیع سمجھے گئے۔ منصف صاحب نے فیصلہ صادر کیا کہ قوانین شارع عام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قلی موٹر کی زد میں آ گیا۔ لہذا اپنی موت کا وہ آپ سبب ہوا۔ البتہ سلیمہ نے بغیر لائسنس موٹر چلائی، اس واسطے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ نیز جرمانے کا کچھ حصہ قلی کی بیوہ کو دلانے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔

مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد ہارون اپنی سسرال گیا۔ سر محمود، خان بہادر، اور جملہ ہم جلیس موجود تھے۔ ہارون کو دیکھتے ہی حامد نے غضبناک تیور سے دیکھ کر کہا ـــــ "ڈیم! آوارہ! منہ دکھاتے بھی شرم نہ آئی؟"

سب چپ چاپ سنتے رہے۔ کسی نے حامد کو اپنے بہنوئی کی تذلیل سے منع نہیں کیا۔

ہارون کی جرأت اور بے باکی میں مطلق فرق نہ آیا۔ اس نے فی الفور گرج کر کہا ـــــ "جو لوگ اپنے گھر کی لڑکیوں کو

جھوٹی شہادت دینا سکھائیں وہی کاوارڈ (بزدل) ہیں نہ کہ میں! راستہ چھوڑ دو میں سلیمہ کو لینے آیا ہوں۔

ہارون نے اندر جانے کے لئے اور ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ پھر حامد نے تیز ہو کر کہا ——— "نہیں مانتے۔ ٹھہر جاؤ۔ اگر تم نے اب قدم بڑھایا تو ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دوں گا! تم کمینے ہو۔ اپنی بیوی سے دغا کرتے ہیں بھی تمھیں باک نہ ہوا۔ ایسے بدتذل آدمی کے ساتھ میری بہن کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا! بدمعاش ———"

جب سر محمود نے دیکھا کہ معاملہ زیادہ طول کھینچ رہا ہے تو وہ دونوں کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ہائیں! یہ کیا ہے؟"

خان بہادر فوراً بول اٹھے ——— "سر محمود یہ تمہاری ناانصافی ہے۔ حامد کا اس وقت کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کا کہنا جاہے۔ جسے اپنی بیوی، اپنے اہل و عیال سے متعلق اپنے فرائض کا احساس نہ ———"

بات کاٹ کر ہارون نے کہا ——— "اپنی بیوی سے متعلق فرائض کا احساس کرانے کی میں نے کسی سے استدعا نہیں کی ہے۔ آپ بالکل خاموش رہیئے"

پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اندر چلا گیا۔

اسے دیکھتے ہی سلیمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ لیکن وہ نازک ہاتھ ان آنسوؤں کو باز نہ رکھ سکے جو رخساروں پر جمع ہوتے اور پھر بہتے تھے۔

ہارون کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ مریضہ کے بستر کے قریب پہونچ کر فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر گلوگیر آواز سے کہنے لگا ——— "ہاں ٹھیک ہے۔ سلیمہ بہت ٹھیک ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ میں سنگدل ہوں۔ ظالم ہوں۔ میں نے تمہیں مصیبت میں پھنسا دیا"

سلیمہ نے ہاتھ اپنی صورت پر سے نہیں ہٹائے۔ وہ کہنے لگی ——— "اب میں کیا کہوں۔ تم نے میرے کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ تم نے میرے خلاف جھوٹی گواہی دی! میں اب منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اب خدا کے لیے مجھے مت ستاؤ" . . . . پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہارون گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عذر کرنے لگا۔ آیا سچ مچ میری عالی خاندان، میری تعلیم یافتہ، سلیمہ کی زبان سے یہ کلمات ادا ہو رہے ہیں؟ کیا درحقیقت یہ بہن اپنے بھائی کا پرتو ہے؟ لیکن یہ وہی سلیمہ تھی۔ جو بیماری کے عالم میں چلاتی تھی "میرے سرتاج" اس آدمی میں دوبارہ جان ڈال دو!" وہی سلیمہ آج مجھے خاطر میں نہیں لاتی۔

ہارون نے اور ایک مرتبہ سلیمہ کی نازک کلائیاں اپنے ہاتھ میں لیں، اور نرم لہجہ میں گویا ہوا ——— "سلیمہ کیا یہ تمھارا آخری جواب ہے!"

سلیمہ نے جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائیاں اپنے شوہر کی گرفت سے آزاد کر لیں اور چلا کر کہنے لگی ——— "خدا کے لئے مجھے

دق نہ کرو، میں تمھارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں کبھی نہ جاؤں گی کبھی نہ جاؤں گی
یہ کہتے کہتے اس پر غشی طاری ہو گئی۔

خادمہ اور نرس فوراً کمرے میں آ گئیں۔ حامد علی آ گیا جو پوشیدہ طور سے سب گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ہارون کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا ـــــ "احمق! اب تو اپنے کانوں سے سن لیا تو نے ـــــ"

ہارون نے فوراً اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولا ـــــ "آپ جیسے راست باز اور صداقت شعار انسانوں میں رہ کر سلیمہ یہ سبق نہ حاصل کرتی تو تعجب ہوتا۔ میں اسی خوف سے اسے یہاں سے لے جانے کی نیت سے آیا تھا۔ لیکن خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب انشاءاللہ آپ کے گھر میں ہرگز قدم نہ رکھوں گا۔ کیا شرافت اسی کا نام ہے کہ جرم کر کے عقوبت جرم سے بچنے کے لئے دروغ بافیوں سے کام لیا جائے، جھوٹی شہادت دی جائے؟ آپ کی جھوٹی دنیا آپ ہی کو مبارک "

ہارون پھر نہ ٹھہرا باد تند کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۴)

پہلے پہل جب میں زیارت کرنے گیا تو مہاتما جی نے محبت بھرے الفاظ میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو میرے دل میں اتر گئیں۔ بس مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ دل کا حال جان لیتے ہیں۔

سابرمتی آشرم کے شفاخانے میں ڈاکٹر ہارون بیٹھا ہوا زخمیوں کے لئے کپڑے کی پٹیاں درست کر کے تہ پر تہ رکھتا جاتا تھا اور یہ الفاظ اپنے پاس بیٹھے ہوئے نوجوان سے کہہ رہا تھا۔ وہ نوجوان خلیل احمد تھا۔

خلیل احمد نے مسکرا کر پوچھا ـــــ "ہاں مہاتما جی نے کیا کہا تھا؟"

ڈاکٹر ہارون نے جواب دیا ـــــ "کیا کہا تھا۔ بس یہی فرماتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب! گھر میں جھگڑا کر کے تو نہیں آئے۔ دیکھو یہ قومی کام ہے۔ اس میں تمھیں تن، من، سے مصروف ہونا پڑے گا۔ اور اگر اپنا من دہلی میں چھوڑ آئے ہو، اور تن یہاں کام میں لگانے کا خیال ہے۔ تو تمھارا ابھی واپس چلا جانا بہتر ہے۔" مہاتما جی کی باتیں سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کیا خوب ارشاد فرمایا کہ میں اپنا من دہلی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

بلا قصد ایک ٹھنڈا سانس اس نے لیا اور چپ ہو گیا۔

وہ کچھ دیر ساکت رہا اور پھر پوچھنے لگا ـــــ "خلیل بھائی، تم بمبئی میں کب تک ٹھہرو گے؟ گھر میں تو سب خیریت ہے ـــــ تمھارے گھر میں؟"

خلیل کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا ـــــ "ہاں معلوم ہو گیا۔ مہاتما نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم اپنا من دہلی میں چھوڑ آئے ہو۔ لیکن پھر یہ ڈھٹائی کیوں ہے؟"

"کیسی ڈھٹائی؟ میں نہیں سمجھا"

اخاہ! ہاں اب کاہے کو سمجھوگے۔ اب تو تارک الدنیا بن گئے ہو! ارے احمق، اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھیں جس کا خیال رہتا ہے، جس کے پاس تم اپنا من چھوڑ آئے ہو، اس کی خبر کیوں نہیں لیتے؟"

یک بیک ہارون کی صورت متغیر ہو گئی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ایک لمحے کے بعد وہ کمال آہستگی سے کہنے لگا ــــــ "جو ساتھ رہنا نہ چاہے، جس کے علوم تبت سے اس غریب الوطن کو کچھ نسبت نہ ہو، اس کا ناحق ذکر کرتے ہو"

خلیل نے ہنس کر کہا ــــــ "دیکھو، میں نے ابھی اس کا تذکرہ صریح الفاظ میں تو نہیں کیا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ خود تمہارا من اسی کی یاد میں مصروف ہے۔ اس کے سوا کوئی اور بھی دہلی میں تمھارا ہے یا نہیں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا ــــــ "خلیل بھائی اور کون ہے۔ ایک پھوپھی تھیں انھیں بھی میں بھوپال پہونچا آیا ہوں"

خلیل نے جوش کے ساتھ کہا ــــــ "بس اور کوئی نہیں ہے۔ احباب، آشنا، اپنے بیگانے، ارے سب ہی تو ہیں۔ پھر اگر ایسی زندگی بسر کرنے کا خیال تھا تو شادی کیوں کی تھی۔ آج کل وہ سب دہلی ہی میں ہیں۔ سلیمہ تمھارے لئے بہت بیتاب ہے۔ وہ بھی دہلی میں ہے۔ اسے تمھارا انتظار ہوگا۔ اب زیادہ پاؤں نہ پھیلاؤ۔ سیدھے میرے ہمراہ ابھی چلو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ آٹھ مہینے کی مفارقت نے سلیمہ کی حالت میں یہ کیسا اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ تو مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھی، آج کیوں طلب کر رہی ہے؟

خلیل نے پھر کہا ــــــ "بھائی ہارون جلدی بتاؤ کیا منشا ہے۔ کتنی دور و دراز کی مسافت قطع کر کے میں آیا ہوں آج عدالت میں کمائی کے دن ہیں لیکن تمھاری خاطر سب کچھ چھوڑ آیا۔ لیکن آج تم مجھ سے ایسے منحرف معلوم ہو رہے ہو گویا ہم زندگی بھر ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ہیں، ہر کام میں شریک رہے ہیں، وہ تمام واقعات ماضی ہیچ تھے! آج تم نے سنیاس کیا لے لیا۔ ہم سب کو فراموش کر دیا۔ اچھا بتاؤ چلنا ہے؟

ہارون نے کہا ــــــ "فرض منصبی۔ کیا فرض منصبی سے غافل ہونے کا سبق دیتے ہو؟"

خلیل جھلا کر کہنے لگا ــــــ "بس رہنے دو تمھارا فرض منصبی۔ اٹھو چلو۔"

ہارون نے استقلال کے ساتھ کہا ــــــ "نہیں بھائی اپنا فرض منصبی ختم کئے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتا"

خلیل بولا ــــــ "خیر اگر ایسے نہیں چلنا منظور ہے تو عارضی طور پر ایک دن کے لئے چلو۔ سب سے ملاقات کر لو۔ اور واپس آ جاؤ"

اسی وقت ایک صاحب پکارتے ہوئے آئے کہ ــــــ "ڈاکٹر ہارون! آپ کو کارلا کے کیمپ میں جانا ہوگا"

دفعتاً ان کی نظر خلیل کی اجنبی صورت پر پڑی۔ ہارون ان کا مافی الضمیر سمجھ گیا۔ اور کہنے لگا ــــــ "یہ میرے دوست ہیں۔ دہلی کے باشندے ہیں۔ مجھ سے ملنے یہاں تشریف لائے ہیں۔ یہ وکیل ہیں۔"

وہ مسرت کا اظہار کر کے کہنے لگے ــــــ "اس آشرم کے ناچیز خادموں کی آپ نے بہت عزت افزائی کی۔

میں آپ کا ممنون ہوں۔"

خلیل نے کہا ——— "یہ آپ کی نوازش ہے۔ میں تو ایک معمولی دنیادار ہوں۔ آپ جیسے بزرگوں نے جو قربانیاں کی ہیں، وہ بلاشبہ قابل قدر ہیں۔ میں اپنے بخت پر نازاں ہوں کہ آپ کی ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ البتہ میری ایک درخواست ہے۔ اگر آپ سے ہوسکے تو میرے دوست ڈاکٹر ہارون کو دو چار روز کی رخصت ——— "

وہ فوراً بول اٹھے ——— "رخصت! آپ کے دوست کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے اپنی مرضی سے یہ نیک کام اختیار کر رکھا ہے۔ فرض منصبی سمجھ کر اسے انجام دیتے ہیں۔ دو چار روز کی رخصت میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے، لیکن سردست ان کا جانا نہ ہوگا۔ کیونکہ فرائض ان کے ذمے عائد کئے جاچکے ہیں۔ اور اب وقت پر دوسرا آدمی نہیں پہونچ سکتا۔" پھر وہ ہارون کی طرف مخاطب ہوئے ——— "جاؤ ڈاکٹر ہارون، باپوجی سے مل لو، پھر اپنے مہمان کو آشرم اچھی طرح دکھا دو۔ اور اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آج اسی آشرم میں ماحضر تناول "

خلیل کہنے لگا ——— "یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیا ہرج ہوسکتا ہے۔ میں ضرور یہیں کھانا کھاتا مگر مجبور ہوں، مجھے اسی وقت جانا ہے۔ اب انھیں تو لے جا نہیں سکتا "

انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ——— "اب اس وقت تو معاف فرمائیے گا۔ اگر آپ پہلے کہتے تو کچھ بندوبست ہوسکتا، اب انھیں اپنے فرض منصبی کو انجام دینا ہی پڑے گا۔ فرض منصبی کا معاملہ ہے۔ مادر وطن کا کام ہے۔۔۔۔"

وہ اور زیادہ نہ ٹھہر سکے۔

ان کے جانے کے بعد خلیل نے دریافت کیا تھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو ہارون نے بتایا کہ یہ شیامل بھائی لال جی، بمبئی کے کروڑپتی تاجر اور احمد آباد و بمبئی کے تین کپڑے کے کارخانوں کے مالک ہیں۔

خلیل کو یہ معلوم کرکے بہت حیرت ہوئی

(۵)

خلیل نے جاتے وقت، ہارون کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا تھا جسے چاک کرنے سے پہلے ہی، ہارون نے روشن تحریر دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ یہ سلیمہ کا خط ہے۔

ریل میں بیٹھتے ہی خلیل کے دل میں ہزاروں خیالات موجزن ہونے لگے۔ ہارون کون سی دنیا میں جاکر پھنس گیا تھا۔ کیسی عجیب جگہ ہے۔ بس ایک سامری ہے جس کے سحر نے وہاں کی کایا پلٹ دی ہے۔ کیسے کیسے آدمی۔ اس کے ایک افسوں سے گرویدہ اور مسحور ہوگئے ہیں۔ شیامل بھائی لال جی، کپڑے کی تجارت کے شہنشاہ، کروڑپتی، تین کارخانوں کے مالک، آشرم میں ایک معمولی انسان کی سی، نہایت سادہ اور جفاکشی کی زندگی بسر کررہے ہیں!

ہارون، وہ ہارون جو میرے اشاروں پر چلتا تھا، جو مجھ سے جدا ہونا پسند نہ کرتا تھا، آج دیس چھوڑ کر اس پردیس

میں پڑا ہے - مجھ سے زیادہ ، اپنی بیوی سے زیادہ ، اسے اپنے فرضِ منصبی کا خیال ہے !

پھر اس نے آشرم کی زندگی سے اپنی تہذیب ، اپنے تمدن ، اپنی معاشرت ، کا مقابلہ کیا لیکن انجام کار ، اس نے بخیال خوشیں یہی تصور کیا کہ اس خطے میں اور اک پر اسی ایک سامری فسوں سازی کا غلبہ ہے ، اور کچھ نہیں۔

جب وہ بمبئی میں اپنے جائے قیام پر پہنچا تو دیکھا کہ حامد صحن میں ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور سلیمہ آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے - ایک کتاب اس کے ہاتھ میں ہے - حامد نے جب سنا کہ ہارون اپنے فرضِ منصبی سے مجبور تھا - اور نہ آسکا ، تو اس نے اپنے ہونٹ کاٹ کر دانت پیس کر غصے کے ساتھ کہا ——— "دیکھو خلیل میں نہ کہتا تھا کہ وہ نہ محض بے وقوف بلکہ مبتذل ہے - جو شخص ادنےٰ اعلےٰ طبقہ کے قلیوں سے اسقدر ہمدردی کا اظہار کرے اس کی دنائت میں کیا شبہ ؟ "

یہ گفتگو سلیمہ کے سامنے ہو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ جب اس نے سنا کہ وہ نہیں آیا تو اس کا چہرہ اتر گیا ، اور اس نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا - خلیل نے محسوس کیا کہ اس عورت کے جذبات اب برانگیختہ ہو رہے ہیں ، اس کی نسوانی تمکنت کو صدمہ پہنچا ہے جسے وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے ، اسے جو شکست ہوئی ہے ، اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی !

جب حامد کی صلواتیں حد سے تجاوز کر گئیں تو سلیمہ نے کہا ——— " بھائی ، بس ، بہت کہہ چکے "

ممکن تھا کہ حامد غصے میں اور کچھ بکتا ، لیکن خلیل اس کا ہاتھ پکڑ کر چائے پینے کے بہانے سے باہر لے گیا اور کہنے لگا ——— " حامد ! تم ہارون سے زیادہ بے وقوف ہو - تم سلیمہ کے سامنے گالیاں دینے بیٹھے - واہ خوب آدمی ہو - معلوم نہیں کہ اس کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے - اس سے ہمدردی درکنار ، الٹا اس کے جذبات کو پامال کرتے ہو - تم عورت کی فطرت سے واقف نہیں ہو - "

(۶)

یہ کیا ماجرا ہے ؟ آیا نظر اسے قبول کر سکتی ہے - کارلا کے ہسپتال میں ایک مجروح کے سرہانے سلیمہ ! اور پھر نرس کا لباس پہنے ہوئے ! قریب تھا کہ ہارون کا اس سے ٹھس کو پ زمین پر گر پڑتا ، اس کے ہاتھ ایسے لرز رہے تھے ، اس کا دل بے اختیار دھڑک رہا تھا - سلیمہ ، عیش و تمول کی آغوش میں جس کی پرورش ہوئی - جس کی ناز برداریوں کے لئے دولتمند ماں باپ نے کوئی کوتاہی نہ کی ، وہ لاڈلی ، اکلوتی ، سلیمہ اور معمولی نرس کا کام کرے ! " عقل سلیم اسے نہیں قبول کرتی - خود ہارون کو اول اول فریب نظر کا گمان ہوا تھا - وہ تھوڑی دیر تک بالکل خاموش اور نقش حیرت بنا کھڑا رہا تھا ، پھر چند قدم آگے بڑھائے تھے اور کانپتی ہوئی آواز میں پکارا تھا ——— " سلیمہ ! سلمیٰ ! "

شادی کی پہلی رات میں ہارون نے سلیمہ کو جس طرح پکارا تھا - آج کی پکار بھی اسی کے مماثل تھی -

سلیمہ نے پلٹ کر دیکھا - پہلے اسے خیال ہوا کہ کوئی اجنبی پکار رہا ہے - پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دہلوی نازنین کی ہنسی سے کہا ——— "

" کسی غیر عورت سے بلاسبب گفتگو کرنے سے آپ کے فرضِ منصبی کو نقصان تو نہیں پہنچا ڈاکٹر ہارون ! "

ہارون کے دل پر گویا ایک چوٹ سی لگی۔ لیکن اس نے زہر خندے یہ الفاظ ادا کئے کہ "سلیمہ فرض منصبی بے شک ایک چیز ہے، " پھر اس نے چاہا کہ بے اختیار سلیمہ سے لپٹ جائے، تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور جھنجھلا کر کہنے لگی ــــــــ "دیکھتے نہیں ہو میں اپنے فرض منصبی پر ہوں!"

ہارون خفیف ہو کر، کچھ چوٹ کھا کر، ناراضگی کے بطور دوسرے وارڈ کی طرف چلا گیا۔

جس دن سابرمتی ندی کے کنارے مس سارا بائی او سلیمہ گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے ٹہل رہی تھیں، سلیمہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی سرگزشت سارا بائی کو سنائی تھی۔ سارا بائی بمبئی کے ایک کھرپتی تاجر کی بہن ہیں۔ قومی خدمت کا شوق انھیں سابرمتی آشرم میں کھینچ لایا ہے۔ وہ اب تک کنواری ہیں۔ چرخہ کاتتی ہیں۔ کھدر پہنتی ہیں۔ زخمیوں کی تیمارداری کرنے جب وہ کارلا کے ہسپتال میں گئی تھیں تو سلیمہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی روز سے ان کا سلیمہ کا بہناپا قائم ہو گیا ہے۔

سارا بائی نے سلیمہ کی آپ بیتی سنکر اس کے آنسو اپنے رومال سے خشک کئے، اسے گلے سے لگا لیا۔ اور کہنے لگیں ــــــــ بہن سلمی تو کیسی پاگل ہے! تیرے شوہر آدمی نہیں فرشتے ہیں۔ وہ اگر میرے سامنے ہوتے میں ان کے قدموں کی خاک اپنے سر پر رکھتی۔ انھوں نے مقدمے میں سچ کے اظہار سے کام لیکر تجھے بھی جھوٹ کی ناپاکی سے بچا لیا ہے۔ سلمی ان داتا کی! تجھے چاہئے ان کے پاؤں دھو دھو کر پئے"

اسی دن سے سلیمہ کی کایا پلٹ ہو گئی۔

ایک دن سلیمہ نے کارلا کے ہسپتال جانے کے لئے باپو سے اجازت حاصل کی۔ سارا بائی اس کے ہمراہ جانے والی تھیں۔ اسی دن ڈاکٹر ہارون کارلا سے آشرم میں آئے۔

ڈاکٹر ہارون نے سلیمہ کو دیکھ کر آواز دی ــــــــ "سلیمہ، سلمی!"

سلیمہ دروازے کی طرف پشت کئے ہوئے چرخہ کات رہی تھی، اسے اپنا کام پورا کر کے کارلا جانا تھا۔ جونہی اسکے کان میں ہارون کی آواز آئی، اس نے موٹر کو دیکھا، چرخہ چھوڑ کر سروقد تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، فی الفور دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے وہ کہنے لگی ــــــــ "بخشدیجئے! میرا قصور معاف . . . ."

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، اس لئے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

ہارون نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دئے۔ اور مسکرا کر کہا ــــــــ "کون؟ میں، تم مجھے بخش دوگی؟"

بخشوں؟ دونوں کے لب باہم ملتے ہوئے نظر آئے۔

(تلخیص) حسن عزیز جاوید

باب المراسلہ

(د۔ ا۔ بلگرامی)

آپ کا غالب نمبر پا کر آنکھوں کے سامنے بہت سی مٹی ہوئی تصویریں زندہ ہوگئیں۔ وہ یہ کہ حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی مرحوم اور میر امامی بلگرامی مرحوم اور غالب مرحوم تینوں ہم مکتب تھے۔ فرخ آباد کے مدرسہ میں تینوں ساتھ پڑھتے تھے میر امامی کو اتھ ضلع آرہ سے اور حضرت صاحب عالم صاحب مارہرہ سے اور غالب دلی سے فرخ آباد پہونچے تھے۔ میر امامی شیعہ تھے۔ حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ تھے اور رہے۔ اور غالب نے تبدیل مذہب کیا اور شیعہ ہوئے۔ مگر شیعہ سنی ہونا وہ نہیں تھا جس کو بدقسمتی سے آج ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ بعد المشرقین ہے۔ بہرکیف کہنا یہ ہے کہ یہ تینوں ہم مکتب زندگی بھر ایک دوسرے سے شیر و شکر رہے۔ غالب اور حضرت صاحب عالم دونوں سے آپ واقف ہیں۔ مگر میر امامی کون تھے اون کو اس مطلع میں دیکھ لیجئے۔ مثنوی ثمر مراد کا آغاز یوں فرماتے ہیں :۔

لوائم خامۂ و لفظ است لشکر　　یہ میداں آمدم اللہ اکبر

نعت کا ایک مصرعہ یوں ہے :۔ "یکے از معجزاتِ او علیؑ بود" کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آن حضرت کا یہ کھلا ہوا معجزہ تھا کہ علیؑ کا ایسا کفش بردار اون کو نصیب ہوا۔ اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علی نے جو کچھ پایا وہ صدقہ تھا آں حضرت کا۔

یہ مثنوی جس کا ذکر ہوا میر امامی نے مارہرہ بھیجی اور حضرت صاحب عالم صاحب کو لکھ بھیجا کہ ہم کو مطلع پر ناز ہے۔

وہاں سے جواب آیا کہ تمہاری مثنوی بہت اچھی ہے مگر مطلع ناقص ہے۔ وہ یوں کہ میدان میں تن تنہا ایک سپاہی کھڑا ہے اور عذر اس کو یہ ہے کہ ہم سپاہی نہیں بلکہ پوری فوج ہیں۔ ("لفظ است لشکر") یہ نقص دور کرنے کے لئے مصرعہ یوں ہونا چاہیئے :۔ "لوایم خامۂ و الفاظ لشکر"

میر امامی نے جواب دیا کہ میری فوج اور آپ کی فوج میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میری فوج نہایت آراستہ پیراستہ۔ اور آپ کی فوج پریشاں حال اور بالکل تباہ۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ میری فوج کا میمنہ اور میسرہ قلب کی پوری حفاظت کر رہا ہے اور ایک منٹ کے لئے غافل نہیں ہوتا۔ (ل ف ظ = ظ) "ف" قلب ہے اور دائیں بائیں اوس کے دونوں محافظ ہیں۔ برخلاف اس کے آپ کی فوج میں پریشاں حالی کا عالم یہ ہے کہ الف اور ظ جو میمنہ میسرہ کی خدمت پر مامور ہیں اون کو قلب سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ "الفاظ"۔

بہرکیف یہ حضرت صاحب عالم صاحب جنکا ذکر اوپر ہوا یہ نانا تھے صفیر بلگرامی کے .... صفیر بلگرامی کی پیدایش مارہرہ میں ہوئی۔ چنانچہ انقلاب زمانہ نے مکانوں کی صورت بدل دی مگر وہ کوٹھا جس پر اون کی ولادت ہوئی تھی مارہرہ میں اب تک محفوظ ہے۔ آمدم برسر مطلب۔ صفیر نے غالب کی شاگردی چاہی اور اس کے لئے وہ آرہ سے اپنے نانا کے پاس مارہرہ گئے اور اُن سے سفارشی خط لے کر دلی گئے۔ تحفہ کے لئے مارہرہ کے آم ساتھ لیتے گئے۔ غالب نے اون کو اپنا مہمان کیا۔ اور چندے وہیں قیام رہا۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن صبح کو صفیر سلام کے لئے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ غالب بہت مضمحل ہیں اور پلنگ سے اٹھتے ہیں۔ خیریت پوچھی تو جواب ملا کہ کسل ہے اور بدن میں بہت درد ہے۔ صفیر نے پاؤں دبانا چاہا۔ غالب نے کہا کہ آپ سید زادہ ہیں۔ ہم ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتے۔ صفیر نے اصرار کیا تو غالب نے فرمایا کہ ایک شرط پر۔ وہ یہ کہ تم اُجرت پر پاؤں دابو۔ صفیر نے کہا کہ ہم کو یہ قبول۔ اوس اجرت کو ہم برکت سمجھ کر لیں گے۔ چنانچہ اس شرط پر اونھوں نے پاؤں دابنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غالب نے فرمایا کہ اب بس۔ صفیر نے اجرت مانگی۔ غالب نے فرمایا کہ "واہ صاحب! پیسے کیسے؟ آپ نے پاؤں دابے ہمنے پیسے دابے!" یہ واقعہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔ مگر نگار ص ۱۴۶ پر نظر پڑی تو دیکھتے ہیں کہ یہی واقعہ میر مہدی مجروح سے منسوب ہے۔ عبد الباری صاحب آسی سے ہم سے مراسلت نہیں ورنہ اون سے دریافت کرتے کہ اون کا ماخذ کیا ہے۔ اگر ہم غلطی پر ہوں تو ہم قبول کرلیں گے اور اگر وہ غلطی پر ہوں تو صحت فرمالیں کیونکہ مزید تحقیقات سے بات ہمیشہ سلجھ جایا کرتی ہے۔ ہم چشم دید گواہ نہیں۔ مگر اپنے گھر کی بات ہے اس لئے یاد رہی۔ صفیر جب دلی گئے تھے تو مارہرہ کے آم تحفۃً لیتے گئے تھے۔ اس واقعہ کی تصدیق اسی رسالہ میں موجود ہے۔ ص ۹۲ :-

"صاحب عالم نے یاد دلایا کہ آپ نے مارہرہ کا ارادہ کیا تھا۔ اوسی کے جواب میں اونھوں نے چودھری عبد الغفور کو یہ لکھا ... :- شیخ محی الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں ......"

اسی سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اُردوے معلّیٰ میں جتنے خطوط چودھری عبد الغفور کے نام ہیں روئے سخن اون کا حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ مگر بہت کم خطوط شایع ہوئے۔ باقی انقلاب زمانہ کے سپرد ہوگئے۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب عالم نے لکھ بھیجا کہ سن ولادت میر الفقت تاریخ سے نکلتا ہے (۱۲۱۱ ہجری) آپ کا سن ولادت کیا ہے؟ غالب نے جواب دیا۔

ہاتف غیب اس طرح چیخا
اُنکی تاریخ تیرا "تاریخا"

"تاریخا" کے عدد ۱۲۱۲ ہجری ہوئے۔ یعنی ایک برس حضرت صاحب عالم صاحب سے غالب چھوٹے تھے۔
۷۳ برس کی عمر پائی۔ اور ۱۲۸۵ میں انتقال کیا۔ (۱۲ + ۷۳ = ۸۵)۔
تاریخ وفات کا واقعہ یوں ہے کہ اپنے مرنے کی تاریخ شاگردوں کو لکھ بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ صفیر بلگرامی کے
پاس اسی مضمون کا خط آیا تو جواباً اونھوں نے یہ لکھ بھیجا ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد "غین" کی ہے دعا — خدا کرے مرا غالب جئے "ہزار برس"

مختصر یہ کہ رسالہ نگار پاکر عجیب عجیب تصویریں سامنے آگئیں۔ خیال آگیا کہ جو واقعہ ہم کو معلوم ہے وہ آپ کو لکھدیں۔

باب الاستفسار

عزیز لکھنوی کی شاعری

(جناب شاد صابری صاحب - کراچی)

میں حضرت عزیز کی قادر الکلامی و بلند پروازی کا بیحد معترف تھا اور آپ کو بھی آٹھویں دور کے ممتاز شعراء میں تصور کرتا تھا - لیکن آج آپ کے مجموعۂ کلام موسومہ "گلکدۂ عزیز" کے مطالعہ نے میرے عقاید و خیالات پر پانی پھیر دیا - میں نے آپ کے کلام میں ایسی ایسی غلطیاں پائیں جنکی توقع ایک مبتدی سے بھی نہیں کی جاسکتی - جی چاہتا ہے کہ چند اشعار سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں اور آپ کی راے طلب کروں اگرچہ جانتا ہوں کہ میری یہ جسارت حضرت عزیز کے بعض متوسلین و معتقدین کو سخت ناگوار ہوگی -

(۱) - دم نہ لینے پائے تھے ہم چھیڑ دی اک داستاں   قبر میں کیا خاک حاصل ہو تن آسانی مجھے

"دم نہ لینے پائے تھے ہم" ایک پورا فقرہ ضمیر جمع متکلم کے ماتحت ادا کرکے ردیف "مجھے" سے بے اعتنائی اختیار کیگئی جو صریح غلط ہے - اگر یہ تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیا جائے کہ کاتب کی غلطی سے مصرعہ اولی میں بجائے "میں" کے "ہم" لکھا گیا تو "دم نہ لینے پائے تھے" کے متعلق کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے

---

(۲) - عمر گزری ہے بشکل خانہ ویرانی مجھے   کیا ہوا ہستی سے حاصل جز پشیمانی مجھے

حضرت عزیز کے مصرع اولی میں "مجھے" بمعنی "میری" استعمال کیا ہے جو سراسر غلط ہے - اساتذہ کے ہزارہا اشعار میری نظر سے بھی گزرے لیکن آجتک "مجھے" بمعنی "میری" دیکھنے میں نہیں آیا - بھلا خیال تو کیجئے "مجھے عمر گزری ہے" کہیں بولا جاتا ہے -

---

(۳) - زنجیر اکے ہلتے ہی سب گرد برد تھا   صحرا جو ایک دفتر اوراق گرد تھا

"اوراق گرد" کوئی صحیح ترکیب نہیں - دامن گرد، چادر گرد، آج تک یہی تشبیہات دیکھنے میں آئی ہیں معلوم ہوا - کہ

"گرد" کے مختلف حصے کر کے ہر حصے کو ایک ورق کہنا بھی نا درست نہیں ہو سکتا۔

---

(۴) حقارت سے نہ دیکھو ساکنانِ خاک کی بستی کہ اک دنیا ہی ہر ذرہ ان اجزائے پریشاں کا

جب تک "ساکنان خاک کی بستی" کے ساتھ "کو" کا اضافہ نہ کیا جائے مفہوم ادا نہیں ہو سکتا ازروئے قواعد بیان علامت مفعول یا حرف جار کا استعمال ضروری ہے۔

---

(۵) اپنی قسمت کو نہ روؤں چارہ گر کی کیا خطا اک مرض پیدا ہوا جب دوسرا کچھ کم ہوا

مفہوم یہ ہے کہ جب چارہ گر کی چارہ گری سے ایک مرض کم ہوتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں قصور تقدیر کا ہے بیچارے چارہ گر کی کیا خطا۔ لیکن مصرع ثانی بالعکس کہا گیا یوں کہنا چاہئے تھا ع

دوسرا پیدا ہوا جب اک مرض کچھ کم ہوا

---

(۶) گویا شبِ فراق میں، میں سر سے تا قدم آئینۂ تحمل ایذائے درد تھا

مصرع اولے میں دو "میں" کا اجتماع آپ اپنی داد ہے۔ "سر سے تا قدم" کی ترکیب غلط ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ "سر سے قدم تک" یا "از سر تا قدم" کہنا چاہئے تھا۔

---

(۷) کسی کے وعدے پہ اتنا جو انتظار کیا ارے یہ کونسا دل تھا جو اعتبار کیا

سبحان اللہ "جو" کی تکرار کے کیا کہنا ہیں

---

(۸) اللہ رے تصوّرِ جاناں کی ہیبتیں رُخ اپنا آئینہ میں جو دیکھا تو زرد تھا

حضرت عزیز کی شاعری کے قربان جائیے، کیا آپ کا محبوب کوئی جن بھوت تھا جس کی تصویر کے دیکھنے سے آپ کا چہرہ زرد ہو گیا۔

(**نگار**) پہلے شعر میں "شتر گربہ" کا عیب آپ نے ظاہر کیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مصرع میں ہم اور دوسرے میں مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

دوسرے شعر میں "مجھے" بھی غلط استعمال ہوا ہے۔ اس کی جگہ "میری" ہونا چاہئے۔

تیسرے شعر میں اوراق گرد پر آپ کا اعتراض ہے اور یقیناً صحرا کو "دفتر اوراق گرد" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ صحرا میں کوئی کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جس سے کنایتہً یا مجازاً دفتر کا مفہوم پیدا ہوتا ہو اور نہ گرد کو دیکھ کر کسی کا خیال اوراق کی طرف جا سکتا ہے۔

چوتھے شعر پر جو اعتراض ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیونکہ دیکھنا ایسا متعدی فعل ہو جس کے مفعول کے لئے لفظ "کو" کا استعمال صرف اس وقت ضروری ہوگا۔ جب مفعول کوئی انسان ہو۔ یعنی "زید دیکھو، احمد دیکھو" کہنا غلط ہوگا۔ لیکن "چاند دیکھو۔ کتاب دیکھو" صحیح۔ پھر چونکہ اس شعر میں مفعول لفظ بستی واقع ہوا ہے جو انسان نہیں ہے، اس لئے اس کے بعد کو کا اضافہ ضروری نہیں"

پانچویں شعر میں بھی آپ نے اچھی بات پیدا کی ہے اور اعتراض نادرست نہیں ہے، اسی طرح چھٹے شعر میں سر سے تا قدم کہنا نامطبوع ہے۔

ساتویں شعر میں جو کی تکرار حقیقتاً اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور آٹھویں شعر میں بھی تصور جاناں سے ہیبت پیدا ہونیکا خیال واقعی وہی مفہوم پیدا کرتا ہے جو آپ نے ظاہر کیا۔

یہاں تک تو میں نے آپ کے صرف اعتراضات سے گفتگو کی ہے اور بڑی حد تک میں اُن سے متفق ہوں لیکن آپ نے جو نتیجہ اس سے نکالا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کیونکہ اگر کسی شاعر کے کلام میں چند شعر ایسے نظر آجائیں جن میں کچھ اسقام پائے جاتے ہیں تو ان کو دیکھ کر یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ آپ کے "عقاید وخیالات پر یوں دفعتہً پانی پھر جائے" اور اسے ممتاز شعراء کی صف سے نکال باہر کردیں۔

حیرت ہے کہ ایک شاعر کو چند اشعار کے نقایص کی بنا پر صف شعراء سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور ان اکثر شعروں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے جو اس نے اچھے لکھے ہیں۔

کیا آپ مہربانی فرما کر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ گلکدۂ عزیز میں کتنے شعر ایسے ہیں جن میں کوئی نقص نہیں اور اگر کوئی شعر ایسا بھی ہو جسے آپ بہترین فکر شعری سے تعبیر کر سکیں تو اس سے بھی مطلع فرمائیے، لیکن اگر آپ صرف تخریبی پہلو کو سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو پھر استقصار کامل کر کے تمام ان اشعار کی فہرست مرتب کیجئے جو عزیز کو آٹھویں دور کے ممتاز شعراء کی صف سے علیحدہ کرنے کا مستوجب بناتے ہیں، میں نہایت شوق سے انھیں "نگار" میں اپنی رائے کے ساتھ درج کروں گا۔

ماہ آیندہ میں

جن معموں کے حل کے ساتھ ہر کے ٹکٹ نہ آئیں گے ان پر توجہ نہ کی جائے گی۔

منیجر

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اس کا تجربہ چوہوں پر کیا اور بالکل صحیح پایا۔ یعنی جس وقت اس نے چوہیا کی غذا سے مادۂ مگنیز یا جدا کر دیا اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف سے التفات بالکل ترک کر دیا۔

ہر چند انسانی غذا سے یہ مادہ جدا کرنا دشوار ضرور ہے لیکن محال نہیں اور اگر کسی وقت یورپ نے جو پیدائش اولاد کا زیادہ حامی نہیں ہے اس پر عمل شروع کر دیا نوع انسانی پر اس کا کیا اثر ہوگا؟

پانی اور سونا

اس وقت تک جتنا سونا جہازوں کے ڈوبنے سے سمندر کی تہ میں جمع ہو چکا ہے، اس کا اندازہ بھی کروروں پونڈ تک پہونچتا ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی سمندر کے پانی میں خود اتنی مقدار سونے چاندی کی پائی جاتی ہے کہ اس کا اندازہ محال ہے۔ کیونکہ غریب سے غریب انسان بھی روئے زمین کا روزانہ کافی مقدار سونے چاندی کی پانی کے ذریعہ سے کھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے سنہ ۱۸۷۲ء میں انگلستان کے ایک ماہر کیمیا نے دریافت کیا۔ کہ سمندر کے فی مکعب پانی میں دس ملیگرام چاندی اور تیس ملیگرام سونا پایا جاتا ہے۔ اور اگر کسی طرح سمندر کے پانی سے یہ دونوں دھاتیں علیحدہ کر لی جائیں تو ۱۳۲۰ ملین مکعب کلومیٹر پانی سے ۱۳۰۰۰ ملین ٹن چاندی اور ۴۰۰۰ ملین ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کو دنیا کی ساری آبادی پر تقسیم کر دیا جائے۔ جو ۱۵۰۰ ملین کے قریب ہے تو ہر شخص ۲۸ ٹن سونے اور ۹ ٹن چاندی کا مالک ہو سکتا ہے۔

وہم و ہذیان کا فرق

جرمنی کا پروفیسر ہانڈل اپنی فکر باطن کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ایک مرتبہ کوئی عورت اس کے پاس آئی اور دریافت کیا کہ وہم و ہذیان میں کیا فرق ہے۔ پروفیسر مذکور نے کہا کہ "اس کا جواب یوں تو بہت تفصیل کا محتاج ہے، لیکن مختصراً آپ یوں سمجھئے کہ اس وقت آپ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہیں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ اس وقت میں اپنے سامنے ایک فرشتہ کو دیکھ رہا ہوں، تو میرا یہ کہنا ہذیان ہوگا۔ لیکن اگر کہوں نہیں بلکہ صرف دل ہی دل میں ایسا سمجھ لوں تو یہ سمجھنا وہم ہوگا۔

صحت کی بیماری

فرانس میں ایک شخص ہے جس کی عمر اس وقت ۵۰ سال کی ہے اور وہ یوم ولادت سے تا ایندم کبھی کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوا۔ اس کی ضخامت کا یہ عالم ہے کہ جہاں بیٹھ جاتا ہے۔ پتھر کی چٹان کی طرح اس کو ہلانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کا وزن ۹ من کے قریب ہے۔ اس کے سینہ کا دور ساڑھے تین گز اور کمر کا دور چار گز ہے۔ ران کی لپیٹ ۱½ اور شانہ کی ایک گز ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسوقت وہ دنیا میں سب سے زیادہ فربہ انسان ہے۔ اس کے بیٹھنے کے لئے لوہے کی کرسی جو بالکل مسہری کی طرح چوڑی چکلی ہوتی ہے۔ خاص طور پر تیار کی جاتی ہے اور اس کے ایک کوٹ پتلون میں تین آدمی اچھی طرح سما سکتے ہیں۔

اقتدار نسائی کی سرزمین

جزیرہ سوناترا میں بعض قبائل ایسے موجود ہیں جہاں مرد کی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کی حیثیت گھر میں وہی ہوتی ہے جو ایک جانور کی یا اسباب

ضرورت و معاشرت کی ۔ جب تک شادی نہیں ہوتی وہ ماں اور بہن کی حکومت میں جاکرانہ زندگی بسر کرتا ہے اور جب شادی ہوجاتی ہے تو بیوی اس کو اپنا غلام بنا کر لے جاتی ہے ۔ حال میں ایک سیاح نے اس جزیرہ کا سفر کر کے وہاں کے ایک قبیلہ مینا ناٹ کابوس کا حال لکھا ہے کہ " اتفاق سے میرے ہی سامنے وہاں ایک شادی ہوئی اور میں نے دیکھا کہ عورتیں نہایت بیش قیمت لباس میں ملبوس ہیں سونے کے جڑاؤ زیوروں سے ان کے جسم کا ہر حصہ آراستہ ہے اور انگلیوں کی ایک ایک پوریں اتنی انگوٹھیاں ہیں کہ ہاتھ ہلانا دشوار ہے ۔ لیکن فدوی شوہر معمولی مزدوروں کا سا لباس پہنے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے ۔ یہ جلسہ چھ دن تک قائم رہا ۔ اور ایک بار بھی اس غریب کو کسی صحبت میں شریک نہیں کیا گیا ۔ آخری دن اس کو بلا کر سب کے ساتھ کھانا کھلا کر گھر بھیج دیا گیا ۔ تاکہ وہاں وہ اپنی بیوی کی اجازت کا انتظار کرے

کیا وہ عورتیں جو اپنے حقوق کے لئے آج آسمان و زمین سر پر اٹھائے ہوئے ہیں ۔ سوماترا کے ان مجبور و بیکس مردوں کی طرف نگاہ نہ کریں گی جن سے ان کی بہنیں خدا معلوم کب سے یہ انتقام لیتی چلی آرہی ہیں ۔

قسمت کا چکر

کیا آپ نے کبھی ایسا سنا ہے کہ کوئی شخص کسی جلسہ سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو اور تین مہینے اسے گھر تک پہونچنے میں لگ جائیں حالانکہ گھر دو فرلانگ سے زیادہ دور نہ ہو ۔ یقیناً یہ ایسی بات ہے جس کا یقین کرنا دشوار ہے ۔ لیکن شہر ساتھگان میں ابھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے ۔

دو بہنیں ایک رات جلسہ رقص میں گئیں اور جب آدھی رات گئے واپس آنے لگیں تو انھوں نے کہا کہ آج گرمی بہت ہے چلو سمندر کے کنارے کنارے ہوکر چلیں ۔ جب وہ ساحل پر پہونچیں تو وہاں چاندنی اسقدر پُر لطف تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے ایک کشتی میں بیٹھ گئیں اور منظر کا لطف حاصل کرنے لگیں ۔ ہوا سرد تھی ، رقص نے انھیں تھکا دیا تھا اس لئے وہیں لیٹ گئیں اور لیٹتے ہی سو گئیں ۔

صبح کو جوان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کشتی بیچ سمندر میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے اور کوئی صورت نجات کی معلوم نہیں ہوتی ۔ اتفاق سے ایک جہاز اس طرف سے گزر رہا تھا ۔ اس کے کپتان نے دوربین سے دیکھ کر ایک کشتی بھیجکر ان کی جان بچائی ۔ اور اپنے جہاز میں بٹھا لیا ۔ جہاں ان کو مطبخ میں کام کرنے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا ۔ یہ جہاز اسباب تجارت لئے ہوئے جا رہا تھا ۔ اور تین ماہ تک اسے واپس نہ آنا تھا ، اس لئے ان کو مجبوراً اتنے زمانہ تک وہیں رہنا پڑا ۔ اور جب تین مہینے کے بعد وہ گھر واپس آئیں تو انھوں نے کان پکڑے کہ اب کبھی وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر نہ چلیں گی ۔

تفریحات

اس ماہ کے سوالات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) آئرلینڈ کا ایک شخص کسب معاش کے لئے امریکہ گیا وہاں اسے ہالینڈ کا ایک شخص مل گیا جو خود روزی کی فکر میں تھا۔ ان دونوں نے مل کر ایک قطعۂ زمین لیا اور اسے کھودنا شروع کیا۔ اتفاق سے انھیں ایک صندوق زمین میں مدفون ملا جس میں کچھ ڈالر اور کچھ سکے تانبہ کے تھے۔ ہالینڈی نے کہا کہ میں اس کا مالک ہوں، کیونکہ سب سے پہلے میں نے اس کو دیکھا، آئرلینڈ والے نے کہا کہ میں اس صندوق کا مالک ہوں۔ اور میرے چچا نے مجھے دیا تھا۔ اس کے اندر ایک ہزار ڈالر تھے۔ لیکن میں نے اس کا بڑا حصہ صرف کر کے باقی کو مدفون کر دیا تھا۔ لیکن بعد کو میں وہ جگہ بھول گیا تھا۔

ہالینڈی نے کہا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے کتنا چھوڑا تھا۔ اور اگر تم بتادو تو بیشک تم اس کے مالک ہو۔ آئرلینڈ والے نے جو ایک نگاہ ڈالکر معلوم کر چکا تھا کہ ۵۰ ڈالر سے زیادہ کی رقم نہ ہوگی کہا کہ ہاں میں بتا سکتا ہوں قلم کاغذ لو اور جو میں بتاتا ہوں اس کو لکھتے جاؤ۔ اسنے قلم کاغذ لے لیا۔ اس نے کہا :۔

"جسوقت میرا چچا مرا تو اسنے ایکہزار ڈالر چھوڑے۔ اس میں سے ۲۴۴ ڈالر اور ۳۵ سنٹ میں نے اپنی ماں کو بھیجے۔ اس لئے جو رقم اس وقت صندوق میں باقی رہ گئی ہے اس میں یہ رقم اضافہ کرو۔ اور جو نتیجہ نکلے اسے ایک ہزار ڈالر سے گھٹاؤ اور جو باقی رہے اسے ۳۰۵ ڈالر ۶۵ سنٹ سے منہا کردو کیونکہ میں نے اتنی رقم خرچ کی تھی پھر جو باقی بچیگا۔ وہ وہی رقم ہوگی جو صندوق میں ہے"

ـــــ ہالینڈی نے اس پر عمل کیا تو بالکل صحیح پایا ـــــ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آئرلینڈ والے نے جو کچھ کہا وہ واقعہ تھا۔ یا صرف حساب کا دھوکا تھا۔ اگر حساب کا دھوکا تھا تو کیا تھا؟ ۱۰۰ سنٹ کا ایک ڈالر ہوتا ہے

---

(۲) ایک کتا اس فکر میں ہے کہ گیارہ ہڈیوں کو زمین میں دفن کرے۔ لیکن ڈرتا ہے کہ کہیں ان کی جگہ نہ بھول جائے۔ اس لئے وہ زمین پر ایسے سیدھے خط کھینچنا چاہتا ہے۔ کہ ہر ہڈی اپنی جگہ چاروں طرف خطوط سے گھر جائے اور اسے ڈھونڈھنے میں دقت نہ ہو۔

اس نے پہلے چاروں طرف چار خط تو کھینچ لئے ہیں۔ اب بتاؤ کہ باقی خطوط کم سے کم کتنے اور کس طرح کھینچے جا سکتے ہیں۔ کہ ہر ہڈی دوسرے سے بذریعہ خطوط علیحدہ ہو جائے اور ہر طرف سے محصور۔



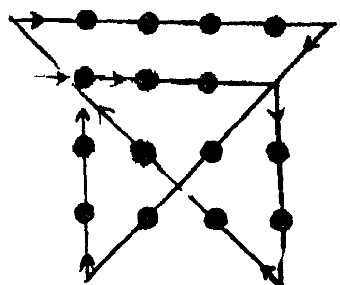
پہلو کے نقشے کی نقل کر کے آپ خطوط کے تعین کر سکتے ہیں۔

(نوٹ) سوال اول کا صحیح جواب دینے والے جذبات بھاشا کی ایک جلد پائیں گے، سوال دوم کا صحیح جواب دینے والے فراست البید کی دونوں سوالوں کا صحیح جواب دینے والے دونوں کتابوں کے مستحق ہونگے لیکن جواب کے ساتھ چار آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔ کیونکہ آئندہ کتابیں بیرنگ نہ روانہ ہوں گی۔

۲۵ رمئی تک جو جواب موصول ہونگے وہی قابل غور ہوں گے۔

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے جواب ذیل میں درج ہیں:-

(۱)

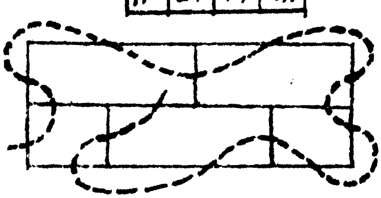


اس کا جواب دینے والوں نے یہ غور نہیں کیا کہ چلنے والا اپنے مکان سے چلیگا اور وہیں واپس آئیگا۔

(۲) سوال نمبر ۲ میں ہندسوں کی ترتیب اس طرح بھی ہو سکتی ہے:-

۷۸	۳۴	۵۶	۱۲
۵۶	۱۲	۷۸	۳۴
۳۴	۷۸	۱۲	۵۶
۱۲	۵۶	۳۴	۷۸

(۳) سوال نمبر ۳ میں حسب ذیل طریقہ پر بھی خط کھینچا جا سکتا ہے۔



مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول ہعہ
″ دوم عہ
″ سوم معہ
الفاروق عا رو ۓ
سیرۃ النعمان ۸ر
الغزالی ۸ر
المامون ۸ر
سوانح مولانا روم ۸ر
سفرنامہ مصر و شام ۸ر و عا
علم الکلام ۸ر و عا
الکلام ۸ر و عا
رسائل شبلی ۸ر
مقالات شبلی عہ
شعر العجم جلد اول ۱۲ر
″ دوم ۸ر
″ سوم ۸ر
″ چہارم ۸ر
″ پنجم ۱۲ر
موازنۂ انیس و دبیر ۓ
مضامین عالمگیر عہ و ۱۲ر
آغاز اسلام ۱۲ر و ۸ر
کلیات فارسی شبلی عا
کلام شبلی اردو عہ

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار ۸ر
خدائی فوجدار ۸ر
جام سرشار عا
الف لیلہ بطرز ناول ہے
کامنی عہ

سوانح عمر دعیار ۸ر

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی عہ
طلسمی فانوس ۱۲ر

جوالا پرشاد برق

مرزا لنی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
روہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی عہ
ملکۂ زنوبیہ ۴ر
قرۃ العین ۴ر
محدرات ۸ر
جویائے حق للعہ
لعبت چین عہ
فاتح و مفتوح ۴ر
بابک خرمی ۸ر
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب ۸ر
قیس و لبنیٰ ۴ر
یوسف و نجمہ ۸ر
زوال بغداد ۴ر

مینا بازار عہ
مقدس نازنین ۸ر
رومۃ الکبریٰ ۴ر
فلپانا ۸ر
فتو تین ملکہ ۸ر
منصور موہنا ۸ر
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز و ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو ۸ر
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دولہن عہ
بدر النساء کی مصیبت ۴ر
میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل عہ

شوق قدوائی

ترانۂ شوق ۸ر
قاسم و زہرہ ۱۲ر و عہ
نیرنگ جمال ۴ر

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۴ر
بہرام کی گرفتاری عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

شعلۂ رنگیں ۸ر
محاصرۂ پیرس عہ
شیخ چلی عہ
بہرام کی واپسی ۴ر
انقلاب فرانس ۸ر
حسن بنارس ۸ر

فطرتی جاسوس ۸ر
ٹرکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور ۸ر
زر پرست ۴ر
کنجی کا راز ۸ر
عبدالرحمٰن ناصر عا
عروس مصر عا
سیلاب خون ۸ر
سیاحت زمین ۴ر
سیاحت ہوا عہ
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر عا
اسرار بالشویزم ۴ر
درج لیلیٰ ۓ
امین بیگ عہ
حجاج بن یوسف ۴ر
یوسف پاشا ۸ر
انقلاب عثمانی ۴ر
بہرام کی رہائی ۴ر
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی سرگزشت ۴ر
لال کھٹور ۸ر
پراسرار قتل عا

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب ۓ
بزم خیال عہ
مشاطۂ سخن عہ
انتشار نسواں ۶ر
مکاتیب محسن الملک ۸ر

لیلیٰ مجنوں ڈراما ۸ر

مراثی

مراثی دبیر عا
مراثی انیس للعہ
مراثی ضمیر عہ
مراثی مونس ۱۲ر
مراثی دلگیر ۱۲ر

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن عہ
سوانح نظیر اکبرآبادی عا

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز ۱۲ر
کلیات عراقی ۱۲ر
دیوان حافظ ۸ر
دیوان بیدل ۸ر
دیوان عرفی ۱۲ر
کلیات جامی ۸ر
کلیات غالب ۸ر
کلیات صائب ۱۲ر
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی ۸ر
کلیات حزیں ۱۲ر
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر

دواوین اردو

کلیات ظفر ۱۲ر
کلیات مومن عہ

دیوان ناسخ عہ
کلیات میر ۸ر
کلیات سودا ۸ر
کلیات آتش ۸ر
کلیات نظیر اکبرآبادی عہ
گلزار داغ ۴ر
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۲ر
کلیات اسمٰعیل عا
مراۃ الغیب عہ
صنمخانۂ عشق عا
فریاد داغ ۴ر
دیوان قائل ۸ر
دیوان شہیدی ۴ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات
تصویر رنگین عہ
″ باتصویر سادہ للعہ
مجمع الفنون ۸ر
طلسم فرنگ عا
کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین ولیلی ۱۲ر
فریب حسن عا
سوزن عشق ۸ر
روز الیمبرٹ للعہ
ناول اسرار ۸ر
شام جوانی ۸ر
طلسمی فانوس ۱۲ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴



مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس نیا گاؤں لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

جلد ۲۱	فہرست مضامین جون سنہ ۳۲ء	شمارہ ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۶	جون سنہ ۴۲ء	جلد ۲۱

ملاحظات

عبدالماجد دریابادی بے نقاب

یہ عنوان ہے اس پمفلٹ کا جسے مولوی عبدالرحمان نگرامی مرحوم کی بیوہ اور عبدالماجد دریابادی کی مطلقہ خاتون نے شائع کیا ہے اور جو اس ماہ کی اشاعت میں تمام و کمال کسی جگہ نقل کر دیا گیا ہے۔

اس کے مطالعہ کے بعد قدرتاً دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عبدالماجد نے نکاح کیوں کیا اور دوسرے یہ کہ طلاق کیوں دی — سوال اول کا جواب، جو خود ان کی تحریر سے مستنبط ہو سکتا ہے یہ ہے کہ نکاح انھوں نے محض اس دوستی کی بناء پر کیا تھا جو عبدالرحمٰن مرحوم سے ان کو تھی، لیکن طلاق کا کوئی صحیح سبب متعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو تحریر عبدالماجد نے خاتون کے اعزہ کے نام روانہ کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص راز ہے جس کو وہ انھیں کی دل شکنی کے خیال سے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور جو تحریر اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کے نام بھیجی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی والدہ کے حکم سے مجبور ہو کر طلاق دی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ

طلاق کوئی ایسی بُری چیز نہیں کیونکہ خود رسول اللہ نے بھی بارہا طلاق دی ہے۔

اس لئے اب تحقیق طلب امر ایک تو یہ ہے کہ واقعی یہ نکاح بربنا ہمدردی کیا گیا تھا یا نہیں، دوسرے یہ کہ طلاق دینے کے جو مختلف و متضاد اسباب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط اور تیسرے یہ کہ اپنے اس مکروہ فعل کو جائز قرار دینے کے لئے جو تہمت عبدالماجد نے رسول اللہ کی ذات گرامی پر رکھی ہے اس کی کیا حقیقت ہے۔

امر اول :

خاتون نے جو تفصیلی داستان نکاح و طلاق کی بیان کی ہے اور جو واقعات انہوں نے تحریر کئے ہیں ان کے دیکھنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا کہ عبدالماجد کا اپنے آپ کو نکاح کے لئے پیش کرنا واقعی بربنا ہمدردی تھا اور اگر ہمدردی اسی کا نام ہے تو شاید ہی اس سے بہتر لفظ، شقاوت و بےرحمی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی اور مل سکے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ

——چونکہ عبدالماجد واقف تھے کہ وہ ایک ایسی عورت سے نکاح کر رہے ہیں جو ان کی پختگی عمر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جوان ہے، وہ اس کو بھی جانتے تھے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے مشکل ہی سے خاتون کے اعزہ نکاح پر راضی ہو سکیں گے، اسی کے ساتھ چونکہ ان کی سخاوت اپنے دوست کی بیوہ کے ساتھ اظہار ہمدردی میں ایک دن روپیہ سے زیادہ صرف کرنے کی بھی اجازت نہ دے سکتی تھی، اس لئے انھوں نے سمجھا کہ وہ ان تمام دشواریوں کے دور کرنے میں اگر کامیاب ہو سکتے ہیں تو صرف "روحانیات و اخلاقیات" کے نمائش سے۔ ورنہ یوں تو ظاہر ہے کہ ان میں کوئی خصوصیت ایسی نہ تھی کہ کوئی جوان العمر عورت اپنی زندگی کو ان کے جذبۂ "تیر افشانی" پر قربان کر دیتی —— چنانچہ انھوں نے "تقیا" کے ترکش کا وہ تیر جو بہت کم خالی جاتا ہے استوار کیا اور "گرامی مرحوم کے ایک سچے وفادار دوست" ہونے کی حیثیت سے اس شریف خاتون کے دل پر چلا ہی دیا، جس کا اخلاق اس مظاہرہ سے متاثر ہو جانا بالکل ناگزیر تھا——

پھر غریب خاتون صرف اس لئے متاثر نہیں ہوئیں کہ عبدالماجد نے غیر معمولی صداقت و خلوص کا اظہار کیا تھا بلکہ ان کے تاثر کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ واقعی عبدالماجد کو ان کی شکل و شمایل، قطع و برید، تحریر و تقریر سے بڑا "پہونچا ہوا" آدمی سمجھتی تھیں اور کبھی ایک لمحہ کے لئے ان کے دل میں یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ کھادی کا اتنا لمبا کرتہ پہننے والا، کھدر کی گاندھی ٹوپی کو پورے قلندرانہ انداز سے سر پر منڈھ لینے والا، فرط انکسار سے چلنے میں ہر وقت شکستہ چپل سے خاک بسر رہنے والا، بیشمار نمازیں پڑھنے والا، رمضان میں اپنے پیر کے پاس جا کر اعتکاف کرنے والا، رسول کے عشق میں ہر وقت آہیں بھرنے والا، اخلاق و انسانیت کے لئے مغرب و اہل مغرب کو ہمیشہ کوستے رہنے والا، بات بات میں قال اللہ و قال الرسول کی صدا اپنے خشک روزہ دار حلق سے نکالنے والا۔ کبھی کوئی حرکت ایسی کر سکتا ہے جو اسلامی عہد و پیمان، مذہبی صداقت و خلوص اور انسانی حمیت و غیرت کے خلاف ہو —— لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

لیکن ایک ماہ سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ چہرہ کا ملمع اترنے لگا، اخلاق کی جھوٹی قلعی سیاہی دینے لگی نمائش زہد و ورع کے صحیح خط وخال نمودار ہونے لگے، اور عبدالماجد کا بطون جسے انھوں نے خدا جانے کن کن ترکیبوں سے اس وقت تک چھپا رکھا تھا، اُن کی تلخ تحریروں سے، ان کی جھڑکیوں سے اور ان کی خشونتوں سے آخرکار خاتون پر کھلے بغیر نہ رہا ـــ اللہ اللہ، وہی شخص جو شادی سے قبل خاتون کے لئے یکسر لجاجت و انکسار تھا سراپا فدویت و عجز تھا، شادی کے صرف ایک ماہ بعد خاتون کی محبت بھری تحریروں کا جواب اس انداز میں دیتا ہے کہ "اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ہے - ہفتے میں ایک بار سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں، تمھارے خطوط کوئی تار تو ہوتے نہیں کہ فوراً جواب دیا جائے"!

حقیقت یہ ہے کہ تھیٹر میں کسی معمولی سے معمولی ایکٹر کے چہرہ کا غازہ بھی اتنی جلدی نہیں اترتا اور ایک بازاری بہروپیا بھی اپنے مصنوعی خط وخال کو اس قدر جلد دھو دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ **وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء!**

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ انقلاب، ایسا سریع انقلاب کیوں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ عزیزوں نے مخالفت کی ہو اور وہ مخالفت ناقابل برداشت ہوگئی ہو۔ ممکن ہے کہ عبدالماجد کی والدہ نے بھی زجر و توبیخ سے کام لیا ہو۔ لیکن یہ مخالفت وہی تھی جو نکاح سے قبل بھی پائی جاتی تھی اور والدہ کی برہمی بھی وہی تھی جس کی پروانہ کرتے ہوئے پہلے شادی رچائی گئی تھی۔ پھر اب شادی کے بعد اس مخالفت کا اثر کیوں قبول کیا گیا۔ اس برہمی کا رعب کیوں چھا گیا۔ کیا عبدالماجد کسی روایت، کسی اثر کسی قول اور کسی فقہی فتاویٰ کی کتاب سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ بیوی کو طلاق دینے کے لئے اعزہ کی مخالفت کافی وجہ ہو سکتی ہے ـــ اور پھر اسے بھی جانے دیجئے "آیئے تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ عبدالماجد نے طلاق محض مجبور ہو کر بادل ناخواستہ دی اور وہ خاتون سے بدستور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس صورت میں وہ اپنی ان تحریروں کی کیا تاویل کریں گے جن میں وہ غریب خاتون کو جھڑکتے تھے اور انکی محبت کا جواب اپنی بیزاریوں سے دیا کرتے تھے۔ کیا ان کی پرائیویٹ تحریروں پر بھی اُن کے اعزہ نے سنسر بٹھا دیا تھا اور کیا وہ پوشیدگی و علٰحدگی میں بھی خاتون کے ساتھ محبت و ہمدردی کا سلوک نہ کر سکتے تھے ـــ حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ جوش محبت جس کی بنا پر شادی کی گئی تھی نہ خلوص و ایثار سے متعلق تھا نہ پاس وفا و دستداری سے بلکہ وابستہ تھا اسی کیفیت سے جسے خود خاتون نے "نفس پرستی" سے تعبیر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ عبدالماجد کی عمر کا انسان اس جوش کو زیادہ سے زیادہ اُسے ایک ہی ماہ تک قائم رکھ سکتا تھا۔

جب تک ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تھی، نہ اعزہ کی مخالفت حارج ہوئی تھی نہ والدہ کی برہمی، لیکن جب جذبات سرد ہوگئے، مقصود نفس حاصل ہوگیا، اور چڑھی ہوئی اُتر گئی تو آنکھ کھلی، لیکن چونکہ اب کوئی،

"ناآسودہ تمنا" جوش کو قائم رکھنے والی موجود نہ تھی، اس لئے علیحدگی کے بہانے ڈھونڈھنے لگے، بات بات میں جھڑکنے لگے، یہاں تک کہ خاتون کو پہلے تو ترکیب سے سہارن پور بھیجدیا اور پھر اس کے بعد تحریری طلاقنامہ ——

اگر عبدالماجد نے واقعی یہ سب کچھ حالات خانگی سے مجبور ہو کر کیا تھا اگر وہ حقیقتاً" ان شدائد و مصائب کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو شادی کے سلسلہ میں رونما ہوئے۔ اور اگر ان کا خاتون کو علیحدہ کرنا فی الاصل اُن کی دلی خواہش کے خلاف تھا تو وہ بغیر طلاق دئے ہوئے بھی ان گتھیوں کو سلجھا سکتے تھے اور اگر طلاق بھی دی تھی تو اس کے بعد اپنی تحریروں سے، اپنی ہمدردیوں سے بہت کچھ تلافی خاتون کی دلشکنی کی کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ خاتون کی محبت بھری تحریروں کا جواب ایسے ظالمانہ و غدارانہ لب ولہجہ میں دینا اور اکیاون روپیہ مہر کی ذلیل رقم ادا کرنے سے قبل یہ مطالبہ کرنا کہ پہلے رسید بھیجدو —— گویا وہ ایک ماہ تک لطف مواصلت حاصل کرنے کا معاوضہ اکیاون روپیہ کو بھی زیادہ سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی بہانہ ملے تو وہ بھی نہ ادا کروں، دنیا اس رند بادہ خوار کو بُرا کہتی ہے جو شراب پیتا ہے اور کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ مگر ان پیران مکر پیشہ کی طرف سے بیخبر ہے جو شراب تو نہیں پیتے لیکن انسانوں کا خوں جن کے منھ لگا ہوا ہے۔ ہم اس تارک صوم و صلوٰۃ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھ کر تنہائی میں کبھی آنسو بھی بہا لیتا ہے، مگر ان زاہدان شب زندہ دار کے حال سے غافل ہیں جو نماز پڑھتے ہوتے ہیں۔ درانحالیکہ اُن کی بڑی بڑی آستینوں میں نفس پرستی و خود غرضی کے سیکڑوں بت چھپے ہوتے ہیں

عبدالماجد نے ۸ اور ۱۵ اپریل کے سچ میں مسئلہ طلاق پر جو گفتگو کی ہے اس کو اپنے پندار میں وہ ایسی مسکت، اس درجہ مدلل اور اتنا زبردست نتیجۂ تحقیق سمجھتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کے بعد گویا کسی کو یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ عبدالماجد کے اس فعل کو بُرا قرار دے۔ لیکن یہ بھی خدا کی شان ہے کہ ایک مجرم جس چیز کو اپنی صفائی میں پیش کرتا ہے وہ خود اس کے جُرم کا ثبوت بنجاتی ہے اور جو ہاتھ لکڑی کاٹنے کے لئے اُٹھتا ہے، وہ خود اُس کے پاؤں کو مجروح کر دیتا ہے۔

اگر سورۂ نساء میں واقعی خدا نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً

ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے رہو، اگر وہ تمھیں ناپسند بھی ہوں کیا عجب ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کر رہے ہو اور اللہ اسی میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔

اور اگر اسی ایت سے استنباط کرتے ہوئے احکام القرآن (ابن عربی) اور احکام القرآن للجصاص میں وہ عبارتیں پائی جاتی ہیں جنکا مفہوم یہ ہے کہ "بیوی کے ساتھ باوجود ناپسندیدگی کے بھی نباہ کرتے رہنا چاہیئے" تو ہمیں حیرت ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کا بڑا زبردست متبع سمجھتا ہے کیونکر طلاق دینے میں اس قدر جری ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ ناپسندیدگی

کی حالت میں بھی بیوی کو طلاق دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔
اگر حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے واقعی یہ حدیث پائی جاتی ہے کہ :۔

تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات

(یعنی نکاح کرو، اور طلاق نہ دیتے رہو، کیونکہ خدا لذت چکھنے والوں اور لذت چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔)

تو کیا عبدالماجد اپنے آپ کو اس "لذت چش" جماعت سے علیحدہ کر سکتے ہیں، جبکہ کوئی معقول وجہ خاتون کو علیحدہ کرنے کے ان کے پاس نہ تھی۔

اچھا اب آیئے "طلاق اور مابعد الطلاق" کے حالات پر غور کریں اور دیکھیں کہ عبدالماجد نے اس باب میں کس حد تک احکام خداوندی کی تعمیل کی ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اہلہ وحکما من اہلھا

(اور اگر تم لوگوں کو میاں بیوی کے درمیان رنجش کا اندیشہ ہے تو ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور دوسرا حکم بیوی کے خاندان سے مقرر کرو)

کیا جس وقت عبدالماجد کو اپنی بیوی کی طرف سے بیزاری پیدا ہوئی تھی، یعنی جس وقت اول اول ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو جلد جلد خط لکھنے پر ڈانٹ بتائیں، تو کیا انھوں نے باہمی مصالحت کے لئے آیت متذکرۂ بالا کی ہدایت کے موافق اپنے خاندان اور بیوی کے خاندان سے کوئی حکم مقرر کر کے شقاق کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔

سورۂ طلاق میں ارشاد ہوتا ہے :۔

اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن[1] واحصوا العدۃ واتقوا اللہ ربکم لا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ

(جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے زمانہ تک انھیں چھوڑ رکھو اور عدت کا شمار رکھو، خدا سے ڈرو اور ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، سوا اس صورت کے کہ وہ کوئی بات کھلی ہوئی بےحیائی کی کر بیٹھیں)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم

(یعنی ان کو اپنی حیثیت کے مطابق رہنے کا مکان دو اور نفقہ بھی ادا کرو کیونکہ فقہا نے "من وجدکم" میں نفقہ کو بھی شامل کیا ہے)

لیکن کیا عبدالماجد نے طلاق کے بعد ایام عدت بسر کرنے کے لئے خاتون کو اپنے گھر میں بلا کر رکھا اور اگر وہ وقت طلاق عبدالماجد کے گھر میں نہ تھیں تو کیا مطلقہ کا نفقہ انھوں نے ادا کیا۔ عبدالماجد نے اس سخت شرعی الزام کے دور کرنے کے لئے اپنے پیر کو تو سمجھا دیا تھا کہ "مصارف روانہ کئے جاتے ہیں"۔ لیکن غریب کو کیا خبر تھی کہ کسی وقت اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل

---

[1] "فطلقوھن لعدتھن" کا ترجمہ عبدالماجد نے کیا ہے "تو ان کی عدت سے پہلے طلاق دو" یہ ہے آپ کا مبلغ علم اور یہ ہے آپ کی عربی دانی۔

جائیگی ۔ اور خود خاتون اس امر کا اعلان کریں گی کہ عبد الماجد کا اپنے پیر کو یہ خبر دینا بالکل جھوٹ ہے اور انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی نفقہ کی صورت سے ادا نہیں کیا ۔

اب آپ خاتون کے پمفلٹ کو ایک بار پڑھکر تمام جزئیات پر نگاہ ڈال جائیے اور ملاحظات میں یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اسپر غور فرمائیے ۔ کیا دنیا کا کوئی شخص جس میں کچھ بھی عقل موجود ہے یہ کہہ سکتا ہے کہ عبد الماجد نے محض لذت نفس کے لئے شادی نہیں کی تھی اور کیا یہ طلاق اسی قسم کی طلاق نہ تھی جو " ذواقین " کی طرف اسے دیجاتی ہے

اب اس سلسلہ میں دو باتیں بحث کے قابل اور رہجاتی ہیں ، ایک تو یہ کہ جب خاتون نے علماء دیوبند سے خط و کتابت کی تو انھوں نے کیا جواب دیا اور دوسرے خود رسول اللہ کے طلاق دینے کے واقعات جنھیں عبد الماجد نے اپنے خطوط میں اور سچ کے صفحات میں بیان کیا ہے ۔

مولوی اشرف علی نے تو خیر اپنی مصلحت کوش فطرت کی بنا پر خاتون کی تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن مولوی حسین احمد صاحب کی اس تحریر سے جو عبد الماجد کے پیر بھی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں مجبور کرے تو بیوی کو طلاق دیدینا ضروری ہے ۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عبد الماجد کو بھی ان کی والدہ نے مجبور کیا تھا یا نہیں ، کیونکہ واقعات و حالات سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ عبد الماجد کی غرض تو نکاح و طلاق سے کچھ اور ہی تھی جس سے ان کی والدہ کی خوشی یا برہمی کو کوئی تعلق نہیں ۔ لیکن اصولاً یہ مسئلہ ضرور غور طلب ہے کہ ماں کے کہنے سے کسی شخص کے لئے کوئی نازیبا حرکت کرنا زیبا ہو سکتی ہے یا نہیں ۔ ہر چند اس کا جواب ہر شخص کا ضمیر خود دے سکتا ہے اور عقل انسانی آپ فیصلہ کر سکتی ہے کہ معصیت و ترک معصیت کا یہ فلسفہ کس حد تک قابل قبول ہے ۔ تاہم ایک سرسری نگاہ اسپر بھی ڈالنا ضروری ہے اسی کے ساتھ عبد الماجد نے رسول اللہ کے واقعات طلاق پر جو خامہ فرسائی کی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے ۔

عبد الماجد نے خاتون کو ایک تحریر میں لکھا تھا کہ :۔

> " رسول اللہ صلعم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہ کی طلاق واپس لی ہے ، باقی دو بیویاں ایسی ہوئی ہیں جس میں طلاق دیکر واپس نہیں لی ہے ، شرعاً یہ کوئی ایسی بُری بات نہیں

سچ میں عبد الماجد صاحب مسئلہ طلاق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> " حضور کا حضرت حفصہ کو طلاق دینا اور پھر اسے واپس لینا مشہور و معلوم واقعہ ہے ــــ ــــ اور خیر ام المومنین حفصہ رض کی طلاق تو آپ نے واپس بھی لے لی لیکن اُن کے علاوہ حضور نے کم از کم دو بیویوں کو بھی طلاق دی ہے جو قائم رہی اور واپس نہیں لیگئی ایک کا نام عمرہ بنت یزید کلابیہ اور دوسری کا اسماء بنت نعمان کندیہ تھا "

اس بیان سے عبد الماجد کے تحقیق کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ :۔

۱ ۔ رسول اللہ نے جناب سودہ کو طلاق دی اور واپس لی ۔ (۲) رسول اللہ نے جناب حفصہ کو طلاق دی اور واپس لی ۔

۴- رسول اللہ نے عمرہ بنت یزید اور اسماء بنت نعمان کو طلاق دی اور واپس نہیں لی۔

سچ میں اُنھوں نے جناب سودہ کی طلاق کا ذکر کہیں نہیں کیا بلکہ صرف اپنے خط میں جو خاتون کے نام بھیجا گیا تھا ذکر کیا ہے۔ بہرحال اب گفتگو ہمیں حسب ذیل مسائل پر کرنا ہے:-

۱- ماں کے کہنے سے ایک شخص کا اپنی بیوی کو طلاق دیدینا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

۲- رسول اللہ صلعم نے امہات المومنین وازواج مطہرات میں کسی کو طلاق دی یا نہیں۔ اور اگر دی تو کن حالات کے ماتحت اور اُسکو اب کوئی شخص استشہاد میں پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔

ان مسائل پر تفصیل کے ساتھ آئندہ ماہ کے نگار میں گفتگو کریں گے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ سچ کا پرچہ نمبر ۱۹ مجھے موصول ہوا۔ اس میں عبد الماجد نے خود اپنے واقعہ نکاح وطلاق کو سامنے رکھکر ایک ضمیمہ بھی اُس مضمون طلاق کا شایع کیا ہے جو سچ نمبر ۱۴ و نمبر ۱۵ میں نکل چکا ہے۔ عبد الماجد مطمئن رہیں کہ آئندہ ماہ کے نگار میں اصل وضمیمہ دونوں کو سامنے رکھ کر گفتگو کرونگا اور ان کی کوئی دلیل ایسی نہ ہوگی جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

اسی سچ نمبر ۱۹ میں اُنھوں نے ایک مختصر سا مقالہ بعنوان "بارگاہ نیاز میں" نگار ماہ مئی کے ملاحظات کو دیکھ کر سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس مقالہ میں عبد الماجد ایک طرف یہ بھی لکھتے جاتے ہیں کہ وہ میری تحریروں کا کوئی جواب نہ دیں گے، لیکن اسی کے ساتھ پورا اسوا کالم سیاہ کرنے کے بعد بھی مطمئن ہوتے نظر نہیں آتے۔ کیا ایک "پیشہ ور افسانہ نویس" کے مقابلہ میں جب ایک "پیشہ ور نمازی" جواب دینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو کیا اسی طرح کی مذبوحی حرکات اس سے سرزد ہونے لگتی ہیں۔

عبد الماجد نے اپنی ذات کو کیوں اس قدر اہم سمجھ لیا ہے کہ میں انکے متعلق کوئی مضمون لکھ کر اپنا وقت ضائع کرونگا مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا اسلام میں کسی عورت کو نکاح کر کے بلا وجہ چھوڑ دینا ایسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی ہے جیسی عبد الماجد ظاہر کر رہے ہیں، یا حقیقت اسکے خلاف ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں عبد الماجد کا نام بار بار آنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم کو ایک طلاق دینے والے کی حیثیت سے پیش کر کے اپنے فعل طلاق کو جائز قرار دینے کی جرارت وگستاخی انھیں کی طرف سے ہوئی ہے۔

سچ نمبر ۱۹ کے صفحہ ۲ پر صوبۂ اودھ کے کسی وکیل کے خط کا اقتباس دیا گیا ہے جسمیں مولانا اسلم جیراجپوری کے ایک مضمون "حجر اسود" کا حوالہ دیتے ہوئے انکی گستاخانہ انداز تحریر کی شکایت کی گئی ہے۔ عبد الماجد صاحب مکتوب نگار کی حمیت دینی کو سراہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جناب اسلم جیراجپوری کی عام بیباکیوں اور گستاخ نگاریوں کے پردے ان صفحات میں بارہا فاش کئے جا چکے ہیں" میں سمجھا تھا کہ عبد الماجد کا جوش دینی یہ سنکر ابل پڑے گا اور جس طرح انھوں نے نگار کے مقالات کو کچھ اپنی کم علمی وکم فہمی کی بنا پر اچھی طرح نہ سمجھکر اور کچھ محض انتقاماً عبارتیں مسخ ومجروح کرنے کے بعد پروپاگنڈا کیا تھا، اسی طرح مولانا اسلم جیراجپوری کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیں گے۔ لیکن وہ تو "ایک آہ" بھر کر رہ گئے۔

اس موقعہ پر غالب کا ایک مشہور لطیفہ یاد آگیا کہ ایک مرتبہ غالب کے اس مصرعہ پر "بہ وادئی کہ دراں خضر را عصا خفت ست" امام بخش صہبائی نے اعتراض کیا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ میرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا اس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا جو یہ کہہ گیا ہے کہ

"دلے بہ حملۂ اول عصائے شیخ بخفت"

نیاز

ایثار

فسانہ

ایک صدی بلکہ اس سے بھی پہلے کا واقعہ ہے۔ جب معاشرت و تہذیب کے اصول یہ نہ تھے اور دنیا کچھ اور تھی ——— گرجا کا گھنٹہ باقاعدہ وقفہ کے ساتھ اپنی حزین و دردناک آواز بلند کر رہا تھا، لوگ جوق در جوق چلے جا رہے تھے، دکانیں بند ہو رہی تھیں مکان مقفل کئے جا رہے تھے۔ اور قصبہ کی ساری چہل پہل سمٹ کر اُس ایک عمارت کی طرف منتقل ہو رہی تھی جو آبادی سے کچھ دور بلندی کے اوپر قائم تھی ——— یہ بہت قدیم گرجا تھا۔ اور جو روایات قرب و جوار میں اس کے متعلق مشہور تھیں وہ بہت عجیب و غریب تھیں، چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ اس گرجا کے پادری ہمیشہ ولی ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ صحیح معنے میں عیسیٰ کی تعلیمات کا درس دیا ——— جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت بھی یہاں کا پادری اس حیثیت سے سارے قصبہ میں مشہور تھا۔ اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے، حالانکہ ابھی وہ بالکل نوجوان تھا۔

سپاہیوں کا ایک دستہ ہاتھوں میں ترسول نما بلم لئے ہوئے گزرا، تماشائی سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے اور اس جلوس کو دیکھنے جو گورنر کے گزرنے کے وقت ہمیشہ ترتیب دیا جاتا تھا ——— یہ بھی گرجا جا رہا تھا ——— تھوڑی دیر کے بعد گورنر جو ایک ضعیف العمر لیکن قوی الاعضا انسان تھا، ہات میں عصائے حکومت اور کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے گزرا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا کہ کوئی مکان کھلا ہوا تو نہیں ہے، کوئی لہو و لعب میں تو مصروف نہیں ہے۔ کیونکہ عبادت کے دن اُس زمانہ میں کھیلنا اتنا ہی معیوب تھا۔ جتنا اس وقت کھیل کے وقت کسی کا سنجیدہ بن جاتا ———

(۲)

للی نے بھی گھنٹے کی آواز سنکر گرجا جانے کی تیاری شروع کی، وہاں کا خاص ملبوس نکالا، آئینہ کے سامنے اس کی غمگنیں دور کرنے لگی اور بالوں میں ڈالنے لگی ——— آئینہ ٹھیک اس کھڑکی کے محاذ میں لگا تھا۔ جو سڑک کی طرف کھلتی تھی، آفتاب کی شعاع نے کھڑکی کی راہ سے آئینہ پر اپنی روشنی ڈالی اور اُس کا عکس کھڑکی سے ہو کر سڑک پر پہونچا، جہاں اس وقت گورنر گزر رہا تھا ——— اُس کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور وہ اسی جگہ ٹھیر کر دیکھنے لگا کہ یہ کس کا مکان ہے جس کی کھڑکیاں ابھی تک بند نہیں ہوئیں اور وہ کون ہے جو گرجا جانے کے لئے باہر نہیں نکلا ——— للی آئینہ کے سامنے سے ہٹ کر کناری (چڑیا) کے پنجرہ کے پاس گئی، ہاتھ ڈال کر نکالا، اور اس کے سر پر نرم نرم ہاتھ پھیر کر اس کی چونچ اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر پیار کی باتیں کرنے لگی ———

وہ چاہتی تھی کہ پھر پنجرہ میں ہاتھ ڈالکر اپنے بند کردے کہ گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اور چڑیا کھڑکی سے باہر اُڑ گئی ــــــ لِلّی بیتابانہ دوڑی، باہر جھاڑیوں میں ادہر اُدہر ڈھونڈھتی پھری، شاخوں سے ٹکرائی، کانٹوں سے دامن اُلجھایا، گری پڑی، لیکن وہ ناشکر گزار شریر چڑیا ہاتھ نہ آئی ــــــ گورنر نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اور غضب آلود چہرہ لئے ہوئے اپنے نائب سے یہ کہتا ہوا گزر گیا کہ "عبادت کے دن یہ لہو ولعب ہرگز معافی کے قابل نہیں ہے"۔ ایک سپاہی نے بڑھ کر دروازہ پر صلیبی نشان سفید کھریا سے بنایا۔ اور سب لوگ گزر گئے۔ لِلّی بدستور اسی الجھن میں گرفتار ہوئی۔ اور گرجا کا گھنٹہ سنکر چونک پڑی۔ یہاں تک کہ گھنٹہ کی آواز بند ہوگئی۔ یہ خموشی گویا اس امر کا اعلان تھا کہ اب انتظار کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ لِلّی نے گھبراکر چڑیا کی جستجو ترک کی اور بھاگتی ہوئی گرجا کی طرف چلی۔ قصبہ میں سناٹا تھا، سڑکیں خالی پڑی تھیں، گرجا کے سامنے دو سپاہی گورنر کے باڈی گارڈ کے مسلح کھڑے تھے۔ اور دروازہ بند تھا، لِلّی نے ڈرتے ہوئے، سہمتے ہوئے، کانپتے ہوئے، ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور اس طرح دبے پاؤں چلی جیسے وہ چوری کرنے جارہی ہو ــــــ

کلیسا کا درمیانی ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور نوجوان راہب انجیل مقدس ہاتھ میں لئے ہوئے وعظ کہہ رہا تھا ــــــ لوگ نہایت خلوص وصداقت کے ساتھ اس کی آسمانی باتوں کو سُن رہے تھے ــــــ لِلّی قریب کی بنچ پر ایک جگہ خالی دیکھ کر آہستگی سے بیٹھ گئی، لیکن راہب نے جس کی نگاہ دروازہ میں داخل ہوتے ہی اس پر پڑ چکی تھی، لِلّی کی طرف اشارہ کرکے بآواز بلند حکم دیا کہ "یہ لڑکی سامنے لائی جائے"۔

لِلّی نازک اندام لِلّی، اکہری بیل کی طرح ذرا سے جھٹکے سے تھرتھرا جانے والی لِلّی کانپتی ہوئی آگے بڑہی اور اشک آلود آنکھوں سے راہب کی طرف دیکھنے لگی ــــــ

لِلّی اُن لڑکیوں میں سے تھی، کہ اگر ان کے اعضا پر علیحدہ علیحدہ نگاہ ڈالی جائے تو وہ معمولی سی زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی دلکشی ناقابل انکار ہوتی ہے ــــــ قصبہ کے اندر اسی سن وسال، اسی قد وقامت، اسی نقشہ وساخت کی بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جنھیں راہب نے دیکھا ہوگا لیکن لِلّی بالکل پہلی لڑکی تھی جس کی طرف سے جلد نگاہ پھیر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ برابر ٹکٹکی باندہے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ اپنے تمام جسم کے ساتھ اس کے دل میں سمائی جارہی ہے ــــــ کتابی چہرہ، باریک کترا ہوا نقشہ، پنکھڑی سے ہونٹ، رسیلی آنکھیں جن میں اس وقت آنسوؤں نے اور بھی موتی کوٹ کر بھر دئے تھے، یہ سب وہ باتیں تھیں، جنھوں نے اسکی رعنائی، فطری دلکشی اور موسم شباب کے ساتھ مل کر، مقدس راہب کو بھی کچھ دیر تک یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ "کیا قانون کی گرفت سے ایسا معصوم حسن بھی آزاد نہیں ہوسکتا"۔

ــــــ اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑا، اس کا تقدس کانپ اٹھا۔ اور بہ مشکل اس نے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹا کر بآواز بلند کہا کہ "بیشک جو گناہ کرے گا اس کو سزا دی جائے گی، عبادت کے دن کھیل کود میں مصروف رہنا۔ کلیسا کا دروازہ بند ہوجانے کے بعد اس کو کھٹکھٹانا، جرم ہے اور خدا اس گستاخی کو معاف نہیں کرے گا"

---- راہب یہ کہہ کر منبر سے اُتر آیا، انجیل بند کرکے میز پر رکھدی اور ایک کونہ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

(۳)

شاہراہ پر، نازک اندام لِلی کے نازک ہاتھ پاؤں ایک کاٹھ میں ڈال دیئے گئے تھے۔ جس پر یہ اعلان کندہ تھا کہ:

"یہ ہے سزا اُس کی جو عبادت کے دن، عبادت سے منھ چرائے"

عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، جوان سبھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔ اور اس کو دیکھتے جاتے تھے، لیکن کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کے لبوں کو، جو تمازت آفتاب کی وجہ سے خشک ہو رہے تھے، پانی سے تر کردے، اس کے بال پریشان تھے، لباس بے ترتیب تھا، چہرہ زرد اور آنکھیں اشک آلود تھیں، وہ دل ہی دل میں سخت محجوب و منفعل تھی، کہ کیوں اس نے ایک بے وفا چڑیا کے لئے مذہبی قانون کا پاس نہیں کیا۔ اسی حال میں گھنٹوں گزر گئے۔ اور اس کی حالت شدت تشنگی سے متغیر ہونے لگی ----

یہ وہ وقت تھا جب راہب گرجا سے نکل کر لوگوں کی تیمار داری، مزاج پرسی اور مذہبی تلقین کے لئے نکلا کرتا تھا ---- ہر چند وہ اُس لمحہ کو نہیں بھولا تھا۔ جب لِلی ایک گناہ گار کی حیثیت سے اس کے سامنے لائی گئی تھی اور جب خود اس کے دل میں اوّل اوّل تاویل گناہ کا جذبہ پیدا ہوا تھا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ لِلی کہاں اور کس عالم میں ہے۔ وہ اسی خیال میں منہمک سڑک سے گزر رہا تھا۔ کہ دفعتاً اس کی نگاہ ایک ہجوم کی طرف گئی اور جب وہ قریب پہونچا تو معلوم ہوا کہ لوگ لِلی کی بے بسی و بے کسی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں ---- وہ بیتابانہ، بے اختیارانہ آگے بڑھا، اس کی نڈھال گردن کو ہات پر سنبھال کر پانی پلایا اور پھر اس کے ہات پاؤں کاٹھ سے نکال کر گھر تک پہونچانے گیا ---- لوگوں نے دیکھا اور کہا "راہب کس قدر رحم دل ہے ---- وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے ایک گنہگار سے بھی وہی محبت ہے جو اوروں سے"----

لوگ اپنی اپنی راہ چلے گئے اور لِلی، راہب کی معیت میں اپنے گھر پہونچی، جہاں اس کا گم شدہ طائر پنجرہ پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا ---- لِلی نے بڑھ کر اس کو پکڑ لیا، پیار کیا اور تمام وہ مصائب بھول گئی جن میں گھنٹوں مبتلا رہی تھی ---- اس نے مسکرا کر راہب سے کہا "میں گرجا دیر میں گئی تو وہ سب کچھ ہوا جس کے خیال سے ایک انسان کو شرم کرنا چاہئے۔ لیکن میں اس چڑیا کو باوجود اس کے کہ اسی نے مجھے ذلیل و رسوا کیا، پیار کرتی ہوں ---- اے راہب، مجھے بتا کہ انسان کے دل میں انتقام کا جذبہ کون پیدا کرتا ہے ---- کیا خدا ایسا کرتا ہے، مجھے اس کا یقین نہیں"

راہب جو لِلی کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش کو اپنے دل و دماغ میں منقوش کرتا جا رہا تھا۔ یہ سنکر بیتاب ہوگیا اور جب اس نے دیکھا کہ زیادہ قیام اسے بالکل بے قابو کردیگا، تو اس نے سر جھکا کر ---- "ہاں ----" کہا اور فوراً دروازہ سے باہر نکل کر چلا گیا ----

(۴)

چند دن گزر گئے لِلی تنہا زندگی کے مشاغل معیشت میں مشغول رہی۔ اور راہب گرجا کے اندر صرف اس کوشش میں

کہ وہ للّی کے خیال کو کیونکر اپنے دل سے نکالے اس نے رات دن انجیل اپنے سامنے کھلی رکھی، گھنٹوں مسیح کے بت کے حضور میں التجائیں کیں، دعائیں مانگیں، کہ وہ اُس عہد پر استوار رہے جو اس نے دس سال قبل ملک کے سب سے بڑے گرجا میں کیا تھا ——— اور جب اس نے ایک نوع کا سکون محسوس کر لیا تو پھر باہر نکلا۔ وہ انجیل ہات میں لئے، جھاڑیوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اُسے ایک لڑکی کی جھلک نظر آئی جو چشمہ پر کپڑے دہو رہی تھی ——— یہاں کا ایک قانون یہ بھی تھا کہ کوئی عورت اپنے چھوٹے کپڑے نہ علانیہ دھو سکتی تھی، نہ کسی کو دکھا سکتی تھی ——— راہب کو خیال آیا کہ ممکن ہے کوئی عورت اس قانون کو توڑ رہی ہو، اس لئے وہ آگے بڑھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی للّی ہے اور حقیقتاً قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے ——— راہب بڑھا اور للّی اس کو دیکھ کر گھبرا گئی، کپڑا دونوں ہاتھوں سے پشت کے پیچھے چھپا لیا۔ اور حد درجہ معصومانہ انداز سے اس کو دیکھنے لگی ——— وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی تھی۔ اور راہب سب سے زیادہ اوسکی اسی ادا سے گھبراتا تھا، کیونکہ اس کی ہر نگاہ اس کے لئے ایک ایسا مہلک پیام تھی کہ مشکل ہی سے وہ اس کا مقابلہ کر سکتا تھا ——— وہ کبھی ایسا محسوس کرتا کہ للّی کی آنکھوں سے سیاہ پردار شعلے نکل نکل کر سیدھے اعماق قلب تک پہونچ رہے ہیں۔ اور کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زبردست سیلاب میں اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ للّی نے اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا ہو اور اس کے جسم میں سنسنی سی نہ پیدا ہوئی ہو ——— اس نے للّی کی طرف سے نگاہ ہٹا کر کہا "للّی، مجھے دکھا دو یہ کون سا کپڑا ہے" ——— للّی برابر دیکھتی رہی اور کپڑا اسی طرح چھپائے رہی ——— راہب نے اس کی کلائیاں اپنے ہات میں لے کر کہا "کیا تم نہیں دکھاؤ گی" ——— للّی کے اعصاب، حسین راہب کے گرم ہاتھوں کے مس سے ڈھیلے پڑ گئے۔ اور اس نے بے اختیارانہ وہ کپڑا سامنے کر دیا جسے وہ چھپائے ہوئے تھی ——— یہ اسی کی چھوٹی قمیص تھی جو رات کو استعمال کی جاتی ہے ——— راہب کا خیال فوراً اس قمیص کو دیکھ کر للّی کے اس مینائی جسم کی طرف گیا جس سے وہ مس ہوتا رہتا تھا، اور صحیح معنے میں وہ ہیجانی کیفیت پیدا ہونے لگی جس کی حکومتِ میکدہ و خانقاہ دونوں جگہ یکساں ہے، اس نے بے اختیارانہ للّی کی دونوں کلائیاں اپنی طرف کھینچنی شروع کیں، اور للّی جسے راہب کے حسن و شباب نے پہلے ہی دن اپنا بنا لیا تھا، اس کی طرف اس طرح کھنچنے لگی جیسے گھاس کا تنکا کہربا کی طرف کھنچتا ہے ——— چہرے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، آنکھیں باہم تبادلۂ صہبا میں مصروف تھیں۔ اور مرتعش لبوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا کہ دفعتہً راہب چونکا اور اس نے فوراً للّی کے دونوں ہات چھوڑ کر، منہ موڑ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا چلا کہ "للّی، دیکھو تم قانون و مذہب کی مخالفت نہ کرو، جاؤ اس کپڑے کو کہیں چھپا دو پھر دوبارہ ایسی جرأت نہ کرنا" ———

للّی، جس کی بیتابی کا وہی عالم تھا جیسے کسی کے خشک لبوں تک لا کر جام ہٹا لیا جائے، راہب کے پیچھے دوڑی اور سامنے جا کر اس کو روک لیا ——— اس نے منہ پھیر کر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہا کہ للّی پھر سامنے آگئی ——— راہب نے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو"؟ للّی نے کہا صرف یہی کہ میں اسی طرح گناہ کرتی رہوں اور تم اسی طرح مجھے سزا سے ڈراتے رہو" ——— اس مرتبہ للّی نے راہب کی کلائیاں پکڑ لیں اور اس نگاہ سے اس کی طرف دیکھا، جس کا جواب سوائے اس کے کوئی نہ ہو سکتا تھا کہ آنکھ بند کر کے اس کی قوت کا اعتراف کر لیا جائے۔

راہب کے لب پہلے للی کی آنکھوں تک، پھر اس کے لبوں تک اور وہاں سے اس کی مرمریں لانبی گردن تک پہونچے اور اس کو اپنی آغوش میں کھینچ کر آخر کار اس نے، اس کے قلب و روح نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اگر عبادت کسی لذت روحانی کے لئے کی جا سکتی ہے تو گناہ سے زیادہ عبادت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(۴)

مہینوں گذر گئے اور کوئی قابل ذکر واقعہ ان دونوں کی زندگی میں پیش نہیں آیا ـــــــ ایک بار رات دن میں دونوں کو مل کر تھوڑی دیر بات کر لینا لازم تھا۔ اور ان پوشیدہ ملاقاتوں کی لذت سے دونوں اپنی اپنی جگہ سرشار رہتے تھے ـــــــ

ایک دن صبح کو راہب بہت خوش خوش للی کے گھر آیا۔ اور بولا کہ میں گورنر کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں ـــــــ للی نے گھبرا کر اسے دیکھا اور جدائی کے خیال سے پریشانی اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگی ـــــــ جس کو محسوس کر کے راہب نے کہا کہ " میں تنہا نہیں جاؤں گا، بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہوگی۔ اور آج ہم تم دونوں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو جائیں گے "

یہ سن کر للی کا وہ عالم ہوا جیسے اس پر بجلی گری ہو اور راہب کی آغوش سے علیحدہ ہو کر اس طرح سہمی ہوئی پیچھے کی طرف ہٹنے لگی جیسے اس کے جسم کا اتصال جلائے دے رہا ہے ـــــــ راہب متحیر ہو گیا۔ اور مطلقاً نہ سمجھ سکا کہ شادی کے ذکر سے للی پر یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی ـــــــ اس نے پوچھا، بار بار پوچھا کہ کیا تم شادی پر آمادہ نہیں ہو اور للی نے آخر کار کہہ دیا کہ " نہیں، میں شادی نہیں کر سکتی " اور بکس سے نکال کر وہ انگوٹھی دکھا دی جو اس سے قبل رسم ازدواج کے وقت اس کے ہات میں پہنائی گئی تھی، اس نے کہا کہ " چند سال ہوئے، میرے والدین نے میری مرضی کے خلاف ایک ڈاکٹر سے شادی کر دی تھی، جو مجھے یہاں لے آیا تھا، لیکن چند مہینے رہنے کے بعد وہ کسی کام سے دوسرے شہر گیا۔ اور پھر وہاں سے واپس نہیں آیا۔ اور نہ اس کی کوئی خبر معلوم ہوئی ـــــــ یقیناً تم مجھے ملامت کرو گے اور میں اس کی مستحق ہوں، مگر میں نے تم پر یہ حال اس خوف سے ظاہر نہیں کیا کہ شاید تم ملنا چھوڑ دو اور اس کو میں کسی طرح برداشت نہ کر سکتی تھی "

راہب دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اور پھر حد درجہ سوگوار و مایوس حالت میں اٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس نے للی کو ملامت نہیں کی، اس نے برہمی کا اظہار نہیں کیا، لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ زندگی میں شاید یہ پہلا موقعہ اس کے لئے اس قسم کی تکلیف کا پیدا ہوا ہے۔ وہ دیر تک سر پکڑے بیٹھا رہا اور پھر دفعتاً اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

(۵)

تین ماہ بعد ـــــــ صبح کا وقت ہے۔ گورنر کے مکان کے سامنے جو میدان ہے آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، سپاہی وردیاں پہنے میدان کے اس حصہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ جہاں ایک بلند چبوترہ پر سولی قائم کی گئی ہے ـــــــ گورنر بالاخانہ پر مع سرداروں کے بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف ہے۔ اور اس وقت کا منتظر ہے کہ مجرم کو سولی کے چبوترہ تک زنداں سے نکال کر

لایا جائے ــــــ تھوڑی دیر بعد اس کو خبر معلوم ہوتی ہے کہ راہب بادشاہ کے پاس سے واپس آرہا ہے۔ اور گورنر صد درجہ مسرت کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے ــــــ راہب اندر داخل ہوتا ہے اور اپنی کامیابی کی خوشخبری سناتا ہے، لیکن قبل اس کے کہ وہ مفصل گفتگو کرے، گورنر اس سے کہتا ہے کہ "تمہارا اس وقت آنا بہت برمحل ہوا ہے، کیونکہ ایک مجرم سولی پر چڑھایا جانے والا ہے اور ضرورت تھی کہ پہلے اس سے تفصیل جرم معلوم کی جائے، کیونکہ حسب قانون اس کے ساتھ کسی اور کو بھی اس سزا میں شریک ہونا ضروری ہے" ــــــ اسی وقت نیچے میدان میں ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور راہب نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا تو حیرت سے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا ــــــ اس نے دیکھا کہ سپاہی للی کو کشاں کشاں لئے آرہے ہیں اور اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ بھی ہے جو گھڑی گھڑی ہمک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کی گردن سے چمٹا جا رہا ہے ــــــ تمام واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے، اور یہ دیکھ کر کہ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا کے سامنے اس کا مکردہ باطن بے نقاب ہو اس کا دل کانپنے لگا ــــــ وہ بے اختیارانہ وہاں سے دوڑا۔ اور مجمع کو چیرتا ہوا کسی نہ کسی طرح للی کے پاس پہونچا۔ چلا تو وہ اس جذبۂ بے اختیار سے تھا کہ جاتے ہی اس کو اپنی آغوش میں لے لیگا۔ اور سب پر اصل راز کو ظاہر کر دے گا، لیکن وہاں پہونچکر پھر اسے اپنے راہبانہ تقدس کا خیال آیا اور اس نے اپنی اسی شفقت کے ساتھ جو ہر شخص پر صرف ہوتی تھی۔ للی کی طرف توجہ کی ــــــ وہ اس وقت چبوترہ پر پہونچ چکی تھی۔ اور اس سے دریافت کیا جا رہا تھا کہ وہ اس بچہ کے باپ کا نام بتائے تاکہ اُسے بھی اسی کے ساتھ سولی پر چڑھا جائے۔ لیکن وہ ساکت و خاموش تھی، اور کسی طرح اپنی گود سے اس بچہ کو علیحدہ نہ کرتی تھی جسے سپاہی چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

راہب دوڑتا ہوا۔ للی کے پاس گیا تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ راہب کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ احساس کی یہ اولین کیفیت دور ہونے کے بعد، راہب نے اشاروں ہی اشاروں میں للی سے کہا کہ اب حقیقت کے چھپانے کا وقت نہیں ہے، لیکن للی نے اسی ایثار سے کام لے کر جو ایک محبت کرنے والی عورت کی زندگی ہے۔ اس کو منع کیا کہ وہ اپنے وقار و احترام کو صدمہ نہ پہونچائے ــــــ راہب نے کہا " اے للی اگر تجھ سے محبت کرنا واقعی کوئی گناہ تھا، تو اس سے زیادہ ثواب کا کام دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا اعتراف کروں "

لیکن للی اس پر راضی نہ ہوئی، اس نے کہا کہ " اس وقت تک ہم نے اپنے تعلق کو جس طرح چھپایا وہ یقیناً ایک بڑا جھوٹ تھا جو ہم نے دنیا کے سامنے بولے، لیکن اس "جھوٹ" کے بعد اب ایسا سچ بولنا جس سے تین جانیں ہلاکت میں پڑ جائیں، اُس جھوٹ سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے "

راہب کے سامنے اس وقت سوال اپنے تقدس کے حفاظت کا نہ تھا۔ بلکہ للی اور اس کے معصوم بچہ کا تھا ــــــ اس نے دل میں کہا " اگر دنیا میں ایک بار جھوٹ بولنے کے بعد، انسان ساری عمر جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جائے تو یہ اس کے جرم کی پاداش ہے اور یہ سزا اُسے بھگتنا چاہئے " ــــــ وہ یہ سوچ کر گورنر کے پاس گیا اور کہا کہ " خدا کے احکام کے مطابق اس عورت کو

افریقہ کے کسی ساحل پر حدود مصر کے قریب پہونچ گئی۔ اور یونانی نوجوانوں کی یہ جماعت یہیں اتر پڑی، انھوں نے یہاں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام سیرینا رکھا۔ اور اس طرح گویا ایک جدید سلطنت یونانی کا تخم انھوں نے بو دیا۔ یہ واقعہ ۶۲۱ سال قبل مسیح کا ہے۔

اس جماعت نے ارسطو کو اپنا بادشاہ تسلیم کرکے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اور باتوس اس کا نام رکھا۔ الجی گول نے ارسطو سے یہ بھی درخواست کی کہ اب وہ شعر و شاعری ترک کرکے ان کے لئے قوانین وضع کرے۔

لیکن یہ بادشاہ شاعر اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہا۔ اور جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے لوگوں کو جمع کرکے کہا کہ

> " اے عزیزو، میں نے ایک خواب دیکھا ہے، اسے سن لو، میں نے دیکھا کہ دیوتا ابولون دفعتاً مجھ پر ظاہر ہوا۔ اور میرے ہاتھ میں ایک سبز شاخ دے کر بولا کہ اے ارسطو اب تو جلد مرنے والا ہے، اور جس سلطنت کی بنیاد تو نے ڈالی ہے وہ یونانیوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے سب کو جمع کرکے اطلاع دیدو کہ حکومت سیرینا ان کے ہاتھ سے نکل کر اہل روما کے پاس جائے گی، پھر اس پر ایک شرقی عربی حکومت قابض ہوگی، اس کے بعد دوسری شرقی حکومت کے اقتدار میں چلی جائے گی، پھر تیسری شرقی حکومت کا تصرف قائم ہوگا۔ اس کے بعد پھر چوتھی شرقی حکومت کا زمانہ آئے گا ——— چنانچہ یہ پیشین گوئی جو خواب میں مجھ کو بتائی گئی ہے، تمام و کمال تم کو سنائے دیتا ہوں "

ارسطو یہ خواب بیان کرکے مرگیا۔

ارسطو کے بعد زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ اہل روما کی فتوحات تمام عالم پر ایک سیلاب کی طرح بڑھنے لگیں۔ اور افریقہ کی سلطنت سیرینا بھی ان کے ہاتھ آگئی۔ اہل روما کے زمانہ میں اس سرزمین نے جس میں ترقی کی وہ اہل نظر سے مخفی نہیں

اس کے بعد اہل روما کا جب زوال شروع ہوا تو بازنطینی حکومت نے جو شرق و غرب کے گوشہ میں قائم تھی۔ اس پر قبضہ کیا، لیکن یہ قبضہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔ اور عربوں کی فوجوں نے تمام افریقہ، مصر، سیرینا، ٹیونس، الجزائر، مراکش اور اندلس پر پرچم اسلامی لہرادیا ——— یہ دوسری پیشین گوئی تھی۔ ارسطو کی جو صحیح نکلی۔ عربوں نے اس پر قابض ہوکر اس کا نام قیروان رکھا تھا۔

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت وسیع ہوئی تو عربوں کی جگہ انھوں نے لے لی۔ اور قیروان ولایت عثمانیہ میں شامل ہوگیا۔ یہ تیسری پیشین گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت ضعیف ہوئی تو اطالیہ نے طرابلس الغرب کے نام سے اپنی نوآبادی قائم کرنا شروع کی اور چاہا کہ سیرینا یا قیروآن میں پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت قائم کریں۔ چونکہ دولت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اطالیہ کی اس خواہش کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اور قیروآن کو خود وہیں کے باشندوں کے سپرد کر کے واپس آگئی۔

ہرچند اس کے بعد کامل دس سال تک اہل قیروآن نے حکومت اطالیہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار وہاں اطالوی اثر قائم ہو ہی گیا۔ اور اس طرح یہ چوتھی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ تیسری بار مشرقی حکومت کے بعد پھر اہل روما کی حکومت وہاں ہوگی۔

اب صرف آخری پیشین گوئی باقی رہ گئی ہے کہ اہل روما کے پاس سے پھر یہ سلطنت کسی مشرقی حکومت کے پاس جائے گی۔ اب دیکھئے کہ یہ مشرقی حکومت کون ہے؟

نیاز

شمیم

جناب فیاض علی صاحب بی۔ اے (علیگ) کا مشہور ناول جس میں جذبات فطری کی عکاسی معاشرت حاضرہ کی مصوری۔ نفسیات وحیات انسانی کی نقاشی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ زبان کی حلاوت۔ انداز بیان کی لطافت تحریر کی شوخی آمیز سنجیدگی۔ اور خیالات کی دل آویز ندرت کے لحاظ سے یہ ناول آپ اپنی مثال ہے۔ قصّہ اسقدر دلچسپ اور جادو اثر ہے۔ کہ بغیر ختم کئے اوسے چھوڑنا محال ہے۔

دوسرا ایڈیشن عمدہ کاغذ پر دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ رنگین تصاویر جو اسی ناول کے لئے صد ہا روپیہ صرف کر کے تیار کی گئی ہیں۔ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

(فرمائش کے ساتھ ۱۱؍ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔)

صحابیات

جس میں عہدِ صحابہ کی اٹھاون خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲؍

منیجر نگار لکھنؤ

علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقایق

سیاروں میں امکان آبادی پر علمی گفتگو

کہا جاتا ہے کہ جس کائنات سے ہمارا تعلق ہے اس کا سمجھنا ایک شئے محال کا سمجھنا ہے - تاہم چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کرۂ ارض آباد ہے، اس لئے یہ غور کرنا کہ ہمارے ساتھ جو دیگر سیارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں ان میں بھی آبادی ہے یا نہیں - اور جس طرح اِن جھلملاتے سیاروں کی رنگا رنگ روشنی سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اسی طرح وہاں کی آبادی ہمارے سیارہ کی تنویر سے لطف اٹھاتی ہے یا نہیں، بالکل فطری امر ہے -

تقریباً دو ہزار چار سو برس گذرے کہ یونان کے حکما عظام میں سے ایک شخص حکیم انا کشا غورث (Anaxagoras) نے یہی سوال کیا تھا کہ :— "کیا ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں ؟" اور ہر چند اس قسم کا سوال اس وقت کرنا نہ صرف خطرناک بلکہ "ملحدانہ" سمجھا جاتا تھا - کیونکہ تمام اجرام سماوی دیوتاؤں اور دیویوں کی حیثیت رکھتے تھے - بایں ہمہ انا کشا غورث نے جرأت و جسارت سے کام لے کر یہ سوال اُٹھایا - اور خود ہی اس کا جواب اثبات میں دیا - اس کے کچھ عرصہ بعد حکیم دیمو قریطس (Democritus) نے بھی جرأت سے کام لے کر یہی بیان کیا کہ اس لانہایت فضا میں صرف ہماری ہی دنیا کا وجود نہیں ہے بلکہ بے شمار سیارے ایسے موجود ہیں جو دور دراز کے نظامہائے شمسی کے ارکان ہیں اور ان میں ایسی مخلوق آباد ہے جو ہم سے اعلےٰ عقل و فہم کی مالک ہے - لیکن چونکہ دیمو قریطس ملک آلوینا میں رہتا تھا جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر یونان کی ایک خوشحال اور آزاد خیال نوآبادی تھی، اس لئے اس کے اس بیان پر کوئی جرم قائم نہیں کیا گیا - البتہ حکیم انا کشا غورث کی حالت بالکل جداگانہ تھی - وہ آزاد خیال آلوینہ میں نہیں بلکہ ایتھنز میں رہتا تھا - اس لئے اُسے فوراً بازنجر کر کے بحیثیت ملزم عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا گیا - مقدمہ چلا، جرم ثابت ہوا اور مجرم کے لئے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا گیا - لیکن ابھی انا کشا غورث قید خانہ کے اندر پڑا ہوا شمشیر جلّاد کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسے فرار ہو جانے کا موقعہ مل گیا، سنہ ۱۶۰۰ء میں راہب جیورڈانو برونو کے متعلق بھی اسی قسم کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا - اور کامل سات سال تک محبوس رکھنے کے بعد راہب مذکور کی نسبت مقدس عدالت کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ پاپائے اعظم کے قصر کے نیچے اس ملحد کو زندہ جلا دیا جائے - چنانچہ وہ زندہ جلا دیا گیا - لیکن جہاں وہ جلایا گیا تھا اسی جگہ "ملحد" کی ایک شاندار یادگار قائم ہے جس نے حقیقت و صداقت کی قربانگاہ پر اپنی جان قربان کی تھی - اس

مظلوم راہب پر علاوہ الحاد کے ایک الزام یہ بھی عاید کیا گیا تھا کہ دنیائے ارضی کے علاوہ کائنات میں اور بہت سے سیاروں کو بھی آباد بتاتا تھا۔ لیکن آج ہم کسقدر خوش قسمت ہیں کہ نہایت آزادی کے ساتھ پھر وہی پرانا سوال اٹھاتے ہیں کہ "کیا سیارے آباد ہیں؟" اور ہمارا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

اس وقت ہر شخص جانتا ہے کہ کرۂ زمین اور آٹھ دوسرے بڑے بڑے سیاروں تک روشنی و حرارت پہونچنے کا کوئی ذریعہ سوائے آفتاب کے نہیں ہے۔ جس کے گرد علاوہ نو بڑے بڑے سیاروں کے ۲۶ اقمار (satellites)، تقریباً ایک ہزار "سیارچے" (asteroids) بے شمار شہاب ثاقب لاتعداد دمدار ستارے، گردش کرتے رہتے ہیں۔ آفتاب ایک روشن و منور کرہ ہے جسکا قطر ۸۶۵۰۰۰ میل ہے یعنی زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا۔

زمین کے قطر کا اوسط ۷۹۱۶ میل ہے۔ رقبہ انیس کرور ستر لاکھ مربع میل اور حجم دو کھرب ساٹھ ارب مکعب میل اور اس کا وزن . . . . ۶۵ ٹن ہے (ایک ٹن = تقریباً ۲۸ من) زہرہ کا وزن زمین کے وزن سے باندازہ ۴/۵ زیادہ ہے۔ اور عطارد کا وزن زمین کے وزن کا صرف ۱/۲۴ ہے۔ وزن و حجم کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی سیارہ کا وزن ایک مقررہ مقدار سے کم ہوگا تو ہم سمجھیں گے کہ (بذریعہ کشش ثقل) ایسا کرۂ ہوائی اپنی گرفت میں رکھنے کے قابل نہیں ہے جو ذوی الارواح کے تنفس کے لئے ضروری ہے۔ یہی باعث ہے کہ چاند جسکا وزن زمین کے وزن کا صرف ۱/۸۱ ہے۔ اپنے لطیف ذرات ہوا زایل کر چکا ہے اور ناقابل آبادی ہو گئی ہے۔ یہی حال کرۂ مریخ کا ہے۔ کیونکہ وہ کرۂ زمین سے بقدر ۱/۹ کم ہے۔ مگر مشتری، زحل، یورانوس اور نیپچون کے متعلق یہ سوال نہیں ہوتا۔ اور یورانوس تو اتنا بڑا سیارہ ہے کہ اگر وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا تو اس کے اندر پندرہ کرۂ زمین سما سکتے تھے۔

عطارد جسکا مدار آفتاب سے بہت قریب ہے تمام سیاروں سے چھوٹا سیارہ یعنی اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے۔ اور مدار آفتاب سے اس کا اوسط فاصلہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے یعنی جو فاصلہ آفتاب اور کرۂ زمین کے درمیان ہے۔ اس سے یہ فاصلہ بقدر ۵/۸ کے کم ہے۔ اس لئے اس پر حرارت آفتاب کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

زہرہ جس کا مدار عطارد زمین کے درمیان واقع ہے آفتاب سے چھ کروڑ ستر لاکھ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ جو زمین کے فاصلہ سے باندازہ ۱/۴ قریب ہے۔ اس لئے اس سیارہ کی سطح پر ہماری زمین سے تقریباً دو چند طاقت شمسی کا نزول ہوتا ہے۔ مگر چونکہ زہرہ اس طاقت شمسی میں سے بقدر ۵۹ فیصدی واپس کر دیتا ہے، اس لئے اس کی سطح پر زمین سے زیادہ گرمی نہ ہوتی ہوگی۔

سیارۂ مریخ کا قطر زمین کے نصف قطر سے کچھ یونہی یعنی تقریباً ۴۲۰۰ میل زیادہ ہے۔ اور جس کا مدار اس کے مرکز نور و حرارت سے ۱۴۱۵۰۰۰۰۰ میل (یعنی ہماری زمین سے ۵۰ فیصدی زیادہ) ہے۔ اس لئے حسب اصول ریاضیات فلکی اس سیارہ کو بہ نسبت زمین کے طاقت شمسی کا ۴/۹ حصہ ملتا ہے۔

سیارۂ مشتری ہمارے نظام شمسی کا ایک عظیم الشان سیارہ ہے۔ یہ زمین سے حجم میں تیرہ سو گنا بڑا ہے، اور آفتاب سے ۴۸ کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ زمین و آفتاب کے فاصلہ کا پانچ گنا ہے۔
زحل اور آفتاب کے درمیان اس سے دوچند فاصلہ (یعنی ۸۸ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہے) زحل اور یورانوس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جسقدر زحل اور آفتاب کے درمیان۔ اس کے بعد اگر ہم نیپچون تک پہونچنا چاہیں تو ہم کو ایک ارب میل کا فاصلہ اور طے کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ سیارہ آفتاب کے گرد ۲،۷۹۰۰۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ اس عدد کو اگر دو سے ضرب کر دیا جائے تو ہمارے نظام شمسی کا قطر معلوم ہو جائے گا۔
مگر ابھی اس قیاس کے قوی اسباب موجود ہیں کہ مدار نیپچون سے آگے بھی ابھی کچھ سیارے اور موجود ہیں۔ اگر صحیح ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نیپچون کے آگے سب سے پہلا سیارہ زمین و آفتاب کے فاصلہ سے بقدر چالیس گنا دور ہوگا۔ ان سیاروں کا علم اتفاق سے ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں ممکن نہیں۔ کیونکہ پہلے ہی سیارہ کی حرکت فلکی سورج کے گرد ۲۹۰ سال میں ختم ہوتی ہوگی۔ اور ان کی حرکت اسقدر سست ہوگی کہ فوٹو کے پلیٹ پر بھی کوئی نشان نہ چھوڑ سکے گی۔ خود نیپچون آفتاب کے گرد ۱۶۵ سال میں ایک گردش کرتا ہے۔ اور اس کی رفتار فلکی ۳،۳۷ میل فی سکنڈ ہے۔ یہ سیارہ ۱۸۴۶ء سے پہلے دریافت نہ ہو سکا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب سے نیپچون کا اوسط فاصلہ ۲،۷۹۰۰۰۰۰۰۰ میل ہے یعنی اگر ہم ٹرین یا موٹر میں ایک میل فی منٹ کی رفتار سے سفر کریں۔ اور مسلسل اسی رفتار سے چلتے رہیں تو پانچ ہزار سال میں اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکیں گے۔
اگر ہم اپنا یہ سفر جاری رکھکر قریب ترین "ثابت" تک پہونچنا چاہیں۔ (جن ستاروں کو ثوابت کہا جاتا ہے وہ بھی در حقیقت ایک جگہ قایم نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت تیز حرکت کرتے رہتے ہیں) تو قریب ترین "ثابت" الف قنطورس (Alpha Centauri) کے ساڑھے چار کروڑ برس پہونچیں گے۔ اور ایک شعاع نور کو جو ۱۸۶۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے ۴،۳ سال درکار ہوں گے۔
اس کے بعد کا بعد ستارہ ۱۱، ۶ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔ تیسرا ۹، ۷ سال نور کے فاصلہ پر ہے۔ اور اس کے بعد الا جسے "شعریٰ یمانیہ" یا "کلب اکبر" (Dog Star یا Sirius) کہتے ہیں وہ ہے

۸۰۰ نوری سال کے مسافت پر واقع ہے۔ الغرض بہت کم ثوابت ایسے ہیں جو زمین سے چار کھرب میل کے اندر واقع ہوں ہمارے تمام نظام شمسی کے چاروں طرف ایک وسیع و تاریک خلا محیط ہے جو اس دائرہ سے جو سیارۂ پچون سورج کے گرد ایکبار گھوم کر بناتا ہے۔ آٹھ کھرب گنا بڑا ہے۔

اس نظام شمسی سے آگے ایک ارب اور تین ارب میل کے درمیان اور بہت سے آفتاب لانہایت فضا کے اندر بیحد تیز رفتاری سے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جو متعدد سیارے اپنی جلو میں رکھتے ہیں۔

امریکہ کے سب سے بڑے ہیئت داں سائمن نیوکومب (Simon Newcomb) نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ فضا میں بے شمار دنیائیں ایسی ہیں جن میں نہ صرف ذوی الارواح بلکہ ناطق مخلوقات آباد ہیں۔"

اور ڈبلو۔ ڈبلو کیمبل مہتمم رصد خانہ لک (Lick) کا قول ہے کہ "یہ فرض کرنا معمولی امکانات کے بھی خلاف ہے کہ صرف ہمارا ہی سیارہ ذوی الارواح سے آباد ہو۔"

ڈاکٹر سی۔ جی ایبٹ ڈائرکٹر رصد خانہ واشنگٹن فرماتے ہیں کہ:۔ "یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ روشن ستاروں کے ساتھ ساتھ اجرام تاریک کی بھی تعداد کثیر ایسی ہو جن کا وجود ہم اپنی طاقتور سے طاقتور دوربین (Telescope) اور آلۂ طیف نما (Spectroscope) سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں خدا کی ذی حیات مخلوق آباد ہو"

مسٹر گاریٹ پی سرویس نے خوب لکھا ہے کہ "کسی سیارہ کے اندر زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ سیارہ منازل ارتقا طے کرتے ہوئے۔ اس حد تک پہونچ جائے کہ اس میں طبیعی اور کیمیاوی قوتیں عمل کرنے لگیں۔ پھر ظاہر ہے۔ کہ ایسی کائنات میں جس کے اندر بے شمار اجرام موجود ہوں۔ خدا معلوم کتنے سیارے ایسے ہوں گے جو ارتقا کے ان منازل کو طے کر چکے ہوں گے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ سوائے کرۂ ارض کے کسی اور سیارہ میں آثار حیات نہ پائے جائیں"

۱۸۶۴ء میں سر ولیم ہگنس نے جو کسی زمانہ میں رائل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ بھی تھے مشاہدات طیفی کے ذریعہ سے بتایا تھا کہ اکثر کیمیاوی عناصر جو ہم کو اس دنیائے ارضی میں معلوم ہیں، وہی دور دراز فاصلوں پر واقع ہونے والے ستاروں کے اندر بھی موجود ہیں۔ اور اس طرح گویا ایک جدید دنیا کی بنیاد پڑی جس کا نام "طبیعیات النجوم" (Astrophysics) ہے۔ سر ولیم کا قول تھا کہ:۔ "جو ستارہ جھلملاتا ہے سمجھ لو کہ اس میں کیمیاوی عناصر موجود ہیں۔"

ڈاکٹر سی فرماتے ہیں کہ:۔ "کائنات کی اس لامتناہی وسعت میں اجرام کا وجود اگر آبادی سے خالی مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صرف ایک کرۂ ارض میں مخلوقات ذوی الارواح کا پایا جانا۔ قدرت کی غلطی ہے جو اس سے ایک عام قانون کے خلاف ہوئی ہے۔"

ہر چند سائنس کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ حیات کیونکر پیدا ہوتی ہے، مگر ہم اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ جب آسانی

سے وہ ہماری چھوٹی سی دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسری دنیاؤں کے اندر بھی ـــ ظاہر ہوتی ہوگی "۔
ـــ آیندہ ہم نظام شمسی کے ہر سیارہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ وہاں آبادی کا امکان ہے یا نہیں

نیاز

مطالعہ

ایک ہفتہ وار جریدہ ہے جو امـ حسن لطیفی بی ۔ اے کی تحریر وادارت میں لودھیانہ سے جاری ہوا ہے ۔ اور آج (۱۶ مئی) تک اسکے پانچ نمبر شایع ہو چکے ہیں ۔ اس جریدہ کو "سولوجرنلزم" کے اصول پر جاری کیا گیا ہے ۔ سولوجرنلزم کا ترجمہ لطیفی صاحب نے "تنہا نگاری" کیا ہے یعنی اگر کسی رسالہ یا جریدہ کو صرف "تحریر وادارت" کی طرف سے تمام وکمال مرتب کیا جائے تو اسے فن صحافت کے اُس شعبہ سے متعلق کیا جائے گا ۔ جسکا نام تنہا نگاری یا "سولوجرنلزم" ہے ۔ یہ جریدہ بڑے صفحات پر شایع ہوتا ہے اور باوجود اسکے کہ اس میں تنقید وتاریخ، لسانیات وحکمیات سبھی کچھ ہوتا ہے لیکن زبان وانشار کے لحاظ سے میں اس کو صرف ادبیات کا رسالہ سمجھتا ہوں ۔ جناب لطیفی حال ہی میں لندن سے فن صحافت کی تکمیل کرکے واپس آئے ہیں ۔ اور سن وسال کے لحاظ سے آپ کا شمار "عرفی" کی طرح قبل از قبل پختہ ہو جانے والی (Precocious) ہستیوں میں سے ہے ۔ جو تجربہ کے سوا سب کچھ اپنے پاس رکھتی ہیں ۔ میں سمجھتا تھا کہ جناب لطیفی مغرب سے واپس آکر کوئی رسالہ یا اخبار انگریزی زبان کا جاری کرینگے ۔ لیکن اُن کو جو فطری دلچسپی اردو ادبیات سے ہے، وہ آخر کار ضرورت ومصلحت سب پر غالب آئی اور انھوں نے وہ چیز پبلک کے سامنے پیش کی جو ممکن ہے ایک حیثیت سے نئی معلوم ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ جناب لطیفی ولایت جانے سے قبل بھی اس کو پیش کرسکتے تھے ۔ یہ جریدہ اخباری حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ صرف ایسے مقالات کا حامل ہوتا ہے جنھیں صرف "خطابت تحریری" میں شامل کیا جاسکتا ہے، اور جن پہ رائے زنی کرنے والے صرف اسی طبقہ میں مل سکتے ہیں جو خود تبصرہ ونقد کی کافی اہلیت رکھتا ہے ۔ لطیفی صاحب، خواہ وہ نظم لکھیں یا نثر، ہر جگہ اپنے آپ کو اسقدر بداہت کے ساتھ نمایاں کر دیتے ہیں ۔ کہ ایک نقاد بشرطیکہ آنکہ وہ "ادب ونقش" کا بھی کافی ذوق رکھتا ہو، ان کے ادبیت کے "حُسن دشوار" کا نہایت آسانی سے اندازہ کرسکتا ہے ۔ "حسن وجمال" کی ایک قسم تو وہ ہے جس کے جلوہ کا مفہوم "لن ترانی" کے سوا کچھ نہیں ہوتا، دوسرا وہ جو "لب بام" ہر شخص کو ہر جگہ نظر آسکتا ہے ۔ پھر میں یہ تو کبھی نہ چاہوں گا کہ لطیفی صاحب کی ادبیت کا حُسن، "حسن لب بام" ہوکر رہ جائے، مگر اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ موسیٰ کی طرح صدائے "دور باش" پر جان دیدینے والے بھی اب دنیا میں موجود نہیں ہیں کاشکے وہ اپنے قلم کی "والہانہ" روش میں کچھ اور اعتدال پیدا کرسکتے اور اسقدر بلند سماوی انشاء (Ethereal Literature) کا معجزہ پیش کرکے اپنی "ریعان صحافت

پر ایمان لانے کے لئے لوگوں کو مجبور نہ کرے۔

جن حضرات نے آپ کے مجموعۂ مضامین "لطیفیات" کا مطالعہ کیا ہے۔ اور جو آپ کی نظموں کو دیکھ چکے ہیں۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ قدرت نے آپ کو کسقدر "برق وش" ذہانت عطا کی ہے لیکن میری رائے میں صحافت کے لئے ذہانت کی اسقدر ضرورت نہیں، جتنی "صیانت" کی ہے۔ کسی کتاب کے پیش کرتے وقت ہمارا خطاب ایک مخصوص حلقہ سے ہوتا ہے، ایک متعین دائرۂ خیال کے اندر رہتا ہے۔ لیکن ایک رسالہ یا جریدہ خواہ وہ "تنہا نگاری" کا نتیجہ ہو یا "انجمن نگاری" کا تربیت جمہور سے متعلق ہوتا ہے۔ اور اس لئے اس میں زیادہ تر وہی باتیں ہونا چاہئے جنکو سمجھنے والے سمجھ سکیں اور سننے والے سمجھیں اگر عنقا اپنے آپکو "روشناس خلق" کرنا چاہے تو اوسے اپنا آشیانہ کی بلندی ضرور کم کرنا پڑے گی ——— میں یہ لکھ تو رہا ہوں اور اس خلوص و نیازمندی کی بناء پر لکھ رہا ہوں جو مجھے لطیفی صاحب کی بارگاہ میں حاصل ہے، مگر اسی کے ساتھ ڈر بھی رہا ہوں کہ اگر انھوں نے یہ سب کچھ سنکر، جواب میں صرف " عالم جوا بنہاست " کہدیا ، تو میں "خون دو عالم اپنی گردن پر" لینے کے سوا اور کیا کر سکوں گا ———

مجھے معلوم ہے کہ اُن کے وطن میں ان کے بہت سے مخالفین پیدا ہو گئے ہیں اور لطیفی صاحب نے نہایت پامردی سے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرکے کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن بہتر ہوتا اگر وہ اپنے جریدہ کو اس نوع کے بیانات سے پاک رکھتے۔

۳۱ مئی کے "مطالعہ" میں بھی اسی نوع کی "تلخ نگاری" موجود ہے، جو یقیناً لطیفی صاحب ایسے خوش ذوق و بلند نظرت انسان کے لئے بہت گری ہوئی بات سمجھی جائے گی اس جریدہ میں یقیناً مواد بہت کم ہوتا ہے اور اس کا بڑا سبب غالباً دشواری طباعت و کتابت ہے جسکا انتظام لودھیانہ میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر فی الحال قلم کو اور خفی کر دیا جائے، مکاتبات کے لئے پورا ایک صفحہ وقف نہ کیا جائے، اور اعلانات و اشتہارات کو جریدہ کے حجم سے علیحدہ کر دیا جائے تو کچھ تلافی ہو سکتی ہے۔

گزشتہ دو اشاعتوں سے "یحییٰ بن عقب" کے چھ شعر عربی کے عنوان پر نظر آتے ہیں جنکا پوری "معتقدانہ تمہید" کے ساتھ جناب لطیفی نے تعارف کر دیا ہے۔ ان اشعار میں، ظہور مہدی، خروج دجال، نزول مسیح اور فتنۂ یاجوج ماجوج کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ حیران ہوں کہ ان اشعار کو "تنہا نگاری" کے کسی جریدہ سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ اور اس قسم کی پیشین گوئیوں پر ایک ہفتہ وار جریدہ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایمان لانا کیوں ضروری قرار دیا جائے۔ اگر یہ اشعار محض سعادت و برکت حاصل کرنے کیلئے درج کئے جاتے ہیں تو ہمکو منتظر رہنا چاہئے اسوقت کا جب کسی دن ان اشعار کی جگہ، دلائل الخیرات، قصیدۂ بردہ، دعائے "گنج العرش" کے حرز جاں بنانیکا مطالبہ لطیفی صاحب کی طرف سے کیا جائے

انچہ می بینم، بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب!

اُمید ہے کہ لطیفی صاحب میری اس تحریر کو محض مخلصانہ مشورہ کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اور ضرورت سے زیادہ ذکاوت حس سے کام لیکر مجھے شرمندہ نہ کریں گے ———

نیاز

عبدالماجد دریابادی بے نقاب

(ایک مظلوم خاتون کی دردناک داستان)

میری شادی تیرہ سال کی عمر میں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی مرحوم سے ہوئی تھی۔ شادی کے چھٹے سال مولانا موصوف کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اور میری گود میں دو سال کی ایک بچی بھی تھی جس کا نام آصفہ ہے۔ شوہر کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد میرے والدین کو میرے نکاح ثانی کی فکر ہوئی۔ مختلف جگہوں سے پیام بھی آئے لیکن کوئی قابل اطمینان نہ تھا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو بہت سی کتابوں کے مصنف اور اخبار "سچ" کے مالک اور اڈیٹر ہیں۔ میرے مرحوم شوہر کے بظاہر سچے دوست بنے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم لوگ ان کو نہایت نیک خصلت سلیم الطبع اور بزرگ جانتے تھے۔

میری بیوگی کے کچھ عرصے کے بعد مولوی عبدالماجد اور میرے بڑے بھائی منشی حسیب الرحمٰن صاحب کے درمیان میری شادی کی بابت خط وکتابت شروع ہوئی۔ اور انھوں نے میرے عقد ثانی کے لئے سخت سے سخت تقاضا کیا جس کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں ضرورت نہیں۔

اس کے بعد عبدالماجد کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے لکھا "ڈرتے ڈرتے ایک صاحب کا نام پیش کرتا ہوں ایک صاحب ایک بیوی رکھتے ہوئے دوسری بیوی کے خواستگار ہیں اگر آپ لوگ منظور کریں تو بہتر ہے" اُس وقت میرے والد مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے ایسے رشتے کو کسی طرح گوارا نہ کیا۔

ہمارے یہاں کے انکار پر عبدالماجد نے میرے بھائی کو کئی مرتبہ لکھا کہ اپنی بہن (یعنی مجھ کو) کو میری بیوی سے ملا دیجئے ہم لوگوں سے جو اُن کے تعلقات تھے اس کے موافق یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی اور نہ مجھے کچھ شبہ تھا کہ میری تقدیر کچھ اور رنگ لائے گی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو ہمراہ لے کر لکھنؤ گئی۔ اور ان کی والدہ، بیوی اور بہن سے خاتون منزل میں مل آئی۔ وہاں کسی قسم کی کوئی ایسی گفتگو نہیں ہوئی جس سے مجھے کچھ عبدالماجد کے دل کا حال معلوم ہوتا۔

ان لوگوں سے ملے ہوئے مجھے مشکل سے دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ عبدالماجد کا ایک طول طویل چار صفحہ کا خط بھائی صاحب کے نام آیا جس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ "آپ کی بہن اور میری بیوی سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں کچھ الفاظ والدہ آصفہ (یعنی میں) نے ایسے استعمال کئے جن کا میرے دل پر گہرا اثر پڑا، وہ یہ کہ زندگی کے ساتھی سبھی ہوتے ہیں، لیکن مرنے

کے بعد سچے اور وفادار دوست بھی ناآشنا ہو جاتے ہیں۔" ان لفظوں نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ اور میں اب سب سے پہلے اپنا ہی نام پیش کرتا ہوں۔ میرے دو بچیاں ہیں۔ چھوٹی مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جس طرح میری دو آنکھیں ہیں اسی طرح دو بیویاں ہوں گی۔ آصفہ سلمٰی کو بہ مسرت اپنی تیسری بچی کی جگہ رکھ سکتا ہوں، لیکن میں ایک غریب آدمی ہوں، مشکل سے شام تک دال روٹی کھا سکتا ہوں لہٰذا امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں رکھ سکتا۔ غصہ ور بھی ہوں، تاہم اُن کے ساتھ نہ کروں گا، میرے میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہیں کہ لوگوں کو رشک آتا ہے۔ میری اہلیہ بیمار بھی رہتی ہیں۔ عقد ثانی مسنون بھی ہے''

یہ خط پڑھ کر بھائی صاحب نے مجھ سے شادی کی بابت رائے لی، میں نے انکار کر دیا لیکن بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ نے سمجھا بجھا کر راضی کیا چنانچہ اکتوبر سنہ ء میں میں عبد الماجد کی نفس پرستیوں کا شکار بنی۔ یہ شادی میرے سسرال والوں سے پوشیدہ طور پر دریاباد میں ہوئی تھی کیونکہ وہ لوگ غیر خاندان ہونے کی وجہ سے اس شادی کے سخت مخالف تھے۔ مہر صرف اکیاون روپے تھا شادی کا ہونا تھا کہ عبد الماجد کے رجسٹری خطوط بکثرت نگرام آنے لگے جن میں یہی لکھتے رہے کہ جلد بھیجئے میں اعلان کے ساتھ دوبارہ نکاح کروں گا۔

چنانچہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہمراہ مع اپنی بچی آصفہ کے دریاباد گئی وہاں اعلان کے ساتھ دوبارہ پھر نکاح ہوا۔ میرا قیام تقریباً ایک ماہ عبد الماجد کے یہاں دریاباد میں رہا۔ اب میری مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔

میرے دریاباد جانے کے دوسرے ہی روز میرے مرحوم شوہر کے چچازاد بھائی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب میری لڑکی آصفہ سلمٰی کو نگرام لے جانے کی غرض سے دریاباد پہونچے اُن کو دیکھ کر آصفہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسکے اس طرح کے رونے پر میری جو حالت تھی۔ اس کا میری ہی جیسی مصیبت زدہ عورت اندازہ کر سکتی ہے۔ میں نے اپنے غمگین اور درد بھرے دل کو سنبھالا۔ اور اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد عبد الماجد کی اجازت سے میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں دریاباد سے سندیلے آئی، کیونکہ اعزہ اور سسرال والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہم لوگوں کو وطن (نگرام) چھوڑنا پڑا۔ اور سندیلہ میں جہاں میرے بڑے بھائی ملازم ہیں سکونت اختیار کرنی پڑی یہیں سے ۲۹ نومبر سنہ ء کو میری چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی۔

سندیلہ میں تقریباً ڈھائی ماہ مجھے رہنا پڑا۔ اس عرصے میں عبد الماجد کے خطوط میرے پاس بہت کم آتے تھے۔ میری طبیعت لگی رہتی تھی۔ اس وجہ سے میں اور بھی جلد جلد خط بھیجا کرتی تھی۔ عبد الماجد نے مجھے لکھا۔ '' اتنی جلدی خط بھیجنے کی کیا ضرورت ہے ہفتے میں ایک بار خط آنا چاہئے'' عبد الماجد کی اس تحریر سے مجھے رنج ضرور ہوا، لیکن کیا کر سکتی تھی خاموش ہو گئی۔ اسکے بعد عبد الماجد نے للعہ کرایہ بھیج کر مجھے لکھا۔ کہ اپنے بھائی کے ساتھ دریاباد چلی آؤ'' چنانچہ میں جنوری میں وہاں پہونچ گئی، دو ہفتے کے بعد عبد الماجد نے مجھ سے کہا کہ '' میں باہر (حیدرآباد) جا رہا ہوں تم اپنے میکے چلی جاؤ'' یہ الفاظ سُن کر مجھے صدمہ ہوا اور میں نے کہا کہ میں ابھی سندیلہ نہیں جاؤں گی کیونکہ مجھے آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔

عبدالماجد کے بڑے بھائی عبدالمجید، سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ انھوں نے بھی اس سے پہلے مجھے سہارنپور بلایا تھا۔ اس لئے عبدالماجد نے مجھے سہارنپور بھیجدیا۔ دو مہینے میں سہارنپور رہی۔ اس درمیان میں عبدالماجد کے خطوط اُن کے بھائی عبدالمجید کے پاس تو برابر آیا کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ ان کی بے رُخی سے جو کچھ خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد میرے بھائی صاحب نے مجھے بلانے کے لئے عبدالماجد کو خط لکھا۔ عبدالماجد نے بھائی صاحب کو جو جواب دیا قابلِ ملاحظہ ہے۔ "میں نے تو مہینہ سوا مہینہ ہوا جب ہی والدہ آصفہ سے سندیلہ جانے کو کہا تھا۔ لیکن انھوں نے خود ہی عذر کیا اور سہارن پور چلی گئیں" گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ میں بغیر ان کی اجازت کے سہارنپور گئی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ عبدالماجد نے خود ہی مجھے سہارنپور بھجوایا تھا۔ سہارنپور سے ماہ مارچ میں عبدالمجید صاحب مجھے راستہ میں سندیلے چھوڑتے گئے یہاں ایک ماہ تک عبدالماجد کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا۔ میں روزانہ خطوط بھیجتی رہتی تھی۔ خدا خدا کرکے ایک خط آیا جس کے الفاظ یہ تھے۔ "تمہارے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ خط ہی تو ہوتے ہیں۔ یا کوئی تار ہوتے ہیں" اس کو دیکھ کر میرا دل مرجھا گیا —— وہ خرچ کے لئے دس روپیہ ماہوار مجھے برابر بھیجتے رہے۔ جب سندیلہ آئے ہوئے مجھے چار ماہ ہوگئے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے مجبور ہوکر خود ہی لکھا کہ میں دریاباد آنا چاہتی ہوں۔ اس کے جواب میں عبدالماجد نے لکھا۔ "ابھی موقعہ نہیں ہے جب موقع ہوگا بلا لوں گا" ماہ جون میں عبدالمجید صاحب نے میرے بھائی صاحب کو ایک گھنٹہ کے لئے سہارنپور بلایا۔ جولائی میں بھائی صاحب گئے تو اُن سے کہا کہ "عبدالماجد تو کچھ بولتے نہیں، ان کی بیوی (عفت) کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ آپ کی بہن کو الگ کردیا جائے" بھائی صاحب یہ الفاظ سُن کر حیران رہ گئے۔ ان کی عجیب حالت ہوئی۔ عبدالمجید کو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سندیلہ واپس آئے یہاں آکر تمام واقعہ بیان کیا۔ کیا بتاؤں یہ الفاظ سنکر میری والدہ محترمہ کا کیا حال ہوا۔ اور اپنی حالت میں تحریر ہی نہیں کرسکتی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے پھر خیال ہوا کہ ممکن ہے انھوں نے مجھے علیحدہ مکان میں رہنے کے لئے کہا ہو۔ غرض میں اپنے دردبھرے دل کو طرح طرح سے تسلی دیتی رہی۔

اس کے چند ہی روز کے بعد طلاق نامہ آگیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مجھے اندھیری فضا میں پھینک دیا ہے۔ میری نظروں میں تمام عالم سونا ہوگیا۔ چاروں طرف گہری تاریکیاں نظر آنے لگیں۔

باوجود اعزہ کے شدید اختلاف کے جو خطوط تعزیت میں آئے۔ ان میں سے ایک خط میرے حقیقی ماموں مولانا محفوظ الرحمن صاحب کا ملاحظہ کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔

نورچشمہ میاں حبیب الرحمن صاحب سلمہ اللہ تعالے

دعا۔ خدا کرے خوش رہو، آباد رہو، کل علی گڑھ سے عزیزی فرید سلمہ کا خط بنام ابجھن سلمہ حالات سندیلہ سے پُرغم والم موصول ہوا،

کل سے اسوقت تک کئی بار تم کو خط لکھنے بیٹھا۔ لیکن قلم نے یارانہ دیا کہ تم کو کیا لکھوں - آہ! یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ ایک صاعقہ تھی، جس نے تن بدن کو جھلسا ڈالا۔ ابتداءً تم لوگوں کی کوتاہ فہمی اور تمھارے عورتوں کی رائے کے پابند ہونے نے معاملہ کو ایک ناگوار اور ذلت آمیز طریقہ سے تکمیل کو پہونچایا! اب اس نااہل اور ناخدا ترس انسان نے اس خاندان کی عزت و افتخار پر زبردست کاری ضرب لگائی ہے - اگرچہ اس وقت ہمارے آپ کے رسمی تعلقات تلخ ہیں۔ لیکن قدرتی واسطے کسی کے توڑے نہیں ٹوٹتے - اس ناگوار خبر نے کل گھر بھر کو بے چین بنا دیا ہے یقیناً کل روز قیامت یہ ظلم کا معاملہ رب العزت کے حضور پیش ہوگا۔ پھر میاں ماجد دیکھیں وہاں کیا جواب دے کر سرخروئی حاصل کریں گے۔ ظلم کی ٹہنی ہری نہیں ہوتی - ان کو خدا کے غضب سے ڈرنا چاہئے تھا - آہ - ثم آہ

ایسی نامبارک حالت میں ظاہر ہے کہ اہل معاملہ کا کیا حال ہوگا - اور ان کی پریشانی کا اثر اس معصوم بچہ پر کیا پڑتا ہوگا جو ہر ایک کو اس واقعہ سے متاثر پاکر اس کے قلب نازک کی کیا کیفیت ہوگی - یہ نقشہ ہر وقت ہم لوگوں کے پیش نظر ہے - اور مجھے خطرہ ہے - کہ اس کی صحت پر اس کا ناگوار اثر پڑے گا - والدعا فقط

محمد محفوظ الرحمن عفی عنہ

از نگرام ۲۵ جولائی سنہ ۳۱ء

طلاق نامہ پہونچنے کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد عبدالماجد کا ایک خط میرے نام آیا، اس میں لکھا تھا - "میں عرصے تک تمھاری خدمت جاری رکھوں گا - اور میرا ارادہ ہے کہ تمھارا ہاتھ کسی شریف کے ہاتھ میں دے دوں گا" یہ خط پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، لیکن کیا کر سکتی تھی، خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی -

اِس کے بعد بھائی صاحب نے عبدالماجد کے پاس خط لکھا جس کا مختصر مضمون یہ ہے "کہ آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ بدعہدی کی، ہم لوگوں پر ظلم کیا - اور بالکل ذبح کر دیا - اور زندہ درگور کر دیا ہے - آپ کو معلوم ہے کہ باوجود اعزہ کی شدید مخالفت کے ایسا کیا گیا تھا، صرف والدہ رافت سلمہا کی صحت کے خیال سے ایسا کرنا کسی طرح آپ کو مناسب نہ تھا - کہ ایک مجبور و لاچار ہستی کو پامال کر دیا گیا - شریعت میں یہ فعل نہایت قبیح اور مبغوض ہے - اس کا آپ نے کچھ خیال نہ کیا"

اس کے جواب میں عبدالماجد کا جو خط بھائی صاحب کے پاس آیا، بعینہ نقل کیا جاتا ہے

بسم اللہ

دریاباد   ۱۴ جولائی سنہ ۳۱ء

منشی حبیب الرحمن صاحب! وعلیکم السلام -

آپ کے دو خط ملے ایک بھائی صاحب کے نام، دوسرا خود میرے نام - میں چار روز کے بعد ابھی لکھنؤ سے واپس آیا ہوں - اس لئے جواب آج سے قبل لکھنا ممکن نہ ہوا -

آپ کو رنج و صدمہ ہونا قدرتی ہے - اور ایسی مغلوبیت کی حالت میں، انسان ایک بڑی حد تک عنداللہ و عندالناس

معذور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ممانعت کے لئے بھی کچھ حدود ہوتے ہیں۔ بار بار ہم لوگوں کو گردن کاٹنے، ذبح کرنے، قتل کرڈالنے ظلم کرنے بدعہدی کرنے، تلوار چلانے کا مجرم قرار دینا، والدہ رافت سلمہا کی علالت کی بحث چھیڑنا۔ یہ سب ان حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے ——— صورت حال جو آپ نے تحریر کی ہے۔ وہ تمام تر خلاف واقعہ ہے۔ آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجئے، کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کردوں۔

اپنے اعزہ کی جو شکایتیں آپ نے لکھی ہیں ممکن ہے صحیح ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ ان معاملات سے ہمارا کیا واسطہ؟ اور ہم لوگ بجز زبانی ہمدردی و اظہار تاسف کے اور کیا کرسکتے ہیں؟

جو کچھ کیا گیا ہے آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں بڑی حد تک، آپ لوگوں کی بہتری اور بھلائی کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے یہ مسئلہ آپ کو کسی نے غلط بتادیا ہے کہ طلاق ہر صورت میں عند اللہ مبغوض ہے۔ طلاق تو خود حضور انور صلعم نے دی ہے۔ اور صحابہ کرام نے بکثرت طلاقیں دی ہیں مطلقہ کے ساتھ نکاح بھی ان حضرات نے بکثرت کئے ہیں اسے عیب تو ہماری موجودہ سوسائٹی نے بنادیا ہے، جس میں عقد بیوہ، تعداد ازدواج وغیرہ بھی داخل عیوب ہیں۔ شریعت نے جس طلاق کو ناپسند کیا ہے وہ وہ ہے جو شوہر بلاوجہ معقول عورت کو ستانے کے لئے یا محض اپنی نفس پرستی کے لئے دیتا ہے نہ کہ وہ طلاق جس کا مقصد یہ ہو کہ زن و شوہر دونوں ایک دوسرے کی صحبت ناموافق سے آزاد ہو جائیں، یہ تو عین رفع ظلم ہے نہ کہ ظلم۔ ——— آپ نے جس جذبۂ ہمدردی کا واسطہ دلایا ہے یہ اسی کا تقاضا ہے۔ جو افتراق وقطع تعلق پر مجبور کر رہا ہے۔ ظلم اگر مقصود ہوتا تو ماس کی متعارف صورتیں دوسری ہیں، جن سے آپ بھی ناواقف نہیں ہوسکتے۔

عبدالماجد

یہ خط دیکھ کر مجھے اور بھی صدمہ ہوا کہ واللہ اعلم وہ کون سی سچائیاں ہیں، اور اسباب افتراق کی خدا جانے کیا تفصیل ہے۔ میں تو بالکل بے قصور ہوں، مجھ سے کوئی ایسی شدید خطا سرزد نہیں ہوئی کہ یہ نوبت آئی اس کے بعد میں نے خود ایک خط لکھا کہ آخر مجھے دنیا کیا کہے گی۔ اور خدا جانے میرے متعلق لوگوں کا کیا گمان ہو۔ عبدالماجد نے میرے خط کا جو جواب دیا بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ

دریاباد ۲۱ جولائی ۱۹۳۱ء

والدہ آصفہ سلمہا۔ وعلیکم السلام۔

کئی دن ہوئے خط ملا تھا۔ اللہ کی مشیت میں جو ہوتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ بندہ کا کام یہ ہے، کہ جو کچھ بھی پیش آئے، اس پر صبر کرے۔ تم نے لکھا کہ لوگ تم پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے۔ ان تہمتوں کی تردید میں جو کہو میں لکھ بھیجوں بھیج دوں

تہمت لگانے والے خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کریں گے۔ میں نے کئی دن ہوئے تمہارے بھائی کو لکھا تھا کہ تکمیل ضابطہ کے لئے مہر کی کل رقم کی رسید میرے پاس بھیجدیں تو بقیہ رقم فوراً بھیج دوں۔ رسید ابھی تک آئی نہیں۔ رقم تیار رکھی ہے۔ صرف تمہاری رسید کا انتظار ہے۔

رسول اللہ صلعم نے صرف ایک بیوی حضرت سودہؓ کی طلاق واپس لی ہے، باقی دو بیویاں ایسی اور ہوئی ہیں جنھیں طلاق دے کر واپس نہیں لی ہے۔ شرعاً یہ ایسی کوئی بُری بات نہیں ہے۔ صرف ہمارے موجودہ رواج نے اسے اتنا بُرا بنا رکھا ہے جیسے دوسرے عقد کو بُرا سمجھ لیا گیا ہے

عبدالماجد

جو خط عبدالماجد کا میرے بھائی صاحب کے نام ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں میں خطاوار ہوں۔ اور اگر افتراق کی تفصیل اور سچائیاں ظاہر ہوں تو مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے ہفتہ بھر ہی کے بعد میرے نام جو خط آیا ہے اس سے میں ہر قصورت بالکل بری الذمہ قرار دی جاتی ہوں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ صحیح بات عبدالماجد کے نزدیک پہلی ہے۔ یا دوسری ... ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کا بیویوں کو طلاق دینا۔ یہ میری تسلی کے لئے لکھا گیا ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے لئے طلاق مبغوض نہ ہوگی، دنیا دی رسمیں بُری سہی مگر شریفوں کے جذبات کے موافق جیسی ہوتی ہیں —— عبدالماجد نے مہر کے روپیے بھی بھائی صاحب کے پاس روانہ کئے تھے۔ لیکن میں نے واپس کر دئے —— اسکے بعد میں نے تھانہ بھون مولانا اشرف علی صاحب کے پاس اور دارالعلوم دیوبند مولانا حسین احمد صاحب کے پاس خطوط بھیجے۔ کیونکہ عبدالماجد مولانا اشرف علی صاحب کے معتقد اور مولانا حسین احمد صاحب کے مرید ہیں۔ ان حضرات کے پاس خطوط بھیجنے کی غرض صرف یہ تھی کہ ممکن ہے اس مصیبت قبیحہ سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے تو میرے خط کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مولانا حسین احمد صاحب نے جو خطوط مجھے اور بھائی صاحب کو تحریر فرمائے وہ نقل کئے جاتے ہیں —
اصل خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔

محترمہ من سلمکم اللہ تعالے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا والانامہ حسرت اور رنج سے بھرا ہوا پہونچا نہایت زیادہ قلق اور افسوس ہوا۔ اللہ تعالے آپ کی دستگیری فرمائے آمین میں مولانا عبدالماجد صاحب کو لکھ رہا ہوں مگر وہ فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے بہت سی باتوں کا وہم وگمان بھی نہ تھا جو کہ بعد از عقد پیش آئیں۔ وہ آپ کے کسی معاملہ میں بدخلقی وغیرہ کے شاکی نہیں ہیں۔ انھوں نے نکاح سے پہلے مدت دراز تک فکر وغور اور جد وجہد جاری رکھا کہ کوئی مناسب اور مفید موقعہ ہاتھ آ جائے۔ جہاں پر آپ کا عقد ثانی ہو جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تب انھوں نے ارادہ کیا تھا۔ کہ میں خود ہی عقد کر لوں۔ اور جیسا کہ انھوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ اسی ارادے میں پختہ تھے۔ مگر عقد کرتے ہی ان پر چاروں طرف سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ گھاٹی اسقدر دشوار گزار ہوگی۔ بالآخر وہ صبر نہ کر سکے۔

اور یہ معاملہ پیش آیا - خط وکتابت وخط میں جو آخری جواب ہوگا - میں پھر پیش کروں گا ـــــــ محترمہ من قسمت کی بات کوئی نہیں جانتا - راضی بہ تقدیر رہنا چاہئے - اللہ تعالے سے دعا کرتا ہوں - کہ وہ آپ کے لئے بہترین صورت کرے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوجئے والسلام ۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دوسرا خط ملاحظہ ہو

محترمہ سلکم اللہ تعالے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' آپ کا والانامہ باعث سرفرازی ہوا تھا - چونکہ میں تقریباً دو ماہ سے پھوڑے پھنسی وغیرہ میں مبتلا ہوں - ادھر مشاغل تدریس وغیرہ سے فرصت نہایت کم ہوتی ہے - اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی - مولانا عبدالماجد کا والانامہ آیا تھا، وہ اپنی انتہائی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں ان کو اس قسم کی مجبوریوں کا خیال تک بھی نہ تھا - جہاں تک مجکو ان کے پہلے کلمات سے اور اب کے کلمات سے پتہ چلتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کو آپ سے پہلے بھی ہمدردی ہی نے مجبور کیا تھا کہ عقد کریں - ان کی ہرگز نیت نہ تھی کہ خدانخواستہ وہ جدا کریں گے - مگر یہ واقعات اعزہ واقارب اور خصوصاً والدہ ماجدہ وغیرہ کے احکام کے ایسے پیش آئے کہ سوائے سر جھکانے کے کوئی چارہ کار ہی نہ رہا - مجکو بھی سخت افسوس ہے کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا - اور ان کو بھی بہت ہی زیادہ رنج اور الم ہے - مگر تقدیرات الٰہیہ میں کس کا چارہ ہے - آپ کے لئے اگر خوش قسمتی مقدر ہوتی تو مولانا عبدالرحمن صاحب ہی کا انتقال کیوں ہوتا - مالک قضا وقدر نے جس طرح چاہا مقرر فرمایا، کسی کا اس میں کیا اختیار ہے - آپ نے بہت بڑا جہاد کیا تھا کہ نکاح ثانی قبول فرمایا - اب یہ دوسرا جہاد پیش آیا - اللہ تعالے آپ کی دستگیری فرمائے اور دین ودنیا میں آپ کی فائز المرامی اور خوش کامی کی صورت ظہور میں لائے اب بجز صبر وشکر کیا چارہ ہوسکتا ہے - مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ میں مصارف روانہ کرتا ہوں مگر آپ کی طرف سے واپسی ہوتی ہے[1] اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ وہ جو کچھ اخراجات کے لئے روانہ کریں قبول فرمالیا کریں - کیا عجب ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر آپ کی اس قسم کی خبرگیری فرماتے رہیں - آپ کو اب بجز صبر کے کیا چارہ ہے - میں اللہ تعالے سے دعا کرتا ہوں کہ وہ کریم وکارساز آپ کی پردۂ غیب سے اعانت فرمائے - آمین

از دیوبند ۹ ر جمادی الاول ۱۳۵۵ھ

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

---

[1] بالکل غلط ہے، صرف مہر کے روپئے جس کو رقم کے لفظ سے مولوی صاحب نے تعبیر کیا ہے روانہ کئے تھے - وہ میں نے واپس کردئے تھے - عبدالماجد نے طلاق کے بعد میرے پاس ایک پیسہ نہیں بھیجا -

اسی سلسلے میں بھائی صاحب کے پاس جو مولانا حسین احمد صاحب کا خط آیا وہ بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

محترم المقام جناب فیض مآب منشی حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میں نے مولانا عبدالماجد صاحب سے اس امر میں خط و کتابت کی۔ یوں تو اسرار کا جاننے والا خالق کون و مکان ہی ہے مگر جہاں تک ان کی پہلی اور اب کی تحریرات اور زبانی گفتگو میں بتلاتی ہیں ان کی نیت بد نہ تھی۔ اور اس عقد ثانی میں ان کو محض ہمدردی اور خبرگیری ہمشیرہ محترمہ کی مقصود تھی، اسی کے ساتھ ساتھ عقد ثانی کا اجرا بھی منظور تھا۔ اگرچہ انھوں نے اس امر میں مستقبل کی دشواریوں کو سوچا سمجھا تھا۔ مگر ان کو اندازہ میں غلطی ہوئی۔ جسقدر وہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے متعلق ان کا گمان تھا کہ میں تحمل کر لوں گا، مگر خلاف امید ان کو اسقدر مشکلات کا سامنا ہوگیا۔ جن کو تحمل کرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ اور پھر بھی ایک عرصہ تک وہ برداشت فرماتے رہے۔ مگر جبکہ بالکل ہی مجبور ہوگئے۔ اسوقت بجز اس صورت مکروہہ کے کوئی مفر ان کو نظر نہ آیا۔ انھوں نے اپنی قدیمی سسرال والوں کے جور و جفا کو برداشت کیا۔ اور اعزہ و اقارب کے طعنوں اور تشنوں کو جھیلا۔ قریب کے رشتہ داروں کی سہی مگر والدہ ماجدہ کے احکام کا ٹال دینا سخت دشوار اور دین و دنیا کی بربادی کا باعث تھا۔ جناب کو معلوم ہے کہ حکم شرعی کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ اگر والدین بلا سبب بھی لڑکے کو حکم کریں تو اس پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عزیز اہلیہ سے جدائی اختیار کرلے۔ اگرچہ انھوں نے عقد سے پہلے اپنی قدیمی اہلیہ اور والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی وغیرہ کو راضی کرلیا تھا مگر بعد از عقد یہ سب کچھ دلوں میں بدل گئے۔ اور ایسی ایسی مشکلات ان کے سامنے آگئیں کہ ان کے موجود ہوتے ان کا اپنے وطن اور گھر بار میں رہنا۔ اور زندگی بسر کرنا دشوار تر بلکہ تقریباً محال ہوگیا یہ سب بھی جھیل جاتے اگر والدہ ماجدہ کا حکم نہ ہوتا۔ میں مولوی صاحب موصوف کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے اس امر کے متعلق بہت زیادہ رد و قدح کی، اور نوشت و خواند کی نوبت آچکی ہے۔ ادھر آپ کی مشکلات بھی واقعی اور بہت زیادہ رنجدہ ہیں۔ افسوس یہ تقدیری معاملات ہیں ان میں دم مارنے کی گنجایش نہیں۔ جس طرح آپ نے ایک ایسے ہونہار قابل بھائی کی نوجوانی کی موت پر صبر کیا اور یہی وہ مصیبت تھی جو کہ تمام مصائب کی سرچشمہ بلکہ تمام خاندان کے لئے ایک ناقابل تلافی مصیبت تھی تو پھر اس مصیبت پر بھی صبر فرمائیں۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں مولوی صاحب موصوف دروغگو، مکار، شہوت پرست نہیں ہیں مگر تقدیری معاملات کے سامنے بڑوں بڑوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔ اور جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ ان کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وجود خالق کا اقرار کرنا مشکل ہو جائے ——— آپ کی عالی ظرفی اور شرافت کا مقتضی یہی تھا جو جناب نے کیا کہ ایسی گندگی کو اچھالنے سے پرہیز فرمایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جزائے خیر عنایت فرمائے۔ اور آپ کی مشکلات کو دور فرمائے۔ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

از دیوبند ۱۹ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

میری حالت شدت رنج وغم سے بالکل دیوانوں جیسی ہوگئی، مجھ میں بالکل سکت نہ رہی، ہاتھ پیر اور بقیہ تمام جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا علاج ہوا۔ میں اپنی اس ردی حالت سے ذرا سی بھی متفکر نہ تھی۔ میری دلی تمنا یہی تھی کہ موت آکر جلد میرے مصائب و آلام کا یک لخت خاتمہ کردے۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے علاج سے مجھے قدرے سکون ضرور ہوا۔ لیکن اب چار پانچ ماہ سے میری حالت روز بروز بالکل ردی ہوتی جاتی ہے، اٹھنے بیٹھنے سے بالکل معذور ہوں۔ اب چارپائی پر سے ہلنے کی طاقت بھی نہیں ہے، ابتدا میں دق جیسی کیفیت تھی، حرارت قائم ہوگئی تھی، کھانسی بے حد تھی مگر اب چار پانچ روز سے بلغم کے ساتھ کچھ خون کی آمیزش ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن بظاہر کوئی امید نہیں۔ خداوند کریم سے میری دلی تمنا یہی ہے کہ مجھے جلد از جلد ان دنیاوی مصائب سے نجات دے۔ اور اپنے حبیب پاک نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ایمان کے ساتھ اپنی اس ادنیٰ کنیز کو آغوش رحمت میں لے کر خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین یارب العالمین!

ان تمام واقعات میں سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ عبدالماجد اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو تو طلاق کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ والدہ نے مجبور کیا۔ اور میرے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اسباب افتراق کی تفصیل اب تک میں نے آپ ہی لوگوں کی دلشکنی کے خیال سے نہیں کی تھی، ایسا نہ ہو کہ آئندہ مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے آئندہ اس قسم کے خطوط لکھ کر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ تمام سچائیوں کو ظاہر کردوں" حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تحریروں میں سے ایک بھی سچی نہیں لیکن عبدالماجد نے یہ چال چلی کہ ادھر تو اپنے پیر کو بھی خوش رکھنا چاہا۔ اور ادھر میرے اعزہ کو ایسا خط لکھا، جس سے وہ ڈر جائیں، اور اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں۔ دوسرا جھوٹ انھوں نے اپنے پیر سے یہ بولا کہ وہ مصارف روانہ کرتے ہیں۔ لیکن میں واپس کر دیتی ہوں۔ حالانکہ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ علاوہ اس کے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کیا پہلے نکاح کے وقت عبدالماجد ایسے مدعی زہد واتقا نے اپنی والدہ سے اجازت نہ لی تھی، یقیناً لی ہے، پھر نکاح کے بعد ان کی مخالفت کیسی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر مولوی حسین احمد صاحب کو (ناراضی والدہ کا) جو سبب بتایا وہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ بہرحال میں ان تمام واقعات کو پبلک اور علماء دین واکابر ملت کے سامنے رکھ کر متمنی ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں ایسی بزرگ صورت، گلیم پوش، تسبیح خواں صورتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کے دل خواہشات نفسانی، مکر وفریب اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح خفیہ طور پر ظلم کرتے رہتے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔

میرا ارادہ نہ تھا کہ یہ واقعات ملک کے سامنے پیش کئے جاتے کیونکہ عبدالماجد کے مظالم سے مجھ پر تو جو کچھ مصیبت گزرنا تھی گزر رہی ہے۔ دق۔ سل جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہوکر زندگی کے دن گن رہی ہوں۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرے اس جانگداز واقعہ سے میری بہنیں اور ان کے والدین عبرت حاصل کریں اور ایسی مقدس ہستیوں سے بچنے اور بچانے کا ہمیشہ خیال رکھیں اور ملک کو بتائیں کہ ایسے لوگوں سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

زندہ در گور ظ۔ بیوہ مولانا عبدالرحمن صاحب ندوی نگرامی مرحوم

مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۳۲ء نگرام ہاؤس۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

انتظام علی صاحب

کس ماحول میں پیدا ہوئے، کس گردوپیش میں پرورش پائی، کس سوسائٹی کے زیر اثر ان کی تعلیم ہوئی۔ اور اُن کے خیالات وجذبات میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیر ہوا۔ ان باتوں کا ہمیں علم اور نہ جاننے کی ضرورت۔ ہم تو صرف اسقدر جانتے ہیں۔ اور فسانے کے لحاظ سے اتنا ہی جاننا چاہئے کہ معاشیات واقتصادیات میں انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اور اس شان کے ساتھ کہ جب وہاں سے نکلے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی سودیشی بھنڈار کے اشتہار یا کارخانہ پارچہ بافی کے ٹریڈ مارک ہیں۔ یعنی تکمیل معاشیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات کا مطالعہ بھی آپ نے جس نقطۂ نظر سے کیا وہ بھی ویسا ہی ویران، وسنسان اور اسی طرح کا بے آب ورنگ تھا۔

یوں تو فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرنے کی ذلت آپ نے کبھی گوارا نہیں کی لیکن سنا ہے کہ اول اول اتنی بیگانگی بھی نہ تھی۔ چنانچہ موسیقی کے ذکر کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ اس موذن کا ذکر ضرور کردیتے جو محلہ کی مسجد میں اذان دیتا تھا۔ اور فرماتے "اچھے اتار چڑھاو کے ساتھ اذان دیتا ہے" ——— "اتار چڑھاؤ" ان کے نزدیک موسیقی کی گویا ایسی نازک ودقیق اصطلاحیں تھیں کہ وہ ان کے علم پر جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ شعر وشاعری کے سلسلہ میں جب وہ کبھی اظہار خیال فرماتے تو شاید اس لئے کہ ساری دنیا غالب کی تعریف کرتی ہے ضرور کوئی نہ کوئی بات ہوگی وہ بھی ہمیشہ غالب ہی سے ابتدا کرتے اور اسی پر انتہا۔ اور مجھے خود تو تجربہ نہیں لیکن دوسروں سے معلوم ہوا کہ جب کبھی رات کی تنہائی میں جذبات کا جوش وخروش ناقابل ضبط ہوجاتا تو غالب کا یہ مصرعہ دردناک گنگنایا کرتے کہ

حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب

پورا شعر وہ بھی نہیں، کیونکہ ان کی توجہ کا مستحق تو چارگرہ کپڑا ہی ہوسکتا ہے۔

بہرحال اوایل عمر میں وہ کیا تھے اور کیا ہیں۔ اس سے بحث فضول ہے۔ ہمیں تو فراغت تعلیم کے بعد اُن کی زندگی کے صرف اس پہلو سے بحث کرنا ہے جسے ازدواجی یا اہلی پہلو سے موسوم کیا جاتا ہے۔

انگریزی میں ایک فقرہ ہے "Freaks of nature" اس کا ترجمہ آپ خواہ "فلتات فطرت" کہئے یا "لاتدبیرات فطرت" صاف اردو میں، اُسے میں "قدرت کا کھلنڈراپن" کہتا ہوں ——— یعنی ———

اب آپ غور کیجئے کہ ایک بھینس، بچہ جنتی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ معمولی اعضا رکا ہو، بجائے ایک سر کے دو سر نظر آتے ہیں بھینس کا مالک افسردہ و ملول ہوجاتا ہے۔ لیکن قدرت ہنستی ہے کہ اس نے تو گوالے سے گویا " فراموس کہکر" اپنا کھیل پوری طرح کھیل لیا ــــ ایک عورت دردزہ میں مبتلا ہے، گھر والے انتظار کر رہے ہیں کہ اب جیتا جاگتا بچہ پیدا ہونے والا ہے، لیکن وہاں بجائے کسی انسانی بچہ کے سانپ کے بہت سے بچے کلبلاتے ہوئے نکل پڑتے ہیں — عورتیں گھبرا کر بھاگ جاتی ہیں، لیکن قدرت خوش ہے کہ اس نے گویا " ہَو " سے کرکے سب کو ڈرا ہی دیا۔

پھر قدرت کے یہ کھیل صرف حیاتیات (Biology) ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں کبھی کبھی اس کھلنڈرے پن سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ انتظام علی کا نکاح بھی انھیں "ملاعبات قدرت" میں سے تھا کہ بیوی ملی انھیں وہ جسے کوئی دور کی نسبت بھی ان کے ذوق سے نہ تھی ــــ یعنی یہ جس چیز سے جتنا بھاگتے تھے۔ اسیقدر وہ اس جانب ملتفت تھی۔ اور ان کو جس طرف جتنا میلان تھا اتنا ہی ادھر تنفر تھا، یہ اگر موسیقی کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے تو اس کا یہ عالم تھا کہ دیگچی بھونتے وقت بھی گنگنا تا بند نہ ہوتا، یہ اگر پیسہ کی کھیلیں خریدتے وقت پہلے ایک من لوہے کا بھاؤ دریافت کرتے تھے تو اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ایک من آٹا تو لنے پر اگر بیس سیر بھی کم " نکلے تو " اونھ " کہہ کے ٹال دیا جاتا تھا ــــ!

شعر و شاعری میں انھیں لے دے کے صرف ایک شعر " چار گرہ کپڑے " والا خدا جانے کس طرح یاد رہ گیا تھا۔ اور اس طرف یہ کیفیت تھی کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر پڑھ دینا ضروری۔

انتظام علی نے اپنی عمر میں شاید ہی کوئی مضمون لٹریچر کا کسی موضوع پر پڑھا ہو۔ اور ادھر ادبیت کا زور کہ جب تک رات کو دو تین رسالے نگاہ سے نہ گزر جائیں نیند آنا دشوار۔

وہ کسقدر بے چین رہتی تھی کہ اپنے لکھے ہوئے مضامین انھیں سنائے، اور داد لے لیکن اس طرف عالم احتراز کہ کھانا کھایا اور فوراً باہر کہ مبادا کوئی ذکر ایسا چھڑ جائے۔

ان حضرت کے نزدیک شادی کا مقصود سوا اس کے کچھ نہ تھا۔ کہ نظام تمدن میں مفید حصہ لینے کے لئے مرد کو ایک رفیق کار میسر آجاتا ہے اور بیگم کا نظریہ یہ تھا کہ ازدواج نام ہے ایک ایسے شخص کی فراہمی کا جو روپیہ کے ساتھ اپنا دل و دماغ بھی غلامی کے لئے پیش کر دیتا ہے ــــ

الغرض یہ تھا دونوں کا رنگ طبیعت جسے قدرت نے ملا کر اپنی تفریح کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ شادی کے چند دن بعد تک تو ان دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چلا کہ کعبہ کی طرف کون جا رہا ہے اور ترکستان کی راہ کس نے اختیار کی ہے، لیکن جب چند دن کے بعد اجنبیت میں کچھ کمی ہوئی۔ اور نسبتاً بے تکلفی پیدا ہو چکی تو سب سے پہلے بیگم ہی کو یہ فکر لاحق ہوئی۔ کہ دیکھیں انتظام علی صاحب صرف " انتظام علی " ہی انتظام علی ہیں یا ان میں کچھ ذوق شعری بھی پایا جاتا ہے۔

ہر چند وہ شادی سے قبل ہی ان کا غیر شاعرانہ نام سنکر کھٹک گئی تھی کہ ایسا بنیوں کا سا نام رکھنے والا آدمی کیا ادبی ذوق رکھ سکتا ہے، لیکن اس نے یہ سمجھ کر تسکین کرلی۔ کہ ممکن ہے کوئی اچھا تخلص رکھ کر اس کی تلافی کرلی گئی ہو۔

اس جستجو میں سب سے پہلے بیگم نے انتظام علی صاحب کی لائبریری اور ان کے کاغذات کا جائزہ لینا شروع کیا، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ الماری میں کوئی ایک کتاب بھی اُردو فارسی کی نہیں ہے۔ اور انگریزی میں بھی صرف وہی کتابیں ہیں جنکا تعلق تجارت، زراعت، مالیات، میزانیات، سرمایہ، دولت، اور مزدوری وغیرہ سے ہے۔ وہ حیران تھی کہ یہ کوئی آدمی ہے یا ٹھیکہ دار کہ سوائے اس قسم کی کتابوں کے کوئی اور کتاب ہی نظر نہیں آتی۔ کاغذات اُلٹ پلٹ کے دیکھے لیکن وہاں بھی کوئی جھلک امید کی اسے نظر نہ آئی۔ بعض بعض کتابوں پر ان کا نام بھی درج تھا۔ لیکن نہایت احتیاط سے صاف صاف ایک ایک حرف لکھا ہوا تھا۔ وہ دل میں ہنسی کہ "انتظام علی" بھی کوئی ایسا نام تھا جسے اتنی احتیاط سے لکھا جاتا۔ اور پھر یہی نہیں کہ صرف "انتظام" لکھدیا جاتا علی کا لفظ ضروری تھا۔ گویا یہ نہ لکھا جاتا تو کوئی اور ان کتابوں پر دعوے کر بیٹھتا ———

ایک دن انتظام علی صاحب کالج سے (جہاں وہ آج کل لکچرار کی خدمت پر مامور تھے) بہت خوش خوش واپس آئے، کیونکہ زراعت پیشہ طبقہ کے متعلق جو مقالہ انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کی خوبی کا حکومت نے اعتراف کیا۔ اور خود گورنر نے ملاقات کے لئے ان کو طلب کیا تھا۔ گھر میں آئے تو سخت بیتاب تھے کہ کوئی اُن سے پوچھتا۔ اور وہ بتاتے کہ ان کی محنت کی کیا داد ملی ہے، ادھر بیوی ان کو غیر معمولی طور پر مسرور دیکھ کر یہ سمجھی کہ آج میاں غالباً شاعری کی جون میں آئے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹتے ہی یہ سوال کر بیٹھی کہ "آج آپ بہت خوش ہیں، کیا کوئی اچھا شعر قلم سے نکل گیا ہے"

انتظام علی صاحب جن پر اس وقت نشۂ اقتصادیات پوری طرح مسلط تھا، شعر کا نام سنکر اس طرح چونک پڑے جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چونک کر بولے ——— "شعر! خوب کہی، شعر و شاعری بھی ایسی چیز ہے۔ جس پر کوئی انسان توجہ کرے"۔

یہ سنکر بیگم صاحب کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ لیکن بہت ضبط سے کام لیا۔ اور بولیں کہ "یہ جو تمام دنیا میں ہزاروں لاکھوں شاعر پیدا ہوئے، سب بیکار ہی تھے۔ اور زمانہ بھی نہایت احمق تھا کہ ان کے کلام کی قدر کی"۔

انتظام علی ——— "یہ بھی کوئی دلیل ہوئی؟ محض کسی چیز کا پیدا ہو جانا اس کے مفید ہونے کا ثبوت نہیں۔ مچھروں مکھیوں کی پیداوار شاعروں سے زیادہ ہے۔ لیکن بتائیے کہ سوائے ملیریا اور بیماریاں پھیلانے کے ان سے کیا فائدہ ہے۔ رہا قدر کرنا، سو ان کی قدر کرنے والے بھی وہی ہیں۔ جو شاعر ہوتے ہوتے رہ گئے"۔

بیگم۔ (بگڑ کر) جب کوئی کام کسی سے بن نہ پڑے تو یوں ہی کہنا چاہئے۔ سچ ہے جب آنگن ہی ٹیڑھا ہو تو ناچنے والا کیا کر سکتا ہے؟

انتظام علی — تم بھی کیا باتیں کر رہی ہو۔ شعر اور کسی سے بن نہ پڑے۔ یہ بھی گویا ریاضی کا کوئی مسئلہ ہوگیا، علم الکیمیا کا کوئی معمہ ٹھہرا کہ ہر شخص اس کے سمجھنے یا حل کرنے کا اہل نہیں۔ چند الفاظ ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیئے اور کوئی مہمل سی بات کہدی شعر ہوگیا۔

بیگم — شعر کی یہ تعریف آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص اسکو کہہ سکتا ہے جو قدرت سے خاص دماغ لیکر آیا ہو۔ اور جذبات انسانی کے اظہار پر پوری قدرت رکھتا ہو۔

انتظام علی — شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں اس سے بحث نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ اور اس تعلیم سے سوائے نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔ حالات کا اقتضاء تو یہ ہے کہ پیوند لگا لگا کر کپڑے کا استعمال کیا جائے۔ اور ادھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریبان کا چاک ملا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان کی دھجیوں کو کب تک کوئی رفو کریگا۔ اور ان کی اس غیر مہذب و مسرف تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہوگا۔"

بیوی۔ (ہنسکر) ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینا چاہئے۔ کہاں شاعر کا چاک گریباں اور کہا آپ کا یہ اقتصادی رفو۔ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر نکل جائے۔

انتظام علی — کس کے کپڑے۔

بیوی۔ (غصہ سے) اپنے اور کس کے۔

انتظام علی — غنیمت ہے میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔

یہ تھی سب سے پہلی گفتگو شاعری کے متعلق جو میاں بیوی میں ہوئی۔ اور جس نے ہمیشہ کے لئے بیوی کو شوہر کی طرف سے مایوس کر دیا۔

انتظام علی شاعر نہ سہی لیکن بہر حال ایک فاضل شخص تھے، نفسیات انسانی سے بے خبر نہیں تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بیوی کا کیا رنگ ہے۔ اور اچھی طرح واقف تھے کہ اس لحاظ سے وہ کوئی دلجوئی اس کی نہ کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بیوی بہت محبت کرنے والی ہے، نہایت مطیع و وفا شعار ہے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اس کے ذوق کی رعایت کر سکیں۔

اس گفتگو کے چند دن بعد شام کو کامل ایک گھنٹہ تنہائی میں بیٹھ کر انھوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور سوچتے رہے۔ کہ اگر کبھی کبھی وہ اپنی طبیعت کے خلاف محض بیوی کو خوش کرنے کے لئے شعر و ادب کے ذکر کو بھی گوارہ کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ کیونکہ یوں بھی اصولاً جب گھر میں کسی چیز کی "مطلب" ناگزیر ہو جائے تو اس کی "فراہمی" ضروری ہے۔

انھوں نے فوراً اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے بازار سے دیوان غالب کا نہایت مکلف اڈیشن منگوایا۔ اور سب سے

پہلے وہ غزل نکالی جس کا ایک شعر انھیں عرصہ سے یاد تھا۔

انھوں نے ہر ہر شعر کو بار بار پڑھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھیں ہر مرتبہ اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا۔ نہ اُنکی سمجھ میں یہ آیا کہ " در و دیوار سے بیابان کیونکر ٹپک سکتا ہے" نہ " جوہر آئینہ" کا "مژگاں" بننا ان کی عقل میں آیا۔ نہ "عید نظارہ" کا صحیح مفہوم ان کو معلوم ہوسکا۔ اور نہ " داغ تمنائے نشاط" کا مطلب ان کے ذہن نشین ہوا۔ البتہ جب وہ مقطع پر پہونچے تو دماغ کی تشویش کچھ کم ہوئی۔ اور دیر تک اس کو پڑھتے رہے:۔

حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب

جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

سوچتے سوچتے انھوں نے کتاب کو ایک طرف رکھدیا۔ اور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئے۔ کبھی وہ پنسل کی نوک کو زبان پر رکھکر اور پھر ایک لفظ لکھ کر دیر تک سوچتے۔ کبھی چھت کو دیکھ کر انگلیوں کو میز پر ہارمونیم کی طرح دیر تک چلاتے رہتے۔ اور پنسل سے کوئی نشان کاغذ پر بنادیتے۔

کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے، الغرض پورے ایک گھنٹہ تک اسی طرح کی عجیب و غریب حرکتیں کرنے کے بعد، ان کے چہرے پر آثارِ مسرت ظاہر ہوئے۔ اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا۔ اسے ایک کاغذ پر صاف کیا۔ اور احتیاط سے جیب میں رکھکر اس شان سے صحن میں چہل قدمی فرمانے لگے، گویا نپولین کو کوئی نئی تدبیر دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کی سوجھ گئی ہے۔

شام کو گھر میں گئے تو بہت خوش خوش تھے۔ بیوی بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ لیکن کسی خیال میں محو تھیں۔ انھوں نے جاتے ہی دیوان غالب پیش کرتے ہوئے کہا کہ " بیگم آج میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شاعری نہ ایسی بُری چیز ہے نہ ویسی مشکل۔ جرمنی کا چھپا ہوا نیا اڈیشن غالب کا مجھے بہت پسند آیا۔ اسے تم اپنی لائبریری میں رکھ لو۔" بیوی نے مسکراتے ہوئے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اور دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولی کہ " واقعی نہایت پاکیزہ چھپا ہے۔ شکریہ"

انتظام علی ــــ " غالب اچھا شاعر تھا "

بیوی ــــ " ہوگا، مجھے کیا معلوم؟

انتظام علی ــــ (حیرت سے) ہوگا۔ کیوں کیا شاعری سے تمھیں دلچسپی نہیں رہی "

بیوی ــــ " جی نہیں "

انتظام علی ــــ خوب، یہ عجیب بات ہے کہ جب میں نے غزل کہنا شروع کی تو تمھیں شاعری سے دلچسپی جاتی رہی ابھی ضد ہے تو (جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے) اتنی محنت میں نے یوں ہی فضول کی "

بیوی — (حیرت سے) آپ اور غزل!

انتظام علی — "کیا تم مذاق سمجھتی ہو۔ یہ دیکھو۔ میری پہلی کوشش ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ ناکامیاب نہیں رہی۔ پہلا شعر — پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا۔ اچھا مطلع سنو۔

ہم نہیں وہ جنھیں آتا ہی پریشاں ہونا مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

بیوی — (مسکرا کر) سبحان اللہ کیا کہنا۔

انتظام علی (خوش ہوکر) اچھا دوسرا شعر سنو۔ اسی سلسلہ کا ہے:۔

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب نام کس چیز کا ہو سر بگریباں ہونا

بیوی — تو یوں کہئے، کہ آپ نے قطعہ فرمایا ہے۔

انتظام علی (حیرت سے) اسے قطعہ کہتے ہیں۔ اچھا آج قطعہ سن لو، کل غزل بھی سن لینا۔ تیسرا شعر سنو۔ اس میں میرا نام بھی ہے۔

کیوں وہاں تم گئے بیکار کو اے انتظام کس نے تم سے کہا وہاں جاکر یا جولاں ہونا

بیوی جو اس وقت تک اپنی ہنسی کو روک رہی تھی مقطع سنکر بالکل بے اختیار ہوگئی۔ انتظام علی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ یہ ہنسی کا کیا موقع ہے۔

بیوی (ہنستے ہوئے) آپ کا آخری شعر تو تقطیع سے بالکل گر گیا۔

انتظام علی (سنجیدگی کے ساتھ) تقطیع سے گر گیا! ۔ تو کیا ہوا۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی۔ شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اور تم نے تو دیگچی گرا کر ہر دفعہ کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔

یہ تھی دوسری صحبت شعر و سخن جو انتظام علی صاحب کے گھر میں منعقد ہوئی اور ہنسی مذاق پر ختم ہوگئی۔ بیوی سمجھتی تھی کہ جو کچھ ہوا۔ صرف مذاق تھا۔ اور انتظام علی صاحب نے قصداً محض تفنن طبع کے لئے غزل کہی تھی۔ لیکن ادہر بیوی کی یہ بات چوٹ کی طرح دل پر لگی کہ "مقطع تقطیع سے گر گیا" اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ غزل گوئی کی طرف توجہ شروع کردی۔ یہاں تک کہ صبح ہوئی اور غزل سنانے بیٹھ گئے، دوپہر ہوئی اور دوسری غزل سامنے کردی، یہاں تک کہ سونے سے قبل روزانہ تین چار غزلوں کا تیار کرلینا۔ اور بیوی کو سنانا۔ ان کے فرائض میں داخل ہوگیا۔ بیوی حیران تھی کہ اس بلا کو کس طرح دور کرے۔ اور ان کی غزلیں سن سن کر جو نفرت شاعری سے اس کو ہوتی جارہی ہے۔ اس کا کیا علاج کرے۔ وہ اب ہنس بھی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ انتظام علی صاحب کو ناگوار ہوتا تھا، وہ منع بھی نہ کرسکتی تھی کہ یہ بھی گویا ایک قسم کی مخالفانہ تنقید تھی۔

ایک دن حسب معمول صبح ہی صبح انتظام علی صاحب ہاتھ میں غزل لئے ہوئے مردانخانہ سے اُٹھ کر اندر آئے تو دیکھا کہ بیوی جو کی پر نماز پڑھ رہی ہیں۔ یہ وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس ارادہ سے کہ سلام پھیرتے ہی یہ اپنا وظیفہ شروع کر دیں گے، لیکن بیوی نے نماز ختم کرتے ہی فوراً "عقدانامل" پر اسمار الٰہی کا ورد شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ رحل سے قرآن شریف اٹھا کر اس کو کھولنے لگیں۔

انتظام علی صاحب کو بہت حیرت تھی کہ خلاف معمول بیوی نے نماز کیا سمجھ کر شروع کر دی۔ کیونکہ آج تک کبھی کسی قسم کی عبادت میں ان کو مشغول نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرتے رہے، لیکن جب بیوی نے کلام مجید سنبھالا تو یہ سمجھے کہ جلد فارغ ہونا مشکل ہے۔ اور باہر چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر اندر آئے تو بیوی بدستور کلام مجید کی تلاوت میں مصروف تھیں، دیکھ کر پھر چلے گئے۔ الغرض دس بجے تک کوئی دس مرتبہ انھوں نے غزل سنانے کی کوشش کی اور ہر بار ناکام ہوئے۔ جب کھانا کھا کر کالج جانے کا وقت آگیا تو بیوی فارغ ہوئیں اور سیدھی باورچی خانہ جا کر کھانا نکالنے میں مصروف ہو گئیں۔

۴ بجے شام کو انتظام علی صاحب زیادہ جوش وولولہ کے ساتھ واپس آئے۔ کیونکہ اب بجائے ایک کے دو غزلیں سنانا تھیں، لیکن گھر پہونچ کر انھیں سخت مایوسی ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ بیوی پھر مصروف تلاوت ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں باہر واپس گئے۔ اور خادمہ کو بُلا کر پوچھا کہ "کیا بیگم نے آج دن بھر تلاوت کی ہے"۔ لیکن۔ جب معلوم ہوا کہ ابھی ابھی عصر کی نماز کے بعد بیٹھی ہیں تو خاموش ہو گئے۔ اور شام کی غزل گوئی ملتوی کر دی۔

مغرب کے وقت تک کئی بار انھوں نے دیکھا کہ بیوی فارغ ہوئیں یا نہیں۔ لیکن انھیں برابر اسی طرح خشوع وخضوع کے ساتھ تلاوت میں منہمک دیکھ کر یہ بھی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اور پھر انھیں نہ معلوم ہو سکا کہ عشا کے بعد کس وقت تک وہ مصلے پر بیٹھی رہیں۔

انتظام علی سمجھتے تھے کہ ایک آدھ روز میں بیوی کا یہ جوش تسبیح وتہلیل ختم ہو جائے گا۔ لیکن جب مسلسل کئی دن تک انھوں نے یہی عالم دیکھا تو گھبرائے کہ بیوی بڑھتے بڑھتے کسی دن ترک دنیا نہ کر دیں۔ اور آخر کار ایک رات سوتے وقت موقعہ پا کر انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ "یہ نماز روزہ کا دورہ آپ پر کب تک پڑتا رہے گا"

بیوی۔ (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے — خوب، آپکے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔

انتظام علی — نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسوقت تک تو تم نے کبھی بھول کر بھی کوئی سجدہ نہ کیا تھا، پھر اب جو اس کا خیال آیا۔ تو کیوں اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی جو کی پر تیمم کرنے کی سی کا تودہ بنی بیٹھی ہیں۔

بیوی ۔۔۔ " لاحول ولاقوة، چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ نماز روزہ کے ساتھ مذاق کیسا؟

انتظام علی ۔۔۔ " مذاق میں تو نہیں کر رہا، تمھیں کر رہی ہو۔ میں نماز کو منع نہیں کرتا، تلاوت سے نہیں روکتا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے، تمھاری بھی عجیب باتیں ہیں۔ نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کا نام نہ لیا اور عبادت پر آئیں تو اس شان کے ساتھ کہ گھر کو مسجد و خانقاہ بنا کے رکھدیا۔

بیوی ۔۔۔ (تنک کر) خیر ہوگا، آپ کو اس سے کیا، میں نے نماز نہیں پڑھی تھی تو خدا کا گناہ کیا تھا، اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے کسی کو کیا؟

انتظام علی ۔۔۔ " مجھے یہ کہ جس دن سے آپ نے نماز شروع کی ہے۔ صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں، سنانے کا موقع ملے تو اور کہوں۔ مجھے تو اس سال پورا دیوان ختم کرنا ہے۔ آخر یہ کام کیسے چلے گا،

۔۔۔ بیوی نے اس اندیشہ سے کہ کہیں فوراً غزلخوانی نہ شروع ہو جائے، کوئی جواب نہ دیا۔ اور کروٹ لے کر اس طرح سانسیں لینے لگیں جیسے نیند سے مغلوب ہوں۔

انتظام علی صاحب نے ایک آدہ مرتبہ آواز بھی دی لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو خاموش ہو کر خود بھی لیٹ گئے۔

کامل ایک ہفتہ اسی حال میں گزر گیا کہ انتظام علی صاحب جب اندر آتے ہیں۔ بیوی نماز و تلاوت میں مشغول ہوتی ہیں اور جب یہ کوئی ذکر اس قسم کا چھیڑتے ہیں تو وہ ٹال جاتی ہیں۔

ایک دن انھوں نے یہ ترکیب کی کہ رات کو چپکے سے اٹھکر بیوی کا مصلا اور تسبیح و قرآن سب چھپا دیا صبح کو جب وہ اٹھیں اور وضو کر کے نماز کے ارادہ سے چوکی پر گئیں تو وہاں صفایا تھا۔ خادمہ کو آواز دی۔ اور پوچھا کہ مصلا کہاں گیا۔ لیکن اسے کیا خبر تھی۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور بیوی کو غصہ آگیا ۔۔۔۔ جب بات زیادہ بڑھتی دیکھی تو انتظام علی صاحب بیوی کا تمام اسباب عبادت لئے ہوئے سامنے آئے اور کہا کہ " بیگم یہ ہے۔ آپ کا تمام عاشور خانہ، لیکن خدا کے لئے یہ بتا دو کہ یہ چلہ کتنے دن تک قایم رہے گا۔ تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر نکل جاؤں،

۔۔۔ بیوی اس ادا کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ سچ سچ کہوں گی تو آپ کو ناگوار ہوگا۔

انتظام علی صاحب نے اس جگہ بیوی کی جانماز، تسبیح اور قرآن مجید سب کو سر پر رکھ کر کہا کہ " قسم لے لو جو کچھ کہوں "

۔۔۔ بیوی نے کہا کہ " وعدہ کیجئے آج سے آپ نہ کبھی کوئی شعر کہیں گے۔ نہ مجھے سنائیں گے "

انتظام علی صاحب (حیرت سے) لاحول ولاقوة، میں تو یہ سب کچھ تمھاری خوشی کے لئے کرتا تھا۔ تم نہیں پسند

کریں، تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضائع کروں۔"

بیوی ــــ "ہاں میری خوشی ہو چکی، اب میری مرضی یہی ہے کہ آیندہ کے لئے آپ اس سے توبہ کیجئے۔

انتظام علی ــــ "اچھا میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن آپ . . . . ؟"

بیوی ــــ (ہنستے ہوئے) خدا تمھیں خیر دے، نماز سے توبہ کراتے ہو، جس نے تم سے شاعری کی لت چھوڑ دالی۔

انتظام علی ــــ "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو، جس نے تمھیں نماز کی عادت ڈلوائی۔

نیاز

فراست الید ۔ مولفہ نیاز فتحپوری۔ جس کے مطالعہ سے ایک شخص بہ آسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسروں کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، نیز حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

جذبات بھاشا ۔ جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے علاوہ محصول ۱۲ر

شاعر کا انجام ۔ جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ قیمت ۱۰ر

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبولیت حاصل کیا اس کا انداز اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے قیمت صرف عـ۸ـر

گہوارۂ تمدن ۔ (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکۃ آرا کتاب جس میں تاریخ اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے۔ اور دنیا، تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۶ار

شہاب کی سرگزشت ۔ حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اس کی تخئیل اس کی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

تذکرۂ خندۂ گل مولفہ عبدالباری آسی جس میں ۲۰۰ سے زاید اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ اُن کے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت معہ محصول ۸ار

مثنوی لالہ رخ ۔ طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ، ادبی شاہکار کا بےمثل نمونہ قیمت معہ محصول ۱۲

مینیجر نگار

پیام بیداری

چھا رہی ہے، زیرِ گردوں تیرگی سی تیرگی
کسقدر صبر آزما ہے رات کی افسردگی

یہ وہی ہے صبح کی دنیا، مگر کتنی عجیب!
قبر سے بڑھ کر بھیانک، موت سے زاید مہیب!!

کھا رہا ہے پستیوں میں ٹھوکریں پندار اوج
رہ گئی ہے مضمحل ہو کر مے ہستی کی موج

سسکیاں سی لے رہی ہے شاہدِ بزمِ حیات
یہ ہوائیں ہیں کہ ماتم کر رہی ہے کائنات

ہنس رہا ہے قسمتِ انساں پہ، شیطان لعیں
کانپتی ہے قہقہوں کی تلخ شورش میں فضا

موت ہے، اے بیخبر انساں، مآل ترک و تاز
آہ، اس دنیا کے چھوٹے سے کُرے کا جوشِ ناز

ہو رہی ہے محفلِ گیتی شبیہ رنج و یاس
دیکھ! میرے جھونپڑے کی شمع ہے کتنی اداس

اس اُداسی میں بھی ہے، لیکن معارف کا جلال
بادہ افشاں ہے مری خلوت میں ہستی کا جمال

سطح پر رخشاں نظر آتے ہیں اسرارِ حیات
مسکراتی ہے نقاب الٹے، عروس کائنات

تیرگی میں گرچہ افسردہ ہے گیتی کی امنگ
میرے آگے کر رہی ہے رقص، بموجِ رنگ رنگ

ہو چکی ہے ختم گو ہستی کے ساغر کی کھنک
میں ابھی تک سن رہا ہوں نبضِ فطرت کی دھمک

روحِ عالم پر ہے اک خوابِ گراں چھایا ہوا
منظرِ حسنِ حقیقت ہے یہاں چھایا ہوا

ہمنشیں! لیکن اسی نورِ بصیرت کی قسم　　بڑھ چکے ہیں حد سے اب تاریک دنیا کے ستم
خون دل کی ناتواں موجوں میں لرزش تابکے　　میری ان ڈوبی ہوئی نبضوں میں جنبش تابکے
گریہی جوش ہوا ہی، دشمن ضبط و فراغ　　تھرتھرا کر بجھنے والی ہے مری شمع دماغ
ہے جو یہ دم گھونٹنے والی فضائے صبح و شام　　خود بکھر جائیگا ان کمزور سانسوں کا نظام

سرد مہری ہی یہی گر اہل دنیا کا شعار
بجھ کے رہ جائیگا میری زندگانی کا شرار

دیکھ! ہی وہ سامنے اک خوش فضا قصرِ بلند　　کسقدر آراستہ، ظاہر میں کتنا ارجمند
قہقہوں کی گونج سے بیدار ہوتے ہیں دماغ　　زندگی اس قصر میں ہی اک حسیں موجِ فراغ
حسن بھی ہی، نغمہ بھی، مے بھی ہی، مے آشام بھی　　صبح کے مانند روشن ہی یہاں کی شام بھی
اس فضا میں دخل پا سکتے نہیں، حزن و ملال　　زندگی ہے اور شرابِ نکہت و رنگ و جمال
ہے انہیں انوار سے رخشاں زمانے کی جبیں　　وہ یہی جلوے ہیں جن پر ناز کرتی ہے زمیں

لیکن اس عشرتکدے کو غور سے ہمراز! دیکھ　　آ ذرا بے پردہ بزمِ زندگی کا راز دیکھ
دیکھنا، رشکِ سحر ہی، جن چراغوں کی بہا　　ان کے سائے میں ہیں کتنی سرد روحیں بیقرار
سُن! کہ جن سازوں کی ہر آواز ہی فردوسِ گوش　　کانپتا ہی انکی لے میں کتنے نالوں کا خروش
ہوشیار! اس بزم میں چلتے نہیں جامِ شراب　　یہ دلوں کا خون ہی یا روحِ انسانی کی آب
سوچ! ہی ان قہقہوں کی تہ میں شیطانی ہنسی　　بے نیازی، باطل آرائی، خداوندی، خودی
جا نہ ان چہروں کی شادابی پہ، ہیں جو لالہ فام　　آہ یہ تاریک باطن، دولت و زر کے غلام!
ان کی روحیں وقف ہیں بندِ غلامی کیلئے　　ناشناسی، خود فریبی، ناتمامی کے لئے
دیکھ! وہ تھرا رہی ہی چرخ پر، برقِ عذاب　　عصمتوں کے خون سے رنگین ہی انکا شباب

بیخودی سی ہستیٔ شاعر پہ تھی چھائی ہوئی — اضطراری جنبشیں، آواز تھرائی ہوئی
کہہ رہا تھا یہ حدیثِ درد و غم دیوانہ وار — کسقدر بیتاب، محو رنج، کتنا بے قرار
میں نے پوچھا، ای کہ تجھ سے بزمِ گیتی کی بہار! — ای کہ تیری روح پر اسرارِ ہستی آشکار!
آج یہ کیا ہے کہ تیرا قلب یوں بیتاب ہے — گفتگو بے ربط، لب ہیں خشک، رخ بے آب ہے
بھول بیٹھا آج پیغامِ محبت کس لئے — تجھ کو ہے دنیا کے ظلم ہیں کی شکایت کس لئے

کچھ بتا تو اے فروغِ بزمِ فطرت، نکتہ سنج!
ہم بھی شاید کر سکیں سعیٔ دوائے درد و رنج

سُن کے یہ تیزی سے پلٹا، شاعرِ درد آشنا — میرے چہرے پر جمادی پھر نظر، اور یوں کہا
آہ، دنیا کے عمل سے بیخبر، معصوم روح! — تو کہاں اور ای تہی ساغر! کہاں کیفِ صبوح
کھوکھلے دعووں سے میرے زخم بھر سکتے نہیں — اہلِ دنیا، منھ سے جو کہتے ہیں کر سکتے نہیں
بڑھتے جائیں گے یہ میرے دامنِ ہستی کے چاک — نذرِ موجِ باد ہو جائیگی میری مشتِ خاک
لیکن اب حد سے تجاوز کر چکا صبر و شکیب — یاد رکھو، چل سکے گا اب نہ باطل کا فریب
چھا رہا ہے ابرِ یکرنگی، قریب و دور پر — عیش کر سکتے نہیں تم محنتِ مزدور پر

قصر و بام و سقف و ایوان و مکاں گرنے لگیں
ہوشیار اس وقت سے جب بجلیاں گرنے لگیں

علی اختر (از حیدرآباد دکن)

عہد گزشتہ کی ایک سیر گاہ

آنکلے ہو تو دم بھر ٹھہر ذرا حریفو!
ہم اس زمیں پہ کیا کیا فتنے جگا چکے ہیں

کیسی یہ جلد بازی، دیکھو تو یہ بہاریں
یاں دامنوں کے کیا کیا پرزے اڑا چکے ہیں

ہاں یہ وہی ندی ہے، جس میں نہا نہا کر
کتنے ہی ساونوں میں طوفاں اٹھا چکے ہیں

ساحل پہ کرم خوردہ، یہ کشتیاں وہی ہیں
جنمیں خم و سبو کے دریا بہا چکے ہیں

یہ سبزہ ہے جہاں ہم سوئے ہوؤں کے منہ پر
صہبا چھڑک چھڑک کر اکثر جگا چکے ہیں

اس سامنے کے بن میں نغمے سنا سنا کر
لب کیسے انکھڑیوں کو طرب بلا چکے ہیں

ہاں یہ وہی چمن ہے جس میں فروغ مے سے
کلیاں سی، کمسنوں کے رخ پر کھلا چکے ہیں

دیکھو یہ بوستاں ہے، جس بوستاں میں اکثر
کیا کیا جوانیوں کی عیدیں منا چکے ہیں

ہاں اسطرف یہ دیکھو، سرشار وادیاں ہیں
ان وادیوں میں کیا کیا دھومیں مچا چکے ہیں

قائم رہے الٰہی یہ جوش کی نشانی
اس سرزمیں پہ کیا کیا معشوق آ چکے ہیں

طعن بے اثر

ای شیخ شہر، خرقۂ سالوس اتار دے
دل کو بھی کاکلوں کی طرح اب سنوار دے

بنیاد کاروبار ہے جس ماہوش کا نام
اس ماہوش کو خلوت جاں میں بھی بار دے

تا چند منعموں کے لئے مژدۂ چمن
خود کو بھی اب پیام نسیم بہار دے

تا چند اہل زر کے نکھارا کرے گا رنگ
اپنے بھی دل کا رنگ عذار انکھار دے

ہر دل پہ کندہ کرتا ہے جو نقش دلنشیں
خود اپنی لوح دل پہ وہی نقش ابھار دے

جس درس پر مدار ہے تیرے عروج کا
اپنے کو بھی وہ درس تمنائے یار دے

اس ظاہری کلاہ کی تزئین تا کجا
باطن کے تاج کو بھی در شاہوار دے

کیا مسکرا کے جوش دیا شیخ نے جواب
"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"

جوش (ملیح آبادی)

آجا

آجا سکونِ دردِ تمنا لئے ہوئے — پلکوں کی اوٹ قلزمِ صہبا لئے ہوئے!

پھر لوٹ لے خدا کیلئے دولتِ سکوں — گیسو بدوش۔ساغر و مینا لئے ہوئے!

آ! اے بہارِ باغ کہ پھر منتظر ہے آج — نرگس کی آنکھ ذوقِ تماشا لئے ہوئے!

للہ دو قدم اسی انداز سے خرام — ہر گام پر ہوا کا سہارا لئے ہوئے!

آ غمکدے میں پھر اسی عنوان سے در آ — صد شکوہ ہائے جور اعزا لئے ہوئے!

ہاں پھر وہی تبسمِ محجوب زیرِ لب — عارض کی سرخی نمیں فسانہ لئے ہوئے!

پھر پھیر لے خدا کیلئے یکسبیک نگاہ — دل میں غبارِ رنجشِ بیجا لئے ہوئے!

ہاں ابتدا سے پھر وہی طالبِ حدیثِ شوق

"آجا سکونِ دردِ تمنا لئے ہوئے!"

طالب باغپتی

وجدانیات

سحر کا عالم ہے بارشِ نور سے فضا جگمگا رہی ہے — کوئی حسینہ تجلیوں کے خموش دریا بہا رہی ہے

چمن کی رنگین وسعتوں میں ستارِ ہستی لرز رہا ہے — بہار کی زر نگاریوں سے کلی کلی مسکرا رہی ہے

نگاہ میں روح کیف بھر دے دلوں کو مست خمار کردے — حریمِ ہستی کے ذرے ذرے کو عرش سے ہمکنار کردے

اٹھ! اے جنونِ خیر نغمہ گر آتشِ ترنم کو منتشر کر — فضائے عالم کو شعلہ افشاں نواؤں سے بیقرار کردے

باقی صدیقی

معلومات

تبدیل جنس کا عجیب واقعہ

حال ہی کا عجیب و غریب واقعہ ڈنمارک کے ایک مصور کا ظہور میں آیا جس میں دفعتہً علامات نسائی ظاہر ہونے لگیں اور جسم و روح کی سخت تکالیف اٹھانے کے بعد وہ آخرکار عورت بنا اور پھر مرگیا۔

اس کا نام واجنر تھا اور اپنے وطن ڈنمارک سے پیرس میں آیا تھا تاکہ نقاشی کا فن سیکھے یہاں اس کو خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔ اور ایک لڑکی سے جس کا نام گارڈا تھی شادی کرلی۔

ایک زمانہ ان دونوں کو مسرت و لطف کی زندگی بسر کرتے ہوئے گزر گیا۔ اور کوئی بات ایسی ظاہر نہ ہوئی۔ کہ ان کی مسرتوں میں کمی پیدا ہوتی۔ ایک دن اچانک واجنر نے اپنے اندر خاص قسم کا اضمحلال محسوس کیا۔ اور اُسے لوگوں کے پاس بیٹھتے شرم سی آنے لگی۔ اس تغیر روحانی کے چند دن بعد اس کے جسم میں بھی تغیر ہونے لگا یعنی وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا مردانہ عضو، نسائی عضو کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔

اس نے ایک نہایت مشہور ڈاکٹر "وارن کردس" سے مشورہ کیا اور ہفتوں تک معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے لما کہ " تم آہستہ آہستہ مرد سے عورت بنتے جارہے ہو، لیکن اگر تم عمل جراحی کے لئے راضی ہوجاؤ تو وہ نتیجہ جو برسوں کے بعد ظاہر ہونے والا ہے جلد ظاہر ہوسکتا ہے۔

یہ راضی ہوگیا اور کامل چھ ماہ کے اعمال جراحی کے بعد وہ مکمل عورت بن گیا۔ اور اس نے اپنا نام لیلا رکھ لیا۔ اس کی بیوی مجبوراً ایک اور اطالوی شخص سے شادی کرکے جس کا نام بورتا تھا چلی گئی۔

اتفاقاً چند ماہ کے بعد جب واجنر مصر کی سیاحت میں مصروف تھا کہ اس کی بیوی گارڈا اپنے نئے شوہر کے ساتھ نظر آئی اور اس نے اپنے پہلے شوہر کو دیکھ کر بہت افسوس کیا۔ کیونکہ یہ بہت نحیف حالت میں تھا۔ اور اس کی خدمت کرنے لگی۔ چند ماہ تک باہم قیام کرنے کے بعد واجنر یا لیلا کی صحت بہت اچھی ہوگئی۔ اور تمام مظاہر حسن و جمال کے لحاظ سے ایک نہایت ہی دل کش و حسین عورت کی طرح، تمام محافل رقصان و سرور میں اس کی پزیرائی ہونے لگی۔

چین کا فن گداگری

دنیا میں صرف چین ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں باقاعدہ گداگری کی تعلیم دیجاتی ہے اور جہاں ان کی منظم باقاعدہ جماعتیں ہیں جو ایک سردار کی ہدایات پر عمل کرتی ہیں۔ ان گداگروں کا بادشاہ الگ ہوتا ہے جو تمام خیرات کی رقموں کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اور حسب ضرورت

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول
" دوم
" سوم
الفاروق
سیرۃ النعمان
الغزالی
المامون
سوانح مولانا روم
سفرنامہ روم و شام
علم الکلام
الکلام
رسائل شبلی
مقالات شبلی
شعر العجم جلد اول
" دوم
" سوم
" چہارم
" پنجم
موازنہ انیس و دبیر
اورنگ زیب عالمگیر
آغاز اسلام
کلیات فارسی شبلی
کلیات شبلی اردو

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار
خدائی فوجدار
[illegible]
[illegible] ناول
[illegible]

سوانح عمر و عیار

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی ۸ر
حاجی بغلول ۸ر
پیاری دنیا ۸ر
کایا پلٹ ۸ر
میٹھی چھری ۶ر
طرحدار لونڈی
طلسمی فانوس

جوالا پرشاد برق

مزالتی ۱۰ر
مار آستین ۱۰ر
بنگالی دولہن ۱۲ر
معشوقۂ فرنگ ۸ر
پرتاب ۱۲ر
رو دہنی ۱۰ر

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی
ملک زنوبیہ ۳ر
قرۃ العین ۳ر
محذرات
جویائے حق
لعبت چین
فاتح و مفتوح
بابک خرمی
الفانسو ۱۲ر
ایام عرب
قیس و لبنیٰ
یوسف و نجمہ
زوال بغداد

مینا بازار
مقدس نازنین
رومۃ الکبریٰ
فلپانا
فتو قین کلہ
منصور موہنا
حسن انجلینا ۸ر
ملک العزیز ورجنا ۱۲ر
فردوس بریں ۸ر
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور ۱۰ر
غیب دان دولہن
بدر النساء کی مصیبت
میوۂ تلخ ۸ر
نیکی کا پھل

شوق قدوائی

ترانۂ شوق

قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب ۹ر
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

شعلۂ رنگین ۸ر
محاصرۂ بیروت
شیخ چلی
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس ۸ر

قطرتی جاسوس
ترکی حرم سرا ۸ر
جنگ طرابلس ۸ر
بہرام چور
زہر پرست
گنجی کا راز
عبدالرحمن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
سیاحت زمین
سیاحت ہوا
نازنین مراکش ۸ر
سمندر کی سیر
اسرار بالشویزم
روح لیلیٰ
امین کبک
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
بہرام کی رہائی
بہرام کی آزادی ۱۲ر
بہرام کی سرگذشت
لال کنور
برا سرار قتل

ادبی کتابیں

کمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
انشار نسواں ۶ر
مکاتیب محسن الملک

لیلیٰ مجنوں ڈراما

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر
مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعراء

تذکرہ حسینی ۱۱ر
گلشن ۱۰ر
سراپائے سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی ۱۲
دیوان حافظ
دیوان بیدل
دیوان عرفی ۱۲
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
دیوان ناصر علی ۶ر
کلیات سعدی
کلیات حزیں
دیوان عنصری ۱۴ر
دیوان غنی کشمیری ۶ر
دیوان ہلالی ۶ر

دواوین اردو

کلیات ظفر
کلیات مومن

دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند ۹ر
دیوان ذوق ۱۳ر
کلیات اسمٰعیل
مراۃ الغیب
صنمخانۂ عشق
فریاد داغ ۴ر
دیوان قاتل ۸ر
دیوان شہیدی ۴ر

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات
تصویر رنگین
" با تصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین و لیلیٰ
فریب حسن
سوز عشق
روزا لیمبرٹ
زوال اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس



تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی
مقالات اور افسانوں کا
مجموعہ۔ نگارستان نے ملک
میں جو درجہ قبولیت حاصل
کیا اس کا اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ اس کے مضامین
[illegible]
منتقل کئے گئے قیمت [illegible]

گہوارۂ تمدن

مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا
کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر
سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء
[illegible]
کتاب ہے قیمت علاوہ محصول [illegible]

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر
افسانہ جو اردو زبان میں بالکل
پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے
اصول پر لکھا گیا [illegible]
[illegible]
قیمت علاوہ محصول [illegible]

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے
مطالعہ سے ایک شخص با آسانی
ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں
کو دیکھ کر [illegible]
[illegible]
قیمت علاوہ محصول [illegible]

شاعر کا انجام

نیاز کے عنوان شباب
کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی
تمام نشہ بخش کیفیات اس کے
[illegible]
دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔
قیمت علاوہ محصول [illegible]

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ
تمہید کے ساتھ بہترین ہندی
شاعری کے نمونے پیش کرکے
[illegible]
قیمت [illegible] محصول

صحابیات

جس میں عہد سعادت کی وہ
خواتین کے مستند حالات یکجا
کر دیئے گئے ہیں اس کا مقدمہ
مولانا نے خاص [illegible]
میں لکھا ہے اس کتاب میں
[illegible]
صحابیات کے حالات درج
[illegible]
نفیس [illegible] قیمت [illegible]

نقاب اٹھ جانے کے بعد

تین افسانوں کا مجموعہ
جس میں بتایا گیا ہے کہ
[illegible]
[illegible] کے لحاظ
[illegible]
اور حضرت نیاز کا نام
کافی ضمانت ہے قیمت [illegible]
علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی [illegible]
جو ادبیات و تنقید عالیہ
[illegible]
[illegible]
قیمت [illegible]
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز
[illegible]
[illegible] کی
روحوں کے ساتھ
۱۔ [illegible]
۲۔ [illegible] کے کرشمے
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے قیمت [illegible]
علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کے تاریخ
تمدن الاسلام کی چوتھی
جلد کا ترجمہ جس میں عہد
بنی امیہ و بنی عباس کی
سیاسیات پر مفصل
تبصرہ کیا گیا ہے جرجی
زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی
شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت
[illegible] علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفیٰ کامل پاشا کی
مشہور عالم کتاب کا ترجمہ
یہ وہ کتاب ہے جس نے
یورپ و ایشیا کے
سیاسیات میں ہلچل ڈال دی
تھی اور جس نے سب سے پہلے
ترکی و مصر و عرب و حجاز
میں انقلاب کی [illegible]
قیمت [illegible] علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل

[illegible]
[illegible]
قیمت [illegible]

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ

[illegible] مثنوی
[illegible]
قیمت [illegible] محصول [illegible]

مثنوی زہر عشق

مرتبہ [illegible]
بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی
تصویریں [illegible] قیمت [illegible]

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو اور انگریزی [illegible]
تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال
چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم
کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب
قیمت [illegible] علاوہ محصول۔

فلکیات کے بعض دلچسپ حقایق

مسلسل

عطارد ہر چند ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ عطارد میں کسی ذی حیات کا وجود محال ہے۔ لیکن بعض قوی وجوہ اس خیال کی تائید میں ضرور موجود ہیں کہ عطارد میں کسی جاندار شے کا وجود سمجھ میں نہیں آتا۔

اول تو اس سیارہ کا مدار آفتاب سے اسقدر قریب ہے کہ اس کی سطح پر جو کچھ بھی مادۂ حیات رہا ہوگا وہ گرمی کی شدت سے جل کر بالکل فنا ہو گیا ہوگا،

پروفیسر ڈیوٹناڈ لکھتے ہیں کہ " عطارد کا رنگ بالکل چاند کی طرح زرد ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی طرح وہ بھی غیر آباد ہے ـــــ مسٹر لوویل کے مشاہدات اور ان نقشوں سے جو انھوں نے سطح عطارد کے متعلق تیار کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عطارد کے خطوط بالکل بے رنگ ہیں۔ اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اس سیارہ کی روزانہ گردش اور گردش فصلی ایک ہے یعنی قمر کی طرح عطارد کا بھی صرف نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی شعاعوں کے سامنے رہتا ہے۔

ایبے موریو کا خیال ہے کہ کرۂ عطارد کا جو نصف حصہ آفتاب کے سامنے رہتا ہے اس میں اتنی حرارت پائی جاتی ہے کہ سیسہ اور رانگا منجمد حالت میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ قول صحیح ہے تو ضرور ہے کہ عطارد کا اوسط ٹمپریچر کم از کم ۳۲۷ درجہ سنٹی ہوگا۔ کیونکہ سیسہ ہماری زمین پر اسی درجہ کی آنچ سے پگھلتا ہے۔ پھر چونکہ عطارد میں درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہاں فاسفورس، پوٹاسیم اور سوڈیم بھی نہ ہوں گے کیونکہ یہ تو اس سے بھی کم گرمی میں پگھل جاتے ہیں، اور یہی وہ عناصر ہیں جنھیں لوازم حیات سمجھا جاتا ہے۔ جھیلیں اور دریا تو درکنار ایسے سیارہ کی زمین میں رطوبت تک نہ ہوگی

ڈاکٹر ایبٹ نے کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ کرۂ عطارد کا ٹمپریچر ۵۰۲ فارنہیٹ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو غور فرمائیے کہ ہماری زمین پر معمولی ہوا کے دباؤ میں ۲۱۲ درجہ فارنہیٹ (یا ۱۰۰ درجہ سنٹی) پر پانی ابلنے لگتا ہے۔ اس لئے عطارد میں اور زیادہ کم درجہ پر ابلیگا۔ لہذا تمام پانی جو اس کرہ کی سطح پر رکھا جائے وہ فوراً نہایت گرم بھاپ میں منتقل ہو جائے گا۔ اس لئے جہاں تک ہم کو شرائط حیات معلوم ہیں سطح عطارد پر کوئی جاندار چیز نہیں رہ سکتی۔

لیکن گاریٹ پی سروس ([illegible]) کا خیال ہے کہ " ممکن ہے وہاں ایسے حالات موجود

ہوں جنھیں ہم نہ سمجھ سکتے ہوں اور گرمی کی شدت وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہو۔"

مسٹر سی فنٹر ہیوٹاملن لکھتے ہیں کہ "یہ سمجھنا غلط نہیں کہ اگر قدرت نے ہماری زمین کے علاوہ دیگر سیارگان پر بھی ذوی الارواح پیدا کئے ہیں تو ان کی صورت شکل اور وضع قطع ایسی ہوگی جس کا ہم کو قطعی علم نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ مخلوق ایسی ہو جسے نہ نباتات میں داخل کیا جاسکے نہ حیوانات میں"

گزشتہ ربع صدی میں تمام ماہرین فلکیات کا یہی خیال تھا کہ سیارہ عطارد اپنے محور پر ایک ہی بار گردش کرتا ہے۔ اور ایک ہی بار آفتاب کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن جبل ولسن رصدگاہ میں ایک "حرارتی جفت" (Thermo Couple) کے ذریعہ سے جس میں ایک "مقناطیسی برق پیما" (Galvanometer) بھی نصب کر دیا گیا تھا، جو حالات معلوم ہوئے ہیں، ان سے مندرجۂ بالا نظریہ کی صحت میں کچھ شبہات پیدا ہوگئے ہیں کیونکہ ان تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ کرۂ عطارد سے جو اشعاع نور (Radiation) پیدا ہوتا ہے اس کی تحلیل طیفی (Spectral distribution) قریب قریب چاند کی طرح نظر آتی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں اجرام سماوی کا سطحی ٹمپریچر (اشعاع) تقریباً یکساں ہے۔ اسی کے ساتھ اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کرۂ عطارد کے تاریک حصہ کی طرف سے بھی حرارت و نور پیدا ہوتا ہے اور یہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ کرۂ عطارد کا زمانۂ تحویل (Rotation) بہت تھوڑا ہے

زہرہ

زہرہ کے زمانۂ تحویل کے باب میں ماہرین فلکیات متفق نہیں ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے کہ کرۂ زہرہ بھی کرۂ عطارد کی طرح اپنے محور پر آفتاب کے گرد گردش کرتے ہوئے گھومتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ایک طرف ہمیشہ نور (دن) اور دوسری طرف ہمیشہ ظلمت (رات) رہتی ہے۔

اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت سیارہ مذکور نرم اور لچک دار حالت میں تھا، اس وقت تمازت آفتاب کی شدت کے باعث اس میں زبردست مدوجزر واقع ہوتا تھا۔ جس سے بہت سی سطح ابھر گئی۔ اور بہت سی .... دب کر رہ گئی، پھر جب ابھری ہوئی سطح نے بطور "بریک" (Brake) کام کیا تو گردش میں سخت رکاوٹ پیدا ہوئی، جس کے باعث زہرہ کا زمانۂ تحویل رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ زہرہ کا کرۂ ہوائی زیادہ کثیف (Dense) ہے۔ اور جب کسی کرہ کا ایک ہی نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی طرف رہیگا تو گمان غالب ہے کہ ہوا زیادہ گرم شدہ نصف کرہ پر سے بیرونی سرد و تاریک نصف کرہ کی طرف چلے گی۔ اور اپنے ساتھ روشن نصف کرہ کا پانی اور رطوبت لے جا کر کرہ کی سمت تاریک میں برف کی طرح منجمد کر دے گی۔

زہرہ کا مشاہدہ کرتے وقت اکثر دیکھا گیا ہے کہ قرص زہرہ کی غیر روشن سمت میں خفیف سی چمک دکھائی دیتی ہے جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ جمع شدہ برف کی چمک ہے۔ بعض اوقات زہرہ کے قطبین پر برف کے تودے بھی دیکھے گئے ہیں۔ اور دائرہ نور و ظلمت کے انحنا میں جو بے قاعدگی پائی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زہرہ کی سطح پر بڑے بڑے اونچے

پہاڑ بھی ہیں۔

ڈاکٹر لوویل اور ان کے رفقاء نے رصدگاہ لوویل میں زہرہ کا مطالعہ کرکے وہاں وسیع منطقے مشاہدہ کئے ہیں لیکن بہت سے ماہرین فلکیات ان نشانات کو محض خیالی سمجھتے ہیں۔ البتہ ارصاد طیفی سے جو ثبوت حاصل ہوئے ہیں۔ ان سے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ زہرہ کا زمانۂ تحویل ۲۲۵ یوم ارضی ہے۔

مشہور و معروف اطالوی ماہر فلکیات ڈاکٹر جی۔ دی۔ شیاپریلی (Selina parelli . V . G) نے اور جس نے کرۂ مریخ کی سطح پر "نہریں" معلوم کی تھیں۔ سب سے پہلے یہ بیان کیا کہ سیارۂ زہرہ کا ہمیشہ ایک ہی رخ آفتاب کے سامنے رہتا ہے۔ اسی وقت سے تمام ماہرین فلکیات اس مسئلہ پر مختلف رہے ہیں کہ اس کا زمانۂ تحویل طویل ہے یا قلیل ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر ڈبلو۔ ایچ پکرنگ ہارورڈ یونیورسٹی نے جزیرہ جمیکا کی صاف اور مستقل فضا میں، جو خط استواء کے قریب ہے، جب زہرہ کا مشاہدہ فرمایا تو انھوں نے ایک جدید اور حیرت انگیز توجیہہ پیش کی یعنی یہ کہ زہرہ کا زمانہ تحویل ۶۸ گھنٹہ ہے۔ اور اس کا محور تحویل اس کے فلک کی سطح میں واقع ہے یعنی صرف چار یا پانچ درجہ کا زاویہ بناتا ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو وہاں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہوگی۔ نہ گرمی ہوگی نہ سردی۔ اگرچہ قرب آفتاب کے باعث نظری طور پر اس کا اوسط ٹمپریچر ۱۵۰ درجہ فارنہیٹ بمقابلہ ۶۰ درجہ فارنہیٹ ہماری زمین کے ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کا ہوائی لفافہ زیادہ کثیف ہے اس لئے کرۂ زہرہ تمازت آفتاب کی شدت سے محفوظ رہتا ہے۔ اور اس طرح اس کا ٹمپریچر صرف ۶۸ درجہ فارنہیٹ رہ جاتا ہے۔

اگر زہرہ کا خط محور واقعی اس کے فلک کی سطح میں عمودی طور پر واقع ہوا ہے۔ تو ہماری زمین کے خلاف وہاں کے باشندے تغیرات فصلی سے واقف ہی نہ ہوں گے، سال بھر یکساں حالت رہتی ہوگی۔ اور ہر منطقہ کی آب و ہوا میں بلحاظ عرض البلد فرق ہوگا۔ اور اگر وہاں کا نظام معاشرت و مدنیت زمین جیسا ہوگا تو لوگ زیادہ تر قطبین کی طرف رہنا پسند کرتے ہوں گے کیونکہ باوجود کثافت ہوا بھی ممالک خط استوا میں رہنا غیر قابل برداشت ہوگا۔ اگرچہ عادی ہونے کے باعث ممکن ہے لوگ ان استوائے ممالک میں بھی رہتے ہوں۔

چونکہ کرۂ زہرہ کا ہوائی لفافہ بہت زیادہ کثیف ہے۔ اور وہاں زیادہ تر ابر چھایا رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لیے اس کی سطح کا مشاہدہ سخت دشوار ہوگیا ہے۔ اور اس کے زمانۂ تحویل کے متعلق کوئی خاص نظریہ قایم نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر سروس (Serviss) فرماتے ہیں کہ "اگر زہرہ اپنے چہرۂ زیبا سے تھوڑی دیر کے لئے وہ عجیب و غریب نقاب ہٹادے جو ہر وقت اس کے روئے روشن پر پڑا رہتا ہے تو وہ تمام نظام شمسی کے اندر یقیناً سب سے زیادہ دلچسپ سیارہ نظر آئے۔"

ڈاکٹر سی جی ایبٹ کا خیال ہے کہ "بقائے حیات کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ وہ سب زہرہ

میں پائی جاتی ہیں - کیونکہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ زیادہ تر پردۂ سحاب میں روپوش رہتا ہے
جس سے غالباً وہاں کا ٹمپریچر بالکل ہماری زمین جیسا ہوگا -

چنانچہ ڈاکٹر ایبٹ بھی کہتے ہیں کہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت جو ۶۰ فیصدی کے قریب ہے بادلوں کے وجود
کے وجود کی متقاضی ہے ، اور یہ بادل بجز پانی اور کسی مادہ کے متشکل ہو سکتے ہیں - اگر زہرہ کی تحویل کا زمانہ اس کی آفتاب کے
گرد گردش کے زمانہ کی برابر ہوتا تو گرم طرف کا تمام پانی بھاپ بنکر اڑجاتا - اور سرد جانب آجمتا - اور بایں صورت تمام چادر
سحابی غائب ہوجاتی -

بعض لوگوں نے مشاہدہ کرکے بیان کیا ہے کہ زہرہ کی بعض سطحی خصوصیات غائب ہوکر پھر ۲۳ گھنٹہ اور ۲۱ منٹ
بعد نمایاں ہوجاتی ہیں -

ڈاکٹر ٹی جے - سی نے لکھا ہے کہ "بمقابلہ مریخ کے زہرہ میں آبادی کا امکان زیادہ ہے ، کیونکہ زہرہ کا زمانۂ تحویل ۲۳ گھنٹہ
۲۱ منٹ ہے - اور تمام باتوں میں کرۂ ارض سے اسقدر مشابہ ہے گویا زہرہ و ارض دونوں توام بہنیں ہیں - زہرہ کے اندر ہوا ،
بادلوں ، پانی ، پہاڑوں ، جھیلوں ، سمندروں ، اور دریاؤں کی کثرت ہے - موسم بھی قریب قریب ایسے ہی ہوتے ہیں
جیسے زمین پر ، صرف اسقدر فرق ہے کہ وہاں کا ہر موسم چھوٹا ہوتا ہے - کیونکہ زہرہ کا سال صرف ۲۲۵ دن کا ہوتا ہے -
پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے سیارہ میں کوئی ذی حیات نہ پائی جائے "

لیکن ڈاکٹر سینٹ جان نے آلۂ طیف پیما سے مشاہدہ کرکے یہ معلوم کیا ہے کہ "زہرہ کے گرد جو ہوا ہے اس میں آکسیجن
ہی نہیں " بہرحال زہرہ کے متعلق اس وقت تک جتنی تحقیق ہوچکی ہے ، اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کسی
ذی حیات کا پایا جانا مستبعد نہیں ہے - اور بالکل ممکن ہے کہ وہاں بھی انسان ہی کی طرح کوئی ذی شعور مخلوق پائی جاتی
ہو ، لیکن چونکہ زہرہ کے چاروں طرف ہوا اور بادل کی نہایت کثیف تہ موجود ہے اس لئے ہمارے آلات رصد ابھی تک
سطح زہرہ کا کوئی صحیح حال معلوم نہیں کرسکے -

مشتری

مشتری اپنے حجم و وزن کے لحاظ سے نہایت عظیم الشان سیارہ ہے یعنی اگر کسی ترازو کے ایک پلڑے میں
مشتری کو رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں نظام شمسی کے اور تمام سیارے تو مشتری کا پلہ بھاری رہیگا -

جس طرح ہماری زمین کے ساتھ ایک چاند ہے اسی طرح سیارۂ مشتری کے ساتھ نو چاند ہیں - ان میں سے چار چاند سنہ ۱۶۱۰ء
میں گلیلو (Galileo) نے دریافت کئے تھے - ان میں سے ایک چاند جسکا نام "گانمیڈ" ہے عطارد کے قطر سے ۶۰۰
میل بڑا قطر رکھتا ہے ، دوسرا چاند "کالسٹو" عطارد کے برابر ہے -

اس عظیم الشان کرۂ کی طبیعی حالت جسقدر ہم کو معلوم ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کسی جاندار چیز کا وجود نہیں پایا جاسکتا
اس عظیم الشان سیارہ کا ٹمپریچر اسقدر زیادہ ہے کہ اس کی سطح پر باریک سا چھلکا یا ٹھوس خول بھی ابھی تک پیدا نہیں ہوا علاوہ

ازیں تحلیل طیفی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو مادی اشیا اس کی بیرونی سطح پر پائی جاتی ہیں وہ ان اشیا سے قطعی مختلف ہیں۔ جو ہم کو سطح ارض پر اب تک معلوم ہو سکی ہیں۔

ابھی یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ ہم مشتری کی اصلی سطح اب تک دیکھ سکے ہیں یا نہیں، کیونکہ اس کی سطح پر رنگین بادل بکثرت نظر آتے ہیں۔ جو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا بڑے بڑے ذخار دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ سحابی منطقے خود بھی کسی قدر بدلتے رہتے ہیں یعنی کبھی شمال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور کبھی جنوب کی طرف۔ ان سحابی منطقوں کے کناروں پر اکثر سرخ رنگ روشنی دیکھی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نیچے جو مواد پایا جاتا ہے، وہ بالکل آگ کی طرح سرخ ہے۔

کرۂ مشتری کے منطقہ خط استوا میں طاقتور دوربینوں کے ذریعہ سے دیکھا گیا ہے کہ مختلف قسم کے دھبے اور عجیب و غریب دھاریاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے کرۂ ہوا میں چھوٹے چھوٹے مختلف الالوان دھبے نظر آتے ہیں۔ جو دھبے خط استوا پر ہیں ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ اور جو دھبے زیادہ جنوب کی طرف واقع ہیں ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۷ منٹ ہے۔ اگر سیارۂ مشتری کی سطح سخت ہوتی تو خط استوار پر حرکت زدا یا شمالی و جنوبی منطقوں کی حرکت سے زیادہ تیز نہ ہوتی۔

گذشتہ چالیس برس سے جرم مشتری پر جو سب سے زیادہ نمایاں داغ نظر آ رہا ہے اس کو عرف عام میں "داغ سرخ کبیر" Great Red Spot کہتے ہیں۔ ایک انگریز ماہر فلکیات کا قول ہے کہ یہ کرۂ مشتری کا ایک چاند ہے جو ہنوز دور تکوین میں ہے۔ اس انگریز کا دعوے ہے کہ یہ مادہ جسے ہم "سرخ داغ" کہتے ہیں، آہستہ آہستہ مشتری کی سطح سے پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا جب یہ مشتری سے بالکل علیحدہ ہو کر اس کا دسواں چاند بن جائے گا۔ اس وقت تک جو ۹ چاند مشتری کے معلوم ہوئے ہیں، ان میں سے آٹھویں اور نویں چاند کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ اُلٹے چلتے ہیں یعنی بائیں سے داہنے یا مشرق سے مغرب کی طرف چلتے ہیں۔ حالانکہ خود مشتری کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ وہ "داغ سرخ" کوئی چاند نہیں ہے۔ بلکہ سطح مشتری پر ایک ٹھوس چھلکا بن رہا ہے۔ اگر یہ داغ آہستہ آہستہ مشتری کے گرد پیچھے کی طرف نہ ہٹتا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا کہ وہ کسی عظیم الشان کوہ آتش فشاں کا وسیع دہانہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں تیس ہزار میل طویل اور آٹھ ہزار میل عریض تھا۔

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۴ء تک یہ داغ قریب قریب غائب ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں یہ بیضوی شکل میں نظر آنے لگا، رنگ البتہ سرخ کے بجائے کسی قدر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں یہ داغ قطعی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۰ء میں وہ کئی ہفتہ تک زیادہ نمایاں رہا۔ یہ داغ اب بھی نظر آتا ہے مگر بہت دھندلا ہے، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب وہ رفتہ رفتہ سرد ہوتا جاتا ہے، اور جو گہرا سرخ رنگ اس داغ کا ۱۸۷۸ء میں دیکھا گیا تھا۔ پھر نہیں دیکھا گیا

مشتری کی ہوا بہت کثیف اور گرم ہے، ڈاکٹر ای۔ سی۔ سلیفر کا قول ہے کہ "جس قدر معلومات ہم کو سیارۂ مشتری کے متعلق حاصل ہوئی ہیں وہ اس امر کی شاہد ہیں کہ مشتری کے اندر شدید ہیجان کا باعث سیارۂ مذکور کی سخت اندرونی حرارت

ہے، جس کا اثر اس کے کثیف لفافۂ بخاراتی پر بھی پڑتا ہے۔

——ڈاکٹر ڈبلو ڈبلو کیمبل (W. W. Campbell) مشتری کے "کرۂ ہوائی" کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ "ہنوز بالکل گرم ہے"

ہم لکھ چکے ہیں کہ سیارہ مشتری کے نو چاند ہیں منجملہ ان کے دو چاند سب سے بڑے ہیں۔ ایک کا نام "گانمیڈ" ہے۔ اس کا قطر ۳۵۵۰ میل یعنی سیارۂ عطارد کے قطر سے تقریباً ۶۰۰ میل زیادہ ہے۔ اس چاند کا مدار مشتری کے مرکز سے ۶۶۴۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور خود مشتری کا قطر ۸۸ ہزار میل ہے۔ چونکہ یہ قمر جرم مشتری سے بہت قریب واقع ہے، اس لئے وہاں مشتری سے بیحد حرارت پہونچتی ہوگی، لیکن نہ اتنی جتنی ہمارے چاند کو آفتاب سے پہونچتی رہتی ہے۔ کیونکہ مشتری کا یہ چاند بہ نسبت ہمارے چاند کے آفتاب سے بہت زیادہ دور واقع ہے۔

جہاں تک ٹمپریچر کا تعلق ہے گانمیڈ اور آیو دونوں چاند میں نہایت منظم آبادی ہونا چاہیے، لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ ان دونوں کی ہوا میں آکسیجن کی بھی کافی مقدار موجود ہے یا نہیں۔

زحل یہ خوبصورت حلقہ دار سیارہ بمقابلہ ہماری زمین کے آفتاب سے ساڑھے نو گنا دور ہے۔ اور اس کا حجم ہماری زمین سے ۷۶۲ گنا بڑا ہے۔ چونکہ یہ سیارہ آفتاب سے ۸۸۶۰۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس لیے اس کی سطح تک سطح ارض کے مقابلہ میں نور و حرارت شمسی کا صرف $\frac{1}{90}$ حصہ پہونچتا ہے۔ اگر جرم زحل تک صرف آفتاب ہی کی حرارت پہونچتی ہے تو اس کا ٹمپریچر درجۂ صفر سے ۲۳۰۰ درجہ فارنہیٹ نیچے ہوگا۔ جو یقیناً اس قدر کم ہے۔ اس میں کوئی ذی حیات چیز نہیں پائی جاسکتی۔ مشتری کی طرح زحل بھی ٹھوس جرم کی طرح حرکت نہیں کرتا، بلکہ اس کے اندر کے طبقات اندر ہی اندر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ طبقات غیر مساوی سرعت کے ساتھ گردش کرتے ہیں اس لئے آپس کی رگڑ سے یقیناً زبردست حرارت پیدا ہوجاتی ہوگی۔ مشتری کی طرح یہ سیارہ بھی گداختہ بلکہ گیس کی سی حالت رکھتا ہے۔ اگر اس سیارہ کی ترکیب انھیں اجزا سے ہوئی ہے جو کرۂ ارض کے ہیں (اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو) تو پھر اس کی سطح پر کوئی سخت چھلکا نہیں ہوگا۔ بلکہ صرف گیسوں کے طبقات ہوں گے، جو بوجہ عمق بہت زیادہ کثیف بن گئے ہوں گے۔ اور مرکز کے قریب بدرجۂ نہایت تاریک ہوں گے۔

ماؤ کا خیال ہے کہ:— " زحل کا طیف بھی بالکل مشتری جیسا ہے، اور معلوم ہوتا ہے زحل کے جرم میں بعض ایسے عناصر گیس موجود ہیں جو ابھی تک زمین یا آفتاب میں دریافت نہیں ہوئے

——سیارۂ زحل کے دس چاند ہیں جن میں ایک (ہایپیریوس) کا قطر ۲۰۰ میل ہے اور دوسرا چاند (ٹائیٹان) سیارۂ عطارد کے برابر ہے چونکہ ہایپیریوس سیارۂ زحل سے ۲۲۲۱۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس لئے اسے زحل سے کافی حرارت نصیب نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس کا کرۂ ہوا نہایت ہی لطیف اور سبک ہے اسلیے اس بات کا قوی گمان ہے کہ اس کی سطح پر اعلیٰ طبقہ کے نشوونما یافتہ جاندار موجود ہوں گے۔

دوسرے چاند (ٹائیٹان) کی حالت دوسری ہے، اور بہ نسبت ہماری زمین کے اس میں زیادہ ادنیٰ قسم کے جاندار پائے جانے کا امکان ہے۔

یورانوس و نیچون

ان دونوں سیاروں کو آفتاب سے نسبتاً بہت کم حرارت و روشنی پہونچتی ہے۔ یعنی یورانوس کو بمقابلہ زمین کے $\frac{1}{368}$ حصہ نور و حرارت کا پہونچتا ہے۔ نیچون کو صرف $\frac{1}{900}$ اس لئے نیچون میں دوپہر کو صرف اتنی روشنی ہوتی ہوگی، جتنی زمین پر شام کے وقت ہوتی ہے۔ اور یورانوس میں اس سے کچھ زائد۔ یورانوس کا ٹمپریچر (۳۸۰) درجہ اور نیچون کا ٹمپریچر (۴۰۰) درجہ بتایا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں سردی اتنی شدید ہوگی۔ کہ اگر ہماری زمین کی ہوا کسی صورت سے نیچون تک پہونچا دی جائے تو فوراً منجمد ہوکر ایک "ٹھوس" چیز کی حیثیت اختیار کرلے گی۔

بعض کا خیال بالکل اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ یورانوس جو کرۂ ارض سے ۱۶ گنا اور نیچون جو زمین سے ۸۵ گنا بڑا ہے۔ دونوں سخت گرم سیارے ہیں۔ اور گیس کی صورت رکھتے ہیں

دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یورانوس بہت دور واقع ہے یہاں تک کہ اس کے ہلکے سبز رنگ کی سطح پر جو نشانات ہیں وہ اچھی طرح دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن بعض ماہرین فلکیات نے یورانوس میں مشتری جیسے طبقات بھی دیکھے ہیں

تقریباً پندرہ سال گزرے اس امر کا اعلان ہوا تھا کہ آلہ طیف بیا یا موشو رکے ذریعہ سے یورانوس اور نیچون میں کلوروفائل (Chlorophyll) (وہ چیز جس سے نباتات میں سبز رنگ پیدا ہوتا ہے) کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور یورانوس اور نیچون میں ویسے ہی حلقے نظر آتے ہیں جیسے کلوروفائل کے محلول سے شعاعیں گزرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ واضح ہو کہ کلوروفائل کوئی عنصر نہیں بلکہ نائٹروجن کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مرکب ہے جو پودوں کے بعض خلایا میں پایا جاتا ہے اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرکب یورانوس اور نیچون کے ہوائی طبقات کے اندر کیونکر آگیا۔

مسٹر گاریٹ پی سروس کہتے ہیں کہ جو سیارے گیسی حالت میں ہوتے ہیں، وہاں کی مخلوقات بھی ویسی ہی گیس کی قسم کی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ لوگ جو اشیاء کو دنیوی اوزان اور پیمانوں کے معیار سے جانچنے کے عادی ہیں یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک گیسی درات حیات کیا ہو سکتی ہے، لیکن مخلوقات کا تنوع ایک ایسی ہدایت ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی دلیل کی جستجو کرنا بیکار ہے۔

مریخ

۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کو مریخ کرۂ ارض سے بقدر ۰۰۰۰۰۰۰ میل قریب آگیا تھا۔ اور یہ قرب اتنا تھا کہ گزشتہ ایک سو بیس سال میں نہ ہوا تھا۔ اور نہ آیندہ ایک سو سال تک اس کا امکان ہے۔ اس تاریخ کی شام کو مریخ زمین سے صرف ۳۴۵۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔

جب زمین اور مریخ اس طرح واقع ہوں کہ اگر آفتاب سے ایک خط مستقیم مریخ تک کھینچا جائے تو کرۂ ارض سے ہوتا ہوا گذرے تو اس وقت اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ ان تینوں کا "قران" ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ مریخ کا مدار بہت ہٹا ہوا ہے

اس لئے وہ زمین سے قریب تر آجانے کے باوجود بہت دور رہتا ہے - مثلاً اگر کرۂ ارض کا فاصلہ آفتاب سے اوج شمسی کے وقت صرف ۰۰۰۰۰۰۳ میل ہوتا ہے، تو مریخ اسی نقطہ پر ۰۰۰۰۰۰ ۲۶ میل دور ہوتا ہے۔

فروری یا مارچ کے مہینے میں جب آفتاب مریخ اور زمین تینوں ایک خط میں ہوتے ہیں تو اس وقت مریخ اور زمین کے درمیان تقریباً ۰۰۰۰۰۰۶۱ میل کا فاصلہ ہوتا ہے، اور اگر یہی صورت اگست یا ستمبر میں واقع ہو تو فاصلہ کم ہوکر ۲۵۵۰۰۰۰۰ میل رہ جاتا ہے - الغرض ایسے تمام قرانوں کا بُعد اوسط ۰۰۰۰۰۰۸۶ ۴ میل ہوتا ہے

دوربین کے ذریعہ سے مریخ کا قطر اقتران کے وقت ۲۵ انچ نظر آتا ہے - مگر اسکا انحصار دوربین کی طاقت پر ہے کیونکہ اگر دوربین بہت قوی ہو تو مریخ، ہمارے چاند کے برابر نظر آسکتا ہے۔

پروفیسر پکرنگ نے کافی مشاہدہ کرنے کے بعد یقین کرلیا ہے کہ کرۂ مریخ میں جاندار مخلوق ضرور موجود ہیں، علاوہ ازیں ماہرین فلکیات نے رصد گاہ لوول سے معلوم کیا ہے کہ وہاں نہروں کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے، جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مریخ میں نباتات کا ہونا لازم ہے۔

رہا یہ امر کہ مریخ میں جاندار مخلوق ہیں یا نہیں اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی جگہ نباتات کا وجود ثابت ہو جائے تو وہاں ادنیٰ درجہ کے حیوانات تو یقیناً پائے جائیں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ مریخ میں حیوانات کا وجود یقیناً ہوگا۔

۱۶۳۶ء میں ماہر فلکیات کو یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ کرۂ مریخ کی سطح پر خاص قسم کے داغ دھبے موجود ہیں لیکن ۱۸۴۰ء میں سب سے پہلے مریخ کا نقشہ مشہور جرمن ہیئت داں جے - ایچ - فان ماڈلر نے کھینچا - اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں ایک اطالوی ہیئت داں جی - وی - شیاپریلی نے ان دھبوں کو معلوم کیا جنھیں "سلسلہ انہار" کہتے ہیں - ۱۸۸۱ء میں اسی شخص نے اعلان کیا کہ بعض اوقات یہ نہریں بہت بڑی ہوجاتی ہیں - اور اس زمانہ سے ان نہروں کا خاص طور پر مطالعہ ہونے لگا۔

سر ولیم ہرشیل نے معلوم کیا کہ مریخ کے قطبین پر برف کے تودے ہیں - اور جب کبھی ان تودوں میں سے کوئی کم ہوتا ہے تو سطح مریخ پر عجیب قسم کے نشانات پیدا ہوجاتے ہیں - اور باریک خطوط کا ایک جال سا پیدا ہوجاتا ہے۔

مریخ کا مدار بیضاوی شکل کا ہے اس کا قطر ۴۲۱۲ میل ہے، اس کا حجم زمین سے ۱/۷ ہے - اور اس کی سطحی رقبہ زمین کا ۱/۴ ہے - اور اس کی کثافت ۱/۱۰ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ میں بمقابلہ زمین کے کشش ثقل کی نسبت ۳۸/۱۰۰ ہوگی یعنی جو چیز زمین پر سو پونڈ وزن رکھتی ہے وہ مریخ پر ۳۸ پونڈ ہوگی۔

مریخ کے خط استواء کا جھکاؤ اپنے مدار کی طرف تقریباً ۲۴ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے - اس لئے کرۂ مریخ پر موسم بھی کرۂ ارض کی ہی طرح بدلتے ہوں گے اس کی رفتار تحویلی بھی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی کہ کرۂ ارض کی یعنی ۲۴ گھنٹہ، ۳۷ منٹ ۲۲،۶۷ سکنڈ - مریخ اپنے فلک پر سورج کے گرد بحساب ۱۴،۹۸ میل فی سکنڈ ۶۸۶،۹۷ دن میں گردش کرتا ہے۔

آفتاب کے گرد مریخ کی گردش کا زمانہ ایک سال ساڑھے دس مہینہ ہوتا ہے۔ یہ گویا مریخ کا "ایک سال" ہے۔ اور زمین ہی کیطرح وہاں بھی بہار، گرما، خزاں اور سرما ہوتے ہیں۔ مگر ہر فصل کی مدت تقریباً دگنی ہوتی ہے۔ جب زمین پر جون کا مہینہ ہوتا ہے تو مریخ پر خزاں ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ۴ جون کو مریخ پر پہلی برف پڑی تھی

جس طرح زمین کے شمالی وجنوبی حصوں میں تفریق موسم ہوتی ہے۔ اسی طرح کرۂ مریخ میں بھی ہے۔ مریخ میں فصل بہار ۱۹۹ دن، گرما ۱۸۳ دن خزاں ۱۴۷ اور سردی ۱۵۸ دن ہوتی ہے۔

مریخ کے درجۂ حرارت کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ۴۰ درجہ ہے اور بعض نے ۶۰ درجہ اندازہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقوال محض ریاضیات فلکی کے بعض اصول کی بنا پر ہیں، صحیح علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ لکزنگ کا قول ہے کہ:۔ مریخ کا اوسط ٹمپریچر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن وہ ۳۲ درجہ سے یقیناً کم ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ ۲۰ درجہ ہو۔ کیونکہ مریخ کے استواء پر دوپہر کے وقت کبھی برف نظر نہیں آتی، لیکن جب مریخ نقطۃ الذنب کی طرف ہوتا ہے تو طلوع آفتاب کے بعد استواء پر برف نمودار ہو جاتی ہے، نیز سہ پہر کے وقت منطقہ حارہ میں کہر اور دھند بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اس زمانہ میں بوقت شب ٹمپریچر ۳۲ درجہ سے کم ہو جاتا ہوگا۔ اور دوپہر کے وقت غالباً ۶۰ یا ۷۰ درجہ تک پہونچ جاتا ہوگا۔

کرۂ مریخ میں ایسا کوئی کرۂ ہوا نہیں ہے۔ جیسا زمین کے گرد پایا جاتا ہے۔ نہ وہاں دوپہر کے وقت ابر ہوتا ہے، نہ ٹھنڈے سمندر ہوتے ہیں، صرف قطبین پر کسی قدر برف ہوتی ہے۔ مریخ کی سطح کا مقابلہ کرۂ ارض کے ریگستانی علاقوں سے کسی قدر ہو سکتا ہے۔

الغرض دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریخ میں اس کے قطبین کے قریب دو سفید داغ پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اسی قسم کے سفید داغ اس کی سطح کے اور حصوں پر بھی نظر آتے ہیں، چنانچہ ۹ جولائی ۱۹۲۲ء کی شب کو تین لاکھ مربع میل کی وسعت کا ایک بہت بڑا سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ قطبین کے گرد جو سفید دھبے نظر آتے ہیں۔ وہ قطر میں ۱۲ ہزار میل سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ برف کے تودے ہیں۔ لیکن ۹ جولائی کی شب کو جو سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کرۂ ہوا میں منجمد ہو جانے والے بادل تھے۔

یہ ابر مریخ کے باشندہ کو تو سیاہ نظر آتا ہوگا۔ مگر ہم کو آفتاب کی شعاعوں کی وجہ سے سفید دکھائی دیتا ہے۔ اور اس لئے سطح مریخ پر اس قسم کے سفید دھبے نظر آنے کے معنے یہ ہیں کہ وہاں سخت گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ اور طوفان ابر و باراں برپا ہے۔ اس قسم کا ایک حادثہ مریخ میں ۹ مئی سنہ ۱۹۲۰ء کو یلکاف کی رصدگاہ میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر کامشکاف کا بیان ہے کہ یہ چادر ابر اسقدر وسیع تھی کہ سطح مریخ پر جو نشانات عموماً نظر آیا کرتے ہیں وہ سب پوشیدہ ہو گئے تھے۔

ایڈگر لوسین لارکن کو یقین نہیں ہے کہ کرۂ مریخ پر کوئی "سلسلۂ انہار" ہے۔ مگر انھوں نے ۷ جون سنہ ۱۹۲۲ء کو سطح مریخ

پر بھورے رنگ کے جدید داغ دیکھے تھے - اور یہ امریکہ کے رقبہ کے برابر وسیع تھے - ان کو مریخ کا ریگستانی حصہ سمجھا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سطح مریخ پر سفید داغ عموماً اس زمانہ میں نمودار ہوتے ہیں جبکہ وہاں موسم گرما ہوتا ہے، یعنی جب قطبین کی برف پگھل کر بہت کم ہو جاتی ہے - اور ہوا میں رطوبت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب شمالی نصف کرہ میں گرمی ہوتی ہے تو شمالی تودۂ برف غائب ہو جاتا ہے - اور جنوبی تودہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگتا ہے - شمالی دھبہ ۲۱ ہزار میل قطر کے رقبہ سے موسم گرما میں کم ہو کر ۳۰۰ میل قطر کا رہ جاتا ہے - لیکن جنوبی داغ بعض اوقات بالکل محو ہو جاتا ہے - اور جاڑوں میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔

تقریباً نصف صدی قبل یہ کہا جاتا تھا کہ کرۂ مریخ میں کوئی طبقہ ہوا نہیں ہے اگر ہے بھی تو وہ بہت ہلکا ہے - اور اس میں بخارات آبی مطلق نہیں ہیں - اس لئے قطبین پر برف ہرگز جم نہیں سکتی - مگر جو واقعات ہم بیان کر چکے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے - کہ مریخ کے متعلق کرۂ ہوائی ضرور ہے - اور اس میں رطوبت بھی کافی ہے جس سے برف اور بارش بن سکتے ہیں -

بعض کا قول یہ بھی ہے کہ مریخ کے قطبین پر جو سفید داغ نظر آتے ہیں وہ منجمد شدہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہے - مگر پروفیسر پائیک کہتے ہیں :- جب قطبین پر تودے بنتے ہیں تو وہ گرد و نواح کی سطح سے ممتاز نظر آتے ہیں - یہ بھی صحیح طور پر معلوم ہے کہ یہ داغ کب محو ہونے لگتے ہیں - اور چند ہفتہ بعد ایک سیاہ خط النصف النہار سے شروع ہو کر مغربی افق کے ... تک زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے - اور پھر چند ہفتہ بعد وہ خط وسیع ہوتے ہوتے افق مشرق تک پہونچ جاتا ہے اور اس طرح وہ اس قطبی تودہ کو کرہ کے دوسرے حصوں سے قطعی علیحدہ کر دیتا ہے - بعد ازاں وہ خط کئی سو میل چوڑا ہو جاتا ہے - اور جوں جوں برفانی داغ محو ہوتا جاتا ہے - یہ خط بھی پیچھے ہٹ کر اس سے ملتا جاتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سطح میں سیاہ خلیجیں بننے لگتی ہیں جن میں سے زرد رنگ کے بادل اٹھتے دکھائی دیتے ہیں اور جب وہ تودہ گھٹنے لگتا ہے تو اس کے حدود میں ایک سیاہ رقبہ نمایاں ہو جاتا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیاہ رقبہ برف کے گھلنے سے پیدا ہوتا ہے - اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح چار ملی میٹر سے کم دباؤ میں پانی قائم نہیں رہتا اسی طرح کاربن ڈائکسائڈ بھی پانچ ملی میٹر سے کم دباؤ میں قائم نہیں رہ سکتی - اس لئے یہ سفید تودے کاربن ڈائکسائڈ کے نہیں بلکہ برف کے ہیں - علاوہ ازیں مسٹر اسلیفر کا بیان ہے کہ مریخ کے سحابی رقبے بھی اسی مادہ کے بنے ہوئے ہیں جس کے ہماری زمین کے بادل بنتے ہیں۔

الغرض شہادتیں اسقدر ضرورت سے زیادہ ہیں کہ ہم کو مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ مریخ میں بخارات آبی ضرور موجود ہیں - اور جن ارصادات طیفی سے یہ ثابت ہوا کہ مریخ پر بخارات آبی کا وجود ہے انھیں سے یہ بھی ثابت ہوا - کہ وہاں آکسیجن بھی ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے کہ اگست ۱۹۲۲ء میں لاک انجلیز سے سو میل کے فاصلہ پر ایک برفانی دریا کی سطح پر مٹی کی تہ پائی گئی تھی جس پر کچھ سبزہ اگ آیا ہوا تھا - اور اس کے نیچے برف تھی - اسی طرح جب مریخ میں قطبین کی برف

پگھلتی ہے تو وہ دھاریاں جنھیں "نہریں" کہتے ہیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ سیاہ خطوط کا ایک جال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں سے جا کر ملتے ہیں جنھیں "نخلستان" کہتے ہیں۔ یہ نخلستان وسعت میں بڑے چھوٹے ہوتے ہیں جن کا اوسط قطر ۱۲۰ میل ہوتا ہے۔ ان میں بہت ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جھیلیں اور اُن سے نہریں چاروں طرف اس طرح نکلتی ہیں جیسے پہیہ کے وسط میں سے آرے۔ اگر کوئی داغ بڑا ہوتا ہے تو اس میں سے سات نہریں نکلتی ہیں۔ ان میں ایک دھبہ بہت بڑا ہے جسے "سورج کی جھیل" کہتے ہیں۔ اس کا قطر ۳۰۰ میل ہے۔ اور طول ۵۴۰ میل۔ اس میں سے دوہری نہریں نکلتی ہیں۔ جنکا طول اوسطاً کم ہے۔ سب سے بڑی نہر ان میں ۳۵۰۰ میل ہے۔ ان نہروں کی اوسط چوڑائی ۳۰ میل ہے۔ اب تک ۲۰۰ نہروں سے زیادہ دیکھی جا چکی ہیں۔ جن کے نقشہ کھینچ کر نام بھی رکھدئے گئے ہیں۔

مشاہدات دوربینی اور فوٹوگرافی دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہریں ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک باقاعدہ جاتی ہیں۔ ہر زاویہ پر ان نہروں کا پورا تقاطع ہوتا ہے۔ اور کئی نہریں ایک ہی مرکز پر آ کر مل جاتی ہیں کسی جگہ دو نہریں ایک دوسرے کو قطع کرکے سیدھی چلی جاتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جس مقام پر پہلے ایک نہر دکھائی دیتی تھی رات بھر میں اسی مقام پر دوسری نہر نمودار ہو گئی۔ اور یہ دونوں نہریں متوازی بہتی رہیں۔ ان توام نہروں کا درمیانی فاصلہ عموماً ۱۵۰ یا ۲۰۰ میل ہوتا ہے۔ بعض توام نہروں کے فوٹو بھی لئے جا چکے ہیں۔

ان نہروں اور نخلستانوں کی تشریح پروفیسر پکرنگ اور لووَیل نے اس طرح کی ہے کہ چونکہ مریخ میں پانی کم ہے اس لئے قطبین کی پگھلنے والی برف سے مخرج کا کام لیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے پانی پیدا ہو کر تنگ نہروں کے ذریعہ سے چاروں طرف تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماہرین فلکیات کو جو خطوط نظر آتے ہیں وہ نہریں نہیں بلکہ نباتاتی منطقے ہیں جو بہار کی آمد پر نمایاں ہو جاتے ہیں اور موسم سرما میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہی توجیہ نخلستانوں کی کی گئی ہے۔ " اس واقعہ سے مندرجہ بالا دلیل کو اور بھی زیادہ تقویت ہوتی ہے کہ نخلستان صرف نہروں کے سنگم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظریہ کا تسلیم کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ کرۂ مریخ میں قرنہا قرن سے ایسی مخلوق آباد ہے جو نہایت عقیل و فہیم ہے اور پانی کی قدرتی کمی کو انھوں نے آبپاشی کے وسیع کاموں سے پورا کیا ہے

مگر بعض دیگر ہیئت دانوں کا خیال یہ ہے کہ جب مریخ میں موسم گرما ہوتا ہے تو وہاں رات کے وقت بارش ہوتی ہے جس کے باعث سبزہ نمودار ہو جاتا ہے۔ پہلے ان سیاہ رقبوں کو سمندر خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب امر یقینی یہ ہے کہ یہ طبقات موسم کیساتھ اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ موسم سرما میں رنگ غائب ہو جاتا ہے اور بہار میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ موسمی تغیر نہروں کی وجہ سے نہیں بلکہ رات کے وقت بارش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ وسیع رقبے جو زرد سے سیاہی مائل بھورے ہو جاتے ہیں۔ دلدلیں ہیں۔ جن کے رنگ میں پانی کے عمق کی وجہ سے فرق پڑتا ہے۔

ایک انگریز محقق ریجنالڈ اس بات کا یقین نہیں کرتا کہ سطح مریخ پر جو نظام انہار ہے وہ مصنوعی نہیں یعنی انجینروں کا بنایا ہوا نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے بمقابلہ زمین کے مریخ میں تبخیر کم ہوتی ہو، اس لئے وہاں بڑے بڑے تالاب ہوں گے جن میں برف پگھلنے کے بعد پانی بھر جاتا ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ مریخ کی نہریں مسقف ہوں تاکہ پانی سوکھ نہ جائے۔

مسٹر مارکونی نے حال ہی میں جو لاسلکی امواج کے منتقل کرنے کا آلہ ایجاد کیا ہے۔ اس سے ممکن ہے کہ کسی وقت ہم لاسلکی پیام مریخ یا زہرہ تک براہ راست پہونچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ مارکونی کا بیان ہے کہ وہ یقیناً دوسری دنیاؤں سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بشرطیکہ وہاں ایسے لوگ آباد ہوں جو ہمارا پیغام سمجھ سکیں۔ اگر وہ ہمارا پیغام سن سکیں گے تو یقیناً وہ جواب بھی دے سکیں گے،،

مشہور موجد اڈیسن کی یہ رائے ہے کہ غالباً دوسیاروں کے باشندے اب بھی اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم سے بات چیت کریں ان کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ چند سال کے عرصہ میں مختلف سیاروں کے درمیان لاسلکی طریقہ پیغام رسانی قائم ہو جائے گا۔ امریکن سائنسداں میک ... کہتا ہے کہ مجھے کامل یقین ہے کہ مریخ میں آبادی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ اسے بہت جلد ثابت کیا جاسکے گا۔

نیاز

روح کا انتقال مکان

۳۰ پانیر رجمنٹ کے تین کمیشن یافتہ ہندوستانی مسلمان چائے کے بعد آپس میں بیٹھے ہوئے مولانا نیاز کے اجتہادی مضامین پر گفتگو کر رہے تھے کہ کپتان قدوائی کہنے لگے۔ "ناجی و ناری کی بحث تو مولانا عبدالماجد عرف مسیح الملت و مولانا سلیمان ندوی عرف معارف الملت کے لئے چھوڑئیے، آج ایک نیا عجیب قصہ سنیئے۔ میں بہت متحیر ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہے اگر روحانیت ایسی ہی مکمل چیز ہے تو غالباً وہ دن دور نہیں۔ جب کسی اور قوت کی ضرورت ہی دنیا کو باقی نہ رہے گی کیونکہ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں روحانیین کا کوئی شاد کار موجود نہ ہو!

کپتان فاروقی۔ وہ قصہ کیا ہے اور کہاں سنا؟

قدوائی۔ سنا کہاں آج میں جب میس سے نکل رہا تھا دیکھا کوئی وسیط آیا ہوا ہے جو لوگوں کے مردہ اعزہ کے حالات سناتا ہے مجکو بھی فطرتاً اشتیاق ہوا میں نے ملازم سے کہا کہ تم اس بازیگر سے کہنا کہ وہ میرے کمرہ میں آوے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجکو اوس کی آمد کی اطلاع دی میں نے اندر بلالیا۔ ایک خوبصورت لڑکی اور ایک ضعیف العمر پٹھان کمرے میں داخل ہوئے اور بہت سے صداقت نامے اپنے کمال کے ثبوت میں پیش کئے میں نے کہا۔ خاں صاحب۔ مجکو بھی کچھ حالات سنائیے۔

خانصاحب کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور کچھ نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے برف منگایا۔ اور دونوں کو پلایا کچھ پھل وغیرہ میں نے اوس خوبصورت لڑکی مریم کو دئے لیکن معلوم ہوا کہ وسیط کوئی چیز کھا نہیں سکتی میں خاموش ہوگیا۔

خاں صاحب نے میرے ملازم اسمٰعیل کو بلایا۔ اور حکم دیا کہ تم اس لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔ اوس کے بعد چراغ جلایا۔ اور ایک خاص موثر نغمہ بلند کیا جسے میں مطلقاً نہ سمجھ سکا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہونے لگا کہ گویا میرا کمرہ متحرک ہے۔ اور کھونٹیوں سے میرے کپڑے گرنا شروع ہوگئے۔ دروازہ کے کواڑ خود بخود بند ہوگئے۔ کمرے میں کسی حد تک تاریکی چھاگئی میرا قلمدان جو میز پر رکھا تھا وہ بلند ہوا۔ اور معلق ہوگیا۔ مجکو یہ ڈر تھا کہ کہیں میرے کپڑے روشنائی سے خراب نہ ہو جائیں۔ میں ہٹنا چاہتا تھا لیکن خاں صاحب نے اشارہ سے مجکو منع کیا۔ میں خدا معلوم کیوں سہم گیا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہونے لگا کہ ایک رنگین روشنی بالکل ایسی جو شعاعوں سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہوئی اور رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی میں نے

یہ سمجھ کر کہ شاید میری نظر کو دھوکہ ہو رہا ہے۔ اسمٰعیل سے دریافت کیا۔ "تم کیا دیکھتے ہو۔"
جواب دیا۔ "سرکار روشنی ناچ رہی ہے"

میں خاموش ہوگیا۔ اوس کے بعد میں نے دیکھا ایک روح اسی شکل میں نمودار ہوئی جس کو میں نے شط العرب کے معرکہ میں دیکھا تھا۔ میں اوس ترکی کپتان کو دیکھ کر سہم گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "میں بہت مصیبت میں مبتلا ہوں تم میرے دوست تھے تم نے باوجود دشمن ہونے کے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ میری اولاد اس وقت انقرہ میں بہت پریشان حال ہے تم اوس کی کسی طرح امداد اگر کرسکتے ہو تو انکار نہ کرو۔ ورنہ وہ عنقریب عیسائی یا یہودی ہو جائیں گے۔ ایک انگریز میری بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آیندہ موسم بہار میں غالباً یہ شادی یافہ میں ہو جائے گی۔ مجکو شادی سے اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اپنی اولاد کو عیسائی دیکھنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ تم اگر لفٹننٹ مصطفےٰ آفندی کو لکھو گے تو یہ معاملہ آسانی سے طے ہو جائے گا۔"

یہ کہکر وہ شکل محو ہوگئی۔ اس کے بعد میرے والد مرحوم کی شکل نظر آئی۔ ....

"میں آج کل بہت پریشان ہوں تم نے آج تک باوجود صاحب ثروت ہونے کے میری خدمت نہ کی۔ میں نے جو قرض لیا تھا وہ آجتک ادا نہ ہوا۔ تم دریافت کرکے یہ رقم ادا کردو"

یہ شکل بھی محو ہوگئی اب دیکھتا ہوں کہ میری میز پر بصرہ کی بنی ہوئی خوبصورت ہاتھی دانت کی مچھلی رکھی ہوئی تھی۔ یہ میرے ایک خانگی معاملہ کی یادگار تھی، میں نے بصرہ میں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی تھی، آہ آج سلمہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ سلمہ نے یہ مچھلی مجکو قصر شیریں سے لاکر تحفتاً پیش کی تھی۔ میں اسی احترام و خلوص کی قدر کرتے ہوئے اس مچھلی کو ہمیشہ اپنی میز پر رکھتا ہوں۔ اور خود اپنے ہاتھ سے اوس کو صاف کرتا ہوں۔ اور ایک بڑی حد تک اپنی مرحوم رفیقہ حیات کی یاد کو تازہ کرلیا کرتا ہوں۔ قصہ مختصر دیکھتا ہوں کہ وہ مچھلی بلند ہونا شروع ہوئی۔ اور حقیقتاً ہوا میں پرواز کرنے لگی۔ اور فقتاً مجکو معلوم ہوا کہ میرے قلمدان کے پاس جو ہوا میں معلق تھا۔ ...... جا کر رکی اور ایک پنسل نہ معلوم کس طرح میز پر آکر پاس رکھے ہوئے کاغذ پر لکھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں خاں صاحب نے کہا کہ اسمٰعیل ہاتھ چھوڑ دو۔ جب اس نے ہاتھ چھوڑ دیا تو ہم اپنے ... ہوں میں واپس آنے لگی۔ دوبارہ میرے کمرہ کے نظام میں تزلزل شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ سکون ہونا شروع ہوا۔ اب جو میں نے مچھلی کو دیکھا وہ بالکل ساکت رکھی ہوئی تھی۔ قلمدان اپنی جگہ پر تھا۔ کپڑے کھونٹیوں پر تھے۔ اور دروازوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی میں کاغذ اُٹھایا، یہ لکھا ہوا تھا۔

"میرا نام رام ناتھ ہے، پیشہ ملازمت قوم کوری ساکن شاہ آباد آرہ کا ہوں میں بہت خوبصورت تھا۔ ایک جوگی سے میرا تعلق ہوگیا۔ اوس سے میں نے یہ سیکھ لیا کہ کس طرح ایک قالب سے دوسرے قالب میں جاسکتے ہیں۔ اور کس طرح اپنے اصلی قالب میں واپس آسکتے ہیں۔ جب یہ فن مجکو آگیا تو میں نے ایک دن یہ تماشا کیا کہ میرے کٹی کے سامنے ایک سوار جا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا۔ اس کے قالب میں داخل ہونا چاہیے۔ میں بھی جنگل میں اوس کے تعاقب میں چلا۔ وہ

تھوڑی دور جاکر چشمہ کے کنارہ سبزہ پر لیٹ کر سوگیا۔ میں نے فوراً اپنے عمل سے اوس کو سُلا دیا۔ اور اپنے قالب سے نکل کر اوس کے قالب میں داخل ہوگیا۔ اور اپنے جسم کو حفاظت سے وہیں چھوڑ دیا۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر آبادی کی طرف واپس چلا کہ دفعتاً پولس کے ایک مسلح دستے نے مجکو حراست میں لے لیا۔ معلوم ہوا کہ میں نے کسی ٹھاکر کو اوس کی حسین لڑکی کے خاطر جان سے مار ڈالا ہے۔ مجکو تشویش ہوئی کہ ناحق میں نے ایسے مجرم کے قالب میں اپنی روح ڈالی۔ اب کیا کرسکتا تھا۔ فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ میں واقعات سے واقف نہیں تھا۔ حوالات میں بند کردیا گیا مقدمہ شروع ہوا معلوم ہوا میرے اعزہ بہت سے پیدا ہوگئے ہیں یعنی اوس (چھتری کے اعزہ) مقدمہ کی پیروی شروع ہوئی خوب خوب روپیہ خرچ ہوا۔ ایک دن اتفاق سے ایک لاش معائنہ کے لئے آئی۔ میں نے فوراً اوس کے قالب میں جاکر مخلصی حاصل کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مجرم خودکشی کرکے مرگیا۔ میں نے توبہ کی کہ آیندہ کسی شخص کے قالب میں داخل نہ ہوں گا۔ یہ جدید شخص بھی ایک مجرم تھا۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر اب میرے اختیار میں تھے۔ میں نے اپنی کٹی میں کیا دیکھا با باسکھدیو رام مرگئے میں فوراً اوس کے جسم میں جو ابھی خراب نہ ہوا تھا داخل ہوگیا۔ اب میری بھی اتنی قدر ہونے لگی جس طرح حقیقتاً باباکی ہوتی تھی۔ مین ایک دن اس چشمہ کے قریب اپنے جسم کو دیکھنے کے لئے گیا۔ معلوم ہوا کہ اوس لاش کو پولس اٹھالے گئی۔ اور سرگرم تفتیش تھی۔ بالآخر اوس کا کریا کرم کردیا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے عہد کیا اب مرد کے بھیس میں نہ آؤں گا —— چنانچہ ایک خوبصورت عورت کو میں نے دیکھا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں فوراً اوس کے جسم میں داخل ہوکر ایک جانب چلا۔ دور سے ایک فوجی افسر آرہا تھا۔ اوس نے مجکو دیکھا اور مجھ اس طرح مجکو دیکھ کر اوس نے دل دے دیا کہ میں بھی مجبور ہوگیا وہ لڑائی پر جانے والا تھا۔ خدا معلوم کس طرح وہ مجکو بھی اپنی بیوی بناکر ساتھ لے گیا۔ اوس زمانہ میں عراق میں لڑائی ہورہی تھی۔ اوس افسر نے مجکو قصر شیریں کے قریب ایک مکان میں رکھا۔ اور خود وہ فوج میں چلا گیا معلوم نہیں اوس کا کیا حشر ہوا؟ میں عرصہ تک اوس مکان میں رہی کہ ایک دن ایک ایرانی خاندان تجارت پیشہ آیا۔ اور اُن کی ایک خوبصورت لڑکی سلمہ مجکو بہت پسند آئی۔ وہ اتفاق سے ہیضہ میں مبتلا ہوئی۔ اور جب اوس کا وقت قریب ہوا۔ میں نے اپنا عمل کیا اور اوس کی روح میں داخل ہوکر وہاں سے فرار ہوگئی قصر شیریں میں یہ مشہور ہوگیا کہ فوجی افسر کی نوجوان خوبصورت بیوی دفعتاً ہیضہ میں مبتلا ہوکر مرگئی۔ اور تاجر صاحب کی لڑکی سلمہ دفعتاً جو علیل تھی غائب ہوگئی مختلف افسانے بیان کئے جاتے ہیں —— میں شط العرب چلی گئی۔ وہاں کیپٹن قدوائی سے شادی کی لیکن کچھ دنوں کے بعد میں عورت کے بھیس سے عاجز آگئی تھی۔ ایک دن میں نے اس مچھلی کے قالب میں ایک سوراخ پایا اوس میں میں چلا گیا۔ یہ مچھلی۔ سلمہ نے قدوائی کو دی تھی (یعنی میں نے ہی پیش کی تھی) مشہور ہوگئی کہ سلمہ مرگئی۔ اور وہ دفن بھی کردی گئی۔ میں مچھلی کے قالب میں عرصہ تک میز پر رہا۔ اکثر اشیاء میں نے [illegible] لیکن ایک دن موقعہ مل گیا۔ میں اس مچھلی کے قالب سے بھی نکل گیا۔ اور ایک جوگی کے قالب میں داخل ہوا [illegible] ایک جماعت نے مجکو مار ڈالا۔ اور میری روح کو دوسرے قالب میں داخل نہ ہونے دیا —— اب بہت

پریشان ہوں ——— اب وجود ابتری قبول کر چکا ہوں "

میں نے یہ قصہ پڑھا مجکو کچھ ہنسی آئی اور کچھ غصہ ان خاں صاحب کو تو انعام اکرام دے کر رخصت کیا - اور اب تم لوگوں سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں -

کیپٹن صدیقی - کیا کسی ترک سے تمھاری ملاقات ہوئی تھی ؟

فاروقی - میرے سامنے کا واقعہ ہے انہوں نے اس ترک کو کھانا کھلایا تھا چائے پلائی تھی -

قدوائی - غالباً وہی ہوگا - ٹھیک ہے تمھارا خیال صحیح ہے -

صدیقی - اچھا اگر ایسا ہے تو تار دے کر اس واقعہ کی اصلیت دریافت کی جائے -

فاروقی - اور تمھارے والد والا واقعہ بھی تفتیش طلب ہے !

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتاً آفیسر کمانڈنگ کا تار ملا کہ ۲۸ پانیر رجمنٹ کو برما کی بغاوت فرو کرنے کے لئے تراودی فوراً دوسری گاڑی سے چلا جانا چاہئے - اور اسی وقت یہ حکم سنا دیا گیا - اور کیپٹن قدوائی روحانیین کو گالیاں دیتے ہوئے اپنا اسباب درست کرنے میں مصروف ہو گئے -

ناظر بی - اے (کاکوروی)

فن اشتہار

(تاریخی، فنی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے)

انگلستان کے ملک الشعرا شیکسپیر نے کسی زمانہ میں لکھا تھا کہ :- "نام میں کیا رکھا ہے!" لیکن اگر آج شیکسپیر زندہ ہوتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ "نام نکو" حقیقتاً بڑی قیمتی چیز ہے۔ تبلیغ و اشاعت، پروپیگنڈا، ایک طاقت ہے جسکے ذریعہ سے بڑے بڑے کام نکلے ہیں اور ہمیشہ نکلیں گے۔ مگر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر طاقت میں خیر و شر دونوں پنہاں ہوتے ہیں، اور اب یہ ہمارا سلیقہ ہے کہ ہم اس سے اچھا کام لیں یا برا۔ جس طرح پروپیگنڈا کے ذریعہ سے کسی قوم کے اخلاق کی تعمیر بھی ہوسکتی ہے اور تخریب بھی اسی طرح تجارتی دنیا میں اشتہار کے ذریعہ سے، بشرطیکہ وہ سچا ہو، ناظرین کو اشیار کی نوعیت اور خصوصیت سے آگاہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ کب اور کہاں مل سکتی ہیں۔

اشتہار ذریعہ شہرت ہے، اور شہرت کے ذریعہ سے انسان کا معیار زندگی بلند ہوجاتا ہے۔ جس طرح عقلمند آدمی گمنام خطوط کی طرف توجہ نہیں کرتے، اسی طرح عموماً ان مصنوعات کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے جن کے کارخانہ کا نام معلوم نہ ہو۔ اشتہار دینے سے اشیار کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے اور جب کسی چیز کی طلب زیادہ ہوتی ہے تو اس کی پیداوار یا رسد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر عمدگی اور سرگرمی کے ساتھ کسی چیز کا اشتہار دیا جائیگا اسیقدر وہ زیادہ خرچ ہوگی، اور جس قدر مقدار زیادہ خرچ ہوگی اسی قدر اس کی برآورد میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور جس قدر برآورد کی مقدار زیادہ ہوگی اسیقدر اس کی لاگت میں کمی ہوگی۔

یہ بات کہ اشتہار دینے سے مشتہر کو کس قدر نفع حاصل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ "قومی انجمن خوردہ فروشان" (National Retailer's Association) کی اس رپورٹ سے ہوسکتا ہے جو حال ہی میں اس نے شائع کی تو اور ظاہر کیا ہے کہ مشتہرہ اشیار میں سے کم از کم ۷۰ فیصدی کی نکاسی ہوتی ہے۔ اور اگر مشتہرہ چیز کی قیمت غیر مشتہرہ چیز کی قیمت سے کسی قدر زیادہ ہو تو بھی مشتہرہ چیزیں ساٹھ فیصدی خریدی جاتی ہیں۔

تاریخ | فن اشتہار بہت قدیم ہے۔ مصر میں ایک قدیم نوشتہ برآمد ہوا ہے جو تین ہزار سال کا پرانا ہے۔ یہ کتبہ فی الحقیقت ایک اشتہار ہے جو ایک دولت مند شخص کی طرف سے دیا گیا تھا، اور جس میں اعلان کیا گیا تھا

کہ اگر کوئی شخص ایک مفرور غلام کا پتہ بتائیگا یا اُسے واپس لاکر حوالہ کریگا تو اسے اس قدر رقم بطور انعام دیجائیگی۔

بائبل کے عہد نامۂ عتیق میں بھی اشتہار کا ذکر آتا ہے۔ صحیفہ روتھ میں بوآز کہتا ہے :۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اشتہار دوں اور باشندوں کے سامنے کہوں کہ "اسے خرید لو"۔

قدیم زمانہ میں سکہ کا وجود نہ تھا بلکہ تبادلۂ اشیاء کے ذریعہ سے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ پھر چونکہ تبادلۂ اشیاء کرنے والوں کا حلقہ بہت محدود ہوتا تھا۔ اس لئے ہر خریدار مطلوبہ شے کے بنانیوالے سے واقف ہوتا تھا اور اشتہار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب اجنبیت کم ہوتی گئی اور ایک مقام کے آدمیوں کا دوسرے مقام کے آدمیوں سے میل جول بڑھا تو تجارت میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی اور ایک مقام کا مال دوسرے مقام تک پہونچنے لگا اور اس کے بعد جب منڈیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور مختلف مقامات پر میلے اور بازار لگنے لگے تو ایک مقام کے تاجر دوسرے مقامات میں جاکر مال فروخت کرنے لگے۔ ہر شخص زبانی صداؤں یا منادی کے ذریعہ سے اپنے اپنے مال کا اشتہار دینے لگا چنانچہ اب بھی اکثر پھیری والے بازاروں، گلیوں کوچوں میں دلفریب صدائیں لگا کر خریداروں کی توجہ اپنے مال کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ جب پندرہویں صدی میں فن طباعت کی ایجاد یورپ میں ہوئی تو سب سے پہلا اشتہار انگریزی میں اپریل ۱۶۴۷ء میں شائع ہوا جو حسب ذیل تھا :۔

"ایک کتاب حکومت کلیسا کا آسمانی حق" جس کی انگلستان کے پادریوں نے بیحد تعریف کی ہے، اور جسے لندن کے بہت سے ممتاز علماء دین نے تالیف کیا ہے۔ جس کی بہت سے مقامات میں تصحیح ہوئی ہے اور بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ علماء دین انگلستان کے خلاف بعض سوالات کے جوابات بھی دے گئے ہیں۔ حسب فرمائش جوزف ہنسکاٹ اور جارج کالورٹ شائع ہوئی ہے جو اسٹیشنرس ہال اور گولڈن فلیس میں فروخت ہوتی ہے۔

اس زمانہ میں ہفتہ وار اخباروں کو "مرکریز" (Mercuries) کہا کرتے تھے۔ چنانچہ مرکیوریس ایلینک ٹیکس (Mercurius Elancticus) کے نمبر ۲۵ مورخہ ۴ اکتوبر ۱۶۴۸ء میں حسب ذیل اشتہار شایع ہوا :۔

ناظرین کرام سے التماس ہے کہ وہ ایک وعظ "آئینۂ اشتراکین" کا مطالعہ فرمائیں جو مسٹر پال نیل ایم۔ اے نے بروز اتوار مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۶۴۸ء کو بمقام سینٹ پیٹرز ارشاد فرمایا تھا۔ ایک دوسری کتاب قابل ملاحظہ اور ہے جس کا نام ہے "ہمارے مصلحین کا عکس مع دعا برائے پارلیمنٹ"

اسی طرح "مرکیوریس پولیٹیکس" (Mercurius Politicus) مورخہ جنوری ۱۶۵۲ء میں ایک نظم کے متعلق اشتہار نکلا جو دراصل ایک شجاع جنرل کی شان میں قصیدہ تھا۔

"دی کرڈسی ریکارڈس" مورخہ ۱۶۵۹ء میں اشتہار بازی کے متعلق حسب ذیل مشورہ دیا گیا تھا :۔

"بہت مناسب ہوگا کہ ہر موضع یا قصبہ میں کوئی مشہور اور نمایاں مقام مقرر کیا جائے مثلاً گرجا کا دروازہ، سرائے یا لوہار کی دکان وغیرہ جہاں اس قسم کے اشتہارات چسپاں کئے جایا کریں، مثلاً فلاں کھیت لگان پر دیا جائیگا، فلاں شخص کو ملازم کی یا ملازم کو نوکری کی ضرورت ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

رفتہ رفتہ اخباروں میں اشتہارات کی اس قدر بھرمار ہونے لگی کہ لندن گزٹ کو اپنے نمبر ۶۲ مورخہ جون ۱۶۶۶ء میں ایک اشتہاری ضمیمہ شائع کرنے کے بارہ میں حسب ذیل نوٹس شائع کرنا پڑا :-

اشتہار:- چونکہ روزمرہ کتابوں، ادویہ، اور دیگر چیزوں کے اشتہارات کی ضرورت سے زیادہ کثرت ہوتی جاتی ہے، جن کا شائع کرنا ایک خبر رساں اخبار کے فرائض سے باہر ہے، اس لئے خاص وعام کو ہمیشہ کے لئے مطلع کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے گزٹ کو اشتہاروں سے ہرگز نہ بھریں گے، تا وقتیکہ ان اشتہارات کا تعلق امور سلطنت سے نہو البتہ اشتہاروں کا ایک پرچہ علحدہ شائع کرکے پبلک میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری نوٹسوں کے علاوہ اُس زمانہ میں جس قدر اشتہارات شائع ہوتے تھے اُن کا تعلق زیادہ تر کتابوں اور دواؤں سے ہوتا تھا۔ البتہ "مرکیوریس پولیٹکس" نمبر ۴۳۵ مورخہ ستمبر ۱۶۵۸ء میں سب سے پہلا اشتہار ایسا شائع ہوا جس کا تعلق ان چیزوں سے نہیں تھا وہ اشتہار یہ تھا :-

"ایک نہایت نفیس چینی مشروب جسکی اطبا، تعریف کرتے ہیں، اور جسے اہل چین "Tcha" (چائے) اور دیگر اقوام "تائے" (Tay) یا "ٹی" (Tee) کہتے ہیں، قہوہ خانہ سوٹنگ رینٹ میں فروخت کی جاتی ہے بیچنے والے لندن کے رائل اکسچینج والے ہیں"

اس سے ہر شخص واقف ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں بہت سے کاروبار والے ایسے ہیں جو اپنے اشتہاروں پر ہزاروں پونڈ سالانہ صرف کرتے ہیں، چنانچہ پیٹنٹ دوا کی ایک کمپنی برطانیہ اور امریکہ میں ایسی ہے، جس نے ایک سال کے اندر اشتہاروں پر دو لاکھ پونڈ خرچ کئے اور کوکو بنانے والے ایک کارخانہ نے صرف برطانیہ کے اندر ڈیڑھ لاکھ پونڈ محض اشتہاروں پر صرف کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کارخانوں کو اشتہار کے ذریعہ سے کسقدر آمدنی ہوتی ہے کہ وہ اس قدر عظیم الشان مصارف اشتہارات کے برداشت کر سکتے ہیں۔ الغرض تجارت کے میدان میں اشتہار نے ایک مستقل اہمیت حاصل کر لی ہے۔

اشتہار کی مختلف صورتیں

بیسویں صدی کی ابتدا میں جس قسم کے اشتہارات دئے جاتے تھے، اُن کو ہم مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں :-

(۱) گذشتہ ربع صدی کے اندر کتابوں، رسالوں اور اخباروں میں اشتہار دینے کا کام اس قدر وسعت اختیار

کرگیا ہے کہ اشتہار نویس اور مصوروں کی بہت بڑی تعداد پیدا ہوگئی ہے، مگر جہاں تک اشتہار نویسی میں جدت کا تعلق ہے، اس کا سہرا اہل امریکہ کے سر ہے۔ جسقدر ترقی اور وسعت اہل امریکہ نے فن اشتہار بازی کو دی ہے، اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں کرسکتی۔ ابتدا میں انگلستان کے مشتہرین اخبار کا صرف ایک کالم استعمال کیا کرتے تھے۔ انکا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اپنا اور اپنے کارخانہ کا نام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کریں۔ اور ان کے اشتہاروں میں نہ کوئی دلفریبی ہوتی تھی نہ دلچسپی۔ ایک عیب ان کے اشتہاروں میں یہ بھی ہوتا تھا کہ تمام اشتہار شروع سے آخر تک نہایت باریک ٹائپ میں چھاپا جاتا تھا۔ لیکن اب اشتہار ہر قسم کے ٹائپ اور نمایاں جگہ میں مع تصاویر کے شائع کئے جاتے ہیں

(۲) بڑے بڑے کاغذ کے تختوں پر نمایاں سرخیوں اور دیدہ زیب تصاویر کے ذریعہ سے بھی اشتہار دئے جاتے ہیں۔ پوسٹروں کا خط عموماً جلی اور سرخیاں عموماً دلچسپ ہوتی ہیں۔ مضمون اگرچہ کم ہوتا ہے۔ مگر دلچسپ اور موثر زیادہ ہوتا ہے پوسٹر عموماً شارع عام پر چسپاں کر دئے جاتے ہیں۔ مگر اب یہ طریقہ غیر موثر ہوگیا ہے، کیونکہ لوگ شارع عام پر کھڑے ہوکر اب کسی اشتہار کا پڑھنا اچھا نہیں سمجھتے۔

(۳) اشتہارات اور لٹریچر بذریعہ ڈاک لوگوں کے پاس روانہ کرنا۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے

جس طرح ہر مشتہر کو اپنے مفاد کا خیال ہوتا ہے، اسی طرح ہر خریدار کو اپنے نفع کی فکر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ عموماً وہ اشتہارات زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو براہ راست اور خوشگوار طریقہ سے ناظرین کے مفاد اور ان کی خواہشات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک اشتہار میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں۔

"یہاں آپ کو ہر قسم کی چیزیں ملیں گی۔ اور جس قیمت اور خوبی کی چیز آپ پسند فرمائیں گے وہ آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی"

مندرجہ بالا عبارت کی طرف زیادہ خریدار متوجہ ہوں گے بمقابلہ مندرجہ ذیل تحریر کے:۔

"ہمارے یہاں سامان کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ ہمارا مال اعلیٰ قسم کا ہے۔ ہمارے یہاں قیمتیں کم ہیں"

ہمیشہ اس قسم کا اشتہار کاروبار کے لئے مفید ہوتا ہے جس میں خریدار کو دوستدارانہ مشورہ دیا جائے کیونکہ اس طرح اشتہار اشتہار نہیں رہتا بلکہ وہ ایک دلچسپ پیام اور نوید خوشخبری ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے اشتہار کے لئے ضروری ہے کہ دوکاندار اپنے گاہکوں یا متوقع خریداروں سے بخوبی واقف ہو، ان کے رجحانات اور طبائع کا پوری طرح علم حاصل ہو ورنہ نتیجہ مفید نہیں نکل سکتا۔ مثلاً فرض کیجئے۔ شمس النہار اور بدر النسا دو بہنیں ہیں، ایک کی شادی کسی تعلقدار سے ہوئی ہے اور دوسری ایک سوداگر کے عقد میں آئی ہے۔ دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق لباس اور دیگر ضروریات کی تلاش ہے۔ اس لئے ایک ہی اشتہار کے ذریعہ سے آپ دونوں بہنوں کو اپنا خریدار نہیں بنا سکتے۔ آپ کو دونوں کے سامنے مختلف مضمون کے اشتہارات پیش کرنا ہوں گے۔

ایک ہوشیار اور دانشمند مشتہر اپنے اشتہار کو اس خوش اسلوبی سے پیش کرے گا کہ دیکھنے والوں کے احساسات فوراً متاثر ہوں۔ مثلاً ایک مشتہر اپنے کارخانہ کی بنی ہوئی چائے فروخت کرنا چاہتا ہے؛ اپنے اشتہار میں وہ ایک ایسی تصویر دیتا ہے جس میں ایک شخص چائے پیتا نظر آتا ہے اور اس کا چہرہ مسرور ہے۔ اس تصویر کے ذریعہ سے گویا مشتہر نے شائقین چائے کی نہ صرف حس باصرہ سے اپیل کی ہے بلکہ چہرہ کو شگفتہ دکھا کر لوگوں کی حس ذائقہ سے بھی اپیل کی گئی ہے، اور اگر تصویر میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ پیالی سے بھاپ اٹھکر پینے والے کی ناک تک پہونچ رہی ہے اور وہ مسکرا رہا ہے تو یہ تصویر قوت شامہ کو بھی متاثر کریگی۔ الغرض تصویری اشتہاروں کے ذریعہ سے حواس انسانی پر اثر ڈال سکتے ہیں۔

انسان کی خاص خاص خواہشات حسب ذیل ہیں:۔

بھوک۔ تعلقات جنسی۔ مادری یا پدری تعلق، اشتیاق، خوف۔ جنگجوئی۔ مدنیت، جذبۂ تفوق، عجز و انکسار۔ اور اس لئے جو مشتہرین زیادہ تجربہ کار ہوتے ہیں وہ اپنے اشتہارات میں حسب ضرورت انھیں احساسات کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور چونکہ حسن نسوانی کا فطرتاً انسان کے دل پر بہت اثر پڑتا ہے اس لئے سوئی سے لیکر موٹر تک کے اشتہارات میں حسین و جمیل عورتوں کی تصویروں سے کام لیا جاتا ہے۔ خصوصاً منجن کا تو کوئی اشتہار کسی خوبصورت خاتون کی تصویر سے خالی نہیں ہوتا یہی حال عطریات کا ہے۔

اس کا بڑا لحاظ رکھنا چاہئے کہ لوگوں کے حافظہ میں کیونکر کسی چیز کے خیال کو مرتسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کارخانہ سگار کا اشتہار دینا شروع کیا اور اس کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اس کی ترقی کا راز صرف یہ تھا کہ سگار کے بکس پر جو کاغذ لپٹا جاتا تھا اس پر اس ملک کے ایک دلفریب منظر کی تصویر بنائی گئی تھی جہاں اس سگار کا تمباکو پیدا ہوتا تھا آپ نے موٹر ٹائر کا ایک اشتہار انگریزی اخباروں اور رسالوں میں دیکھا ہوگا جس میں ایک آدمی کی پوری تصویر ٹائروں کے ذریعہ سے بنا دی جاتی ہے۔ اس کا نام جدت ہے اور اشتہار میں اس سے بہت کامیابی ہوتی ہے۔ ایک موٹر کے اشتہار میں موٹر چلانے کی جگہ پر بندر بٹھا دیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موٹر کا چلانا اس قدر آسان ہے کہ اُسے ایک جانور یا بچہ تک چلا سکتا ہے۔ اس اشتہار کو دیکھتے ہی عوام کی قوت تخئیل پر اثر پڑتا ہے۔ اشتہار کے لئے بہترین چیز مشتہر کا ذاتی تجربہ ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اشتہار دیکر دولت کمانا چاہتا ہے تو اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کے خصوصیات اور رجحان طبع سے بخوبی واقف ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی توجہ اپنے مال کی طرف منعطف کر کے اُن کو اپنا خریدار بنائیں تو آپ کو چاہئے کہ خود کو اپنے آپ خریدار کی جگہ تصور کریں اور سوچیں کہ آپ کے خیالات کیا ہیں ——— اور یہ کہ آپ نے جو اشتہار اپنے مال کا دیا ہے اس کا اثر آپ کی طبیعت پر پڑتا ہے۔ موثر اشتہار کے لئے ضروری

ہے کہ جو کچھ بذریعہ اشتہار آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں اس کی نسبت سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ کہدیجئے اگر آپ بذریعہ اشتہار کوئی ایسی چیز فروخت کرنا چاہتے ہیں جو واقعی اچھی نہیں ہے تو اشتہار دینے کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کامیابی ہوسکتی ہے۔

اشتہار کی عبارت ایسی ہونی چاہئے کہ لوگ یہ سمجھ سکیں کہ آپ کو شے مشتہرہ کے تمام حالات سے پوری آگاہی حاصل ہے اسی لئے اگر وہ چیز مختلف صورتوں میں استعمال ہوسکتی ہے تو آپ کو اشتہار میں صاف صاف لکھنا چاہئے کہ۔ اس چیز کے اتنے فوائد ہیں" یہ نہ لکھیں کہ "اس چیز کے بیشمار فوائد ہیں"

خریدار کی طبیعت پر اثر ڈالنے کے لئے اشتہار کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں کہ ان کے سچے ہونے کا یقین آجائے شے مشتہرہ کی تمام خصوصیات بلاکم وکاست بیان کردینا چاہئے اور مبالغہ سے بالکل کام نہ لینا چاہئے۔ اشتہار میں طویل فقروں سے ہمیشہ محترز رہنا چاہئے، کوئی فقرہ تیس پینتیس لفظوں سے زیادہ نہ ہو، اور جس اشتہار میں عوام الناس کو مخاطب کیا جائے اس میں دس پندرہ لفظوں سے زائد کا کوئی فقرہ استعمال کرنا چاہئے کیونکہ عوام کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ عبارت نہایت صاف صاف ہونا چاہئے اور الجھن سے بالکل صاف۔ فعل و فاعل اور خبر و جزا قریب ہی قریب رکھو۔ تعقید ہرگز نہ پیدا ہونے دو، ہر فقرہ اپنے معنی و مطلب کے لحاظ سے مکمل ہو تاکہ پڑھنے والا پڑھنے کے ساتھ سمجھتا چلا جائے اور کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب میں ہمیشہ صرف ونحو کا خیال رکھو۔ "یہ" "وہ" "اس" "اُس" اور "کب" "جب" "کہاں" وغیرہ کے اشارے صاف اور صحیح ہوں غیر مانوس، ثقیل، اور بازاری الفاظ سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے یہ یاد رہے کہ اگر اردو زبان میں اشتہار دے رہے ہیں تو ترکی، عربی، فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال قطعی نامناسب ہے۔ اسی طرح سنسکرت یا ہندی الفاظ کی بھرمار بھی مناسب نہیں الغرض اشتہار کے الفاظ لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ سمجھنے کے لئے پڑھنے والے کو دماغ پر زور دینا نہ پڑے۔ اشتہار کی جان لوگوں میں حالت منتظرہ پیدا کرنا ہے۔ یعنی اشتہارات کی ترتیب اس طرح ہونی چاہئے کہ پہلے اپنے مال کی صفت بیان کرتے ہوئے اس کے نام معلوم کرنے کا شوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ آخر میں مشتہرہ چیز کا نام بتایا جائے اس سے اشتہار میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوجاتی ہے۔

فی زمانا زندگی کی جد وجہد اس قدر سخت ہوگئی ہے کہ لوگوں کو بڑی بڑی تحریریں پڑھنے کی فرصت نہیں۔ اسلئے اشتہار دیتے وقت ہمیشہ اختصار کا خیال رکھنا چاہئے۔ اشتہار میں ہمیشہ کم سے کم الفاظ استعمال کرو۔ لیکن یہ الفاظ ایسے ہونے چاہئے کہ چیز کی تصویر سامنے آجائے۔

اشتہار کو دیدہ زیب بھی ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے اسّی فیصدی تاثرات حسِ باصرہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے

ہیں - اشتہار میں جسقدر الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جائیں وہ معروف افعال صیغوں کی صورت میں ہوں، مجہول نہ ہوں مثلاً آپ یہ لکھئے کہ :-

"فلاں چیز استعمال کرکے اپنی مدد کیجئے، اپنا وقت بچائیے - اور اپنی پریشانی رفع کیجئے"

یہ نہ لکھئے کہ :-

"اگر آپ فلاں چیز استعمال کریں گے تو آپ کو مدد پہونچیگی، آپ کی دقتیں رفع ہوجائینگی اور آپ کا وقت بچ جائیگا"

زوردار الفاظ ہمیشہ اس جگہ استعمال کیجئے جہاں زور دینے کی ضرورت ہو اور کوئی دعویٰ بغیر دلیل اور ثبوت کے پیش نہ کیجئے - اشتہار ہمیشہ اثباتی و ایجابی الفاظ میں ہونا چاہئے اور منفی الفاظ سے احتراز کرنا چاہئے -

مثلاً اگر چاقو کا اشتہار دینا ہے تو یہ لکھو کہ :- "اپنی دھار ہمیشہ قائم رکھتا ہے" یہ نہ لکھو کہ جلد کند نہ ہوگا"

آج کل جو اشتہارات رائج ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جذباتیہ، یعنی ایسے اشتہار جن کے ذریعہ سے ہم انسان کے جذبات سے اپیل کرتے ہیں ان میں زیادہ تر تمثیل سے کام لیا جاتا ہے، دوسرے تعلیلیہ - یعنی وہ اشتہار جن میں بذریعہ دلائل شئے مشتہرہ کی خوبی ثابت کی جاتی ہے - اور اگر ہم کسی اشتہار میں یہ دونوں باتیں پیدا کرسکیں تو کامیابی کی زیادہ توقع ہے -

آج کل جو نمائشی اشتہارات نظر آتے ہیں وہ صنعت و تجارت دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ہیں جب سے دنیا میں موٹروں کی کثرت ہوگئی ہے، پوسٹروں کے ذریعہ سے اشتہار دینے کا طریقہ بہت وسعت اختیار کرگیا ہے سڑکوں کے دونوں طرف مناسب مقامات پر خوبصورت اور موثر اشتہارات چسپاں نظر آتے ہیں - جن کے جلی حروف اور دلچسپ سرخیوں پر اہل نظر کی توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے - ایک خوبصورت اور دلاویز تصویر اور چند دلچسپ الفاظ کا اشتہار خریدار مہیا کرنے میں سحر کا کام دیتا ہے - بعض پوسٹر جو اپنے عقبی منظر سے ہم آہنگی پیدا کرلیتے ہیں وہ نہ صرف منظر کو چار چاند لگا دیتے ہیں بلکہ خریداروں کی توجہ فوراً جذب کرلیتے ہیں - بجلی کے ذریعہ سے اشتہار دینے کا طریقہ بھی بالکل حال کی چیز ہے - بازاروں میں جہاں برقی روشنی ہوتی ہے اکثر نمایاں مقامات پر کسی چیز کا نام یا پتہ تحریر کردیا جاتا ہے جس پر طاقتور برقی قمقموں کی روشنی پڑتی ہے اور پھر چند لمحہ بعد خود بخود غائب ہوجاتی ہے تو اس کا اثر شئے مشتہرہ کی شہرت پر بہت پڑتا ہے - اگر روشنی رنگین اور تیز ہوتی ہے تو وہ اور بھی زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہے برقی قمقموں کو اس طرح قائم کیا جائے کہ روشنی دور تک پھیلے -

یہ یاد رکھئے کہ آپ کی دکان ایک اسٹیج ہے - اور فروخت کرنے والا ایک ایکٹر - لہذا آپ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ فروخت کرنے والے کا لباس عمدہ اور صاف ہو، اور وہ ایک ایکٹر کی طرح وقت اور موقعہ دیکھکر خریداروں سے گفتگو کرے، اسی طرح دکان کو بھی ہمیشہ صاف اور آراستہ رکھنا چاہئے - اگر آپ کے یہاں ہر قسم کا مال موجود ہو

اور دکان میں قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ سجا ہوا نہیں ہے تو آپ کی دکان کی طرف بہت کم خریدار متوجہ ہوں گے۔

اشتہار بذریعہ ڈاک

اشتہار دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر شہر و قصبہ کے مشہور اور صاحب حیثیت اشخاص کی فہرست مرتب کر لی جاتی ہے اور پھر ان کے پاس، خطوط، نمونے، فہرستیں، جنتریاں رسالے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں گویا در کھئے کہ آپ کا لیٹریچر آپ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس لئے آپ کے اشتہاری خطوط کی نوعیت ہمیشہ ایسی ہونی چاہئے کہ اگر ان کے مضمون کو بآواز بلند پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہو گویا خریدار کے سامنے آپ خود کلام کر رہے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ اشتہاری خطوط میں اگر تصاویر اور رنگین حروف سے کام لیا جائیگا تو ان کا اثر اور زیادہ ہوگا۔ اشتہاری خطوط کی کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہونا چاہئے اور کاغذ بہت نفیس، ایک انسان اگر ایک مرتبہ یا دو مرتبہ بلانے سے نہیں بولتا تو تیسری مرتبہ ضرور بولیگا، اسی طرح اگر آپ کسی صاحب کی خدمت میں اپنا اشتہاری خط ایک مرتبہ یا دو مرتبہ ارسال کریں تو ممکن ہے کہ وہ بے اثر رہے مگر تیسری مرتبہ آپ کے خط کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اس لئے مایوس نہ ہونا چاہئے اور بار بار اپنا اشتہار بھیجنا چاہئے۔

ڈاک کے اشتہاروں کو عموماً کسی دلچسپ خبر، حیرت انگیز بیان، اور بعض اوقات کسی دلچسپ لطیفہ سے شروع کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ باتیں نفس مطلب سے غیر متعلق نہ ہوں بلکہ چسپاں ہوں۔ اشتہاری خط کا پہلا پیراگراف ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جسے پڑھتے ہی انسان متوجہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ فوائد بتائے جو شے مشتہرہ سے حاصل ہو سکتے ہیں پھر اس کی قیمت اور شرائط خریداری سے آگاہ کیجئے۔ خط کے آخری حصہ میں آپ پرزور الفاظ کے ذریعہ سے ایسا اثر ڈالئے کہ خریدار فوراً آمادۂ عمل ہو جائے۔ مثلاً لکھئے کہ:—

کارڈ ملفوفہ پر دستخط کر کے ابھی بواپسی ڈاک ارسال فرما دیجئے۔ یا اگر ہماری دکان کی طرف سے گذر ہو تو آج ہی تکلیف کر کے خود ملاحظہ فرما لیجئے۔ یا یہ کہ فلاں رعایت فلاں تاریخ کو ختم ہو جائیگی۔

فہرستوں میں تصاویر سے کام لینا اشتہار دینے کا نہایت موثر طریقہ ہے، اشتہار کی تصویر گویا آپ کے مال کی نقیب یا خطیب ہوتی ہے۔ حروف اور تصاویر کے رنگوں کا بھی خریداروں پر بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً شکاگو کی ایک دکان نے اپنی ایک فہرست سیاہ و سفید اور دوسری رنگین شائع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاہ و سفید کے مقابلہ میں رنگین فہرست کے ذریعہ سے بہت زیادہ فرمائشیں موصول ہوئیں۔ گمنام چیزوں کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوتے ہیں، اس لئے آپ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ فہرست تک کا بھی کچھ نہ کچھ نام رکھئے۔ مثلاً گھڑی ہے تو لکھئے "۱۷-۱۵" دوا ہے تو لکھئے "اکسیر ۵"، فہرست ہے تو لکھئے "ہماری فہرست ۳ طلب فرمائیے۔ وغیرہ

اشتہار کی ترتیب

لوگ آپ کا اشتہار پڑھنے کی زحمت اسی وقت گوارا کریں گے جب آپ اُن کو کسی نہ کسی طرح

اپنی طرف متوجہ کریں گے۔ اور توجہ حاصل کرنے کا اولیں ذریعہ اشتہار کی سُرخی ہے۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو سمجھ لیجئے کہ لوگ اشتہار کے مضمون کو بھی پڑھیں گے جیسے اپنی طرزِ ادا، استعمال تصاویر وغیرہ کے لحاظ سے اتنا ہی دلکش و موثر ہونا چاہیئے۔ جس طرح اشیا مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے اشتہار میں بھی اختلاف و فرق ہونا چاہیئے۔

مثلاً اگر کسی باربرداری کے موٹر کا اشتہار دینا منظور ہے تو آپ کو اشتہار میں اس کے پرزوں کی مضبوطی اور زمین کی دشوار گذاری دکھانا پڑے گی، اور اگر کسی زنانہ تفریحی موٹر کا اشتہار دینا ہے تو اس میں آپ گاڑی کی خوبصورتی و نزاکت دکھلائیں گے۔ پہلے اشتہار کے منظر میں سختی و کرختگی اور دوسرے اشتہار کے منظر میں نفاست اور دلفریبی پیدا کرنا پڑے گی۔

اپنے ہر اشتہار میں آپ کو اپنا تجارتی نشان یا اپنے مخصوص دستخط ضرور دینا چاہیئے۔ جب ان پر لوگوں کی نظریں تواتر کے ساتھ پڑیں گی تو اس سے نہ صرف آپ کے مال کی شہرت بڑھ جائیگی بلکہ ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اشتہار پڑھنے والے کو آپ کی دیگر مصنوعات بھی یاد آجائیں گی۔ مثلاً کانپور کے ایک مشہور کارخانہ کا تجارتی نشان "لال املی" ہے۔ اس کارخانہ کا یہ نشان جب کسی اشتہار یا چیز پر نظر پڑیگا تو اس کی بنائی ہوئی اور چیزیں بھی خیال میں آجائینگی۔ اشتہار میں سرخی اور مضمون کے ساتھ ہی اگر رنگ آمیزیوں اور تصویروں سے بھی کام لیا جائے تو اشتہار میں خاص کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن نقوش و تصاویر کو شے مشتہرہ کے لحاظ سے انتخاب کرنا چاہیئے۔ مثلاً اگر آپ عطر کی شیشیاں فروخت کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے اشتہار میں خوشنما پھولوں، رنگین حاشیوں، یا کسی جمیل عورت کی تصویر سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن بندوقوں اور کارتوسوں کے اشتہار میں ایسی چیزیں بالکل مہمل معلوم ہوں گی۔ اس کے لئے جنگلی جانوروں اور صحرائی مناظر کی تصویریں مناسب ہیں۔ اشتہار کی کتابت میں خفی و جلی مختلف قلموں سے کام لینا چاہیئے کیونکہ اختلاف سے دیدہ زیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے اشتہار میں کوئی ایسی تصویر شائع کریں جس میں انگلی سے اشارہ کیا گیا ہے، تو دیکھنے والے کی توجہ فوراً اشارہ کردہ مقام کی طرف مبذول ہو جائیگی یہی اثر سگریٹ کے دھویں کے خمدار نشان کا ہوا کرتا ہے۔

اگر کسی موٹر کے اشتہار میں کسی جمیل عورت کی تصویر دی جائے تو وہ ضرور توجہ کو مائل کرے گی، لیکن اگر عورت کو اس طرح سے دکھایا جائے کہ وہ موٹر میں بیٹھی ہوئی سیر کر رہی ہے تو اس کا اثر اور زیادہ اچھا ہوگا تصاویر کے بارہ میں دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے ایک یہ کہ تصویر میں شے مشتہرہ کو استعمال کرتے ہوئے دکھانا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ تصویر کے ذریعہ سے شے مشتہرہ کی عمدگی ساخت کو دلفریب ماحول کے ساتھ پیش کرنا چاہیئے۔

تصویریں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے دیکھنے سے کوئی واقعہ نظروں کے سامنے پھر جائے اور دوسری وہ جو محض جذب نظر کے لئے استعمال کی جائے۔ مشتہر کے لئے لازم ہے کہ وہ دونوں قسم کی تصاویر کا صحیح استعمال سیکھے

یاد رکھنے کے قابل باتیں

مشتہر کو لازم ہے کہ وہ اشاعت اشتہارات سے پہلے ہی پورا خاکہ مرتب کرلے اور اچھی طرح سوچ لے کہ مشتہر کردہ شے کے خریدار کون لوگ ہوں گے اور یہ کہ اُس کو فروخت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا۔

سب سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ جس چیز کا آپ اشتہار دینا چاہتے ہیں وہ ضروریات میں داخل ہے یا سامان تعیش میں، نیز یہ کہ وہ کوئی پُرانی چیز ہے یا نئی۔ کیونکہ وہ چیزیں جو ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ ان کے اشتہارات ان چیزوں کے اشتہارات سے مختلف ہونے چاہئیں جو جدید ہیں یا سامان تعیش میں داخل ہیں۔ اول الذکر قسم کی اشیاء میں قیمت کا خیال سب سے بڑی چیز ہے، اور دیگر قسم کی اشیاء میں وضع قطع، صورت شکل کی دیدہ زیبی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر شے مشتہرہ بالکل جدید چیز ہے تو اُس کے استعمال کے متعلق خریداروں کو تعلیم دینا پڑے گی، اور اگر شے مشتہرہ کوئی مانوس چیز ہے تو خریدار کو اطمینان دلانا پڑے گا کہ آپ کی چیز دوسری چیزوں سے کیوں بہتر ہے۔

اگر آپ کی مشتہر کردہ چیز میں کچھ خصوصیات خاص ہیں تو دوسری اشیا کے مقابلہ میں ان کو ظاہر کیجئے۔ یہ بھی دیکھئے کہ آپ کی چیز کسی خاص موسم میں زیادہ فروخت ہوتی ہے یا ہمیشہ فروخت ہوتی رہتی ہے، اگر آپ کی چیز فصلی ہے تو اس کے اشتہار کو اسی زمانہ میں وسعت دیجئے جس زمانہ میں وہ زیادہ فروخت ہوتی ہے، اگر آپ کی چیز جاڑوں میں زیادہ فروخت ہوتی ہے تو گرمیوں کے زمانہ میں اس کا اشتہار ان ممالک میں دیجئے جو خط استوار سے زیادہ جانب جنوب واقع ہیں۔

یہ بھی خیال رکھئے کہ آپ کی چیز کو خریدنے والے کون لوگ ہیں۔ یعنی سامان خورد نوش کی طرح اسے ہر شخص خریدتا ہے یا وہ ایسی چیز ہے جس کا خریدار کوئی خاص طبقہ ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ آپ کی چیز کا خریدار مردوں کا طبقہ ہے یا عورتوں کا اگر آپ کی چیز کے خریدار سب لوگ ہیں تو آپ اپنا اشتہار اس طریقہ سے دیجئے کہ وہ سب کو اپیل کرے، لیکن اگر اسکی خریدار کوئی خاص جنس ہے تو اشتہار دیتے وقت اس خاص جنس کا خیال رکھئے۔

اگر آپ کی چیز کے خریدار کسی خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً 'مدرسین' یا 'مزارعین' یا 'اہل سیف' وغیرہ وغیرہ تو آپ اپنے اشتہار کی ترکیب و ترتیب ایسی رکھئے کہ وہ اس خاص طبقہ کے لوگوں پر اثر انداز ہو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر شخص کسی ایک چیز کو ایک ہی مصرف کے لئے نہیں خریدتا۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ ہر خریدار کے مزاج سے پوری واقفیت حاصل کریں۔ اور یہ بھی خیال رکھئے کہ آپ کے خریدار قیمت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں، یا مال کی خوبی اور اس کے فوائد کا۔

تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق

حسن تائب

خادمہ ملکۂ تیودورا کے حضور میں آئی، جھک کر آداب بجالائی اور آگے بڑھکر ملکہ کے کان میں آہستہ سے کہا کہ ۔ ———"میکائیل"

تیودورا نے اپنا سر اُٹھایا اور پوچھا " بڑا یا چھوٹا ؟"

خادمہ نے جواب دیا " اے ملکۂ عالم، بڑا"

ملکہ نے کہا " بہتر ہے بلاؤ" ——— خادمہ چلی گئی

ملکہ نے اپنی جگہ سے اُٹھکر، چیتے کو جو اس کے قدموں پر پڑا سو رہا تھا، قریب کے پنجرہ میں لیجا کر بند کر دیا، اور واپس آکر اس کمرہ میں جس کا دریچہ سمندر کی طرف کھلتا تھا، مخمل و حریر کے گدّوں اور تکیوں پر جاکر لیٹ رہی۔

اسی وقت ایک کشیدہ قامت نوجوان اندر داخل ہوا، جس کی آنکھیں نیلگوں تھیں اور بال بھورے ۔ میکائیل دوزانو ہوا، ملکہ نے اپنا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ہنوز یہ رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ ملکہ نے اپنی آغوش کھولدی اور آخر کار وہ اظہار شیفتگی جس کی ابتدا ملکہ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی اس کے سینہ وگردن، شانہ و رخسار تک پہونچنے سے قبل ختم نہ ہوسکا۔

میکائیل نے انتہائی حزن وملال کے ساتھ کہا " کیا یہ صحیح ہے کہ ملکۂ عالم اب میری حاضری کو پسند نہیں فرماتیں اور قصر کے اندر میرا آنا شاق گزرتا ہے۔ اگر یہ غلط نہیں ہے تو کیا میں اس کا سبب معلوم کرسکتا ہوں، کیا مجھے بتایا جاسکتا ہے کہ عنایات شاہانہ میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا"

تیودورا نے میکائیل کا سر اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر کہا "اے میکائیل، میرے دل میں تیری محبت بدستور قائم ہے، لیکن بعض دفعہ واقعات وحالات کچھ ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ انکا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔

تجھے معلوم ہے کہ اس قصر میں داخل ہونے سے قبل، سلطنت بازنطینی کی ملکہ بننے سے پہلے ہی میں تجھ سے

محبت کرتی تھی، اور ملکہ ہونے کے بعد بھی کوشش کرکے میں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ تو آزادی کے ساتھ مجھ سے ملتا رہے، لیکن اب ایک حادثہ ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے اور تیرے دونوں کے انجام سے ڈرنے لگی ہوں"

میکائیل۔ وہ کیا حادثہ ہے۔

ملکہ ——"چند دن ہوئے تیرا بھائی آیا اور مجھ سے ملنے کی درخواست کی۔چونکہ اس کا نام بھی میکائیل ہے، اسلئے میں نے یہ سمجھکر کہ یہ تو ہی ہے اجازت دیدی"

میکائیل۔ (گھبراکر) پھر کیا ہوا۔

ملکہ ——"اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا"

میکائیل ——"پھر"

ملکہ ——"میں نے اس سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ، لیکن اس نے جاتے ہوئے غضبناک ہوکر دھمکی دی اور کہا کہ میرے اور تیرے تعلق کو وہ تمام شہر میں مشتہر کریگا اور بادشاہ سے بھی جاکر کہیگا" اس لئے اس واقعہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت تک قصر میں آمد و رفت بند کردے، جب تک ....

میکائیل "جب تک؟"

ملکہ ——"ہاں، جب تک کہ تیرا بھائی اس ارادہ سے باز نہ آجائے یا راستہ بالکل صاف نہ کردیا جائے، میکائیل نے یہ سنا اور انتہائی غیظ کے عالم میں دیوانہ وار وہاں سے نکل کھڑا ہوا"

تیودورا کا باپ جانوروں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں کا نام کسی کو کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کون تھی اور کیا تھی جب اس کا باپ مرگیا تو وہ بہت کمسن تھی، دنیا اُسپر تنگ ہوئی تو حصول معاش کے لئے اس نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جو ایک خانماں برباد حسین عورت اختیار کرسکتی ہے، وہ تماشہ گاہوں میں ناچتی تھی، ہوٹلوں میں جاکر گاتی تھی، سڑکوں پر، گلیوں میں اپنے پُرشباب اعضا کی نمائش سے لوگوں کو لبھایا کرتی تھی — اسی زمانہ میں اسکے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے انجام سے ڈر کر اس نے اپنی آوارہ زندگی کو ترک کرکے ایک دکان قائم کرلی جہاں وہ عورتوں کے کپڑے وغیرہ سیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کے ماضی کو بھلا دیا اور طبقۂ امرا کی عورتیں بھی اس کی دکان پر آنے جانے لگیں۔ اتفاق سے اسی دوران میں سلطنت کے ولی عہد (یوستی نیانوس) نے اسے دیکھ لیا اور بیتابی کے ساتھ مائل ہوگیا۔

ولی عہد کی نسبت کسی اور جگہ ہوچکی تھی اور اپنے مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ تیودورا سے شادی نہ کرسکتا تھا جس کا ماضی اس قدر بدنام اور حال نہایت ادنیٰ درجہ کا تھا۔لیکن ایک تو ولی عہد خود فطرتاً بہت آزاد طبع واقع

ہوا تھا، دوسرے اسی زمانہ میں جدید قانون کے رو سے شاہی خاندان کے افراد کو شادی کے مسئلہ میں پوری آزادی دیدی گئی اس لئے تخت نشین ہوتے ہی اس نے تیودورا سے نکاح کر لیا اور اسے بازنطینی سلطنت کا ملکہ بنا دیا ——

کچھ عرصہ تک تو جاہ و ثروت سلطنت و حکومت کے نشہ نے تیودورا کو مدہوش رکھا، لیکن جب وہ تھک گئی تو اسکو پھر اپنا وہی دور آزادی یاد آنے لگا اور تمام وہ جذبات جوانی جن کو واقعات نے افسردہ کر دیا تھا، پھر از سر نو تازہ ہو گئے چنانچہ اُس نے اپنے تمام قدیم عشاق کو آہستہ آہستہ بلانا شروع کیا اور چند دن میں قصر حکومت اچھا خاصہ معصیت گاہ بن گیا

اُنھیں عشاق میں دو بھائی میکائیل کبیر، و میکائیل صغیر بھی تھے، جو پوشیدہ طور پر ملکہ سے آکر ملا کرتے تھے، لیکن ایک کو دوسرے کی آمد کی اطلاع نہ ہوتی تھی۔ ایک دن چھوٹے میکائیل کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ملکہ اس کے بڑے بھائی سے بھی ملتی ہے اور زیادہ التفات سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت برہمی کے عالم میں ملکہ کے پاس گیا اور کہا کہ اگر میرے بھائی کی آمد و رفت یہاں بند نہ کی گئی تو میں یہ تمام راز دنیا پر افشا کر دونگا"

یہ سنکر ملکہ اس وقت تو خاموش ہو گئی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو راستہ سے دور کرنا ہے۔

ملکہ اپنے مخصوص کمرہ میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے کہ خادمہ جو اس کے تمام رازوں سے آگاہ ہے، حاضر ہوتی ہے اور میکائیل کے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔

ملکہ چونک کر پوچھتی ہے "بڑا؟" اور پھر ملکہ کے چہرے سے جواب کو پڑھکر مسکراتی ہوئی کہتی ہے "ہاں بلالاؤ میں تو اس کا انتظار ہی کر رہی تھی"۔

میکائیل آیا اور ملکہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر کہا کہ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اس وقت تک مچھلیاں اس کے جسم کو کھا چکی ہونگی"۔

ملکہ نے گھبرا کر پوچھا "کیا واقعی تو نے اُسے قتل کر دیا"

میکائیل —— "ہاں قتل کر دیا، اور اس کے جسم کو دریا میں ڈالدیا"

"یہ سنکر ملکہ نے اپنی آغوشش کھولدی اور دونوں کے لب ایک دوسرے سے مل گئے اس حال میں کہ اُنسے مشتعل آگ کی سی حرارت پیدا ہو رہی تھی"۔

اس وقت کہ دونوں ریشم کے نرم نرم گدوں پر لیٹے ہوئے ہیجان نفس کی انتہائی کیفیات میں ڈوبے ہوئے تھے، ملکہ کی نگاہ میکائیل کی ہتیلی پر پہونچکر رُک گئی، اور اُس نے خیال کیا کہ اس پر خون کا دھبہ موجود ہے۔ اس کے بعد اس نے میکائیل کی دوسری ہتیلی کو دیکھا، چہرہ کو دیکھا، گردن کو دیکھا اور ہر جگہ اُسے خون کے بڑے بڑے دھبے

نظر آنے لگے۔

اس وقت تک تیودورا خدا معلوم کتنے جرائم کی مرتکب ہو چکی تھی، لیکن یہ اس کی زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ اس کے ضمیر نے اس کے جرم کو اس طرح پیش کیا ہو۔ گزشتہ زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے اس کے سامنے آرہے تھے اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی آواز اس کو ملامت کر رہی ہے اور اس کا دل کانپا جا رہا ہے۔

کامل چھ ماہ گزر گئے ہیں کہ ہزاروں معمار باسفورس کے ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت کی تکمیل میں رات دن مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ عمارت ملکہ تیودورا کے حکم سے تعمیر ہو رہی ہے جس میں ۵۰۰ آدمیوں کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ تعمیر مکمل ہوگئی تو ملکہ نے تمام ملک میں اعلان کیا کہ جو عورتیں گناہوں سے تائب ہوکر عصمت و عفت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں وہ آئیں اور اس عمارت میں قیام کریں۔ چنانچہ اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی عورتیں اس مکان میں جمع کرنا شروع کیں اور کوشش کرکے اُن کی شادیاں شرفا، شہر اور امراء دربار سے کردیں۔

اس عمارت کا نام اس نے "دار التوبہ" رکھا تھا اور اس کی نگرانی میکائیل کے سپرد تھی جو خود بھی تائب ہوکر مرتاضی زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

بادشاہ یوستی نیانوس بازنطینی تخت حکومت پر ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک متمکن رہا لیکن اس ۳۸ سال کی مدت میں وہ اس راز سے بالکل ناواقف رہا کہ ملکہ نے دار التوبہ کیوں قائم کیا تھا۔

افیونی

افیون تو ایک ایسی چیز ہے جس کو اپنے اثرات کے اعتبار سے ایک بنگالی اور ایک بھوٹانی، ایک پنجابی اور ایک آسامی کے لئے یکساں ہونا چاہئے لیکن اس سلسلہ میں لکھنؤ نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید دنیا کے کسی حصہ کو نصیب نہیں ہوئی، بظاہر یہ خصوصیت عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو افیونیوں کو بھی دیکھ چکے ہیں اور اہل لکھنؤ سے بھی ملے ہیں اس خصوصیت کی وجہ جانتے ہوں گے کہ "لکھنویت" اور "افیونیت" دونوں اس حد تک متصل ہیں کہ ایک اجنبی کو ایک پر دوسرے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ افیونیوں میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کے رہنے والے ہوں قدرتی طور پر بہت سی ادائیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اہل لکھنؤ کے لئے مخصوص ہیں اور لکھنؤ کے اس باشندے میں بھی افیون کی سی شان ہوتی ہے جس بیچارے نے کبھی افیون کی صورت بھی نہ دیکھی ہو خدا جانے اس مماثلت کی کیا وجہ ہے لیکن آپ کو چاہئے کہ ہمارے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے کسی ایسے لکھنوی سے ملئے جو افیونی نہ ہو اور پھر اس کا مطالعہ اس نظر سے کیجئے کہ اس میں "افیونیت" ہے یا نہیں تو آپ کو ہمارے بیان کی تائید کرنا پڑے گی اسی طرح آپ کسی فرنگی افیونی کو دیکھئے تو وہ باوجود اپنی ملکی وحشت کے آپ کو اپنی خاص کیفیت میں بہت بڑی حد تک لکھنوی نظر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افیون کے استعمال کے بعد انسان اس حد تک شائستہ ہو جاتا ہے کہ اس پر لکھنوی ہونے کا شبہ کیا جائے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اہل لکھنؤ نے شائستگی افیونیوں سے لی ہے بہر حال جو کچھ بھی ہو یہ کچھ "حساب دوستاں در دل" والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے افیونیوں کے متعلق ہم نے اس قدر روایتیں سنیں کہ آخر ہم کو کسی لکھنوی افیونی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن جب اس شوق کی تکمیل نہ ہوئی تو اس نے رفتہ رفتہ آرزو کی صورت اختیار کر لی، ہمارا یہ شوق غالباً بیجا بھی نہ تھا ذرا تصور تو فرمائیے کہ ایک تو افیونی اور پھر لکھنوی یہ دونوں خصوصیات اپنی اپنی جگہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن جب وہ ایک ہی ہستی میں جمع ہو جائیں تو وہ ہستی ہوگی یا قیامت؟ ایک تو کریلا اور پھر نیب چڑھا۔ مختصر یہ کہ ہم خدا کی اس عجیب و غریب صنعت کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے لیکن اب نہ تو وہ لکھنؤ رہ گیا ہے اور نہ اس کی وہ روایتی خصوصیات باقی ہیں لیکن خداوند کریم تو بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے ہماری جستجو کو ناکام نہ رہنے دیا اور ہم کو بہت جلد میر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہو گیا۔

میر صاحب اپنے کو شاہی خاندان سے متعلق بتاتے تھے اور اس کا ثبوت پندرہ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بغیر کسی دقت کے برابر مل رہا تھا آپ نہ صرف خالص لکھنوی تھے بلکہ نجیب الطرفین افیونی بھی تھے اور اپنی جماعت میں اس خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے گھر کے اکیلے تھے بیوی بچے تو خیر ایک سرے سے تھے ہی نہیں لیکن ان کے علاوہ نزدیک یا دور کے کسی عزیز کا پتہ نہ چلتا تھا ان کو بیوی بچوں اور عزیزوں کا لطف اپنی افیون ہی سے حاصل تھا اور وہ اپنے کو افیون کے لئے مٹائے ہوئے تھے۔ اس وقت انکی عمر تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی کم ہوگی لیکن افیون نے ان کو قبل از وقت بٹاری کا انگور بنا دیا تھا اس کے علاوہ انکی عام صحت کا یہ حال تھا کہ اگر وہ افیون کے عادی نہ ہوتے تو ان کی موت یقیناً تپ دق سے واقع ہوتی مگر اب بھی وہ غریب کھانسی، دمہ اور قبض وغیرہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ توانائی کا یہ حال تھا کہ اگر میڈیکل کالج کے طلباء ان کو دیکھ پاتے تو اس زندہ انسانی ڈھانچے کو کبھی نہ چھوڑتے اور اپنے کالج کے میوزیم میں مطالعہ کرنے کے لئے یقیناً بند کر دیتے۔ شکل وصورت کا تو ذکر ہی کیا ضعیفی میں انسان خوبصورت تو نہیں البتہ خوبصورتوں کو ہنسانیوالی ایک چیز بنجاتا ہے۔ لیکن میر صاحب پر تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بوڑھاپا بھٹ پڑا ہے کمر بھی اونگھتے اونگھتے جھک گئی تھی۔ تمام جسم کی کھال لٹک پڑی تھی چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے الجھے ہوئے پٹے بھی بے مرمت پڑے تھے اور کھچڑی داڑھی بھی آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی تھی پھیل رہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ انگلیوں کے ناخن بھی قطع و برید سے معاف کر دئے گئے تھے۔ لباس کے معاملہ میں وہ بہت ہی سادہ دل واقع ہوئے تھے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ خاندان شاہی کا یہ چراغ نہایت سادہ وضع میں زندگی بسر کر رہا تھا، اُن کے گھر میں کپڑوں کے لئے کوئی بکس کوئی صندوق یا کوئی صندوقچی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی میر صاحب کے پاس جس قدر کپڑے تھے وہ سب ان کے جسم پر رہتے تھے ہم نے تو کبھی بھی ان کے کپڑوں کو دھوبی کے یہاں جاتے یا دھوبی کے یہاں سے ان کے کپڑے آتے ہوئے نہیں دیکھے۔ بس جو کپڑے وہ جسم پر پہنے ہوئے تھے وہ گویا ان کی کھال ہو کر رہ گئے تھے اب اگر آپ ہم سے یہ پوچھیں کہ ان کپڑوں کا کیا رنگ تھا تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلی رنگ کا تو خیر حال معلوم نہیں لیکن کثرت استعمال سے وہ کپڑے رنگ بدلتے بدلتے اب جس ایک رنگ پر قائم ہو گئے تھے اس کو اصطلاح عام میں صافی کا رنگ کہتے ہیں اسی طرح اگر آپ یہ دریافت کریں کہ ان کا لباس کس کپڑے کا ہوتا تھا یعنی تنزیب یا نین سکھ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ہمنے میر صاحب کو ہمیشہ موم جامہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا ہے جس پر مکھیوں کی نشست سے ہر وقت مختلف قسم کے نقش ونگار بنتے اور مٹتے رہتے تھے۔ البتہ ان کے کپڑوں کی خوشبو یا بدبو کے متعلق ہم کچھ بھی عرض نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ علم حاصل کرنے کی ہم کو کبھی جرات نہیں ہوئی۔

میر صاحب کا دولت کدہ ایک بہت ہی ویران محلہ میں تھا جس کا بیشتر حصہ لکھوری اینٹ اور گارے کی شکل

یں مکان کے صحن میں نظر آتا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا وہ بھی کوئی تاریخی کھنڈر معلوم ہوتا تھا لیکن میر صاحب کی ضروریات کے لئے ایک مختصر سی کوٹھری کافی تھی جس میں وہ اپنی تمام گرہستی کے ساتھ رہتے تھے اور باقی تمام مکان فی سبیل اللہ چھوڑ رکھا تھا۔ میر صاحب کی مختصر سی کوٹھری میں ایک تو تھی وہ چارپائی جو شاہی زمانہ کے کھٹ بنوں نے اپنی ہاتھ سے بنی تھی حالانکہ اب وہ اپنی بوسیدگی کے اعتبار سے ٹوٹی ہوئی قبر معلوم ہوتی تھی لیکن میر صاحب اس حالت کو غنیمت سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ آج کل کے بدتمیز کھٹ بُنے اس تاریخی چارپائی میں ہاتھ لگائیں۔ اُس چارپائی پر کچھ بستر تھا تو ضرور لیکن صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ اور کن کن چیزوں پر مشتمل تھا۔ چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں جس چیز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ حقہ تھا اس حقہ کے متعلق یہی بیان کیا جاتا ہے کہ میر صاحب کے دادا جان مرحوم مغفور کو غدر کے زمانہ میں کسی شاہی محل میں پڑا ہوا ملا تھا اور وہ اب تک نہایت حفاظت کے ساتھ سینہ بسینہ چلا آ رہا تھا میر صاحب نے تو بنظر احتیاط اس کو کبھی پانی سے تازہ تک نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پانی سال بھر۔ چلمے بدلتے تھے البتہ ان کی چلمیں جب سے اب تک چار پانچ مرتبہ ضرور بدلی گئی تھیں اور اس میں بھی میر صاحب کی احتیاطی کو دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں میر صاحب کی آنکھ جھپکی اور حقہ الٹ کر زمین پر آ رہا بس اسی میں چلمیں ٹوٹ گئیں چارپائی اور حقہ کے بعد مین کے سماور کا نمبر تھا جو ہر وقت گرم رہتا تھا اور جس میں ہر وقت چائے موجود ہوتی تھی ان چیزوں کے علاوہ چائے کی پیالی کوئیلوں کی ٹوکری، کچھ کلہڑ، کچھ دونے، گلگسو کا ڈبہ جس میں خمیرہ تمباکو رکھا جاتا تھا، ایک اسٹول جس پر گول چینی کی پیالی، کاتبوں کی دوات کی طرح رکھی تھی ایک آگ دہونکنے والی دھنی، کچھ آگ سلگانے کے لئے گودڑ، ایک آبخورہ، ایک گھڑا، ایک تابجینی کا ڈونگا اور ایک دیا سلائی کی ڈبیا بھی تھی ان ہی تمام چیزوں کی میر صاحب کو ضرورت تھی اور ان ہی سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن زیادہ تر توجہ اسٹول پر رکھی ہوئی پیالی کی جانب رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگی اسی پیالی میں بند ہے۔

میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گذرتا تھا لیکن ہر روز کم سے کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہو کر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گذارتے تھے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی، سیاسی اور معاشرتی، ادبی اور تمدنی، اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی، واقعات حاضرہ پر رائے زنی کی جاتی تھی اور دنیا کے اہم سے اہم معاملات نہایت غور و فکر کے بعد طے پاتے تھے اور اس انجمن میں میر صاحب کو وہی درجہ حاصل تھا جو کسی ذمہ دار کانفرنس کے صدر کو حاصل ہوتا ہے ان کی رائے قطعی اور فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کے تبحر، تدبر اور تجربہ کاری کا تمام ہمعصروں پر بڑا اثر تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اپنے یاران میکدہ میں میر صاحب سب سے زیادہ کہنہ مشق اور سب سے پُرانے افیونی تھے۔ ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ہمارے میر صاحب کس پایہ کے افیونی تھے۔

میر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم نے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ ان کی افیون کے اخراجات کا ٹھیکہ لے لیا جس کے بعد میر صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی تک دنیا باوفا دوستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ میر صاحب پر اس طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد ہم نے ان کی خاص سوسائٹی میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس نئی دنیا کی سیر کرتے رہے۔ میر صاحب کا معمول تھا کہ اپنے دوستوں کے مجمع میں جاتے ضرور تھے لہذا ہم نے بھی ان کے ہمراہ جانا شروع کر دیا اور وہاں جاکر صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا دیکھی جس کمرہ میں اس کانفرنس کے اجلاس ہوتے تھے اس کے وسط میں ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر چڑھا رہتا تھا جس میں چار دم ہوتی تھی اور اس پتیلے کے چاروں طرف میر صاحب کے تمام دوست حلقہ باندھکر بیٹھتے تھے اور سب کے سامنے کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا کسی کے سامنے چار کی پیالی ہوتی تھی تو کوئی کلھڑ لئے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے آگے حقہ ہوتا تھا تو کوئی اپنی عزیز از جان پیالی میں چٹکی ڈالے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہوتی تھی تو کوئی کھٹیوں سے شغل کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اہم ترین معاملات پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کسی نے کہا:——— (ہر جگہ نون غنہ بڑھا کر پڑھیئے)

"اماں بھائی۔ غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

دوسرے بولے۔ ارے یار پھر کہاں ہم اور کہاں یہ صحبتیں مر کر چلے جائیں گے پھر ہم ہوں گے اور قبر کا کونا"

تیسرے نے کہا۔ سچ ہے بھائی اللہ بس باقی ہوس۔

چوتھے نے فرمایا "خدا معلوم کیا حشر ہو بڑے گناہ کئے ہیں"

پانچویں بولے۔ واللہ ہم سا روسیاہ بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا نہ نماز کے نہ روزے کے آخر خدا کو کیا منہ دکھائینگے بھائی اور چاہے جو کچھ کرو نماز ضرور پڑھ لیا کرو بڑی برکت ہوتی ہے اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے یہ نماز نہ پڑھنا تو جہنم کی سیر کرائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا "اماں لاحول ولاقوۃ کیسی باتیں کرتے ہو خداوند کریم بڑا رحیم ہے، اماں وہ ہم کو نہ بخشے گا تو کیا فرنگیوں کو بخشے گا بھائی ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں ان گنہگاروں کو دیکھو جو دنیا کے گناہ کرتے ہیں اور پھر بھی بادشاہت کرتے ہیں مگر وہاں جاکر پتہ چلے گا۔

ایک اور صاحب کہنے لگے۔ کیا بات کہی ہے واللہ مگر میر صاحب یہ انگریزوں کی شاہی بھی گاندھی نے کرکری کر دی سنا ہے کہ اب تو لڑائی ہونے والی ہے"

میر صاحب "اماں جاؤ بھی گاندھی بیچارہ کیا کرتا وہ تو کہو کہ سرکار نے ڈھیل چھوڑ رکھی ہے نہیں تو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیتی سرکار سے کوئی کیا لڑے گا۔ ہزاروں بندوقیں توپیں، تیر و کمان، تلوار سب ہی تو اس کے پاس ہیں سرمہ کر دے

جو کوئی سر بھی اُٹھائے، اماں آج چاہے توپوں میں بارود بھر کر سارے شہر کو اڑا دے۔ ہوائی جہاز سے آگ برسا دے ریلوں کو اڑا دے موٹروں سے کچل دے اماں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا اے ہاں بھائی میر صاحب خوب یاد دلایا، یار اِن ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے۔ سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے۔"

دوسرے صاحب کہنے لگے "ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکان پر نکلا مگر بہت نیچا تھا میں نے بھی لڑکے کا لنگڑ لیکر جو اسپر مارا تو قسم ہے آپکے سر عزیز کی کہ بس ذرا سا بچ گیا نہیں تو زمین پر ہوتا اور ہڈی پسلی سرمہ ہوگئی ہوتیں میر صاحب نے تجویز پیش کی۔ بھائی تو اب کیا کیا جائے عورتوں کو انگنائی میں نہ نکلنے دیا کرو یا ایک شامیانہ لیکر لگا دو۔

اس کے بعد پردہ کا مسئلہ چھڑ گیا اور پھر یورپ کی آزادی پر تبصرہ ہونے لگا، انگریزوں کی دولت کا ذکر ہوا انکی تندرستی اُن کی غذا ان کے لباس اُن کی معاشرت ان کی گندگی ان کے کتوں ان کی میموں ان کے بچوں کا تذکرہ ہوا بیفکری اور فارغ البالی کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں ہوئیں ہندوستان کے افلاس پر اظہار افسوس کیا گیا ہندو مسلم کشیدگی پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ سوراج کے امکانات پر تبادلہ خیال ہوا، جنگ کے آثار کا اندیشہ ظاہر کیا گیا، جنگ کے ہولناک نتائج بیان کئے گئے اور پھر قرب قیامت کے وعظ کے بعد ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ ہم سب نماز شروع کر دیں اور اب کی رمضان میں روزے ضرور رکھیں افطاری کی فہرست مرتب ہوئی اور یہ دلچسپ کارروائی ایک صاحب کے چاء کی طرف متوجہ ہونے سے ادھوری رہ گئی۔ جس کے بعد سب نے چاء نوشی شروع کر دی اور پھر وہی دور شروع ہوا جس کے ساتھ ساتھ کوئی تو اپنی خاندانی فیاضی کے فسانے سناتا رہا کوئی اپنے والد مرحوم کے کارنامے بیان کرتا رہا کسی نے اپنی جوانی کی رنگین داستان چھیڑ دی اور میر صاحب نے اپنے خاص انداز بیان میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے محلات کا ذکر شروع کیا جو نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتا ہوا الہ آباد کی نمائش پر آکر ختم ہوا۔ ایک صاحب جو دیر سے اپنے دونوں گھٹنوں میں سر دئے ہوئے بیٹھے تھے ذرا سا اُبھرے اور سب کو داستان امیر حمزہ کی طرف متوجہ کیا۔ جسکی سب نے تائید کی اور ایک صاحب نے شروع کر دیا۔ داستان کا پڑھنا اور سب آنکھیں بند کر کے سننے لگے وہ حضرت داستان پڑھ رہے تھے داستان کے ایک ایک فقرے پر ایکٹنگ بھی فرماتے جاتے تھے لیکن سامعین کا یہ حال تھا کہ رفتہ رفتہ سب کے سر گھٹنوں میں گھستے جاتے تھے صرف داستان گو کی آواز کمرہ میں گونج رہی تھی باقی سب پر ایک سکوت بلکہ موت کی سی کیفیت طاری تھی۔

شوکت تھانوی

باب الاستفسار

(جناب محمد عظمت علی خاں صاحب۔ رنگون)

براہ کرم حسب ذیل دو سوالات کا جواب مرحمت فرمائیے

(۱) مشہور شعر ہے:۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

کیا یہ شعر واقعی خاقانی کا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

(۲) شاہجہاں کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ شطرنج میں ایک شخص کے مقابلہ میں اُن کو مات ہو رہی تھی کہ ان کی کسی بیگم نے یہ نقشہ بتایا براہ کرم اس واقعہ کی تفصیل سے آگاہ فرمائیے نیز یہ کہ شطرنج کا وہ نقشہ کیا تھا میں نے ہر ایک شخص کی زبانی یہی سنا ہے کہ اس نقشہ میں فرزین پیٹا ہوا تھا اور اس کو دو رخ دیکر بچانے کا مشورہ بیگم نے دیا تھا۔ گویا ولا رام یہاں فرزین کے معنے میں آیا ہے۔

(نگار) آپ نے جو شعر لکھا ہے اس کا پہلا مصرعہ تو یقیناً خاقانی کا ہے لیکن دوسرا نہیں ہے۔ خاقانی کا اصل شعر یہ ہے:۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ سلطانی ست درویشی و درویشی ست سلطانی

لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ بدلکر ابو اسحاق نے وہ رکھدیا جو آپ کے لکھے ہوئے شعر میں پایا جاتا ہے۔ ابو اسحاق ایک شاعر تھا جو کھانے کا بڑا شائق تھا اور اس کی شاعری کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ سوائے کھانے کی چیزوں کے اور کوئی ذکر ہی نہ کرتا تھا۔ اس نے سعدی، حافظ وغیرہ کے بہت سے اشعار میں اس طرح کا تصرف کر کے اپنے ذوق کا اظہار کیا ہے۔

مقدمہ کے بعد خود مولف نے ایک "پیش نامہ" کے ذریعہ سے کتاب کا تعارف کیا ہے اور پھر ان مخطوطات کو شروع کیا ہے جو مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں،

اس کتاب میں ۱۰۰ اسے زائد مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے بعض بعض ایسے نادر ہیں کہ اس سے قبل ان کا علم ہی کسی کو نہ تھا۔

ہر چند اس میں زیادہ تر صرف دکن ہی کے شعراء و مصنفین کے مخطوطات پائے جاتے ہیں، لیکن تاریخ دکن کی اہمیت اور اس حقیقت کے لحاظ سے کہ زبان اردو کا تعلق دکن سے قدیم ترین تعلق ہے، یہ اس درجہ مفید واہم ہے کہ اردو لٹریچر کا کوئی محقق و منقش اسکو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

یہ کتاب ۴۱۰ صفحات کو محیط ہے، اور نہایت نفیس کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

قیمت چار روپیہ ہے اور مولف سے تلی گوڑہ۔ ترپ بازار حیدرآباد کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

آزادی | ترجمہ ہے جان اسٹوارٹ مل کی مشہور کتاب (Liberty) کا جسے مولوی سعید انصاری صاحب بی اے (جامعہ) نے کیا اور مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ جنھوں نے مل کی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ اس میں مسئلہ آزادی پر کس جوش و استواری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اور "حریت فکر و خیال" کے فلسفہ کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مولوی سعید انصاری اور مکتبہ جامعہ ملیہ دونوں شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُن کی وجہ سے یہ بیش بہا خیالات اردو داں طبقہ تک پہونچ سکے۔ مولوی سعید انصاری مشہور مصنف و مولف ہیں اور سلاست روانی جو ان کے ترجمہ کی خصوصیات کبریٰ ہیں اس دقیق کتاب کے ترجمہ میں بھی پوری طرح پائی جاتی ہیں، قیمت صرف ۱۲؍

آئینہ معرفت | یہ تصنیف ہے جناب سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم، اے کی جو الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں اس کتاب میں اردو شاعری کے عنصر تصوف سے بحث کی گئی ہے اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں تصوف کی ابتدا و ترقی پر گفتگو کی گئی ہے اور متصوفین کے مختلف ابتدائی طبقوں کا حال بتایا گیا ہے۔

دوسرے باب میں تصوف کے بعض مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عہد ماجد کے بعض صوفیہ فرقوں کا حال بتادیا ہے۔

تیسرے باب میں فارسی شاعری کے عنصر تصوف کا ذکر ہے اور چوتھے پانچویں باب میں ان اردو شعرا کا ذکر ہے جن کے یہاں تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

کتاب مطالعہ کے قابل ہے اور دو روپیہ میں لالہ رام نرائن لال پبلیشر کٹرہ روڈ الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین | یہ مشہور مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائکلوپیڈیا کی [illegible] "محمد نمبر"

کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے جیسا کہ اسلام و بانی اسلام کے متعلق مستشرقین کے اکثر مضامین میں تاریخی و استدلالی غلطیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح دلہا دزن کے مضمون میں بھی ہیں اور انھیں کو دور کرنے کے لئے مولوی عبد العلیم احراری بی اے آنرز (جامعہ) نے اس کا ترجمہ کرکے جا بجا نوٹوں سے غلطیوں کی طرف متنبہ کیا ہے۔

ترجمہ بہت صاف اور اقتباسات نہایت برمحل مسلمانہ ہیں یہ کتاب بھی مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے ۱۲؍ میں مل سکتی ہے

دنیا کے بسنے والے — اس مختصر رسالہ میں جناب سید بشیر حسین زیدی بی اے نے بعض وحشی قبائل کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں قلمبند کئے ہیں۔ جا بجا تصاویر و نقوش بھی دیدئے گئے ہیں

یہ کتاب نہ صرف بچوں اور لڑکیوں کے لئے بلکہ ہمارے ملک کے نوجوان طبقہ کے لئے بھی مفید ہے۔

قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی۔

انتخاب حسرت — مولانا حسرت موہانی کے دواوین کا انتخاب ہے جو جناب جلیل احمد صاحب قدوائی کے مقدمہ کے ساتھ جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

حسرت کے رنگ تغزل کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، دنیا جانتی ہے کہ اس عہد میں حسرت ہی ایک ایسا شاعر ہے جسے صحیح معنے میں رئیس المتغزلین کہہ سکتے ہیں۔ مقدمہ نہایت دلچسپ ہے اور انتخاب بہت پسندیدہ

قیمت عہ (ایک روپیہ)

شاعر کی راتیں — جناب جوش ملیح آبادی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جس میں کسی نہ کسی طرح رات اور اس کے متعلقات کا ذکر آگیا ہے۔

جوش کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت یہ کہنا کہ آفتاب نکل آیا ہے۔

جناب اعجاز قدوسی نے ان نظموں کو یکجا شائع کرکے حقیقتاً "خمریات" کی بڑی بیش قیمت خدمت انجام دی ہے۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں مرتب سے بنام پلی جدید نمبر ۱۶۷ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

انگورا اور ترک — یہ کتاب جناب عبد الرب صاحب بی اے ال ال بی کی تالیف ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سلطنت ترکی کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں نہ صرف انگورا کی تین مشہور لڑائیوں کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ ترکوں کی تمام عسکری تاریخ پر اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اخیر میں قیام جمہوریت کے بعد جو تغیرات ہوئے ہیں ان کی طرف بھی اعتنا کیا گیا ہے۔

وہ لوگ جو ترکی و تاریخ ترکی سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت ۸؍ ہے اور ملنے کا پتہ محمود مکتبہ نمبر ۶ نخاس کہنہ الہ آباد ہے۔

جوہر ماہر — یہ ایک علمی رسالہ ہے جسے حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی نے تصنیف کیا ہے

کے اس رسالہ میں جناب ماہر نے مختلف اشیاء کے جوہر، نمک اور ست بنانے کے ایسے آسان طریقے بتلائے ہیں کہ ہر شخص ان کو بنا کر کام لے سکتا ہے۔ ان کا طریق استعمال بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی لکھدیا گیا ہے کہ کن کن امراض کے لئے مفید ہیں۔ چونکہ جوہر نمک وغیرہ بہت جلد اپنا اثر کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص کتاب کی ہدایت کے مطابق چند ضروری چیزیں بنا کر اپنے پاس محفوظ رکھے تو معمولی معمولی امراض میں اسے اطباء کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

ترقی یافتہ ممالک میں تو ہر شخص کسی نہ کسی حد تک فن معالجہ سے واقف ہوتا ہے اور معمولی امراض کا علاج خود ہی کر لیتا ہے۔ لیکن ہندوستان ایسے جاہل ملک میں جہاں نزلہ و زکام کے فرق کو بھی لوگ محسوس نہیں کر سکتے، اس فن سے لوگوں کو سخت بیگانگی ہے۔ اس لئے جناب ماہر کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ رسالہ لکھکر عوام کے معمولی امراض کا علاج ان کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ فرو گزاشت بھی ہو گئی ہے، مثلاً جوہر اڑانے کی ترکیبوں میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ آنچ کتنی لکڑی کی دی جائے یا اگر اسپرٹ وغیرہ سے جوہر اڑانا ہو تو کتنی گرمی پہونچانا چاہئے۔ دوسرے اڈیشن میں اس کمی کو دور کر دینا چاہئے۔ اس کتاب کی قیمت ۲ روپے ہے اور خود جناب مصنف سے فراش خانہ دہلی کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

عصمتی کشیدہ

ملک کے مشہور نسوانی رسالہ عصمت دہلی میں جو مختلف نمونے سوزنکاری کے شائع ہو چکے ہیں ان کو یکجا طور پر عصمتی کشیدہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً ۵۰ نمونوں کے نقشے دئیے گئے ہیں اور سب کے سب اچھے ہیں۔ بنانے کی ترکیب بھی نہایت صاف و آسان زبان میں بتادی گئی ہے۔ مینیجر رسالہ عصمت دہلی سے یہ کتاب ایک روپیہ میں مل سکتی ہے۔

عصمتی کروشیا

یہ بھی رسالہ عصمت دہلی کی طرف شائع ہوئی ہے اور اس میں کروشیا کے کام کے ۵۷ نمونے مع ہدایات وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عہ میں رسالہ عصمت دہلی کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

موتیوں کا کام

اسی سلسلہ کی یہ تیسری کتاب ہے جو حال ہی میں رسالہ عصمت نے شائع کی ہے آج کل موتیوں کا کام عورتوں میں بہت مقبول ہوتا جارہا ہے اس لئے اس کتاب کی اشاعت بہت بڑی ہی ہوئی ہے۔ اس میں مختلف چیزوں کے دو سو سے زیادہ نمونے دئیے گئے ہیں، جو واقعی بہت خوشنما ہیں، ہر چیز کے بنانے کی ترکیب بھی بتادی گئی ہے۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ وہی رسالہ عصمت دہلی ہے۔

صبغۃ اللہ

یہ کتاب ہے جناب شیخ غلام محمد احمد صاحب ایم، اے کی، جنھوں نے اس میں صوفیائے کرام کے "فلسفہ ریاضات و کمالات" سے بحث کی ہے اس وقت تک تصوف پر اتنی کتابیں اردو میں لکھی جا چکی ہیں کہ شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھی گئی ہوں، لیکن ان میں زیادہ تر وہی ہیں جو "خوارق عادات"

کو تنہا ذریعہ اظہار عظمت سمجھکر تصنیف ہوئی ہیں، اور جن میں اخلاق وسیرت کو معمولی بات سمجھکر نظر انداز کردیا ہی یا بہت کم اس طرف اعتنا کیا گیا ہے۔

لیکن اب دور حاضر میں مستشرقین کی دیکھا دیکھی لوگوں کو توجہ رہی ہے کہ وہ فلسفہ وتاریخ کے نقطۂ نظر سے اس پر بحث کریں اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ داخل تصوف کردی جائے۔

یہ کتاب بھی اسی نوع کی کوشش کا نتیجہ ہے لیکن ناقص ونا تمام کیونکہ اس وقت ضرورت اصطلاحات تصوف سے بحث کرنے کی نہیں ہے اور نہ اُن اقوال وآثار کے نقل کرنے کی جن کا زیادہ حصہ موضوع وغیر صحیح ہے، بلکہ ضرورت ہے۔ اس پیام امن وسکون کی تبلیغ کی، جو تصوف کا مقصد وحید ہے۔ آپ وحدت وجودی ذکر وفکر، فنافی اللہ لاہوت وناسوت وغیرہ کی اصطلاحیں سمجھا کر کوئی تبدیلی اخلاق انسانی میں پیدا نہیں کرسکتے اور نہ تصوف نام ان مصلحات کا ہے جو یقیناً انحطاط تصوف کے دور کی چیزیں ہیں، بلکہ تصوف عبارت ہے اس "جلوۂ محبت" سے جو سب سے پہلے تفریق نسل وقوم کو مٹاتا ہے اور پھر اخیر میں اختلاف مذاہب محو کرکے انسان کو اس فضا میں پہونچا دیتا ہے جہاں انفرادی حیثیت مٹ کر صرف "انسان کلی" کا مفہوم باقی رہجاتا ہے۔

اس لئے میری رائے میں تصوف کی کتابیں لکھنا اس قدر مفید نہیں ہے جتنا خود اپنے اخلاق واعمال سے اس کی غایت کو واضح کرنا۔ تصوف اور "درس محبت" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، اس لئے درس محبت بیکار ہے اگر خود اپنے دل میں "محبت" کا وجود نہیں اور نہ محبت کا کوئی خاص دستور وآئین ہے جسے آپ اصطلاحوں کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔

میرا عقیدہ ہمیشہ سے یہی ہے کہ نوع انسانی کی نجات اور دنیا کا امن وسکون صرف تصوف ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے، لیکن وہ تصوف ایک انسان کے قلب ونگاہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے، کتاب اور دفتر اصطلاحات سے نہیں۔

اس کتاب کو میں اس لحاظ سے ضرور غنیمت سمجھتا ہوں کہ اس میں خوارق عادات وغیرہ پر بحث نہیں کی گئی ورنہ اس سے آگے وہ کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ جس وقت ہم اپنی یہاں کے اس نوع کی تصانیف کے مقابلہ میں ہندو متصوفین کے ارشادات دیکھتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان جو اپنے آپ کو بہت بڑا علمبردار اس چیز کا سمجھتے ہیں، ان کے یہاں سوائے لایعنی اصطلاحات اور چند دقیق ومشکل الفاظ کے کچھ نظر نہیں آتا اور سوامی رام کا ہر ہر لفظ ایک ایسا پیغام محبت ہے جس کے آگے سر جھکا دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

یہ کتاب ۸ ہر قیمت مصنف سے کیوں تو فی جمعوں کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

نغمۂ دل دیوان ہے جناب حکیم ضمیر حسن خان صاحب دل شاہجہاں پوری کا جو نفیس طباعت وکتابت کے ساتھ حال ہی میں شایع ہوا ہے -

حضرت دل اس وقت ہندوستان کے مشہور شعرا میں سے ہیں اور ناظرین نگار کے طبقہ میں تو یوں بھی تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ اُنکا کلام اکثر نگار میں شائع ہوتا رہتا ہے - وہ لوگ جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں اور سنجیدہ رنگ تغزل کے شائق ہیں اُن کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے -

ابتدا میں میرا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے اور حضرت عزیز لکھنوی کا تبصرہ بھی مصنف کی دو تصویریں بھی دی گئی ہیں - ایک عنفوان شباب کی اور دوسری اس وقت کی - آپ کا رنگ کلام ذیل کے بعض اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے :-

سرِ طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے دامن کو

نگاہ مست سے اودھر کے دیکھنے والے تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

نگاہ شوق رہی ہمزبان دل لیکن کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

حسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں بلٹی ہوا تو اشکِ گلِ تر کے ہو گئے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

روز آ آکر تسلی دل کو دیجاتا ہے کون کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون

پردہ اٹھا دیا یہ غضب اُس نے چال کی دیکھا تو ہم میں تاب نہ تھی عرض حال کی

یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

یہ دیوان علاوہ محصول عہ میں مینیجر نگار یا خود حضرت مصنف سے محلہ ہاتھی تھان شاہجہانپور کے پتہ سے مل سکتا ہے

بقیہ ملاحظات بسلسلہ صفحہ نمبر آٹھ

اب رہا یہ امر کہ والدین کے کہنے سے طلاق دینا ضروری ہو جاتا ہے میں عمومیت کے ساتھ اس کا قائل نہیں ہوں اور عہد نبوی کے جو بعض واقعات ایسے بتائے جاتے ہیں اگر ان کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صورتیں ایسی تھیں کہ اگر والدین مجبور نہ کرتے تو بھی طلاق دیدینا ضروری ہوجاتا اور ان کا مجبور کرنا بھی صرف انھیں اسباب کی بنا پر ہوگا جو بہرصورت طلاق کو لازم کر دینے والے ہیں بلاکسی اور مصلحت یا سبب خاص کے محض والدین کے کہنے پر طلاق دینا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ نیکن عبدالماجد تو یہ وجہ بھی پیش نہیں کرسکتے، کیونکہ جو شخص والدہ اور تمام اعزہ کی مخالفت کے باوجود شادی کرلے اس کو یہ حق کب حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ بعد کو طلاق دینے کی وجہ اس مخالفت کو قرار دے۔

اس قدر لکھنے کے بعد میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں اور آئندہ نگار میں اس موضوع پر قلم نہ اٹھاؤنگا۔ اگر عبدالماجد نے اپنی تحریروں سے مجھے مجبور نہ کردیا

ٹھیک اس وقت جبکہ آرڈیننس کا دور اپنی انتہائی منزل پر آرہا تھا اور ہندوستان کا کھویا ہوا امن وسکون متقضی تھا کہ اس تاریک عہد کے بعد صلح وعافیت کا آفتاب طلوع کرے دفعتہً ۲۷ جون کو لندن اور شملہ کے ایوان حکومت سے وہ اعلان شایع ہوتا ہے جو آج کل سیاسی حلقوں میں انتہائی سرگرم گفتگو کا موضوع بنا ہوا ہے۔

دنیا سمجھ رہی تھی کہ اب غالباً آرڈیننس کے ذریعہ سے حکومت کی پالیسی ترک کردی جائے گی، لیکن دنیا کی یہ نافہمی دور کردی گئی اور اسی کے ساتھ جس صورت سے ہندوستان کی قسمت کا آئندہ فیصلہ کیا جانے والا ہے اس کا بھی اعلان کرکے ایکبار اور ہمیشہ کے لئے ذہن نشین کرادیا گیا کہ بھیک دینے کا طریقہ وہی خوب جانتا ہے جس سے بھیک مانگی جاتی ہے۔ یعنی اگر ایک طرف مستقبل کے آئین حکومت کو پیش کیا گیا تو دوسری طرف یہ بھی بتادیا گیا کہ اس وقت تک جس چیز کو راونڈ ٹیبل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا وہ محض خواب خیال تھا کیونکہ ہندوستان کے باشندے ہنوز اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ اپنے ملک کے کسی معاملہ میں کوئی اہم رائے قائم کرسکیں اور برطانیہ اپنے اس حصہ کو بھی ترک نہیں کرسکتا جو ایک "شیر کا حصہ" ہونے کی حیثیت سے ایک چیز کے کل پر حاوی ہوسکتا ہے۔

اگر آپ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں تو تیرہ سال قبل سے اس داستان کو شروع کیجئے۔ جب ۱۹۱۹ء میں اصلاحات کی اسکیم منظور ہوئی۔ تو ہندوستان کے قوم پرست اور آزادی پسند طبقوں نے اسکو ناکافی سمجھکر ترک موالات کے سلسلہ کو برابر جاری رکھا۔ سوراج پارٹی مرکزی اور صوبوں کی قانون ساز

جماعتوں میں داخل ہوگئی اور اس نے ایک گول میز کانفرنس کا مطالبہ کیا جس میں ہندوستانی نمائندے، برطانوی نمائندوں کے ساتھ مساوی مرتبہ رکھتے ہوئے ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل کرسکیں لیکن اس مطالبہ کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور وقت گذرتا رہا۔ جب دس سال کی میعاد ختم ہوئی جس کے بعد آئینی اصلاحات کے قانون پر نظرثانی کرنا پارلیمنٹ منظور کرچکی تھی تو سائمن کمیشن مقرر کیا گیا، لیکن چونکہ اسکے تمام اراکین انگریز تھے اور ہندوستانیوں کو صرف مشورہ اور شہادت دینے کی اجازت تھی اس لئے اُسکے خلاف سخت شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور اعتدال پسند، انتہا پسند سب نے مل کر اس کا مقاطعہ کیا۔ بائیکاٹ کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سائمن کمیشن کا تقرر کرکے گویا برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو ان کے اس حق سے محروم کردیا تھا کہ وہ اپنے ملک کے لئے کسی قسم کا آئین مقرر کریں۔ پارلیمنٹ نے مشاورتی کمیٹیاں وغیرہ بنا کر اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آخرکار گورنمنٹ نے ایک گول میز کانفرنس کے منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن چونکہ انتہا پسند جماعت کے اس مطالبہ کا کہ گول میز کانفرنس ہندوستان کے لئے ڈومینین طرز کی حکومت کا آئین بنانے کے لئے منعقد کی جائے کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اس لئے مجبور ہوکر کانگریس نے آزادی کامل کا اعلان کردیا اور تحریک سول نافرمانی منظور ہوگئی۔ سائمن کمیشن رپورٹ نے صوبوں میں خود مختاری اور مرکزی حکومت میں فیڈریشن کے اصول کو تجویز کیا تھا۔ لیکن اس کے خیال میں فیڈریشن کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہ تھا۔ جب گول میز کانفرنس کے موقعہ پر شہزادگان ہند نے فیڈریشن میں شامل ہونے کیلئے اپنی غیر متوقع رضامندی کا اظہار کرکے اس مسئلہ کے حل کو سہل کردیا تو فیڈریشن کا مسئلہ بھی گول میز کانفرنس کے پروگرام میں داخل ہوگیا۔ لیکن چونکہ کانگریس ابھی تک گول میز کانفرنس کے بحث و مباحثہ سے بالکل علٰحدہ رہی تھی اس لئے حکومت کے نتائج فکر زیادہ اہم نہ ٹھہر سکے اور لارڈ ارون نے گاندھی جی سے مفاہمت کرکے اس بات کی سعی کی کہ کانگریس کی معیت بھی حاصل کرلی جائے۔ چنانچہ دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے لندن پہنچے۔ لیکن وہاں کی سیاسی فضا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ پارلیمنٹ کے نئے انتخابات میں، قدامت پسند جماعت کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا، جسے گول میز کانفرنس اور مفاہمت کے طریقوں پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔ اس لئے ہر چند اہم مسائل پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ جاری رکھا گیا، مگر ہندوستانی قوم پرست جماعت کے اس مطالبہ پر کہ برطانوی حکومت اپنی تجاویز اصلاحات کے متعلق پیش کرے کوئی اعتنا نہیں کیا گیا اور اسی وجہ سے نہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی حل ہوسکا۔ اور نہ تحفظات کے مسئلہ کا تصفیہ ممکن ہوا۔ آخرکار حکومت نے معاملات کو ملتوی کرنے کے لئے ایک طرف کمیٹیوں کا تقرر کردیا تاکہ وہ ہندوستان کا دورہ کرکے رپورٹ مرتب کریں، اور دوسری طرف انتہا پسند جماعت کی سرکوبی پر گورنمنٹ آمادہ ہوگئی کیونکہ حکومت کو یقین تھا کہ

انتہا پسند جماعت کی تعداد محدود ہے اور اس کی قوت کو آسانی کے ساتھ فنا کیا جا سکتا ہے اس لئے آرڈیننس جاری ہوئے کانگریس کی مختلف انجمنیں غیر قانونی قرار دی گئیں اور قومی زندگی میں ایک انتشار اور ہنگامہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ گورنمنٹ نے ساتھ ہی ساتھ اسی بات کی کوشش کی کہ ایک ایسی جماعت کانگریس کے مقابلہ میں پیدا کرے جو پبلک کے اعتماد کو قائم رکھتے ہوئے گورنمنٹ سے سوالات کر سکے اور اصلاح کے متعلق جو قانون حکومت نافذ کرنا مناسب تصور کرے اُن کو عملی جامہ پہنا سکے۔ یہ دونوں کوششیں یعنی کانگریس کے قلع قمع کرنے کی کوشش اور ایک تعاون کرنے والی آئینی جماعت کے پیدا کرنے کی کوشش ابھی تک جاری ہے۔

سیاسی ماحول کی اس قدر مختصر تاریخ معلوم کرنے کے بعد ضروری ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کی موجودہ حالت پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ کانگریس والے صاف طور پر کہہ چکے ہیں کہ کوئی آئینی اصلاح قابل قبول نہ ہو گی اگر اس میں کانگریس کو قوم کا نمائندہ سمجھ کر اُس کے مطالبات کو نہ سنا گیا اور خود مختاری کامل کے اصول کو نظر انداز کر دیا گیا اور اعتدال پسند جماعت بھی ان اصول کو اتنا ہی اہم سمجھتی ہے لیکن وہ کانگریس کو قوم کا واحد نمائندہ سمجھنے سے انکار کرتی ہے اور صوبہ کی حکومت میں مکمل خود مختاری اور مرکزی حکومت میں ڈومینین طرز کی حکومت چاہتی ہے۔ اس کے مطالبات کانگریس کے مطالبات کے تقریباً برابر ہیں۔ لیکن وہ مفاہمت کے لئے کانگریس سے زیادہ آمادہ ہے۔ مسلمان جماعت کے کچھ نمائندے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں اور بعض مشترک کے، بعض نشستوں کا تحفظ تمام صوبوں میں چاہتے ہیں، ان کی اکثریت ہو یا اقلیت بعض محض اقلیت والے صوبوں میں نشستوں کا تحفظ چاہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں انکی اکثریت قائم رکھی جائے اور جہاں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کی اقلیت کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور مرکزی جماعتوں میں انھیں ایک تہائی نشستیں دی جائیں، سرکاری دفاتر جماعت عاملہ وغیرہ وغیرہ میں اُن کی نمائندگی محفوظ کر دی جائے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کی فرقہ وارانہ جماعتیں، اقلیتوں کو کم سے کم حقوق دینا چاہتی ہیں۔ اور یہ مسئلہ ابھی تک باہمی مشاورت اور بحث و مباحثہ سے طے نہیں ہو سکا ہے۔

اب ۲۷ جون کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کے تین پہلو ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان کے صوبوں کو خود مختاری فوراً دیدی جائیگی لیکن چونکہ فیڈریشن کے قیام میں ابھی اس وجہ سے عرصہ لگے گا کہ فیڈریشن کے اجزا ابھی مکمل طور پر اس میں شریک ہونے کے لئے طیار نہیں ہیں اسی لئے مرکزی حکومت میں فوراً کوئی تبدیلی نہ ہو سکیگی۔ دوم یہ کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے گورنمنٹ اپنی تجاویز گرمی کے اختتام تک پیش کر دیگی۔ سوم یہ کہ گول میز کانفرنس کو ختم کر دیا جائیگا اور اس کی جگہ ایک مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کا تقرر کیا جائیگا۔ جس کے ساتھ مشورہ کرنے کے لئے گورنمنٹ جن نمائندوں کو مناسب سمجھے گی نامزد کر دیگی

فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق گورنمنٹ سے تجاویز حاصل کرنے کے معاملہ میں تو تقریباً سب کو اتفاق ہے انھوں کا
لیکن سوال یہ ہے کہ آیا گورنمنٹ ایسی تجاویز پیش کرنے میں کامیاب بھی ہو سکتی ہے جو اچھوت ذاتوں، مسلمانوں
ہندوں اور سکھوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے قابل قبول ہوں بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے اس لئے
گورنمنٹ کو اس باب میں زیادہ کامیابی کی توقع نہیں رکھنا چاہئے فیڈریشن کے ملتوی کرنے اور صوبوں میں
حکومت خود اختیاری فوراً قائم کرنے .... کی مخالفت کے لئے انتہا پسند اور اعتدال پسند یکساں طور پر آمادہ
ہیں اور اس بات کا صریح طور پر اعلان کر چکے ہیں کہ ہندوستان کے لئے کوئی اصلاحی قانون قابل قبول نہیں ہو سکتا
جس میں مرکزی ذمہ داری، صوبہ جاتی خود مختاری کے پہلو بہ پہلو عطا نہ کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوبہ جاتی خود مختاری
مرکزی ذمہ داری کی عدم موجودگی میں محض دہوکہ ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے اس اعلان سے کہ مرکزی
ذمہ داری اور فیڈریشن فی الحال ممکن نہیں ہے۔ انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں غیر مطمئن رہیں گے۔ اب رہا
سوال طریق عمل کا سو انتہا پسند اور اعتدال پسند کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی حیثیت محض مشورہ
اور گواہی دینے والوں کی سی ہو۔ جس طرح سائمن کمیشن کا بائی کاٹ ہوا اور وہ ناکام رہا، اسی طرح یہ صورت
بھی ناکام رہیگی۔ کیونکہ ہندوستان کا خود دار طبقہ محض گول میز کانفرنس کے طریقہ ہی پر اشتراک عمل
کیلئے طیار ہو سکتا ہے۔

اب سوال کانگریس کے قلع قمع کا رہ جاتا ہے، سکریٹری آف اسٹیٹ نے اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا ہے
کہ آرڈیننس برابر جاری رہیں گے اور جب تک کانگریس اس بات کا دعوی کرتی رہیگی کہ وہ تمام قوم کی نمائندہ
ہے اسوقت تک کوئی مصالحت کانگریس سے نہیں کی جا سکتی۔

اس لئے بہ حالات موجودہ ہمارے نزدیک سکریٹری آف اسٹیٹ کا یہ اعلان ملک میں امن و سکون پیدا
نہیں کر سکتا کیونکہ حکومت نے گول میز کانفرنس کو محو کر کے اس جماعت کو بھی نکتہ چینی کا موقعہ دیدیا ہے جو بڑی
حد تک حکومت کے ساتھ اشتراک عمل پر آمادہ تھی

وزیر ہند کے اس اعلان پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم ایک تو یہ ہے کہ
جب گول میز کانفرنس کی وساطت بغیر یہ سب کچھ کرنا تھا تو پہلے ہی کیوں اس کا قیام کر کے خواہ مخواہ لوگوں
کو اس میں شرکت کی زحمت دی گئی اور فضول بہت سا روپیہ ہندوستان کا ضائع کیا گیا اور دوسرے یہ
کہ آئندہ اصول نظام کی تعین میں چونکہ ہندوستانیوں کو ملک کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پوری آزادی
کے ساتھ اشتراک عمل کا موقعہ نہیں ملیگا اس لئے ملک کبھی اس کے قبول کرنے کے لئے طیار نہیں۔

نیاز

فریبِ اُمید

قیدی ! رنجور، دل شکستہ　　غمگیں، مضطر، ذلیل، خستہ
زنداں کی مصیبتیں اُٹھائے　　بیٹھا تھا غریب سر جھکائے
کتنی بیتاب خامشی تھی　　رگ رگ گویا تڑپ رہی تھی
آئینۂ درد و یاس چہرہ　　آنکھیں سونی، اداس چہرہ
اشکوں کے حجاب میں نگاہیں　　تھم تھم کے لبوں پہ سرد آہیں
ڈوبی ہوئی نبضِ شادمانی　　پیری سے ضعیف تر جوانی
ناخن لانبے، بڑھے ہوئے بال　　بیکس، مغموم، زرد بیحال
ہر سانس تھی، اک فسانۂ غم　　کھوئی ہوئی زندگی کا ماتم !
ہستی اک بددعا تھی اُسکو　　گیتی دامِ بلا تھی اُسکو
اب اس کیلئے تھی اک کہانی　　پچھلی آزاد زندگانی
بے روحِ بہار، ابر تاریک　　دنیا مانندِ قبر تاریک
بے یار و دیار، زار و تنہا　　مدت سے غریب قید میں تھا

آنکھوں میں، اگرچہ ابرِ الم تھی　　ہلکی سی اُمید کی تجلّی
شاید کوئی راستہ نکل آئے　　زندانِ بلا کا قفل کھل جائے
ہو غیب سے کوئی شکل پیدا　　ممکن ہے کہ رحم کھائے دنیا
شاید نالوں میں کچھ اثر ہو　　اِس شامِ ملال کی سحر ہو

یہ آس جلائے جا رہی تھی
بگڑی کو بنائے جا رہی تھی

لیکن کچھ دن کے بعد دیکھا　　پیشِ زنداں ہجوم سا تھا
حدِ غم سے گزر گیا وہ　　پوچھا تو کھلا کہ مر گیا وہ
کل تک کیا کیا نہ جستجو تھی　　دل میں صد رنگ آرزو تھی !
اللہ رے فریبِ آرزو کا　　کتنا سادہ عجیب گہرا !!

[illegible] ([illegible])

اس لئے اس وقت ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ خیام کے دو نہایت ہی قدیم بے بہا نسخوں کا مالک ہے۔ گذشتہ ایک صدی کے اندر، اکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری (Boldein Library) کا مشہور نسخہ جو آؤسلے (Ouseley) کے نام سے موسوم ہے اور جس پر ۱۴۶۰ء کی تاریخ درج ہے۔ دنیا کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا تھا اور تمام دنیا کے علما ان رباعیوں کے متعلق جو خیام سے منسوب کی جاتی تھیں اسی کو دیکھا کرتے تھے۔ لیکن اس جدید نسخہ کی دریافت سے جس پر ۱۴۲۳ء کی تاریخ درج ہے اور اس لحاظ سے وہ بوڈلین نسخہ کے مقابلہ میں چالیس سال زیادہ قدیم ہے تمام دنیا کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہو جائے گی اور عمر خیام کے شائقین اس کی اشاعت کا نہایت دلچسپی سے انتظار کریں گے۔ پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے معلوم کیا ہے کہ کل ۲۰۶ رباعیات میں ۵۵ ایسی رباعیات ہیں جو موجودہ تمام دیگر نسخوں اور ایڈیشنوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۰ سے زیادہ بالکل نئی رباعیات دنیا کے سامنے آگئی ہیں۔ ہرچند ان تمام رباعیوں کے متعلق یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب خیام کی ہی ہیں لیکن اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں کہ ان میں سے کچھ رباعیاں ضرور خیام ہی نے تصنیف کی ہیں اس لئے انکشاف سے جو تحقیق و کاوش علمی کے لئے ایک وسیع میدان پیدا ہو گیا ہے اُس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سمندر کے نیچے سے گھنٹیوں کی آواز

جزائر ویسٹ انڈیز کے قریب سے گذرنے والے بحری مسافروں کو ’پراسرار گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ آوازیں سمندر کی گہرائیوں میں سے پیدا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مقامی آدمیوں کو انھیں سنکر کوئی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ بندرگاہ رایل کے گرجے کی گھنٹیاں ہیں جو اُن بد اطوار آدمیوں کی روحوں کے لئے بجتی رہتی ہیں جو یہاں ڈوب کر مر چکے ہیں۔

ایک زمانہ میں بندرگاہ رایل کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ امریکہ کے سخت ترین پُرمعصیت شہروں میں سے ہے۔ وہاں کے زاہد اور پاکباز لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دو سو چالیس سال قبل یہ شہر خدا کے حکم سے سمندر میں غرق ہو گیا کیونکہ یہاں جرم و معصیت انتہا کو پہنچ چکی تھیں اور سمندر کے رہزن و قزاق یہاں لوٹ کا مال لاتے تھے اور اسے بے دردی سے اُن عورتوں کے ساتھ تعیشات اور رنگ رلیوں میں صرف کرتے تھے جو اُنھیں کی طرح بے شرم اور گناہ گار تھیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس غرق شدہ شہر کی بہت سی عمارتیں ابھی تک جوں کی توں پانی کے نیچے قائم ہیں

اور پھر اسے گرجا کی کھڑکیوں اور دروازوں سے جب مچھلیاں گذرتی ہیں تو گھنٹہ جنبش میں آجاتا ہے اور اس سے آواز پیدا ہونے لگتی ہے۔

اس غرق شدہ شہر کے مکانوں کی چھتیں جب سمندر پر سکون ہوتا ہے اب بھی نظر آتی رہتی ہیں۔

مصنوعی دل

ایک برطانوی ماہر سائنس نے ایک مصنوعی دل بنایا ہے جو جانوروں میں دوران خون کو اس وقت بھی جاری رکھتا ہے جب کہ ان کا دل ان کے جسم سے علحدہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ دل پیتل کا بنا ہوا ہے۔ اور گبس (Gibbs) اس کا موجد ہے۔ بیہوش کرنے والی دواؤں کے زیر اثر اصلی دل نکال لینے کے بعد کتے بلیاں خرگوش اور دوسرے بڑے جانور اس مصنوعی دل کی مدد سے کئی گھنٹہ تک زندہ رہتے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ اطبا اور طلبہ جانور کے جسم میں جو دوران خون ہوتا ہے اسے طبعی حالت میں دیکھ سکتے ہیں اور نیز ان دواؤں اور رنگوں کے اثرات کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو خون میں بیرونی ذرائع سے داخل کئے جاتے ہیں۔ اگر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی تو غالباً انسان پر بھی اس کا تجربہ کیا جائیگا۔ اور اس کا نتیجہ کوئی مفید نکلے لیکن ڈاکٹروں کے ہاتھ ایک مشغلہ اچھا ہاتھ آجائیگا۔ اور شعرا کا دعواے بے دلی خطرہ میں پڑ جائیگا۔

آگ لگنے سے محفوظ رکھنے والا کاغذ

جرمنی میں ایک ایسی شے دریافت ہوئی ہے جو چھت بنانے اور دیواروں پر لپیٹے جانے کے لئے خصوصیت کیساتھ موزوں ہے وہاں کے مکانات کی تعمیر میں اس کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے اور ڈاکٹر ڈی۔ آئی کین گرڈن نے اس کے متعلق جو تجربات کئے ہیں ان سے نتائج تشفی بخش پیدا ہوئے ہیں اس کے استعمال سے مکان آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کا دانہ دار کاغذ ہوتا ہے اور جب آگ اس کے قریب آتی ہے تو جھلس جاتی ہے اور اس میں سے ہوا اور گیسیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں جو شعلوں کو بالکل دبا دیتی ہیں۔

"تھرماس" کے طرز کی عمارت

حال میں امریکہ میں ایک مکان تھرماس کے اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کے اندر نہ باہر کی گرمی آسکتی ہے نہ اندر کی گرمی باہر جا سکتی ہے۔ ایسے تجربات یہاں آسانی کے ساتھ کئے جا سکتے ہیں جن کے لئے ایک خاص درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ باہر کی جانب ہر طرف کارک کا موٹا خول چڑھایا گیا ہے اور پھر ایک تہ [illegible] اگر اس کے اندرونی حصہ کو ایک مرتبہ ۸۰ ڈگری تک گرم کر دیا جائے اور بعد کو بالکل گرم نہ کیا جائے تو بھی [illegible] دنوں میں [illegible] مدت میں اس کی حرارت صرف ایک ڈگری کم ہوگی۔ عمل کا مقصد یہ ہے کہ دریافت کیا جائے کہ مختلف درجہ حرارت پر نباتات سے کس قسم کی روشنیاں نکلتی ہیں۔

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

[illegible]ڈر کا لال	[illegible]	فرائض مادری	۱۲ر
[illegible]کت آرا بیگم حصہ اول و دوم	[illegible]	انسا تار جہاں	[illegible]
،، حصہ سوم	[illegible]	اقبال دولھن	[illegible]
[illegible]سیدہ کے خطوط	عہ	حسن معاشرت	[illegible]
[illegible]ی سہیلی	۱۰ر	ایا می	[illegible]
[illegible]دیلی پیاری سہیلی	[illegible]	سولہ کہانیاں	۱۲ر
[illegible]توں کی انشا	عہ	سترہ کہانیاں	۱۲ر
انشاء نسواں	[illegible]	سولہ قصے	۸ر
[illegible]رۃ الکبریٰ	[illegible]	مراۃ العروس	۸ر
[illegible]زندگی	[illegible]	بناۃ النعش	۸ر
[illegible]زرات تیموریہ	[illegible]	توبۃ النصوح	۱۲ر
ازواج النبی	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر
ازواج الانبیا	[illegible]	پھلجھڑیاں	۸ر
سیرۃ عائشہ صدیقہ	[illegible]	نصیحت کا کرنپھول	۸
عفت المسلمات	[illegible]	برکات سلطانی	۸ر
سبیل الجنان	[illegible]	ابن الوقت	[illegible]
بچوں کی پرورش	[illegible]	چند پند	۴ر
[illegible]طفلاں	عہ	منتخب الحکایات	۴ر
تہذیب نسواں	[illegible]	تندرستی	عہ
بیوی کی تعلیم	[illegible]	حفظ صحت	عہ
بیوی کی تربیت	عہ	طبیب نسواں	[illegible]
تربیت اطفال	۱۲ر	رہبر صحت	۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک	[illegible]	موہنی	۱۲ر
جتندر ناتھ	عہ	وداع ظفر	[illegible]
بس کا روکھ	عہ	یاسمین شام	[illegible]
فسانۂ سعید	۸ر	طوفان اشک	عہ
خوفناک ڈکیتی	[illegible]	شاہین و دراج	۸ر
سیلاب اشک با تصویر	[illegible]	درس عشق	[illegible]
بے زبان دوست	[illegible]	کرو رپتی چور	[illegible]
جمال ہم نشین	عہ	تین بندوق باز	[illegible]
تغیر عصمت	[illegible]	کرشمۂ رقابت	۸ر
جوہر قدامت	[illegible]	انقلاب قسطنطنیہ	۸ر
تائید غیبی	۸ر	شاہد رعنا	[illegible]
پراسرار قتل	[illegible]	ڈیڈیا کی سرگذشت	۱۲ر
اعلان آزادی	۵ر	شگوفۂ محبت	۸ر
سرگذشت ہاجرہ	۱۰ر	نسوانی زندگی	۸ر
نوحۂ زندگی	۱۲ر	ولایتی نمنی	۸ر
قلب حزین	۸ر	شمع خاموش	۸ر
عروس کربلا	[illegible]	شب زندگی کامل	[illegible]
شہید مغرب	[illegible]	مودودہ	۸ر
ماہ عجم	[illegible]	چندر کلا	۸ر
تیغ کمال	[illegible]	گلستان خاتون	[illegible]
سراب مغرب	۸ر	صبح زندگی	[illegible]
منازل السائرہ کامل	[illegible]	شام زندگی	عہ

تاریخ و سوانحعمریاں

تاریخ مغرب	[illegible]
مختصر تاریخ اسلامی	۸ر
،، ،، حصہ ۲	۹ر
،، ،، حصہ ۳	۱۰ر
،، ،، حصہ ۴	عہ
الصالحات	[illegible]
امت کی مائیں	عہ
الزہرا	۱۲ر
اسوۂ حسنہ	۸ر
ہند و شعراء	[illegible]
شونہار	[illegible]
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ
سفر نامہ عراق	عہ
تاریخ افاغنہ	[illegible]
اسلام اور غیر مسلم	۸ر
سیر المصنفین حصہ ۱	[illegible]
،، حصہ ۲	[illegible]
تاریخ اسلام ۵ جلد	[illegible]
اخبار الاندلس ۳ جلد	[illegible]
خلافت موحدین	[illegible]
خلافت مولدین	[illegible]
عرب اور اس کا مستقبل	[illegible]

لغات و ادب

بازاری زبان	۸ر
لغات سعیدی	[illegible]
لغات کشوری	[illegible]
گنجینۂ تحقیق مجلد	[illegible]
غیاث اللغات فارسی	[illegible]
محاورات نسواں	۸ر
جواہر اللغات	۱۲ر
گوہر اللغات	۱۲ر
چراغ سخن	عہ
دکھنی لغت	۸ر
جواہرات کلیات نظیر	[illegible]
عزیز اللغات	[illegible]
تذکرۂ ریختی	[illegible]
تاریخ اردوئے قدیم	[illegible]
دکن میں اردو	[illegible]
منتخب کلام ہندی	[illegible]
رباعیات عمر خیام	[illegible]
منتخب کلام ہندی	[illegible]
اردو کے اسالیب بیان	[illegible]
تصریح الاغلاط	۴ر
فیض اردو	۵ر
نور اللغات ۴ جلد	[illegible]

دواوین فارسی

دیوان [illegible] تبریز	[illegible]	کلیات غالب	[illegible]	دیوان غنی کشمیری	۶ر
کلیات [illegible]اقی	۱۲ر	کلیات صائب	[illegible]	دیوان ہلالی	۶ر
دیوان حافظ	[illegible]	دیوان ناصر علی	۶ر	اسرار خودی و رموز	[illegible]
دیوان بیدل	[illegible]	کلیات سعدی	[illegible]	زبور عجم	[illegible]
دیوان [illegible]ی	۱۲ر	کلیات حزیں	[illegible]	پیام مشرق	[illegible]
کلیات [illegible]	[illegible]	دیوان عنصری	۱۲ر	قصائد عرفی مجلد	[illegible]

دواوین اردو

کلیات ظفر	[illegible]	کلیات نظیر اکبرآبادی	[illegible]	صنمخانۂ عشق	[illegible]
کلیات مومن	۱۲ر	گلزار داغ	[illegible]	فریاد داغ	۴ر
دیوان ناسخ	[illegible]	دیوان رند	۱۲ر	عالم خیال باتصویر	عہ
کلیات میر	[illegible]	دیوان ذوق	۱۲ر	دیوان شہیدی	۴ر
کلیات سودا	[illegible]	گلکدہ عزیز عہ، [illegible]		کلیات اکبر الہ آبادی	[illegible]
کلیات انشا	[illegible]	مراۃ الغیب	عہ	نغمۂ دل شاہجہانپوری	[illegible]

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابو بکر صدیق
- ائمہ اسلام ۱۲ر
- الحبیب
- عمر بن عبد العزیز
- دولت فاروقیہ
- مکمل سوانح دیبا انسا بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تلخیص التواریخ
- خاتون جنت
- حکایات الصوفیہ
- خواتین اسلام
- مشاہیر نسواں
- مشاہیر ہند
- مخدرات عصمت
- بیگمات بنگال ۴ر

جاسوسی کے ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرۂ پیرس ۸ر
- شیخ چلی ۴ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جگت سطرالیس ۴ر
- بہرام چور ۱۲ر
- زر پرست ۱۲ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبد الرحمٰن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشویزم
- ربیع لیلیٰ
- اتنت بک ۱۲ر
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی ۱۲ر
- بہرام کی سرگذشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

عجائب و غرائب

- عجائب المخلوقات / تصویر رنگین
- بلا تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روزا ایمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۸ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرنالنی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دولھن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۸ر
- پرتاپ ۱۲ر
- روہنی ۱۰ر

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمری عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعرار

- تذکرۂ حسینی ۱۲ر
- گلشن بہار ۱۰ر
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبر آبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- جویائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس و لبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- مینا بازار
- قدس نازنین
- روضۃ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- 〃 〃 دوم
- 〃 〃 سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ



نہ کرے گا۔

دوسرے دن بدل جب جنگل پہنچا تو دور ہی سے اسکو نندی دکھائی پڑی بدل کو شادی کی باتیں سنانے کے لئے وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی لیکن بدل کا اداس چہرہ دیکھکر اُس نے پوچھا۔ بدل "تمھار جی کس ہے" (تمھارا جی کیسا ہے)

بدل نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ نندی سے بالکل نہ بولے گا لیکن اسکو دیکھتے ہی اپنا عہد بھول گیا اُس نے رکھائی سے جواب دیا۔ "ہمرے جیو سے کوؤ کا کا مطلب" (کسی کو ہمارے جی سے کیا مطلب؟)

نندی نے تعجب سے کہا۔ "بدل! آج مو سے ٹھیک سے کس نہیں بولت ہو؟ (مجھ سے اچھی طرح کیوں نہیں بولتے)

بدل نے جواب دیا۔ "کا کری! کا ہم ہی پہل کرا ہے۔ کا ہم ہی دو دن سے گھر بیٹھے رہن ہمن" (کیا بتاؤں؟ کیا ہم نے ہی پہل کی ہے کیا ہم ہی دو دن تک گھر میں بیٹھے رہتے ہیں)

بدل کی ناراضگی کا مطلب اب نندی سمجھ گئی اس نے ہنس کر کہا۔ "ارے! تو ای کیں نہیں کہیت ہو کہ ہمری نہ آئے سے کھسیائے گئے ہو۔ سیتل دادا کی بٹیا کا بیاہ رہا وہی کارن نہیں آسکیوں۔ تمہو کا ناچ کھوب بھا۔ رات تمہاری بڑی یاد آوت رہی سکل رات کو برات لوٹ گئی تو ہمکا فرصت مل گئی۔ تو رسیاتے کاہے گیو؟

بدل بولا۔ کا کری نندی! تو سے بنا مور جی نہیں لاگت رہا۔

تھوڑی دیر میں بدل پھر ہنس ہنس کر نندی سے باتیں کرنے لگا۔ دوپہر کی دھوپ میں دونوں نے پیڑ کے نیچے بیٹھکر ایک ساتھ کھانا کھایا پھر برہا گانے لگے۔

اس کے ایک مہینہ کے بعد کا ذکر ہے جنگل میں مویشی چرانے والے لڑکے اور لڑکیوں نے کوئی دیہاتی کھیل کھیلنے کا آپس میں مشورہ کیا۔ نندی اور بدل کو بھی اس میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا لیکن بدل نے انکار کر دیا اور کہا "ہم دونوں جنے الگ کھیلب تم لوگن کے ساتھ نہ کھیلب" (ہم دونوں تمھارے ساتھ نہ کھیلیں گے)

دوسرے لڑکوں کو اس کی یہ بات بہت بڑی معلوم ہوئی ایک لڑکے نے طعنہ مارا۔ "ہوں! الگ کھیلب! نندی کا سنگ۔ بدل کبھوں نہیں چھوڑت۔ یا تو دونوں دولھا دلھن آہی تو ہیں"

نندی پاس ہی کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ "دولھا دلہن" کا لفظ سنکر وہ کچھ پریشان سی ہوگئی اس کا دل دھڑکنے لگا اس سے پہلے بھی اس نے اس لفظ کو کئی بار سنا تھا لیکن کبھی اس کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا تھا اسکے اور بدل کے درمیان ایسا رشتہ بھی ہوسکتا ہے اس کی طرف آج پہلی مرتبہ اس کا دھیان گیا وہ دن بھر نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اور جب شام کو گھر لوٹی تو اس نے ماں سے پوچھا۔ "کا رے مائی! دولھا دلھن کو ہوت ہیں"

یہ پہلا موقع تھا کہ نندی نے اپنی ماں سے ایسا سوال کیا اس کی ماں کو سخت حیرت ہوئی مگر نندی کی معصومیت اور لڑکپن کا خیال کرکے اس نے جواب دیا۔ نندی! دلہن اوکا کہیت ہیں جون اپنے دولھا کے سنگ رہے اور اوکا روٹی پکا دے۔"

ادھر بدل کے دل میں بھی الجھن تھی اُس نے گھر پہنچکر اپنے پڑوسی ماتا دین سے جو عمر میں اس سے بڑا تھا "دولھا" کی فلاسفی دریافت کی۔ ماتا دین نے ہنسکر پوچھا "کا دولھا بننے کا من ہے؟"

"بھیّا! ایسے ہی پوچھت ہوں"

ماتادین۔ دت پاگل! دولھا اوکا کہت ہیں جو اپنی دولھن کے سنگ رہے اور پیسہ کوڑی کمائے اور دولھن کا دے"

یہ تو بالکل معمولی بات ہے یہ سمجھکر بدل کی وحشت دور ہوگئی

دوسرے دن بدل اور نندی اسی جنگل میں پھر ملے۔ دونوں کے دلوں میں ایک عجیب قسم کے جذبات کا طوفان بپا تھا لیکن ان جذبات کو زبان پر لانے کی ہمت کسی کو نہ تھی۔ دونوں میں لڑکپن تھا کئی گھنٹے تک وہ چپ چاپ ڈھور چراتے رہے۔ آخر شریر نندی سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہا۔ "کا سوچت ہو۔ آؤ ہم دونوں بنے دولھا دلہن بن جائیں"

نندی نے یہ بات بدل کے دل کی کہی تھی وہ بولا۔ "ٹھیک تو ہے لیکن اس معاملہ میں اُسے کئی باتوں کا ڈر معلوم ہوا اس نے کہا۔ "مدا دولھا دلہن تو ساتھ رہت ہیں۔ یہ کیسے ہوئی"

نادان نندی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ "ای کا مشکل ہے۔ یہ سب ڈھور کا مرگئے ہیں کہ جنگل جر گوا ہے جیسے روج ساتھ ساتھ رہت ہیں تبو رہیے۔

بدل نے کہا۔ "تو ٹھیک ہے"

شادی کی بات طے ہو جانے پر ان کو اور کئی باتوں کا خیال آیا۔ نندی نے ایک شرط پیش کی کہ بیاہ میں "گڑ سہاری" سب کو تقسیم ہوتا ہے اس نے سیتل داد کی لڑکی کے بیاہ میں گڑ سہاری کھایا تھا اس کے علاوہ بیاہ کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک برہمن کی بھی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ کافی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ "سہاری" کا انتظام نندی کرے گی اور گڑ بدل لائے گا۔ برہمن کے لئے زیادہ پریشانی نہ اٹھانی پڑی۔ بدل کے گاؤں کے پنڈت کا لڑکا بھی ان کے ساتھ گائیں چرانے آیا کرتا تھا۔ اُس نے صرف دو آنے پر بیاہ کرانے اور اس کو پوشیدہ رکھنے کا ذمہ لے لیا۔ اس نے اپنے پتا کے ساتھ اکثر شادیوں میں شرکت کی تھی۔ کچھ اوٹ پٹانگ منتر پڑھنا بھنور پھرانا اور بات میں ٹکے وصول کرنا بس یہی شادی ہے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن چکا تھا۔ اُسے کامل

یقین تھا کہ وہ بدل اور نندی کی شادی کو نہایت خوبی سے سرانجام دے گا۔

دوسرے دن صبح ہی نندی نے اپنی ماں سے رو دھو کر بڑی مشکل سے اٹھ "سہاری" بنوائیں اور انھیں ایک کپڑے میں باندھ کر مویشی ہانکتی ہوئی بَن کو چل پڑی۔ ادھر بدل نے بھی کچھ اناج بیچ کر بنئے سے دو آنے پیسے اور کچھ گڑ حاصل کر لیا اور خوش خوش جنگل میں پہنچا وہاں برہمن کا لڑکا پہلے ہی سے موجود تھا۔ بدل کو دیکھ کر نندی نے پوچھا "گڑ لائے؟" برہمن لڑکے نے بھی سوال کیا "اور پیسے لائے؟"

بدل نے بڑے فخر سے گڑ اور پیسے دکھا دیئے اور طعنہ کے ساتھ کہا — "تو اپنی کہہ۔ سہاری لائی؟"

نندی نے جھک کر گال پھُلا کر سہاری کی پوٹلی کو اونچا کر کے کہا "یہ کا ہے؟ لے سونگھ لے" بیاہ کی پہلی کسوٹی پر دونوں کھرے نکلے۔

اب کس بات کی دیر تھی سنسان جنگل میں ایک سبز پیڑ کے نیچے آم کی ایک ٹہنی زمین میں گاڑ کر نندی اور بدل آمنے سامنے بیٹھ گئے پروہت جی کچھ منھ ہی منھ میں بڑبڑائے گویا وہ منتر یا کوئی اشلوک پڑھ رہے ہیں بھونر پھرا کر پروہت جی نے اپنی سمجھ میں بدل اور نندی کو دولھا دلہن بنا دیا اور اپنے دو آنے پیسے طلب کئے بدل نے بڑی ہوشیاری سے پنڈت جی کو چھ ہی پیسے پر ٹالا اور بچے ہوئے دو پیسے نندی کے ہاتھ پر رکھ کر وہ اپنے خیال میں شوہری فرض سے بھی ادا ہو گیا۔

نندی کے لئے وہ دو پیسے لاکھوں روپے کے برابر تھے آج اس کی خوشی کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اپنی گانٹھ میں پیسوں کو باندھ کر اس نے بدل کے ساتھ گڑ۔ سہاری" کا بھوج کیا اور قدرتی چشمہ کا ٹھنڈا پانی پی کر پھر دونوں مویشی چرانے لگے۔

بیاہ کے رسومات بڑی سادگی سے ختم ہو گئیں۔

چار برس اور گزر گئے۔ نندی کے باپ کو اپنی "بال ودھوا" کنیا کی دوبارہ شادی کی فکر ہوئی۔ بدل اور نندی کے اچھے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے نندی کے باپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی سگائی بدل ہی سے کرائے گا۔ بات چیت بھی پکی ہو گئی لیکن جب گاؤں کے مکھیا کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے نندی کے باپ کو منع کر دیا کہ وہ یہ رشتہ نہ کرے۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدل کے گاؤں کے مکھیا اور نندی کے گاؤں کے مکھیا میں پٹی داری تھی ان میں اکثر فوجداری ہوتی رہتی تھی پھر بھلا نندی کے گاؤں کے مکھیا کو یہ کب گوارہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے دشمن کا چمار ان کے گاؤں پر برات چڑھا کر لائے۔ مجبوراً نندی کے باپ کو کسی دوسرے گاؤں میں رشتہ کرنا پڑا یہ رسم و رواج کا کرشمہ نہ تھا بلکہ غریب اچھوتوں پر سرمایہ داری

کی لعنت تھی۔

سندی کو یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں وہ بدستور جنگل میں مویشی چرانے جایا کرتی تھی لیکن شرم و لحاظ سے جس طرح پہلے وہ بدل کے ساتھ سگائی ہونے کی خبر بدل کو نہ سنا سکی تھی اسی طرح جب یہ نسبت ٹوٹ گئی تو بھی وہ خاموش ہی رہی۔ بدل کو اپنی قسمت کا یہ بننا بگڑنا بالکل معلوم ہی نہ ہوسکا۔

خلاف معمول ایک دن سندی جنگل میں نہ آئی بدل نے سوچا کسی خاص کام کی وجہ سے نہ آئی ہوگی لیکن جب کئی دن گزرنے لگے اور سندی نہ آئی تب بدل سخت پریشان ہوا۔

ادہر سندی کی شادی کی تاریخ قریب آگئی تھی اسی وجہ سے جنگل کا آنا جانا بند کردیا گیا تھا۔ بدل کی جدائی میں سندی کا دل بہت اداس رہتا تھا۔ گھر میں منگل گیت۔ بچوں کی اچھل کود اور مردوں اور عورتوں کی چہل پہل اسے کچھ نہ بھاتی تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھکر لوگ یہ سمجھتے کہ سندی کو گھر چھوٹنے کا غم ہے۔

برات آئی سندی کو وہ خوشی حاصل نہ ہوسکی جو چار سال پہلے اس سنسان جنگل میں بیڑ کے نیچے بدل کے ساتھ شادی ہونے سے ہوئی تھی۔ آج برات کے دن کھانے پینے میں سندی کو وہ لطف حاصل نہ ہوا جو چار برس پہلے بیڑ کے سایہ میں بیٹھکر بدل کے ساتھ گڑ "سہاری" کھانے میں ملتا تھا منڈپ کے نیچے بھونر گھومتے وقت سندی کے پاؤں میں وہ تیزی نہ تھی جیسے پہلے آم کی شاخ کے چاروں طرف بدل کے ساتھ گھومنے میں تھی۔ بڈھے پنڈت جی کے منتر اس کے کانوں کو اتنے اچھے نہ معلوم ہوئے جیسے چھ پیسے والے توتلے پنڈت کے لڑکے کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔ پہلی شادی اپنی مرضی سے کی تھی اور یہ شادی والدین اور زمیندار کے حکم سے ہو رہی تھی۔

بدل کو اس شادی کی کچھ خبر نہ تھی وہ مجبوراً جنگل میں آیا تو سہی لیکن اب اس کو کھیلنے کودنے میں کوئی دلچسپی نہ معلوم ہوتی وہ تنہائی میں بیٹھ کر سندی کی یاد میں آنسو بہاتا۔ جس دن سندی کا بیاہ تھا اس دن اسکا دل بہت بے چین تھا اس نے اب تک کسی کو اپنا ہمراز نہ بنایا تھا لیکن آج وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا اُس نے مجبوراً سندی کے گاؤں سے آنے والی ایک اہیرن کی لڑکی سے سندی کو کہلا بھیجا کہ آج شام کیوقت جس طرح سے بھی ہوسکے اس کو جنگل میں ملنا چاہئے۔ کہاں؟ اسی بیڑ کے نیچے جہاں چار برس پہلے ان کی شادی ہوچکی تھی اور بدل کے دئیے ہوئے پیسے بطور یادگار آج بھی سندی کے گلے میں تعویذ بنے ہوئے تھے۔

وقت مقررہ پر سندی عروسی جوڑہ پہنے پاؤں میں مہاور اور مانگ میں سیندور لگائے بہت پوشیدہ طریقہ سے جنگل میں پہونچ گئی۔ بدل اس کا انتظار کر رہا تھا۔ عرصہ تک ایک دوسرے کو نہ دیکھنے سے وہ تڑپ رہے تھے۔ بدل نے سندی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور آج پہلی مرتبہ اس نے سندی کو اپنے کلیجہ سے لگایا۔

نندی نے اپنا سر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بدل کے کندھے پر رکھدیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ ارمان و تمناؤں کے جذبات سے اس کا دل اچھل رہا تھا۔ شرم و لحاظ کی لہریں اس کے رگوں میں دوڑ کر اُسے کپکپا رہی تھیں
ایک لمحہ کے لئے بدل بیخود سا ہوگیا لیکن فوراً ہی اس کو اپنا کندھا بھیگتا معلوم ہوا اور اس نے نندی کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرہ کو بغور دیکھا اور پھر گویا اس پر بجلی گری ہجوم جذبات سے اس نے نندی کو کلیجے سے لگا تو لیا تھا لیکن اس کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا اس نے اس کے عروسی جوڑے کی طرف کچھ دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب پاؤں میں مہاور اور مانگ میں سیندور دیکھکر چونک اٹھا اور نندی سے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا اس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "ای کا نندی! (یہ کیا نندی؟)
نندی اس کے جواب میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی وہ خود کو قصوروار سمجھتی تھی۔
بدل نے کانپتی ہوئی آواز سے پھر دریافت کیا۔ "یہی پیڑ کے نیچے جون قرار کینو رہا یاد ہے" (اس پیڑ کے نیچے جو قرار کیا تھا وہ یاد ہے)
نندی نے سر ہلا کر تسلیم کیا۔
بدل۔ یاد ہے تو بتاؤ مور کہا نیہو (یاد ہے تو بتاؤ میرا کہنا مانوگی)
نندی نے پھر سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا کہ "ہاں مانوں گی"
بدل اب بچہ نہ تھا نندی کی یہ محبت دیکھ کر جوش مسرت سے اس کا دل ناچ اٹھا اس کے امیدوں کی خشک شاخ پھر ہری ہوگئی اس نے پھر ایک بار نندی کو جو اس کے خیال سے اس کی آج سے چار برس پہلے ہم پتنی ہو چکی تھی کھینچ کر چھاتی سے لگا کر مہر محبت ثبت کردی جس سے نندی کا چہرہ لال ہوگیا
تاریکی بڑھنے لگی اور اسی تاریکی میں نندی اور بدل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوے وہاں سے غائب ہوگئے

نندی اور بدل کی گمشدگی سے تمام گاؤں میں ہلچل مچ گئی ادھر اُدھر بہت تلاش کی گئی لیکن دونوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آئی ہوئی برات بگڑ کر واپس چلی گئی۔
بدل اپنے گاؤں سے نندی کو لیکر قریب کے ایک شہر میں پہونچا اور ایک وکیل صاحب کے اصطبل میں نوکر ہوگیا۔ والدین کے ڈر سے دونوں نے اپنی ذات چھپا رکھی تھی اتفاقاً ایک دن بدل کے گاؤں کا ایک اہیر اصطبل کی طرف سے نکلا اور اُس نے بدل کو پہچان لیا۔ بدل نے اپنے مالک سے کچھ دن کی چھٹی لےلی اور اہیر کو اپنا ہمراز بنا کر وطن کی طرف چلا۔ گاؤں کے قریب پہنچکر جنگل میں اسی پیڑ کے نیچے جہاں اُس کی شادی ہوئی تھی نندی کو ٹھہرا کر گاؤں میں گھسا جب اس کے ضعیف باپ کو اس کے آنے کی خبر ملی تو وہ خوشی

کے آنسو بہاتا بدل کے پاس پہنچا۔ بات کی بات میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ بدل چوپال میں بیٹھ گیا تھا گاؤں والے اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

دو ڈھائی سال کے بچھڑے ہوئے لڑکے کو اپنے سینے سے لگا کر بڈھے باپ نے کہا۔ "چلو! بیٹا! اب گھر چلو؟"

بدل نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔ "دادا! مورے (میرے) ساتھ تمھار پتو (تمھاری بہو) ہوہے"۔

بڈھے کی خوشی دوگنی ہوگئی وہ بولا "کون؟ نندی! کہاں ہے؟"

بدل نے اور بھی شرما کر کہا۔ اس کی گود میں ...." وہ اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا صرف جنگل کی طرف اشارہ کر دیا۔ سب اسی طرف دوڑ پڑے۔

بدل کو گھر سے نکلے ڈھائی سال ہو چکے تھے اب نندی کی گود میں ایک ہنس مکھ بچہ بھی تھا۔ جب نندی اپنی سسرال پہنچی۔ تو اس کے دوسرے دن بدل کے باپ نے نندی کے باپ کو بھی اس کی خبر بھیجدی جو دوڑے ہوئے آئے۔ اس طرح سے بچھڑے ہوئے آپس میں مل گئے لیکن اس سے برادری خوش نہ ہوئی اور بغیر بھوج کے وہ خوش بھی کس طرح ہو سکتی تھی ان کی نظروں میں تو بدل کا باپ کوئی معمولی پاپ نہ تھا اسی وجہ سے برادری نے بدل کے گھر کا حقہ پانی بند کر دیا تھا جب بدل نے اُن کو اپنی کمائی سے بھوج دیا تب جاکر کہیں برادری کا غصہ رفع ہوا اور پھر بدل کا خاندان برادری میں شامل کر لیا گیا۔ اب برادری کی نظروں میں نندی اور بدل کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ (ماخوذ)

اعظم کریوی

یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر

پروفیسر ہاسکنس نے "انگلش ہسٹاریکل ریویو" میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ بارہویں صدی میں جب مغربی یورپ کے اندر علوم عربیہ کی اشاعت ہونے لگی تو انگلستان نے بھی اس میں نہایت اہم حصہ لیا چنانچہ اُس زمانہ میں باتھ کا رہنے والا ایک شخص ایڈیلارڈ تھا جس نے علوم عربیہ کو بہت زیادہ انہماک سے حاصل کیا اس کے معاصرین اور علماء ما بعد کی تحریر کردہ بہت سی کتابیں مع تاریخ تصنیف ایسی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات نہایت وضاحت اور صحت کے ساتھ تحقیق کی جا سکتی ہے کہ ان علوم جدیدہ (عربیہ) کی اشاعت ملک انگلستان میں کس طرح ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستان کی علمی بیداری میں ان علوم عربیہ نے نہایت زبردست حصہ لیا تھا۔ اور عربوں کے ذریعہ سے علوم ریاضی خاص طور پر اس قدر معراج ترقی پر پہونچ گئے تھے کہ اس سے قبل مغربی یورپ کو کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

عربوں میں لفظ "سائنس" کے اندر وہ جملہ علوم شامل تھے جو قرون وسطیٰ میں یورپ کے اندر ریاضیات میں داخل تھے یعنی علم الحساب۔ علم المساحت موسیقی اور فلکیات اور ان تمام علوم پر مستشرقین نے کافی توجہ کی ہے، مگر بدقسمتی سے علم موسیقی پر کسی نے توجہ نہ کی۔ یعنی اب تک یہ بات ظاہر کرنے کی کسی شخص نے بھی کوشش نہ کی کہ عربوں کے فن موسیقی نے مغربی یورپ پر کس قدر اثر ڈالا۔

یورپ پر عربوں کے اثر کا یہ پہلو دو صورتوں میں تحقیق کیا جاتا ہے:-

(۱) عام موسیقی - جو آٹھویں صدی میں یورپ کے اندر بسلسلۂ تعلقات اشاعت پذیر ہوئی۔

(۲) فن موسیقی، جو دسویں اور گیارہویں صدیوں میں ادبی اور علمی تعلقات کے ساتھ ساتھ یورپ میں آیا۔

عربوں کی عام موسیقی، مغربی یورپ میں سفری قوالوں یا مغنیوں کے ذریعہ سے پھیلی۔ جو اپنے ساتھ اہل عرب کے ایجاد کردہ جدید ساز ہائے موسیقی لئے پھرتے تھے اور عربی ترکیبوں سے گاتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں یورپ کے مغنی اور گشتی قوال جو گیت گاتے تھے یا جن طریقوں سے رقص کرتے تھے، ان میں سے اکثر راگنیاں اور اکثر رقص عربوں کے رہین منت تھے۔ لیکن یہ گشت کرنے والے یا سفری مغنی، عربی علم موسیقی سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عموماً عطائی ہوتے تھے، جو عربی گویوں سے سن سنا کر چیزیں اُڑا لیا کرتے تھے ـــــ لیکن جو عربی ساز ہائے موسیقی یہ لوگ اپنے ساتھ لئے پھرا کرتے تھے۔ وہ یورپ کے

نزدیک بالکل نئے اور انوکھے تھے۔ اور ان میں سے بعض ساز اس ترکیب سے وضع کئے گئے تھے کہ ان میں سروں کا ٹھاٹھ زیادہ تر علمی طریقہ پر قائم تھا جس سے . . . یورپ بالکل ناواقف تھا۔

بعض ساز اور اصطلاحات موسیقی

اب ہم ذیل میں بعض عربی اور یوروپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یوروپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔

عربی نام	یوروپین
اَلعُودُ	A Lute = (Al-ud)
قِطَارُ	Guitar = (qitar)
رَبَاب	Rebec = (Rabab)
نقّارہ	Naker = (Naqqara)
صنوج (مجیرہ یا جھانجھ)	Sonajas = (Sunuj)
اَلدّف (مربع)	Adufe = (Al-duff)
بندیر (مدور)	Pandere = (Bandair)
قصعہ (ایک قسم کا عربی ڈھول)	(qasa) = سولھویں صدی میں فرانسیسی queese ہوا اور اب فی زمانہ Caisee کہلاتا ہے
طَبل	Taber, tabor, tabel (Tabl)
النفیر (نفیری)	Anafil (Nafir)
انفار	Fanafare (بہت سی نفیریوں کا یکدم بجنا) (Anfar)
السرنائی	Dulcaya (Al-Surnay)
قانون	Canon (qanoon)
الشقرہ	Eschaquiel (Al-Shaqira)
زامر	Shawm (Zamr)

معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں جلترنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یورپ میں (جلترنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارھویں صدی تک تاریخ سے

ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے واقعی آبی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنون بنالئے تھے۔ اور آبی ارگن سے مراد "جلترنگ ہے"۔

تان اور برہمپت عربوں کے ساتھ یوروپ کا تعلق پیدا ہونے کے بعد جو سب سے پہلے اثر پڑا وہ "زوائد نغمہ" یعنی کوئی چیز گاتے گاتے تان، یا نیپڈ لگانا جسے انگریزی اصطلاح میں "glass" (چمک) یا "Ornament" (راگنی کا زیور یا سنگھار) کہتے ہیں۔

عربی اثر پڑنے سے قبل یوروپین موسیقی بالکل سادہ ہوا کرتی تھی جسے "نغمۂ گریگوری" کہتے تھے۔ اس میں سروں کا کوئی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ مگر عربی اثر پڑتے ہی تمام یوروپین موسیقی کا رنگ بدل گیا۔ اگر دو یا دو سے زیادہ مغنی گانے بیٹھتے تھے تو ان میں ایک آدمی سیدھی استائی گاتا تھا اور دوسرا درمیان میں گلے بازی کرتا جاتا تھا۔ اس تان اور نیپڈ وغیرہ کو اصطلاح یوروپ میں "Oppoggialura" کہتے تھے

سُر ملانا جس چیز کو انگریزی زبان میں "Harmony" (ہم آہنگی) کہتے ہیں وہ یوروپ میں دسویں صدی سے پیشتر بالکل مفقود تھی، لیکن پروفیسر دولبریج لکھتے ہیں کہ دسویں صدی میں فن موسیقی کے اس اسلوب کا ذکر پایا جاتا ہے جسے "Organising" (ٹھاٹھ ملانا) کہتے ہیں۔ یہ فن سروں کے ملانے پر مشتمل تھا اور اس زمانہ میں اسکو "Organum" یا۔ "Dia-phony" کہتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوروپ میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا۔

بعض مورخین، مثلاً ایمیل نوماں (Emil Naumann) کا یہ قول ہے کہ دین عیسوی کی ترقی کے ساتھ یہ بات بھی پیدا ہوگئی تھی، مگر اس قول کی تردید پادری سر ایف۔ اے۔ گور اوسلے جیسے عالم و فاضل نے بخوبی کردی ہے۔ حقیقت کا اظہار دراصل پروفیسر وولریج نے کیا ہے جو تحریر فرماتے ہیں کہ "ارغنوم" (Organum) کا اصول اساسی قدیم یونانیوں کے اس طریقہ میں پایا جاتا ہے جسے "Magadizing" کہتے تھے۔ اس میں "اکیٹو" (Octave) کو اکیٹو سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور "Organising" میں چوتھے یا پانچویں سر (مدھم اور پنچم) سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر ریمان (Riemann) اس کے بعد "Magadising" سے "Organising" کی طرف قدم اٹھانا ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن یہ پہلا قدم کس نے اٹھایا؟ کیا عربوں نے؟

سب سے پہلا عرب مصنف جس کی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں وہ الکندی (المتوفی ۸۷۴ء) ہے مگر جو اوراق پریشاں اس شخص کے ہم کو دستیاب ہوئے ہیں ان میں "ارغنوم" کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے۔ اور نہ الفارابی

(المتوفی ۹۵۰ء) کی تصانیف میں اس کا کہیں اشارہ پایا جاتا ہے۔ لیکن بو علی سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) کی کتاب "شفا" میں دونوں باتوں یعنی "Organising" اور "Magadising" یا "تضعیف" اور "ترکیب" کے ناموں سے بحث کی گئی ہے[52] لیکن چونکہ یہ باتیں بو علی سینا میں پائی جاتی ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ الفارابی نے بھی ضرور ان کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فن "ترکیب" (Organum) دراصل عربی فن نہیں ہے، بلکہ یونانی ہے اور غالباً ارسطو سے لیا گیا تھا۔

ایک ہسپانوی مورخ ورجلیس قرطبائی کے تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے مدارس موسیقی میں فن "ترکیب" کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اہل یوروپ عرصہ دراز تک یونانیوں کی تقلید میں یہ بات مانتے رہے کہ صرف آٹھویں، پانچویں اور چوتھے سروں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تیسرا سُر کسی سے نہیں ملتا۔ مگر الفارابی (دسویں صدی) اور ابن سینا (گیارہویں صدی) نے سر نمبر ۴ و نمبر ۵ کو ملا کر "ثالث کبیر" (چڑھی گندھار)[53] اور سر نمبر ۵ و نمبر ۶ کو "ثالث صغیر" (اُتری گندھار)[54] تسلیم کر لیا تھا۔ اور ٹھیک اس وقت جبکہ یوروپ بتقلید فیثا غورث تیسرے سر کو غیر آہنگ خیال کر رہا تھا، عربوں کا ساز "طنبورہ خراسانی" نہایت اچھی طرح سے "ثالث کبیر" کے سر پیدا کرتا تھا۔

الغرض رفتہ رفتہ یوروپ نے نظریۂ فیثا غورث ترک کر کے عربوں کے ایجاد کردہ جدید طریقے اختیار کر لئے جن میں سے ایک تیسرے چوتھے، پانچویں اور آٹھویں سروں میں دوگن پیدا کرنا تھا اور جس کا ذکر ابن سینا نے کیا تھا۔

سرگم ٹھاٹھ

اسی سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ کے اندر سازہائے موسیقی کا "ٹھاٹھ" قائم کرنا بھی عربوں ہی سے آیا تھا چنانچہ لوئی شانزدہم شاہ فرانس کے ترجمان السنۂ مشرقیہ موسیو بیجن دی سینٹ بیٹرن نے اس قول کی تائید میں ایک عربی مخطوطہ پیش کیا تھا۔ اور یہ بات تو زمانۂ

---

۵۲ ویقرب من ھذا الباب التركيبات وھو ان يحدث بنقرة واحدة تستمر على وترين النغمة المطلوبة والتي مجانسة الذي بالاربعة او الذي بالخمسة وغير ذالك كانھما يقعان في زمان واحد والتضعيفات وقد علمتھا من جملة التركيبات الا انھا في الذي بالكل۔

۵۳ انگریزی میں اُسے (Major Third) کہتے ہیں

۵۴ انگریزی میں اسے (Minor Third) کہتے ہیں

دراز سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ یوروپ میں سرگم کی تعلیم عربوں ہی نے جاری کی تھی۔ یوروپ کی اصطلاح میں سرگم کو "Solfeggio" اور گت یا ٹھاٹھ کو "Tabalature" کہتے ہیں۔

اگر ہم عربی اور یوروپین سرگموں کے ناموں کا مقابلہ کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کے نام اور حروف ایک ہی ہیں مثلاً :-

عربی سرگم :- میم ، فا ، صاد ، لام ، سین ، دال ، را

یوروپین سرگم :- می ، فا ، سول ، لا ، سی ، دو یا ات ، ری

سب سے زیادہ دلچسپ عربی اثر وہ ہے جو یوروپ کے سازہائے موسیقی کے "ٹھاٹھ" یا گتوں پر پڑا۔ اور عربوں کے اس احسان کو یوروپ کے محققین عام طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک طریقہ تھا جس میں حرفوں یا علامتوں کے ذریعہ سے گتیں "قائم کی جاتی تھیں" یا پردوں اور سپتکوں کے اتار چڑھاؤ سے "ٹھاٹھ" بنایا جاتا تھا۔ یوروپ والوں کو اس سے قبل یہ فن قطعی معلوم نہ تھا۔ عربوں کے اس احسان کا کھلم کھلا اعتراف پندرہویں صدی کے ایک راہب مصنف جائمے ویلانووا نے ایک مخطوطہ میں کیا ہے۔ مخطوطۂ مذکور کی ابتدا بایں الفاظ ہوتی ہے :-

"یہ امر حیرت انگیز ہے کہ روح القدس کے فیوض و برکات کفار پر اس قدر نازل ہوں۔ میں یہ بات اس وجہ سے کہتا ہوں کہ سلطنت غرناطہ کے ایک عرب (مور) نے جس کی ماہرین فن ہسپانیہ بیحد تعریف کرتے ہیں، سازوں کے بجانے کا نہایت عمدہ فن ایجاد کیا تھا۔" اس کے بعد زاہدِ مذکور نے سروں کے متعین کرنے کا وہ طریقہ بیان کیا ہے جو یوروپ میں اٹھارہویں صدی تک رائج تھا۔ اور اس طریقہ کا نام اس نے "ٹیبلیچر" (Tabalature) رکھا ہے۔

معاشرتی علمی و ادبی تعلقات کا اثر

یہاں تک تو ہم نے یوروپ کے فن موسیقی پر عربوں کے اس اثر کا حال بیان کیا ہے، جو سیاسی تعلقات کے ذریعہ سے پڑا۔ اب ہم اس معاشرتی اثر کا کچھ حال بیان کرتے ہیں جو اس زمانہ سے بھی قبل یوروپ پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر ہاسکن نے بیان کیا ہے کہ بارہویں صدی کے اوائل ہی میں رفتہ رفتہ بہت سی عربی اصطلاحیں اور الفاظ یوروپ میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر جب یوروپ سے عربوں کا علمی و ادبی تعلق بھی قائم ہو گیا تو یہ اثر بہت زیادہ ہو گیا۔

انگلستان پر اس تعلقات کا اثر بقول پروفیسر ہاسکن، والچر راہب مالورن (المتوفی ۱۱۳۵ء) کے ذریعہ سے ظاہر ہوا، جس نے "علوم عربیہ" ایک یہودی المذہب عرب مسمی پطرس الفوزی سے حاصل کئے تھے۔ یہ یہودی عرب اس زمانہ میں انگلستان آیا تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا (۱۱۰۷ لغایۃ ۱۱۱۲ عیسوی) جبکہ یوروپ میں عربوں کا جدید

علم الہیئت پہونچا۔

اسی زمانہ میں عربوں کا فن موسیقی مغربی یورپ میں داخل ہوا، جس کی اشاعت میں انگلستان نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ آٹھویں اور گیارہویں صدی کے درمیان عربوں نے قدیم یونان کی ایسی بہت کتب موسیقی کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا جن کا نام تک مغربی یورپ کو معلوم نہ تھا۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

موضوع کتاب	نام کتاب یونانی		نام مصنف یونانی	
سر اور تال	Harmonics and Rhythmic	ارسطاکزینوس	Aristoxenos
گیت۔	Problems	ارسطو	Aristotle
لحنیات و قانون	Harmonics and Canon	اقلیدس	Euclid
لحنیات	Harmonics	بطلیموس	Ptolemy
لحنیات	Harmonics	نیقوماخوس	Nichomachos

مندرجہ بالا کتب کے تراجم کے علاوہ اکثر عرب مصنفین کے قلم سے طبعزاد کتابیں نکلیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مصنفین یہ تھے:۔

(۱) الکندی۔ (۲) السرخسی۔ (۳) بنو موسیٰ۔ (۴) ثابت ابن قرہ۔ (۵) ذکریا الرازی۔ (۶) قسطہ ابن لوقا (۷) الفارابی۔ (۸) بو علی ابن سینا۔ (۹) ابن باجہ۔

مسٹر ہنری جارج فارمر۔ ایم۔ اے کا قول ہے کہ جب ہم اس عہد کی یوروپین کتب موسیقی کا مقابلہ عرب معاصرین سے کرتے ہیں تو ہم شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی موسیقیات ایک صحرائے بے آب و گیاہ تھا جس میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" اور ابن سینا کی کتاب "الشفا" سرسبز و شاداب نخلستان دکھائی دیتی ہیں۔

الغرض یورپ نے بہت جلد عربوں کی علمی و دماغی فوقیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ اور طلبار فرنگ اندلس کی یونیورسٹیوں اور ہسپانیہ کے مدرسوں میں عرب اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے لگے، جہاں نہ صرف یونانی موسیقیات کے عربی تراجم پڑھائے جاتے تھے۔ بلکہ خالص عربی کتب موسیقی میں بھی درس دیا جاتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں اور مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر جو مشہور طلبار مغربی یورپ کو گئے وہ جربرٹ، ہرمان کانٹرکٹ، قسطنطین افریقی، جان سیوائلی، گندیسالوی، جیرارڈ کریمونوی۔ اور فلاطون طفالوی تھے۔ اسی قسم کے انگریز طلبار میں الفریڈ، ایڈیلارڈ ساکن باتھ، رابرٹ ساکن ریڈنگ، راجر ساکن ہیرفورڈ، اور دانیال مورلے کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ایڈیلارڈ ساکن باتھ نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس نے فن موسیقی کی تعلیم فرانس میں پائی تھی اور ملکہ فرانس کے حضور میں قطارہ (ستارہ) بھی بجایا تھا (غالباً ۱۱۰۹ء سے قبل) علاوہ ازیں اس شخص

کی تصنیف کردہ ایک دوسری کتاب بھی شہر میلان کی ایمبروزین لائبریری میں موجود ہے جس کا ایک حصہ علم موسیقی کے لئے مخصوص ہے۔ اسی کتاب میں مصنف مذکور نے ایک عرب ماہر فن کا حوالہ دیا ہے جس کا نام اس نے الخوارزمی (Alce.........) تحریر کیا ہے۔ یہ شخص مشہور و معروف "حکیم ابوعبداللہ خوارزمی" تو ہو نہیں سکتا کیونکہ حکیم مذکور کی کسی کتاب موسیقی کا ذکر عرب مصنفین نے نہیں کیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ یہ محمد ابن احمد خوارزمی ہوگا جس کی کتاب "مفاتیح العلوم" میں ایک فصل موسیقی کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بہرحال بارہویں صدی عیسوی میں جدید علم موسیقی یورپ کے اندر داخل ہوا۔ اور یہ شعبۂ موسیقی "الیقاعات" (Mensural music یعنی تال اور سم) تھا۔

قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ جب ۱۱۳۰ء میں ہسپانیہ کے "موحدین" نے از راہ تعصب غیر مسلموں پر زیادتیاں کرنا شروع کیں تو وہاں سے بہت سے یہودی دیگر ممالک میں منتشر ہوگئے۔ انھی میں مشہور و معروف یہودی "ابراہام ابن عذیر" اور دیگر یہودی بھی تھے جو اپنے ہم مذہبوں سے ملنے انگلستان آئے تھے۔ ابراہام لندن میں ۱۱۵۸ء-۱۱۵۹ء میں تھا اور یہیں اس نے اپنی کتاب موسیقی کا کچھ حصہ قلمبند کیا اور اسی زمانہ میں اس کی کتاب ایک انگریزی یہودی نے نقل کی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں جب کتاب "سعدیہ" لکھی گئی تو یہودیوں نے عربوں سے علم موسیقی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسٹین شینڈر نے اپنی کتاب "یہودی لٹریچر" صفحہ ۱۵۴ میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا علم و فن موسیقی، دیگر علوم کی طرح، عربوں سے حاصل کیا گیا تھا"۔ اسی زمانہ میں یہودی لوگ عربی کتب موسیقی کا ترجمہ اپنی عبرانی زبان میں کر رہے تھے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا" جلد اول صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ "ابن عقنین نے جن کتابوں کے پڑھنے کی سفارش کی ہے۔ ان کی فہرست میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" کا بھی نام ہے۔ علاوہ ازیں الفارابی کی دوسری کتاب "احصاء العلوم" کا ترجمہ بھی عبرانی زبان میں موجود ہے۔ پاپائے اعظم کے کتبخانہ واقع قصر فاتیقان میں ایک عربی کتاب موسیقی کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ جو ابراہام ابن حجہ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس شخص نے جو ۱۱۳۶ء میں فوت ہوا، عربی کتابوں کا لاطینی ترجمہ کرنے میں بےحد مدد دی تھی۔ یہ ابراہام ابن عذیر کا بڑا دوست تھا اور اس کے ساتھ ملکر کام کیا کرتا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور امر قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ عربوں کے بہت پرانے یوروپین شاگردوں میں ایک شخص مسمی "ہرمان کانٹریکٹ" (۱۰۱۳ء لغایۃ ۱۰۵۴ء) گذرا ہے۔ اُس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس رسالہ میں اس شخص نے سُروں کی تعین کا ایک عجیب و غریب طریقہ علامات یا حروف کا استعمال کیا ہے اس سے قبل یورپ میں ایسا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ مثلاً ہرمان کانٹریکٹ نے حسب ذیل طریقہ سے مختلف سروں کو ظاہر کیا ہے:-

علامت	نام سُر
e	AEquus (Unison = برابر کا سُر)
t	Tonus (Tone = لحن)
S	Semitonium (Half-tone = ادھر)
ts	Tonus cum semitonio (Minor third = اتری گندھار)

ہرمان کانٹریکٹ نے یہ طریقہ عربوں سے لیا ہے۔ اور جو الکندی (المتوفی سنہ ۸۷۳ء) کے زمانہ میں وہاں موجود تھا

تال سم
mensural music

تال، سم کا فن عربوں کو بہت قدیم زمانہ سے معلوم تھا چنانچہ الخلیل (المتوفی سنہ ۷۹۱ء) کی تصنیف الموسوم "کتاب الایقاع" (Rhythmics) میں یہ فن موجود ہے۔ یہ فن الکندی (المتوفی سنہ ۸۷۳ء) کو بھی معلوم تھا جیسا کہ مخطوطات الکندی سے ثابت ہوتا ہے جو برٹش میوزیم اور برلن میوزیم میں محفوظ ہیں۔ الفارابی بھی اس فن سے بخوبی واقف تھا۔ اور اس پر اس نے اپنی تصنیف "کتاب الموسیقی" میں پوری بحث کی ہے۔ جو لیڈن، میڈرڈ اور میلان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ الفارابی نے سنہ ۹۵۰ء میں وفات پائی تھی۔ اخوان الصفا کے رسائل میں بھی اس فن پر خوب بحث کی گئی ہے جو سنہ ۱۸۱۲ء میں مقام بمبئی اور سنہ ۱۹۰۶ء میں مقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔ بوعلی سینا (المتوفی سنہ ۱۰۳۷ء) نے بھی اپنی کتاب "الشفا" اور "نجات" میں اس فن پر بحث کی ہے۔ پہلی کتاب انڈیا آفس اور بوڈلیں لائبریری میں ہے اور دوسری کتاب بھی بوڈلیں لائبریری میں پائی جاتی ہے۔ اندلس کی یونیورسٹیوں نے فارابی اور ابن سینا دونوں کی کتابیں گیارہویں صدی میں بیہاں جاری رکھی تھیں۔ (المقری جلد سوم)

اپنے زمانہ میں جامعہ قرطبہ کا مدرسۂ موسیقی تمام دنیا میں مشہور تھا۔ دور دراز سے طلبہ آکر اندلس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے۔ اور وہاں وہ الخوارزمی، ابن الہیثم، البطانی، الفارابی اور بوعلی سینا وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کا ترجمہ یوروپ کی زبانوں میں کیا کرتے تھے۔ یہ مسلم مصنفین اور ماہرین فن مغربی یوروپ میں جن ناموں سے مشہور تھے وہ حسب ذیل ہیں:—

یوروپین نام		عربی نام
Alchoarisimus	Algaurizm	الخوارزمی
Alhazen		الہیثم
Albategnius		البطانی
Alpharabius		الفارابی

ابن سینا Avicenna
ابن باجہ Avempace

الفارابی کی کتاب "احصاء العلوم" کا پہلا لاطینی ترجمہ ۱۱۳۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیان ہوا اور اس کی دوسری کتاب "کتاب الموسیقی" کا اصل نسخہ (جو ابن باجہ سے نقل کیا گیا ہے) کتب خانہ میڈرڈ میں محفوظ ہے۔ مگر لاطینی زبان میں اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ابن سینا کی کتاب موسیقی کا بھی اس وقت کوئی لاطینی ترجمہ موجود نہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ لاطینی میں ضرور ہوا تھا۔ کیونکہ یوروپین مصنفین اس کی عبارتیں اکثر نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ابن سینا کی کتاب "نجات" کا لاطینی ترجمہ موجود ہے مگر اس ترجمہ میں یہ عجیب بات ہے کہ اس کی جو فصل موسیقی کے متعلق تھی وہی نادر ہے۔

قدیم یوروپین ماہرین موسیقی کی کتابوں میں "تال سم" کا کہیں پتہ نہیں کیونکہ یہ فن وہ جانتے ہی نہ تھے۔ سب سے پہلا یوروپین ماہر موسیقی فرانکو ساکن کولون (۱۱۹۰ء) جس کی کتاب ہم تک پہونچی ہے، ایسا شخص ہے جس نے "تال سم" کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ مگر کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن مغربی یوروپ کی ایجاد نہ تھا بلکہ کسی اور جگہ سے لیا گیا تھا جہاں وہ پوری طرح ترقی پا چکا تھا اور یہ فن "الیقاعات" کے نام سے عربوں میں بہت پیشتر سے موجود تھا۔ الغرض یوروپ میں تال سم کا فن عربوں کے ذریعہ سے پہونچا۔ یوروپین اصطلاح میں "تال" کو "Hoquetus" یا "Hochetus" "Ochetus" اور ماہرین علم الالسنہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لفظ "الیقاعات" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

برٹش میوزیم میں ایک نہایت اہم مخطوطہ موجود ہے جس کا نام "لامعلوم الاسم نمبر ۴ (Anonymous IV) ہے اور اس کی تاریخ ۱۲۷۰ء تا ۱۲۸۰ء بتائی جاتی ہے۔ بلحاظ مضمون اس مخطوطہ کا نام (De mensuris et discantu) ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یوروپ کا علم موسیقی عربی علم موسیقی کا زیر بار احسان ہے۔ مخطوطہ مذکور میں جو بزبان لاطینی ہے، سروں کے متعلق دو اصطلاحات "Elmuarifa" اور "Elmuahym" استعمال کی گئی ہیں۔ جو کھلی ہوئی عربی اصطلاحیں ہیں۔ گیارہویں صدی کی ایک لاطینی و عربی لغت میں جس کا نام "Glossarium Latino Arabicum" ہے۔ دو اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق علم موسیقی سے ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں "Elmu.chym" اور "Elmu.arifa" ہیں جو عربی اصطلاحات معلومہ و معروفہ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فرانس میں ونسنٹ ڈی بووے (۱۱۹۰ء تا ۱۲۶۴ء) کی کتاب "Speculum

" Doctrinale " جلد اول فصل ۱۷ میں جگہ جگہ الفارابی سے استناد کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے نظریۂ موسیقی پر عربوں کا کس قدر زبردست اثر پڑا تھا۔ راجر بیکن ایک مشہور انگریز ماہر موسیقی (۱۲۱۴ء تا ۱۲۹۴ء) گذرا ہے۔ یہ بھی اپنے فن میں عربوں کا زیر بار احسان تھا۔ اپنی کتاب موسیقی " Opus Tertium " میں اس نے بطلیموس اور اقلیدس کے ساتھ الفارابی کی عبارتیں نقل کی ہیں اور اس کی کتاب " احصار العلوم " سے بار بار حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی کتاب میں ابن سینا کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ راگ راگنیوں کے ذریعہ سے امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اور والٹر آڈنگٹن (۱۲۸۰ء) تو عرب اساتذۂ فن کا اس قدر معتقد تھا کہ اس نے ابن سینا کو فن موسیقی میں سینٹ گریگوری، سینٹ برنارڈ حتی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے برابر بٹھا دیا ہے۔ اسی طرح جیروم نے جو الفارابی کا نہایت ارادتمند ہے اپنی کتاب " De musica " میں الفارابی کے بہت سے اقوال درج کئے ہیں

سائمن ٹنسٹڈ (۱۳۰۰ء تا ۱۳۶۹ء) جونس ڈی میوریز (۱۳۲۵ء) اور ہان بوائز (۱۴۲۷ء) تک "فن ایقاعات" انگلستان کے ماہرین فن موسیقی کو بخوبی معلوم ہو چکا تھا ڈی ہینڈ لو نے لکھا ہے کہ "صوات واوقاف کے اجتماع سے "ایقاعات" (Hocket) پیدا ہوتے ہیں"۔ اور آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب کسی راگنی یا لحن (melody) میں تان توڑ دی جاتی ہے تو اُسے سم یا " Hocket " کہتے ہیں۔ اور جونس دی میوریز نے عنوان " Hocket " کے ذیل میں عرب ماہرین موسیقی کے .... ایک دوسرے فن کا حال لکھا ہے جو اس کے زمانہ تک موجود تھا اور جسے " Alentada " کہتے تھے۔ یہ اصطلاح بھی عربی اصطلاح "طرد" سے نکلی ہے جس کے معنی ہیں "آواز کو کھینچنا"

خاتمہ پندرھویں صدی کے بعد مغربی یورپ کی موسیقی سے عربی اثر زائل ہو گیا۔ کیونکہ مسلمانان اندلس کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان کا علمی و دماغی انحطاط بھی شروع ہو گیا تھا۔ مگر بایں ہمہ سولھویں صدی تک یورپ میں عربوں کی زبردست شہرت قائم رہی حتی کہ جارج والا نے ۱۵۰۱ء میں اور جارج ریش نے ۱۵۰۸ء میں بھی جب علم موسیقی پر اپنی مشہور کتابیں لکھیں تو انھوں نے جگہ جگہ الفارابی کے حوالے دئے —— الفارابی اور ابن سینا کے بعد تیرھویں صدی میں صفی الدین عبدالمومن نے بھی فن موسیقی میں بیحد شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں ایک جدید حلقۂ درس (School) قایم ہو گیا تھا جنھیں "اصولی" (Systematist) کہتے تھے۔ اس حلقۂ درس کا امام یہی شخص صفی الدین عبدالمومن تھا۔ سرہوبرٹ پیری نے اس ہوائی کی سرگم (Scale) کے متعلق اپنی کتاب فن موسیقی (Art of music) میں لکھا ہے کہ "یہ سرگم سب سے زیادہ مکمل تھی"۔ ہیہولٹز کا بھی یہی خیال ہے کہ اصولیین کا یورپ پر بہت اثر پڑا۔ اور یہ لوگ جو ابتدا سرگم میں "چڑھتی بکھاد" (major 7th) کا استعمال کیا کرتے تھے یہ گویا شاہراہ ترقی میں ایک خاص نشان تھا جہاں سے علم موسیقی نے آگے ترقی کی

تاریخ کا ایک ورق مجہول

زامورہ

(دنیا کا ایک انتہائی بدنصیب شہر)

یوں تو دنیا میں بہت سے دیار و امصار ایسے ہیں جن کے لئے انسانوں نے باہم جنگ و خونریزی سے کام لیا، لیکن اس باب میں زامورہ کو جو تاریخی خصوصیت حاصل ہے وہ شاید ہی دنیا کے کسی مقام کو حاصل ہوئی ہو۔

اس بدنصیب شہر کا محاصرہ کتنی دفعہ ہوا، کتنی مرتبہ اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا اور کتنی بار اس کی فضا لاشوں کے ڈھیر سے متعفن کی گئی؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ بیس مرتبہ تو اہل عرب نے حملہ کر کے "جلالقہ" کے قبضہ سے اُسے نکالا۔ اور بیس ہی مرتبہ "جلالقہ" نے عربوں سے اس کو چھینا، یہاں تک کہ آج تاریخ میں اس کا نام "آتش و آہن" کے حرفوں سے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی مسماریاں و بربادیاں اب بھی ان واقعات کو دہرا رہی ہیں اور وہاں کے آثار اور ویران قلعے ان تمام دردناک داستانوں کی زندہ تصویریں ہیں۔

عرب یہاں فاتحانہ داخل ہوئے، لیکن الونزو ہسپانوی نے پھر ۷۴۸ء میں اُسے چھین لیا۔ اس کے بعد ۸۱۳ء میں دوبارہ اہل عرب قابض ہوئے اور پھر یہ مقام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۹۳۹ء میں عبدالرحمان ناصر نے پھر واپس لیا مگر اہل ہسپانیہ دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔ الغرض اسی طرح بارہا عرب کا قبضہ یہاں ہوا اور ہر بار ۹۶۳ء ۹۸۴ء اور ۹۸۶ء میں ان کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ عہد فرڈینانڈ اول میں جو لقب "کبیر" سے یاد کیا جاتا ہے، یہ مقام مستقلاً حکومت اسپین میں داخل ہو گیا اور ۱۰۶۱ء میں اُس نے یہ شہر اپنی حسین و محبوب بیٹی ڈونیا اوراکا کو ہدیہ میں دیدیا۔

لیکن چونکہ اس بدنصیب شہر کی قسمت ہی میں بربادی و خونریزی لکھی ہوئی ہے اور اس سے قبل عرب و جلالقہ وغیرہ کے خدا معلوم کتنے بچے کتنے بوڑھے اور کتنی عورتیں یہاں ذبح کی جا چکی تھیں، اس لئے یہاں کے خونریز و خون آشام دیوتا نے اس مرتبہ بھی وہی قربانی طلب کی اور جب ۱۰۶۵ء میں فرڈینانڈ مر گیا تو اوراکا کے بھائی نے اس شہر پر قابض ہونے کے لئے جنگ شروع کر دی یعنی اگر اس سے قبل عرب و اہل اسپین باہم دست و گریبان

نظر آتے تھے، تو اب خود اہل ہسپانیہ آپس ہی میں اس بدبخت شہر کے لئے خونریزی پر آمادہ ہوگئے۔

اس وقت زامورہ جلالقہ اور عرب کی ملی ہوئی آبادی پر مشتمل تھا اور ان دونوں کے تعلقات باہم اس قدر شدید ہوگئے تھے کہ کوئی امتیاز نسل و مذہب کا باقی نہ رہا تھا اور ان لوگوں میں زاموری ہونے کی نسبت اسقدر قوی ہوگئی تھی کہ وہ اس کے سامنے کسی اور فرق و امتیاز کو دیکھتے ہی نہ تھے۔ اسی لئے جب کوئی لشکر زامورہ پر حملہ آور ہوتا تھا تو تمام آبادی بلا تفریق مذہب و نسل متحد ہو جاتی تھی۔ اور کوشش کرتی تھی کہ قتل و خونریزی تک نوبت نہ پہونچے۔

اس لئے جس وقت فرڈنیانڈو کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو اُس نے زامورہ کی طرف جو اس کی بہن کے قبضہ میں تھا فوجیں روانہ کیں اور حکم دیدیا کہ شہر کا محاصرہ اس وقت تک برابر جاری رکھا جائے، جب تک شہر کے دروازے نہ کھولدئے جائیں اور قلعہ پر قبضہ نہ ہوجائے۔ اہل زامورہ حاکم شہر کے پاس گئے اور اس سے التجا کی کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے دروازے کھولدئے جائیں اور بھائی بہن کی جنگ میں غریب اہل شہر کو قتل و ذبح کی مصیبت میں نہ مبتلا کیا جائے۔ لیکن حاکم شہر نے ان کی التجاؤں پر توجہ نہیں کی اور پورے عزم کے ساتھ مقابلہ کا ارادہ کرلیا۔

فریقین کے لشکر کو میدان جنگ میں چھوڑئے اور زامورہ کی فصیل و خندق کے گرد جو انسانی خون بہ رہا ہے اس سے قطع نظر کرکے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے اندر آئے اور دیکھئے کہ وہاں کیا ہورہا ہے۔

ایک مکان سے جو گلی میں واقع ہے نہایت ہی دردناک آواز آرہی ہے لیکن اس طرح جیسے کوئی تکلیف کو برداشت کرتے کرتے مجبور ہو جانے پر بھی پوری آزادی سے فریاد نہ کرسکے۔ یہ مکان محمد بن عبداللہ اموی کا ہے اور یہ آواز اسی کے خاندان میں سے کسی فرد کی ہے۔

کسی وقت یہ خاندان بہت بڑا خاندان تھا اور محمد بن عبداللہ جب جنگ کے لئے باہر نکلتا تھا تو کم از کم بیس کی تعداد میں اس کے بیٹے پوتے وغیرہ گھوڑوں پر سوار اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، اور دس بارہ عورتیں بھی ہمرکاب ہوتی تھیں تاکہ زخمیوں کی تیمارداری کریں۔ آخرکار محمد بن عبداللہ ایک جنگ میں کام آگیا اور رفتہ رفتہ اس کے بیٹے پوتے بھی اسی طرح ختم ہوگئے۔ اب اس گھر میں ایک چہل سالہ عورت جو محمد بن عبداللہ کی نواسی ہے سکونت پذیر ہے۔ اس کی ایک لڑکی فاطمہ ہے جس کی عمر دس سال کی ہے۔ اور ایک لڑکا ہے جو عمر کے آٹھویں سال میں ہے۔ فاطمہ کا باپ ایک بار جو شکار کے لئے باہر نکلا تو واپس نہیں آیا۔ غالباً ڈاکوؤں نے اسے مار ڈالا۔ اسی وقت سے اس خاندان کی تباہیاں شروع ہوئیں۔ خیر فقر و فاقہ کی مصیبت تو تھی ہی قدرت نے

صحت بھی ان کی چھین لی اور ماں بیٹے دونوں صاحبِ فراش ہوکر حرکت سے مجبور ہوگئے - فاطمہ ہنوز اٹھ بیٹھ سکتی تھی اور حیران تھی کہ اس فقر و فاقہ کی بلا کیونکر دور کرے اور اپنی بیمار ماں اور دم توڑنے والے بھائی کیلئے کہاں سے کھانے کا انتظام کرے -

ایک رات معصوم فاطمہ باہر نکلی اور شہر پناہ سے گزر کر محاصرہ کرنے والی فوج کے کیمپ میں داخل ہوگئی، جب وہ سپہ سالار کے خیمہ کے قریب پہونچی تو سنتری نے اُسے روک کر پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے - اُس نے جواب دیا کہ میں سپہ سالار سے ملنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک نہایت ضروری بات مجھے اس سے کہنا ہے -

یہ سپہ سالار روڈرج بیوار تھا جو تاریخ اسپین میں غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور جو اپنی شجاعت و اقدام کی وجہ سے اہلِ عرب میں بھی سید کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا - سنتری نے یہ سنکر اس کو جانے کی اجازت دیدی اور چند منٹ میں وہ ایک شخص کے سامنے پہونچگئی جس کے چہرہ پر سوائے داڑھی کے اور کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی - اس نے لڑکی کو تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ دیکھا اور پھر بیٹھنے کا حکم دیا - اس کے بعد بھی دیر تک وہ فاطمہ کو دیکھتا رہا اور پھر پوچھا کہ "کیا چاہتی ہے"

فاطمہ نے کہا — "میں ایک عرب کی بیٹی اور ایک عرب کی پوتی ہوں اور شہر زامورہ ہی کی روشنی میں میں نے آنکھ کھولی اور یہیں پرورش پائی - میرا خاندان یہاں اس زمانہ سے مقیم ہے جب عبد الرحمان ناصر نے یہاں فاتحانہ داخل ہوکر اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا اور آج تک محمد بن عبد اللہ اموی اپنے مورث اول کے دین اور اسکی تعلیمات سے ہمارے خاندان کے کسی فرد نے انحراف نہیں کیا - اس خاندان کا ایک ایک فرد زامورہ کی حفاظت وحمایت میں ——— فنا ہوچکا ہے - اور اب سوائے میرے جسے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں یا ایک صاحبِ فراش ۴۰ سالہ عورت کے جو میری ماں ہے اور ایک آٹھ سال کے لڑکے کے جو میرا بھائی اور قریب الموت ہے - کوئی اور شخص خاندان میں باقی نہیں رہا - ہم لوگ اب ننگے ہیں بھوکے ہیں، بیمار و لاچار ہیں اور شاید صرف چند دن کے مہمان - لیکن اے سردار میں آپ سے روٹی طلب کرنے نہیں آئی، کپڑے کا سوال کرنے نہیں آئی کیونکہ دستِ سوال دراز کرنے سے بہتر یہ ہے کہ انسان مرجائے - بلکہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنے آئی ہوں اور وہ یہ کہ ہم لوگوں کو شہر سے نکل جانے کی اجازت دیجائے اور اہلِ لشکر کو ہدایت کر دیجائے کہ وہ ہمارے مزاحم نہ ہوں - میں اس عنایت کے عوض میں آپ کو ایک زمرد کا ٹکڑا دونگی جو اب تنہا یادگار، ہمارے خاندان کے زمانۂ ثروت کی باقی رہگیا ہے - آپ یہ زمرد قبول کیجئے اور اس کے عوض مجھے ایک گھوڑا دیجئے تاکہ اُسپر اپنی بیمار ماں اور صاحبِ فراش بھائی کو بٹھا کر لیجاؤں"

یہ سنکر سردار کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بولا کہ "لاؤ زمرد مجھے دو، تمھاری خواہش پوری

کردی جائے گی "۔ فاطمہ نے اپنی مٹھی کھول کر زمرد کا ٹکڑا سردار کو دیا اور بولی کہ ۔ لو یہ تمھارے گھوڑے کی قیمت ہے، میں کسی ہسپانوی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتی "۔

فاطمہ اپنی ماں اور بھائی کو گھوڑے پر سوار کر کے خود بھی پیدل ساتھ چل رہی ہے اور تین سوار ہسپانوی لشکر کی حفاظت کے لئے ساتھ ہیں ۔ جب لشکر کے حدود سے یہ مختصر سا قافلہ گزر گیا ۔ اور مزاحمت کا اندیشہ باقی نہ رہا تو یہ لوگ ایک جگہ رُکے اور ان تین سواروں میں سے ایک سوار آگے بڑھکر فاطمہ سے مخاطب ہوا کہ " اے لڑکی تو نے ایک گھوڑا خرید کر اپنی ماں اور بھائی کو سوار کرا دیا اور باوجود ہمارے اصرار کے تو نے اپنے لئے کوئی سواری قبول نہ کی اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا ۔ اب کہ ہم تم جدا ہو رہے ہیں، میں ایک التجا تجھ سے کرتا ہوں، امید ہے کہ تو قبول کریگی "۔

یہ کہکر سوار نے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھائی تو فاطمہ دیکھکر حیران رہگئی کہ یہ تو خود سپہ سالار ہے جس سے اُس نے گفتگو کی تھی ۔ اس نے مسکراتے ہوئے زمرد کا ٹکڑا فاطمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ " اس کو اپنے ہی پاس رکھو کیونکہ یہ تمھارے خاندان کی عزیز یادگار ہے، اور میں بھی اس یادگار کا احترام کرتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اہل عرب جو مجھے سید کے لقب سے یاد کرتے ہیں واقعی خود بھی سردار و سید ہیں اور ان کی یادگار کا احترام مجھ پر واجب ہے "

فاطمہ نے نم آنکھوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے، زمرد واپس لیا اور بولی کہ اے سردار واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے تجھے سید کا لقب دیا انھوں نے غلطی نہیں کی، تو واقعی اسی کا مستحق تھا "

یہ کہکر فاطمہ نے اپنا راستہ اختیار کیا اور زاموره کو آگ اور خون سے کھیلنے کے لئے ہمیشہ کے واسطے اپنے پیچھے چھوڑ گئی ——



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ ـــ ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۲　　فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۲ء　　شمارہ ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۲	ستمبر ۱۹۳۲ء	شمار ۳

ملاحظات

تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد ۲۰ راگست کو میں پھر لکھنؤ آگیا اور آفتاب کو قہر و جلال کے جس صبر آزما عالم میں چھوڑ کر گیا تھا واپس آکر پھر اُسی جانگداز کیفیت غیظ و غضب میں پایا۔ سنا ہے کہ میری غیبت میں یہاں بارش بھی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں بھی چلیں، لیکن ——"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"—— مجھے کیا جب تک یہاں رہا آفتاب کی گرم نگاہی کا شکوہ طراز بنا رہا، حیدر آباد پہونچا تو وہاں کی سرد فضا میں بہت سی دل دکھانے والی تمناؤں کا حسرت گزار —— الغرض وہ شخص جس کے لئے "غمزۂ ناہید" بھی "قہر مریخ" کے برابر ہو، اس کو شکوہ و شکایت کا کیا موقعہ؟

جس زمانہ میں حیدر آباد پہونچا وہ زمانہ تھا اربعین محرم کے بعد کا میلاد نبوی کا اور گیارہویں کا (جسے یہاں یازدہم شریف کہتے ہیں) کہیں مجالس عزا برپا ہو رہی تھیں، تو کسی جگہ ولادت نبوی کی تقریب میں محافل وعظ کا

اہتمام ہو رہا تھا، کسی کے دولت کدہ پر اگرڈھولک کی تھاپ بزم حال وقال میں گرمیاں پیدا کر رہی تھی، تو کسی طریقت
خانہ میں "کرامات غوثیہ" کے اذکار سے لوگوں کے جسموں پر "قشعریرہ" طاری کیا جا رہا تھا۔ الغرض جدھر دیکھئے
ایک ہنگامہ تھا نمایش مذہبی کا، آرائش عقیدت کا، پرستش خیال کا، فنا دگی عقل و روح کا اور شیفتگی احساس و
اعتقاد کا ـــــ تمام اکناف ہند سے علماء و مشائخ، فقراء و صوفیہ، واعظین و مرشدین مختلف وضع و لباس
مختلف سج دھج، اور مختلف اہتمامات فنی سے مسلح و آراستہ کھنچ کھنچ کر یہاں آرہے تھے۔ اور سلسلۂ وعظ و تبلیغ
رشد و ہدایت پوری گرمی اور گہما گہمی کے ساتھ جاری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر چودھویں صدی ہجری کا
کوئی قطعۂ زمین حشر کے دن صرف اعلاء کلمۃ الحق کی منطقی حجت کی بناء پر سند مغفرت پانے والا ہے تو شاید ہی
سرزمین دکن کے مقابلہ میں کسی اور قطعۂ ارض کو اولیت کا فخر حاصل ہو ـــــ پھر یہی نہیں کہ ان اکابر علم و فضل
اور ان اعاظم شریعت و طریقت کا وقت بالکلیہ خدمت دین و مذہب ہی میں "خاشعانہ و خاضعانہ" طور پر بسر
ہوتا ہو، بلکہ وہ بفحوائے "ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ" مادی و تمدنی زندگی کی فلاح کے لئے بھی اسی
"فدویانہ و سائلانہ" انداز سے منہمک نظر آتے ہیں جو غالباً دولت کی طرف سے اولین خراج کے طور پر ہر شخص سے
وصول کیا جاتا ہے ـــــ

صبح کی نماز اور اوراد و اشغال کے بلند بانگ پروپگنڈا کے بعد موٹروں میں بیٹھ کر (جن کے متعلق انھیں
مطلق خبر نہیں کہ اُن کا پٹرول کہاں سے اور کتنا آتا ہے) امراء کے دولتکدوں پر پہونچنا، ان کی فقیر دوستی
و تصوف نوازی کی تعریف میں پہلے ایک قصیدہ منثور پڑھنا اور پھر لاہوت و جبروت، ابدیت و ازلیت
عبدیت و معبودیت کے عجیب و غریب نکات بیان کرکے، اشارتاً و کنایتاً اپنی ہستی کو مبدء فیاض کے تمام
برکات و فیوض کا مرکز حقیقی اور "مہبط انوار الٰہی" قرار دینا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کوئی آسان بات ہے؟
نہ انکی زبان تھکتی ہے نہ دماغ، بیٹھے بیٹھے نہ اُن کے اعضاء میں خستگی و تعطل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نہ
معدہ میں "تکاثف ریاح" کی۔ صاحب خانہ پہلو پر پہلو بدل رہا ہے لیکن ان کی "مربع نشینی" میں مطلق کوئی
فرق نہیں آتا، وہ کسی نہ کسی بہانہ سے زنانخانہ کے اندر چلا جاتا ہے، لیکن یہ مذہبی "قرق امین" اسی تیور سے
ہر ہر چیز کا جائزہ لیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ پھر باہر آتا ہے اور اپنے آپ کو پھر اس انداز سے اُن کے سپرد
کر دیتا ہے۔ گویا کہ غریب پر کوئی عمل جراحی ہونے والا ہے ـــــ

دوسرے اہل دنیا و اہل غرض بیٹھے ہوئے منھ تک رہے ہیں، موقع کے منتظر ہیں، لیکن ان بے غرض
حضرات اہل دین کی گرفت ایسی معمولی نہیں ہوتی کہ کوئی آسانی سے چھوٹ جائے۔ آخر سب لوگ سلام کرکے
رخصت ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو تھکا کر خود کبھی نہ تھکنے والا اللہ کا خاص بندہ اپنے آپ کو "قطب وقت"

ثابت کرنے کے لئے بدستور ڈٹا رہتا ہے۔ خواہ مغرب کی نماز قضا ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے —— داستان امیر حمزہ میں "تسمہ پا" مخلوق کے واقعات دیکھ کر یقین نہ آتا تھا، لیکن حیدر آباد میں اس کا مشاہدہ روزانہ ہو سکتا ہے۔ آپ جس امیر کے دربار میں چلے جائیے کوئی نہ کوئی تسمہ پا وہاں ضرور موجود ہوگا۔ اور اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب وہ آئے گا تو مصافحہ ضرور کریگا اور قریب ترین نشست پر قابض ہو جائیگا مزاج پرسی کے بعد ہی "گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر اپنے مواعظ و انہماکات مذہبی کی داستان چھیڑ دیگا اور پھر جو کرامات اولیا و خوارق عادات کا ذکر شروع کریگا تو اس وقت تک دم نہ لیگا جب تک سارے مجمع کو فرط حیرت سے "صنمکدہ" نہ بنا دے ——

ان حضرات کے مواعظ کیا اور کس قسم کے ہوتے ہیں ؟ اب اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔ کیونکہ تیسرے درجہ کا تمام وہ لٹریچر جسے نہ "صحت تاریخی" سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ "استشہاد قرآنی" سے ان کے نوک زبان ہوتا ہے اور شاید "روما و یونان" کے "صنمیات" میں بھی وہ حکایات نہ پائی جاتی ہوں جنھیں یہ علمبرداران مذہب، تاریخ اسلام و مذہب اسلام سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔

ایک صاحب نے جو بڑے پایہ کے محقق و مورخ مانے جاتے ہیں، نمرود اور جناب ابراہیم کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب نمرود نے اُن کو آگ میں ڈالنا چاہا تو سلطنت کے طول و عرض میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ ہر شخص کا سالانہ خراج معاف ہے بشرطیکہ وہ ایک گٹھا لکڑی کا لا کر جمع کر دے۔ میں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ ایک شخص کے جلانے کے لئے لکڑی کے اتنے انبار کی کیا ضرورت تھی اور جب تمام ملک کے آدمیوں نے اس کی فراہمی میں حصہ لیا ہوگا تو یہ انبار زمین کے کتنے حصہ کو محیط ہوا ہوگا اور نمرود کو کتنا انتظار کرنا پڑا ہوگا پھر یہ کہ وہ کتنا بڑا میدان رہا ہوگا جہاں اتنی لکڑی جمع کی گئی ہوگی، اور جب اتنے بڑے انبار میں آگ دی گئی ہوگی تو اس کی لپٹ سے صحرا کے کتنے جانور جل کر راکھ ہو گئے ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا خالص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وعظ فرما رہے تھے انداز بیان میں خاص دلکشی رکھتے تھے، آیات قرآنی کو پوری قرأت کے ساتھ پڑھتے تھے، آواز کے نشیب و فراز میں ایک ملہمانہ کیفیت پیدا کرنے پر پوری طرح قادر تھے، لیکن جو کچھ وہ فرما رہے تھے اُسے اسلام سے کیا تعلق تھا، تاریخ سے کتنا لگاؤ تھا، اس کا اندازہ اس نمرود والی حکایت سے ہو سکتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اُن کی قیام گاہ پر جا کر کسی وقت دریافت کروں کہ "مولانا، قرآن پاک میں تو نمرود کا نام کہیں نہیں آیا، پھر یہ نام آپ نے کہاں سے لیا اور جن روایات کی بنا پر یہ نام لیا جاتا ہے ان کی صحت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، جبکہ جناب ابراہیم کا حمورابی کے عہد میں ہونا پایا جاتا ہے اور نمرود کے زمانہ کو اس عہد سے کوئی واسطہ نہیں" ——

یہ بھی دریافت کرنے کو جی چاہا کہ " اسلام میں جو روایات جناب ابراہیم کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ کس حد تک توریت کے بیان سے علیحدہ ہیں اور صحف موسیٰ (pentateuch.) اور یہودیوں کی کتاب مدراش ربا میں جو حالات جناب ابراہیم کے دیئے ہیں، کلام مجید کس حد تک ان کا مصدّق و منکر ہے - لیکن یہ سمجھ کر کہ اس گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا خاموش رہا اور ہندوستان کے جہل کو دعا دینے لگا جسکے بدولت اتنے لوگوں کا پیٹ چل رہا ہے -

---

اس سے قبل فقر و درویشی اور علم و فضل پر ایک ایسا دور آ چکا ہے جب وہ دنیاوی جاہ و ثروت کو کمال بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا تھا اور بڑے بڑے امراء و سلاطین کو بھی ان کی بوریا نشینی تک باریاب ہونے کا موقع نہ ملتا تھا - لیکن اگر آپ کو اس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا ہو تو حیدر آباد چلے جایئے اور دیکھئے کہ کیسا کیسا مدعی فضل و کمال، کیسا کیسا صوفی "مشائخ" امراء کے دربار میں سائلانہ انداز سے پہونچتا ہے اور کس کس طرح تملق و چاپلوسی سے کام لیکر دین و مذہب کا سودا کرتا ہے ـــــ وہی عالم و صوفی، وہی رہبر مذہب و طریقت جس سے اگر آپ اس کے مدرسہ و خانقاہ میں ملنے جائیں تو یہ ظاہر ہو کہ شاید یہ کوئی دوسرا خدا ہے جو انتہائی کبر و نخوت کے ساتھ تخت خدائی پر متمکن ہے - ہاں وہی عالم و صوفی، آپ کو معلوم ہے کہ حیدر آباد کے کسی امیر کی محفل میں پہونچکر کیا چیز ہو جاتا ہے ـــــ

یہ خدا یہاں پہونچکر ایسا ذلیل بندہ بنجاتا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی "کمینہ چاکر" دنیا میں پایا جائے اور یہ فرعون یہاں درباریوں کی صف میں پہونچکر اس درجہ بجوج، اس قدر "خاکسار و فدوی" نظر آتا ہے گویا کہ وہ غلامانِ زورق[1] (Galley Slaves) میں سے کوئی مصیبت زدہ غلام ہے - غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ان حضرات کی یہ ایکٹنگ (تمثیل) کس مدعا کو لئے ہوئے ہوتی ہے ـــــ اگر آپ کاغذات سرکاری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنے ماہانہ وظائف و سالانہ عطیات ان حضرات کو ملتے ہیں اور یہ اپنے اعزہ و متوسلین کے لئے ملازمتیں حاصل کرنے میں کس قدر کامیاب ہوتے ہیں ـــــ

---

[1] یوروپ میں سولھویں اور سترھویں صدی کے اندر رواج تھا کہ اسیران جنگ یا اور دوسرے غلاموں سے کشتی رانی کا کام لیتے تھے - یہ غلام زنجیروں سے بندھے بندھے کشتیاں چلاتے تھے اور نہایت سخت تکالیف میں مبتلا کئے جاتے تھے " Galley. " اس کشتی کا نام تھا جہاں وہ کام کرتے تھے - اس لئے اس کا ترجمہ " غلامان زورق " کیا گیا - (زورق بہ معنی کشتی) -

میرا قیام بدستور مولانا ہوش بلگرامی کے بنگلہ پر رہا اُن کے خلوص وکرم کی داستان چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں تو جو کچھ ہے میرا ہے - لیکن اس مرتبہ ان کی وساطت سے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ مجھے ملی کہ اس کا ذکر نہ کرنا غالباً کفران نعمت ہوگا - یوں تو ہر بار سفر حیدرآباد کے سلسلہ میں کسی نہ کسی قابل ذکر ہستی سے ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن اس مرتبہ ایسی ذات گرامی سے اُنھوں نے تعارف کرایا کہ آخر کار میں ان تمام تکلیف دہ مناظر کو جن کا ذکر ابھی ابھی کر چکا ہوں، بھلا دینے پر مجبور ہو ہی گیا - یعنی ——— راجہ نارائن پرشاد صاحب بہادر -

آپ صدر اعظم بہادر کے حقیقی بھانجے ہیں اور بیگم پیٹ میں جو بلدۂ حیدرآباد سے دور چھاؤنی سکندرآباد کے علاقہ میں واقع ہے، نہایت ہی خاموش و پر لطف زندگی بسر کرتے ہیں - میں حیران ہوں کہ وہ شخص جس نے ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی ہو، جاہ و دولت کے گہوارہ میں پرورش پائی ہو، غلامان زریں کمر و کنیزان سمن بر کے حلقہ میں جس کا نشو و نما ہوا ہو، جس کو "جور استاد" کے مقابلہ میں "مہر پدر" سے زیادہ واسطہ پڑا ہو اور جسے ایک محدود جماعت و مختصر سرزمین میں مدارج حیات بسر کرنے کی وجہ سے بہت کم موقع حیات انسانی کے مطالعہ کا ملا ہو - وہ کیونکر ایسا بہتر انسان بن سکتا ہے - سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ نتیجہ ہے اُن کے خال محترم (سر مہاراجہ بہادر) کی صحیح تربیت کا اور خود راجہ صاحب کی فطری اہلیت کا جو "مجبور اکتساب" طبقہ کے لوگوں میں بھی بہت کم نظر آتی ہے، چہ جائیکہ طبقۂ امراء میں ——— سچ ہے - "این سعادت بزور بازو نیست" ———

راجہ صاحب کا پاکیزہ ذوق ادب، فنون لطیفہ میں انکی بالغ نظری، وسعت مطالعہ کے ساتھ اُن کی نگاہ نفاذ، ان حقیقتوں کا تھوڑا سا علم تو مجھے اول ہی دن اُن کی گفتگو سے ہو گیا تھا اور پھر اس کی تصدیق ان کی لائبریری کو دیکھ کر ہوئی جو ہر فن کی بہترین کتابوں سے آراستہ ہے - لیکن حق الیقین کا مرتبہ تو اس خنک چاندنی رات میں ہوا جب ان کی فطرت جمیل بالکل عریاں تھی ——— اور عریاں بھی بالکل اُس طرح جس کو کسی شاعر نے ایک خاص کیفیت کے ماتحت ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ :-

بہ بزم بادہ گریباں کشودنش نگرید
خوشا بہانۂ مستی، خوشا رعایت شوق

درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی، سرد ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکے، دکن کی بھیگی ہوئی رات کا وہ لطیف نم (جیسے کوئی نہانے کے بعد کچھ خشک اور کچھ بھیگے ہوئے بال لئے ہوئے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے) آبادی سے بہت دور، خاموش و پر سکون فضائیں، تین یک رنگ دلوں کا یکجا جمع ہو جانا ——— اور شعر و ادب یا کسی ملکۂ شعر و ادب کا موضوع گفتگو قرار پانا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب اس رات کی

صبح کبھی نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو غالباً میر کی اس کیفیت کو لئے ہوئے کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

راجہ صاحب نے جیسے جیسے لطیف اشعار فارسی اردو کے اس صحبت میں سنائے وہ قیام دکن کے زمانہ میں غالباً میرے اور ہوش دونوں کے لئے بالکل نئی چیز تھے ــــــ لے وقت تو خوش کہ وقت ناخوش کردی ــــ بہرحال سرزمین دکن میں میرے لئے یہ ایک اور نئی وجہ کشش پیدا ہوگئی ہے اور منتظر ہوں کہ دیکھئے یہ لطیف صحبت پھر کب نصیب ہوتی ہے

غالباً ناشکری ہوگی اگر اس سلسلہ میں مولوی محمد میر خاں صاحب غربت' ام ۔ اے کا ذکر نہ کروں جنھوں نے ایک شام مجھے مدعو کر کے لذت روحانی سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا۔ غربت صاحب سے یوں تو میرے غائبانہ مراسم ایک زمانہ سے ہیں لیکن "مشاہدۂ ذات" کا موقع اسی مرتبہ ملا۔ آپ حیدرآباد میں اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل کے عہدہ پر ممتاز ہیں اور نہایت اچھا ذوق شعر و ادب کا رکھتے ہیں۔ آپ ہی کے وساطت سے ایک اور گرانمایہ ہستی ڈاکٹر طاہر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا' آپ نظام کالج میں لاطینی اور فارسی زبان کے پروفیسر ہیں اور یوروپ سے اتنی زبانیں سیکھ کر آئے ہیں کہ اگر آپ کو برج بابل (Tower of Babel) کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا ۔ نہایت آزاد خیال ۔۔ روشن فکر انسان ہیں اور موسیقی کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں ۔ آپ نے متعدد بار میرے پاس آنے کی زحمت گوارا فرمائی' لیکن مجھ بدنصیب کو ایک بار بھی "بازدید" کا موقعہ نہ ملا خدا معلوم کیا کیا باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا ۔ بہرحال "اگر تقدیر دل کا پھیر ا پھر کبھی ہوا تو غربت کے دولت کدہ پر ہو کر یہ حسرت بھی پوری کرونگا۔

۱۸ کی صبح کو جب ریل میں آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میں نے اخبار کی جستجو کی تاکہ ۱۷ کا وہ اعلان حکومت دیکھوں جس میں فرقہ وارانہ نیابت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کانپور پہونچکر اخبار لیا اور نہایت بیتابی سے اس نقشہ کو دیکھنے لگا جس میں اقلیت و اکثریت کی نیابت کے اعداد و شمار دیئے گئے تھے ۔ یہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حکومت سوائے جداگانہ انتخاب کے کسی اور طریق کار کو پسند کر ہی نہیں سکتی' لیکن اس کا علم نہ تھا کہ یہ فیصلہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے اس درجہ ناقابل اطمینان ثابت ہوگا ــــ اعلان میرے سامنے تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا ایک دل کے اس سے زیادہ ٹکڑے کرنا ممکن ہیں ــ پنجاب کے سکھ اور ہندو نالاں ہیں کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ حق نیابت دیا گیا' مسلمان کہہ رہے ہیں کہ ہماری کثرت آبادی کا بھی کافی لحاظ نہیں کیا گیا' یہی حال بنگال اور سرحدی صوبہ کا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے کہ حق نیابت کے فیصلہ سے نہ وہ خوش ہیں نہ ہندو ۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مسلمانوں کو بھی شکایتیں ہیں جو نیابت وغیرہ میں ہندوؤں کو ہیں' الغرض حیرت کا مقام ہے کہ یہ فیصلہ مسلمانوں میں نہ صرف حافظ ہدایت حسین صاحب

اور مولوی شفیع داؤدی کے لئے ناقابل اطمینان ثابت ہوا بلکہ حد یہ ہے کہ ڈاکٹر شفاعت احمد خان اور بیگم شاہنواز بھی زیادہ مطمئن نہیں۔ حکومت کو معلوم تھا اور وہ اس سے قبل اپنا خیال ظاہر کر چکی تھی کہ اس فیصلہ سے سب کو خوش کرنا ممکن نہیں، لیکن واقعی یہ ایک جدید اکتشاف ہے کہ وہ کسی ایک کو بھی خوش نہ کر سکی۔ تاہم اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کی ذمہ دار حکومت ہند ہے، کیا قابل الزام برٹش راج ہے؟۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ جو کچھ خطا ہے وہ صرف ہماری ہے کہ ہم خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکے اور مخلوط انتخاب کی امن پسند صورت کو چھوڑ کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ اختیار کیا جو کسی طرح کسی کو مطمئن نہیں کر سکتا —— ظاہر ہے کہ حکومت نے بالکل مجبور ہو کر یہ ذمہ داری اُس وقت اپنے سر لی جب تمام جماعتوں نے متفقہ طور پر کہدیا کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اب شکوہ و شکایت بیکار ہے اور ہم کو یہ عذاب برداشت کرنا پڑیگا جس کو خود ہم نے مول لیا ہے۔ اعلان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اب بھی یہ فیصلہ حکومت کا منسوخ ہو سکتا ہے اگر اہل ہند کوئی متفقہ مطالبہ پیش کریں، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ حکومت کی یہ انصاف پسندی اور جرأت اخلاق کس وثوق کی بنا پر ہے جس طرح مہاتما گاندھی نے سادہ کاغذ پر دستخط کر کے مسلمانوں سے کہدیا تھا کہ تم جس متفقہ فیصلہ کو پیش کروگے میں کانگریس کی طرف سے منظور کر لونگا، بالکل اسی طرح حکومت کا یہ کہنا ہے۔ کیونکہ مہاتما گاندھی خوب واقف تھے کہ مسلمان ایسے معمولی احمق نہیں ہیں جو آپس کے اختلافات کو محو کر کے کسی ایک فیصلہ پر متفق ہو جائیں گے اور حکومت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ملک میں اب ہندو مسلمانوں کا کسی ایک امر پر اتفاق کر لینا آسان بات نہیں۔ بہرحال فیصلہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اور انتخاب جداگانہ کی جو بلا ہندوستان پر نازل ہونیوالی تھی کم از کم مزید دس سال کے لئے مسلط ہو گئی۔ اس وقت تو نہیں لیکن مستقبل بتائیگا کہ اس سے ملک کے امن و سکون کو کس قدر آزار پہونچا اور کس کس طرح گوشت سے ناخن جدا کیا گیا۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ ناخوشگوار تعلقات کا علم لوگوں کو ہو ہی چکا ہے، اب سکھوں نے اپنا محاذ علیحدہ قائم کر لیا ہے اور کچھ زمانہ گزرتا ہے کہ آپ باہمی کشاکش کے خطرناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور شیر کو جو اس کا "حصہ" (Lion's Share) ملنا چاہئے ملکر رہیگا۔ پائندہ باد حکومت برطانیہ۔

مسٹر راحت حسین صاحب علوی (سول لائن۔ بریلی) کی ایک نہایت دردانگیز تحریر اس مضمون کی موصول ہوئی کہ اُن کے ایک نہایت ہی عزیز دوست شفقت علی بی اے جولائی ۳۲ء کے نگار میں "مجنوں گورکھپوری کے فسانہ سمن پوش" پڑھ کر دفعۃً قلب کی حرکت بند ہو جانے سے، رحلت کر گئے۔ مراسلہ نگار کا بیان ہے کہ مرحوم نہایت حساس طبیعت رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "یہ افسانہ میری جان لیکر چھوڑے گا" اور آخرکار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مرحوم نے موت سے کچھ دیر قبل افسانہ کے آخر میں سُرخ روشنائی سے بقید وقت و تاریخ یہ شعر لکھا تھا:۔

نہ خوں سینہ سے بہتا نہ یاد گل آتی[1]
عجیب چیز تھی تیر جفا کی دلدوزی

میں نے مراسلہ نگار سے اس شہید ادب کے مفصل حالات زندگی طلب کئے ہیں اور اگر مل گئے تو وہ بھی ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں گے

نیاز

---

[1] یہ شعر میری ایک قومی نظم کا ہے جو عرصہ ہوا کسی رسالہ میں شائع ہوئی تھی (نیاز)

فتح

(افسانہ)

اس کا نام شاہزادی اجیتا تھا اور راجہ نارائن کے دربار کے شاعر نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن جب وہ کوئی نئی نظم راجہ کو سناتا تو اتنی بلند آواز سے گاتا کہ اس کے نغمے بالاخانہ کی چلمنوں کے پیچھے نادیدہ سامعین کے کانوں تک بھی پہونچ جاتے۔ وہ اپنے نغموں کو وہاں تک پہونچانا چاہتا تھا جہاں وہ خود نہ پہونچ سکتا تھا یعنی اس تاروں بھری دنیا میں جہاں اس کی قسمت کا ستارہ حد نظر سے دور ایک حلقۂ نور کے اندر جگمگایا کرتا تھا۔

کبھی کبھی پردوں کے پیچھے اسے کوئی سایہ سا حرکت کرتا نظر آتا اور وہ اس سایہ کی رعنائی کو دیکھکر گھنٹوں محو حیرت رہتا کبھی دور سے چھم چھم کی آواز اس کے کانوں میں پہونچتی اور وہ ان خوبصورت ایڑیوں کا خواب دیکھنے لگتا جنپر پڑے ہوے چھوٹے چھوٹے سنہرے گھونگھروؤں سے ہر ہر قدم پر بارش نغمہ ہوا کرتی ———— آہ وہ گلابی نازک پاؤں! شاعر نے انھیں اپنے دل کے مندر میں بسا لیا تھا جہاں ان کی روح ہر وقت دوزانو رہا کرتی تھی۔ لیکن با اینہمہ وہ کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ پردوں کے پیچھے کس کا سایہ نظر آتا ہے اور وہ نازک ایڑیاں کس کی ہیں جن کے گھونگھروؤں کی صدا اس کے دل کی حرکت کو اپنا ہم آہنگ بنالیتی ہے۔

شاہزادی کی ایک کنیز جس کا نام منجری تھا، جب روزانہ دریا جاتے ہوئے شاعر کے گھر کے پاس سے گزرتی تو ایک آدھ بات شاعر سے بھی ضرور کرلیا کرتی اور جب سڑک سنسان ہوجاتی شام کا دھندلکا زمین پر چھاجاتا، تو وہ چپکے سے اس کے مکان میں داخل ہوجاتی اور فرش کے ایک کونہ پر بیٹھ جایا کرتی تھی ——— بالوں میں عجیب انداز سے گندھے ہوئے پھول اور ہلکے رنگ کا نقاب جبیں افشاں کے ذرے جمکا کرتے، منجری کی وہ خصوصیت تھی جو کسی اور کنیز کو حاصل نہ تھی۔ لوگ اس پر مسکراتے اور سرگوشیاں کیا کرتے کیونکہ شاعر نے (جس کا نام شیکھر تھا) کبھی اس بات کے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ ملاقاتیں اس کے لئے بڑی مسرت کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

منجری کے معنے "پھول کی ٹہنی" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ عام آدمیوں کے لئے اس نام میں یوں بھی کافی دلکشی پائی جاتی ہے، لیکن شاعر کچھ اضافہ کے ساتھ اسے "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کہا کرتا۔ لوگ سنتے اور کہتے "ہائے افسوس"!

شاعر، بہاریہ نظموں میں اس "بہار کے پھولوں کی ٹہنی" کا ذکر ضرور کرتا اور جب راجہ ہنستا تو مسکراتا، اور

شاعر بھی جواباً مسکرا دیا کرتا۔

بادشاہ اس سے پوچھتا "کیا شہد کی مکھی کا صرف یہی کام ہے کہ بہار کے حضور میں بھنبھناتی رہے؟"
شاعر کہتا "نہیں، بلکہ بہار کے پھولوں کی ٹہنی کا شہد حاصل کرنا بھی اس کا کام ہے" اس پر راجہ کے درباری ہنس پڑتے۔ اور سنا گیا ہے کہ شاہزادی اجتیا بھی ہنسا کرتی کہ اس کی خادمہ اپنے نام کے ساتھ شاعر کا نام وابستہ ہو جانے پر خوش ہے۔

اسی طرح دنیا میں جھوٹ اور سچ مل جل جاتے ہیں اور خدا جو کچھ بناتا ہے آدمی اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔

شاعر کے نغموں میں صداقت تھی۔ اس کی نظموں کا موضوع "کرشن" اور اُن کی محبوبہ "رادھا" یعنی ازلی ابدی مرد و عورت تھے، لیعنی وہ درد جو ابتدا سے ہے اور وہ خوشی جس کی انتہا نہیں۔ اس کے نغموں کی صداقت کا ہر شخص معترف تھا اور شاہ سے لیکر گداتک اس کی عزت کرتا تھا۔ شاعر کی نظمیں زبان زد عام تھیں، چاندنی راتوں میں، بہار کی خوشگوار ہواؤں میں، کھڑکیوں سے، کشتیوں سے، عام گزرگاہوں پر، درختوں کے سایوں میں الغرض ہر جگہ اس کی نظمیں گائی جاتی تھیں۔

اسی طرح دن خوشی خوشی گزرتے گئے۔ شاعر اشعار گاتا، راجہ سنتا، لوگ واہ واہ کرتے، شاعر بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے سایہ حرکت کرتا دیکھتا اور دور سے ننھے ننھے طلائی گھنگھروؤں کی آواز سنا کرتا۔۔۔۔۔۔

اسی زمانہ میں ایک اور شاعر جنوب کی طرف سے روانہ ہوا وہ قلمرو امرپور میں راجہ نارائن کے دربار میں حاضر ہوا تخت کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے راجہ کی تعریف میں ایک شعر پڑھا۔ اور پنڈارک (یہی شاعر کا نام تھا) نے مغرورانہ انداز میں جواب دیا "مہاراج میں دربار کے شاعر سے مقابلہ چاہتا ہوں!"

راجہ کے دربار کا شاعر "شیکھر" نہ جانتا تھا کہ مقابلہ کس طرح ہوگا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی مشہور و مغرور پنڈارک کا بھاری بھر کم ڈیل ڈول اس کی کٹار کی سی مڑی ہوئی ناک اور اس کا بڑا سر رات بھر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔

کانپتے ہوئے دل کے ساتھ شیکھر دربار میں داخل ہوا چاروں طرف کرسیاں لوگوں سے پر تھیں شاعر نے اپنے حریف کا خیر مقدم سر جھکا کر ایک تبسم سے کیا۔ پنڈارک نے بھی اس کا جواب سر کے ایک ہلکی سی جنبش سے دیا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا چہرہ اپنے مداحوں کی طرف پھیر لیا۔

شیکھر نے اوپر بالاخانہ کی چلمنوں کی طرف نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا "اگر آج کے مقابلہ میں کامیاب

رہا تو اے میری ملکہ! تیرے ارجمند نام کی عظمت اور بڑھ جائے گی"

نوبت بجنے لگی۔ ہجوم "مہاراج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ راجہ سفید لباس پہنے خزاں کے تیرتے ہوئے ابر کی طرح آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا اور وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہوگئی۔ سر کو اوپر اُٹھا کر، سینہ پھیلا کر اپنی گرجتی ہوئی آواز میں اس نے راجہ نارائن کے مدح میں اشعار پڑھنا شروع کئے۔ اس کے الفاظ کمرہ کی دیواروں سے اس طرح ٹکراتے تھے جیسے سمندر کی لہریں ساحل کی چٹانوں سے، اور معلوم ہوتا تھا کہ سامعین کی پسلیوں سے انکا تصادم ہوکر کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے! جس ہشیاری سے اس نے نارائن کے نام کے مختلف معانی بیان کئے اور ہر ہر حرف کو جس انداز سے اس نے اپنے اشعار میں باندھا اس کو سنکر لوگ متعجب اور دم بخود ہوگئے۔

اس کے بیٹھ جانے کے کچھ دیر بعد تک بھی اس کی آواز ہزاروں خاموش دلوں اور دربار کے بے شمار ستونوں کے درمیان گونجتی رہی۔ فاضل پنڈت جو دور دراز ملکوں سے آئے تھے اپنے داہنے ہاتھ اٹھا کر چلائے "واہ واہ"!

راجہ نے شیکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور شیکھر نے جواب میں اپنی دردمند آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے آقا کی طرف اُٹھائیں اور اس کے بعد زخمی ہرن کی طرح کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا لاغر، نازک بدن ایک ایسے ستار کے مانند تھا جس کے تار ضرورت سے زیادہ تنے ہوں اور صرف چھیڑنے کی دیر ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پہلے چند اشعار تو قریب قریب نامسموع تھے لیکن اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اُٹھایا اور اس کی صاف شیریں آواز لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے لگی۔ اس نے شاہی خاندان کی ان پرانی روایات سے جو ماضی کی دھندلی فضا میں کھو گئے تھے ابتدا کی اور اپنے آقا کے آبا و اجداد کی بہادری اور بے نظیر سخاوت کے کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملا دیا۔ اس نے راجہ کے چہرہ پر اپنی نگاہیں جما دیں اور شاہی خاندان کی محبت خوشبو کی طرح اس کے نغمہ سے نکلی اور تخت کے چاروں طرف پھیل گئی! جب وہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھا تو یہی الفاظ اس کی زبان پر تھے "میرے آقا" میں الفاظ کے ہیر پھیر میں شکست کھا سکتا ہوں لیکن تیری محبت میں نہیں ہار سکتا!"

سامعین کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور سنگین دیواریں "فتح" کے نعروں سے گونج اُٹھیں!!

سر کی ایک پر شکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے جوش کی تضحیک کرتے ہوئے پنڈارک کھڑا ہوگیا اور مجمع کے سامنے اس نے یہ سوال پیش کیا کہ "الفاظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟" اور یکایک کمرہ میں پھر سناٹا چھا گیا۔

اس کے بعد اپنی قابلیت کا معجزانہ اظہار کرتے ہوئے اس نے ثابت کر دیا کہ لفظ ہی ہر چیز کی ابتدا ہے، اُسنے شاستروں اور دوسری مقدس کتابوں کے حوالوں اور اقتباسات کا ڈھیر لگا دیا اور اس طرح لفظ کو زمین و آسمان کی تمام چیزوں سے بلند ثابت کر دیا!...... اور اپنی بلند آواز میں یہ سوال پھر دہرایا کہ لفظ سے برتر دنیا میں کیا چیز ہے؟ اس نے اپنے اردگرد متکبرانہ انداز سے دیکھا۔ کسی کو اس کے مقابل ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور ایک ایسے شیر کے مانند جو اپنے شکار سے شکم سیر ہو چکا ہو بہ آہستگی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت پھر واہ واہ چلائے۔ راجہ حیرت سے خاموش تھا اور شیکھر شاعر اپنے آپ کو اس علم و فضل کے سامنے بالکل بے حقیقت محسوس کر رہا تھا مجلس دوسرے روز کے لئے برخاست ہوئی۔

دوسرے روز شیکھر نے اپنے نغمہ سے ابتدا کی جو اس واقعہ سے متعلق تھا جب پریم کی بانسری کے شیریں ترانے "بندرابن" کی خاموش فضا میں پہلے پہل لہرائے تھے اور عورتوں کو نہ معلوم تھا کہ بانسری کون بجا رہا ہے اور یہ راگ کہاں سے آرہے ہیں۔ کبھی انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ نغمے باد جنوب کے دوش پر سوار ان تک پہونچ رہے ہیں اور کبھی وہ یہ سمجھتیں کہ نغموں کا یہ چشمہ پہاڑ کی چوٹیوں پر تیرتے ہوئے ابر سے ابل پڑا ہے۔ یہ مشرق سے عاشقوں کے لئے پیام محبت لاتیں اور آہیں بنکر مغرب میں جا گرتیں! معلوم ہوتا تھا کہ راگ یکایک چاروں طرف سے ابل پڑا ہے۔ میدانوں اور چمنوں میں، تاریک گلیوں اور ویران سڑکوں میں آسمان کی پگھلتی ہوئی نیلاہٹ میں چمکدار سبز گھاس اور وسیع مرغزاروں میں راگ ہی راگ تھا............ وہ نہ تو اس کے معنی سمجھتیں اور نہ انھیں اپنی دلی خواہشات کے اظہار کے لئے الفاظ ملتے! ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور انکی "زندگی" موت کی خواہشمند معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اس درد و کرب اور خلش روحی سے نجات پا سکتی تھیں!......... شیکھر سامعین کو بھول چکا تھا۔ اسے اپنے حریف سے مقابلہ کا بھی کچھ خیال نہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات کے ہجوم میں "بانسری کے راگ" کا نغمہ گائے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایک ایسی مورت کا خیال تھا جو ایک سایہ سے صورت پذیر ہوئی تھی اور ان گھنگھروؤں کی آواز کا جو اُس کے دل و دماغ میں ہر وقت بسے رہتے تھے.........!!

وہ بیٹھ گیا سننے والے ایک ناقابل بیان مبہم مسرت کی کیفیت سے تھرتھرا رہے تھے اور وہ نعرۂ تحسین و آفریں بلند کرنا بھی بھول گئے۔ جب جذبات کا یہ تلاطم کچھ کم ہوا تو پنڈارک تخت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے حریف سے کہا کہ وہ اس عاشق کی تعریف کرے اور بتلائے کہ وہ معشوقہ کون تھی اس نے اپنے چاروں طرف ایک پُرغرور نگاہ ڈالی، اپنے مداحوں کی طرف دیکھکر مسکرایا اور پھر دوبارہ سوال کیا "کرشن عاشق اور رادھا

مجموعہ کون ہیں؟"

تب اس نے خود ہی اُن ناموں کے مادہ کی تشریح کرنی شروع کی اور ان کے کئی کئی معنے بیان کئے۔ اُس نے اپنے متحیر سامعین کے سامنے کامل ہنرمندی کے ساتھ روحِ انسانی اور علم موجودات کے معموں کو بیان کیا۔ پھر اُس نے ان ناموں کے ایک ایک حرف کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور اپنی بے پناہ منطق سے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بالکل بے معنی کر دیا اور اس نے دوبارہ اس لفظ کو پیدا کر کے اس کا ایک ایسا نیا مفہوم بتایا جو کسی بڑے سے بڑے فاضل کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔

پنڈت وجد کے عالم میں تھے۔ وہ تحسین و آفریں کی صدا زور و شور سے بلند کر رہے تھے۔ اور مجمع بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ آج وہ اپنی آنکھوں سے سچائی کی آخری دھجیاں علم کی عجیب طاقت کے سامنے تار تار ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ اس کے اس عقل فرسا کارنامے کو دیکھکر وہ اتنے خوش ہوئے کہ وہ یہ خیال کرنا بھی بھول گئے کہ آخر ان باتوں میں کچھ حقیقت بھی ہے؟

راجہ دریائے حیرت میں غرق تھا۔ فضا موسیقی سے بالکل خالی ہو چکی تھی اردگرد کی خیالی تازگی اور سبزہ کی جگہ پتھروں نے لے لی تھی۔ لوگوں کو اس دیو کے سامنے جو دنیائے الفاظ و خیالات میں ہر قدم پر مشکلات کو روندتا چلا جاتا تھا اپنا شاعر بالکل طفل مکتب معلوم ہونے لگا۔ انھیں اب پہلی مرتبہ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شیکھر بالکل سیدھی سادھی نظمیں کہتا تھا۔

راجہ نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے شاعر کو دیکھا اور اُسے آخری کوشش کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن شیکھر نے کچھ خیال نہ کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

راجہ ناراض ہو کر تخت سے نیچے آیا اور اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر پنڈارک کے گلے میں ڈال دیا۔ کمرہ مسرت کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ بالاخانہ سے کپڑوں کی سرسراہٹ اور سنہرے گھنگھروؤں کی ہلکی سی آواز آئی۔ شیکھر اپنی جگہ سے اُٹھا...... اور کمرہ سے باہر نکل گیا...........!

چاند زوال پر تھا، رات اندھیری تھی۔ شیکھر نے اپنی نظموں کے مسودے الماریوں سے نکال کر زمین پر ڈھیر لگا دیے ان میں سے بعض اس کی ابتدائی نظمیں تھیں جنھیں وہ تقریباً بھول چکا تھا۔ وہ اوراق الٹ رہا تھا اور کہیں کہیں بعض بعض نظمیں پڑھتا جا رہا تھا۔ اب یہ اسے بالکل بیکار معلوم ہوئیں۔ محض الفاظ، طفلانہ خیالات کا مجموعہ!

اس نے ایک ایک کر کے اپنی کتابیں اور مسودے پرزے پرزے کر دیئے اور ان الفاظ کے ساتھ

نذر آتش کر دیا کہ "مجھ پر اور صرف تجھ پر اے حسن! میں اپنا سب کچھ قربان کرتا ہوں! تیری آگ میرے سینہ میں بیکار سالوں تک بھڑکتی رہی۔ اگر میری زندگی سونا ہوتی تو اس آزمائش سے کندن بنکر نکلتی لیکن یہ روندی ہوئی گھاس ہے اور سوائے ایک مٹھی راکھ کے اب اس کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی!"..........

رات بھیگتی گئی۔ شیکھر نے اپنے مکان کی کھڑکیاں کھولدیں۔ اس نے اپنے بستر پر ان سفید پھولوں کو جنھیں وہ پسند کرتا تھا بچھا دیا اور جس قدر چراغ اس کے پاس تھے ان کو لاکر اپنے کمرہ میں روشن کر دیا۔ اس کے بعد کسی زہریلی بوٹی کا عرق شہد میں ملا کر پی گیا .... اور بستر پر لیٹ گیا!..........

دروازے کے باہر سڑک پر سنہرے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی ہوا کا ایک معطر جھونکا کمرے میں آیا۔

شاعر نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا "میری ملکہ! اپنے غلام پر ترس کھا کر اس سے آخری وقت ملنے آہی گئیں؟"

جواب ایک شیریں آواز میں سنائی دیا "ہاں میرے شاعر میں آگئی ہوں"

شاعر نے آنکھیں کھولدیں اور اپنے بستر کے قریب ایک لڑکی کو دیکھا۔ اس کی بینائی دھندھلی ہوگئی تھی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مورت جس کی حقیقت صرف خیال پر مبنی تھی اور جو اب سے قبل اس کے دل کے مندر میں پوشیدہ طور پر متمکن تھی اب اس کے آخری ساعت میں اس کو دیکھنے کے لئے باہر کی دنیا میں آگئی ہے ——

لڑکی نے کہا "میں شاہزادی اجیتا ہوں"

شاعر انتہائی کوشش کے بعد اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

شاہزادی نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا "مہاراج نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میرے شاعر مقابلہ میں تم ہی کامیاب رہے اور میں تمھارے سر "فتح" کا سہرا باندھنے آئی ہوں!"

اُس نے پھولوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ شاعر بستر پر گر پڑا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی!.......... (ماخوذ)

ایم - زبیر احمد



تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین [illegible] مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان کو جو [illegible] مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے [illegible] مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت [illegible]

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی [illegible] کتاب جس میں [illegible] سے ثابت کیا گیا ہے کہ [illegible] تمدن میں عورت نے [illegible] [illegible] کتاب ہے قیمت [illegible] علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا [illegible] افسانہ [illegible] [illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

فراست الید
مولانا نیاز فتحپوری کی جس کے [illegible] [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول [illegible]

شاعر کا انجام
[illegible] نیاز کے [illegible] [illegible] دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ قیمت علاوہ محصول [illegible]

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے [illegible] شاعری کے [illegible] [illegible] قیمت [illegible]

صحابیات
جس میں [illegible] [illegible] گئے ہیں [illegible] مولانا نے خاص [illegible] میں لکھی ہے [illegible] صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد
[illegible] افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ [illegible] زبان [illegible] سے [illegible] اور حضرت نیاز کا نام [illegible] ہے قیمت [illegible] علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز
[illegible] حضرت نیاز کی [illegible] [illegible] ایک بار [illegible] کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول

قواعد [illegible]
[illegible] حضرت نیاز [illegible] نہایت مفید و عجیب کتاب ہے قیمت [illegible] علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
[illegible] دولت عباسیہ کی [illegible] سیاسیات پر [illegible] [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

المسئلة الشرقیہ
[illegible] مشہور عالم کتاب کا ترجمہ [illegible] یورپ و ایشیا کے [illegible] ترکی و مصر [illegible] انقلاب کی [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

تذکرۂ [illegible]
مولانا عبدالباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات معہ لطائف و ظرائف و انتخابات کلام [illegible] قیمت معہ محصول [illegible]

مثنوی لالۂ [illegible]
[illegible] کی [illegible] کا مکمل ترجمہ [illegible] قیمت معہ محصول [illegible]

مثنوی زہر عشق
[illegible] بہترین [illegible] قیمت [illegible]

فراست التحریر [illegible]
یعنی اردو اور انگریزی [illegible] تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول۔

اس سے قبل جب میں جولائی میں یہاں آیا تھا تو مولانا ہوشؔ بلگرامی اور راجہ نارائن پرشاد صاحب کی لطیف صحبتوں میں تقریباً روزانہ راجہ دھن راجگیرجی صاحب کا ذکر سنا کرتا تھا۔ کیونکہ راجہ صاحب موصوف اُس وقت بنگلور و جوارِ بنگلور کی دلکش فضا میں سیاحت فرما رہے تھے اور میری واپسی تک مراجعت نہ ہوئی تھی۔

اس مرتبہ لکھنؤ چھوڑنے سے قبل ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ :-

"یوسف گم گشتہ باز آمد بہ کنعاں غم مخور"

اور جسوقت سکندر آباد اسٹیشن پر مولانا ہوشؔ سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے بھی اس کی تصدیق فرمائی۔ ولولۂ شوق کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اولین فرصت میں راجہ صاحب موصوف کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا، لیکن کچھ تو انتظام قیام کی ابتدائی دشواریوں میں الجھے رہنے کی وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ راجہ صاحب موصوف کا مزاج نادرست تھا، یہ حاضری ٹلتی رہی۔ آخر کار وہ دن آیا جس کو میں تاریخ سیاسیات ہند کا نہایت اہم دن قرار دیتا ہوں یعنی ٹھیک اسی دن جب کہ لوگوں کے دل مہاتما گاندھی کی روزہ شکنی کے خیال سے لبریزِ مسرت تھے۔ شام کو مولانا ہوشؔ اور مولوی حکیم مقصود علی خاں صاحب (جو یہاں کے نہایت ہی سربرآوردہ و حاذق اطبا میں سے ہیں اور علاج سے قبل ہی نصف مرض اپنی پرخلوص گفتگو سے زائل کر دیتے ہیں) میری فرودگاہ پر تشریف لائے اور راجہ صاحب موصوف کا فرمان طلب و حاضری سنا کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

آج کل راجہ صاحب اپنے اُس قصر میں مقیم ہیں جو بلدہ کے ایک بعید ترین حصہ میں تعمیر کیا گیا ہے اور جو ماحول کی آبادی و مکانات کو دیکھتے ہوئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو شب تاریں ماہ چاردہم کو حاصل ہے۔ یہ قصر معہ اپنے تمام ملحقہ عمارات و تفریح گاہوں کے نہایت وسیع حصۂ زمین کو محیط ہے، اتنا وسیع کہ یہاں داخل ہونے کے بعد ایک انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس احاطہ سے باہر شاید کسی انسانی آبادی کا وجود ہی نہیں ہے۔ میں نے چل پھر کر قصر کے اندرونی و بیرونی مختلف حصوں کو دیکھا، ان کی آرائش و زیبائش میں جو دولت و ذہانت صرف کی گئی ہے ان کا مطالعہ کرتا رہا، تمدن جدید کے ان تمام اسباب آرائش کو، جو تھوڑی دیر کے لئے نظریۂ فردوس کو بھی دماغ سے محو کر دیتے ہیں دیر تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں مغرب کی موجودہ ترقی علوم و فنون کو دعائیں دیتا رہا جس نے تمدن انسانی کے معیار کو اس قدر بلند کر کے غریبوں کی حیثیت حشرات الارض سے زیادہ نہیں رکھی۔ اور انسانی ارتقاء و حصیفی کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مادیات کی اتنی زبردست دیوار حائل کر دی ہے۔

اس قصر کے بلند ایوان، وسیع و مرتفع شہ نشین، اس کا مرمریں فرش، مرصع سقف، منقش دیواریں، قیمتی تصاویر، دلفریب مجسمے، نقرئی و طلائی ظروف حریری پردے، متعدد سبزہ زار، مختلف صناعیوں کے بڑے بڑے حوض اور بجلی کی رنگین روشنیوں کے انعکاس میں قوس قزح کے رنگ پیدا کرنے والے فوارے، الغرض میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ دنیا سے الگ یہ کوئی بازیگاہ فطرت ہے، جہاں وہ ہر وقت رنگ و نور، ریشم و طلا کے ساتھ کھیلا کرتی ہے یا یہ کہ شاید میرے ہی ہاتھ الہ والدین کا چراغ آگیا ہے، اور یہ عالیشان قصر آن واحد میں میرے ہی لئے طیار ہوا ہے -

جاہ و ثروت والے دنیا میں بہت سے پائے جاتے ہیں، لیکن دولتِ دنیا کے ساتھ، دولت دماغ بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ دولت و ذہانت، ثروت و خوش سلیقگی کہیں ایک محل میں جمع ہو جائیں - میری زندگی میں غالباً یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ ان دونوں کا اجتماع میں نے اس قدر تکمیل کے ساتھ دیکھا ہو - اگر راجہ صاحب اس ودیعت ربانی پر خراج تحسین حاصل کرنے کے مستحق ہیں تو اُس مبدء فیاض کو کیوں نہ سراہا جائے - جس نے راجہ صاحب کی ذات اور ان کے دل و دماغ کو اس کے لئے منتخب کیا -

اس قصر کی طیاری و آرائش میں جس قدر بیدریغ دولت صرف کی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ایک حمام کی طیاری میں لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے -

---

تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب موصوف راجہ نارائن پرشاد صاحب کی معیت میں باہر تشریف لائے اور مجھ سے مخاطبت کی تو بے اختیار عرفی کا یہ شعر مجھے یاد آ رہا تھا کہ

زباں چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

راجہ صاحب ایک جوان العمر کشیدہ قامت نہایت خوش قیافہ و خوش شمایل انسان ہیں، اور باوجود دولت و ثروت کی اس فراوانی کے آپ کا انکسار آپ کی وسعت اخلاق، آپ کی فراخ حوصلگی اور سیر چشمی اس جوار میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت رکھتی ہے اور شاید ہی کوئی قومی، ملکی یا علمی تحریک ایسی ہو جس کو آپ کے "طلا، دست افشار" کی اعانت نہ حاصل ہوتی ہو - سیاسی معاملات میں آپ نہایت صائب رائے رکھتے ہیں اور مذہبیات میں آپ کا مسلک صرف اخوت عامہ و انسانیت پر مبنی ہے جہاں عصبیت و تمیز نسل و رنگ کا گزر نہیں -

تھوڑی دیر کے بعد سرود خانہ میں تشریف لے گئے اور چونکہ ہمارے حکیم صاحب ایک مریض کو دیکھنے شہر چلے گئے تھے اور فضائے تقدس واتقاء کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے کچھ گفتگو کا موضوع بھی بدلا، زاویۂ نظر میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور اگر سامعہ ادھر امین کی دلکش سروں میں محو تھا تو ادھر بقول نسیم دہلوی :—

نگاہیں ڈوب کر رہ گئیں جام لبالب میں

آخر کار یہ صحبت لطیف جو رنگین کم مگر دلکش زیادہ تھی، ایک بجے رات کو ختم ہوئی اور واپس آنے کے بعد عالم خواب میں بھی اسی کیفیت سے لذت اندوز ہوتا رہا مگر کبھی کبھی اس ڈر سے آنکھ کھل جاتی تھی کہ کہیں حکیم صاحب تو تشریف نہیں لے آئے۔

میرے قیام کا سبب حیدرآباد میں یہ ہو کہ مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر کی مثنوی پریم درپن کا گویا فلم طیار ہو رہا ہے اور مکالموں، گانوں اور مناظر کی نگرانی میرے سپرد ہوئی ہے۔ اس فلم کو یہین حیدرآباد کی ایک لمیٹڈ کمپنی طیار کر رہی ہے جس کے مینیجنگ ایجنٹ ایک انگریز میجر ریڈ ہیں اور جو اس سے قبل یہیں، حیدرآباد میں ایک نہایت کامیاب فلم "شکاری" طیار کر چکے ہیں۔ پریم درپن کے فلم کو مسٹر داؤد بیگ ڈائرکٹ کر رہے ہیں جو ایک زمانہ تک یورپ میں رہکر اس فن میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے ہیں۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہندوستانی فلموں میں جو نقائص عام طور پر نظر آتے ہیں وہ اس میں نہ پائے جائیں اور ہر ممکن حد تک تمام مناظر و گفتگو وغیرہ فطری حالت میں پیش ہو سکیں۔ یہ فلم غالباً دسمبر تک مکمل ہو سکے گا اور اس لئے میرا بھی اس وقت تک یہاں قیام کرنا ضروری ہے۔

---

۲۰ ستمبر سے لیکر ۲۶ ستمبر کا زمانہ بھی تاریخ ہند میں ایک ایسی زبردست یادگار عزم انسانی وصداقت نیت کی قائم کر گیا ہے کہ شاید ہی اس کی دوسری نظیر پیش کی جا سکے۔ دنیا میں مصلح و ریفارمر بھی آتے ہیں اور قائد و رہنما بھی، ماہرین سیاست بھی نظر آتے ہیں اور قوم کے فدائی بھی، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ سب اسی منزلت و مرتبت کے حامل ہوتے ہیں جو اس وقت مہاتما گاندھی کو حاصل ہے اور کیا اُن کی آواز میں بھی اثر ہوتا ہے جو اس نحیف الجثہ حقیر صورت انسان کی آواز میں پایا جاتا ہے۔

وہ ایک بار اعلان کر دیتا ہے کہ میں ۲۰ ستمبر سے اپنی زندگی کا آخری روزہ شروع کر دونگا اور مشرق سے لیکر مغرب تک ایک اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے، وہ عہد کرتا ہے کہ میں اس فاقہ کو فنا کی حد تک

کھینچ لیجاؤں گا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے اس عزم سے ہٹانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی — کیوں؟ دنیا باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں یقین لاتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے جو کچھ کیا وہ فرمان خداوندی کی تعمیل تھی اور جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ یقیناً الہام ربانی تھا۔

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہندو آبادی میں جو مسئلہ چھوت و اچھوت کا ایک زمانۂ نامعلوم سے الجھا چلا آرہا تھا وہ کبھی سلجھ سکے گا۔ اور کیا کسی انسان کے امکان میں تھا کہ وہ برہمن و شودر کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کردے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی بندہ کو اپنا پیام سنانے کے لئے چن لیتا ہے تو زبان میں یہی اثر، ارادہ میں یہی عزم پیدا کردیتا ہے اور پھر تمام طاغوتی قوتیں اس کے سامنے اسی طرح سربسجود ہوجایا کرتی ہیں۔

اگر امم قدیمہ کے مصلحین کی ان قربانیوں سے جو انھوں نے نوع انسانی کے لئے روا رکھی ہیں انکار نہیں کیا جاسکتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ عہد حاضر میں ہندوستان کے اس مصلح اعظم۔ اس قاید اکبر اور پیام خداوندی کے اس عظیم المرتبت حامل و مبلغ کی صداقت، و قربانی کو نہ تسلیم کیا جائے جس نے اب واقعتہً" ایک معجزہ کی سی صورت اختیار کرلی ہے اور کرلینی چاہئے تھی

لیکن اب سوال یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کی وہ دوسری قوم اب کیا کرنا چاہتی ہے جس نے اس وقت تک اپنی ساری عمر ترکستان و عربستان ہی کی فکروں میں ضایع کردی اور ہندوستان کے درد نے کبھی اس کو بیتاب نہ بنایا۔ اگر اس کے دماغ میں کوئی حقیر ترین ذرہ بھی عقل کا موجود ہے تو اُس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ جواب ہے مہاتما گاندھی کی طرف سے ان کی حماقتوں اور شرارتوں کا جو مخلوط انتخاب کے مسئلہ میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئیں اور انتقام ہے فطرت کا جو وہ ہمیشہ بے عقل و کج فہم قوموں سے لیا کرتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمان اب بھی ہندوؤں سے اچھوت قوموں کی علیحدگی کی کوئی صورت نکال سکتے ہیں اور کیا اب بھی ان کو توقع ہے کہ ہندو قوم کی تفریق ان کے انتخاب جداگانہ کو کامیاب بنا دینے والی ثابت ہوگی۔ مگر نہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ طلسم فریب اب ٹوٹ چکا ہے، حقیقت بڑی حد تک بے نقاب ہوچکی ہے اور اگر اس کے بعد بھی مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کی لعنت کو اپنے اوپر سے دور نہ کیا تو پھر اس کے بعد غالباً کوئی دوسری نشانی قدرت کی طرف سے ظاہر ہونے والی نہیں ہے۔ اور اب جو فیصلہ دست خدا میں اس قوم کے لئے انتظار کر رہا ہے وہ صرف یہی ہے کہ

کونوا قردۃً خاسئین

نیاز

بنی فاطمہ کی سیاسی تحریکیں اور ان کا تاریخی انجام

عہد امویہ و عباسیہ کی داستان خونیں کے چند صفحے

ہر انسان پر خواہ وہ زاہد شب زندہ دار ہو، یا رند معصیت کوش زندگی کے بعض ایسے معصوم اور برگزیدہ لمحے بھی گزر جاتے ہیں، جب اشیا و مناظر کی حقیقت پر بھی اُسے غور کرنا پڑ جاتا ہے پھر اُس کا موضوع فکر کبھی خود اس کی ذات ہوتی ہے اور کبھی ماورائے ذات۔ چنانچہ فلسفہ کے مختلف مذاہب، شاعری کے مختلف اسالیب اخلاقیات و عمرانیات کے مسائل اسی خیال کی تحلیل کا نتیجہ ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی نظر زندگی اور اس کی حقیقت پر پڑتی ہے اور اسی عقدہ کے حل کرنے کے بعد انسان ماورائے ذات کے ساتھ اپنے ربط و علاقہ کی تعیین کرتا ہے۔ حقیقت زندگی کیا ہے؟ اس کے جواب میں خیالات کا ایک عمان بے پایاں سامنے آجاتا ہے۔ لیکن بچین قلوب کو نہ افلاطون کے "تصورات" کی موشگافیاں تسکین پہونچا سکتی ہیں نہ ارسطو کی ثنویت اور اس کے آفریدگار کی بے نیازیاں؛

از یں چہ سود وزیاں در کمال حکمت او   کہ بوعلی مقرو ارسطو بہ انکار است

مذاہب کو ان کے پرستاروں کی انانیت اور خود غرضیوں نے سیاسیات سے زیادہ اونچی سطح پر نہیں رکھا اس لئے اس کے مکارم و معالی، نشو و ارتقا کی تدریجی رفتار کے ساتھ فنا ہونے لگے اور آخر کار مذہب اپنے خود غرض پرستاروں کی وجہ سے ہلاکت و فساد کا ایک خوفناک نظام بن گیا۔ اس لئے انسان اپنی ہی طرف دیکھتا ہے، اور سوال کرتا ہے زندگی کیا ہے؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر محرومیاں اور کامرانیاں دونوں آئندہ چل کر خواب و خیال بن جاتی ہیں تو پھر ہم مستقبل کے ساتھ اس قدر آرزومندانہ انہماک کیوں رکھتے ہیں ہم ساری آرزوں کو کیوں نہیں تیاگ دیتے اور پھر سوال یہ ہے کہ اس افسردگی تمنا کے بعد ہم میں جینے کا حوصلہ کیوں باقی رہتا ہے۔ غالب اپنے فلسفیانہ انداز میں اس کا جواب دیتے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید   نا اُمیدی اُسکی دیکھا چاہیے

مرزا کا عقیدہ ہے کہ زندگی محض اُمیدوں کے سہارے قائم رہتی ہے، اگر اُمیدیں باقی نہ رہینگی، تو موت اُمید بن جائیگی، یعنی انسان زندہ رہنا پسند نہیں کریگا، غالب کا یہ شعر زندگی کی بالکل حقیقت ہے۔

انسان فطرتاً رجائیت کا جذبہ لیکر آیا ہے، اور جب تک وہ زندہ رہتا ہے، محرومیوں کے باوجود مستقبل کے ساتھ ایک آرزو رکھتا ہے، زمانہ اور اس کا انقلاب یا تو انسانی قلوب کو مدفن تمنا بنا دیتا ہے، یا گلشن تمنا، لیکن انسان جب ماضی کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی کامرانیاں بھی محرومیوں سے زیادہ ناکام نظر آتی ہیں۔ ناکامی تو نیز خلش دل بلکہ زندگی کا ساتھ دیتی ہے، لیکن کامرانیوں کا انجام تو بے کیفی اور افسردگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ انسان کیفیت چاہتا ہے خواہ وہ درد ہو یا نشاط! رونا بھی آرزو کے وجود کی دلیل ہے، کیونکہ انسان روتا بھی اسی وقت ہے جب دل میں کوئی آرزو ہوتی ہے۔ آہ! اصل رونا تو نہ رونے کا ہے، دل کی حسرتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ ظہوری اس نفسیاتی مسئلہ کے متعلق اپنے شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں،

گریۂ حسرت اے ظہوری چند   آرزو ہا ہمہ ز دیدہ چکید

فلسفی شاعر کہتا ہے کہ انسان کب تک روئے، ارے ساری آرزوئیں تو آنکھوں کی راہ بہ گئیں اب آرزو ہی نہیں تو روئیں کیا۔ یہ صرف شاعری نہیں ہے، بلکہ شاعر نے ایک نفسیاتی واقعہ بیان کر دیا ہے۔

الغرض ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کا تجزیہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ زندگی نام ہی دراصل ماضی کے خواب و خیال بنجانے اور مستقبل کے ساتھ آرزوؤں کی وابستگی کا، بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اکتشاف کے بعد ہم پر یاس و بے حسی کیوں نہیں طاری ہو جاتی۔ نہیں ہو سکتی، نظام فطرت انسان کو اندھا بنا دیتا ہے، اور جب تک انسان کے قویٰ باقی رہتے ہیں وہ فطرت کے ذوق آرائش میں اپنی زندگی تباہ و برباد کرتا رہتا ہے۔ عمرانیات کا سارا ساز و نشاط، حکومتوں کی ساری حکمت عملی، ذہن و جسم کی تمام پیداوار ایک اسی فریب خیال کا نتیجہ ہیں ورنہ سلف کے تمدنی کارنامے قدما کے آثار، حکومتوں کا قیام و زوال خاندانوں کا عروج و انحطاط ہمارے اندر کیوں نہیں ایک نفسی ردعمل پیدا کر دیتا ہے، آخر ہم کیوں آرزوہائے خیالی کے دیوانے ہیں ہم دل کے اندر امیدوں کی پرورش کیوں کرتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کے لئے اس قدر سرگرداں کیوں ہیں؟ قرآن نے اپنے اچھوتے فلسفیانہ انداز میں اس کی طرف ایک جگہ اشارہ کیا ہے،

اتبنون بکل ریع آیۃ تعبثون ٥ وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون ٥ (شعراء)

کیا تم ہر اونچے مقام پر ایک یادگار بناتے ہو جو بالکل عبث ہے اور بڑے بڑے محل طیار کرتے ہو جیسے ہمیشہ تم کو دنیا میں رہنا ہے۔

یہ ہے اسلامی عمرانیات کا وہ سہل و سادہ اصول جو انسان کو دنیا کی بہت سی ابلہ فریبیوں سے بچا سکتا ہے۔ لیکن انسان کے اندر جس وقت جذبۂ انانیت پیدا ہوتا ہے وہ دولت و جاہ امارت و حکومت، شہرت و عزت خود غرضی و کامرانی کے نشہ میں سرشار ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جن کی بدولت اس کو ابنائے

جنس پر تفوق و برتری حاصل ہو، یہیں سے اخلاقیات کی ساری فرومایگی شروع ہوتی ہے اور انسان سے تو امیس اخلاقی رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک درندہ بنجاتا ہے۔ جس کی بیشمار مثالیں صفحاتِ تاریخ میں موجود ہیں۔ اچھا تو آیئے آج کی صحبت میں "بنی فاطمہ" کی مظلومیت اور امویہ و عباسیہ کی خون آشامیوں پر ایک نگاہ ڈال کر فطرتِ انسانی کی ہوسناکیوں کا مطالعہ کریں۔

مختصراً اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے صفحات علویہ و اہلبیت کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت زید شہید کو جس طرح فنا کے گھاٹ اتارا گیا وہ ہشام و ولید کو ابدی لعنت میں گرفتار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حضرت یحییٰ ابن زید کا سر کاٹ کر بی بی ریطہ[1] کے آغوش میں دینا ایک ایسی وحشت ہے، جس پر چنگیز و ہلاکو بھی رشک کریں گے۔ محمد نفس الزکیہ اور ابراہیم کو جس غداری اور بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا وہ خلیفہ منصور کے دامن پر ایسا دھبہ ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ ہارون الرشید اسلامی دنیا کا ایک نامور خلیفہ سہی اس کی بیدار مغزی اس کی سیاسی اہمیت اس کا فاتحانہ جوش و خروش مسلم لیکن آہ! یحییٰ ابن عبد اللہ محض کو امان دیکر زہر دلا دینا کیا معمولی واقعہ ہے، اور کیا اس کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے؟ کیا ابو الحسین ابن علی العابد کا واقعہ درد ناک فخ[1] جس کو مورخین اس بنا پر فراموش نہیں کر سکتے ہیں کہ خلیفہ ہادی کے حکم سے یہ بلا انگیز بلا نازل نہیں ہوئی تھی، امام محمد تقی کہا کرتے تھے۔

[1] لیکن دنیا بغداد الطمت، مصرع اعظلم من فخ　　کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت جو ہم پر نازل ہوئی وہ واقعہ فخ ہے۔

کیا امام جعفر صادق جیسے گوشہ نشین عالم کو زہر دینا خلیفہ منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کی معمولی دناءت تھی؟ کیا حضرت امام موسیٰ کاظم کو زہر دینے کے لئے بعد بھی رشید (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ) اسلامی دنیا کا ہر دلعزیز تاجدار کہا جا سکتا ہے؟ کیا امام علی نقی کو زہر کا پیالہ پلا دینا خلیفہ المعتز (۲۵۲ھ تا ۲۵۵ھ) کا ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا عباسیہ کے جاہ و جلال اور اسلامی شان و شکوہ کی داد دے سکتی ہے۔ الغرض کہاں تک عباسیہ کی سیہ کاریوں... کا شمار کیا جائے، میں مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی جلالت و عظمت، علمی و سیاسی خدمات، معاشرتی و عمرانی ترقیوں کے ذریعہ سے عربوں کو دنیا کی ملتوں کے سامنے بہت سربلند کر دیا۔ لیکن کیا دنیا میں صرف سربلندی حاصل کر لینا ہی اسلام کا اصل پیام ہے؟ کیا ترقی کا حقیقی معیار اسلام کے نزدیک یہی ہے کہ بغداد میں بہلیہ جیسی شاندار عمارتیں بنا دی جائیں، یونانی زبان کی خرافات کا عربی میں ترجمہ کیا جائے، عباسی حکومت کو اطراف و اکناف عالم تک وسیع کر دیا جائے؟ کیا یہ سب کچھ اسلام اور جمالوں کی ترقی تھی؟ بالفرض تھی بھی تو بنی فاطمہ کے ساتھ ان کا سلوک کیا ان کو اسلامی دنیا کے لئے رحمت بتا سکتا ہے۔

زید شہید

حضرت زید بن امام علی زین العابدین فریادی بنکر ہشام اموی کے دربار میں تشریف لے جاتے ہیں، ہشام اپنے افسر فوج کو حکم دیتا ہے کہ زید ہمارے لشکر میں رہنے نہ پائیں حضرت زید یہ سنکر فرماتے ہیں کہ جو شخص تلوار کی زد ناپسند کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے" لوگوں نے یہ خبر دربار میں پہونچادی ہشام سمجھا کہ آپ ضرور خروج کریں گے، وہ مکہ میں آیا، اور حضرت زید، داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور محمد ابن عمر بن حضرت علی کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ خالد قشیری کا مال اُن کے یہاں موجود ہے۔ جب یہ لوگ گرفتار کر کے کوفہ میں یوسف ابن عمر ثقفی کے پاس پہنچے گئے تو ان لوگوں نے قسم کھائی کہ خالد کا مال ان کے ذمہ نہیں ہے چنانچہ یوسف نے ان کو رہا کر دیا اس کے بعد شیعہ زید کو قادسیہ سے کوفہ کی طرف لائے اور آپ سے بیعت کی۔ جو لوگ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے، زیدیہ کہلاتے ہیں اور جنھوں نے آپ کو چھوڑ دیا "رافضہ" کہلاتے ہیں صرف کوفہ میں زید کے ساتھ پندرہ ہزار آدمی موجود تھے، اس کے علاوہ مدائن بصرہ، واسط، موصل خراسان رے، جرجان، جزیرہ وغیرہ کے باشندوں نے بھی ساتھ دیا۔ ۱۲۱ھ میں آپ نے لوائے خروج بلند کیا رفتہ رفتہ آپ کے رفیقوں نے آپ کو چھوڑنا شروع کیا یہاں تک کہ صف آرائی کے دن آپ کے ساتھ صرف تین سو آدمی تھے اموی طرف سے یوسف ابن عمر ثقفی دس ہزار فوج لیکر آیا تھا میدان کارزار گرم تھا کہ یوسف ابن عمر ثقفی کے ایک غلام نے جس کا نام "راشد" تھا ایک تیر مارا جس سے حضرت زید کی پیشانی زخمی ہو گئی آپ کو سواری سے اتار لیا گیا آپ کا سر مبارک مسلم ابن محمد خیاط کے گود میں تھا آپ کے صاحبزادے یحییٰ ابن زید تشریف لائے، اور روکر کہا "اباجان! بشارت ہو کہ آپ حضرت رسول اللہ، علی، فاطمہ اور حسن و حسین سے ملیں گے" حضرت زید نے فرمایا "میرے عزیز بچے اب تم کیا کرو گے"؟ حضرت یحییٰ نے جواب دیا "اباجان میں تن تنہا بھی اُن سے لڑونگا" حضرت زید نے فرمایا ہاں میرے بچے یہی کرو، چونکہ تم حق پر ہو اور وہ ناحق پر اگر انھوں نے تم کو شہید کیا تو تم جنت میں داخل ہوگے اور اگر وہ مارے گئے تو واصل جہنم ہوں گے" اس کے بعد تاریخ میں حضرت زید کا وہ حسرتناک انجام مرقوم ہے، جسے علامہ سراج الدین رفاعی نے اس طرح لکھا ہے[۵] پھر تیر آپکی پیشانی سے نکالا گیا اور اسی کے ساتھ آپ نے رحلت کی۔ سعید بن خیثم کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہم لوگ آپ کو ایک چشمہ کے نزدیک لائے جو ایک باغ کے اندر جاری تھا آپ کی لاش دفن کر دی اور ہمارے ساتھ ایک سندی غلام تھا اُس نے یوسف کو خبر کر دی۔ صبح کے وقت آپ کی لاش چشمہ سے نکالی اور ایک کناسہ میں سولی دیدی اور چار برس تک سولی ہی پر لٹکائے رکھا (اس عرصہ میں) ہشام نے قضا کی اور ولید ثانی ابن

---

[۵] صحاح الاخبار فی نسب السادۃ الفاطمیۃ الاخیار

یزید ثانی (۱۲۵ھ - ۱۲۶ھ) نے یوسف کو لکھا کہ تم کو جس وقت میرا خط ملے فوراً اہل عراق کی طرف جاؤ اور (زید کو) جلا کر آپ کی خاک دریا میں منتشر کردو، یوسف نے سولی سے لاش اتاری اور جلا کر راکھ ہوا میں منتشر کردی،

یحییٰ ابن زید شہید

حضرت زید کے چار بیٹے تھے، یحییٰ، حسین ذوالدمعہ، عیسیٰ موتم الاشبال، اور محمد حضرت یحییٰ سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، آپ لاولد مرے حضرت زید کی شہادت کے بعد آپ مدائن میں آئے خلیفہ ولید اموی کے گورنر یوسف ابن عمر نے آپ کو بلایا آپ رے کی طرف چلے گئے وہاں سے نیشاپور اور سرخس میں آئے اس کے بعد یوسف نے نصر ابن سیار کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی تین دن تک سخت لڑائی ہوئی لوگوں نے جمعہ کے دن عصر کے بعد ۱۲۵ھ میں آپ کو جام شہادت پلا دیا شہادت کے وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی آپ کا سر مبارک ولید کے دربار میں آیا، جسد مبارک سولی پر لٹکا دیا گیا، ولید نے سر مبارک مدینہ میں بھیجا کہ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی ریطہ بنت عبید اللہ بن محمد بن علی بن ابی طالب کے گود میں ڈالدیا جائے بی بی ریطہؓ حضرت شیر خدا کی پوتی تھیں آپ کی رگوں میں وہی خون جاری وساری تھا آپ نے سر کی طرف حسرت بھی نظروں سے دیکھا اور امویوں کی طرف خطاب کرکے کہا۔

شردتموہ عنی طویلا واھد تیموہ الی قتیلا	ایک عرصہ تک تم نے مجھکو اسکا داغ فراق دیا اور اب
صلوٰت اللہ علیہ بکرۃ و اصیلا	قتل کرکے اس کا تحفہ دیتے ہو، اللہ تعالیٰ کی بخششیں اسپر صبح وشام ہوا کریں

ایک غیر متعصب طالب علم امویوں کی ان سیہ کاریوں کی داستان پڑھکر حیرت میں آجاتا ہے کہ اموی مسلمان تھے یا ننگ اسلام!

بنو حسن کی سیاسی جدوجہد

بنو حسن نے بدسلوکیوں کے باوجود نہ تو قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی نہ سیاسیات میں کوئی حصہ لیا تھا - علی ثانی (امام زین العابدین) کی اولاد عزت گزیں زندگی گزارتی تھی اور علمی وفلسفیانہ مشاغل میں مصروف، انھوں نے خود کو بنی عباس کی سیاسی تحریکوں سے بالکل علیحدہ رکھا، البتہ زید شہید اور آپ کے صاحبزادہ نے مظلومیت کی بنا پر ہشام اور یزید کے خلاف اسلحہ اٹھایا اور اپنی زندگی قربان کردی - بنو حسن اور بنو حسین مدینہ میں رہتے تھے اور کبھی کبھی قلیل جایداد کچھ تجارتی منفعت اور مدارس کی غیر متعین آمدنی پر ان کی بسر ہوتی تھی! لیکن افلاس کے باوجود، مقامی باشندے ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مدینہ میں خلفائے ثلاثہؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اولاد بھی رہتی تھی، اور یہ سب علویہ کے ساتھ علاقہ رکھتے تھے - علویہ کے اس اثر و رسوخ اور عزت وبرتری کو دیکھ کر منصور عباسی کو خوف ہوا کہ جس آسانی کے ساتھ بنی مروان تباہ ہوئے

کہیں اس کا خاندان بھی نہ برباد ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے مختلف طریقوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں بغاوت کا سامان تو نہیں، اُس نے اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کر کے علویہ کے یہاں بھیجا کہ وہ اُن کے معتمد بن جائیں اور ان کو بلاخوف بولنے کی ترغیب دیں، تاکہ اس کو دار و گیر کے لئے حجت مل جائے اس طرف جب امویہ کی حکومت کو زوال ہو رہا تھا تو فطری طور پر علویہ اس سے دلچسپی لے رہے تھے، مدینہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بہت سے بنو حسن اور بنو حسین جمع ہوئے، منصور بھی اس میں شریک تھا، اس جمعیت میں امام حسن کے پوتے محمد (جو بنو حسن کے سردار تھے) خلیفہ منتخب ہوئے آپ کی صداقت و شرافت اخلاق کے باعث آپ کو "نفس الزکیہ" کا لقب ملا تھا۔ سارے مجمع نے مع ابو جعفر منصور متفقہ طور پر آپ کی لیاقت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ سے بیعت کی جب منصور تخت خلافت پر بیٹھا، اس ناقابل فراموش بیعت کی یاد سے اس کی زندگی تاریک نظر آنے لگی، اور اس کا شک قوی ہو گیا، اور اس نے محمد نفس الزکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ لوگ فرار ہو گئے اس نے خاندان کے بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں ضعیف العمر حضرت عبد اللہ محض اور آل عثمان کے سردار محمد العثمانی بھی شامل تھے جن کی صاحبزادی ابراہیم کی زوجیت میں تھیں ان کو پا بزنجیر کوفہ میں بھیجا گیا اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ محمد العثمانی کو اہل شام بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، اس لئے اُن کی شخصیت بھی تخت عباسیہ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ آخر کار آپ کو کوڑے لگائے گئے اور پھر قتل کر دیا گیا۔ دوسروں کے ساتھ بڑی سفاکی کی گئی۔ یہاں تک کہ غریب مظلوموں نے اعتراف کیا کہ وہ اس لحاظ سے تو دور اموی ہی میں اچھی طرح بسر کرتے تھے۔ محمد اور ابراہیم کی گرفتاری کے لئے چاروں طرف لوگ سرگرم تھے، بدؤں کو پانی کے مقامات پر متعین کیا گیا کہ وہ جاسوسی کریں۔ جن لوگوں پر پناہ دینے کا شبہ تھا ان کو کوڑے مارے گئے قید کیا گیا۔ آخر نا امید ہو کر محمد نے اپنے بھائی ابراہیم کو اہواز اور بصرہ کی طرف تحریک کیلئے بھیجا اور خود مدینہ میں تشریف لائے، منصور کے عزل کا اعلان بیک وقت بصرہ اور مدینہ میں ہونا قرار پایا۔ اگر یہ کارروائی کامیاب ہو جاتی تو غالب گمان تھا کہ عباسیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا لیکن محمد پر اُن کے بھائی کی تیاریوں کے قبل اعلان کرنے کا زور دیا گیا اور اس لئے منصور باری باری دونوں پر حملہ کرنے کے لائق ہو گیا منصور کا عامل جو مدینہ میں تھا گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اور چند دنوں کے اندر سارے حجاز اور یمن نے محمد کو دنیائے اسلام کا خلیفہ مان لیا۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک نے محمد کی تائید میں فتویٰ دیا۔ منصور نے جب اس تحریک کو توقع سے زیادہ خطرناک پایا تو اپنی رسمی روباہ بازی سے کام لیا اور محمد نفس الزکیہ کو ایک خط لکھا اور اُن کو اجازت دی کہ جہاں جی میں آئے رہیں اسی کے ساتھ ایک بڑے وظیفہ کی لالچ دی اور ان کے رشتہ داروں کے حق میں بھی رعایت کا وعدہ کیا۔ محمد نے اس کا جواب دیا کہ آمرزش اور مہربانی کرنے کا حق تو ہم کو ہے، کیونکہ حقیقت

کے اعتبار سے خلافت میری چیز ہے' اور امان کے متعلق یہ لکھا کہ اس کی حقیقت اسی امان کی سی تو نہیں جو ابومسلم، عبداللہ بن علی اور یزید بن ہبیرہ کو دی گئی تھی - منصور اس تلخ جواب سے جل گیا اور اس نے محمد نفس الزکیہ کو ایک طویل خط لکھا - اور اس پر زور دیا کہ چونکہ آنحضرت صلعم نے کوئی اولاد ذکور نہیں چھوڑی اس لئے آپ کی صاحبزادی کی اولاد کو وراثت نہیں پہونچتی، بلکہ اس کی حقدار آپ کے چچا عباس کی اولاد ہوئی - منصور نے اپنے بھتیجے عیسیٰ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ وہ نفس الزکیہ کو کچل ڈالے - جنگ کے قبل محمد نفس الزکیہ نے اپنے رفقا سے کہا کہ جس کے جی میں آئے میرے ساتھ رہے، اور جو جانا چاہے چلا جائے' اس پر آپ کے معاونین کی اکثریت نے اپنے اپنے گھر کا راستہ لیا اور آپ صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے رہ گئے - آپ کے تمام ہیرو ایک ایک کرکے شہید ہوگئے اور ان کی لاشیں حسب دستور دار پر لٹکائی گئیں اہلبیت کی ایک خاتون نے عیسیٰ سے اجازت لیکر مقتولین کو مدینہ کے نزدیک "روضۃ الشہدا" میں دفن کردیا -

اسمعیلیہ و ادارسہ عباسیہ نے فاطمیہ کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ خراب خستہ رہیں، لیکن فطرت اپنا اصول کب چھوڑتی ہے' جہاں تک ان کو ستایا گیا جہاں تک انکی جمعیتیں پریشان کی گئیں' اتنا ہی لوگوں کے دل ان کے گرویدہ ہوتے گئے اور یہ بھی تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اس پریشان حالی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود فاطمیہ کی دو زبردست حکومتیں اسمعیلیہ اور ادارسہ قائم ہو ہی گئیں - حضرت امام حسین کی اولاد نے بہ استثنائے حضرت زید و یحییٰ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں کی، پھر بھی حضرت اسمعیل ابن امام صادق کی اولاد نے مغرب میں جلالت و شکوہ کے وہ کارنامے چھوڑے کہ دول اسلامیہ کی تاریخ میں ان کو ایک خاص امتیاز و اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' عبید اللہ المہدی سے فاطمیہ مصر کے آخری فرمانروا العاضد لدین اللہ (۲۹۷ھ - ۵۵۵ھ) تک ڈھائی سو صدیوں سے زیادہ زمانہ ہوتا ہے، انھوں نے صقلیہ تک اپنی حکومت وسیع کی آل حسن نے عباسیہ کے لئے ایسی ایسی سیاسی نزاکتیں پیدا کردیں کہ منصور و رشید کے ہوش پراگندہ ہوگئے' محمد نفس الزکیہ اگر منصور ہی کی طرح سیاسی چالبازیوں سے باخبر ہوتے تو آج اسلام کی تاریخ میں عباسیہ کی جگہ فاطمیہ علویہ ہی نظر آتے' اگر رشید حضرت یحییٰ کو دیلم سے بلاکر زہر نہ دلا دیتا تو وہ دیلم کے بادشاہ ہوچکے تھے، اور تاریخوں میں "صاحب الدیلم" ہی کے لقب سے مشہور ہیں حضرت عبداللہ محض ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسن ع کے چار صاحبزادوں محمد، ابراہیم، یحییٰ، ادریس نے ظلم و ستم سے اکتا کر ایسی ایسی تحریکیں کیں کہ عباسیہ خوفزدہ ہوگئے لیکن سیاسیات کے مکر و فریب سے باخبر نہ ہونے کے باعث ان کو ناکامیاں ہوئیں صرف ادریس کو خدا نے مغرب کا بادشاہ بنایا اور اس طور سے یہ دوسرا فاطمی

خاندان ہے، جس کو حکومت و سلطنت ملی ۱۶۹ھ سے ۳۱۹ھ تک ان کی حکومت رہی، یحییٰ سوم کے زمانہ ۳۰۹ھ میں ادارسۂ مصر کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد ادریسی خاندان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم ہوئیں جن پر ۳۱۹ھ میں امویہ اندلس اور اسمٰعیلیہ متصرف ہو گئے۔

یحییٰ فرمانروائے دیلم

آپ صاحب الدیلم مشہور ہیں جیسا کہ مشہور نسابہ سید عمید الدین حسینی نے بیان کیا ہے، آپ حضرت امام حسن کے پوتے تھے، آپ کے والد کا نام عبد اللہ محض ابن حسن مثنیٰ بن امام حسن ہے، آپ خلیفہ رشید کے زمانہ میں بھاگ کر دیلم پہونچے وہاں کے باشندوں نے آپ سے بیعت کی اور آپ کے پاس جمع ہو گئے آپ کی شان و شوکت بڑھی، ہارون الرشید کو اس کا بڑا صدمہ و قلق ہوا اُس نے فضل ابن یحییٰ برمکی کو لکھا کہ یحییٰ نے میری آنکھوں میں کانٹے چبھوئے ہیں، جو وہ چاہیں اُن کو دو اور ان کی طرف سے میرا اندیشہ دور کر دو، فضل بن یحییٰ ایک بڑا لشکر لیکر آ دھمکا اور خوف و لالچ مہر و قہر سے اُن کو پیام دیا، یحییٰ نے امان طلب کی فضل نے رشید کے وکیل کی حیثیت سے امان نامہ لکھدیا، بعض روایت میں ہے کہ آپ دیلم میں غلامی کی حالت میں پہونچے وہاں کے باشندوں نے ایک لاکھ دینار میں آپ کو فضل سے خرید لیا حضرت یحییٰ مدینہ میں چلے گئے اس قیام مدینہ کے زمانہ میں عبد اللہ بن مصعب بن ثابت بن عبد اللہ زبیرؓ نے آپ کے خلاف رشید سے کہدیا کہ وہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے تھے۔ رشید نے دونوں کو بلایا یحییٰ بھی مدینہ سے آئے جب آپ سے زبیری (عبد اللہ بن مصعب) کا سامنا ہوا تو اُس نے کہا "تم نے ہمارے خلاف سازش کی اور ہماری حکومت کی تباہی کا ارادہ کیا"۔

یحییٰ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تم کون ہو؟ رشید کو بے اختیار ہنسی آگئی یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین یہ شخص جو آج ہم پر تہمت رکھ رہا ہے ہمارے بھائی نفس الزکیہ کے ساتھ آپ کے جد منصور کے خلاف خروج میں شامل تھا اور یہ اسی نے کہا ہے

قوموا لبیعتکم ننھض بطاعتنا ان الخلافۃ فیکم یا بنی حسن

(ترجمہ) اے آل حسن! اپنی بیعت کیلئے اٹھ کھڑے ہو، ہم تمھاری فرمانبرداری کیلئے مستعد ہیں خلافت تمھاری چیز ہے اور اے امیر المومنین یہ شخص جو تہمت رکھ رہا ہے وہ آپ کی محبت اور آپ کی حکومت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم تمام اہل بیت کے ساتھ عناد پروری کا مظاہرہ ہے، میں حلف اٹھانے کو کہتا ہوں اگر وہ حلف اُٹھا لیگا کہ میں نے اس سے بیعت کے لئے کہا تھا تو پھر میرا خون آپ کے لئے حلال ہوگا"۔

جب عبد اللہ نے جھوٹا حلف لیا تو، یحییٰ نے کہا یا امیر المومنین مجھے تین دن تک حوالات میں رکھئے اگر عبد اللہ پر کوئی بلا نازل نہ ہو تو میرا خون حلال ہے، رشید نے یحییٰ کو فضل برمکی کے سپرد کیا فضل روایت

کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم ہم نے ابھی اس دن عصر کی نماز بھی نہ پڑھی تھی کہ عبد اللہ بن مصعب کے گھر سے چیخنے کی آواز آئی، بیٹے دریافت حال کے لئے آدمی بھیجے معلوم ہوا کہ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ میں اس کے یہاں گیا لیکن میں نے اس کو نہیں پہچانا، وہ سیاہ کوئلہ کے مثل ہو گیا تھا۔ میں رشید کے پاس گیا تاکہ اس کو خبر دوں ابھی میں نے بات بھی پوری نہیں کی تھی کہ اس کی موت کی خبر آئی۔ مگر رشید کا ظلم تو دیکھئے کہ وہ اسپر بھی باز نہ آیا اور امان نامہ پھاڑ ڈالا، اور یحییٰ کو جیلخانہ میں بھیجدیا، چند دن گزرنے کے بعد قاضی اور اہل دربار جمع ہوئے سبھوں نے کہا کہ امان نامہ صحیح ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں، یحییٰ خموش تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا آپ چپ کیوں ہیں؟

آپ نے اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا کہ مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں اور اپنی زبان نکالی آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا رشید نے کہا یہ تم کو وہم دلا رہے ہیں کہ ان کو زہر دیا گیا ہے، پھر آپ کو جیلخانہ میں واپس کر دیا اس کے بعد آپ کی کوئی خبر نہ ملی،

آپ کے واقعۂ شہادت کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں ایک روایت تو یہ ہے، کہ ایک حوض میں بھوکے شیروں کے سامنے چھوڑ دیا گیا اور وہ آپ کو نوچ کر کھا گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سندی ابن شاہک کے گھر میں ایک کمرہ کے اندر بند کر دیا اور اس کو مٹی وغیرہ سے بھر دیا۔

ابوالحسین ابن علی عابد آپ حضرت حسن مثلث ابن حسن مثنیٰ ابن امام حسنؑ کی اولاد میں تھے، آپ نے خلیفہ ہادی ابن مہدی عباسی کے زمانہ میں علویہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ میں خروج کیا محمد ابن علی ابن عیسیٰ اور محمد ابن سلیمان بن منصور نے بمقام فخ ۱۶۹ھ میں آپ کو جام شہادت پلایا اور آپ کی گردن مبارک کاٹ کر خلیفہ ہادی کے دربار میں بھیجی، ہادی کو اُن کی یہ حرکت پسند نہ آئی امام محمد تقی ابن امام علی رضا فرمایا کرتے تھے کہ کربلا کے بعد سب سے بڑی مصیبت واقعۂ فخ" ہے جو ہم لوگوں پر گزری۔

عبد المالک (آروی)

(**نگار**) ہمارے عزیز دوست مولوی عبد المالک آروی نے جس سوز و درد کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اُس سے کس کو ہمدردی نہ ہوگی، لیکن سوال یہ ہے کہ امویہ وعباسیہ کی تمام سختیاں

لہ (نگار) حیرت ہے کہ یحییٰ کے خلاف جھوٹی قسم کھانے پر ایک شخص تو مبتلائے جذام ہو جائے، لیکن خدا ان لوگوں کو چھوڑ دے جو دائمی ظلم وستم کے بانی تھے۔ اس نوع کی روایات ماننے میں مجھے بہت تامل ہے۔ نیاز

علوئین کے خلاف کیوں تھیں؟ کیا اس لئے تھیں کہ وہ آل رسول و معاونین آل رسول تھے؟ کیا محض اس لئے تھیں کہ بانی اسلام کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ مخالفت صرف اس لئے تھی کہ وہ ڈرتے تھے کہیں اُن کی حکومت نہ چھن جائے اور علوئین اُن کی سلطنت پر قابض نہ ہوجائیں۔ پھر جب یہ امر مسلم ہے کہ عہد خلافت کے بعد، امیر معاویہ کے عہد سے اسلام میں خالص دنیاوی حکومت شروع ہوگئی تھی اور بنی امیہ و بنی عباس میں جن جن کو خلفاء کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب انھیں اصول سیاست کے ماتحت اپنی حکومتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے، جو دنیا کے حکمرانوں نے ہمیشہ اختیار کئے ہیں، تو پھر اُن کے مظالم کا شکوہ کیوں کیا جائے؟

اگر تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ امویہ و عباسیہ نے علوئین پر ظلم کئے تو یہ بھی ثابت ہے کہ علوئین نے ہمیشہ در پردہ اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور بارہا امویہ و عباسیہ کے خلاف خروج بھی کیا۔ اس لئے اگر امویہ و عباسیہ نے اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دنیا کے ارباب حکومت نے ——— اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے ہمیشہ کیا ہے اور ہمیشہ کریں گے تو کیا الزام ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر امویہ و عباسیہ اس قدر سختیاں نہ کرتے، اتنی احتیاط سے کام نہ لیتے تو علوئین کا برسر اقتدار ہو کر حکمراں ہوجانا یقینی تھا اور امویہ و عباسیہ اُسے کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ اگر وہ سمجھتے کہ آل رسول واقعی مستحق خلافت ہیں اور حکومت و سلطنت انھیں کو ملنا چاہئے تو یہ جھگڑا بڑھتا ہی کیوں۔ الغرض تمام دنیاوی حکومتوں کے قیام کی تاریخ اسی طرح کی خونیں داستانوں سے معمور ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر علوئین برسر حکومت ہوتے تو امویہ و عباسیہ کے ساتھ وہ کوئی دوسرا سلوک کرتے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ امویہ و عباسیہ اگر واقعی مسلمان ہوتے تو آل رسول کے ساتھ اس قدر بدتمیزی کا سلوک کبھی نہ گوارا کرتے اس پر دونوں جانب سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس قسم کے مباحث کو چھیڑنا اب بالکل بیکار ہے جبکہ مسلمانوں سے خلافت و حکومت دونوں چیزیں چھین لی گئی ہیں اور علوئین و غیر علوئین سب کے لئے یہ "باب نزاع" الحمدللہ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا ہے۔

یہ وقت اس بحث کا نہیں کہ اس سے قبل ہم پر کیا گزر گیا، بلکہ یہ دیکھنے کا ہے کہ آئندہ ہم پر کیا گزرنے والا ہے۔ یعنی اب ضرورت گزشتہ اختلافات کے دہرانے کی نہیں ہے بلکہ آئندہ کسی ایک امر پر متفق و متحد کر دینے کی ہے۔ وللہ در ما قال

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوی کاندراں　　کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نزاند

(نیاز)

ناموس خاندان

(تمثیل)

سین —— قاضی صاحب ایک قدیم وضع کے زمیندار کی میلی کچیلی بیٹھک جمیں برائے نام سامان آرائش ہے کمرے کے کچے فرش پر کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ایک کثیف دری بچھی ہے - کھڑکیاں ندارد ہیں صرف ایک روشن دان اور دو دروازے ہیں - ایک دروازہ سڑک کی جانب ہے دوسرا زنانہ مکان میں کھلتا ہے - زنانہ مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا ایک موٹا پردہ پڑا ہے - داخلہ کے دروازہ کے بالکل مقابل، کمرے کے وسط میں دیوار سے متصل ایک تخت ہے جس پر پھٹا پرانا فرش بچھا ہے - اسی فرش پر ایک پیرانہ سال قاضی جی مع اپنی ریش دراز کے جلوہ افروز ہیں سفید ململ کا قدرے کثیف کرتا اور ڈھیلے ڈھالے پائچوں کا پائجامہ زیب بدن ہے - داہنی جانب تہ کی ہوئی جانماز اور قریب ہی تپائی پر لوٹا رکھا ہے - بائیں طرف ایک پرانے خاصدان کے پاس کچھ کتابوں کا ڈھیر ہے - تخت پر قاضی صاحب کے بالکل سامنے حقہ رکھا ہے - بائیں طرف کی دیوار سے ملی ایک چارپائی ہے جس پر ایک جانب تہ کئے ہوئے بچھونے کا پلندہ رکھا ہے - تخت کی داہنی طرف دو تین شکستہ حال کرسیاں جن کے ہتھے ٹوٹ گئے ہیں پڑی ہوئی ہیں - قاضی صاحب اکیلے بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہیں - حقہ کی نے منھ سے لگی ہوئی ہے - تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کش لگا لیتے ہیں - ٹھیک جس وقت قاضی صاحب کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہوتے ہیں - پردے کے پیچھے سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں پھر ایک بار آواز سنائی دیتی ہے :- "اے تم اکیلے ہی بیٹھے ہو نا؟" قاضی صاحب چونک کر گردن اٹھاتے ہیں "اچھا - تم ہو بی" —— جواب ملتا ہے "ہاں - کہو تو ذرا کی ذرا چلی آؤں - کچھ کہنا ہے"
قاضی صاحب سلیپر پہن کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتے ہیں :- "ٹھہرو - ذرا دروازہ بند کر لوں" —— دروازہ بند کر کے اپنی جگہ پر واپس آتے ہیں -

قاضی صاحب - لے اب چلی آؤ -

(تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر کی ایک عورت، چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنے، گلابی رنگ کا دوپٹہ جس میں سستے قسم کی لیس ٹکی ہے اوڑھے، آکر تخت کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے، ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہے جس میں پان کے دو تین بیڑے،

چھالیا اور سروتا رکھا ہے - تھالی تخت پر رکھدیتی ہے)

قاضی صاحب :- کہو کیا ہے - بی - (پان کا ایک بیڑا اٹھا کر منھ میں رکھ لیتے ہیں)

بی :- اے کچھ نہیں - نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کہنے آئی تھی -

قاضی صاحب :- نجمہ کے کپڑے ؟

بی :- ہاں - تمھیں تو معلوم ہی ہے - دس بارہ دن میں رحمت کا بیاہ ہونے والا ہے نا - آخر لڑکی کے لئے کچھ کپڑے درکار ہوں گے کہ نہیں - بچاری کے پاس ایک تار نہیں ہے - (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ہا ! غریب کے لئے میرا دل کیسا کیسا کڑھتا ہے ! ــــ (کچھ توقف کے بعد) خیر گہنے پاتے کا تو کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائیگا - مانگے کی دو چار چیزوں کا کہیں سے بندوبست ہو جائیگا - اب رہے کپڑے ــــ

قاضی :- تو پھر کہیں سے مانگے کے کپڑوں کا بھی بندوبست کرلو -

بی :- مانگے کے کپڑے ! اے ہٹو بھی - کیسی باتیں کرتے ہو ؟ بھلا سوچو تو برادری کیا کہے گی ؟

قاضی صاحب :- (مسکراتے ہوئے) اور برادری زیور کے بارے میں کچھ نہ کہے گی ؟

بی :- زیور - زیور کا معاملہ دوسرا ہے - آج کل سبھی مانگے تانگے کے زیور سے کام چلاتے ہیں - ابھی اس دن کی بات ہے مولوی رحمٰن کی دلھن خانصاحب کی بڑی بہو کا جھومر اور گلوبند پہنے تھیں - میں نے دیکھتے ہی تو پہچان لیا میں بولی " اے ہے سارہ کیسا پیارا گلوبند ہے !" بس سارہ کا تو جیسے خون خشک ہوگیا ہو - مگر ان کی ساس بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں - بڑھیا ڈھڈو - نہ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت - قبر میں پاؤں لٹکائے تو بیٹھی ہیں لیکن اب تک شوخ رنگ کے کپڑے پہننے کا ارمان نہ گیا - جب دیکھو پوپلے منھ میں پان ٹھنسا ہوا ہے - منمناتی ہوئی آواز میں بولیں " تمھیں بھی پسند آیا - اے یہ نگوڑا گلوبند ہی ایسا - جس نے دیکھا پسند کیا - اچھا ہے نا ؟" میں نے کہا بیشک بڑا خوبصورت ہے - اور دیکھنا خانصاحب کی دلھن کے گلوبند سے کتنا ملتا جلتا ہے - جیسے ایک ہی کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو - رتی برابر بھی تو فرق نہیں " بس میرا یہ کہنا تھا کہ بڑھیا پیک کی پچکاری مار گول گول دیدے بنا کے کہتی کیا ہے " کہاں خانصاحب کی دلھن کا گلوبند کہاں یہ - ہٹو بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو - ہوش کے ناخن لو - ابھی پرسوں تو سارہ کا دولھا اس کے لئے لکھنؤ سے یہ گلوبند مول لایا ہے " ــــ اللہ اکبر ! ذرا یہ دیدہ دلیری کا سفید جھوٹ تو دیکھو - میں بولی " بہن خیر - خدا کا شکر ہے - چلو داماد کمانے کے تو قابل ہوا - مبارک ہو " پھر اس پر طرہ یہ کہ ....

قاضی جی :- (بات کاٹتے ہوئے) اچھا - اچھا - ہوگا - اب یہ بتاؤ کہ نجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کیا طے کیا کتنی لاگت آئے گی ؟

بی :- اب میں کیا جانوں - منالال بزاز کو کھڑے کھڑے بلوا لیتے - وہ حساب کر کے بتا دے گا -
قاضی صاحب :- لیکن آخر تم نے بھی تو کچھ اندازہ لگایا ہوگا -
بی :- اچھا ٹھہرو - بتاتی ہوں (قدرے توقف کے بعد) اب تم یوں سمجھو کہ کم سے کم دو جوڑے تو چاہئے ہی ہوں گے -
قاضی صاحب :- دو جوڑے کیسے ؟ ایک سے کام نہیں چل سکتا -
بی :- تم بھی کیسے بھولے ہو - جانتے ہو کہ لڑکی رات کی رات مہمان رہے گی - آخر دوسرے دن جوڑا بدلنا چاہئے کہ نہیں ؟ —— کیا تمھارا مطلب ہے بچاری دو دن تک وہی جوڑا پہنے رہے !
قاضی صاحب :- (سٹپٹا کر) لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے ؟
بی :- حرج ! میں کہتی ہوں لوگ کیا کہیں گے - دیکھ لینا ہر طرف تھڑی تھڑی ہوگی - مہمان ایک دوسرے سے کانا پھوسی کریں گے " اے دیکھنا بہن قاضی صاحب کی دلھن کے پاس بس یہی ایک جوڑا ہے - کل شام کو بھی اسی کو پہنے ہوئے تھیں - آج پھر وہی ڈانٹے ہیں " —— اور پھر یہ لوگ اپنے کو رئیس اور نواب کہتے ہیں " ہونھ ، مجھ سے نہ ہوگا کہ میں چپکی بیٹھی یہ طعنے سنا کروں - یہ بڑا عزت آبرو کا معاملہ ہے میں اپنی بچی کو کپڑے لتے سے آراستہ کئے بغیر ہرگز تو برات میں جانے نہ دوں گی - واہ ....
قاضی صاحب :- لیکن بی - تم جانتی ہو آج کل خرچ کی کیسی تنگی ہے -
بی :- خرچ - خرچ کی تو ہمیشہ ہی تنگی رہتی ہے - کوئی نئی بات ہے —— مگر ....
قاضی صاحب :- مگر کیا ؟ -
بی :- مگر یہ کیا مہاجن سے کچھ روپیہ قرض نہیں لیا جا سکتا - اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ ایک چھوٹی سی رقم کے لئے وہ انکار کر دے -
قاضی صاحب :- لیکن تم نے یہ نہ بتایا کہ آخر کپڑوں میں خرچ کتنا ہوگا -
بی :- ٹھہرو - مجھے سوچنے دو (سوچتی ہے اور انگلیوں پر کچھ حساب لگاتی ہے) بس یہ سمجھو کہ کوئی دو سو روپئے درکار ہوں گے -
قاضی صاحب :- (تعجب کے لہجے میں) دو سو !!!
بی :- ہاں دو سو - بات یہ ہے کہ گھر میں پہننے کے کپڑوں سے تو بہرحال یہ جوڑے اچھے ہونا ہی چاہئے - اسی سے دام بھی زیادہ لگیں گے - لڑکی انھیں کوئی روز روز تھوڑی پہنے گی - وہ تو شادی بیاہ کے موقعوں کیلئے ہوں گے ——

قاضی جی :۔ (تعجب کے لہجے میں دوبارہ) دوسو بی !!

بی :۔ دوسو سے تو کم میں کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ آخر کچھ اپنی حیثیت کا، خاندان کے ناموس کا بھی تو خیال کرو۔۔ اور روپیہ کا کیا ہے؟ روپیہ تو ہاتھ کا میل ٹھہرا۔ ادھر آیا اُدھر خرچ ہوا۔ بڑی چیز عزت آبرو کا پاس ہے۔ اُس سے کیا فائدہ کہ لوگ طعنے دیں کہ "ہاں بہن۔ بیاہ تو بڑے دھوم دھڑکے سے رچایا لیکن اب دلہن کی گت دیکھو۔ بدن پر چیتھڑا تک نہیں"

قاضی صاحب :۔ (مری ہوئی آواز میں) تمھیں معلوم ہے بی۔ وہ جو اس بیاہ کے لئے میں نے دس ہزار کی رقم قرض لی تھی اب قریب قریب دگنی ہوگئی ہے۔ اور اصل تو درکنار اب تک سود تک ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے

بی :۔ روپیہ! روپیہ ۔۔۔ خدا کی مار اس موئے روپئے پر۔ جب دیکھو روپئے کی پکار مچی ہوئی ہے۔ روپیہ کوئی ہمارے ساتھ عاقبت میں تو بخشوانے جائیگا نہیں؟ ۔۔۔ تو پھر بولو کیا کہتے ہو۔

قاضی صاحب :۔ (اکتاکر) اچھی بات ہے بی۔ سوچ کر بتاؤں گا۔

بی :۔ سوچ کر بتاؤ گے؟ ۔۔۔ یہ خوب کہی۔ میں نہیں جانتی۔ اسی اٹھوارے میں کپڑے سل کر تیار ہو جائیں سمجھے کہ نہیں ۔۔۔ آخر منالال بزاز کو کیوں نہیں بلوا بھیجتے'

قاضی صاحب :۔ منالال بزاز کو کس منھ سے بلوا بھیجوں۔ ابھی ابھی تو اُس نے حساب بھیجا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ بغیر پچھلا روپیہ بیباق ہوئے وہ کپڑا دینے کو تیار ہو جائے۔ خیال تو کرو کتنے دنوں سے رقم چڑھی ہوئی ہے کہاں تک صبر کرے بیچارہ؟

بی :۔ (پان کا بیڑا کلے میں دبائے ہوئے) جو کچھ بھی ہو فصلانہ کی وصولیابی تک تو اُسے انتظار کرنا ہی پڑیگا

قاضی صاحب :۔ فصلانہ؟

بی :۔ ہاں فصلانہ کی وصولی میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں۔ دس بارہ روز میں وصول ہو جائیگا۔ سوچتی ہوں فصلانہ ملتے ہی نجمہ کے گلوبند مہاجن کے یہاں چھڑوا لوں۔ کب سے گروی پڑا سڑ رہا ہے۔

قاضی صاحب :۔ مگر بی۔ فصلانہ تو جو کچھ وصول ہوگا سرکاری مالگذاری میں چلا جائیگا۔

بی :۔ سرکاری مالگذاری!

قاضی صاحب :۔ ہاں مالگذاری تھوڑی روکی جا سکتی ہے۔ مہاجن اور بزاز کو تو خیر ٹالا بھی جا سکتا ہے لیکن سرکاری مالگذاری کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔

بی :۔ یکایک روپڑتی ہے) میں سمجھ گئی۔ تم مجھے الو بناتے ہو ۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں......

(بی ہچکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔ قاضی صاحب ہکا بکا ہو کر بیوقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھتے ہیں)

اوں اوں ـــــ دنیا جہان کی بہو بیٹیاں (ہچکی) کیسے اچھے اچھے (ہچکی) ـــــ کیسے اچھے اچھے (ہچکی) کپڑے پہنتی اوڑھتی ہیں (ہچکی) ـــــ گہنے پاتے سے (ہچکی) گوندنی کی طرح لدی رہتی ہیں ـــــ اور ـــــ اور میری بچی (ہچکی) موئے کنگالوں کی طرح جیتھڑے لگائے...... (ہچکی) کیسی ذلت کی بات ہے!!

قاضی صاحب :- ہائیں - ہائیں بی ـــ سنو تو ـــ ارے بھئی (کھڑے ہو کر) اچھا میں ابھی بزاز کو بلوائے دیتا ہوں۔

بی :- (آنسو خشک کرتے ہوئے) تو پھر جلدی کرو۔

قاضی :- اور تم! آخر تمھیں بھی تو کپڑے چاہئے ہیں۔

بی :- اونھ - میرا کیا ہے؟ تم میری فکر نہ کرو۔

قاضی :- لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کپڑے تو تمھیں بھی درکار ہوں گے۔

بی :- نہیں جی - میرا کیا ہے۔ لشتم پشتم جو کچھ ملیگا پہن لوں گی ـــــ گر میری بچی کو اچھی طرح حیثیت کے موافق پہن اوڑھ کر جانا چاہئے۔

(اندر سے ایک آواز سنائی دیتی ہے)

آواز :- اماں - اماں

بی :- کون؟ ـــ جعفر۔ مدرسہ میں آج جلدی چھٹی ہوگئی کیا؟

(اٹھارہ سال کا ایک اول جلول لڑکا' بدوضع کپڑے پہنے' بونقوں کی صورت بنائے داخل ہوتا ہے)

بی :- (جعفر کے اترے ہوئے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھکر) خیریت تو ہے جعفر؟ ـــــ بیٹا تم اداس کیوں ہو؟ ـــــ

جعفر :- اماں - فیس

قاضی :- فیس؟

جعفر :- جی ہاں - آج داخل ہو جانا چاہئے نہیں تو - نام کٹ جائے گا۔ اور ماسٹر صاحب کہتے تھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی۔

بی :- (جعفر کے پاس آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ـــــ میرا بچہ! میرا بچہ ـــــ یہ ماسٹر گوڑی یونہی روز روز میرے لال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ـــــ ابھی اسی روز بچارے کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی' یا جانے کیا تو درجے میں بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے۔

جعفر :- ہاں اماں - خوب یاد دلایا - قواعد کی کتاب آج ہی مل جائے - نہیں تو انگریزی کے ماسٹر صاحب

مدرسہ کے پاس نہیں پھٹکنے دیں گے -

قاضی :- خدا غارت کرے ان ماسٹروں کو! کتابیں ----- کاپیاں ----- فیس ----- روز ہی رونا - روز ہی چیخ پکار! آخر ہم نے بھی تو پڑھا ہے - ہم نے تو اتنی عمر میں کبھی نہ اتنی کتابیں خریدیں نہ ڈھیر کی ڈھیر کاپیاں مول لیں - تختیوں سے خاصہ کام چل جاتا تھا ----- یہ انگریزی تعلیم تو ہمارا دیوالہ نکالے دیتی ہے -

بی :- اور پھر کتابیں بھی کیسی ----- کیڑوں مکوڑوں جیسے مہین مہین حرفوں سے لپی ہوئی - میں تو جعفر سے کہا کرتی ہوں کہ بچے یہ کتابیں پڑھ پڑھ کے ایک دن تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گا -

جعفر :- (تھوڑے توقف کے بعد) - اماں فیس -

قاضی صاحب :- (جھنجھلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں) میں کہتا ہوں تمھارے ماسٹر صاحب دو چار دن صبر نہیں کر سکتے - کوئی فیس لیکر بھاگا نہیں جا رہا ہے -!

جعفر :- لیکن یہ رقم کوئی ان کی جیب میں تو جائیگی نہیں - آپ تو جانتے ہیں کہ ....

قاضی :- اچھا کل کتنی فیس ہوئی ؟

جعفر :- پچیس روپئے -

قاضی :- پچیس روپئے ؟ خدا کی پناہ ! .... پچیس روپئے !!

جعفر :- ہاں ابا -

قاضی :- پچیس روپئے - جاؤ بیٹا - اپنے ماسٹر صاحب سے کہدینا کہ وہ مجھے اس طرح الو بنا کر نہیں لوٹ سکتے

جعفر :- (متعجب ہو کر) مگر ابا یہ تو میرے امتحان کی اور پڑھائی کی فیس ہے -

قاضی :- (غضبناک ہو کر) بلا سے - ہو گی امتحان کی فیس ----- مجھے تمھارا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھایا ----- لڑکوں کو اچھا خاصہ کرستان بنا دیتے ہیں - جہاں شد بد پڑھ لیا بس داڑھی منڈا، فرنگیوں جیسے کپڑے پہن، لگے ادہر ادہر اینڈنے -

بی :- اے ہاں - ٹھیک تو کہتے ہو - دور کیوں جاؤ لے اب سجاد ہی کو دیکھ لو نا - پکا کرستان بنا پھرتا ہے - روزہ رکھنا اس کے نزدیک فاقہ کرنے کے برابر ہے - نماز پڑھنے کو توبہ توبہ نعوذ باللہ ٹکریں مارنے کے برابر سمجھتا ہے - داڑھی مونچھ غائب - موئے فرنگیوں کی طرح چوکی کے بدلے پاٹے پر بیٹھتا ہے ----- نابابا! میں باز آئی اپنے بچے کو ایسے مدرسے میں بھیجنے سے !

جعفر :- لیکن اماں - آپ کو معلوم ہے مجھے پڑھنے کا کتنا شوق ہے -

بی :- میرے لال اس پڑھائی سے میں پوچھتی ہوں، آخر فائدہ کیا - کوئی لاٹ گورنر تو بن نہیں جاؤ گے ؟ .....
.... رہا پڑھنے کا شوق - سو تمھارے ابا کے پاس ایک چھوڑ نہ جانے کتنی کتابیں بھری پڑی ہیں جب جی چاہے پڑھو - کوئی منع کرتا ہے ؟

جعفر :- اماں آپ تو سمجھتی نہیں — یہ کتابیں میرے کس کام کی عربی فارسی کی کتابیں -

قاضی :- (غصہ میں) کیا کہا ؟ پھر تو کہنا یہ کتابیں کس کام کی ——

—— ہاں بھلا یہ کتابیں جن میں خدا رسول کی باتیں لکھی ہوں، جنھیں پڑھنے سے عاقبت درست ہو تیرے کس کام کی ! !

جعفر :- مگر ابا - اب آج کل تو ان کتابوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا —— اور میں کہتا ہوں آخر ایسی کتابوں کے پڑھنے سے فائدہ ہی کیا ؟ سوا اس کے کہ انھیں پڑھ پڑھ کے آدمی اچھا خاصا "ملانٹا" بن جائے سو مجھے تو ملا بننے سے چڑھ ہے -

قاضی :- (کھڑے ہو کر جعفر کی طرف بڑھتے ہوئے) چپ رہ - نالائق ! میرے سامنے ایسی واہیات باتیں ! پاجی کہیں کا - دور ہو جا میرے سامنے سے —— دیکھتی ہو اس پاجی کی بدتمیزی - یہ انگریزی تعلیم کا اثر ہے - نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ - بس خدا رسول کا مضحکہ اڑانے کو دیدو ....
ٹھہر تو جا مردود ! ابھی مزہ چکھاتا ہوں اس گستاخی کا (قاضی صاحب دانت پیستے ہوئے جعفر کی طرف بڑھتے ہیں - بی ان کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

بی :- جعفر کے ابا ! جانے دو - چلو ہوگا - بچہ تو .....

قاضی :- بچہ ہے ؟ انیسواں سال لگ گیا اور ابھی — بچہ ہی ہے — نچا لفنگا کہیں کا نکل یہاں سے مردود !

بی :- اے یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے - لے بس اب غصہ تھوک دو - چلو کھانا کھائیں جعفر غریب بھوکا ہوگا -
کندن ! اری او کندن ! ....

کندن :- اچھا بی - آئی -

بی :- کندن - کھانا تیار ہوا ؟

کندن :- بی للو ابھی ابھی بنئے کے ہاں سے پلٹا ہے موئے نے سودا وودا کچھ بھی نہیں دیا کہلوا بھیجا ہے کہ جب تک پچھلا حساب چکایا نہ جائیگا میں ایک دانہ نہیں دینے کا -

بی اور قاضی صاحب :- (ہم آواز ہو کر) یہ کیا ؟ —— اس کے کیا معنے ہیں ؟ ! !

جعفر :- خدایا روز یہی رونا رہتا ہے —— مجھ سے نہیں دیکھا جا سکتا - میں نہیں برداشت کر سکتا آج

پیسہ کی تنگی ہے، کل روٹی کی محتاجی ہے ——— میں نکل جاؤنگا - مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالوں گا

قاضی :- کیا بکتا ہے بے ہودہ ! تجھ سے بیچ میں ٹانگ اڑانے کو کس نے کہا تھا -

جعفر :- ابا - آپ ہی بتائیے - آخر کب تک اس طرح کام چلے گا - اس مصیبت کا کوئی علاج تو ہمیں سوچنا ہی پڑے گا -

قاضی :- بس بس خاموش رہ - نہیں تو ایسا ٹھیک کردوں گا کہ یاد کرے گا -

جعفر :- ابا - مجھ سے نہیں دیکھا جاتا - مفلسی اور ناداری کی یہ زندگی نہیں دیکھی جاتی ——— یہ پیسہ پیسہ کی محتاجی ! آہ کس قدر ذلت کی بات ہے - ہم سے ایک معمولی مزدور ابھی اچھا ہوگا - دن بھر محنت مشقت کرکے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کیا - شام کو مٹھی بھر پیسے ملے - بس مگن ہوگیا - آہ کیسا اطمینان کتنی آزادی ! - اور ہم ؟ ہم جو رئیس اور نواب کہلاتے ہیں - شریف بنے اینڈتے پھرتے ہیں - ذرا خیال تو کیجئے ہم لوگوں نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے - - - - - ہم فاقے کرتے ہیں بھوکوں مرتے ہیں لیکن کیا مجال جو ہاتھ پاؤں ہلائیں کوئی کام کاج کریں ——— ہم کتوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں - ہمارا وجود ایک آسمانی بلا ہے ایک ہولناک عذاب !! - - - - - -

قاضی صاحب :- ابے چپ رہتا ہے کہ نہیں -

بی :- (قاضی صاحب اور جعفر کے درمیان بیچ بچاؤ کرتے ہوئے) جعفر کے ابا - - - - - - اجی جعفر کے ابا ---

جعفر :- نہیں - ہرگز نہیں چپ ہونگا - بولے جاؤنگا - خوب چیخونگا - دل کی بھڑاس نکالے بغیر زبان نہیں روکوں گا اب مجھ میں ضبط کی قوت باقی نہیں - چپکا بیٹھا اس ذلت آمیز مفلسی کا تماشا نہیں دیکھ سکتا - - - - - - اماں کے یہ میلے کچیلے چیتھڑے، یہ کثیف گدڑی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے کلیجے پر گھونسہ مار دیا ہو - - - - - - - - - جب دیکھو خرچ کی تنگی ہے - جب سنو بنئے کے یہاں سے ادھار آرہا ہے مہاجن کا سود چڑھتا جاتا ہے ——— اور یہ ظالم بنئے اور مہاجن - انسانی جونکیں ! یہ ہم لوگوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس کر چھوڑیں گے - - - - آخر کب تک صبر کروں ؟ کب تک یہ اذیتیں سہوں ؟ --- نہیں نہیں ایک منٹ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا - جہاں سینگ سمائیں گے نکل جاؤنگا اور مزدوری کرکے پیٹ پالونگا ———

بی :- (جلدی سے جعفر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) ہائیں جعفر ! کیا بکتے ہو ؟ مزدوری کروگے ؟ باپ دادا کی عزت پر بٹہ لگاؤگے ؟ خاندان کا نام ڈبوؤگے ؟

جعفر :- باپ دادا کی عزت ! خاندان کا نام ! - - - - - - سب وہم ہے - سب ڈھوکہ ہے - کیسا ننگ ناموس

عصمت بی بی از بیچارگی

" غرض یہ کہ اس بے لطف زندگی سے میری طبیعت اکتا گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے میری ہر فرمائش کی تعمیل کی خواہ اس میں کتنا ہی روپیہ صرف ہو، لیکن دنیا میں اس کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جن کے لئے زندگی بیتاب رہتی ہے۔ اپنی آئندہ زندگی خوشگوار بنانے کے لئے ایک موقع ہاتھ آیا ہے۔ اور اس سے میں فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں اسلئے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ "

اس کے بعد دو تین جملے اور لکھ کر خورشید النساء نے دستخط کئے، اور لفافہ بند کر کے مکتوب الیہ کا نام لکھا —— "جب وہ یہاں آئیں گے تو اُن کی نظر ضرور اس پر پڑے گی" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس نے اپنے شوہر، حامد حسین خان کے کمرے کا رُخ کیا، اور دھڑکتے ہوئے دل سے سنگار کی میز کا خانہ کھینچا۔ جو چیزیں اس میں رکھی ہوئی تھیں ان کو ادھر ادھر ہٹا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کو مناسب جگہ پر رکھ دیا مگر میز کے خانہ کو بند کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا، دم گھٹنے لگا۔ وہ گھبرا اٹھی، اور لفافہ کو وہاں سے اُٹھا کر کھڑکی کی طرف گئی۔ اس کو کھولا تو ہوا کے خنک جھونکوں کی وجہ سے پھر اس کے بے چین قلب میں کچھ سکون پیدا ہوا —— اور وہ اپنے ارادے پر زیادہ مضبوطی سے قائم ہو گئی۔

لوٹ کر لفافہ کو آئینہ کے سہارے ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا، اور جلدی جلدی اپنے کمرے کی طرف جا کر کریم بی کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

اتنے میں کریم بی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اطلاع دی "سواری دروازے پر موجود ہے" خورشید نے ایک ٹرنک اور صندوقچہ اس کے حوالہ کیا، اور جھٹ پٹ موٹر میں سوار ہو گئی۔

"ابھی ساڑھے پانچ بجے ہیں" خورشید نے کریم بی سے مخاطب ہو کر کہا "اور ریل ساڑھے چھ بجے روانہ ہو گی" آدھا راستہ طے ہونے پایا تھا کہ مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک ادھ موٹر سرسے گزر جاتا تھا ورنہ سڑک صاف تھی۔ خورشید کا

موٹر نہایت تیزی سے گذر رہا تھا - ریل کے آنے میں ابھی دیر تھی اس لئے کریم بی نے خورشید کو ویٹنگ روم میں پہونچا دیا ——

چھ بج چکے ، لیکن حکیم کا کوئی پتہ نہ تھا - خورشید اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور تاخیر کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا خورشید کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا - اور طرح طرح کے خوفناک اور مایوس کن خیالات اس کے دل میں آرہے تھے -

---

زنانہ ویٹنگ روم سے ملحق کمرے میں کچھ لوگ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں - خورشید جس کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے وہ اس بند دروازے سے ملی ہوئی ہے ، جو دونوں کمروں کے درمیان واقع تھا ایک شخص نے کسی قدر بلند آواز میں یہ خبر پڑھنی شروع کی : "حیرت انگیز واقعہ ' جواہرات کا سرقہ - عبدالحکیم نامی ایک خوش پوش - نوجوان کو عین فرار کے وقت گرفتار کر لیا گیا - متعدد افراد نے نشان دہی کی "

حکیم کا نام سنتے ہی خورشید کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - اس کا دل دھڑکنے لگا ، اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا —— اُس نے ضبط کر کے اپنے آپ کو سنبھالا ' اور کریم بی سے ایک اخبار لانے کے لئے کہا - سرورق پر حکیم کا فوٹو اور "جواہرات کا سرقہ" دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے اور سکتہ کا عالم طاری ہوگیا —— " واپس چلو —— جلدی " خورشید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ، اور اُٹھ کھڑی ہوئی - خادمہ نے دوڑ کر ایک موٹر کو اشارہ کیا اور خورشید اس میں سوار ہوگئی ——

اب اس کے لئے صرف ایک اُمید رہ گئی تھی —— یعنی حامد سے پہلے مکان پہونچ کر اس لفافہ کو اُٹھا لے —— بارش رک گئی تھی مطلع صاف تھا - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں اور راستوں پر کافی چہل پہل تھی - خورشید بار بار شوفر کو تیز چلانے کے لئے کہہ رہی تھی - اس کی حالت اس خونیں مجرم کی سی تھی جس کے قصاص کا وقت قریب ہو ، لیکن خفیف سی اُمید جان بخشی کی بھی ہو —— اس کی یہ اُمید صرف اس بات پر قائم تھی کہ حامد اس دن دیر سے گھر لوٹنے والا تھا -

موٹر مکان کے دروازے پر رکی ، خادمہ نے دروازہ کھولا خورشید جھٹ سے مکان میں داخل ہوگئی اور نہایت تیزی سے حامد کے کمرے کی طرف بڑھی —— اپنے خط کو وہاں نہ پایا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ، دل دھڑکنے لگا ، اور وہ اُس آئینہ کے سامنے بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی —— یکایک اس کی نظر حامد پر پڑی ، جو پلنگ کے نیچے جھک کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا -

حامد کی نظر خورشید پر پڑی تو اس نے پر استعجاب لہجہ میں کہا "کیوں آگئیں ! ——

وہ دم بخود ہوگئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا ــــ اس کے ہونٹ خشک تھے، اور سانس نہایت تیزی کے ساتھ چل رہی تھی ـــــــــ

"کب سے کف کے بٹن ڈھونڈھ رہا ہوں" حامد نے جھلا کر کہا۔

خورشید نے میز کے نیچے اپنا بند لفافہ دیکھا اور فوراً جھک کر اُس کو اُٹھا لیا۔

میر حسن (جامعہ عثمانیہ)

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

دورِ حاضر کی روحانیئین کی جماعت میں سب سے زیادہ دلچسپ مبحث یہ ہے کہ "ماورائے قبر کیا ہوگا، کیسی سرزمین ہوگی، کیا موسم ہوگا، کیسے کھانے ملیں گے اور کس قسم کی صحبت میسر آئے گی۔ پڑھنے کے لئے عمدہ کتابیں۔ پہننے کے لئے عمدہ پوشاکیں اور محبت کرنے کے لئے جمیل صورتیں ملیں گی یا نہیں" یہ مسئلہ واقعی بہت دلچسپ اور قابلِ غور ہے۔ ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی رائے کسی ماہرِ فن کی دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ روحانیئین کی ایک جماعت یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ روح قالب سے جدا ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک بے خبر رہتی ہے، نہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ کہ اس پر کیا گزر رہی ہے پھر جب اس کو احساس اس انقلاب کا ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش ——— پر ایک غائر نظر ڈالتی ہے اور اپنی گزری ہوئی زندگی کی طرح وقت گزارنے لگتی ہے یعنی عالمِ ارواح میں بھی بالکل وہی مشاغل اختیار کر لیتی ہے جو دنیا میں اختیار کئے تھے۔

ایک سنجیدہ گروہ سر آلیور لاج کے اس عقیدہ کی جو اس نے ریمانڈ میں ظاہر کیا ہے تضحیک کرتا ہے کہ "ماورائے قبر دوکانیں ہیں، جہاں ارواح خرید و فروخت کر سکتی ہیں۔ اور جن کو عمدہ شرابیں، سگرٹ اور سوڈا وغیرہ مل سکتا ہے"۔ مسٹر ڈیل اون نے ویکلی ڈسپیچ میں اپنے اکتشافات ماورائے قبر کے متعلق

لہ ممکن ہے سر آلیور لاج کا یہ عقیدہ قابلِ مضحکہ قرار دیا جائے لیکن کم از کم مسلمانوں کو اس کی تضحیک کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ ان کی روایاتِ مذہبی میں بھی بکثرت اس نوع کی باتیں بہ سلسلۂ "لذائذِ جنت" ظاہر کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اہلِ اسلام کا یہ نہایت مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ "جنتی جس چیز کی خواہش کریگا فوراً مہیا ہو جائے گی" پھر اس "ہر چیز" میں "شراباً طہوراً" تو خیر شامل ہی ہے، رہ گیا سوڈا سو حوضِ کوثر کے چھلکتے ہوئے جام میں اگر یہ صفت بھی نہ پائی گئی کہ وہ حسبِ ضرورت و خواہش "آب نمک" بن جائے تو بات ہی کیا ہوئی، البتہ سگرٹ کا معاملہ ضرور غور طلب ہے کیونکہ جنت میں آگ کا پایا جانا مستبعد ہے، سو ممکن ہے اس کے لئے وہاں اک خاص قسم کی "آتشِ سرد" پیدا کر دی جائے اور شعاع "ماوراء البنفسجی" (Ultra Voilet ray) کی طرح کسی کو نظر نہ آئے۔

سر آلیور لاج اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہی (ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳)

شائع کئے ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ روحی میدانوں میں ہماری زندگی دنیاوی زندگی کا ایک صیقل شدہ آئینہ ہے، یہاں تک کہ اختلاط محبت، اور شادیاں بھی اس روحی دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر شے اس دنیا سے زیادہ خوبصورت وہاں موجود ہے، لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس دنیا میں محبت نام ہے خواہشات نفسانی کا اور وہاں یہ بات نہیں ہے[۵]۔ روحانیئن کسی حد تک ہمارے برادران وطن کی طرح عقیدۂ تناسخ کے بھی قائل

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲) بلاتخصیص و تفریق ہر شخص کو ان لذائذ کا مستحق قرار دیتا ہے اور اہل اسلام صرف "مومنین قانتین" کیلئے مخصوص کرتے ہیں اور وہ بھی محض "فضائے فردوس" میں — ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد فردوس تک پہونچنے کا جو زمانۂ انتظار ہے اس میں مومنین کے لئے کوئی اور سامان تفریح و دلچسپی مہیا کر دیا جائے۔ کیونکہ خدا بڑا قدرت والا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو اس کے جی میں آئے اور انسان کی سمجھ میں کبھی نہ آئے —— تری شان جل جلالہٗ (اڈیٹر)

[۵] خوب! یہ بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے — کیا وہاں بھی اس امر کا اندیشہ انسانی اعصاب کو مضمحل کر دیگا کہ گناہ کیا نہیں اور "جنت کی حوریں" چھنی نہیں! اہل اسلام کے مذہبی لٹریچر میں جس جگہ حوران فردوس کا بیان ہے وہاں ان کے حسن وجمال و "شدت دوشیزگی" کا ذکر تو ضرور پایا جاتا ہے کہ لم یطمثھن قبلھم انس ولا جان (یعنی اس سے قبل ان کو کسی انس و جن نے ہاتھ ہی نہیں لگایا) لیکن کھلے الفاظ میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ ان حوروں کا مصرف کیا ہوگا — غالباً تہذیب و شائستگی مانع تھی کہ اس کا اظہار کیا جاتا اور صرف "ذہن سامع" یا "ذولولۂ مومن" پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ اس خلا کو پُر کرے — اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ روحانیئن مغرب نے اس "محبت بے نفس" کا خیال کہاں سے پیدا کیا — ہو سکتا ہے کہ متصوفین کے "عشق حقیقی" سے استعارہ کیا گیا ہو، مگر اس کا تعلق تو غالباً "حسن مجرد" سے ہے، نہ کہ "حسن انسانی" سے۔ بہرحال مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ عقیدہ بھی اک ناقص و نامکمل عقیدہ ہے اور وہ کبھی اس مفاہمت کے لئے طیار نہیں ہو سکتے کہ ساری عمر "نماز و روزہ و تسبیح و توبہ و استغفار" میں بسر کر دینے کے بعد اس کا اجر ملے بھی تو ایسی عورت کی صورت میں جسے وہ ہاتھ بھی نہ لگا سکیں!

غالب نے تو خیر جنت کے مفہوم میں، یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ "وہاں کی دیواروں میں روزن ہوں اور وہ اُن سے تاک جھانک کرے، یہ حوروں کو بلائے اور وہ گریز کریں، یہ اُن سے پوچھے کہ کب ملوگی اور وہ جھوٹی قسم کھا کر کل پر ٹالدیں وغیرہ وغیرہ"۔ لیکن یہ تو ہیں غالب کی شاعرانہ بیہودگیاں جن پر اگر اُسے کافر قرار دیکر دوزخ میں ڈالدیا جائے تو عجب نہیں —— لیکن ہاں اب اتنی تہذیب بھی ٹھیک نہیں کہ "ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

الغرض مغربی روحانیئن کی یہ محبت بغیر ہیجان نفس، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے —— افسوس ہے کہ یہ لوگ جو فطرت انسانی کے سمجھنے میں اپنے آپ کو بڑا ماہر جانتے ہیں، اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ "فلسفۂ لذت" کیا ہے۔ کاش یہ مولویوں کی تعلیمات کو سمجھیں اور اس کی حقیقت پر ایمان لائیں —— (اڈیٹر)

نظر آتے ہیں، لیکن ـــــ اس ترمیم کے ساتھ ـــــ کہ ایک مرتبہ جو انسان پیدا ہوچکا ہے وہ دوسرے جنم میں بھی انسان ہی پیدا ہوگا اور جانوروں کی صورت اختیار نہ کریگا۔

ایک مرتبہ چند احباب میز پر بیٹھے ہوئے معمول کے ذریعہ سے کچھ اخبار غیب معلوم کر رہے تھے کہ ایک صاحب بغیر اجازت کے کمرہ میں داخل ہوگئے اور دفعتاً وہ سلسلہ بند ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد سرخ روشنی دیواروں پر اور خصوصیت سے ان صاحب کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر سب سہم گئے کیونکہ سُرخ رنگ کی روشنی نہایت شریر اور خوفناک ارواح خبیثہ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ سب کو سہما ہوا دیکھ کر وہ صاحب بھی سہم گئے تھوڑی دیر کے بعد دیوار پر لگی ہوئی گھنٹیاں زور سے بجنے لگیں۔ "وسیط" یا معمول سے حروف تہجی کے ذریعہ سے دریافت حال شروع کیا تو ش - م - ش - ا - حروف سمجھ میں آئے جن سے کوئی مفہوم نہ پیدا ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر میں ایک نیلی روشنی رقص کرتی نظر آئی اور اُس نے سمٹ کر ایک انسانی چہرہ کی صورت اختیار کرلی لوگوں نے دریافت کیا کہ کس سے گفتگو مقصود ہے۔ وہ صاحب جو نووارد تھے کہنے لگے یہ تو میرے ایک مرحوم دوست ہیں جن کی موت پر اسرار طریقہ سے واقع ہوئی تھی آج ۲۵ برس کے بعد میں نے ان کو دیکھا ہے۔ ان کا نام شمشاد تھا۔ اب سب کو خیال آیا کہ ش - م - ش - ا جو حروف پیدا ہوے تھے وہ یقیناً شمشاد کے حروف تھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب وہ ماورائے قبر پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک پیشہ ور عورت نے اُن کی روح کو پریشان کر رکھا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کی زندگی بھی اسی دنیا کی زندگی کا باقی حصہ ہے اور جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کی ہے[1] اسی طرح دوسری دنیا میں بسر کریگا۔

جب پوچھا گیا کہ وہ عورت کون ہے جس نے شمشاد کی روح کو پریشان کر رکھا ہے تو شمشاد نے وسیط کو اشارہ کیا اس نے پنسل اپنے ہاتھ میں لی اور غیر ارادی طور پر حسب ذیل نقشہ بن گیا۔



---

[1] کس قدر لغو و مہمل خیال ہے۔ یعنی جس نے اس دنیا میں عیش و مسرت سے زندگی بسر کی ہے وہاں وہ بھی مزہ میں رہیگا اور جس نے یہاں تکلیف اٹھائی ہے وہاں بھی مبتلائے آلام رہیگا۔ (اڈیٹر)

اس نقشہ کو کوئی سمجھ نہ سکا لیکن بعد کو نووارد صاحب نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام ان کے مکان کے پشت پر واقع ہے جو اب مزبلہ کی حیثیت رکھتا ہے اُنھوں نے سمجھا یا کہ شمال میں الف سے مطلب احمد علی کا مکان ہے، جنوب میں ب سے مطلب یہ ہے کہ بنک کی عمارت ہے، مشرق میں لالہ رام سین کی حویلی ہے اور مغرب میں بابو جے پال کی دو کانیں ہیں اسی جگہ ایک مسیحی اسپتال اور گرجا بھی تھا جہاں صلیب کا نشان بنا ہوا ہے اور ایک کنواں چند درخت اور ایک مزبلہ موجود ہے۔ جب دریافت کیا گیا تو روح نے کہا کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے اس لئے وہ جانا چاہتی ہے چنانچہ دفعتاً وہ غائب ہوگئی"۔

لارڈ بردھم نے بھی اپنے سوانح حیات میں ایک واقعہ اسی قسم کا تحریر کیا ہے جو بہت دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراے قبر بھی ارواح اپنے ان اعزہ سے جن سے دنیا میں انکا تعلق رہا ہے ملنے کی متمنی رہا کرتی ہیں اور جو وعدہ کرتی ہیں ان کو پورا کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں وہ لکھتا ہے:۔

"یہ واقعہ دسمبر ۱۷۹۹ء کا ہے، میں تعطیل کے زمانہ میں سویڈن گیا ہوا تھا موسم بہت سرد تھا میں نے نوکر کو گرم پانی کے لئے حکم دیا۔ حمام میں پانی رکھدیا گیا اور میں نہانے میں مشغول ہوگیا۔ جب میں طالب علم تھا اس زمانہ میں روحانیت کا بہت چرچا تھا، ایک طالب علم سے میری بہت دوستی تھی ہم دونوں نے وعدہ کیا کہ جو پہلے مرے وہ دوسرے کو اطلاع دے۔ میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور میرا دوست فوج میں نوکر ہوکر ہندوستان چلا گیا۔ عرصہ سے اُس کی خبر نہ ملی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا کر مجھے دیکھ رہا ہے میں ٹب میں تھا۔ جلدی سے میں نے کپڑے بدلے دیکھا کرسی پر وہ بیٹھا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ میں سہم گیا اور گر پڑا جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں زمین پر پڑا ہوا ہوں اور کرسی خالی ہے۔ اس واقعہ کو میں نے کسی سے نہ کہا۔ میں اڈنبرا چلا گیا وہاں جاکر مجھکو اپنے دوست کے انتقال کی خبر ملی"۔

اسی طرح میرے ایک دوست نے یہ بیان کیا کہ مردہ وعدہ ضرور پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب کا بیان ہے کہ اُن کی نانی کو اپنی سہیلی سے بہت محبت تھی دونوں نے یہ وعدہ کیا کہ جو پہلے مرجائے وہ مرنے کے بعد اطلاع ضرور دے اور یہ بتلائے کہ ماوراے قبر کیا پیش آتا ہے چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی سہیلی مرگئی۔ ان صاحب کی نانی کو بہت قلق ہوا اور وہ بھی علیل ہوگئیں۔ ایک دن ڈاکٹر انکو دیکھ کر باہر گئے تھے کہ وہ کہنے لگیں "آہاہ تم آگئیں! تم نے یقیناً اپنا وعدہ پورا کیا۔ کیوں وہاں پر کیسی گزرتی ہے تکلیف تو نہیں ہے"۔ سب گھر والے اس واقعہ سے پریشان ہوگئے تھوڑی دیر کے بعد اس کا بخار اُتر گیا اور بالکل سکون ہوگیا۔ دوسرے دن مریضہ نے بیان کیا کہ میں نے اپنی مری ہوئی سہیلی کو دیکھا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مری ہوئی عورت کی نواسی آئی تو اُس سے یہ واقعہ بیان کیا گیا اس نے کہا کہ بالکل

صحیح ہے۔ کیونکہ جس دن اُن کا انتقال ہوا ہے اس دن انھوں نے یہی لباس استعمال کیا تھا"

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں ہم اپنے اعزہ سے ملاقات کے لئے بیتاب و مضطر رہتے ہیں اسی طرح ارواح بھی ہم سے ملنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ایک عجیب بات ہے کہ ارواح بالعموم تاریکی میں نظر آیا کرتی ہیں اور زیادہ روشنی میں ارواح کا نظر آنا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ جب یہ اشکال نظر آئیں ان کے فوٹو لئے گئے۔ ان میں گلیڈ اسٹون اور ڈکنس کی تصاویر بہت زیادہ ان کی اصلی تصاویر سے ملتی جلتی پائی گئی ہیں۔ اسی سلسلۂ تصویر کشی میں ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس وقت کوئی روح آکر اپنے اعزہ کے حالات بیان کرتی ہے، اگر اس وقت کیمرا کی پلیٹ ہاتھ میں لے لی جائے اور وہ روح اس کو چھولے تو اس میں روح کی تصویر آجائے گی۔ چنانچہ ایک وسیط نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ کمال کیا کہ جب حالت خاص میں وہ پلیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا ایک شکل عجیب آجایا کرتی تھی اور حلقے کے اراکین اس کو دیکھکر یہ کہدیا کرتے تھے کہ یہ ہمارا فلاں شناسا ہے۔

لیکن اس طرح فریب بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک وسیط نے یہ اعلان کیا کہ وہ ارواح سے تحائف بھی حاصل کرسکتی ہے۔ چنانچہ جب وسیط سے کہا گیا تو اُس نے اپنے ہاتھ ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور عامل نے اس پر عمل تنویم شروع کیا اب ارواح آنا شروع ہوئیں۔ اور جو کچھ مانگا گیا دینے لگیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سامان پہلے سے موجود تھا اور چونکہ کمرہ میں تاریکی تھی اس لئے کوئی اس شعبدہ کو سمجھ نہ سکا اور وسیط نے کافی روپیہ کمالیا۔

روحانئین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اگر شب و روز کوئی قوی شخص کمزور و نازک شخص پر قوت خیال صرف کرے تو وہ پریشان ہوکر ہر خواہش پورا کرنے کیلئے تیار ہوجائیگا اور آخر کار جب تک خیال ترک نہ کیا جائے اس کے قلب کو سکون میسر نہیں آئے گا۔

چنانچہ پنجاب کے ایک صاحب آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کررہے تھے اتفاقاً ایک لڑکی سے جو اسی کالج میں تعلیم حاصل کرتی تھی قلبی تعلق پیدا ہوگیا، لیکن اُس لڑکی کو اُن پنجابی صاحب سے یک گونہ نفرت تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس چلے آئے اور یہاں اُنھوں نے ایک یوگی سے یہ عمل سیکھا اور شب و روز اس لڑکی کا خیال کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ـــــ انگلستان میں اس لڑکی کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی، بہت علاج کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا، آخر روحانئین کی ایک جماعت میں اس کی علالت بیان کی گئی تو ایک ڈاکٹر نے اس کے حالات دریافت کرنا شروع کئے اس گفتگو میں ان پنجابی صاحب کا بھی تذکرہ آیا۔ اس تذکرہ سے وہ لڑکی کچھ خائف معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے عمل تنویم سے یہ بتلایا کہ اُن پنجابی صاحب نے

قوت ارادی سے اُس لڑکی کو سزا دی ہے، لڑکی کے والدین نے اُن پنجابی صاحب کی خدمت میں لڑکی کی تصویر بھیجی اور درخواست کی کہ اس کو معاف کردیا جائے۔ چنانچہ پنجابی صاحب نے بھی یہ سمجھکر کہ اب سزا کافی مل چکی ہے اس عمل کو چھوڑ دیا اور وہ لڑکی خود ہندوستان آگئی اور اُن سے شادی کرلی۔ یہ عورت وسیط کی حیثیت سے بہت عمدہ خدمات انجام دے سکتی تھی لیکن اُنھوں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اُس لڑکی کی علالت اور ہندوستان کی گرمی نے اس کی صحت کو بد سے بدتر بنادیا اور اس کا انتقال ہوگیا۔

اس قسم کے واقعات بھی سنے گئے ہیں کہ عامل اپنے وسیط کے ذریعہ سے اخبار غیب بھی بتلا دیا کرتے ہیں۔ اور امراض کا علاج بھی کرتے ہیں۔ دنیا میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو اگر چاہیں تو اپنے خیالات سے دوسرے کو متاثر کرسکتی ہیں۔ اس قوت کا انحصار طبائع پر ہے۔ یہ ایک قسم کی مشق ہے، اگر ہم اپنے دماغ کو اس امر کا خوگر بنالیں کہ وہ دوسرے دل کی بات کا پتہ لگا سکے تو آسانی سے ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک نابینا ——— راستہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے۔ اسی طرح انسانی خواہش بھی یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی روح عیش و سکون حاصل کرسکے کیونکہ جہاں تک عقل کی رسائی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح ایک غیر مادی چیز ہے اس لئے وہ نہ خراب ہوسکتی ہے اور نہ اس کو فنا ہے۔

سر آلیور لاج نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ مادی اسباب نہ تو روح کو پیدا کرتے ہیں اور نہ اسے ہلاک کرسکتے ہیں، روح ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ جسم خاکی صرف اس کی سیرت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے، جس سے رہائی حاصل کرنے کے بعد روح کو اپنے افعال میں آزادی تام ملجاتی ہے۔ ریورنڈ شیپرڈ نے ڈیلی نیوز میں لکھا تھا کہ میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ مرنے والے واقعی زندہ رہتے ہیں، ان کے اعمال اسی دنیا میں ختم نہیں ہوجاتے بلکہ جسم خاکی چھوڑکر بھی وہ اپنی بہبودی و فلاح میں منہمک رہتے ہیں حتی کہ ابدی حیات کے مقررہ منازل طے کرنے کے بعد وہ قرب خداوندی حاصل کرلیتے ہیں۔ جو مذہب کے نقطۂ خیال سے روح کا نصب العین ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر روح کا نصب العین تشنہ رہجاتا ہے تو وہ لوگوں کو دق کیا کرتی ہے، چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بہرائچ اور بانسہ وغیرہ میں بعض عامل ارواح خبیثہ کو لوگوں کے جسموں سے جدا کردیتے ہیں اور لوگوں کو صحتیں ہوجایا کرتی ہیں۔ بدروحیں نکالنا اناجیل سے بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح نے بھی بدروحیں نکالی تھیں ایک مرتبہ ایسا ہی واقعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک حسین بیوہ عورت سے ایک صاحب نے شادی کی تھی تو اکثر پہلے شوہر کی روح اُن صاحب کو دق کیا کرتی تھی اور بالآخر وہ صاحب کچھ سہم گئے اور اُنھوں نے اس حسین بیوی کو چھوڑ دیا اس وقت ان غریب کی جان بچی وہ حسینہ دق میں مبتلا ہوگئی اور آخر کار تیرہ آب پیکر

اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جس کوٹھی میں وہ حسینہ مع اپنے سابق شوہر کے رہتی تھی وہاں اس کے سابق شوہر کی روح اکثر نظر آیا کرتی تھی لیکن جس دن سے وہ حسینہ مری ہے وہ روح کسی کو نظر نہیں آئی اور اب وہیں اسی کوٹھی میں ایک سرکاری دفتر موجود ہے۔

سر آلیور لاج نے اپنی کتاب حیات و ممات میں لکھا ہے کہ "موت کے بعد غالباً ہم وجود اثیری قبول کر لیتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کے لئے قوت ممیزہ سے بھی افضل تر کوئی طاقت ہمیں حاصل ہو جاتی ہے اس تغیر سے ہم ایک ایسے عالم میں چلے جاتے ہیں جہاں محبت، سکون، خوشی اور امید مکمل طریقہ سے غیر فانی اور تسلی بخش طور پر نصیب ہوتی ہے۔

یہ خیال اب دنیا میں زیادہ راسخ ہوتا جاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنی قوتوں کو زائل نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا کو اُسی طریقہ سے فائدہ پہنچا سکتا ہے جس طرح ساری دنیا۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ اس دنیا میں بھی کلب ہیں، اخبار ہیں۔ فرقہ وارانہ مباحث میں کونسلیں ہیں، نمازیں ہیں، دعائیں ہیں، گانے بجانے ہیں، خوبصورت پلانے والیاں ہیں اور اطمینان و سکون سے زندگی بسر ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو موت کے خوف سے ہم لوگ کیوں گھبرائیں؟

مشیر احمد علوی، بی، اے

(نگار) - سر آلیور لاج کو مابعد الطبیعیات و عالم ارواح کا بڑا ماہر سمجھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک شاید ہی کوئی شخص اُس سے زیادہ احمق بیسویں صدی کے دورِ علم و روشنی میں پیدا ہوا ہو —— وہ اول اول "فلسفہ تشکیک" کا بڑا زبردست حامی تھا۔ لیکن بعد کو جب ردّ عمل ہوا تو وہ عالم ارواح کے وجود کا بھی اسی شدت حماقت کے ساتھ حمایت کرنے لگا اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ "متشککین" کے خیال کا ردّ عمل اسی طرح کی توہم پرستی پر منتہی ہوتا ہے لینن ڈائل کی دوسری مثال موجود ہے، دیکھ لیجئے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی ہمیشہ اُس چیز کی جستجو میں لگی رہتی ہے، جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ پھر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ علم انسانی بعض حقایق تک پہونچکر ان کے چہرہ کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے اور کبھی صرف اس کے قیاسات شدت انہماک سے ایک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ اُنھیں کو حقیقت باور کرنے لگتا ہے "مرنے کے بعد کیا ہوگا" —— چونکہ یہ عالم انسانی کی سب سے زیادہ مخفی و غیر معلوم حقیقت ہے، اس لئے ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے

اس پر انتہائی غور و انہماک سے کام لیا یہاں تک کہ جب انسان کسی اور طرح مطمئن نہ ہوسکا تو مذاہب عالم نے اس مسئلہ کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لیکر دو ٹوک فیصلہ کر دیا ـــــ مدعا صرف یہ تھا کہ انسان فضول خیال آرائیاں چھوڑ دے اور ان میں اپنا وقت نہ ضائع کرے ـــــ اور ہے بھی یہی بات کہ انسان کا موت سے پہلے موت کی گتھیاں سلجھانا انتہائی حماقت ہے۔ جب تک زندہ ہیں ہم کو اپنے کام میں لگا رہنا چاہئے، جب موت آئے گی چل دیں گے۔ اور اگر اس کے بعد کوئی اور زندگی ہے تو اس میں لگ جائیں گے، اس وقت اس کے خیال میں وقت ضائع کرنا نہایت لغو و مہمل بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معاد کے خیال پر بہت کچھ انحصار انسان کی درستی اخلاق کا ہے، لیکن صرف اُسی جماعت کے لئے اور اُسی زمانہ تک جس کا تعلق "عہد تاریک" سے ہے اور جب تک انسان کے دماغ نے اس قدر ترقی نہیں کی ہے کہ وہ ایک اچھے کام کی اہمیت کا اندازہ محض اس کے "اچھے" ہونے کی حیثیت سے (بغیر خیال مزد) کر سکے ـ پھر چونکہ مذاہب کی بنیاد ڈالنے والے ایک خاص قسم کا مصلحانہ دماغ لیکر آئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان کی جماعت ترقی کے کس دور میں ہے اور وہ کس تعلیم سے متاثر ہوسکتی ہے، اس لئے انھوں نے "نفسیات تبلیغ و ہدایت" کے اصول سے کام لیکر اسی قسم کی باتیں لوگوں کو بتائیں جنھیں لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور جن کا اثر ہو ـــــ مذاہب عالم نے عالم کون کے معارف و حقائق سے کبھی بحث نہیں کی ہے، بلکہ صرف اصلاح نوع انسانی کو اصل مقصد قرار دیکر "عقاید" مخصوصہ کی طرح ڈالی ہے، اور ظاہر ہے کہ انکی اس فراست و دانشمندی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے ـــ بہرحال جس حد تک صرف اصلاح کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ معاد کے اعتقاد نے بہت کچھ دنیا میں کیا ہے، اور غالباً ابھی عرصۂ دراز تک کرتا رہیگا، لیکن اگر آپ "حقیقت" کا سوال کریں گے تو ماننا پڑے گا کہ "بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک نہ کسی مذہب نے ایسی بات بتائی ہے جس پر ہر شخص کو اطمینان ہوسکے اور نہ علوم جدیدہ کی ترقی اس معمہ کو سلجھا سکی ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم مستقبل کو کسی طرح حال میں تبدیل نہیں کر سکتے اور انسان بندہ ہے صرف حال اور مشاہدۂ حال کا۔

مغربی لٹریچر میں کثرت سے حاضرات و طلب ارواح وغیرہ کے واقعات نظر آتے ہیں،

یہاں تک کہ روحوں کی تصاویر حاصل کر لینا، ان سے گفتگو کرنا بلکہ بسا اوقات اُن سے تعلق جنسی قائم ہو کر اولاد کا پیدا ہونا بھی حقیقت ووا قعہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اس لیٹریچر میں ۹/۱۰ حصہ تو محض پروپاگنڈا ہے اس جماعت کا جو ہندوستان کے گنڈا تعویذ لکھنے والوں کی طرح لوگوں کو احمق بنا کر دولت کمانا چاہتی ہے اور باقی ۱/۱۰ نتیجہ ہے صرف "انسانی قوتِ انفعال" کا جو اپنے واہمہ میں مبتلا ہو کر خدا جانے کیا کیا دیکھنے لگتی ہے۔

امریکہ کے نہایت مشہور اخبار "سائنٹفک" نے ایک بار چند لوگ متعین کئے کہ وہ ہر جگہ جا کر تحقیق کریں کہ طلب ارواح کے دعوے میں کس حد تک حقیقت پائی جاتی ہے اور "وسیط" "معمول" کے بیانات قابل اعتبار ہیں یا نہیں ـــــ چنانچہ ایک زمانہ تک اس جماعت نے یورپ کے تمام ممالک کی سیر کی، تمام روحانیین سے ملے، معمولوں اور وسایط سے گفتگو کی، حاضرات میں شریک ہوئے، روحوں کے پیغام سُنے، ان کی تصویریں لئے جانیکا تماشہ دیکھا اور آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ تمام دعوے بے بنیاد ہیں اور سو میں ایک بیان بھی ان روحانیین کا قابل اعتبار نہیں ہے۔ جس جس طرح یہ لوگ دہوکا دیتے ہیں، اور جن جن ترکیبوں سے یہ روحوں کی تصویریں لینا ظاہر کرتے ہیں، اُن کا مفصل حال اس کمیٹی نے قلمبند کیا اور اخبار مذکور میں شائع کرا دیا ــ الغرض وہ سر آلیور لاج ہوں یا کوئی اور بزرگ ان کی تمام تحقیقات وہم وقیاس سے آگے نہیں بڑھی اور اس مسئلہ پر اب بھی تاریکی کا وہی پردہ پڑا ہوا ہے جو اب سے ہزار سال قبل پڑا ہوا تھا ـــــ

پھر چونکہ ہمارے پاس اس کے باور کرنے کی کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اسی طرح کی زندگی بسر کرنا پڑے گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ مرنے کے بعد انسان پر "انعدام محض" کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بالکل نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے تو کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ بات تو بہت کچھ قرین عقل بھی ہے اور وہ عقل سے بڑی حد تک دور ـــــ

تاریخ کا ایک گم شدہ ورق

(وصل بعد از وصال)

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبد القادر جزائری معہ اپنی بیویوں، لڑکیوں، اور اعوان وانصار کے شہر امبواز کے ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہوئے ہیں جسے حکومت فرانس نے اُن کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

امیر عبد القادر جزائری وہی وطن پرست وغیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آبا واجداد کی روایات شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک عساکر فرنساوی سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا کر چھوڑا —— لیکن فرانس کی زبردست حکومت و منظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہل فرانس بلاد عربی میں ساحل سے لیکر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہوگئے اور ۲۸ اگست سنہ ۱۸۴۸ء کی شام کو امیر عبد القادر اپنی تلوار دشمن کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو ہی گیا —— ہر چند عساکر فرنساوی کے جنرل نے امیر موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالہ کر دیں گے تو ان کو اجازت دیدیجائے گی کہ وہ شرقی دیار عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں۔ لیکن حکومت فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انھیں فرانس بھیجدیا جہاں وہ قصر امبواز میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ سنہ ۱۸۴۸ سے سنہ ۱۸۵۲ء تک رہے اور سنہ ۱۸۵۲ میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبد القادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی۔

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبد القادر کا ساتھ دیا تھا اور جو اُن کے ساتھ امبواز میں نظر بند تھے ایک شخص عبد السمیع مغربی بھی تھا۔ اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے ایام کامیابی میں دیا تھا اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی محبت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو پوری طرح احساس تھا کہ اُس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل وعیال سب کو خیر باد کہدیا تھا عبد السمیع امیر سے کہا کرتا تاکہ "اے میرے آقا، میں نے اپنے قلب کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں ایک خدا کے لئے وقف ہے اور دوسرا آپ کے لئے" —— لیکن اُسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنا پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا پڑے گا ——

یہ تھی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام ایلس فونتان تھا - یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمانِ محبت استوار ہو گیا تھا اور اس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کر لی تھی -

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین و اعزہ سے ملنے گھر گئی تو اُنھوں نے اُس کو قید کر لیا اور پھر نہ جانے دیا کیونکہ ان کو اس کے تعلق خاطر کا حال معلوم ہو گیا تھا اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے وابستگی پیدا کرے ---- انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" ---- اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ امیر اور عبد السمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے -

ہفتوں گزر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آسکی - عبد السمیع کا تردد بڑھتا جا رہا تھا اور حیران تھا کہ اُس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے - آخر کار اُس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیق حال کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول و حزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں

نومبر ۱۸۵۱ء کی پانچویں تاریخ صبح کو جب اہل قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ بائیں باغ کے سمت سے فریاد و زاری کی آواز آ رہی ہے - سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے اس حال میں کہ اس کے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے - لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہو گئے - یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بیتاب تھی، درد سے تڑپ رہی تھی، لیکن عبد السمیع کا نام ہر وقت اس کی زبان پر تھا - لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے - ابھی تک عبد السمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے - جب عبد السمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتاً غائب ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی ---- یہ بے اختیار اُس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ اور غم آلود چہرہ چومنے لگا --- لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے - جب جوش کم ہوا تو عبد السمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی روایات تہذیب سے ہٹا جا رہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہو گیا -

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ "تمھاری شناسائی اس لڑکی سے کیونکر ہوئی اور اس بے تکلفی

باب الاستفسار

کلیلہ و دمنہ

(جناب سید برہان الدین صاحب مغلپورہ ۔ [illegible])

کیا آپ مہربانی فرما کر بتا سکتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ سب سے پہلے کب اور کس زبان میں لکھی گئی اور پھر کن کن زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے - میں ایک کتاب ہند قدیم کی ادبیات پر لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے ان معلومات کی ضرورت ہے - ممنون ہونگا -

---

(نگار) اس موضوع پر اسی براکلمین کا لکھا ہوا تفصیلی مقالہ ملاحظہ فرمایئے جو انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں شائع ہوا ہے - مختصراً میں عرض کئے دیتا ہوں -

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں لکھی گئی اور کلیلہ دمنہ دونوں بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اصل سنسکرت الفاظ کرٹکا اور دمنکا کی (یہ نام تھے دو گیدڑوں کے) - سُریانی زبان میں جو ترجمہ ہوا ہے اس میں یہ دونوں نام کلیلاگ اور دمناگ ہوگئے - سنسکرت سے پہلا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا، اس کے بعد عربی میں اور پھر اسلامی و عیسوی ادبیات میں ہر جگہ یہ کتاب مشہور ہو کر مختلف زبانوں میں منتقل ہوئی -

یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت زبان میں بمقام کشمیر سنہ ۲۰۰ء میں لکھی گئی تھی - اس کا مصنف کوئی وشنوئی برہمن تھا جس کا نام اب تک متحقق نہیں ہو سکا - یہ کتاب امراء و شاہزادگان کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھی گئی تھی اور جانوروں کے فرضی قصوں کے ذریعہ سے اصول جہانبانی بتانا اس کتاب کا اصلی مقصود تھا - سنسکرت کی دو مشہور کتابیں تنتر اخیایکا اور پنچ تانترا، اسی کتاب کی دو مختلف صورتیں ہیں -

پنچ تانترا کا پہلوی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ خسرو انوشیرواں (۵۳۱ - ۵۷۹ء) کے زمانہ میں ہوا - مترجم کا نام بُرزوی تھا، یہ دربار کا طبیب تھا اور محض اسی کام کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا - برزوی نے اس میں چند اور قصوں کا بھی اضافہ کر دیا جو ہندوستان ہی میں اس نے سنے تھے - اس کا دیباچہ خود اس نے لکھا تھا -

بُرزوی کا یہ ترجمہ معدوم ہوچکا ہے لیکن اس سے جو ترجمہ سریانی زبان میں سنہ ۵۷۰ء کے قریب پیر ددوت بُود نے کیا تھا اُس کا ایک نسخہ ضرور اب بھی پیرس میں پایا جاتا ہے۔

اس کے تین صدی بعد عبداللہ بن المقفع نے بُرزوی کے ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا اور تھوڑا بہت اضافہ بھی اپنی طرف سے کیا۔ ابن المقفع کا یہ ترجمہ حقیقتاً ادبی خوبیوں اور انشاء عالیہ کا بہترین نمونہ تھا جسے صرف خواص کے طبقہ تک محدود رہنا چاہیئے تھا؛ لیکن موضوع اس قدر عام پسند تھا کہ ہر طبقہ و جماعت میں اسکی شہرت ہوگئی اور نقل و روایت کی عمومیت نے اس کو بڑی حد تک غارت کردیا۔ چنانچہ اس وقت عربی زبان میں جو ترجمے اس کے پائے جاتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ابن مقفع کے اصل نسخہ سے کتنا انحراف ان میں کیا گیا ہے۔

ابن مقفع کا ترجمہ تین مرتبہ عربی نظم میں لایا گیا۔ پہلی مرتبہ تو ابن مقفع کے ہمعصر ابان اللاحقی نے کیا جو اب ناپید ہے۔ دوبارہ سنہ ۱۱۰۰ء میں ابن الہباریہ نے کیا، تیسری بار دُرّالحکم کے نام سے عبدالمومن نے سنہ ۱۲۴۲ء میں کیا۔

دسویں یا گیارہویں صدی میں ابن مقفع کے ترجمہ کو ایک سریانی زبان کے عالم نے سریانی میں منتقل کیا ہرچند اس نے اس میں عیسوی رنگ پیدا کیا اور ترجمہ میں بھی غلطیاں کیں، لیکن چونکہ اس نے ایسے نسخہ سے ترجمہ کیا تھا جو ابن مقفع سے قریب تر عہد کا تھا، اس لئے اس کی اہمیت نقادان فن کے نزدیک بہت ہے —

شاہنامہ میں فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کا ترجمہ پہلوی زبان میں نصر بن احمد سامانی کے عہد میں (۹۱۴ - ۹۴۳ء) وزیر بلعمی کے حکم سے کیا گیا تھا؛ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ختم نہیں ہو سکا۔ اسی بادشاہ کے حکم سے رودکی نے بھی اس کو نظم کیا جس کے صرف سولہ شعر اسدی کے لغات فرس میں نظر آتے ہیں۔

ابن مقفع کا ترجمہ فارسی نثر میں سنہ ۱۱۴۳ء کے بعد نظام الدین ابوالمعانی نصراللہ نے کیا تھا اور بہرام شاہ فرمانروائے غزنہ کے نام معنون کیا گیا تھا۔ اسی ترجمہ کو احمد بن محمود الطوسی قانعی نے نظم کرکے سلطان عزالدین کیکاؤس (۱۲۴۶ - ۱۲۶۳ء) کی خدمت میں پیش کیا۔ اور پھر نظرثانی کے بعد ملا حسین واعظ کاشفی (سنہ ۱۵۰۴ء) نے جو حسین بیقرا (والی ہرات) کا واعظ دربار تھا وزیر احمد سہیلی کے نام پر انوار سہیلی کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کا ترجمہ دنیا کی تمام زبانوں میں کیا گیا۔ لیکن چونکہ انوار سہیلی کی عبارت و انشاء بہت دقیق و مشکل تھی اس لئے شہنشاہ اکبر نے ابوالفضل کو

مامور کیا کہ وہ دوبارہ اس کو مرتب کرے، چنانچہ عیار دانش کے نام سے ۱۵۸۰ء میں دوسرا ترجمہ پیش کیا گیا جس میں ابن مقفع اور بُرزوی کے اصل دیباچے بھی شامل تھے، مگر یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔

ترکی زبان میں بھی ابن مقفع کا ترجمہ دوبار منتقل کیا گیا لیکن نصراللہ کے ترجمۂ فارسی سے۔ قدیم ترکی میں بھی ایک شخص مسعود نامی نے اس کو منتقل کیا۔ اس کے بعد یہ منظوم بھی ہوا اور سلطان مراد اول کے سامنے پیش کیا گیا۔ حال کی ترکی نثر میں بھی اس کو منتقل کیا گیا اور غالباً ۱۵۴۰ء سے کچھ زمانہ قبل علی بن صالح یا علی چلپی نے انوار سہیلی کا ترجمہ مقفیٰ عبارت (ترکی) میں کیا اور ہمایوں نامہ کے نام سے سلطان سلیمان اول کے سامنے پیش کیا۔ اسی ہمایوں نامہ کا ترجمہ بعد کو فرانسیسی، جادی، ملائی زبانوں میں ہوا، کہا جاتا ہے کہ ہمایوں نامہ بہ لحاظ حسنِ انشار کے انوار سہیلی سے بدرجہا بہتر تھا۔

ابن المقفع کی کتاب کا ترجمہ عربی سے ترکی میں عبدالغلام فیض خان اوغلو نے بھی کیا تھا جو ۱۸۸۹ء میں بمقام قازان شائع ہوا۔

مغولی زبان میں بھی ملک افتخار الدین محمد بن ابی نصر نے اس کا ترجمہ کیا، لیکن اب وہ معدوم ہے، اسی طرح حبشی زبان کا ترجمہ بھی اب نایاب ہے۔

عبرانی میں اس کا ترجمہ ربی جوئیل نے کیا تھا اور ابن مقفع کے نہایت قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ربی جوئیل کا ترجمہ لاطینی اور ہسپانی زبانوں میں کیا گیا۔ گیارہویں صدی کے اخیر میں یونانی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا لیکن براہ راست ابن مقفع کے نسخہ سے۔

عہد اکبری میں مفرح القلوب کے نام سے تاج الدین نے جو ترجمہ پیش کیا وہ پنچ تانترا کے ترجمۂ سنسکرت ہٹوپادیش سے کیا گیا تھا۔ اسی مفرح القلوب کو میر بہادر علی حسینی نے ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی یا اردو زبان میں منتقل کیا۔ اس کے ایک سال بعد گل کرائسٹ نے اسی کو اخلاق ہندی کے نام سے مرتب کرکے پیش کیا۔

ملائی زبان میں جو کتاب "حکایات کلیلہ و دمنہ" کے نام سے پائی جاتی ہے وہ ابن مقفع کی کتاب اور پنچ تانترا کے تامیلی ترجمہ دونوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی۔

ابن مقفع کی کتاب کو سامنے رکھ کر تین اس طرح کی اور کتابیں لکھنے کی تین بار کوشش کی گئی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیلہ و دمنہ دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو شہرت و قبول کے انتہائی درجہ تک پہونچیں اور کرۂ ارض کی تمام زبانوں میں جن کا ترجمہ ہوا۔

یہاں وہاں سے

لغزشِ قدم:-

شوبان، ایک تاجر کے دفتر میں ملازم ہے - آدمی خوش قد، خوش ادا ہے اور ان تمام خصوصیات سے آراستہ جو ایک عورت کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہیں -

ایک شام حسب معمول دفتر سے نکل کر جلدی جلدی چلنے لگا تاکہ اسٹیشن پہونچکر سب سے پہلی گاڑی پر سوار ہوکر اپنی قیام گاہ کو واپس جا سکے -

ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا ایک نوجوان لڑکی زینہ سے پھسلی اور اُس نے زور سے چیخ ماری - شوبان نے بڑھکر اسے سنبھالا اور پوچھا کہ چوٹ تو نہیں آئی اس نے کہا "نہیں" اور اُس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی -

رفتہ رفتہ یہ مراسم بڑھتے گئے اور آخرکار دونوں نے شادی کا عہد و پیمان کرکے ایک ہی جگہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی — یہ لڑکی کپڑا سینے کے کارخانے میں ملازم تھی کچھ دن گزرنے کے بعد شوبان نے محسوس کیا کہ باہم تعلقات محبت کم ہوتے جاتے ہیں اور لوسی نے بھی شوبان کی بے اعتنائی کو محسوس کرکے آخرکار ایک دن اس سے صاف صاف پوچھا کہ یہ کیا بات ہے - شوبان نے جواب دیا "واقعہ یہ ہے کہ میں جس جذبہ کو محبت سمجھتا تھا وہ محبت کا جذبہ نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا" - لوسی نے یہ سنکر فوراً اس کے کمرہ سے اپنا سامان سنبھالا تاکہ اپنی ماں کے گھر جا کر رہے -

وہ اپنا سامان لئے اسٹیشن کی سیڑھی سے گزر رہی تھی کہ اُس کا قدم پھسلا اور ایک اور نوجوان نے بڑھکر اُسے سنبھالا اور نہایت الفت و ہمدردی سے پوچھا کہ "چوٹ تو نہیں آئی"

اس نے کہا "نہیں" اور اس کے بازو پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے ہوئے ریل کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئی -

یہ بھی کوئی بات تھی:-

لوسیا، ۱۸ سال کی نوجوان لڑکی تھی اور کافی قبول صورت - لیکن نہایت ہی خاموش و متین بلکہ ایک

یعنی روس کی کل آبادی کے لحاظ سے ۵۸ فی صدی بچے ان اداروں میں داخل ہو سکیں گے۔ اس طریق کار کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چار سال قبل ۱۹۲۸ء میں صرف ۲۸ فی صدی بچوں کی گنجائش ان اداروں میں تھی۔ لیکن اب ۷۳ فی صدی تک پہونچ گئی ہے۔

ان اداروں کے قیام نے روس کی عورت کو امور خانہ داری اور تربیت اطفال کے بارے سبکدوش کر کے مردوں کے دوش بدوش تمام علمی و صنعتی تجارتی و زرعی کاموں میں مشغول ہونے کے لئے آزاد کر دیا ہے۔

آٹھ سال قبل روس میں صرف ۲۳ لاکھ ۴۹ ہزار عورتیں اجرت پر کام کرتی تھیں لیکن اس وقت ۶۰ لاکھ ہیں اور اختتام سال تک ۱۵ لاکھ کے اضافہ کی اور توقع کی جاتی ہے۔ روس میں عورت و مرد دونوں کی اجرت بالکل برابر رکھی گئی ہے۔

ان عورتوں کو وضع حمل سے آٹھ ہفتہ قبل اور آٹھ ہفتہ بعد تک پوری اُجرت پر چھٹی دیدیجاتی ہے لیکن جو عورتیں دماغی کام کرتی ہیں ان کو ۶ ہفتہ قبل اور چھ ہفتہ بعد کی رخصت ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ بچے کے کپڑوں وغیرہ کے لئے کچھ الاؤنس بھی مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اور طبی امداد بالکل مفت دیجاتی ہے۔

اُن کارخانوں میں جہاں پہلے عورت نہایت ہی معمولی معمولی خدمت انجام دیتی تھی، وہیں اب وہ ماہرانہ حیثیت سے کام کرتی نظر آتی ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عورت کسی بات میں مرد سے کم نہیں ہے۔ عورتیں البتہ ان کاموں سے ضرور باز رکھی جاتی ہیں جو اُن کے نسوانی اعضاء کو صدمہ پہونچانے والے ہیں۔

روسی عورتیں نظم حکومت میں بھی عملی حصہ لے رہی ہیں چنانچہ اس وقت وہاں ۳ لاکھ عورتیں مختلف سرکاری کمیٹیوں میں ممبر کی حیثیت سے اور ۵ لاکھ متعدد محکموں میں عاملانہ حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ سوویٹ ٹریڈ یونین میں ۵۴ لاکھ عورتیں شریک ہیں۔

ان میں تعلیم بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ گزشتہ تین سال میں ایک کروڑ ۵۰ لاکھ جاہل عورتوں کو ابتدائی لکھنا پڑھنا سکھایا گیا اور صنعتی تعلیم میں ان کی تعداد بمقابلہ ۱۹۲۹ء کے ۲۸ فیصدی سے ۴۷ فیصدی تک پہونچ گئی۔

یونیورسٹیوں میں عورتوں کی تعداد ۱۹۳۰ء میں ۲۷ فیصدی تھی لیکن ۱۹۳۱ء میں ۴۰ فیصدی سے بڑھ گئی۔

ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ مختلف تعلیمی شعبوں میں وہ کس نسبت سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

ڈاکٹری .. .. .. ۷۵ .. .. فی صدی
محکمۂ تعلیم .. .. .. ۵۱ .. .. فی صدی
صنعتی تعلیم .. .. .. ۳۹ .. .. فی صدی
تحقیقات علمیہ .. .. ۲۹ .. .. فی صدی

ابتدائی و ثانوی تعلیم میں اس وقت ۷۶ فی صدی عورتیں درس و تدریس میں مشغول نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت روس ہی ایک ملک ایسا ہے جس نے نظام تمدن کی ترقی میں عورت کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں طرح کی مکمل آزادی سے آشنا کیا۔

ایک گم شدہ جزیرے کی جستجو

امریکہ کے سمندروں میں خط نصف النہار سے شمال پر ایک جزیرہ سارآن پایا جاتا تھا جو اب بالکل نظر نہیں آتا۔ ہر چند نقشوں میں اس کا نام اب بھی پایا جاتا ہوگا، مگر وہ خود کہیں نہیں ہے۔ چنانچہ امریکہ نے اپنے بحر پیسفک کے بیڑے کو حکم دیا کہ اس جزیرہ کی جستجو کی جائے، دوسری طرف جرمنی بھی اس کے پالینے کی فکر میں کر رہا ہے۔

اس جزیرہ کی اہمیت فی الحال اس لئے بڑھ گئی ہے کہ یہی ایک چھوٹا سا جزیرہ ایسا ہے جہاں سے ۳۷ء میں واقع ہونے والے سورج گرہن کا پورا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور آس پاس کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی رصد گاہ قائم ہو سکے۔

سال رواں میں جو سورج گرہن ہونے والا ہے اور جسکے دیکھنے کے لئے ہزاروں ماہرین فلکیات نیوانگلینڈ پہنچ رہے ہیں صرف ڈیڑھ منٹ رہیگا، لیکن ۳۷ء کا گرہن سات منٹ $\frac{3}{5}$ سکنڈ تک قائم رہیگا۔ گرہن پڑنے کی زیادہ سے زیادہ مدت سات منٹ ۲۰ سکنڈ ہو سکتی ہے، اس لئے ۳۷ء کا سورج گرہن ایک ایسا موقع ماہرین فلکیات کے لئے مشکل ہی سے پھر دوبارہ نصیب ہو سکتا ہے۔

اہل جرمن جن کو فلکیات کا بڑا شوق ہے بہت متمنی ہیں کہ اُن کو یہ جزیرہ مل جائے اور وہ مخصوص طور پر گرہن کے رصد کا انتظام کریں۔

اب تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن اُمید ہے کہ یہ جزیرہ دستیاب ہو جائے گا۔ اگر بہت زیادہ عمیق پانی نے اُسے نہیں چھپالیا اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو یہ بھی یقینی ہے کہ یہاں سے جو تصویریں سورج گرہن کی ۳۷ء میں لی جائیں گی وہ فن کے لحاظ سے نہایت بیش قیمت چیز سمجھی جائیں گی۔

قیمت ۸ ر

عریانی و عریانیات

تہذیب کے اس دور میں عریانی کی قدر و قیمت اور اس کے نفسیاتی اثرات پر بحث کرنا جرارت کا کام ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں اتنی اخلاقی جرارت ہو کہ اگر وہ برہنگی کو خلاف شرم نہ سمجھتا ہو تو اس رائے کا اظہار ہی کر دے چہ جائیکہ اس پر عمل کرنا۔

بہرحال یہاں برہنگی اور اس کے متعلقہ مسائل سے علمی بحث کی جا رہی ہے اور یہ بتایا جانا مقصود ہے کہ بچوں کو برہنگی سے کس حد تک مانوس کرنا چاہیے اور اسکے نفسیاتی اثرات کیا ہیں۔ اس مسئلہ پر مختلف زمانوں میں مختلف رائیں پائی گئی ہیں اور موجودہ زمانہ کے علماء تعلیمیات کے ذہن میں تو ایک عظیم الشان تغیر اس باب میں پیدا ہو گیا ہے یہ رائیں کیا تھیں اور یہ تغیر کیا ہے ان کے دلائل و وجوہ سے اس مضمون میں واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یونانِ قدیم، اقوام عالم کا رہنما، علم کا آماج گاہ، فلسفہ و سائنس کا معلم اس مسئلہ کے متعلق واضح تعلیم دیتا ہے۔ اسپارٹا اور یونان کے مختلف شہروں میں کسی زمانہ میں عورتیں برہنہ رقص کرتی تھیں اور بدنی ریاضتوں میں مشغول رہتی تھیں اور برہنہ مرد بھی وہاں موجود ہوتے تھے۔ فلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ریپبلک میں عریانی کے رواج کو پسند کیا۔ اور جو لوگ اس کا استہزا کرتے تھے ان کی رائے کو وہ "شجر علم کا کچا پھل" کہتا ہے۔ عمر کی آخری منزل تک فلاطون نے اور مسائل میں بہت سی رائیں بدلیں لیکن اس مسئلہ میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا "قوانین" جو ان کے فلسفیانہ فکر کا آخری نتیجہ ہے اس میں بھی وہ اس رائے کی تائید کرتا ہے اور زندگی کے تمام کاموں میں مرد و زن کے تعاون کو ضروری سمجھتا ہے تاکہ خواہش نفسانی کی تیز دھار کند ہو جائے۔ اسی غرض سے وہ نوجوان مردوں اور عورتوں کے باہمی میل جول کو ضروری سمجھتا ہے۔ یہ اس ہستی کی رائیں ہیں جس نے فلسفہ و مذہب میں نظام "تصوریت" پیش کیا تھا اور اس سے زیادہ حیرت انگیز و شاندار نظامِ فکر انسان کی تخلیقی قوت نے پیدا ہی نہیں کیا۔

اہل روما کے نزدیک برہنگی و بے شرمی مترادف تھے، انھیں یونانیوں کی طرح برہنگی کے اخلاقی و اصلاحی اثرات کا ادراک نہ تھا ان کے یہاں عریانی اسٹیج کی حد تک محدود تھی اور عوام اس سے لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ روما میں تو لوگ اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ ایکٹروں کو اسٹیج پر برہنہ ایکٹ کرتا دیکھیں لیکن یہاں کام کرنے والوں کے

و بدنی صحت کے لئے برہنگی کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، ان سب کے نزدیک بدن کا کھلی ہوئی ہوا، پانی اور روشنی میں رہنا بدنی صحت کا باعث ہے۔ برہنہ بدن سے مانوس ہونا خواہش حیوانی کو دور کرتا ہے، حاسۂ جمال میں شائستگی پیدا کرتا ہے اور صحت روحانی کو ترقی دیتا ہے۔ لیکن برہنگی کا رواج کس حد تک فروغ پائے اور کس عمر میں اس کی ابتدا ہو — یہاں آکر رایوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر گرہارڈ کہتا ہے کہ پہلے پختہ عمر کے حضرات کی اس بارے میں تعلیم ہونی چاہئے کیونکہ جنسی معاملات میں بچوں سے زیادہ یہی تعلیم و تفہیم کے محتاج نظر آتے ہیں۔ والدین بچوں کو ابتدا ہی سے شہوت پرستی کی تعلیم دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حیا اور اخلاق ان کے ذہن نشین کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف خود اپنی ابتدائی زندگی کے حالات پیش کرتا ہے جو کسی گرم ملک میں بسر ہوئے تھے اور جہاں وہ شروع ہی سے برہنگی کا عادی تھا وہ لکھتا ہے کہ جب میں اپنے وطن جرمنی میں آیا تو میری عمر بیس برس کی تھی، وطن پہنچتے ہی مجھے یہ بتایا گیا کہ جسم انسانی شاید کوئی مکروہ چیز ہے اور اس کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ چنانچہ جب جسم انسانی میری نگاہوں سے بالکل پوشیدہ کر دیا گیا اور متعدد دفعہ مجھ سے یہ کہا گیا کہ کپڑوں کے اندر کوئی شرم انگیز چیز مستور رہے، تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ کیا معاملہ ہے ...... اس وقت تک میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ برہنہ بدن صرف اپنی برہنگی کی وجہ سے شہوت خیز احساسات پیدا کر سکتا ہے۔ مجھے اس قسم کے احساسات کا تجربہ ضرور تھا۔ لیکن یہ برہنہ بدن کو دیکھنے سے نہیں پیدا ہوتے تھے۔ بلکہ ہماری روحوں کے امتزاج سے رفتہ رفتہ شگفتہ ہوتے تھے۔" ممکن ہے کہ قدیم روایات میں نشوونما پائے ہوئے لوگ اس واقعہ کو بالکل سمجھ نہ سکیں، لیکن ہمارے مشورہ کو جو ابتدائے مضمون میں پیش کیا گیا ہے ملحوظ رکھکر وہ خلاف طبیعت خیالات کی صحت پر غور کرنے کی عادت ڈالیں اور جذبات کو عقل کا خادم سمجھیں نہ کہ اس کے برعکس!

اسی طرح فارل، گرہارڈ کا ہم زبان ہو کر کہتا ہے کہ اگر ابتدا ہی سے بچوں کے سامنے جسم کے چھپانے کی کوشش کی جائے گی تو ضرور وہ آئندہ چلکر برہنگی کو شہوانی جذبات کا ہیج سمجھنے لگیں گے، لیکن اگر شروع سے یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی جائے کہ جسم میں کوئی عضو غیر فطری نہیں جس کی وجہ سے ہم شرمندہ ہوں تو یہ جذبہ ابتدا ہی سے دور ہو جائیگا۔

برہنگی کا بچوں پر تخریب اخلاق یا شہوانی اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان پر تہیجات شہوانیہ کی تکمیل نہیں ہوتی ہے اس لئے جہاں تک جلد ممکن ہو سکے انہیں برہنگی سے مانوس کر دینا چاہئے تاکہ جنسی احساسات کا قبل از وقت نشوونما نہ ہو۔ اس طرح بچے ابتدا ہی سے ناپاک اثرات سے محفوظ ہو جائیں گے اور بعد میں جب برہنگی سے واسطہ پڑے گا تو ان میں شہوی جذبات پیدا نہ ہوں گے۔

اسی طرح بولشے کہتا ہے کہ نہانے وقت تو ہم ایک حد تک برہنہ ہوتے ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ جسمانی ریاضت

کے وقت بھی برہنہ ہوں، پہلے پہلے مرد عورت علٰحدہ علٰحدہ برہنہ ہوں لیکن جب ہم اس خیال سے مانوس ہو جائیں تو بعض اوقات دونوں ایک ساتھ ہو جائیں۔ ہم میں یہ قابلیت پیدا ہونی چاہیئے کہ غیر جنس کے افراد کے برہنہ جسم کو اس قدر ضبط نفس اور پاک باطنی سے دیکھ سکیں کہ برہنگی مہیج شہوت نہ رہے۔

بہرحال ان علماء کا یہ خیال ہے کہ عہد طفولیت ہی سے بچوں کو برہنگی سے مانوس ہونا چاہیئے، ہر خاندان میں اسکے موقعے موجود ہیں مثلاً کھیل کود میں، باغ میں، اور خصوصاً نہاتے وقت اگر کسی خاندان میں صرف ایک ہی جنس کے بچے ہوں تو والدین کو چاہیئے کہ کسی دوسرے خاندان سے جہاں دوسری جنس کے ہم عمر بچے موجود ہوں دوستانہ تعلقات قائم کر لیں تاکہ یہ آپس میں مل جل کر رہیں اور انس و محبت کی فضا میں نشوونما پائیں۔ اس طرح برہنگی شہوت انگیزی کے ہم معنی نہ رہیگی بلکہ ایک معصوم فطری چیز ہو جائیگی۔ اور حاسۂ جمال میں شائستگی پیدا کرے گی۔

اس امر کے واضح کرنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ برہنگی اور بے شرمی دونوں علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں اس لئے اگر برہنگی کی وجہ سے نوجوان خود اپنی ذات کو حقیر سمجھنے لگیں یا اپنے بزرگوں کی وقعت ان کے دل میں باقی نہ رہے تو جان لینا چاہیئے کہ برہنگی کے لئے ہم نے بہت زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ فقدانِ لباس اور فقدان حیا میں کوئی نسبت لزومی نہیں ہے، کیونکہ اکثر وحشی قبائل جو بالکل برہنہ زندگی بسر کرتے ہیں، اِن وحشیوں سے زیادہ حیادار ہوتے ہیں جو کپڑے پہنے رہتے ہیں۔ پلوٹارک کا بھی یہی خیال تھا کہ حیا کا تعلق لباس سے ضروری نہیں، کیونکہ باحیا عورت کا لباس خود اس کی حیا ہے اور اگر کبھی وہ اپنی چادر دور کرتی ہے تو حیا کے آنچل کی اوٹ کر لیتی ہے۔ جاپان کی ایک ممتاز خاتون نے ڈاکٹر ہیلز سے کہا تھا کہ "عورت برہنہ ہونے کے باوجود حد درجہ شریفانہ زندگی بسر کر سکتی ہے"

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ سوال بڑا اہم ہے کیونکہ قومی روایات کی وجہ سے ہم برہنگی کو بے شرمی کا مترادف سمجھنے لگے ہیں اور جب ہم اس نقطۂ نظر سے ایک برہنہ عورت کو دیکھتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نیت کا حال جان لیتی ہے اور جذبۂ حیا اس کو ستر پوشی پر مجبور کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر ممالک میں جہاں عورتیں برہنہ رہنے کی عادی ہیں یورپین سیاحوں کی بُری نگاہوں کی تاب نہ لا کر اپنے جسم کو ڈھانک لیتی ہیں۔ مسٹر ائرجس کا کچھ زمانہ جاپان میں گزرا ہے یہاں کی عورتوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ غیر ممالک کے باشندوں کے سامنے برہنہ چلنے سے انکار کرتی ہیں۔ مسٹر ائرز خود چونکہ ڈاکٹر تھا اور جاوا میں ایک عرصہ تک رہ چکا تھا جہاں برہنگی کا عام رواج ہے اسلئے جاپانی عورتیں اس کے سامنے برہنہ آنے سے احتراز نہیں کرتی تھیں۔

جذبۂ حیا کی طرح "جذبۂ نمود" بھی بالکل فطری ہے اور اسی جذبہ کے تحت نہ صرف نیک طینت و پاکباز مردوں میں بلکہ نوجوان عورتوں میں بھی یہ میلان پایا جاتا ہے کہ اپنے خوبصورت بدن کو نہ صرف خود دیکھیں بلکہ مناسب

موقع و محل، پر غیروں کے سامنے بھی اس کی نمائش کریں۔ وحشیوں میں بھی یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اپنے جسم اور اعضا کے حسن اور نشو و نما پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سیر نے کہتا ہے کہ عضو جنسی کو چھپانے کی خواہش صرف ان نوجوانوں میں پائی جاتی ہے جن کا نشو و نما پوری طرح نہ ہوا ہو لیکن جو فطری طور پر اچھی طرح نشو و نما پاتے ہیں ان میں یہ جھجک بہت کم پائی جاتی ہے۔

برہنگی کا سب سے پہلا فایدہ تو یہ ہے کہ نوجوانوں کی جنسی صحت (Sexual Hygiene) پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ دوسرا فایدہ یہ ہے کہ اس کا اثر ان لوگوں پر بھی اچھا پڑتا ہے جو عمر میں کسی قدر زیادہ ہیں کیونکہ اس سے ان کا حاسۂ جمال نشو و نما پاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ برہنگی کا رواج اخلاق انسانی پر ایک قسم کا قوی نفسیاتی اثر ڈالتا ہے اور بجائے ضعیف و منفی اخلاق کے انسان میں قوی اور ایجابی اخلاق پیدا ہونے لگتا ہے۔

بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہوں گے کہ بچے جنس مقابل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے کس قدر وقت، صبر، اور ذہنی قوت کو کام میں لاتے ہیں۔ ان کی یہ ساری کوششیں راز میں ہوتی ہیں لیکن بعض وقت یہ راز فاش ہو جاتا ہے اور قانون کی نگاہوں میں "جرم" قرار پاتا ہے! جرمنی کے ایک مشہور مقنن نے حال ہی میں کہا تھا کہ اگر بچوں میں جنس مخالف کے اعضائے جنسی اور اُن کے فرائض سے ایک قسم کا انس پیدا کر دیا جائے تو نوے فیصدی ناجائز حرکات کا خاتمہ ہو جائیگا۔

نوجوانوں کے فطری تجسس کو کم کرنے کے علاوہ برہنگی کی روحانی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ بالغ السن حضرات کے لئے جو نوجوانی کے جذبات کو رخصت کر چکے ہوتے ہیں برہنگی ایک قسم کی تحریک روحانی ہے، کیونکہ انسان کے جسم کا نظارہ ہمارے لئے دنیا میں سب سے زیادہ قریبی چیز ہے اور اس کی طاقت، اس کی لطافت و حلاوت زندگی کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔ دنیا کی کوئی حسین چیز حتیٰ کہ خوبصورت پھول، خوشنما ستارے، شباب انگیز سمندر بھی جسم انسانی سے زیادہ حسین و مسرت بخش نہیں! کسی نے خوب کہا ہے "عورت کے جسم کی قوت محض مادی نہیں ہے بلکہ اس کی قوت اسی طرح روحانی ہے جیسی موسیقی کہ اس کا اثر ہوا کے ارتعاشات ٹلنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔"

بولشے نے خوب کہا ہے کہ ہمیں انسان کے برہنہ جسم کو اُنھیں نگاہوں سے دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے جن نگاہوں سے ہم ایک خوبصورت پھول کو دیکھتے ہیں ہمیں اُس کی قوت، صحت و حسن سے کیف اندوز ہونا چاہئے، کیونکہ پھول محض برہنہ جسم، ہی نہیں بلکہ وہ جسم کا ایک نہایت مقدس حصہ ہے یعنی پودے کا عضو نسلی ہے!"

ایک مشہور آسٹرین مصنف کا بیان ہے کہ وہ ایک روز دنیا سے تنگ تھا، اتفاقاً اس کی نگاہ ایک معصوم لڑکے پر جا پڑی جو بالکل برہنہ تھا، اس کے چہرے کی خوبصورتی، اس کے ہاتھ پاؤں کی نفاست نے "(وہ کہتا ہے)

"میرے دردمند دل کو مسرت اور نئی امیدوں سے بھر دیا، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں نے دل میں کہا کہ جب تک دنیا میں حسن کا وجود ہے میں اپنی ناکام کوششیں بھی برابر جاری رکھونگا"!

آخر میں برہنگی کا اخلاقی سوال پیش ہوتا ہے۔ گزشتہ پچاس سال سے اس پر کافی بحثیں ہو رہی ہیں، تاہم عوام الناس اس سے مانوس نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسم انسانی کوئی حقیر شے نہیں، اور اس کے نظارے میں دو عنصر پائے جاتے ہیں، ہیبت و جمال، جذب و دفع، انسان کا دل اس طرف مائل بھی ہوتا ہے اور ہٹ بھی جاتا ہے، اسی دوگونہ قوت کیوجہ سے نظارہ میں نیکی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور جذبات شہوی کا روکنا بھی ناممکن ہوجاتا ہے۔ لیکن تجربہ یہی کہتا ہے کہ جذبات شہوانی کا تعلق زیادہ تر جسم مستور ہی سے ہے اور یہ امر عام طور پر مسلم ہوگیا ہے کہ لباس زیور اور آرائش کی مختلف چیزوں کا اصل مقصد خواہشات نفسانی کا اشتعال ہی ہے اور برہنہ جسم کو سنوارا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس کے نظارہ سے صنف مخالف میں ہیجان نفسی پیدا ہوجائے اس کی صداقت سے نقاشوں کے ماڈل، بخوبی واقف ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جنھیں برہنہ بدن دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چنانچہ مشہور مصنف ڈاکٹر شوفلڈ سے ان کے ایک ماڈل نے کہا تھا کہ جونہی وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تھی - وہ فوراً برہنہ ہوجاتی تھی، کیونکہ مرد اپنے جذبات پر قادر نہیں رہتے اور اس کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ برہنگی کی حالت میں اس قدر جذبات کو مشتعل نہیں کرسکتی جس قدر کہ نیم برہنگی کی حالت میں اس لئے ظاہر ہے کہ اگر شہوانی خواہشات پر تسلط حاصل کرنا زندگی کا مقصد وحید ہو تو یہ زیادہ قرین عقل ہوگا کہ لباس کا استعمال منع کردیا جائے نہ کہ برہنگی کو جرم قرار دیں!

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ برہنگی کے نظارہ سے اشتعال ہوتا ہے تو پھر بھی یہ صحیح ہے کہ اس نظارہ کی وجہ سے ضبط نفس جیسی شریف صفات کے سیکھنے کا موقع ملتا ہے، حقیقت میں وہ نیکی نہایت ہی کمزور ہے جو محض ترغیبات سے محفوظ رکھنے کے لئے ہمیں جنگل میں بھیج دے۔ ہولباخ نے صحیح کہا ہے کہ عقل صحیح جذبات کے انتخاب کا فن ہے اور تعلیم نام ہے قلوب انسانی میں ان کو جاگزیں کرنے کا۔ برہنگی کا نظارہ اس نقطۂ نظر سے بہت قدر و قیمت رکھتا ہے کہ وہ ہمیں ایسی شے سے خوش ہونا سکھاتا ہے جسکے ہم مالک نہیں ہوتے، اور ہماری مسرت غرض سے خالی ہوتی ہے، یہ ایسا سبق ہے جو ہر معاشری زندگی کی تعلیم کا ضروری جزو ہے۔ اگر بچہ کو یہ تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ خوبصورت پھول کو دیکھے اور اس کو توڑے نہیں، تو بالغ العمر آدمی کو یہ سیکھنا چاہئے کہ وہ عورت کے حسن و جمال کو دیکھے اور ملکیت کی خواہش نہ کرے۔ لوگ اس کو ناممکن سمجھتے ہیں لیکن در اصل یہ صحیح نہیں ہے --- انسان کے دوسرے جذبات کی طرح یہ خواہش بھی فطری حدود کے اندر نشو و نما پاسکتی ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ شروع سے برہنگی کی اہمیت یا جاذبیت کے خیال کو محو کیا جائے

جن لوگوں کی تربیت خراب ہوئی ہے اُن کا — اہل یونان یا دوسری نفیس طبائع اقوام کی ذہنی حد تک پہونچنا اور انسان کے برہنہ جسم کے نظارہ سے جمالیاتی، علمی اور اخلاقی فوائد حاصل کرنا ناممکن معلوم ہوگا، لیکن ہمیں اس نقطۂ کمال تک پہونچنے کی کوشش میں کمی نہ کرنی چاہیئے۔ دسلے نے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ شیطان ہی کیوں ہمیشہ بہترین نغموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اسی طرح زمانۂ حال کے لوگ پوچھنے لگے ہیں کہ کیوں انسانی جسم - وہ الٰہی نغمۂ تخلیق - کے بہترین لمحوں میں ظہور پذیر ہوا ہے - انھیں لوگوں کی دیدہ بازی کے لئے مخصوص ہو جائے جو فحش کی تلاش میں رہتے ہیں" یہ وہ خیالات ہیں جن کو ہم آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے گو عوام کی جانب سے ان کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو! —

"دور نظر"

(نگار) یہ مضمون ہے ایک ایسے بزرگ کا جو یوروپ میں اپنی عمر کا معقول حصہ بسر کرکے ہندوستان واپس آئے ہیں اور علم وفضل کی بڑی بڑی سندیں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ لیکن کیا حیرت کا مقام نہیں کہ وہی شخص جو "عریانی" کی حمایت میں اس قدر طویل مقالہ سپرد قلم کرتا ہے، وہ اتنی اخلاقی جرأت بھی اپنے اندر نہیں رکھتا کہ جسم تو جسم صرف اپنے نام ہی کو "عریاں" پیش کر سکے۔ اُنھوں نے اپنے اصلی نام کے بجائے صرف "دور نظر" لکھنا کافی سمجھا ہے، درانحالیکہ برہنگی یا عریانی سے لطف اندوز ہونے یا بقول اُن کے کسب روحانیت کے لئے "دور نظری" سے کام نہیں چلتا، بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے آنکھیں چار ہونے کے، اتصال جسم ولب کی اور "تو من شدی، من تو شدم" کی

نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں شعبۂ ادارت ہی کی طرف سے ایک مضمون اسی موضوع پر شایع ہو چکا ہے اور اس میں تقریباً یہی خیالات اور مغرب کے ائمۂ عریانی کے یہی اقوال پیش کئے گئے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ میں نے اس مضمون میں ایک حد تک ان خیالات کی مخالفت کی ہے اور ہمارے فاضل مقالہ نگار اس کے موافق ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ برہنگی کے جو فوائد ہم کو بتائے جاتے ہیں، وہ بڑی حد تک قابل لحاظ ہیں۔ لیکن اس کا ایک فائدہ جس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہم شروع ہی سے عریانی و برہنگی سے مانوس بنا دیئے جائیں تو ہمارے جذبات جنسی میں کسی کو عریاں دیکھ کر ہیجان پیدا نہیں ہو سکتا اور میں بھی اس کی صحت کو تسلیم کرتا ہوں

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے جذبات جنسی میں ہیجان پیدا کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ؟۔
ظاہر ہے کہ کوئی صائب الرائے شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب انسان کے جذبات جنسی مفقود ہوجاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ اضمحلال قویٰ ، ضعف عقل و دماغ ، فقدان ولولہ و نشاط ، اور انحطاط حرکت و عمل کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی شخص جو جوانی میں یکسر پیکر عمل ہوتا ہے ، ضعف و پیری کی حالت میں بیکار محض ہوجاتا ہے ۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کا تعلق جذبات جنسی سے نہیں ہے بلکہ محض اس زمانہ سے ہے جب قوائے انسانی پوری طرح نشو و نما پا چکے ہوتے ہیں تو پھر میں یہ دریافت کرونگا کہ وہ نوجوان جن میں کسی خاص سبب سے ضعف رجولیت پیدا ہوجاتا ہے ، کیوں دنیائے عمل میں بیکار ثابت ہوتے ہیں اور جب بوڑھے آدمیوں پر "اعادۂ شباب" کا آپریشن کیا جاتا ہے تو کیوں ان میں وہی تمام کیفیتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو جوانی کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں۔

بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ شباب اور شباب کی اُمنگ جس چیز سے عبارت ہے وہ صرف "خواہش جنسی" ہے اور اسی کا اضمحلال شباب کا اضمحلال کہلاتا ہے ۔ پھر جب اصل چیز یہی قرار پائی تو کیا ہمارا اصول معاشرت میں ایسی باتوں کا رائج کرنا ، جو "جذبات جنسی" میں بجائے ہیجان پیدا کرنے کے اضمحلال پیدا کریں ، کسی طرح مناسب قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہمارے فاضل مقالہ نگار نے خود ہی اس بات کو تسلیم کیا ہے اور واقعی تسلیم کرنے کی بات بھی ہے کہ ملبوس و آرائش کا مقصد ہی صرف جذبات جنسی میں ہیجان پیدا کرنا ہے اس لئے جب تک اصولاً اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ "ہیجان جذبات" بُری چیز ہے ، اسوقت تک لباس و آرائش کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان عہد قدیم میں عریاں زندگی بسر کرتے کرتے تنگ آگیا اور اُس نے محسوس کیا کہ مرد و عورت کے درمیان تعلق جنسی کی خواہش بھی ایک دوسرے کو برہنہ دیکھتے دیکھتے مفقود ہوتی جارہی ہے ' تو اس نے یہی تدبیر سوچی ہوگی کہ ایک دوسرے کی نگاہ کے لئے کچھ موانع و حجاب پیدا کئے جائیں اور جب اس کے اولین تجربات مفید ثابت ہوئے ہونگے تو اصولاً ستر پوشی کو لازم قرار دیدیا ہوگا تاکہ مرد و عورت کے خواہشات جنسی میں ہیجان و اشتعال پیدا ہوتا رہے ' جو تمدن انسانی کی ترقی کے لئے از بس ضروری ہے ۔

اس میں کلام نہیں کہ جو وحشی قومیں عریاں رہتی ہیں ان کی صحت جسمانی اچھی رہتی ہے ' لیکن انسان نام صرف صحت جسمانی کا نہیں ہے بلکہ صحت احساس و ادراک کا بھی ہے ۔ اس کے علاوہ یوں بھی

ملاحظہ کیجئے کہ اگر آج ملبوس کا استعمال ممنوع قرار دیدیا جائے تو انسانی تمدن کی ترقی کس قدر پیچھے ہٹ جائے گی اور ہماری کتنی صنعتیں محو ہو کر ہماری قوت ابداع و اختراع کو مضمحل کردینگی۔

وہ چیز جو انسان کو تمام دیگر مخلوقات سے ممیّز و ممتاز بناتی ہے اس کا ذوق "وجدانیات" ہے جسے "جمالیات" بھی کہتے ہیں۔ اگر آج یہ ذوق مفقود ہوجائے تو انسان و حیوان دونوں برابر ہیں۔ پھر غور کیجئے کہ اس ذوق کا تعلق عریانی سے ہے یا ستر پوشی سے، اور ہیجانِ نفس جو اصل محرک اس ذوق کا ہے، وہ جسم مستور سے وابستہ نظر آتا ہے یا جسم عریاں سے۔ آپ ہی غور کیجئے کہ اگر آج ساری دنیا ننگی ہوجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میری رائے میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا فن تعمیر آرٹ کا فن پارچہ بافی آپ کا فن تزئین و آرائش اور تمام فنون لطیفہ مردہ ہوجائیں گے کیونکہ پھر نہ ہم کو عالی شان محلوں کی ضرورت ہوگی، نہ دیبا و حریر کی نہ ہمارے دلوں میں کوئی ہیجان پیدا ہوگا کہ نقش و نغمہ کی طرف متوجہ ہوں اور نہ کوئی خاص اُمنگ جو ہمیں محنت و عمل کی طرف مایل کرے الغرض مرد عورت کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہجائے گا اور انسانی زندگی ریگزار کی طرح ویران اور سنسان نظر آنے لگے گی۔

مرد عورت کا مستور رکھا جانا حقیقتاً بالکل نفسیاتی اصول پر مبنی ہے اور اس سے مدعا یہی ہے کہ دونوں میں باہم دگر کشش باقی رہے اور شوق کی آگ نہ بجھنے پائے۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی ہے کہ جو چیز اس سے زیادہ چھپائی جائے گی اس کے لئے زیادہ عسیر الحصول ہوگی اتنی ہی رغبت بڑھیگی اور اسی نسبت سے شوق و ولولہ میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ ایک بیوی کی طرف سے رغبت شہوانی کا آہستہ آہستہ کم ہوجانا خواہ وہ کتنی ہی جمیل کیوں نہ ہو اور غیر عورت کی طرف کھنچنا خواہ وہ کیسی ہی معمولی شکل و شمائل کی ہو، اسی نفسیاتی اصول کی بنا پر ہے۔

بہر حال عریانی کے اور جو فوائد بھی ہوں، لیکن اس کی یہ مضرت بالکل یقینی ہے کہ جذبات جنسی اس سے فنا ہوجاتے ہیں جن پر نوعِ انسانی کے ترقی کا مدار ہے۔

اس وقت یورپ میں جرمنی اس کا سب سے بڑا علمبردار ہے، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا اس تحریک کا بڑا سبب وہاں کی اقتصادی مشکلات ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اُن کا مقصود واقعی وہی ہے جو فاضل مقالہ نگار نے بتایا ہے تو افسوس ہے کہ اس کی اہمیت و صداقت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً مغرب و اہل مغرب کی ترقیاں اور ان کے اصولِ زندگی نہایت پاکیزہ و مستحکم ہیں لیکن بلا غور کئے ہوئے اُن کی ہر تحریک کو لبیک کہنا، وہی کورانہ تقلید ہے جس نے اہل ایشیا اور خصوصیت

کے ساتھ اہل ہند کو تباہ کر رکھا ہے۔

ممکن ہے صاحب مضمون کا تجربہ اس کے خلاف ہو، لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آج مرد و عورت دونوں ننگے پھرنے لگیں تو تھوڑے ہی زمانہ کے بعد انسانی نسل میں انحطاط شروع ہو جائے اور دونوں جنسوں میں رفتہ رفتہ اضمحلال پیدا ہو کر کائنات کی رونق خاک میں مل جائے۔

آئندہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء کا نگار

حسب معمول دو چند ضخامت پر شایع ہوگا اور عجیب و غریب مجموعہ ہوگا صرف حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا یا اُن کی تنقیدات عالیہ کا جو عہد حاضر کے بہترین شعراء کے کلام پر کیجائیں گی۔ ناظرین براہ کرم مطالعہ فرمائیں کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر کثرت رائے سے صورت اوّل اختیار کی گئی تو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر دوسری صورت اختیار کی گئی تو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حسب ذیل شعراء کے کلام پر تنقید کر کے بتایا جائیگا کہ کون کس مرتبہ کا ہے اور کس کے کلام میں کس قدر اور کس نوع کی غلطیاں یا خوبیاں پائی جاتی ہیں:۔

اقبال، (علی) اختر (حیدرآباد)، اصغر، جگر، جوش، حسرت، سیماب، صفی، عزیز، فانی، یاس،

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ گزشتہ دس سال میں باب الاستفسار کے ماتحت جو جوابات مختلف لوگوں کے سوالات پر حضرت نیاز نے دیئے ہیں اُن کا انتخاب شایع کر دیا جائے۔

بہرحال اس کا فیصلہ ناظرین نگار کے ہاتھ میں ہے اور انھیں کی پسند پر چھوڑا جاتا ہے لیکن یہ رائے زیادہ سے زیادہ ۲۰ نومبر تک دفتر میں پہونچ جانی چاہئے۔ — منیجر نگار لکھنؤ

سیزر اور کلیوپیٹرا

(انگلستان کے مایہ ناز ادیب برنارڈ شا کا ڈراما)

پہلا ایکٹ

مصر کے ۳۳ ویں خاندان کے اختتام پر (یعنی ۴۸ قبل مسیح) نخلستان سیریا کے حدود پر، چاندنی رات کی ایک صبح کو، کرۂ آتشیں مشرق سے طلوع ہو رہا ہے، ستارے اور صاف آسمان، جو اس وقت ہمیں نظر آ رہے ہیں اُس وقت ساڑھے انیس سو سال کم عمر تھے اور ان کے نیچے، تمدن انسانی کی دو یادگاریں نظر آتی تھیں:- ایک محل اور دوسرا سپاہی۔

محل جو ایک قدیم شامی طرز کی عمارت ہے اور سفید اینٹوں سے بنائی گئی ہے اس قدر بدنما نہیں ہے جیسا قصر بکنگھم۔ اور اس کے کشادہ صحن میں جمع رہنے والے سپاہی موجودہ زمانہ کے انگلستانی عہدہ داروں سے زیادہ مہذب ہیں۔ مثلاً وہ اپنے دشمنوں کی نعشوں کو قبروں سے نکال کر ان کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ جیسا کہ ہم لوگ کرامول اور مہدی کی نعشوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ ایک جماعت اپنے کپتان بلزنار کی قمار بازی کی طرف متوجہ ہے جو ایک حبشی رنگرٹ کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں منہمک ہے دوسرا گروہ ایک پہرہ دار کے گرد مجتمع ہے جو ابھی ابھی ایک نہایت پرلطف قصہ کہکر فارغ ہوا ہے اور جس کو سنکر سب لوگ ہنس رہے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ سب خوبصورت مصری جوان ہیں، جو اسلحہ اور زرہ بکتر سے آراستہ ہیں

بلزنار ایک مرد آزمودہ کار ہے اور بہت تیز و چالاک، جہاں سخت ظلم و تشدد کی ضرورت ہو وہاں اس کی مکاریاں اور جعلسازیاں کام کرتی ہیں اور جب اس کی ضرورت نہ ہو تو وہ بالکل سیدھا سادھا اور لڑکوں کی مانند بھولا انسان معلوم ہوتا ہے، یہ ایک بارعب سپاہی، ایک بے مثال افسر اور ایک زبردست حاکم ہے۔ وہ بجید انہماک کے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہے دوسرے چھوٹے عہدہ دار اپنے نیزے دیوار سے لگائے ہوئے کھڑے ہیں، صحن کے ایک گوشہ میں جسکا ایک رخ قیصر کے سامنے پڑتا ہے، ایک بڑا دروازہ لگا ہوا ہے۔ دوسری طرف ایک دیوار ہے جس میں ایک پھاٹک لگا ہوا ہے، قصہ گو محل کی سمت میں ہے۔ اور قمار باز دیوار کی طرف پھاٹک کے قریب۔ دیوار کے سامنے ایک

بہت بڑا پتھر ہے جو اس قدر بلند ہے کہ ایک حبشی پہرہ دار اُس پر کھڑا ہو تو دیوار کے باہر دیکھ سکتا ہے۔

ایک دیوار میں لگی ہوئی قندیل سے صحن روشن ہے اور عجمی سردار بازی جیت کر زمین پر پڑی ہوئی چھڑی اٹھالیتا ہے۔

بلزنار:- ایپِس کی قسم ہے عجمی، تیرے دیوتا تجھ پر بہت مہربان ہیں۔

عجمی:- او سردار، پھر ایک بار قسمت آزماؤ۔ یا تو دوگنا ملیگا یا پھر کچھ نہیں۔

بلزنار:- نہیں۔ اب نہیں، اس وقت کچھ میرا دل نہیں لگتا۔

سنتری:- (اپنی برچھی اٹھاکر) کھڑا رہ، کون جا رہا ہے؟

(سب کھڑے ہو جاتے ہیں ایک عجیب آواز باہر سے جواب دیتی ہے)

آواز:- بُری خبروں کا پیغامبر

بلزنار:- (سنتری کو پکار کر) آنے دے۔

سنتری:- (اپنی برچھی زمین کی طرف جھکاکر) او بُری خبروں کے پیغامبر۔ میرے قریب آ۔

بلزنار:- (شطرنج کو جیب میں رکھ برچھی کو اٹھاتے ہوئے) ہم کو اس آدمی کا خیر مقدم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بری خبریں لا رہا ہے۔

(محافظ اپنی اپنی برچھیاں لیکر پھاٹک پر جمع ہو جاتے ہیں اور آنیوالے کے لئے بیچ میں راستہ چھوڑ دیتے ہیں)

عجمی:- (گھٹنے کے بل اٹھتے ہوئے) کیا بری خبریں ہیں؟

بلزنار:- او وحشی عجمی، میری بات سن، مصر میں اچھی خبریں لانے والا دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن بری خبریں لانے والے کا خون، کوئی دیوتا قبول نہیں کرتا۔ اس لئے جب ہم کو اچھی خبریں ملتی ہیں تو ہم ان کو غلام کے منھ سے سنتے ہیں اور بری خبریں وہ شرفا لاتے ہیں جو اپنی اہمیت کو لوگوں کی نظروں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(آنے والے پھاٹک کے پاس پہنچ جاتے ہیں)

سنتری:- او جوان سردار، جا اور ملکہ کی حضور میں سر تسلیم خم کر۔

آواز:- جا اور اپنی برچھی پر سور کی چربی مل لے، کیونکہ صبح ہونے سے قبل ہی رومی سپاہی اُسے تیرے حلق میں داخل کر دیں گے۔

آواز دینے والا ایک خوبصورت بالوں والا، خوش پوشاک نوجوان ہے جو محافظوں سے بالکل مختلف کئی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ہے پھاٹک میں ہنستا ہوا داخل ہوتا ہے اس کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی جنگ میں شریک ہو کر آیا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی ہے اور داہنے میں کسی رومی سپاہی کی ایک تلوار ہے جو میان میں رکھی ہوئی ہے وہ صحن میں پہنچتا ہے۔ بلزنار، اور محافظ سپاہی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

بلزنار:- تو کون ہے جو ملکہ، کلیوپیٹرا کے محل اور بلزنار کے سامنے یوں ہنستا ہے۔

اجنبی:- میرا نام بلا فرکس ہے اور میں دیوتاؤں کی نسل سے ہوں۔

بلزنار:- (رسماً) خوش آمدید - برادر۔
سب مل کر:- (عجمی کے سوا) خوش آمدید برادر۔
عجمی:- او اجنبی میرے سوا ملکہ کے تمام محافظ دیوتاؤں کی نسل سے ہیں میں البتہ ایک عجمی ہوں اور دنیاوی بادشاہوں کی نسل سے۔
بلزنار:- اے بلافریس، تم جنگ میں رہ چکے ہو اور جانتے ہو کہ سپاہی کسے کہتے ہیں اس لئے مجھے اُمید ہے کہ تم ملکہ کی کنیزوں کو سب سے پہلے اپنی خبریں نہ سناؤ گے۔
بلافریس:- اس کے سوا میں اور کوئی خبر نہیں لایا کہ ہم سب کے سر قلم کر دیئے جانے والے ہیں — سپاہیوں کے، عورتوں کے اور سب کے!
عجمی:- (بلزنار سے) میں نے بھی تم سے یہی کہا تھا۔
سنتری:- (جو اب تک سن رہا تھا) آہ افسوس۔
بلافریس:- صبر صبر، قسمت دیوتاؤں کے ساتھ ہے جنھوں نے تجھے سیاہ رنگ میں رنگا ہے۔ (بلزنار سے) اس آدمی (عجمی کی طرف اشارہ کرکے) نے تم سے کیا کہا ہے؟
بلزنار:- اس نے کہا کہ روم کا جولیس سیزر جو ایک مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ملک میں آپہنچا ہے۔ خود مصر کا حکمران بنجائیگا۔ کسان اس لئے ہیں کہ ہل جوتیں۔ لوہار، سنار اور رنگریزوں کے بیٹے سارے کام کاج کرنے کو بنائے گئے ہیں اور ہم تو شرفا میں سے ہیں اور ہتھیاروں کو متبرک سمجھنے والے دیوتاؤں کی نسل سے!

عجمی:- دیوتا اپنے غریب رشتہ داروں پر ہمیشہ مہربان نہیں ہوتے۔
بلزنار:- (غصہ سے عجمی کو دیکھ کر) انسان کی اولاد کیا ہم سیزر کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں؟
بلافریس:- (ان کے درمیان آکر) اے انسان کی اولاد وسنو، ہم مصری ایسے ہی افضل ہیں جیسے دیوتا رومیوں کے مقابلہ میں۔
محافظ:- آہا ہا۔
بلافریس:- لیکن یہ سیزر- آدمی کے مقابلہ میں آدمی کو کچھ نہیں سمجھتا - وہ اپنی فوج سے اس مقام پر حملہ کرتا ہے جہاں تمھاری حالت بہت کمزور ہو- وہ گویا پہاڑ پر سے ایک پتھر پھینکتا ہے اور اس کا لشکر یوں سمجھو کہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے سر صرف ایک ہی ہے مگر ہاتھ ہزاروں ہیں اور مذہب کوئی نہیں رکھتا میں نے اس کا مقابلہ کیا ہے اور میں اس سے پوری طرح واقف ہوں۔
بلزنار:- کیا بھائی تم ڈر گئے تھے۔؟

محافظ سپاہی خوفناک قہقہہ لگاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اپنے سردار کی اس بات پر چمکنے لگتی ہیں

بلافریس:- نہیں بھائی- لیکن مجھے شکست اٹھانی پڑی- وہ ڈر گئے تھے شاید- لیکن انھوں نے ہم کو بھوسے یا چھلکے کی طرح پراگندہ کر دیا-

محافظ نفرت آمیز لہجہ میں باہم رائے زنی کرتے ہیں

بلزنار:- کیا تم نہ مر سکتے تھے؟
بلافریس:- نہیں- کیونکہ ایک دیوتا کی نسل سے ہونا

بہت سی مشکلوں سے بچا لیتا ہے - اس کے علاوہ اسکا وقت بھی نہ تھا - یہ سب کچھ پلک مارتے ہوگیا - حملہ ہیں ہوا جہاں ہم کو ذرا بھی توقع نہ تھی -

بلزنار :- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومی بزدل ہیں

بلافریس :- وہ بزدلی کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے وہ جیتنے کے لئے لڑتے ہیں جنگ کی عظمت و شرافت انکے نزدیک بے معنی چیز ہے -

عجمی :- فدا جنگ کے واقعات تو بیان کرو - کیا کیا ہوا؟

سب محافظ :- (بلافریس کے گرد خواہشمندانہ طور پر جمع ہوتے ہوئے) ہاں جنگ کی داستان ہم بھی سنیں

بلافریس :- تو تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں معبد را کے محافظوں میں ایک ادنی درجہ رکھتا ہوں یعنی نہیں کلیوپیٹرا کی خدمت گذاری کرتا ہوں نہ اس کے بھائی ٹالمی کی - البتہ بڑے دیوتاؤں کی اطاعت میں ضرور رہا ہوں - ایک بار ہمنے محض اس غرض سے سفر کیا کہ کلیوپیٹرا کو سیریا بھگا دینے کا سبب ٹالمی سے دریافت کریں اور یہ کہ ہم مصریوں کو پمپئی کے ساتھ (جو اس وقت فارسیلیا میں سیزر کے ہاتھوں شکست اٹھاکر ہمارے ملک میں وارد ہوا تھا) کیا سلوک کرنا چاہئے - تمھارا کیا خیال ہے کہ ہم کو کیا معلوم ہوا؟ مجھ سے سنو، ٹالمی نے پمپئی کو قتل کر ڈالا - جس کا کٹا ہوا سر وہ فاتح کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے محفوظ رکھے ہوئے ہے -

(محافظوں میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے)

بلکہ اس سے بھی زیادہ اضطراب آفریں بات ہم کو یہ معلوم ہوئی کہ سیزر آ پہنچا ہے کیونکہ ابھی ہم نے نصف روز کا سفر بھی طے نہ کیا تھا کہ ایک ایسے شہر میں پہنچے جہاں کے لوگ اس کی فوج کے ڈر سے بھاگ رہے تھے -

بلزنار :- اور تم مندر کے محافظ ! کیا تم نے اس لشکر کا مقابلہ نہیں کیا؟

بلافریس :- انسان بھلا کیا کر سکتا تھا جو ہم نے کیا - لیکن اسی وقت بگل کی آواز کانوں میں آئی جو ایک سیاہ پہاڑ کی بد دعا کی مانند تھی تب ہم نے دیکھا کہ ڈھالوں کی ایک دیوار سی ہماری طرف آرہی ہے - تم جانتے ہو کہ دل کسقدر جلنے لگتا ہے جب تم قلعوں سے محفوظ مقام پر حملہ کرتے ہو ؟ لیکن جب خود قلعہ کی دیوار تم پر حملہ کرے تو کیا ہو؟

عجمی :- (لوگوں سے) کیا یہ میں نے نہیں کہا تھا ؟

بلافریس :- جب وہ دیوار قریب آئی تو آدمیوں کی ایک صف میں تبدیل ہوگئی - جو بالکل معمولی تھے - لیکن خود اور چمڑے کے لباس پہنے تھے ، ان کے سینے آہنی زرہ سے محفوظ تھے - ان میں سے ہر آدمی نے اپنی برچھی سے وار کیا - ایک جو میری طرف آیا اس نے میری ڈھال میں چھید کر دیا - یہ دیکھو (وہ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور اگر میں جھک نہ جاتا تو وہ میری گردن میں پیوست ہو جاتی - وہ اس وقت دو دو کرکے حملہ کر رہے تھے اور پھر اپنی چھوٹی چھوٹی تلواریں لیکر ہم پر آپڑے ، تم سمجھ سکتے ہو کہ جب کوئی آدمی تمھارے پاس ایسی تلوار لیکر پہنچ جائے ، تو تم اپنے ان ہتھیاروں سے کچھ نہیں کر سکتے - کیونکہ وہ سب بہت لمبے ہیں ؟

عجمی :- تم نے کیا کیا ؟
بلا فریس :- میں نے گھونسا تان کر رومی کے جبڑوں پر مارا - بہرحال وہ آدمی ہی تھا ایک گڑھے میں گر پڑا - اور میں نے اس کی تلوار چھین لی - (تلوار میان سے کھینچ کر) یہ دیکھو ایک رومی کی تلوار جس پر رومی خون کے قطرے ہیں -
محافظ :- (تعریف کرکے) بہت خوب، بہت خوب (وہ تلوار لیکر یکے بعد دیگرے دیکھتے ہیں اور اسکا امتحان کرتے ہیں)
عجمی :- اور تمھارے آدمی ؟
بلا فریس :- بھاگ گئے - بھیڑوں کی طرح تتر بتر ہوگئے
بلزنار :- (غضبناک ہوکر) بزدل، کمینے، بھاگ گئے دیوتاؤں کے عزیزوں کو قربان ہونے کے لئے چھوڑ دیا
بلا فریس :- (نہایت بے پروائی سے) دیوتاؤں کے رشتہ دار قربان ہوجانے کے لئے نہیں ٹھہرے - بھائی یہ طاقتوروں کی، جنگ نہیں تھی، بلکہ دوڑتھی سب سے زیادہ تیز آدمیوں کی - رومیوں نے جن کے پاس رتھ نہیں تھے ہمارے تعاقب میں سواروں کا ایک دستہ روانہ کیا اور مجمع کو قتل کرڈالا تب ہمارے بڑے دیوتاؤں کے سردار نے بارہ دیوتاؤں کے رشتہ داروں کو روانہ کیا - اور یہ کہلا بھیجا کہ ہم لڑتے ہوئے مرجائیں - میں نے جی میں کہا کہ بہ نسبت اس کے کہ میں اپنے ہوش و حواس کھودوں، اور پشت پر زخم کھاؤں، سامنے مقابلہ کرنا بہتر ہے

اس لئے میں نے اپنے سردار کا ساتھ دیا اور وہیں کھڑا رہا تب رومیوں نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا - کیونکہ کوئی شخص شیر پر اس وقت حملہ نہیں کرتا جب سارا میدان بھیڑ اور بکریوں سے بھرجائے، الغرض اس طرح ہم اپنی جان بچاکر بھاگے - اور میں اب اس امر کی اطلاع دینے آیا ہوں کہ تم کو سیزر کے استقبال کے لئے اپنے پھاٹک کھول دینے چاہئیں - کیونکہ اس کا ہراول ایک گھنٹہ کے اندر ہی یہاں پہونچ جائے گا - اور مصر کا کوئی جوانمرد زندہ نہ بچے گا -
سنتری :- آہ افسوس ! (وہ اپنی برچھی زمین پر پھینک دیتا ہے اور محل کی طرف بھاگتا ہے)
بلزنار :- اس کو دروازہ میں کیلوں سے جڑدو - جلدی (محافظ برچھیاں لیکر اس کی طرف دوڑتے ہیں لیکن وہ ان سے زیادہ تیز دوڑتا ہے) اب یہ خبر آگ کی طرح محل میں پہنچ جائے گی -
بلا فریس :- ہمیں عورتوں کو رومیوں سے بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے ؟
بلزنار :- ان کو مار کیوں نہ ڈالیں ؟
عجمی :- مگر ان میں سے بعض کے لئے ہمیں تاوان دینا پڑے گا - اس لئے بہتر ہے کہ رومی ہی ان کو قتل کرڈالیں - اس طرح سستے چھوٹ جائیں گے -
بلزنار :- (اس کی ذہنیت سے مبہوت ہوکر) او مکار اور سانپ !
بلا فریس :- لیکن تمھاری ملکہ ؟
بلزنار :- سچ ہے، ہمیں کلیوپیٹرا کو لیکر بھاگ جانا چاہئے

بلا فریس :- کیا تم اس کے فرمان کا انتظار کرو گے ؟

بلزنار :- فرمان ! ایک سولہ برس کی لڑکی کا ——— نہیں ہم انتظار نہیں کریں گے - میں اُسے اپنے گھوڑے پر بٹھا کرلے جاؤنگا اور جب ہم لوگ اُسے سیزر کی دسترس سے باہر لیجائیں گے ———

عجمی :- مجھسے سنو بلزنار -

بلزنار :- بول ، کیا کہتا ہے ؟

عجمی :- کلیوپیٹرا کا بھائی ٹالمی اس سے برسرپیکار ہے آؤ ہم اُسے ٹالمی کے ہاتھ بیچ ڈالیں -

محافظ :- او مکار ، او سانپ - !

بلزنار :- ہم میں اس کی جرأت نہیں - ہم دیوتاؤں کی نسل سے ہیں - لیکن کلیوپیٹرا دریائے نیل کی نسل سے ہے - اور اگر دریائے نیل میں طوفان اور سیلاب نہ آئیں تو پھر ہمارے باپ داداؤں کی زمینوں میں غلہ نہ پیدا ہو - ——— اور ہماری زندگی کتوں سے بدتر ہو جائے -

عجمی :- یہ سچ ہے ———

——— لیکن مجھسے ایک بات اور سنو - او سیریس کے عزیزو -

محافظ :- بول ،

عجمی :- کیا میں نے ابتک تم سے سیزر کے متعلق سچ سچ نہیں کہا ؟

محافظ :- بالکل سچ ! بالکل سچ !

بلزنار :- (اعتراف کرتے ہوئے) یہی بلزنار بھی کہتا ہے -

عجمی :- تو اس کے متعلق اور سنو - سیزر عورتوں کا بہت شیدائی ہے وہ ان کو بہت عزیز رکھتا ہے یہ انسے مشورہ لیتا ہے -

بلزنار :- اوہ - مگر یہ عورتوں کی حکمرانی تو مصر کو تباہ کرکے رکھدیگی -

عجمی :- مگر نہیں - سیزر اب معمر ہوتا جا رہا ہے - وہ پچاس برس سے زیادہ بڈھا ہوگیا ہے - وہ جوان عورتوں کی لیئے بہت ضعیف ہے - اور بڈھی عورتیں اس قدر عقلمند ہیں کہ وہ اس کی پرستش نہیں کرسکتیں

بلا فریس :- عجمی ذرا ہوشیاری سے کام لے سیزر اب ہم سے صرف بالشت بھر کے فاصلہ پر ہے -

عجمی :- کلیوپیٹرا بھی جوان عورت نہیں ہے - اور نہ عقلمند ہی ہے تاہم وہ عقلمندوں کو چکر میں ڈالدیتی ہے -

بلزنار :- ہاں یہ اس لئے کہ وہ دریائے نیل کی نسل سے ہے پھر کیا ہو ؟

عجمی :- وہ یہ کہ ہم خفیہ طور پر اُسے ٹالمی کے ہاتھ فروخت کردیں اور پھر اپنے آپ کو سیزر کے سامنے رضاکار کے طور پر پیش کریں اور ٹالمی کو تخت سے اتارنے اور کلیوپیٹرا کو تخت نشین کرنے کے لئے لڑیں

محافظ :- او سانپ !

عجمی :- اگر ہم ملکہ کی تصویر اپنے منہ میں دبا کر اس کے پاس جائیں تو وہ ہماری سنے گا - وہ فتح کرکے کلیوپیٹرا کے بھائی کو مار ڈالے گا - اور مصر میں ملکہ کے ساتھ حکمرانی کرے گا - اور ہم اس کے محافظ ہوں گے -

محافظ :- او سب سے زیادہ ہوشیار سانپ -

بلا فریس :- تمھاری باتیں ختم ہونے سے قبل ہی وہ نازل ہوجائیگا! او باتیں بنانے والو!

بلزنار :- یہ سچ ہے۔ (محل کا ایک خوفناک شور اس کی گفتگو میں خلل پیدا کر دیتا ہے) دروازہ کی حفاظت کرو

(سپاہی دروازہ کی طرف دوڑتے ہیں اور اس طرف اپنی برچھیوں کی نوکیں لگا کر کھڑے ہوجاتے ہیں عورتوں اناؤں اور خادماؤں کا گروہ نمودار ہوتا ہے جو آگے ہیں وہ برچھیوں سے خوفزدہ ہوکر پیچھے والیوں کو پیچھے ہٹنے کے لئے شور کرتی ہیں، جب بلزنار چلاتا ہے تو اس کی آواز سب پر غالب آتی ہے)

واپس جاؤ۔ اندر جاؤ۔ بے مصرف جانورو ــــــ

فتاتا، ملکہ کی خاص اناکو ہمارے پاس بھیجو۔

عورتیں :- (محل میں پکار کر) فتاتا، فتاتا، آؤ۔ آؤ۔ بلزنار سے باتیں کرو۔

ایک عورت :- اوہ پیچھے رہو۔ تم مجھے برچھیوں کی نوک پر ڈھکیلے دیتی ہو۔

(ایک بڈھی، جسیم، قدآور، مضبوط عورت جس کے چہرہ پر جھریوں کا ایک جال سا بن گیا ہے ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی ہیں، منہ شکاری کتے کی طرح، اور جبڑے بلڈاگ کے مانند کھلے ہوئے ہیں محافظوں کو بہت غصہ سے ڈانٹتی ہے۔)

فتاتا :- ملکہ کی خاص اناکے لئے راستہ صاف کرو۔

بلزنار :- (سنجیدہ تکبر سے) فتاتا، تجھے معلوم ہے کہ میں ملکہ کے محافظوں کا سردار اور دیوتاؤں کی نسل سے ہوں۔

فتاتا :- (تمکنت کے ساتھ) بلزنار۔ میں ملکہ کی خاص انا فتاتا ہوں۔ تمھارے آبا واجداد اُن بادشاہوں کے ہرموں میں، جنکی میرے والد نے اطاعت کی ہے، منقوش کئے جانے پر خوش ہوتے تھے۔ (عورتیں فتحمندانہ طور پر ہنستی ہیں)

بلزنار :- (دانت پیسکر طنز سے) فتاتا زبان دراز کوتاہ چشم کی بیٹی! رومی سر پر آپہنچے ہیں۔ (عورتیں خوف سے چیخ مارتی ہیں اور وہ بھاگ جانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن برچھیوں کی وجہ سے پھر مجبوراً ٹھہر جاتی ہیں) اور خود دیوتاؤں کی اولاد ان کو روک نہیں سکتی کیونکہ ان میں ہر آدمی کے سات ہاتھ ہیں اور ہر ایک کے پاس سات سات برچھیاں ہیں۔ خون ان کے جسم میں پگھلنے والے پارہ کی طرح ابل رہا ہے اور ان کی بیویاں تین گھنٹے میں ماں بنجاتی ہیں۔ دوسرے روز قتل کر ڈالی جاتی ہیں اور کھالی جاتی ہیں۔ (عورتوں پر ایک خوف طاری ہوجاتا ہے۔ فتاتا سپاہیوں کو نفرت سے دیکھکر بھیڑ میں اپنے لئے راستہ نکالنے لگتی ہے، اور برچھیوں کا خوف نہیں کرتی۔)

فتاتا :- تو اے معمولی مٹی کے بنے ہوئے دیوتاؤں کے بزدل لڑکو، بھاگ جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو

بلزنار :- نہیں جب تک تم ہمارے حکم کی تعمیل نہ کرو یہ نہیں ہوسکتا۔ ملکہ کلیوپیٹرا کو ہمارے پاس لاؤ۔ اور پھر جہاں تمھارا جی چاہے چلی جاؤ۔

فتاتا :- (ایک نفرت آمیز قہقہہ کے ساتھ) ہاں

اب مجھے معلوم ہوا کہ دیوتا کیوں اُسے لے گئے۔؟
(محافظ ایک دوسرے کو متعجب انداز سے دیکھنے لگتے ہیں۔) او بیوقوف سپاہی، تجھے جان لینا چاہیئے کہ ملکہ غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد ہی غائب ہو گئی ہے۔

بلزنار :- (غضبناک ہو کر) ڈائن۔ تونے اسی سیزر یا ٹالمی کے ہاتھ فروخت کر دینے کے لئے چھپا دیا ہے
(اس کی بائیں کلائی پکڑ لیتا ہے اور چند محافظوں کی مدد سے کھینچتے ہوئے صحن کے درمیان لاتا ہے جہاں وہ اُسے گھٹنوں کے بل گرا دیتے ہیں۔ وہ ایک خوفناک چاقو نکالتا ہے) وہ کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟
(وہ اس کی گردن جدا کر دینے کو ڈراتا ہے۔)

فتاتا :- کتے، مجھے ہاتھ لگایا تو یاد رکھ نیل میں سات برس تک سیلاب نہ آئے گا۔

بلزنار :- (خوفزدہ ہو کر عجمی سے) تمھارے باپ دادا کی زینیں نیل سے بہت فاصلہ پر ہیں۔ تم اس کو قتل کر دو۔

عجمی :- (چاقو نکال کر) ایران کا صرف ایک خدا ہے لیکن بوڑھی عورتوں کا خون اسے بہت مرغوب ہے! بول کلیوپیٹرا کہاں ہے؟

فتاتا :- اے عجمی، او سیریس دیوتا سے پوچھ جس کی مقدس بلیوں کو گود میں لینے کی وجہ سے ہمیشہ آفتیں نازل ہوئیں۔ میں نے ملکہ سے کہا تھا کہ جب رومی یہاں آئیں گے، تو وہ اپنے انتظار کی سرزنش میں یہاں تن تنہا چھوڑ دی جائیگی، چنانچہ اب وہ چلی گئی ——
بھاگ گئی — چھپ گئی۔ میں سچ کہتی ہوں، میں اسیریس کو گواہ ٹھہراتی ہوں۔

عورتیں :- (حاکمانہ طور پر اعتراض کرتے ہوئے) وہ سچ کہتی ہے۔ بلزنار!

بلزنار :- تم نے لڑکی کو ڈرا دیا ہے وہ چھپی ہوئی ہے تلاش کرو۔ جلد — محل میں۔ کونا کونا ڈھونڈ ڈالو۔
(سب محافظ بلزنار کی رہنمائی میں، محل کے اندر داخل ہوتے ہیں عورتیں صحن کے دروازہ سے باہر بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں)

فتاتا :- (چلا کر) اس قدر بے حرمتی۔ ملکہ کے محل میں اس طرح آدمیوں کی بھرمار!
(عجمی اس کی گردن پر چاقو رکھتا ہے وہ چپ ہو جاتی ہے)

بلافریس :- (فتاتا کے بائیں شانے پر ہاتھ رکھکر) اے عجمی ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جا (فتاتا سے) مادر مہربان اب تمھارے سب دیوتا سو گئے ہیں۔ یا شکار کھیلنے چلے گئے ہیں اور تلوار تمھاری گردن پر ہے۔ اس لئے جاؤ ملکہ کو ڈھونڈ کر ہمارے پاس لے آؤ تاکہ تمھاری جان بخشی کر دی جائے۔

فتاتا :- (نفرت انگیز لہجہ میں) اگر بڑے دیوتاؤں کا منشا نہیں ہے تو ایک بیوقوف کے ہاتھ میں تلوار کب رہ سکتی ہے؟ سنو او ناسمجھ جوانو۔ میری باتیں توجہ سے سنو۔ کلیوپیٹرا مجھسے خود ڈرتی ہے لیکن میری بہ نسبت وہ رومیوں سے زیادہ خائف ہے۔ صرف ایک ہی اگر زبردست طاقت اس کی آنکھوں میں ہے جو ابوالہول دیوتا کی وجہ سے

اُسے حاصل ہے۔ وہ دیوتا جو ریگستان میں بیٹھا رہتا ہے
اور سمندر جانے والے راستہ کی نگہبانی کرتا ہے۔ جو
کچھ کلیوپیٹرا اس سے پوچھنا چاہتی ہے، اسے مقدس
بلیوں کے کان میں کہہ دیتی ہے۔ اور سالگرہ کے روز
وہ ابوالہول دیوتا پر اپنے چڑھاوے چڑھاتی ہے۔
اس لئے تم لوگ اس ریگستان میں جاؤ اور کلیوپیٹرا کو
ابوالہول کے سایہ میں تلاش کرو۔ مگر یہ خیال رہے
کہ اس کی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔

بلافریس:- (عجمی سے) او ہوشیار مرد، کیا ہم اس پر
یقین کریں۔

عجمی:- رومی کس طرف سے آرہے ہیں؟

بلافریس:- سمندر سے، ریگستان کے راستہ سے، جو
ابوالہول دیوتا کے نزدیک سے گزرتا ہے۔

عجمی:- (فتاتا سے) او عیار تو نے یہ کہانی اس لئے
گھڑی ہے کہ ہم دونوں ریگستان جائیں اور رومیوں
کی برچھیوں کا نشانہ بنکر ختم ہوجائیں (چاقو اٹھاکر)
لے موت کا مزہ چکھ

فتاتا:- مگر لڑکے تیرے ہاتھوں سے نہیں۔

(وہ عجمی کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیکر محل کے اندر
بھاگ جاتی ہے اور اندھیرے میں غائب ہوجاتی
ہے۔ بلافریس عجمی کو قلابازی کھاتا دیکھکر ایک
خوفناک قہقہہ لگاتا ہے۔ سپاہی بلزنار کے ہمراہ
بہت سے قیدیوں کو لئے ہوئے محل سے باہر کی
طرف جاتے ہیں)

عجمی:- کیا کلیوپیٹرا مل گئی؟

بلزنار:- نہیں وہ بھاگ گئی۔ ہم نے کونا کونا چھان مارا
مگر وہ نہیں ملی۔

حبشی پہرہ دار:- (محل کے پھاٹک پر آکر) مصیبت۔
آفت۔ بھاگو۔ بھاگو۔

بلزنار:- کیا خبر ہے؟

پہرہ دار:- مقدس سفید بلی چرالی گئی!

سب مل کر:- افسوس! افسوس!

(ایک عام انتشار ــ سب غصہ سے چیختے ہوئے
بھاگتے ہیں۔ بھیڑ میں مشعل پھینکدی جاتی ہے
اور وہ گل ہوجاتی ہے ــ تاریکی ــ قیدیوں
کی آوازیں آنی بند ہوجاتی ہیں ــ کامل سکوت
ــ وقفہ ــ خاموشی اور تاریکی کا طلسم ٹوٹتا
ہے۔ روشنی اب زیادہ صاف ہوتی جاتی ہے
یہاں تک کہ مجسمہ ابوالہول کی بڑی بڑی آنکھیں
نظر آنے لگتی ہیں، جو سامنے غیر محدود فضا میں
نگرانی کر رہا ہے۔ اس کے پاؤں پر ایک لڑکی
بے حس و حرکت لیٹی ہوئی ہے۔ جس کے منتشر
بال اس طرح چمک رہے ہیں، جیسے چاندنی
میں کسی طائر کے پر و بال۔ ناگہاں بہت دور سے
ایک خوفناک آواز سنائی دیتی ہے۔ سکوت
ــ پھر چند بگلوں کی آوازیں آتی ہیں ــ
پھر سکوت ــ پھر ایک آدمی دبے پاؤں
جنوب کی طرف سے آتا ہے اور خیالات کی
کشمکش میں کھویا ہوا ابوالہول دیوتا کے
بائیں جانب کھڑا ہوجاتا ہے اور اس کا سینہ

ابوالہول کے بازو کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔)

اجنبی:۔ اے ابوالہول، جولیس سیزر کی طرف سے بندگی قبول ہو۔ میں اس کھوئے ہوئے مقام کی تلاش میں پھرتا رہا ہوں، جہاں سے مجھے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ مجھے ایسے لوگوں کی صحبت ضرور ملی جیسا میں خود ہوں، لیکن آج تک دوسرا سیزر نہیں ملا۔ مجھے کہیں کی ہوا میں وطنیت کی بو نہیں آتی۔ کوئی انسان مجھے اپنا رشتہ دار نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دن بھر میری طرح کام کر سکے، اور رات بھر خیالات کا ہجوم دماغ میں پیدا کرتا رہے۔ اس مختصر دنیا میں اے ابوالہول میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس ریگستان میں، فرق یہ ہے کہ میں ہمیشہ آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں اور تو ایک جگہ ساکت بیٹھا ہوا ہے۔ میں فتح کرتا رہتا ہوں اور تو قناعت سے کام لیتا ہے۔ میں کام کرتا اور متعجب ہوتا ہوں تو نگہبانی کرتا ہے اور انتظار کرتا ہے۔ میں اوپر دیکھتا ہوں اور آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ نیچے دیکھتا ہوں اور ان میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ایک کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ اس کے برعکس تیری آنکھیں کبھی نہیں تھکتیں ——— اس لئے اے ابوالہول، تو اور ہم ہر چند انسانی اقوام سے بیگانہ ہیں ——— لیکن ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہیں۔ کیا میرے دل میں، پیدائش کے وقت سے تیرے اور اس مقام کے متعلق خیالات پیدا نہیں ہوتے رہے ہیں؟ روم ایک پاگل کا خواب ہے، یہ میرا اعتقاد ہے تیری ان ستارہ نما چراغوں کو، میں نے بہت دور برطانیہ اندلس اور تھیسلی سے دیکھا ہے۔ تو نے اپنے بعض پرستاروں کو بعض بہت بڑے راز بتا دیئے ہیں اے میری زندگی کے غیر فانی حصہ کے مجسمے، اے خیالات سے معمور۔ اور اے اس ریگستان میں تنہا زندگی بسر کرنے والے ابوالہول! میں رات کی تاریکیوں میں پہاڑوں پر چڑھا ہوں، تاکہ بہت دور آندھیوں کے دبے پاؤں چلنے کی آوازیں سن سکوں، جو تیری ریت کو اپنے کھیل کود سے منتشر کرتی پھرتی ہیں ——— میرا اس راستہ پر آنا مقدر ہی تھا۔ کیونکہ میں وہی ہوں جس کی اعلیٰ ذہنیت کی تو ایک نشانی ہے۔ کیا اے ابوالہول، میں نے تیرے معمہ کو حل کر لیا ہے۔

لڑکی:۔ (جو بیدار ہو چکی ہے جھانک کر دیکھتی ہے کہ کون بول رہا ہے) بڈھے شریف آدمی؟

سیزر:۔ (گھبرا کر تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھ کر) غیر فانی دیوتا؟

لڑکی:۔ بڈھے شریف آدمی۔ مت بھاگو۔

سیزر:۔ (گھبرا کر) بڈھے آدمی مت بھاگو! یہ سب کچھ جولیس سیزر سے کہا جا رہا ہے

لڑکی:۔ بڈھے شریف آدمی!

سیزر:۔ اے ابوالہول تو بہت زیادہ ضعیف ہے اور میں تجھ سے کم عمر ہوں۔ مگر تیری آواز اب بھی ایک لڑکی کی سی ہے۔

لڑکی:۔ یہاں چڑھ کر آؤ۔ جلدی، ورنہ رومی آکر تم کو زندہ نگل لیں گے"

سیزر:- (آگے بڑھ کر لڑکی کو دیکھتے ہوئے) اوہ، ابوالہول کے سینہ پر ایک لڑکی - ایک آسمانی مخلوق!

لڑکی:- جلدی اوپر آؤ۔

سیزر:- (تعجب سے) تم کون ہو؟

لڑکی:- کلیوپیٹرا - مصر کی ملکہ!

سیزر:- یعنی یونانیوں کی حکمراں!

کلیوپیٹرا:- تمھیں میری توہین نہ کرنی چاہیئے - ورنہ ابوالہول تم کو رومیوں سے ہلاک کرا دیگا - اوپر آؤ یہ مقام بہت آرام دہ ہے۔

سیزر:- (آپ ہی آپ) کیسا خواب ہے؟ کسقدر پُرلطف خواب ہے - کاش میں اس خواب سے بیدار نہ ہوں"

(وہ ابوالہول کے نیزہ پر چڑھتا ہے اور پھر اس کا داہنا بازو پھاند کر لڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:- ہاں اب ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔ تمھارے لئے اس کا دوسرا پاؤں بھی بیٹھنے کے لئے خالی ہوسکتا ہے یہ بہت مضبوط ہے اور ہم کو بچا سکتا ہے - لیکن (کانپتے ہوئے تنہائی کی دہشت سے) وہ میرا کوئی خیال نہ کریگا - نہ مجھے اپنی صحبت میں رکھیگا - مجھے مسرت ہے کہ تم آگئے ہو۔ میں اپنی تنہائی سے بہت بے چین تھی - کیا تم نے کہیں کسی سفید بلی کو دیکھا ہے؟

سیزر:- (تعجب سے، داہنے پاؤں پر آہستہ بیٹھکر) کیا تمھاری کوئی بلی کھو گئی ہے؟

کلیوپیٹرا:- ہاں سفید مقدس بلی - کیا یہ خوفناک بات نہیں ہے؟ میں یہاں اسے ابوالہول کی قربانی کے لئے لائی تھی - لیکن جب ہم شہر سے کچھ دور نکل گئے تو ایک سیاہ بلی نے اُسے پکارا وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر اس کے پاس بھاگ گئی - کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ سیاہ بلی میری نانی کی نانی تھی"

سیزر:- (گھورتے ہوئے) تمھاری نانی کی نانی؟

ہاں کیوں نہیں؟ مجھے آج رات کوئی چیز متعجب نہیں کرسکتی۔

کلیوپیٹرا:- میں خیال کرتی ہوں کہ اس سے تم کو متعجب ہونا چاہیئے تھا - میری نانی کی نانی سفید مقدس بلی کا سیاہ بچہ تھی - اور نیل دیوتا نے اسے اپنی ساتویں بیوی بنایا تھا - اسی لئے میرے بال اس قدر لہردار ہیں اور میں ہمیشہ یہی چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں کرنا چاہوں مجھے کرلنے دیا جائے، خواہ اس میں دیوتاؤں کی مرضی شامل ہو یا نہیں - کیونکہ میرا خون نیل کے پانی سے بنایا گیا ہے۔

سیزر:- تم یہاں رات کی ایسی وحشتناک تاریکی میں کیا کررہی ہو؟ کیا تم یہاں رہا کرتی ہو؟

کلیوپیٹرا:- حقیقت میں تو ایسا نہیں ہے، میں ملکہ ہوں اور جاکر اپنے قصر میں رہونگی - مگر شرط یہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا خاتمہ کردوں کیونکہ اس نے مجھے وہاں سے بھگا دیا ہے اور جب میری عمر اور زیادہ ہوجائیگی تو جو کچھ میرا دل چاہیگا کرونگی - میں غلاموں کو زہر دیدونگی اور ان کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے ہوئے دیکھونگی، اور فتاتا سے کہوں گی کہ دیکھ اب تو آگ کی بھٹی میں

ڈال دی جائے گی۔

سیزر:- ہوں! اس وقت تک تم اپنے گھر جاکر بستر پر کیوں نہیں لیٹیں۔؟

کلیوپیٹرا:- اس لئے کہ رومی ہم سب کو نگلنے آرہے ہیں مگر تم بھی تو اپنے گھر میں نہیں ہو، اور نہ اپنے بستر پر؟

سیزر:- (مطمئن انداز سے) ہاں، میں تو ایک خیمے میں رہتا ہوں اور اس وقت اُسی کے اندر گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہوں اور خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیا تم یہ سوچتی ہو کہ مجھے تمھاری اصلیت پر یقین ہے؟"

کلیوپیٹرا:- (اس کی طرف بڑھتے ہوئے) تم ایک ظریف بڈھے آدمی ہو۔ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔

سیزر:- اوہ۔ تمھارا یہی کہنا تو میرے خواب کو، خواب پریشاں بنا دیتا ہے۔ تم یہ خواب کیوں نہیں دیکھتیں کہ میں جوان ہوں؟

کلیوپیٹرا:- میں چاہتی ہوں کاش تم جوان ہوتے! میں یہ سوچتی ہوں کہ مجھے تم سے اور زیادہ ڈرنا چاہئے۔ میں آدمیوں کو ضرور پسند کرتی ہوں۔ مگر صرف جوان آدمیوں کو جنکے شانے طاقتور اور گول ہوں، بازو خوبصورت ہوں۔ تم بڈھے آدمی ہو اور کسی حد تک کمزور۔ لیکن تمھاری آواز بہت دلکش ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی شخص مجھ سے باتیں کرتا رہے۔ گو میرا خیال ہے کہ تم کسی قدر دیوانے بھی ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ چاند ہے جو تم کو ایسی دیوانی باتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے

سیزر:- کیا تم نے سنا تھا ــــــــ جب میں ابوالہول دیوتا کی عبادت اور تعریف کر رہا تھا

کلیوپیٹرا:- لیکن یہ بڑا ابوالہول نہیں ہے۔

سیزر:- (مجسمے کی طرف دل شکستہ انداز سے دیکھکر) کیا؟

کلیوپیٹرا:- یہ تو ابوالہول کی ایک بلی کا چھوٹا بچہ ہے۔ کیوں؟ ــ بڑا ابوالہول تو اتنا بڑا ہے کہ اس کے پنجوں کے بیچ میں ایک بڑا مندر تعمیر کیا گیا ہے، یہ میرا عزیز ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمھاری دانست میں رومیوں کے پاس ایسے جادوگر ہیں جو ہم کو اپنے جادو کے ذریعہ ابوالہول سے الگ کر سکیں؟

سیزر:- کیوں؟ کیا تم رومیوں سے ڈرتی ہو؟

کلیوپیٹرا:- (بہت سنجیدگی سے) اوہ۔ وہ اگر ہم کو پا جائیں تو زندہ نگل جائیں۔ وہ ظالم ہوتے ہیں ان کا سردار جولیس سیزر کہلاتا ہے۔ اس کا باپ ایک شیر تھا اور اس کی ماں ایک آتشی پہاڑ، اس کی ناک ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی ہے۔

(سیزر غیرارادی طور پر اپنی ناک ٹٹولنے لگتا ہے)

اور وہ کیا، سب رومیوں کی ناکیں لمبی ہوتی ہیں۔ اُن کی دُمیں چھوٹی ہوتی ہیں اور ہر ایک کے سات ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور ہر ہاتھ میں سو سو تیر ہوتے ہیں۔ اور وہ انسان کے گوشت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

سیزر:- اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تمھیں ایک اصل رومی کو دکھاؤں!

کلیوپیٹرا:- (مبہوت ہوکر) نہیں۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو!

سیزر:- کوئی ہرج نہیں۔ یہ صرف ایک خواب ہے۔

کلیوپیٹرا:- (گھبراتے ہوئے) یہ خواب نہیں ہے۔

یہ خواب نہیں ہے - دیکھو - دیکھو -

(وہ اپنے بالوں سے ایک آلپین نکال کر سیزر کے بازو میں چبھو دیتی ہے)

سیزر:- ہا ہا ہا - ٹھہرو (غصہ سے) تم نے یہ کیا حرکت کی ؟

کلیوپیٹرا:- (شرمندہ ہو کر) تم نے کہا تم خواب دیکھ رہے ہو میں تم کو یہی بتانا چاہتی تھی کہ ——

سیزر:- (نرمی سے) ادھر آؤ - ادھر، روتی کیوں ہو ؟ ایک ملکہ کو رونا نہ چاہئیے (وہ اس حقیقت کے نکشتات پر اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگتا ہے) کیا واقعی میں بیدار ہوں ؟ (وہ اس حقیقت پر یقین کرنے کے لئے اپنا ہاتھ ابو الہول پر پٹکتا ہے) نہیں - ناممکن - دیوانگی - پاگل پن - (رنجیدہ ہو کر) خیمے کو واپس —— خیمے کو -

(وہ پتھر کے تخت سے نیچے کود پڑنے کو اٹھتا ہے)

کلیوپیٹرا:- (خوفزدہ ہو کر اس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے) نہیں - تمھیں اکیلا چھوڑ کر نہ جانا چاہیئے نہیں نہیں مت جاؤ - میں ڈرتی ہوں میں رومیوں سے بہت ڈرتی ہوں -

سیزر:- (یہ یقین کرنے کے لئے وہ حقیقت میں بیدار رہے) کلیوپیٹرا کیا تمھیں میرا چہرہ صاف نظر آتا ہے ؟

کلیوپیٹرا:- ہاں چاندنی میں وہ اور سفید نظر آتا ہے -

سیزر:- کیا تمھیں یقین ہے کہ چاندنی نے میرے چہرہ کو کو اہل مصر کے چہرہ سے زیادہ گورا بنا دیا ہے (اضطرا کے ساتھ) کیا تم یہ بھی دیکھتی ہو کہ میری ناک کچھ لمبی ہے -

کلیوپیٹرا:- (ایک خوفناک شبہ سے متاثر ہو کر) اوہ!

سیزر:- یہ ایک رومی ناک ہے - کلیوپیٹرا -

کلیوپیٹرا:- آہ (ایک دلخراش چیخ کے ساتھ وہ اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے - ابو الہول کے بائیں بازو کی طرف جھپٹتی ہے - ریتیلی زمین پر کود پڑتی ہے - اور اپنے دونوں گھٹنوں پر جھک کر دردناک لہجے میں کہتی ہے) ابو الہول، اُس کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دے اس کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دے - میرے کہنے کا مقصد سفید بلی سے ہے میرا مقصد اسی سے ہے - میں (سیزر پتھر کے چبوترے پر سے کود پڑتا ہے اور کلیوپیٹرا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے) آہ (وہ اپنا منھ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے)

سیزر:- کلیوپیٹرا - اگر کہو تو تمھیں ایک ایسی تدبیر بتاؤں جس سے تم سیزر کے مظالم سے محفوظ رہو -

کلیوپیٹرا:- (اس سے لپٹ کر ملتجی انداز سے) ہاں ہاں بتاؤ - ضرور بتاؤ - میں فتاتا کے زیور چرا کر تم کو دیدونگی - میں دریائے نیل سے کہدونگی کہ وہ تمھارے کھیتوں کو سال میں دوبارہ شاداب کر دیا کرے -

سیزر:- خاموش رہ - اے لڑکی - تیرے دیوتا بھی رومیوں سے ڈرتے ہیں - تم نے دیکھ لیا کہ تیرے ابو الہول نے میرا کچھ نہیں بگاڑا - اور وہ مجھے تم کو سیزر کے پاس لیجانے سے منع نہ کر سکا -

کلیوپیٹرا :- (رحم طلب کرتی ہوئی دھیمی آواز میں) تم نہ لیجاؤ گے ؟ تم نے ابھی کہا کہ مجھے نہ لیجاؤ گے -

سیزر :- سیزر عورتوں کو نہیں نگلتا -

کلیوپیٹرا :- (امید افزا انداز سے خوش ہوکر) کیا !

سیزر :- (موثر انداز سے) لیکن وہ لڑکیوں کو نگل لیتا ہے (وہ غمزدہ ہوجاتی ہے) اور تم بلیوں کی ایک چھوٹی بیوقوف لڑکی ہو، تم کالی بلی کی نسل سے ہو - تم بلی بھی ہو اور لڑکی بھی -

کلیوپیٹرا :- (کانپتے ہوئے) تو کیا وہ مجھے نگل جائیگا -

سیزر :- ہاں ! جب تک تم اُسے یہ یقین نہ دلا دو کہ تم ایک عورت ہو -

کلیوپیٹرا :- اوہ - تو تم میرے لئے کوئی جادوگر بلاؤ تاکہ وہ مجھے عورت بنا دے - کیا تم جادوگر ہو ؟

سیزر :- شاید ! لیکن اس میں بہت وقت صرف ہوگا - اور آج ہی رات کو تمھیں اپنے محل میں سیزر کے سامنے کھڑا ہونا ہے -

کلیوپیٹرا :- نہیں - نہیں مجھ سے نہیں ہو سکتا -

سیزر :- تمھارے دل میں خواہ کیسی ہی دہشت کیوں نہ پیدا ہو - اور سیزر کتنا ہی خوفناک کیوں نہ نظر آئے ——— تمھیں ایک بہادر عورت اور ایک عالی شان ملکہ کی طرح اسے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنا چاہئے اور تم کو اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہونا چاہئے - اگر تمھارا ہاتھ کانپا ——— اور تمھاری آواز بھرائی ——— تو - رات ہی اور موت (وہ رنجیدہ ہوجاتی ہے) لیکن اگر وہ تمھیں حکومت کرنے کے قابل سمجھیگا تو اپنے پاس تخت پر بٹھا لیگا - اور مصر کا سچا فرمانروا بنا دیگا -

کلیوپیٹرا :- (ناامیدی سے) نہیں وہ میری اصلیت کو جان لیگا - وہ مجھے پہچان لیگا -

سیزر :- (غمگین انداز سے) وہ عورتوں سے بہت جلد دھوکہ کھا جاتا ہے - عورتوں کی آنکھیں اس کی نظروں کو خیرہ کر دیتی ہیں - وہ انھیں اس حالت میں نہیں دیکھتا جس میں وہ دراصل ہوتی ہیں - بلکہ اس حالت میں دیکھتا ہے، جس میں وہ خود انھیں دیکھنا چاہتا ہے -

کلیوپیٹرا :- (امید افزا انداز سے) تو ہم اُسے دھوکہ دینگے میں فتاتا کے سر کا دوپٹہ اوڑھ لونگی اور وہ مجھے بالکل بڈھی عورت سمجھنے لگا -

سیزر :- اگر تم ایسا کروگی تو وہ تمھیں فوراً نگل لیگا -

کلیوپیٹرا :- لیکن میں اُسے جادو کی ایک ایسی روٹی دونگی جس میں سفید بلی کے سات بال بھی گوندے گئے ہیں اور -

سیزر :- (قطع کلام کرتے ہوئے) اوہو - تم بڑی بیوقوف لڑکی ہو - وہ تمھیں اور تمھاری روٹی دونوں کو کھا جائیگا

(وہ تنفر انداز سے اس کی طرف سے رُخ پھیر لیتا ہے)

کلیوپیٹرا :- (دوڑ کر اس کے ہاتھوں سے چمٹتے ہوئے) آہ مہربانی کرو - تم جو کہوگے میں وہی کرونگی - میں بالکل چپ چاپ رہونگی - میں تمھاری لونڈی بنجاؤنگی ———

(پھر ایک بار صحرا کی سنسان فضاؤں میں بگل کی خوفناک آواز بلند ہوتی ہے)

سیزر :- سنو - سنو -

کلیوپیٹرا :- (کانپتے ہوئے) یہ کیا تھا ؟

سیزر :- سیزر کی آواز !

کلیوپیٹرا :- (اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) چلو بھاگ چلیں
— [illegible] —

سیزر :- جب تک تم سیزر کے استقبال کے لئے اپنے تخت پر ہیں بیٹھتیں - اس وقت تک میرے ساتھ محفوظ ہو۔ چلو مجھے اس طرف لے چلو۔

کلیوپیٹرا :- (مسرور ہو کر) ہاں - چلو میں ضرور لے چلونگی (بِگل کی آواز آتی ہے) اُف، دیکھو دیوتا غضبناک ہو رہے ہیں، کیا تم نہیں محسوس کرتے کہ زمین لرز رہی ہے۔

سیزر :- یہ سیزر کی فوج کی رفتار ہے۔

کلیوپیٹرا :- (اُسے کھینچتے ہوئے) اس طرف چلو ہمیں چاہئے کہ چلتے چلتے سفید بلی کو بھی تلاش کرتے چلیں - اسی نے تو تم کو رومی بنا دیا ہے۔

(سیزر اس کے ساتھ جاتا ہے - اور وہ جس قدر آگے ریگستان میں بڑھتے جاتے ہیں - بگل کی آواز اور زیادہ صاف سنائی دیتی ہے چاندنی پھیکی پڑ جاتی ہے اُفق پر سیاہی نمودار ہوتی ہے - آسمان تاریکی کے پردہ میں روپوش ہو جاتا ہے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا - دفعتہً ایک مشعل کی روشنی، بہت دور سے ان مصری ستونوں پر پڑتی ہے - جو ایک شاندار غلام گردش کو سنبھالے ہوئے ہیں - اس غلام گردش کے دوسرے کنارے پر ایک حبشی غلام مشعل لئے ہوئے نظر آتا ہے - سیزر کلیوپیٹرا کے کہنے کے مطابق خاموشی سے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ غلام گردش سے نیچے اترتے ہیں - سیزر یہاں کے فن تعمیر کو غائر نگاہوں سے دیکھتا جاتا ہے - ستون کے نقوش کو دیکھتا ہوا آگے چلکر دیوار ایک گوشہ کی طرف مڑ جاتی ہے اور ایک اونچا برآمدہ نظر آتا ہے - سیزر اپنے داہنی جانب تختِ شاہی دیکھتا ہے اور اس تخت کے پیچھے ایک دروازہ نظر آتا ہے - تخت کی ہر دو جانب ایک سیدھا ستون ہے جس پر ایک شمع رکھی ہے)

سیزر :- یہ کون سا مقام ہے ؟

کلیوپیٹرا :- یہ وہ جگہ ہے جہاں میں تخت شاہی پر بیٹھتی ہوں - جب میں شاہی لباس پہن کر تاج سر پر رکھتی ہوں

(غلام تخت کو دکھانے کے لئے مشعل بلند کرتا ہے)

سیزر :- غلام کو حکم دو کہ وہ شمع روشن کر دے۔

کلیوپیٹرا :- (شرمندگی سے) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں حکم دے سکتی ہوں ؟

سیزر :- کیوں نہیں ! تم ملکہ ہو (وہ ہچکچاتی ہے) کہو

کلیوپیٹرا :- (ڈرتے ہوئے غلام سے) شمعیں روشن کرو۔

فتاتا :- (تخت کے پیچھے سے یکایک باہر نکل کر) ٹھہر جاؤ

(غلام ٹھہر جاتا ہے وہ غضبناک انداز سے کلیوپیٹرا سے مخاطب ہوتی ہے جو شیر کے بچے کی طرح دبک جاتی ہے) یہ تیرے ساتھ کون ہے ؟ اور تو نے بلا میری اجازت کے شمعیں روشن کرنے کی جرأت کیونکر کی ؟ -

(کلیوپیٹرا خوف سے چپ رہتی ہے)

سیزر :- یہ کون ہے ؟

کلیوپیٹرا :- فتاتا۔

فتاتا :- (نخوت سے) ملکہ کی خاص انا، دایہ !

سیزر :- (قطع کلام کر کے) تمھارے غلام اور ملازم

تم سے اسی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اسے باہر نکال دو (غلام سے)
اور کیا تو ملکہ کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہا ہے؟ (غلام شمعیں روشن
کرتا ہے۔ کلیوپیٹرا فتاتا کے خوف سے سہمی ہوئی کھڑی ہے) تم
ملکہ ہو۔ اسے باہر نکال دو۔

کلیوپیٹرا:۔ (نرمی سے) پیاری فتاتا تمھیں ایک لمحہ کیلئے
باہر چلا جانا چاہیئے۔

سیزر:۔ تم اسے باہر جانے کا حکم نہیں دے رہی ہو
بلکہ اس سے درخواست کر رہی ہو۔ تم ملکہ نہیں ہو۔ تم
نگل لی جاؤ گی۔ لو میں جاتا ہوں خدا حافظ۔
(وہ جانے لگتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (پکڑتے ہوئے) نہیں۔ نہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ
کے نہ جاؤ"

سیزر:۔ ایک رومی ایسی ملکہ کے پاس نہیں ہوتا
جو اپنے خادموں سے ڈرتی ہو۔

کلیوپیٹرا:۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔ مجھے ذرا بھی خوف نہیں
معلوم ہوتا"

فتاتا:۔ اچھا تو مجھے دیکھنا ہے یہاں کون ڈرتا ہے۔
کلیوپیٹرا!

سیزر:۔ او عورت اپنا سر جھکا کر باتیں کر کیا میں بھی
کوئی بچہ ہوں جو مجھے دھمکاتی ہے (وہ کلیوپیٹرا کے پاؤں کے
پاس زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فتاتا کسی قدر مبہوت انداز
میں کھڑی رہتی ہے سیزر حبشی غلام کو پکارتا ہے۔ غلام حاضر
ہوتا ہے) کیا تو ایک سر کاٹ سکتا ہے؟

(حبشی غلام نفی میں سر ہلاتا ہے اور اس کے دانت
باہر نکل آتے ہیں۔ سیزر میان سے تلوار کھینچ لیتا
ہے اور تلوار غلام کو دینے کے لئے بڑھتا ہے۔ پھر فتاتا
کو مخاطب کرتے ہوئے) کیا تو اپنی ہستی بھول گئی۔
(فتاتا کلیوپیٹرا کے سامنے سر تعظیم خم کر دیتی ہے)

فتاتا:۔ اے عالی شان ملکہ، اپنی عظمت و حکمرانی کے زمانہ
میں اپنی قدیم اناکو نہ بھول جانا۔

کلیوپیٹرا:۔ (تعجب سے دیکھتے ہوئے) جاؤ۔ چلی جاؤ۔ جاؤ
یہاں سے۔ (فتاتا اٹھتی ہے اور دروازے سے نکل کر دہیں
چلی جاتی ہے۔ کلیوپیٹرا اس کی تعظیم کو بے چینی سے دیکھتی ہے اور اپنے
کانپتے ہوئے ہاتھوں کو ملنے لگتی ہے۔ پھر یکایک چیخ کر کہتے ہوئے) لاؤ
مجھے کوئی چیز دو۔ میں اسے مار کر بھگاؤں۔
(وہ تخت سے ایک سانپ کی کھال اٹھا لیتی ہے۔
اور فتاتا کے پیچھے دوڑتی ہے اور سانپ کی کھال
کو گھماتی رہتی ہے۔ سیزر دوڑتا ہے اور اسے
پکڑ لیتا ہے فتاتا بھاگ جاتی ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (خود کو چھڑاتے ہوئے) میں کسی کو اسوقت
ضرور ماروں گی۔ میں اس غلام کو ماروں گی۔ (وہ غلام کو مارتی
ہے۔ غلام جان بچانے کو ادھر ادھر بھاگتا ہے آخر غلام گردش
میں بھاگ کر جان بچاتا ہے۔ کلیوپیٹرا سانپ کی کھال پھینک
دیتی ہے اور تخت کی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھ ہلاتی اور چلاتی ہوئی
چڑھنے لگتی ہے) آخر کار میں ایک سچی ملکہ۔ یعنی کلیوپیٹرا ہوں
(سیزر اپنا سر ہلاتا ہے وہ سیزر کو تعریف کی نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے
پھر وہ سیڑھیوں سے نیچے کود پڑتی ہے۔ اس کی طرف دوڑتی
ہے اور اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ایک ادائے محبت
و مسرت سے ڈال دیتی ہے۔ اور پھر جوش و مسرت سے کہتی
ہے) آہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم نے مجھے

ملکہ بنا دیا -

سیزر :- لیکن شہزادیاں تو صرف بادشاہوں سے محبت کرتی ہیں -

کلیوپیٹرا :- لیکن میں اب ان سب آدمیوں کو جنھیں میں چاہتی ہوں، بادشاہ بنا سکتی ہوں میں تمھیں بھی بادشاہ بنادونگی - میں اور بہت سے نوجوانوں کو بادشاہ بناؤنگی جن کے بازو خوبصورت اور طاقتور ہوں گے - اور جب میں ان سے بیزار ہو جاؤنگی تو انھیں تازیانے مار مار کر ہلاک کر دونگی - لیکن تم ہمیشہ بادشاہ بنے رہوگے میرے اچھے، مہربان، عقلمند بڈھے بادشاہ، (مضطر اندازسے) کیا تم سیزر سے یہ نہ کہوگے - کہ میں ملکہ ہوں؟ ایک سچی ملکہ ہوں، سنو ہم دونوں یہاں سے بھاگ چلیں اور جب تک سیزر یہاں سے چلا نہ جائے کہیں چھپے رہیں -

سیزر :- اگر تم سیزر سے ڈرتی ہو - تو سچی ملکہ نہیں ہو اور اگر تم کسی حرم کے پیچھے چھپ جاؤگی تو بھی وہ سیدھا وہیں جاکر تم کو ڈھونڈے گا - اور حرم کو ایک ہاتھ سے اٹھا لیگا -

(وہ اپنے دانت پیستا ہے)

کلیوپیٹرا :- (کانپتے ہوے) اوہ !

سیزر :- اگر تم ڈرتی ہو تو ڈرو - (بگل کی آواز سنائی دیتی ہے - وہ خوف سے چلا اٹھتی ہے - سیزر طعن آمیز لہجہ میں اظہار مسرت کرتے ہوئے) آہاہا - سیزر کلیوپیٹرا کے تخت کے پاس آرہا ہے - آؤ اپنی جگہ پر بیٹھو - (وہ کلیوپیٹرا کا ہاتھ پکڑکر تخت کی طرف لیجاتا ہے کلیوپیٹرا اس قدر غمگین ہوکر کچھ نہیں بولتی) ہوں - طیطا توتا - تم اپنی خادمہ کو کس طرح پکارتی ہو ؟

کلیوپیٹرا :- (بیدلی سے تخت پر بیٹھکر کانپتے ہوئے تالی بجاؤ -

(وہ تالی بجاتا ہے فتاتا واپس آتی ہے)

سیزر :- ملکہ کا لباس اور تاج لاؤ خادماؤں کو بلاؤ اور ملکہ کو سنوارو -

کلیوپیٹرا :- (مسرور ہوکر) ہاں تاج فتاتا میں تاج سر پر رکھونگی -

فتاتا :- ملکہ یہ سب کس کے لئے پہنے گی -

سیزر :- ایک رومی کے لئے - ایک بادشاہوں کے بادشاہ کے لئے طوطا تیتا - !

کلیوپیٹرا :- (فتاتا کو مارتے ہوئے) تجھے سوال کرنے کی جرات کیونکر ہوئی ؟ جا اور جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کر - (فتاتا دانت پیستی ہوئی جاتی ہے - کلیوپیٹرا آرزومند انداز سے سیزر کے پاس جاتی ہے) تو جب سیزر میرا لباس اور تاج دیکھیگا تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ میں ملکہ ہوں! کیوں ؟

سیزر :- نہیں اُسے کس طرح معلوم ہوگا کہ تم ایک ملکہ کے لباس میں کنیز نہیں ہو؟

کلیوپیٹرا :- تمھیں کہدینا چاہئے -

سیزر :- وہ مجھ سے نہ دریافت کریگا - وہ خود کلیوپیٹرا کو اس کی عظمت و شان اور نخوتِ حسن سے پہچان لے گا - کیا تم کانپ رہی ہو؟

کلیوپیٹرا :- (خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے) نہیں میں

میں ——— (نہایت دھیمی آواز میں) نہیں۔

(فتاتا اور تین عورتیں لباس وغیرہ لیکر آتی ہیں)

فتاتا:۔ ملکہ کی سب خادمائیں بھاگ گئیں۔ صرف یہی تین باقی رہ گئی ہیں۔

(وہ کلیوپیٹرا کو لباس پہنانے لگتی ہیں)

سیزر:۔ خیر۔ تین ہی کافی ہیں۔ غریب سیزر کو تو اپنا لباس خود ہی پہننا پڑتا ہے۔

فتاتا:۔ (حقارت سے) مصر کی ملکہ ایک ظالم رومی نہیں ہے۔ (کلیوپیٹرا سے) میری بچی دلیر بنی رہو۔ اور اپنا سر اس اجنبی کے سامنے بلند رکھو۔

سیزر:۔ (کلیوپیٹرا کی تعریف کرکے تاج اس کے سر پر رکھتے ہوئے) ایک ملکہ ہونا مسرت آفریں ہے یا تکلیف دہ۔ کلیوپیٹرا؟

کلیوپیٹرا:۔ تکلیف دہ!

سیزر:۔ خوف و دہشت کو دل سے دور کردو تو تم سیزر کو مفتوح کرلوگی، فتاتا کیا رومی قریب آگئے؟

فتاتا:۔ ہاں وہ بالکل قریب آگئے ہیں۔ اور پہرہ دار بھاگ گیا ہے۔

(حبشی غلام بھاگتا ہوا آتا ہے)

غلام:۔ رومی احاطہ کے اندر آگئے ہیں۔

(ایک دروازہ سے نکل کر بھاگتا ہے۔ ایک چیخ کے ساتھ تینوں عورتیں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ فتاتا کے چہرہ سے خوف کا اظہار ہونے لگتا ہے کلیوپیٹرا ان کے پیچھے بھاگنے سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتی۔ سیزر اُس کی کلائی پکڑ لیتا ہے اور اُس کو گھورتا ہے۔ وہ ایک بچہ کی طرح چپ کھڑی ہوجاتی ہے)

سیزر:۔ ملکہ کو تنِ تنہا سیزر کا مقابلہ کرنا چاہئے جواب دو۔ "ایسا ہی ہوگا"

کلیوپیٹرا:۔ (خوف سے سفید ہوکر) ایسا ہی ہوگا۔

سیزر:۔ (اس کو چھوڑتے ہوئے) بہت خوب۔

(فوج کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ بگل کی آواز بالکل قریب آجاتی ہے۔ کلیوپیٹرا بہت خوفزدہ ہوجاتی ہے، وہ چیخ مارکر دروازہ کی طرف دوڑتی ہے فتاتا اُسے دوڑکر پکڑ لیتی ہے)

فتاتا:۔ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ "ایسا ہی ہوگا" اور اگر تم اس کے لئے مر بھی جاؤ تو تمھیں ایک ملکہ کے الفاظ کو سچا ثابت کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔

(وہ کلیوپیٹرا کو سیزر کے سپرد کردیتی ہے جو اُسے تخت کی طرف واپس لے جاتا ہے کلیوپیٹرا دہشت کے مارے اپنے آپ میں نہیں رہتی)

سیزر:۔ اب اگر تم ہمت ہاردوگی ———

(وہ خود بھی اُس کے قریب تخت پر بیٹھ جاتا ہے وہ موت کا انتظار کرتی ہوئی خود فراموشی کے عالم میں سیڑھی پر کھڑی رہتی ہے۔ رومی سپاہی غلام گردش سے نکل کر شور و غل کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں جنکے ساتھ ان کا نقیب جھنڈا لئے ہوئے ہے اور بگلچی بھی ساتھ ہے جب وہ محل میں داخل ہوتے ہیں تو تعجب سے تخت کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ایک صف میں ترتیب دے لیتے ہیں۔ اپنی تلواریں

میانوں سے کھینچ لیتے ہیں۔ اور "سیزر زندہ باد"
کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کلیوپیٹرا رخ پھیر کر مبہوت
نگاہوں سے سیزر کو دیکھتی ہے اور پھر اس منظر کو
دیکھ کر خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے سیزر کی آغوش
میں گر پڑتی ہے۔)

ایکٹ دوسرا

اسکندریہ :-

محل کی پہلی منزل کا ایک دالان، جو ایک ایسے گوشے
میں ختم ہوتا ہے جہاں دو سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس
گوشے سے بحر قلزم نظر آتا ہے جس کی سطح صبح کی
شعاعوں میں جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ دلکش
مناظر، فرش اور ساز و سامان نے اس جگہ کو
فرحت بخش، خوبصورت، سادہ اور ٹھنڈا
بنا رکھا ہے۔

کمسن بادشاہ ٹالمی سیڑھیوں کے سرے پر
دالان میں جانے کے لئے کھڑا ہے اور اس کا سرپرست
پوتھینس بھی اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔
دربار اس کے استقبال کے لئے آراستہ ہے
ایک جماعت میں، جو ٹالمی کی دائیں جانب ہے،
سب سے بڑی شخصیت ٹالمی کے اتالیق تھیوڈوٹس
کی ہے۔ دوسرا گروہ جو ٹالمی کی بائیں جانب ہے
اس میں ٹالمی کی فوج کا سپہ سالار اچیلس سب
کا سردار ہے۔ تھیوڈوٹس ایک پستہ قد ضعیف
آدمی ہے جس کے خد و خال اتنے ہی مکروہ ہیں جتنے
اس کے اعضا اور اس کا قد۔ اس کی ناک اونچی
اور پیشانی سیدھی ہے، جو اس کے چہرہ میں
سب سے زیادہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اسکی
نگاہوں میں عقاب کی سی تیزی ہے اور دوسروں
کی باتیں ایک فلسفی کی سی خبرداری سے سنتا ہے
اچیلس ایک پینتیس سالہ آدمی ہے جس کی سیاہ
گھنی داڑھی میں پیچ پڑے ہوئے ہیں بظاہر
وہ چالاک آدمی نہیں معلوم ہوتا البتہ ایک بارعب
اور ممتاز شخصیت کا ضرور مالک ہے۔

پوتھینس خواجہ سرا، ایک طاقتور آدمی ہے
مگر جدت پسند اور حاضر جواب۔ اس کی عمر
پچاس برس کی ہے۔ لیکن اس کا دماغ بہت
معمولی ہے۔ اس کی فطرت میں غصہ بےحد ہے۔ اور
وہ اپنے غصہ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کے
بال سمور کی مانند خوبصورت ہیں۔

ٹالمی بادشاہ، اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ سنجیدہ
اور معمر نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں اب بھی لڑکپن
موجود ہے وہ دوسروں کی رہنمائی پر چلنے کا عادی
ہے۔ سب لوگ بادشاہ کا نہایت احترام سے
استقبال کرتے ہیں۔ وہ اتر کر نیچے آتا ہے اور
ایک کرسی کے قریب جو اس کے دائیں جانب
ہے آکر کھڑا ہو جاتا ہے وہ اس پر بیٹھے ہوئے
آئندہ ہدایات کے لئے نہایت بےچینی سے
اپنے سرپرست پوتھینس کی طرف دیکھتا ہے
جو خود بائیں طرف بیٹھ جاتا ہے۔

پوتھینس :- بادشاہ مصر کچھ کہنا چاہتا ہے - !

تھیوڈوٹس :- (موثر انداز سے) بادشاہ کا فرمان سننے کے لئے خاموش رہو۔

ٹالمی :- (ایک رٹے ہوئے سبق کو دہرانے لگتا ہے) تم سب کو غور سے سننا چاہیئے۔ میں تمھاری بانسری بجانے والے بادشاہ آلی ٹیس کا سب سے پہلا بیٹا ہوں میری بہن بیرنیس، اسے تخت سے ہٹاکر خود حکومت کرنے لگی۔ لیکن، لیکن، (وہ رک جاتا ہے)

پوتھینس :- (چپکے سے لقمہ دیتے ہوئے) دیوتاؤں کو اس کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

ٹالمی :- ہاں - دیوتاؤں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا ــــ نقصان نہ پہنچے گا (وہ چپ ہوجاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے معنی انداز سے) میں بھول رہا ہوں کہ دیوتاؤں کو کیا نقصان نہ پہنچے گا۔

تھیوڈوٹس :- بہتر ہے کہ بادشاہ کا سرپرست پوتھینس بادشاہ کے خیالات کا اظہار کرے۔

پوتھینس :- (اپنی بے چینی کو مشکل سے ضبط کرتے ہوئے) بادشاہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوتا ہرگز اس امر کو برداشت نہ کریں گے کہ اس کی شریر بہن، بلا سزا پائے چلی جائے

ٹالمی :- (جلدی سے) ہاں اب مجھے یاد آگیا۔ (وہ پھر کہنے لگتا ہے) اس لئے دیوتاؤں نے ایک اجنبی شخص مارک انطونی، رومی سواروں کے ایک سردار کو اس ریگستان میں بھیجا اور اس نے میرے باپ کو پھر تخت واپس ولادیا۔ اور میرے والد نے میری بہن بیرنیس کا سر قلم کردیا۔ اور اب گو میرے والد کا انتقال ہوچکا ہے۔ تاہم میری ایک دوسری بہن کلیوپیٹرا، مجھسے تخت و ملک چھینکر خود میری جگہ حکومت کرنا چاہتی ہے لیکن دیوتا اس کو برداشت نہ کریں گے۔ (پوتھینس نصیحتاً زور سے کھانستا ہے) دیوتا۔ دیوتا برداشت نہ کریں گے۔

پوتھینس :- (لقمہ دیتے ہوئے) برقرار نہ رکھیں گے۔

ٹالمی :- ہاں ٹھیک! وہ ایسی زبردستی کو برقرار نہ رکھیں گے۔ اور وہ اس کا سر بھی، اس کی بہن کی طرح قلم کردیں گے، لیکن اُس نے جرنیل فتاتا کی مدد سے جولیس سیزر پر اپنا جادو چلادیا ہے۔ تاکہ وہ اس کو حکومت کرنے میں اس کے غلط اور بے بنیاد دعوؤں کو سچ ثابت کردکھائے۔ تو اب تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں یہ برداشت نہ کرونگا ــــ میں یہ برداشت نہ کروں گا۔ (پوتھینس سے مستفسرانہ) ہاں میں کیا برداشت نہ کرونگا؟

پوتھینس :- (یکایک نہایت زور اور سیاسی جوش کے ساتھ) بادشاہ ہرگز یہ برداشت نہ کرے گا کہ ایک غیر ملکی، اس سے، اس کا تخت چھین لے۔ (نعرۂ تحسین)

اکیلس! بادشاہ کی خدمت میں عرض کرو کہ رومی کے ساتھ کتنے سوار اور سپاہی ہیں؟

تھیوڈوٹس :- بہتر ہوگا کہ شاہی افواج کا سپہ سالار اس کا اظہار کرے۔

اکیلس :- جہاں پناہ! صرف تین ہزار سپاہی اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار سوار۔

(درباری ایک نفرت آگیں قہقہہ لگاتے ہیں اور

زور زور سے باتیں ہونے لگتی ہیں۔ اس اثناء
میں ایک رومی سردار (روفیو) دالان میں وارد
ہوتا ہے۔ وہ ایک اوسط عمر کا بارعب آدمی ہے
جس کے چہرہ پر سیاہ گھنی لمبی داڑھی ہے۔
یہ شخص بہت ترش مزاج ہے۔ اس کی آنکھیں
تیز اور چھوٹی ہیں۔ ناک بہت اونچی اور گال
چھوٹے ہوئے ہیں)

روفیو:۔ (سپاہی سے) خاموش (قہقہے اور سرگوشیاں
یک لخت بند ہو جاتی ہیں) سیزر آرہا ہے۔

تھیوڈوٹس:۔ (ہوش و حواس بجا رکھتے ہوئے) بادشاہ
رومی حاکم کو آنے کی اجازت دیتا ہے۔

(سیزر سادہ لباس میں دالان سے نکلتا ہے اسکے
ساتھ اس کا برطانوی معتمد برٹینس بھی ہے، جس کی
عمر تقریباً چالیس برس کی ہے۔ اس کا قد اونچا۔
مزاج سنجیدہ اور سر کسی قدر گنجا ہے۔ مونچھیں بڑی بڑی اور
نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ وہ نیلے لباس میں
باقاعدگی سے ملبوس ہے۔ اس کی کمر کی پیٹی میں کاغذ،
دوات، اور ایک قلم بھی موجود ہے۔ اسکا چہرہ جولیس سیزر
کے بامروت چہرہ سے بالکل متضاد ہے وہ اب موجودہ
منظر کو، جو اس کے لئے بالکل نیا ہے ایک بچے کی طرح
مستفسرانہ انداز سے دیکھ رہا ہے اور پھر بادشاہ کے
تخت کی طرف پلٹتا ہے برٹینس اور روفیو، سیڑھی
کے قریب دوسری جانب کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سیزر:۔ (پوتھینس اور ٹالمی کی طرف دیکھکر) بادشاہ
کون ہے؟ لڑکا یا وہ آدمی؟

پوتھینس:۔ میں اپنے جہان پناہ شاہ ٹالمی کا سرپرست
پوتھینس ہوں۔

سیزر:۔ (ٹالمی کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے) تم
بادشاہ ہو! اوہ تمھاری عمر کے لئے یہ خدمت کس قدر
لغو ہے (پوتھینس سے) تمھارا ملازم پوتھینس!
(وہ بے پروائی سے پلٹتا ہے اور بیچ میں آہستہ
آہستہ آتا ہے اور دونوں طرف کے درباریوں
کو دیکھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اچیلس کے
پاس پہنچ جاتا ہے) اور یہ شخص؟

تھیوڈوٹس:۔ اچیلس! شاہی افواج کا سپہ سالار۔

سیزر:۔ (اچیلس سے دوستانہ طور پر) ایک
سردار ہو تم! میں بھی ایک سردار ہوں۔ لیکن میں نے
بہت دیر میں یہ زندگی اختیار کی، بہت ضعیفی میں تم کو
تندرستی اور صدہا فتحمندیاں نصیب ہوں اچیلس!

اچیلس:۔ جیسی دیوتاؤں کی مرضی ہو سیزر۔

سیزر:۔ (تھیوڈوٹس سے) اور جناب آپ؟

تھیوڈوٹس:۔ تھیوڈوٹس! بادشاہ کا اتالیق۔

سیزر:۔ تم آدمیوں کو بادشاہ بننا سکھاتے
ہو۔ تھیوڈوٹس! یہ تم میں کمال ہے (جب وہ تھیوڈوٹس
کی طرف سے پلٹ کر پھر پوتھینس کی طرف جاتا ہے تو دیوار پر
دیوتاؤں کی تصویریں دیکھتے ہوئے) اور یہ مقام؟

پوتھینس:۔ بادشاہ کے خزانچیوں کا کونسل ہال
سیزر!

سیزر:۔ ہاں مجھے خوب یاد آیا۔ مجھے کچھ روپیہ
کی ضرورت ہے۔

پوتھینس :- بادشاہ کا خزانہ خالی ہے سیزر!

سیزر :- ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ صرف ایک ہی کرسی ہے -

روفیو :- (کسی قدر غصہ سے چلاکر) جاؤ تم میں سے کوئی جاکر سیزر کے لئے ایک اور کرسی لائے -

ٹالمی :- (شرمندہ ہوکر اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے) سیزر -

سیزر :- (نرمی سے) نہیں نہیں میرے لڑکے یہ تمھارا شاہانہ تخت ہے - تم بیٹھ جاؤ -

(وہ ٹالمی کو پھر بٹھا دیتا ہے اس اثنا میں روفیو ادہر اُدہر دیکھنے لگتا ہے اُسے قریب کے ایک گوشے میں دیوتا را کا مجسمہ نظر آتا ہے - جس کی شکل ایک بیٹھے ہوئے آدمی کی مانند ہے - اور سرباز کی طرح اس کے سامنے ایک پیتل کی تپائی رکھی ہے جس پر عود و عنبر سلگ رہا ہے - روفیو اپنی آزادانہ فطرت کے مطابق، دیگر غیر ملکی رسوم وعقائد کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے تپائی اٹھا لیتا ہے عود و عنبر پھینک دیتا ہے اس کی راکھ پھونک دیتا ہے اور بیچ ہال میں سیزر کے پیچھے رکھدیتا ہے)

روفیو - سیزر! اس پر بیٹھ جاؤ - (سارے دربار میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس مذہبی بے ادبی پر سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں)

سیزر - (بیٹھتے ہوئے) پوتھینس اب ہم کو اصل معاملہ پر غور کرنا چاہئے - مجھے روپے کی شدید ضرورت ہے

بری ٹینس - (تمہید کو نظر انداز کرتے ہوئے) میرے آقا اب یہ فرمائیں گے کہ مصر کے ذمہ روم کا بہت بڑا قرض باقی ہے، جو بادشاہ کے مرحوم والد کی ضمانت پر دیا گیا تھا اور اب یہ سیزر کا فرض ہے کہ اپنے ملک کے لئے فوراً اس کی واپسی کا مطالبہ کرے -

سیزر - اوہ - میں بھول گیا - میں نے یہاں اپنے ہمراہیوں کو نہیں بتایا کہ یہ کون ہیں؟ یہ بری ٹینس ہے میرا معتمد - یہ مغربی جزیرہ کا ایک باشندہ ہے (بری ٹینس تعظیماً سر جھکاتا ہے) یہ رومی روفیو ہے اور جنگ میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے - (روفیو سر ہلاتا ہے) پوتھینس مجھے ایک ہزار چھ سو ٹیلنٹ[1] سکہ کی ضرورت ہے -

(درباری خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور تھیوڈوٹس اور پوتھینس اتنی بڑی رقم کے تقاضے پر ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں)

پوتھینس - (تعجب سے) چالیس لاکھ سسٹرس[2] ناممکن! بادشاہ کے خزانے میں اتنی دولت نہیں ہے -

سیزر - (ہمت افزائی کرتے ہوئے) صرف سولہ سو ٹیلنٹ، اسے سسٹرس میں کیوں شمار کرتے ہو؟ ایک سسٹر تو صرف ایک روٹی کی قیمت کے برابر ہے

پوتھینس - اور ایک ٹیلنٹ، ایک گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کی قیمت کے مترادف ہے - میں کہتا ہوں یہ ناممکن ہے ہمنے یہاں لڑائی کے موقع پر اچھی طرح جیسا ان [illegible] کر دیا ہے کیونکہ بادشاہ کی بہن کلیوپیٹرا نے یہ دعویٰ [illegible] دعویدار بن بیٹھی ہے اور بادشاہ کو اپنی [illegible]

---

[1] قدیم مصری اشرفی -

[2] قدیم مصری نقرئی سکہ

لگان وصول نہیں ہوا۔

سیزر۔ ہاں وہ وصول کر لیا گیا ہے ——— میرے سردار تمام صحیح وصول کرتے رہے ہیں۔

(درباریوں میں اضطراب کے ساتھ سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے ہیں)

روفیو۔ (سختی سے) تمھیں دینا چاہئے، پوتھینس بیکار باتیں کیوں کرتے ہو؟ تم بہت سستے چھوٹے جا رہے ہو۔

پوتھینس۔ (ترش روئی سے) یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کا فاتح سیزر، ہمارے ملک کے محاصل وصول کرنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔؟

سیزر۔ میرے دوست۔ دنیا کے فاتح کے لئے یہی سب سے زیادہ اہم شے ہے۔

پوتھینس۔ تو پھر خبردار ہو جاؤ اے سیزر، آج مندروں کی دولت اور خزانہ کی متاع ٹکسال بھیجی جائیگی، تاکہ گلا کر ہمارا نذرانہ ادا کرنے کے کام آئے دیوتا ہمیں دیواروں کے پیچھے بیٹھا ہوا اور لکڑی کے پیالوں میں شراب پیتا ہوا دیکھیں گے اور ان کا غصہ تم پر نازل ہوگا، سیزر ہم کو مذہبی بے ادبی اور اس کی تحقیر کرنے پر مجبور مت کرو

سیزر۔ مت ڈرو پوتھینس دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ چوبی پیالوں میں شراب بہت زیادہ لطیف اور لذیذ ہو جاتی ہے میں تمھاری اس دریا دلی کے معاوضہ میں اس تخت کے جھگڑے کا تمھارے حق میں فیصلہ کر دونگا۔ اگر تم پسند کرو۔ کہو تمھارا کیا منشا ہے؟

پوتھینس۔ اگر میں انکار کروں تو کیا تم اُس سے باز آجاؤ گے؟

روفیو۔ نہیں۔

سیزر۔ تم کہتے ہو کہ یہ معاملہ ایک سال سے چل رہا ہے۔ پوتھینس کیا میں اس کے متعلق صرف دس منٹ غور کر سکتا ہوں؟

پوتھینس۔ بیشک، آپ اپنی مرضی کے مطابق کرنے کے مجاز ہیں۔

سیزر۔ خوب لیکن سب سے پہلے کلیوپیٹرا کو بلاؤ۔

تھیوڈوٹس۔ وہ اسکندریہ میں نہیں ہے وہ سیریا بھاگ گئی۔

سیزر۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ (روفیو سے) طوطا تیتا کو بلاؤ۔

روفیو۔ (پکار کر) او تیتا طوطا۔ (فتاتا ——— داخل ہوتی ہے اور سیڑھیوں کے سرے پر کھڑی ہو جاتی ہے)

فتاتا۔ ملکہ کی خاص انا فتاتا کا نام کون لے رہا ہے۔

سیزر۔ کوئی شخص نہیں لے سکتا۔ طوطا۔ صرف تم ہی لے سکتی ہو۔ تمھاری ملکہ کہاں ہے؟

(کلیوپیٹرا، جو فتاتا کے پیچھے چھپی کھڑی ہے مسکرا کر جھانکتی ہے۔ سیزر کھڑا ہو جاتا ہے)

سیزر۔ کیا ملکہ صرف ایک لمحہ کے لئے ہم کو شرفِ دیدار بخشیں گی؟

کلیوپیٹرا۔ (فتاتا کو ایک طرف ہٹا کر خود سامنے آجاتی ہے) کیا مجھے ایک ملکہ کی طرح آنا چاہئے؟

سیزر۔ ہاں۔

(کلیوپیٹرا فوراً تخت شاہی کے قریب آجاتی ہے ٹالمی کو گھسیٹ کر تخت سے اتار دیتی ہے اور خود

بیٹھ جاتی ہے۔ فاتا دور سے سیڑھیوں پر بیٹھکر اس
منظر کو غائر نگاہوں سے دیکھتی ہے۔)

ٹالمی۔ (آنسو بہلاتے ہوئے) سیزر! دیکھو یہ ہمیشہ اسیطرح
مجھسے سلوک کرتی ہے۔ جب میں بادشاہ ہوں تو پھر اسکو
مجھ سے تخت چھین لینے کا کیا حق حاصل ہے؟

کلیوپیٹرا۔ (قہر آلود نگاہوں سے) تو بادشاہ نہیں ہوسکتا
اے رونے والے بچے۔ رومی تجھے نگل لیں گے۔

سیزر۔ (ٹالمی کی دردناک حالت سے متاثر ہوکر) ادہر
آ میرے لڑکے، میرے پاس کھڑا ہو۔

(ٹالمی سیزر کے پاس جاتا ہے جو تپائی پر بیٹھکر ہمت
افزائی کے طور پر ٹالمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے کلیوپیٹرا
حاسدانہ نگاہوں سے گھورنے لگتی ہے)

کلیوپیٹرا۔ (تمتماتے ہوئے رخساروں سے) لے اپنا تخت
لے مجھے نہ چاہئے۔ (وہ تخت سے اتر کر ٹالمی کے پاس آتی ہے
جو پیچھے ہٹ جاتا ہے) جا۔ جلدی جا اور اپنے تخت پر بیٹھ

سیزر۔ جاؤ ٹالمی! جب تم کو کوئی تخت دیا جائے
تو فوراً قبول کر لیا کرو۔

روفیو۔ مجھے اُمید ہے کہ جب ہم روم واپس جائیں گے
تو تم اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کی سعی کروگے
سیزر!

(ٹالمی آہستہ آہستہ اپنے تخت پر واپس جاتا ہے۔
اور کلیوپیٹرا سیزر کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

سیزر۔ پوتھینس ———

کلیوپیٹرا۔ (دخل دیتے ہوئے) کیا تم مجھسے گفتگو نہ کروگے؟

سیزر۔ خاموش رہو۔ اگر تم نے میری اجازت بغیر
منھ کھولا تو نگل لی جاؤ گی۔

کلیوپیٹرا۔ میں اس سے نہیں ڈرتی۔ ایک ملکہ کو بزدل
نہ ہونا چاہئے میرے شوہر کو 'تمھارا جی چاہے تو کھا
جاؤ' وہ ڈرتا ہے۔

سیزر۔ (گھور کر) تمھارا شوہر۔ تمھارا شوہر! کیا
معنی اس کے؟

کلیوپیٹرا۔ (ٹالمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ چھوٹی سی
چیز ——

(دونوں رومی اور برطانی ایک دوسرے کو حیرت سے
تکنے لگتے ہیں)

تھیوڈوٹس۔ سیزر، تم یہاں ایک اجنبی ہو اور ہمارے
قوانین سے بالکل ناآشنا۔ مصر کے شاہی خاندان کے لوگ
غیر سے شادی نہیں کرسکتے۔ ٹالمی اور کلیوپیٹرا بھائی بہن
پیدا ہوئے ہیں۔ اور اس لئے میاں بیوی بھی ہیں"

برٹینس۔ (خوف زدہ ہوکر) سیزر یہ تو نہایت نامناسب
بات ہے۔

تھیوڈوٹس۔ (غضبناک ہوکر) کس طرح؟

سیزر۔ (خودداری کا احساس کرتے ہوئے) اسے
معاف کرو۔ تھیوڈوٹس! وہ ایک وحشی ہے اور اپنے
جزیرہ کے رسوم واطوار کو قانون قدرت سمجھتا ہے۔

برٹینس۔ یہ بات نہیں، سیزر۔ یہ مصری وحشی ہیں
اور تم ان کی ہمت افزائی کرنے میں غلطی پر ہو۔ میں کہتا
ہوں یہ انتہائی شرارت و بدتہذیبی ہے۔

سیزر۔ شرارت ہو یا نہ ہو، مگر میرے دوست
یہ امن وسکون کا دروازہ کھول دیتی ہے (وہ پوتھینس کو

سنجیدگی سے مخاطب کرتا ہے) سنو، میں اپنی رائے تم سے کہتا ہوں!
روفیو۔ ادھر سنو سیزر،
سیزر۔ ٹالمی) اور کلیوپیٹرا، دونوں ملکر مصر پر حکومت کریں گے۔
اچیلس۔ اور بادشاہ کے چھوٹے بھائی، اور کلیوپیٹرا کی چھوٹی بہن کے متعلق؟
روفیو۔ (تشریح کرتے ہوئے) لوگ کہتے ہیں سیزر، ایک اور چھوٹا ٹالمی موجود ہے۔
سیزر۔ تو پھر چھوٹا ٹالمی دوسری بہن سے شادی کر سکتا ہے۔ اور ہم ان دونوں کو جزیرہ سائپرس، بطور تحفہ پیش کریں گے۔
پوتھینس (بے چینی سے) سائپرس، کسی کے لئے کسی کام کا بھی نہیں ہے۔
سیزر۔ کوئی حرج نہیں۔ یہ صرف تم کو صلح کے معاوضہ میں دیدیا جائیگا۔
بری ٹینس۔ (خود فراموشی کے عالم میں ———— کچھ سوچتے ہوئے) عزت کے ساتھ صلح کرلو۔ پوتھینس!
پوتھینس:۔ (سرکشی سے) سیزر، ایماندار بنو، جس رقم کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ ہماری آزادی کی قیمت ہو، تم یہ رقم لے لو۔ اور ہم کو ہمارے جھگڑے خود طے کر لینے کے لئے چھوڑ دو۔
ایک دلیر درباری۔ (پوتھینس کے لہجہ اور سیزر کی خاموشی سے متاثر ہوکر) ہاں ٹھیک ہے مصر مصریوں کے لیئے ہے۔

(اب مجلس میں زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی ہے مصری گفتگو کرنے لگتا ہے۔ سیزر خاموش بیٹھا رہتا ہے

لیکن روفیو بہت غضبناک اور خوفناک شکل اختیار کرتا جاتا ہے اور بری ٹینس کے چہرہ پر بھی غصہ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں)
روفیو۔ (حقارت سے) مصر، مصریوں کے لئے! کیا تم بھول گئے کہ یہاں ایک رومی لشکر موجود ہے جسے آلیکس گینی نس نے، سبب تمھارے بادشاہ کو تخت پر بٹھایا تو ہیں چھوڑ رہا تھا۔
اچیلس۔ (تہورانہ انداز سے) ہاں اور اب اس فوج کا سپہ سالار میں ہوں۔ سیزر، میں ہی یہاں وہ رومی سردار ہوں۔
سیزر۔ (ہنسکر) اور اب مصری فوج کا بھی سردار ہو
پوتھینس۔ (فتحمندانہ) ہاں ایسا ہی ہے سیزر۔
سیزر۔ (اچیلس سے) تو تم روم کی خاطر مصر میں جنگ کر سکتے ہو۔ اور رومیوں سے اگر ضرورت سمجھو تو مصر کی خاطر؟
اچیلس۔ ہاں ایسا ہی ہے سیزر۔!
سیزر۔ تو اے سردار میں تم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تم کس طرف ہو؟
اچیلس۔ دیوتاؤں اور سچی جماعت کی طرف
سیزر۔ ہوں! تو اچھا تو تمھارے پاس کتنی فوج ہے؟
اچیلس۔ یہ اس وقت معلوم ہوگا جب میں میدان جنگ میں آؤنگا۔
روفیو۔ (تند خوئی سے) کیا تمھارے سپاہی رومی نہیں ہیں؟ اگر نہیں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کہ کتنے ہیں؟ ہمارے دس، تمھارے پانسو پر بھاری ہیں۔
پوتھینس۔ سیزر کو شرمندہ کرنا فضول ہے روفیو سیزر۔

پہلے بھی شکست کھا چکا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی پسپا ہو - کچھ زمانہ گذرا کہ سیزر جان بچانے کے لئے پمپئی کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا رہا - اور ممکن ہے چند مہینوں کے بعد وہ اپنی جان بچانے کے لئے افریقہ کے بادشاہ، کیٹو اور جوبا کے پاس پناہ ڈھونڈنے جائے -

اچیلس - (پوتھینس کی تقریر کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے) تم چار ہزار سپاہیوں سے کیا کر سکتے ہو؟

تھیوڈوٹس - (اچیلس کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتی ہوئی) اور بالکل مفلس - ؟

سب درباری - (غل مچا کر سیزر کے پاس جمع ہوتے ہوئے) تم چلے جاؤ - مصر مصریوں کے لئے ہے، تم چلے جاؤ یہاں سے !

(روفیو غصہ سے داڑھی چبانے لگتا ہے اور اسکی زبان سے بات نہیں نکلتی - سیزر اس قدر مطمئن انداز سے بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی تماشہ دیکھ رہا ہو اور کوئی بلی اس کے پاؤں کے پاس کھیل رہی ہو)

کلیوپیٹرا - تم ان کو ایسی باتیں کیوں کرنے دیتے ہو سیزر؟ کیا تم ان سے خوفزدہ ہو؟

سیزر - کیوں میری پیاری، جو کچھ وہ کہتے ہیں بالکل سچ ہے -

کلیوپیٹرا - مگر تمہارے چلے جانے کے بعد میں ملکہ نہ بن سکوں گی -

سیزر - مگر جب تک تم ملکہ نہ بنجاؤ گی میں یہاں سے جاؤں گا نہیں -

پوتھینس - اچیلس، اگر تم بیوقوف نہیں ہو تو اس لڑکی کو جبکہ وہ تمہارے قابو میں ہے قید کر لو -

روفیو - (طعن سے) ضرور، اور سیزر کو بھی اچیلس ؟

پوتھینس - روفیو تم نے ٹھیک کہا -

روفیو - کوشش کرو، اچیلس (پکار کر) اس طرف حفاظت کرو -

(دالان میں سیزر کی فوج یکایک آکر جمع ہو جاتی ہے اور تلوار سونت کر سیڑھی کی چوٹی پر کھڑی ہو جاتی ہے اور حملہ کی منتظر رہتی ہے ایک لمحہ تک مصری نخوت و تمکنت کے انداز سے ان کا سامنا کرتے ہیں اور پھر اپنی اپنی جگہ واپس چلے جاتے ہیں)

بری ٹینس - تم سیزر کے قیدی ہو - تم سب !

سیزر - (دریا دلی سے) اوہ - نہیں نہیں کسی طرح نہیں - بلکہ سیزر کے مہمان،

کلیوپیٹرا - کیا تم ان کے سر قلم نہ کرو گے ؟

سیزر - کیا تمہارے بھائی کا سر کاٹ ڈالوں ؟

کلیوپیٹرا - ہاں ضرور! اگر اسے موقع ملا تو وہ میرا سر قلم کر دیگا - کیا تم ایسا نہ کرو گے ٹالمی ؟

ٹالمی - (غمگین مگر مستقل مزاجی سے) ضرور - میں جوان ہو کر ضرور اس کا سر اڑا دونگا -

(کلیوپیٹرا اپنی نئی حاصل شدہ حاکمانہ عظمت کے خیال میں محو ہو جاتی ہے اور ایک طفلانہ اضطرار کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے اور جب سیزر اپنی نشست سے اٹھتا ہے تو اس پر بیٹھ جاتی ہے)

پوتھینس - سیزر اگر تم ہم کو یہیں ٹھہرنے پر مجبور کرتے ہو

روفیو - ہاں ہاں اے مصریو' اس امر پر تیار ہو جاؤ - ہمارے قبضہ میں محل' سمندر کا ساحل اور شرقی بندرگاہ ہے - روم کا راستہ کھلا ہوا ہے اور اگر سیزر نے پسند کیا تو تمھیں اسی راستہ پر سفر کرنا پڑے گا -

سیزر - (نہایت خوش خلقی کے ساتھ) میں اپنے سپاہیوں کی حفاظت کے لئے پوتھینس' اس سے کم اور کچھ نہ کرسکتا تھا - میں ان میں سے ہر ایک کی جان کا جواب دہ ہوں لیکن تم بالکل آزاد ہو - اور اسی طرح یہاں محل کے اور سب آزاد ہیں -

روفیو - (اس برتاؤ سے متعجب ہوکر) کیا یہ بیدین اور سب؟

سیزر - (اس جملہ کو لطیف بناتے ہوئے) رومی فوج اور سب اے روفیو -

پوتھینس - (سختی سے) تو میں سیزر کے انصاف سے آخری درخواست کرتا ہوں - کہ وہ ہمارے لئے اس کا ثبوت پیش کرے - رومی مقامی فوج' دنیا کے سب سے بڑے سپاہی کی نگرانی میں' سیزر کو اپنے رحم و کرم پر سر تسلیم خم کرتے پلے گی (دالان میں پکار کر) او لوسیس سپٹیمیس (سیزر بے حد متاثر ہوکر متحیر ہوتا ہے) اگر میری آواز تم تک پہنچ سکتی ہے - تو باہر نکل آؤ اور سیزر کے سامنے آکر امتحان کرو -

سیزر - (گھبراکر) نہیں - نہیں -

تھیوڈوٹس - ہاں میں کہتا ہوں کہ حاکم فوج کو شہادت پیش کرنے دو -

(لوسیس سپٹیمیس' ایک بے ریش و بروت نہایت متناسب الاعضا' چالیس سالہ' خوبصورت نوجوان ———— ایک رومی سردار کے لباس میں' دالان سے نکلکر باہر آتا ہے - وہ اپنا چہرہ پہلے اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے پھر ———— دامن ہٹا دیتا ہے - اور تمکنت سے فوجی حاکم کو دیکھتا)

پوتھینس - لوسیس سپٹیمیس شہادت پیش کرو - سیزر یہاں اپنے دشمن کے تعاقب میں آیا ہے کیا ہم نے اسکے دشمن کو پناہ دی؟

لوسیس - جیسے ہی پمپئی کے پاؤں مصری ساحل پر پڑے میں نے ایک وار میں اس کا سر جدا کر دیا -

تھیوڈوٹس - اور اس کی بیوی اور بچوں کے سامنے سیزر' ذرا سوچو تو - انھوں نے اس کو قتل ہوتے دیکھا اور اسی جہاز میں سے' جس کو اس نے اسی وقت خیرباد کہا تھا ہم نے تمھیں انتقام کا اطمینان بخش ثبوت دیا ہے -

سیزر - (خوفزدہ ہوکر) - انتقام!

پوتھینس - جب دنیا کی شہنشاہی کا اعلان کرنے کو تمھارا جہاز ہمارے بندرگاہ میں داخل ہوا تو ہمارا سب سے پہلا نذرانہ تمھارے حریف کا سر تھا - لوسیس گواہی دو کیا یہ سب سچ نہیں ہے؟

لوسیس - ہاں بالکل درست ہے! اس ہاتھ سے جس نے پمپئی کو قتل کیا' میں نے مقتول کا سر سیزر کے قدموں پر ڈال دیا -

سیزر - قاتل! اگر پمپئی فارسیلیا میں فتحمند ہوتا تو تم اسی طرح سیزر کو بھی قتل کر دیتے -

لوسیس - مفتوح پر لعنت' سیزر! جب میں

پمپئی کا اطاعت گذار تھا۔ تو میں نے ایسے آدمیوں کو بھی قتل کیا، جیسا وہ خود تھا۔ اور آخر کار اُس کی بھی باری آئی ـــ

تھیوڈوٹس۔ (خوشامدانہ) یہ کام تمھارا نہیں تھا سیزر، بلکہ ہمارا تھا ـــ نہیں صرف میرا۔ کیونکہ یہ سب کچھ میری تدبیر سے ہوا۔ ہماری بدولت تمھاری شہرت بھی باقی رہی اور انتقام بھی پورا ہوا۔

سیزر۔ انتقام، انتقام، اوہ، اگر میں انتقام لینے پر آمادہ ہوتا تو تم سے اس مقتول کے خون کے عوض کیا کچھ نہ لے لیتا۔ (وہ سب خوفزدہ اور ناامید ہوجاتے ہیں) کیا وہ میرا داماد نہ تھا؟ کیا وہ بیس برس تک روم کا حکمراں اور تیس سال تک نصرت و فتحمندی کا علمبردار نہ رہا تھا؟ کیا ایک رومی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ میری بھی شہرت نہیں ہوئی؟ کیا قسمت جس نے ہمیں دنیا کو فتح کرنے پر مجبور کیا، ہماری بنائی ہوئی تھی؟ میں جولیس سیزر ہوں یا کوئی اور جو تم ایک بڈھے سپاہی کا سر میری طرف پھینک رہے ہو، مشہور فاتح، جوانمرد اور دلیر رومی دھوکہ اور مکاری سے، اس بدمعاش کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر تم اس کو میرے شکریہ کا مستحق بھی ٹھہراتے ہو! لوسیس) دور ہو میری نظروں سے، تو مجھے خوف و دہشت سے سراسیمہ کر رہا ہے۔

لوسیس۔ (سرد مہری اور دلیری سے) ہوں، تم نے بہت سے سر پہلے بھی تن سے جدا دیکھے ہیں۔ سیزر، اور میرا خیال ہے بہت سے کٹے ہوئے ہاتھ۔ مگر جب تم نے ورسنگی ٹورکس پر فتح پائی تو کیا اُسے یونہی چھوڑ دیا؟ ـــ کیا یہ انتقام نہ تھا؟

سیزر۔ نہیں دیوتاؤں کی قسم، میں چاہتا ہوں کہ کاش ایسا ہی ہوتا۔ انتقام آخر کار ایک انسانی فطرت کا خاصہ ہے نہیں! میں کہتا ہوں کہ وہ تمام کٹے ہوئے ہاتھ اور ورسنگی ٹورکس کی موت جو دارالخلافہ میں گردن دبا کر مارا گیا، دونوں دانائی کے ماتحت تھے ـــ جہالت اور چھوٹی باتیں ایک سچے انتقام سے دس گنا زیادہ خونی اور خوفناک ہوتی ہیں۔ میں اس وقت یقینی بیوقوف بن گیا تھا۔ جب میں نے سوچا کہ انسانوں کی جان ایسے بیوقوفوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جائے (انکسار سے) لوسیس مجھے معاف کرو۔ ورسنگی ٹورکس کا قاتل، پمپئی کے قاتل کو کیوں بُرا کہے۔؟ تم بھی سب کے ساتھ آزاد ہو تمھارا دل چاہے تو ٹھہرو۔ میں تم کو اپنے پاس کوئی خدمت دے سکونگا۔

لوسیس۔ دیوتا تمھارے خلاف ہیں۔ سیزر۔ میں جانتا ہوں۔

(وہ دالان کی طرف جانے کو پلٹتا ہے)

روفیو۔ (اپنے شکار کو بچکر جاتے ہوئے دیکھکر غصہ سے) اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ جمہوریت پسند ہے۔

لوسیس۔ (دالان کی سیڑھیوں پر پلٹ کر) اور تم کیا ہو؟

روفیو۔ سیزر کے دوسرے سپاہیوں کی طرح ایک خیر خواہ۔

سیزر۔ (اخلاقاً) لوسیس، یقین کرو کہ سیزر، سیزر ہی نہیں ہے۔ اگر روم میں حقیقی جمہوریت ہوتی تو سیزر سب سے پہلا جمہوریت پسند ہوتا لیکن اب تم نے

اپنی رائے قائم کرلی ہے اس لئے خدا حافظ۔

لوسیس۔ آؤ اچیلس! تاہم ابھی کچھ وقت باقی ہے

(سیزر یہ دیکھ کر کہ روفیو اپنے غصہ سے بہت بے حال ہو رہا ہے' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اسے خطرہ سے باہر نکال لاتا ہے بری ٹینس سیزر کی دائیں جانب ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ یہ تینوں اچیلس کے گروہ کے پاس پہنچتے ہیں جو وہاں سے اٹھکر دوسری طرف تھیوڈوٹس سے ملجاتا ہے۔ لوسیس سپٹیمیس دالان کے سپاہیوں کے بیچ میں سے ہوکر باہر چلے جاتے ہیں۔ پوتھنیس تھیوڈوٹس اور اچیلس مع تمام درباریوں کے اس کے پیچھے جاتے ہیں۔ اور فوجوں میں جو اپنے آپکو پہلی صف میں ترتیب دیئے ہیں بالکل بے اعتنائی کا احساس کرتے ہوئے ان کے پیچھے بلا کسی خاص احترام کے باہر جاتے ہیں بادشاہ' قابل رحم حالت میں' بے حد رنجیدہ اور تنہا رہجاتا ہے۔ اس اثنا میں روفیو برہم لہجہ میں کہتا ہے)

روفیو۔ (لوسیس کے جانے کے بعد) کیا تمھارا خیال ہے کہ اگر وہ ہمارے سروں کو اپنے ہاتھوں میں لے لے تو ہمکو جلا جانے دیا جائیگا۔

سیزر۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں اس کی تدبیروں کو اپنے ارادوں سے زیادہ ذلیل خیال کروں۔

روفیو۔ ہوں۔

سیزر۔ روفیو۔ اگر میں لوسیس کو اپنے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قرار دوں تو کیا اس وقت بھی تم میری اطاعت کروگے؟

بری ٹینس۔ سیزر! یہ کوئی دانائی کی بات نہیں ہے تمھارے رومی فرائض تم سے اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کے دشمن ملک کو آئندہ کوئی ضرر نہ پہنچانے پائیں۔

(سیزر ایک استغنا کے ساتھ مسکراتا ہے)

روفیو۔ اس سے گفتگو کرنا بے سود ہے

بری ٹینس۔ غور سے سنو سیزر! مانا کہ بردباری تمھارے لئے بہت مفید ہے لیکن وہ تمھارے سپاہیوں کے لئے کس کام کی ہے؟ جنھیں کل انھیں آدمیوں سے لڑنا پڑے گا جن کو تم نے کل رہا کردیا ہے۔ تمھارا جو دل چاہے حکم دو لیکن میں تو یہ عرض کرونگا کہ تمھاری دوسری فتح کے معنی قتل عام کے ہیں۔ میں کسی شخص کو گرفتار نہ کرونگا۔ بلکہ تمام دشمنوں کو میدان ہی میں قتل کرڈالونگا۔ اور مجھے اُن سے دوبارہ لڑنا نہ پڑے گا۔

(وہ جانے کا قصد کرتا ہے)

سیزر۔ (پلٹ کر ٹالمی کو دیکھتے ہوئے) کیا۔۔۔؟ وہ سب لڑکے کو تنہا چھوڑکر چلے گئے شرم شرم!

روفیو۔ (ٹالمی کا ہاتھ پکڑکر اٹھاتے ہوئے) آئیے بادشاہ سلامت

ٹالمی۔ (روفیو سے ہاتھ چھڑاکر سیزر سے) کیا یہ مجھے اپنے محل سے باہر نکال رہا ہے۔

روفیو۔ (ردائے پیسکر) اگر آپ چاہیں تو یہاں ٹھہر سکتے ہیں

محشر عابدی (باقی آئندہ)

عزیز لکھنوی کی شاعری

مولانا نیاز اڈیٹر نگار نے عزیز صاحب کی شاعری کے متعلق میرا مضمون مئی کے پرچے میں درج کرکے مجھکو مزید تنقید و تبصرہ کی دعوت دی ہے میں موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جناب عزیز کا جستہ جستہ کلام دیکھنے کے بعد اپنے مضمون کی پہلی قسط پیش کرتا ہوں۔

دنیائے ادب میں جناب عزیز کی شخصیت محتاج تعارف نہیں لیکن ادبی دنیا کا اکثر حصہ اُن کے کلام کا نظر عمیق سے مطالعہ کئے بغیر محض تقلیداً ان کو آٹھویں دور کے ممتاز شعراء میں تصور کئے ہوئے [illegible] ہے۔ میں خود بھی اسی غلط خیالی کا شکار ہو رہا تھا۔ لیکن گلکدۂ عزیز کے مطالعہ نے مجھپر یہ ظاہر کر دیا کہ عزیز صاحب کو ممتاز شعراء کی صف میں جگہ دینا غلطی ہے۔ ان کو شعر و سخن کے فن سے کوئی خاص نسبت نہیں۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں جنکے ایک مصرع کا دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں۔ اور بعض متروکات حاضرہ سے بے نیازی اور زبان و محاورہ کی کم علمی ظاہر کر رہے ہیں۔ البتہ بجلیوں کی رو، ذرہ ہائے دل۔ عالم نزع وغیرہ چند مرکبات ایسے ہیں جو جا و بیجا استعمال کئے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حسن ہی کیا تہ و بالا جو نہ عالم کر دے ۔۔۔ دل ہی کیا جس میں کوئی جذبۂ فطری نہوا

کیا پابندئ ردیف سے مجبور ہوکر "نہوا" بمعنی "نہیں" استعمال کرنا کسی قادر الکلام شاعر کے لئے مناسب ہے؟[1]

عزیز اب سخت مشکل ہے بہلنا دل سے وحشی کا ۔۔۔ وہ ہو شہروں کی آبادی کہ سناٹا بیاباں کا

معلوم نہیں یہ مطلع ہے یا شعر، اگر مطلع کہا جائے تو "بیاباں" کا قافیہ موجود نہیں اور اگر شعر ہے تو مصرع اولیٰ میں "کا" کا استعمال کیسا؟ اگر یہ مصرع اس طرح کہا جاتا تو یہ عیب دور ہو سکتا تھا[2]۔

عزیز اب دل سے وحشی کا سنبھلنا سخت مشکل ہے

کچھ نہ پوچھو شب وعدہ مری گھر کی رونق ۔۔۔ اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

"سامان سے ساماں" غلط محاورہ ہے؟ لفظ "سامان" میں نون کا اعلان اور دوسرے میں نون غنہ درست نہیں[3]

---

[1] یقیناً "نہوا" یہاں "نہیں" کی جگہ استعمال ہوا ہے جو نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ (اڈیٹر) [2] یقیناً یہ مصرع بہتر ہے۔ (اڈیٹر) [3] علاوہ اعلان نون و نون غنہ کے ایک نقص یہ بھی ہے۔ سامان سے ساماں میں بجائے "سے" کے "سا" ہونا چاہئے تھا۔ (اڈیٹر)

اُن کی اس کوشش بیجد کا پتہ دیتا ہے　　　چارہ سازوں کا میری لاش پہ گریاں ہونا

جب آپ نے یہ دیکھا کہ مصرع اولیٰ پورا ہوتا نظر نہیں آتا تو مجبوراً "اس" کا اضافہ کرکے ہموزن بنالیا۔ حضرت! اس کو فن شاعری میں "حشو" کہتے ہیں اور حشو بھی قبیح۔[51]

ہم تو دل ہی پہ سمجھتے تھے بتوں کا اختیار　　　نصب کعبہ میں بھی اَب تک ایک پتھر رہ گیا

مصرع ثانی میں "اَب تک" اور "نصب رہگیا" کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہو سکتا ہو کہ کیا غلطی ہے۔ "اَب تک نصب ہے" کہنا چاہیئے تھا نہ کہ "اب تک نصب رہگیا"۔[52]

جاچکے احباب رو کر اُٹھ چکی ماتم کی صف　　　آپ کب آئے کہ جب خالی میرا گھر رہ گیا

اللہ رے بے بسی! ردیف کی پابندی نے اس درجہ مجبور کردیا کہ غلط و صحیح کا امتیاز اُٹھ گیا مصرعہ اولیٰ کے مفہوم کا خیال کرتے ہوئے یوں کہنا چاہیئے تھا۔

"آپ کب آئے کہ جب خالی مرا گھر ہو گیا"[53]

چارہ سازوں میں بہم مشورہ کیا کیا نہ ہوا　　　نہ ہوا آپ کا بیمار غم اچھا نہ ہوا

حضرت! مشورہ تو بہم ہی ہوا کرتا ہے پھر "بہم" لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ "مشورہ" کے ساتھ "بہم" غلط اور خلاف محاورہ ہے۔[54]

جاجاکے پلٹ آئے میرے نالۂ دل سب　　　جب تنگ بہت گنبد دوّار کو دیکھا

"سب" کی زیادتی کی داد دینا محال ہے ایسی مثالوں سے آپ کا دیوان بھرا پڑا ہے۔[55]

وقت اَب وہ ہو کہ احباب تو احباب ہیں سب　　　میری بالیں سے نہیں ہے کوئی بیگانہ جدا

شعر ہا ہیں "احباب تو احباب ہیں سب" ایسا پاکیزہ اور پُر معنی جز وہے جو خود اپنی داد ہے۔ شعر کیا ہے اچھا خاصہ معما ہے شعر کو بار بار پڑھیئے اور مطلب سوچیے۔ انشاء اللہ العزیز ہزار مرتبہ پڑھنے پر بھی مطلب براری نہ ہوگی۔[56]

---

[51] بیشک اس کا استعمال یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (اڈیٹر) [52] یقیناً اعتراض درست ہے۔ (اڈیٹر) [53] مصرعہ ثانی میں بجائے ہوگیا کے رہگیا استعمال ہوا ہے۔ علاوہ اس کے "آپ کب آئے کہ جب" بھی کانوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے۔ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا "آپ بھی کب آئے، جب خالی مرا گھر ہوگیا"۔ (اڈیٹر) [54] میں اس اعتراض کو درست نہیں سمجھتا۔ مانا کہ مشورہ باہم ہی ہوتا ہے لیکن اس کے اظہار میں کیا حرج ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب "مشورۂ بہم" کا ذکر اس طرح کیا جائے گا تو اس سے مخالفت کا مفہوم پیدا ہوگا جو یہاں مقصود نہیں۔ (اڈیٹر) [55] یقیناً زائد ہے۔ (اڈیٹر) [56] شعر کا مطلب یہ ہو کہ اب وقت ہو کہ احباب تو احباب، میری بالیں سے اب کوئی بیگانہ بھی جدا نہیں۔ اس لئے پہلے مصرعہ میں لفظ سب بیکار ہے اور دوسرے مصرعہ میں بیگانہ کے بعد لفظ بھی آنا چاہیئے تھا۔ (اڈیٹر)

ہوئی پیمائش راہِ محبت بعد میرے جب　　مسافت ایک منزل کی تھی ہر نقشِ قدم میرا

" بعد میرے جب " کیا پاکیزہ بندش ہے ! دوسرے مصرع کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ " میرا ہر نقشِ قدم ایک منزل کی مسافت تھا " لیکن آپ نے ہر نقش کی مسافت ایک منزل ظاہر کرکے مفہوم کو کچھ سے کچھ بنا دیا اب اس کے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ ہر نقش قدم کی مسافت (طوالت و فاصلہ) ایک منزل تھی[51]

کچھ رنگ عزیز اب نظر آتا ہے مجھے اور　　شاید کہ یہ درد آج سے اٹھکر نہ اُٹھے گا

" آج سے اُٹھکر نہ اُٹھے گا " بالکل غلط ہے اور خلاف محاورہ ہے یوں کہنا چاہئے کہ " آج اُٹھکر پھر نہ اٹھیگا "[52]

اپنی حد سے سوزِ دل اب بڑھ گیا　　آخری درجہ تھا پارہ چڑھ گیا

" اب " اور " تھا " تعریف سے مستغنی ہیں دونوں غلط اور بے محل استعمال ہوئے ہیں یوں کہئے

اپنی حد سے سوزِ دل جب بڑھ گیا　　آخری درجہ پہ پارہ چڑھ گیا

غیر کو دیکھ کے کرتے وہ نظر کاش عزیز　　رنگ خود، وہ ہی کوئی تیر نکالا ہوتا

" غیر کو دیکھکر " آخر کس طرف دیکھتے[53] !

یہ سعیٔ بیخودی پے تسکین شوق تھی　　واقف ہوں میں کہ آپکا ملنا محال تھا

مصرع ثانی میں " ہوں " سے زمانہ حال ظاہر ہوتا ہے اور مصرع اول ماضی بعید میں ہے یوں بھی کہا جا سکتا تھا " واقف تھا میں کہ الخ "[54]

دل نام کوئی چیز کبھی پاس تھی عزیز　　یا بھولتے ہو یہ کوئی خواب وخیال تھا

ضمیر غائب " وہ " ہے " یہ " نہیں ہے[55]۔

امتحانگاہِ محبت میں وہی دل دل ہے　　مطمئن وہ جسے میں جسکو پریشاں سمجھا

" وہ جسے میں جس کو " کی ترکیب کتنی دلکش ہے آپ نے مصرع اولیٰ فعل حال میں اور مصرع ثانی فعل ماضی میں نظم کرکے اپنی قادر الکلامی و مشاقی کا کتنا انوکھا ثبوت دیا ہے[56]

آپ دم بھر کو اگر آکے چلے بھی جاتے　　ایک بیمار کو مرنے کا سہارا ہوتا

آپ فرماتے ہیں کہ " اگر آپ دم بھر کو آ کر چلے بھی جاتے تو ایک بیمار کے مرنے کا سہارا ہو جاتا " کیا دس بیس بیمار تھے جو " ایک " کی تخصیص کی گئی[57] ؟

جب کوئی ذرہ مرے خاکسترِ دل کا اڑا　　جاتے جاتے انکی محفل تک وہی پروانہ تھا

" اڑا " کے ساتھ " ہوا " استعمال کرنا چاہئے تھا[58]۔

---

[51] " بعد میرے جب " یقیناً مکروہ ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا (اڈیٹر) [52] یقیناً آج کے بعد سے بالکل غلط ہے۔ (اڈیٹر) [53] اصلاح موزوں ہے۔ (اڈیٹر) [54] چونکہ شعر سے اصل مفہوم متبادر ہے اس لئے اظہار ضمیر کی ضرورت نہیں۔ (اڈیٹر) [55] اعتراض چنداں اہم نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [56] اعتراض درست ہے (اڈیٹر) [57] شعر کا مفہوم کیا ہے۔ (اڈیٹر) [58] یہاں ایک تنکیری ہے تخصیصی نہیں (اڈیٹر) [59] یہ دونوں زبانیں غلط ہیں (اڈیٹر)

دفتر عشق میں دل کو نہ سمجھنا مہمل لفظ بھی ہوگا یہی اور یہی معنی ہوگا

جب مصرع ثانی میں "لفظ" کے ساتھ "بھی" استعمال کیا گیا تو "معنی" نے کیا قصور کیا تھا! اس کے لئے بھی تو کسی صورت سے "بھی" کا استعمال کیا ہوتا[1]۔

ہوگئی مستوں پہ طاری آج دونی کیفیت تھیں نشیلی انکھڑیاں ساقی کی ساغر کا جواب

"کیفیت" کی یائے ثانی بالتشدید ہے اس کا صحیح تلفظ بر وزن مفعولن ہے نہ کہ فاعلن — رند لکھنوی کہتے ہیں[2]

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

اول تو "انکھڑیاں" قدیم لفظ متروک الاستعمال ہے دوئم "انکھڑیاں" جمع اور ساغر واحد، پھر آنکھیں ایک ساغر کا جواب کیسے ہوسکتی ہیں[3]؟

اے ناشناس اہل وفا میں ترے نثار کیا سونچتا ہے خوں بھری تلوار دیکھکر

سونچنا کانوں اور "خوں بھری" میں نون غنہ کا استعمال قابل غور ہے۔

جا کبھی نجد کی جانب بھی عزیز روح مجنوں کو ذرا شاد تو کر

"بھی" اور "تو" کے اضافہ سے روح مجنوں شاد ہوگی یا ناشاد[4]؟

چھپے ہو تم تو بھلا پھر کہاں سے آئے بہار حجاب اٹھاؤ تو چلنے لگے ہوائے بہار

"ہوائے بہار" تو یقیناً چلنے لگے گی لیکن "بھلا" کا حسن استعمال آپ کی حسن شاعری پر نقاب پوشی ہی کرتا رہیگا[5]۔

پھپکتے آتے ہیں پودے گھٹائیں اٹھی ہیں عجب سماں نظر آتا ہے مجھکو ہائے بہار

کیا اہل لکھنؤ کا یہ کوئی مخصوص محاورہ ہے کہ "پودے پھپکتے ہیں" اس جدید محاورہ سے کان آشنا نہیں، جب "عجب" کہدیا تو "ہائے" کی کیا ضرورت رہی[6]۔

گرمیٔ حسن سے کچھ آئی ہے تاثیر بہار یہ پسینہ ہے کہ ہے روغن تصویر بہار

"روغن تصویر" کی جدید ترکیب نے اس شعر کو اتنا بلند کر دیا کہ بے نیاز معنی ہو کر رہگیا[7]۔

---

[1] میرے نزدیک ضروری نہیں۔ (اڈیٹر) [2] کیفیت بغیر تشدید یا اردو میں مستعمل ہے۔ لفظ انکھڑیاں ان متروکات میں سے نہیں ہیں جن کا استعمال کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا انکھڑیوں کا جواب ساغر ہونا — محض کیفیت کے لحاظ سے ہے اس لئے اس میں ایک اور دو کی بحث چھیڑنا درست نہیں۔ (اڈیٹر) [3] یقیناً تو کا استعمال مناسب نہ تھا۔ (اڈیٹر) [4] بھلا کا استعمال بالکل درست ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [5] پھپکنا محاورہ ہے۔ البتہ ہائے کا استعمال درست نہیں۔ (اڈیٹر) [6] صحیح معنی میں لکھنوی رنگ کا شعر ہے۔ (اڈیٹر)

حلق پر پھیر کہ بر آئیگی امید وصال | عکس تیر ابھی ہے شمشیر میں شامل قاتل

مصرع اولیٰ کی تو کیا تعریف کروں البتہ اس کے جزو اول "حلق پر پھیر" کی ضرور تعریف کرونگا تاکہ ہر سامع کو ذم کا پہلو نظر نہ آئے "بھی" تو مستغنی تحسین و مرحبا ہے گویا قاتل کے سوا کسی دوسرے کا عکس بھی داخل شمشیر ہے[1]

مایوس کب ہوئے دل جذب آفریں سے ہم | کروٹ ابھی لوائیں گے سطح زمیں سے ہم

یقیناً زمین کا کروٹ لینا یا لوانا تو داخل محاورہ ہے لیکن "سطح زمین کا کروٹ لوانا" عجیب بات ہے[2]۔

حسرت تعمیر ہے اپنے خرابے کی ہمیں | آسماں اس فکر میں ہو اور ہم ویراں کریں

"ہمیں" کے بعد "ہم" کی کیا ضرورت تھی[3]۔

بے سبب تیرے لب نہیں خاموش | کر رہی ہیں تری نظر باتیں

جمع کے ساتھ جمع استعمال کیجیے، یوں کہنا چاہیے (نثر) تیری نظریں باتیں کر رہی ہیں[4]۔

ہے اک فریب ہمت دنا کامیٔ خیال | مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں

ناکامیٔ خیال کے ساتھ "فریب ہمت" سبحان اللہ کتنی دلکش ترکیب ہے مصرع ثانی میں "جو" کے ساتھ "وہ" استعمال کرنا چاہئے تھا اور اگر "وہی" کا استعمال مناسب تھا تو "بھی" کس مصرف کا[5]؟

پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا | ہوتا اگر یہ دل ہی میرے اختیار میں

"یہ" کہنے کی کیا ضرورت ہے "دل" دو تو نہیں کہ اُن کے لئے اشارہ کرنا لازمی ہو "ہی" اور "بھلا" کا کیا ذکر، بے نیاز داد ہیں[6]

چھپتے کیوں ہو جو سر تا بقدم دیکھتے ہیں | یہ کوئی اور نہیں ہے تمھیں ہم دیکھتے ہیں

اس جگہ "یہ" بے نیاز معنی ہے اگر یوں ہوتا کہ "یہاں" کوئی اور نہیں تو خیر مطلب صاف ہو جاتا[7]

یاد پھر آئی کوئی صحبت دیرینہ عزیز | مجلس وعظ میں اب آپ کو کم دیکھتے ہیں

حضرت! "یاد پھر آئی" کو مصرع ثانی سے کیا نسبت! یوں کہئے "یاد آتی ہے ہمیں صحبت دیرینہ عزیز[8]"

اس کے حریم ناز کا کیا پوچھنا بھلا | گھیرے ہوئے ہے عرش کو جو آشیانے میں

آشیانہ میں عرش کا گھیرنا کیا معنی[9]؟

---

[1] ذم کا کوئی پہلو موجود نہیں اور نہ "بھی" کا استعمال غلط ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [2] مبالغہ میں عجیب ہی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ (اڈیٹر) [3] لفظ ہم کہیں آسمان کے لئے نہ ہو یعنی ویرانی کی فکر آسمان نہ کر رہا ہو۔ (اڈیٹر) [4] ممکن "ہو کر رہی ہے" ہو۔ [5] مصرعۂ اولیٰ میں تو کوئی غلطی نہیں، البتہ دوسرا مصرع قابل اصلاح ہے۔ (اڈیٹر) [6] یقیناً شعر محتاج اصلاح ہے۔ [7] یہ کا استعمال درست ہے۔ (اڈیٹر) [8] صلاح بری نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [9] معنی تو ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر۔ (اڈیٹر)

ذیل میں پانچ چار شعر صرف ایسے درج کرتا ہوں جن میں حشو قبیح نمایاں ہے [۵۱]

کون سمجھا ہے بھلا وسعت کاشانۂ دل — شرح کونین ہے دیباچۂ افسانۂ دل

دم الٹ جائے گا عزیز عزیز — رہ نہ خاموش کچھ تو کر باتیں

اب تلک کچھ آشیاں کا ساں سا نظر میں ہے — گو میں قفس میں تازہ گرفتار بھی نہیں

بس اب تو چین سے سو شور بھی جہاں میں نہیں — کہ سانس تک ترے بیمار ناتواں میں نہیں

زہر دیتے ہیں تجھے یا کہ دوا دیتے ہیں — چارہ سازوں سے یہ پوچھو تو کہ کیا دیتے ہیں

چارہ گر چپ ہیں کیوں علاج کریں — کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

شعر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ چارہ گر نے کیا تکلیف دی [۵۲]۔

عبرت اے اہل نظر جب یہ برا وقت پڑے — کیا کرے آہ وہ چلتے میں بھی بیزار نہ ہو

"چلتے میں بھی" کیا انوکھا ٹکڑا ہے جس نے شعر کو بے نیاز معنی کر دیا [۵۳]۔

چارہ سازوں سے نکالی ہے کہاں کی دوستی — وہ نہیں جب مہرباں تو مہرباں کوئی نہ ہو

عزیز صاحب نے پابندی ردیف سے مجبور ہو کر "نہو" بمعنی "نہیں" استعمال کیا [۵۴]۔

وہ ستم پیشہ فلک ظلم ایجاد — اُنسے ہوتی ہے تو ہو لینے دو

جہاں تک میرے مطالعہ کتب کا تعلق ہے، اساتذۂ متقدمین و متاخرین کے کلام میں "ستم ایجاد" نظم دیکھا گیا ہے اور بعض مسلم الثبوت اساتذۂ ہند سے یہی سُنا بھی ہے اس لئے "ظلم ایجاد" قابل تسلیم نہیں [۵۵]۔

دیکھو انجام کہ آنکھوں میں بھر آئے آنسو — ظلم ہے یوں بھی کسی کو نہ ہنساتے جاؤ

عزیز صاحب معشوق سے مخاطب ہو کر کہنا چاہتے ہیں کہ "یوں کسی کو نہ ہنساؤ کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئیں" لیکن ردیف کی پابندی نے مجبور کر دیا کہ بجائے ہنساؤ کے ہنساتے جاؤ لکھیں [۵۶]۔

---

[۵۱] پہلے شعر میں بھلا حشو نہیں ہے، البتہ بجائے سمجھا ہے کے اگر سمجھے گا ہوتا تو بہتر تھا۔ دوسرے شعر میں عزیز حشو نہیں ہے بلکہ عزیز (تخلص) کی صفت ہے۔ تاہم یہ تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ تیسرے شعر میں لفظ بھی البتہ غیر ضروری ہے۔ چوتھے شعر میں بھی بیشک بیکار ہے۔ پانچویں شعر میں تو اور کہ دونوں درست ہیں (اڈیٹر)

[۵۲] غالباً یہ تکلیف کہ محبوب کے کوچہ سے پکڑ کر زبردستی لے آئے تاکہ جنون کا مداوا کریں (اڈیٹر) [۵۳] یقیناً یہ ٹکڑا کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر اس کے معنے آخری وقت کے ہیں تو زیادہ مہمل ہے (اڈیٹر) [۵۴] جو یقیناً غلط ہے۔ (اڈیٹر) [۵۵] اگر ظلم و ستم دونوں مترادف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ستم ایجاد تو صحیح ہو اور ظلم ایجاد غلط۔ ستم ایجاد ان محاوروں میں نہیں ہے جن میں تصرف نادرست قرار دیا جائے۔ (اڈیٹر) [۵۶] اگر ردیف کی پابندی نہ ہو تو دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے "ظلم ہے یوں بھی کسی کو نہ ہنسائے کوئی"۔ صحیح مفہوم صرف ہنساؤ سے بھی نہیں پیدا ہوتا۔ (اڈیٹر)

کھینچ کر آہ اڑا دونگا ورق کو تیرے　　اے زمانہ کی روش تجھکو بہت ناز نہ ہو

عزیز صاحب کے کلام میں اکثر ایسی ہی انوکھی ترکیبیں ہوتی ہیں کہ شعر مہمل ہو جاتے ہیں۔ "زمانہ کی روش کا ورق" شائد ہوتا ہو لیکن صرف زمانہ کا ورق کبھی سننے میں نہیں آتا۔ اسی طرح "ناز نکر" کی بجائے "ناز نہو" کہنا بھی مناسب نہیں[۵۱]۔

آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا　　مگر ان کو کہ جنھیں طاقت پرواز نہ ہو

"نہیں" یا "نہ تھی" کہنے کی جگہ "نہو" کہدیا گیا جو درست نہیں[۵۲]۔

تمنا وصل کی تھی جس کو سمجھے دم نکلتا ہے　　یہی ارمان ہے جو زندگی میں کم نکلتا ہے

مصرع اولیٰ میں تمنا کہنے کے بعد مصرع ثانی میں "ارمان" کی کیا ضرورت رہتی[۵۳]؟

ہاں ملادے دشت کو اے وسعتِ شوقِ جنوں　　ہے بہت کم اپنے کاشانے کی بربادی مجھے

"مجھے" بمعنی "میرے لئے" کہکر محاورہ میں اضافہ کیا گیا[۵۴]۔

یارب ایسے رشک کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہیں　　خود نہیں منظور اسکے گھر کی دربانی مجھے

"کچھ" کے بعد "کہیں" کی ضرورت کو عزیز صاحب ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں[۵۵]۔

اے خدا اس بزم میں اس بیکسی کی داد دے　　میں اکیلا اک طرف اور ساری محفل ایک ہے

"اس بزم" کی بجائے "انکی بزم" کہتے تو خیر کوئی معنی نکل سکتے تھے، یہ کیا؟ "میں اکیلا اک طرف اور ساری محفل ایک ہے" "اکیلا اک طرف" کی ساتھ مصرع کے توازن کا خیال رکھتے ہوئے "ساری محفل اک طرف" کہنا چاہئے تھا[۵۶]۔

چراغِ راہ نہ بن نوردیدۂ یعقوب　　کہ دشتِ عشق میں ہے یوں ہی جستجو ہوتی

مصرع ثانی میں "ہے" اور "ہوتی" کا فاصلہ، فن شاعری میں سخت معیوب ہے[۵۷]۔

ہے یہ وقتِ امتحانِ چشمِ تر　　رونے والے آبرو رہ جائیگی

"اگر تونے اشکباری کی" یا اسی قسم کا کوئی دوسرا جملہ اضافہ کئے بغیر مفہوم شعر کی تکمیل نہیں ہوتی[۵۸]۔

---

[۵۱] "زمانہ کا ورق" اور "زمانہ کی روش کا ورق" دونوں غلط ہیں تاوقتیکہ پہلے زمانہ کو کسی ایسی چیز سے منسوب نہ کریں جس میں ورق پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں۔ "ورق کتاب دہر" بیشک درست ہے۔ ناز نہو میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہاں "نہ ہو" "نہ ہونا چاہئے" کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [۵۲] یقیناً نامناسب ہے۔ (اڈیٹر) [۵۳] ارمان کی تکرار دوسرے مصرعہ میں نادرست نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [۵۴] فارسی میں تو بیشک مرا اس معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن اردو میں مجھے کا استعمال اس مفہوم میں یقیناً غلط ہے۔ (اڈیٹر) [۵۵] اگر کہیں کی جگہ بھلا ہوتا تو بہتر تھا۔ (اڈیٹر) [۵۶] اعتراض درست ہے۔ (اڈیٹر) [۵۷] علاوہ اس کے دوسرا عیب اس شعر میں یہ ہے کہ یونہی کا صرف سمجھ میں نہیں آتا۔ (اڈیٹر) [۵۸] دوسرے مصرعہ کو حقیقتاً اس مفہوم کے ساتھ پیش کرنا چاہئے تھا کہ "اگر تو نہ رو دیا تو آبرو رہ جائیگی" لیکن بجائے منفی جملہ شرطیہ کے مثبت استعمال کیا گیا جس نے شعر کی قوت کو بہت کم کر دیا۔ علاوہ اس کے جیسا کہ معترض کا اعتراض ہے پورے ایک فقرہ کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ (اڈیٹر)

یقین ہے مجھ سے ملاقات اُس سے ہو جائے — تیری تلاش میں پہلے جو آپ کھو جائے

مصرع اولیٰ میں "اُس سے" کی بجائے "اس کی" ہونا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں پہلے کا اضافہ بھی بیکار ہے[1]

دکھاؤں کس کو میں زورِ عشق طاقت جذب کامل کی — کھچے بیٹھے ہیں وہ یاں ٹوٹی جاتی ہیں رگیں دل کی

"جذب کامل کی طاقت" اور "یاں" کی تو کیا تعریف کی جائے، یہ شعر ہر صاحب عقل و فہم کی سمجھ سے ارفع و اعلیٰ ہے معلوم نہیں کہ "طاقت جذب کامل" کی داد خواہی ہے یا "دل کی رگیں ٹوٹنے" کا افسوس[2]۔

یاد آ ہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی — سب کیجئے جہاں میں محبت نہ کیجئے

"سب" کی بجائے کسی صورت سے "سب کچھ" کہا جاتا تو مصرع ثانی بامعنی ہو سکتا تھا۔ مصرع اولیٰ میں "ہی" اور "کبھی" کے بعد "بھی" کی کیا ضرورت رہی[3]!

برق سے خورشید سے گلہائے رنگارنگ سے — مختلف شکلوں سے صورت اُس نے دکھلا دی مجھے

"دکھلا دی" اول تو متروک ہے دوسرے معنی و مفہوم کے لحاظ سے "دکھلائی" کی جگہ "دکھلا دی" استعمال کیا گیا[4]۔

دہرا رہے ہو تم جسے تلوار ٹیک کر — تقریر کیا یہی تھی کسی عذر خواہ کی

"ٹیک کر" یہ لفظ اکثر گاؤں کے باشندوں کی زبان سے سننے میں آیا کرتا تھا آج معلوم ہوا کہ اہل لکھنؤ کے یہاں بھی مروج ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے قطع نظر کی جائے تو شعر میں شروع سے آخر تک "تلوار ٹیکنے" کی نہ وجہ معلوم ہوئی نہ جگہ۔ خدا جانے مقصد کیا ہے[5]؟

صبح ہجراں ہے نسیم سحری آتی ہے — سانس کچھ کچھ ابھی بیمار میں بھی آتی ہے

"بیمار کے سانس آنے کی" علت؟ صبح ہجراں میں نسیم سحری کی آمد سے بیمار میں سانس کیونکر آئے گی؟ معلوم ہوتا ہے کہ مطلع بنانے کے لئے "سحری" کے قافیہ کے لئے "بھی" کا استعمال کیا گیا جو یقیناً بلا ضرورت ہے[6]

کوئی سیاح خرابے پہ مرے جب گزرا — غور سے دیر تک اُس نے وہ مکاں دیکھا ہے

کوئی خرابے پہ "گزرتا ہے" یا خرابے سے؟ "خرابے" بمعنی ویران جگہ، جو مقام ویران ہو اس کو مکان کیسے کہہ سکتے ہیں؟ "دیکھا" کے ساتھ "ہے" کی ضرورت جبکہ مصرع اولیٰ میں صرف "گزرا" لکھا گیا[7]۔

---

[1] اعتراض بالکل درست ہے۔ (اڈیٹر) [2] یہ شعر اپنے معنے کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جذب کامل کی طاقت دکھانا چاہتا ہے۔ درانحالیکہ دوسرے مصرعہ میں "کھنچے بیٹھے ہیں وہ" کہکر بجائے طاقت کے اسکا ضعف ثابت کیا جا رہا ہے۔ (اڈیٹر) [3] "سب کچھ" ہوتا تو بہتر تھا۔ دوسرا اعتراض درست نہیں۔ (اڈیٹر) [4] "دکھلا دینا" کیوں متروک مانا جائے۔ (اڈیٹر) [5] ٹیکنا محاورہ ہے اور اہل لکھنؤ کا۔ تلوار ٹیکنے کی حالت بطور محاکات دکھائی ہے۔ تاکہ قاتل یا محبوب کی "وضع خون آشامی" پر روشنی پڑے۔ دونوں اعتراض غلط ہیں۔ (اڈیٹر) [6] اس شعر پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں "آتی ہے" بجائے "باقی ہے" کے استعمال کیا گیا ہے۔ یوں نہیں بولتے کہ "بیمار میں ابھی سانس آتی ہے" بلکہ "سانس باقی ہے" کہتے ہیں۔ (اڈیٹر) [7] مکان بمعنی جگہ یا مقام استعمال کیا گیا ہے۔ جو استعمال نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ دوسرے مصرعہ میں "ہے" یقیناً بیکار ہے۔ (اڈیٹر)

کب سے دکھا رہا ہوں دل داغ داغ کو　　　کچھ تو نگاہ ناز سے تنقید کیجئے

"کو" کا بے محل استعمال داد طلب ہے اگر "کو" کی جگہ "میں" کہدیا جاتا تو کسی حد تک یہ عیب دور ہو سکتا تھا۔[1]

دیدنی ہے بزم مے میں دورِ دورِ بیخودی　　　رند ادھر بیہوش ہیں ساقی ادھر بیہوش ہے

"بزم مے میں" تین میم کا اجتماع اور اسپر "دور" کی تکرار لائق صد تحسین و مرحبا ہے۔ شاعر نے "دور دورۂ بیخودی" کی لطیف مرکب کو "دور دورِ بیخودی" کے کثیف مرکب سے تبدیل کرکے اور ظلم کیا۔[2]

اُف ری گرمی آفتاب حسن محشر خیز کی　　　دیکھتا ہوں جس کو میں غرق عرق تا دوش ہے

"آفتاب حسن محشر خیز" کی پاکیزہ ترکیب کا کیا کہنا! اُس پر "تا دوش" کا اضافہ اور بھی لطف دے رہا ہے۔ پسینے میں کاندھے تک غرق ہو جانا بھی شان استادی ہے۔[3]

یہ مشورہ ہم اُٹھے ہیں چارہ جو کرتے　　　اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

"مشورہ" باہم ہی ہوا کرتا ہے نہ کہ تنہا۔ پھر "ہم" کی کیا ضرورت رہی؟ "چارہ جو کرتے" خلاف محاورہ ہے "چارہ جو کرکے" کہنا چاہئے تھا۔[4]

ہوئی ہے دیر کہ کچھ ہوش بخیہ گر کو نہیں　　　کہو کہ زخم جگر میں یہ کیا رفو کرتے

حالت مفعولی میں ہمیشہ اسم جمع "وں" کے ساتھ آتا ہے، اس لئے بجائے "بخیہ گروں" کے صرف "بخیہ گر" لکھکر اس سے جمع مراد لینا قاعدہ کے خلاف ہے اور اگر اسے واحد تصور کیا جائے تو دوسرے مصرع میں ردیف غلط ہوئی جاتی ہے۔[5]

مجھے جب غور سے دیکھا عیادت کرنیوالوں نے　　　بساط خواب پر دھندلی سی اک تصویر نکلی ہے

"دیکھا" اور "نکلی" دونوں ہم زمانہ، پھر "نکلی" کے ساتھ "ہے" کیسا؟[6]

---

[1] معترض کے اس اعتراض سے تو مجھے اتفاق نہیں ہے، لیکن دوسرا مصرعہ معنی کے لحاظ سے ضرور محل نظر ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ تنقید نگاہِ ناز کریگی یا محبوب کریگا اس حال میں کہ نگاہ ناز صرف ہو رہی ہوگی۔ مدعا شاعر کا صرف یہ ہے کہ کب سے میں دل پُر داغ دکھا رہا ہوں، ایک نگاہ دیکھ تو لیجئے اسلئے دیکھنے کے مفہوم کو "نگاہ ناز کی تنقید" سے ظاہر کرنا محض تصنع و آورد ہے۔ (اڈیٹر) [2] مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔ بزم میں یہ بیخودی کا دور بھی ہے دیدنی۔ لفظ مے کا اظہار پہلے مصرعہ میں غیر ضروری ہے جبکہ دوسرے مصرعہ سے بزم کی نوعیت ظاہر ہے۔ (اڈیٹر) [3] "آفتاب حسن محشر خیز" میں تو کوئی حرج نہیں، لیکن دوسرا مصرعہ بالکل مہمل ہے اور تا دوش کی تعیین لغو۔ پسینہ سر سے کیوں نہیں گزر گیا۔ علاوہ اس کے مفہوم بھی کوئی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ جب مقصود واقعی پسینہ نہیں ہے تو پھر تا دوش کیا؟ (اڈیٹر) [4] اُٹھے ہیں اور کرتے کے درمیان اس قدر فصل ہے کہ مصرعہ معیوب ہو گیا علاوہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے بھی شعر ناقص ہے۔ مریض کو قبلہ رو کر دینا کوئی ایسا اہم مسئلہ نہ تھا کہ چارہ گر اس کے لئے باہم مشورہ کرنے بیٹھ جاتے کیا خود ایسا نہ کر سکتے تھے۔ (اڈیٹر) [5] علاوہ اس نقص کے بیان کی تعقید بھی پائی جاتی ہے۔ (اڈیٹر) [6] اعتراض درست ہے۔ (اڈیٹر)

گرد اڑی ہے صبح کو جو رفت و روب دیر سے کعبہ جاتے وقت وہ چہرہ پہ ملتے جائیں گے

"رفت و روب دیر" کی جدت ترکیب قابل داد ہے۔[1]

یہ درازی شب غم کی یہ بلاؤں کا ہجوم اس پر اندھیر کہ آنکھوں میں کٹی رات مجھے

"مجھے آنکھوں میں رات کٹی" کیا پاکیزہ محاورہ اور چست بندش ہے؟[2]

یہ مانا کہ فرصت بہت تم کو کم ہے ٹھہر جاؤ دم بھر ابھی دم میں دم ہے

کس کے دم میں دم ہے؟ اگر قافیہ کے ماقبل "دم" کو "مجھ" سے تبدیل کر دیا جاتا تو یہ نقص نکل جاتا۔[3]

کبھی دل میں میرے چمک سی اٹھی تھی اب ایک آبلہ آج سرتاقدم ہے

مصرع ثانی میں "اب" اور "آج" کا اجتماع قابل غور ہے۔[4]

مٹے طلسم تصور تو اب قدم اٹھیں کہ ذرہ ذرہ پہ تصویر یار راہ میں ہے

شعر کو ہزار بار نظر غائر سے دیکھا لیکن کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔[5]

دیکھ کر وہ نزع کی تکلیف ان کا التفات زندگی بھر میں ہیں راحت کبھی ایسی نہ تھی

کونسا عالم نزع؟ آخر "وہ" کا اشارہ کس طرف ہے؟[6]

دیوانہ عزیز آنکھ کو گردش دم آخر بیٹھے ہیں سرہانے ترے ارباب نظر بھی

"گردش نگاہ" کی جگہ آپ نے "آنکھ کی گردش" لکھا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "بھی" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید غیر ارباب نظر بھی بیٹھے تھے۔[8]

---

[1] پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔ گرد اڑی ہے صبح کو جو آستان دیر سے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ وہ بھی محل نظر ہے جو اُسے کی جگہ استعمال ہوا ہے (اڈیٹر) [2] مجھے، میری جگہ استعمال کیا گیا جو غلط ہے۔ شعر مفہوم کے لحاظ سے بھی ناقص ہے۔ کیونکہ جب شب غم میں بلاؤں کا ہجوم ہوگا تو "آنکھوں میں رات کٹنا" کونسی حیرت انگیز بات ہے جس پر اندھیر کی صدا بلند کی جاتی ہے۔ (اڈیٹر) [3] یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ شعر کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ کس کا دم مراد ہے۔ (اڈیٹر) [4] اس نقص کے علاوہ دوسرا نقص یہ ہے کہ "سرتاقدم" آبلہ کون ہے دل یا خود شاعر؟ اگر دل مقصود ہے تو سرتاقدم کہنا مہمل بات ہے اور اگر اس سے مراد شاعر ہے تو دوسرے مصرعہ میں بجائے ہے کے "ہوں" ہونا چاہئے۔ اگر ہے کا فاعل چمک کو قرار دیا جائے تو بیشک تاویل ہوسکتی ہے لیکن مصرعہ کے الفاظ سے جو انتشار خیال پیدا ہوتا ہے اس کا کیا علاج؟ (اڈیٹر) [5] شعر کا مفہوم ظاہر ہے۔ مدعا یہ ہے کہ چشم تصور نے ہر ہر ذرہ کو تصویر یار بنا دیا ہے اس لئے جب تک طلسم تصور نہ مٹے قدم کیونکر اٹھ سکتے ہیں۔ (اڈیٹر) [6] پہلا مصرعہ بری طرح نظم کیا گیا ہے۔ یوں ہونا چاہئے تھا۔ نزع کی تکلیف میں بھی یہ وہ ان کا التفات (اڈیٹر) [8] معترض کا اعتراض غلط ہے "آنکھ کو گردش دینا" نہ خلاف محاورہ ہے نہ خلاف واقعہ۔ رہا غیر ارباب نظر کا [illegible] بھی ممکن نہیں۔ (اڈیٹر)

معاذ اللہ کچھ پوچھو نہ میرے دل کی بربادی   نگاہوں میں مرے ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے

میری نگاہوں میں ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے" کیا معنی؟ "نگاہوں میں ہے" کہنا چاہئے تھا۔[۵۱]

مری مردہ حسرتوں پر وہ ہیں کہاں ہنسنے والے   کوئی نوحہ خوان آئے کوئی اشکبار آئے

"نوحہ خوان" کے نون کی کیا داد دی جا سکتی ہے[۵۲]؟

الٰہی وہ شفق بنکر دیارِ حسن میں پھوٹے   برابر خونِ دل جو صبح سے تا شام آتا ہے

اردو اور فارسی میں "از صبح تا شام" یا "صبح تا شام" نظر سے گزرا ہے شائد اب "صبح سے تا شام" جدید محاورہ کا اضافہ کیا گیا ہو۔ "خونِ دل" نہیں معلوم منہ سے نکلتا ہے یا آنکھوں سے یا کہیں اور سے، شعر میں تو کوئی صراحت نہیں[۵۳]۔

مگر ہم آج جذبِ خاک دامنگیر دیکھیں گے   زمین کوئے جاناں تری تاثیر دیکھیں گے

مصرعہ اولیٰ میں "مگر" کی افزائش کتنی اچھی معلوم ہوتی ہے[۵۴]!

مزہ نہ دیگی بھلا تم سے داستاں میری   کہاں زبان تمھاری کہاں زباں میری

"بھلا" کو نظر انداز کرنے پر بھی مصرع ثانی میں "زبان" میں ایک جگہ نون معلن اور دوسری جگہ نون غنہ کا استعمال کیا گیا ہے[۵۵]۔

جس کو سمجھ رہا ہوں کہ میری حیات ہے   بگڑے وہ بات بات پہ کہنے کی بات ہے

بغیر اس کے کہ عزیز صاحب نے تین جگہ "بات" نظم کر دیا اور کیا فائدہ ہوا دونوں مصرعوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے "کہنے کی بات ہے[۵۶]" یا "نہیں" اسی طرز پر ایک اور شعر سنکر لطف اندوز ہو جئے۔

آج کل تیار اُن کا ہاتھ ہے   دل اڑا دینا بھی کوئی بات ہے

"تیار" بمعنی موجود، حاضر، "ہاتھ کا تیار" ہونا کیا معنی! "ہاتھ" ہائے مخلوط پر ختم ہوتا ہے نہ کہ تائے فوقانی پر، بات، رات، کے ساتھ قافیہ کر لینا خاندان داغ کے علاوہ جائز نہیں[۵۷]۔

وہ دن رہے عزیز نہ وہ رات رہ گئی   اہل نظر میں صرف مری بات رہ گئی

"دن رہے" کی ساتھ "رات رہی" کہنا چاہئے تھا[۵۸]۔ اسی طرز پر ایک اور شعر فرماتے ہیں۔

---

[۵۱] یقیناً آتا ہے بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ (اڈیٹر) [۵۲] اعلان نون بالکل غلط ہے۔ (اڈیٹر) [۵۳] اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ لفظ برابر نہایت نامناسب جگہ لایا گیا ہے۔ (اڈیٹر) [۵۴] مگر کا استعمال کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ لیکن شعر مفہوم کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے۔ (اڈیٹر) [۵۵] بھلا کا استعمال بالکل صحیح ہے اور زبان میں ایک جگہ نون معلن اور دوسری جگہ نون غنہ کا استعمال بھی غلط نہیں۔ (اڈیٹر) [۵۶] مجھے اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ محبوب کو جان کہا جاتا ہے یا حیات! (اڈیٹر) [۵۷] ہاتھ، نظم میں بات کے ساتھ آسکتا ہے اور ہاتھ کا تیار ہونا محاورہ ہے جس کے معنے مشاق کے ہیں۔ (اڈیٹر) [۵۸] اس اعتراض سے مجھے اختلاف ہے۔ (اڈیٹر)

حد ہوئی مشق ستم کی آپ کے حد ہو گئی کوئی بھی وہ سرزمیں ہے جس جگہ تربت نہیں

اس میں بھی ایک جگہ "حد ہوئی" اور دوسری جگہ "حد ہو گئی" کہا گیا[۱]۔

کون سنتا ہے جناب شیخ کی اب زمانہ آج کل آزاد ہے

"اب" اور "آج" کا اجتماع قابل ملاحظہ ہے[۲]۔

منزل ہستی میں اے آئندگان رفتنی دیکھتے جانا ٹھہر کر خانہ ویرانی مری

"آئندگان رفتنی" کی پاکیزہ ترکیب کی کوئی کیا داد دیسکتا ہے؟ "اے جانے کے لائق آنے والو" تجدید کی حد ہو گئی[۳]!

جبہ سائی نے ابھارا سوز دل کو اس قدر سنگ در سے اُن کے لو دے اٹھی پیشانی مری

"پیشانی کا لو دینا" کوئی محاورہ نہیں۔ اگر شمع پیشانی کہا جاتا تو درست ہو سکتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اظہار مفہوم میں مجبور ہے جس کی وجہ سے شعر اچھا خاصہ معما بن گیا[۴]۔

مضمون طوالت پکڑتا جاتا ہے لہذا ذیل میں پانچ سات شعر ایسے درج کر کے ختم کرتا ہوں جن میں حشو قبیح نمایاں ہے[۵]

کون سنتا ہے درد دل کو عزیز کس سے یہ شکوہ و شکایت ہے

کچھ تو ہے بیٹھے ہوئے ہیں واعظان شہر سب ورنہ میخانہ میں تو صحبت کبھی ایسی نہ تھی

ہے یہ بھی خبر جذبۂ تاثیر کے مالک محتاج ہے تیرا کوئی مایوس اثر بھی

ارباب عشق میں تھا باہم آج مشورہ اک مقبرہ عزیز کا تعمیر ہو نہ جائے

کہتی ہے روح نزع میں رستہ دکھا چکے جاتے ہیں ہم خود آپ ہاں وہ تو آ چکے

ترے وعدے کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں وہ مریض زندگی ہے جسے اعتبار آ ہے

مانا کہ درد دل کی جہاں میں دوا بھی ہے اے چارہ گر بتا کہ کوئی شے قضا بھی ہے[۵]

شاد صابری

۱؎ حد کی تکرار اچھی نہیں ہے ۔ (اڈیٹر) ۲؎ اب اور آج کل کا اجتماع نامناسب ہے ۔ (اڈیٹر) ۳؎ یقیناً تغزل میں ایسی ترکیبوں کا استعمال موزوں نہیں ۔ (اڈیٹر) ۴؎ محاورہ کا بیان کوئی ذکر نہیں کہ اس پر نگاہ کی جائے ۔ لیکن مفہوم کے لحاظ سے ضرور تھوڑا سا نقص پایا جاتا ہے ۔ اور وہ یہ کہ جب سوز دل جبہ سائی کی وجہ سے اُبھرا تو پیشانی کیوں لو دے اٹھی ۔ پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا۔ "سوز دل نے جبہ سائی کو اُبھارا اس قدر" ۔ (اڈیٹر) ۵؎ ان میں سے کسی شعر میں حشو قبیح نہیں ہے ۔ (اڈیٹر)

ایک فٹ عمیق جگہ کی ضرورت ہے تو نہایت آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی ایسی مکعب جگہ میں جس کے ایک ضلع کا طول نصف میل ہو ایک ارب پچاس کروڑ انسان سے زیادہ سما سکتے ہیں۔

کاغذی دودھ

حال ہی میں ڈنمارک کے کسی کاشتکار نے ایک عجیب و غریب اختراع غذا کی دنیا میں کی ہے یعنی وہ دودھ کو کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے جو بہت عرصہ تک خشک و محفوظ رکھا جا سکتا ہے اس کا بیان ہے کہ اگر اس کے اصول کے مطابق ورق شیر طیار کئے جائیں تو وہ سالہا سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اسی قسم کا ایک ورق گرم پانی کے ایک پیالہ میں ڈالنے سے نہایت نفیس دودھ تیار ہو گیا جو مزہ اور خوشبو میں بالکل تازہ دودھ کی طرح تھا۔ اب ڈنمارک میں مستقلاً ایک کمپنی اس صنعت کے لئے قائم کی جا رہی ہے۔ جس میں یہ کاغذی دودھ تیار کیا جائیگا اور ڈبوں میں بند کر کے دنیا کے تمام بازاروں میں بھیجا جائے گا۔

جاپان کی آبادی کا حیرت انگیز نشو و نما

جاپان میں جس نسبت سے انسانی آبادی بڑھ رہی ہے اُس کی مثال کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ گذشتہ سال وہاں کی مردم شماری سے یہ تحقیق ہوا ہے کہ صرف جزیرۂ جاپان میں اس وقت چھ کروڑ چالیس لاکھ چار ہزار انسان آباد ہیں۔ جاپانی نوآبادیوں کی آبادی اس کے علاوہ ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جتنی آبادی جاپان میں پائی جاتی تھی اس میں اب سینتالیس لاکھ تیرہ ہزار ایک سو اسی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے اتنی ہی مدت میں صرف سینتیس لاکھ تیرہ ہزار سات سو اَنتھر آدمیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ جاپان میں ہر سال تقریباً سولہ فی ہزار کا اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اقتصادئین کی رائے ہے کہ جاپان کی آبادی بہت جلد دس کروڑ تک پہنچ جائے گی اور دول کبریٰ میں آبادی کے لحاظ سے اس کا تیسرا درجہ ہو جائیگا۔ لیکن اسی کے ساتھ جو اقتصادی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی وہ بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہیں اور غالباً یہی وہ خیال ہے جو جاپان کو چین کے خلاف جنگ کرنے اور منچوریا میں اپنے اثرات وسیع کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔



قیمت

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ [illegible] قیمت [illegible]

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا [illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ مشہور افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا [illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

فراست الید
مولانا نیاز فتحپوری [illegible] ہاتھ کی شناخت [illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کی لکھی ہوئی [illegible] کیفیات اس ایک جلد میں موجود ہیں [illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ [illegible] کے ساتھ [illegible] شاعری کے [illegible] قیمت [illegible]

صحابیات
[illegible] قیمت علاوہ محصول [illegible]

[illegible]
[illegible] افسانوں کا مجموعہ [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز [illegible] کا عجیب و غریب ذخیرہ [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز [illegible] فلاسفۂ قدیم کی [illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
[illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول

المسلم الشرقی
[illegible] قیمت [illegible]

تذکرۂ خندۂ گل
[illegible] محصول [illegible]

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

مثنوی لالہ رخ
[illegible] قیمت [illegible] محصول [illegible]

مثنوی زہر عشق
[illegible]

فراست التحریر
[illegible] قیمت [illegible] علاوہ محصول۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ۔ ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۶	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۲ء	جلد ۲۲

اس اعلان کے علاوہ جتنے اور اعلانات و اشتہارات جنوری ۳۳ء کے نگار کے تعلق اس اشاعت میں یا اس سے قبل شایع ہوئے ہیں اُن کو منسوخ سمجھا جائے

(جنوری ۳۳ء کے خاص نمبر کے متعلق ایک اور اہم تجویز)

جس وقت یہ اعلان کیا گیا کہ جنوری ۳۳ء کا نگار مخصوص ہوگا صرف ایک موضوع "تاریخ الفحشاء" کے لئے، تو بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اس کو علحدہ کتابی صورت میں نکالنا زیادہ مناسب ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ ممکن ہے بعض حضرات اسے پسند نہ فرمائیں، بلکہ اس لئے بھی کہ تجارتی نقطۂ نظر سے اس میں دفتر کا نقصان ہے۔ میں بھی کامل غور کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچا اس لئے میں تمام ناظرین نگار کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ الفحشاء، تو علحدہ کتابی صورت میں شایع ہوگی۔ اور جنوری ۳۳ء کا نگار مخصوص ہوگا صرف حضرت نیاز کے ملاحظات و مکتوبات کیلئے جنوری کا نگار تو حسب معمول جنوری کے پہلے ہی ہفتہ میں شایع ہو جائے گا، لیکن یہ کتاب اخیر جنوری تک طیار ہوگی اور علاوہ محصول دو روپیہ میں مل سکیگی۔ لیکن خریداران نگار اس کو نصف قیمت میں حاصل کر سکیں گے۔

جس طرح جنوری کا نگار حضرت نیاز کا مجموعۂ ملاحظات ہونے کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہوگا، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک نادر مجموعہ معلومات جنسی کا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں کتاب زیر بحث کے متعلق چند باتیں

ضرور ذہن نشین کر لیجئے :۔

۱۔ اس کتاب میں "جنسیات" کے موضوع پر وہ سب کچھ موجود ہے جو اصولاً ہونا چاہیئے۔

۲۔ یہ نہ اس قسم کی کتاب ہے جیسی آج کل بازاروں میں "دولھا دلھن" "میاں بیوی" وغیرہ کے نام سے ہر جگہ ملتی ہیں اور نہ اس میں "تعلق جنسی" کی ترکیبیں بتا کر اس کو کوک شاستر بنایا گیا ہے۔ بلکہ نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ متین و سنجیدہ لٹریچر میں پیش کی جائے گی۔

۳۔ یہ خالص علمی و تاریخی کتاب ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ عہد وحشت سے لیکر اس وقت تک انسان کا میلان معصیت کیونکر رونما ہوا، اس ذوق نے کس طرح ترقی کی اور اس کے اسباب ترقی کیا تھے

۴۔ اس کتاب میں یہ بتایا جائے گا کہ آج کل علم و تہذیب کی دنیا جس تمدن پر فخر کر رہی ہے اور مغرب جس چیز کو ترقی سے تعبیر کر رہا ہے، وہ کس قدر اخلاق شکن اور کس درجہ بہیمیت کرنے والا ہے۔

۵۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبوں میں، عالم کے تمام مذاہب میں، صرف ایک ہی ادارۂ تہذیب ایسا تھا جس نے فحاشی کو پوری طرح روکا، صرف ایک ہی دین ایسا تھا جس نے اس کا سدباب کیا اور وہ اسلام تھا۔

۶۔ اس کتاب میں واقعات عالم، نفسیات انسانی اور شواہد تاریخی کی بنا پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جنسی معاصی کے روکنے کی بہترین تدبیر وہی ہو سکتی تھی جو اسلام نے مخصوص اصول ازدواج مقرر کرنے کے بعد اختیار کی۔

۷۔ یہ کتاب کسی مذہب سے بحث نہیں کرتی کسی خاص جماعت سے خطاب نہیں کرتی بلکہ عمومی طور پر انسان قدیم سے لیکر موجودہ عہد کے انسانی تمدن کے قوانین حیات کو سامنے رکھکر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دنیا ترقی کا نام لیکر کس قدر قعر مذلت میں گرتی جا رہی ہے

اور اس سے بچنے کا واحد ذریعہ کیا ہے۔

۸۔ یہ کتاب فی الحقیقت ایک نشتر ہے اُس فاسد مادہ کے لئے جو آج کل کے نوجوانوں میں پیدا ہو رہا ہے اور علاج ہے اُس خود سری، آزادی اور بے راہ روی کا جس نے اخلاق و مذہب دونوں کے صحیح مفہوم کو پس پشت ڈال دیا ہے

۹۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نظام عالم میں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کیسے نامضبوط و ناکافی ثابت ہوتے ہیں اور دنیا میں انسان کو صحیح "درس انسانیت" دینا صرف مذہب کا کام ہے جس کی حکومت ظاہری اعضا پر نہیں بلکہ انسان کے دل پر، انسان کی روح پر قائم ہوتی ہے۔

۱۰۔ یہ کتاب مغرب کی تہذیب اور مغرب کے اخلاق کو بے نقاب کرنے والی ہے اور ملک کے نوجوانوں کے سامنے ایک درس عبرت و بصیرت پیش کرنے والی ہے تاکہ اُن کے اخلاق درست ہوں اور وہ سوچیں کہ کیا انسان اُسی جانور کا نام ہو سکتا ہے جس سے ایسی ایسی ناشائستہ حرکات سرزد ہوں۔

منی آرڈر کے ذریعہ سے چندہ بھیجنے میں آپ کو چار آنے کی بچت ہے کیونکہ منی آرڈر میں آپ کے پانچ روپیہ دو آنے صرف ہوں گے اور وی پی آپ کو پانچ روپیہ دیکر وصول کرنا پڑے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے جو مناسب معلوم ہو اسپر عمل کیجئے۔

جو صاحب نگار کی خریداری اب جاری رکھنا نہیں چاہتے وہ زحمت فرما کر مطلع فرما دیں تاکہ اُن کو وی پی نہ بھیجا جائے۔ کیونکہ اگر وی پی واپس آیا تو دفتر کو بہت کا نقصان ہوگا۔ آپکے اخلاق سے اُمید ہے کہ اس التجا کو رد نہ فرمائیں گے۔

اسی کے ساتھ ایک استدعا اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر نگار کی خدمت آپ کے نزدیک کوئی وقعت رکھتی ہو تو زیادہ نہیں صرف ایک خریدار اپنے حلقۂ اثر میں پیدا کر کے ہماری حوصلہ افزائی فرمایئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے ملاحظات ختم کرتے ہوئے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس ماہ کی اشاعت میں، مسلمانوں کے موجودہ حالات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے انجام پر غور کروں گا کہ اس کے آثار اس وقت کیا نظر آرہے ہیں اور مستقبل کے خطرات کو دور کرنے کی کیا تدابیر ہوسکتی ہیں - ہر چند اس موضوع پر ملاحظات کے آٹھ صفحات یوں بھی کسی طرح کافی نہ ہوسکتے تھے، لیکن اس مرتبہ منیجر نے تین صفحے مجھ سے چھین کر، میرے لئے میدان کو اور زیادہ تنگ کر دیا - اس لئے کسی مختتم گفتگو کی توقع قائم کئے بغیر، آپ چند ابتدائی باتیں اس اشاعت میں سن لیجئے، اس کے بعد تو پھر مسلسل مجھے کئی اشاعتوں تک اس سلسلہ کو جاری رکھنا ہے -

۱- غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے - تقریباً ۲۵ کرور - اور اسی کے ساتھ غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے آپ نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے سواحل اٹلانٹک سے شروع ہوکر بحر روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہونچتا ہے، اور پھر سواحل بحر قلزم و بحر اسود سے ہوتا ہوا سائبیریا اور منگولیا تک پہونچ جاتا ہے - دوسری طرف مشرقی ساحل افریقہ سے شروع ہوکر، مڈغاسکر کے عرض البلد پر منتہی ہوتا ہے - اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستانوں کو عبور کرکے ہندوستان تک پہونچتا ہے - اور یہاں سے جزیرہ نمائے ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہونچ جاتا ہے -

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی یہ ترقی تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتاً فوقتاً اٹھتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہوگیا یعنی ۶۳۰ء اور ۷۵۰ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش سے لیکر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریباً ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا - اس کے تقریباً ڈھائی صدی بعد ۱۰۰۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لیکر، ایشیائے کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہونچ گئی - پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر اٹھی جس نے (۱۳۰۰ء اور ۱۴۰۰ء کے درمیان) جزیرہ نمائے بلقان سے لیکر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا - اور اس طرح جو نقشہ مسلم آبادی کا ۱۵۰۰ء میں قائم ہوگیا

تھا، تقریباً وہی اب بھی نظر آتا ہے۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہئے۔ بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی نگار کی کسی اشاعت میں لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب دونوں بالکل علحدہ چیزیں ہیں، یعنی دین نام ہے اس خاص اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعیات سے اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بناء پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے، سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے ماتحت دنیا میں قائم ہو جاتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے۔ اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی لفظ (Culture) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں، بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (Culture) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت اس کا ماحول کیا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف "یونانیات" ہو سکتا ہے۔ یہاں یونانیات سے مراد صرف ملک یونان کی تہذیب نہیں ہے بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً مجموعہ تھی رومہ و یونان دونوں کی تہذیب کا اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک متاثر رہنے کے بعد اپنے دور انحطاط میں بھی اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قائم تھا اور اہل عرب باوجود اس کے کہ ان کی وثنیت شدید قسم کی بُت پرستی تھی، نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے۔ اور ان کے علم و فضل و روحانیت کے قائل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اہل عرب میں بت پرستی کا خیال خود یونان و رومہ سے آیا تھا، لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنت رومہ کے اقتدار و وسعت، ہیبت و جبروت کی وہ روایات قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً ہونا چاہئے تھیں جبکہ اُس وقت بھی

قسطنطین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و روما ہی کی حکومت کو قرار دیا، لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زائل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا یعنی گو ظاہری حکومت تو اہل یوروپ کی ضرور چھن گئی، لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قائم ہو گئی، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی۔ حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو اسکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دیدیا۔ ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں میں ایک کا دوسرے سے برسرپیکار رہوجانا کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا۔ خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ و خونریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں۔ الغرض مسلمانوں کا روما و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلامی حکومت کی فتح تھی، تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جارہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قائم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہل عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اسکی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جس نے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا اور آخر کار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، وہی مغربی خصوصیت ان کی قائم ہے اور جس نے ان کے مستقبل کو مشرق میں حد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بالکل یہی مغربی ذہنیت ہے اور اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنا یوروپی اقوام کی خصوصیت خاصہ ہے۔

ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دَورِ مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہو گئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس لئے جس وقت بلائے عناد و انتقام مسلمانوں کے سر پڑ گئے تو پھر وہی اُن کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا۔

چنانچہ اس وقت بھی جبکہ ہندوستان میں ایک سخت سیاسی انقلاب کے آثار پیدا ہوگئے ہیں، بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہوکر حقیقی معنے میں خدمت وطن پر آمادہ نظر آتے ہوں، ورنہ اکثر حصہ انھیں افراد کا ہے جو انگریزوں کی طرف مائل ہیں اور ان کو ہندوؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں کس کو بہتر سمجھتا ہے تو فوراً انگریزوں کا نام لے دیگا اور دلیل یہ بیان کرے گا کہ وہ صاحب کتاب ہیں اور یہ کافر، ان کی لڑکیوں سے ہم شادیاں کرسکتے ہیں اور ان کی لڑکی سے نہیں۔ کلام پاک اُن کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں۔ الغرض وہ بہت سے اسباب و دلائل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کرسکے گا۔ پھر چونکہ مسلمانوں کی یہ ذہنیت بہت قدیم ہے اور صدیوں کی بڑی ہوئی عادت کا ترک ہونا تقریباً محال ہے، اس لئے اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی قومی و ملکی تحریکوں میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا، تو یہ اُن کی فطرت تھی، ان کی مذہبی ذہنیت کا اقتضا تھا جس میں وہ بڑی حد تک مجبور رہتے اور رہیں۔

میں نے جہاں تک مسلمانوں سے اس باب میں تبادلۂ خیال کیا ہے، اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ وہ اپنی تہذیب یا اپنے مذہب (Culture) کو بدلنے کے لئے طیار نہیں اور اُن کو یقین ہو کہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرنا اسوقت تک ممکن نہیں جب تک اُن کی سطح پر نہ آیا جائے اور ان کی سطح پر آنا اپنی قدیم تہذیب کی روایات کو صدمہ پہونچانا ہے۔

اس لئے اب سب سے پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان اپنی قدیم روایات تہذیب کو صدمہ پہونچائے بغیر کوئی ملکی یا وطنی جذبہ ہندوستان کے متعلق قائم کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو پھر نتیجہ کیا ہونا ہے۔

سوائے ہندوستان کے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے حالات پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو منطبق نہیں کرسکتے، کیونکہ ترکی، ایران، افغانستان، عرب و مصر میں نہ وہ محکوم کی حیثیت سے ہیں، نہ اجنبی اقوام میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا ملک ہے، ان کی آبادی ہے، ان کی حکومت ہے اور اس لئے اگر وہاں کے مسلمانوں کو ان کی مغربی ذہنیت، یورپ کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھکر ترقی کرسکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اگر ان کی پیروی کرنا چاہیں تو یہ کیونکر کامیاب ہوسکتے ہیں، جبکہ ہندوؤں کی بیداری نے مغربی حکومت کا جوا اپنی گردن سے علیحدہ کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی وہ اصل مسئلہ ہے جس پر ہم آئندہ بحث کرینگے۔ نیاز

ڈاکٹر - (پریشان ہوکر چیختے ہوئے) اس ہجوم پر گولی چلانے میں تمھاری کوئی زیادتی نہیں ہے" یہ جملہ تین سو ساٹھ مرتبہ تم دہرا چکے ہو!

راجکمار - (اسی طرح چیختے ہوئے) پھر تم کیوں بار بار مجھ سے وہی سوال کرتے ہو؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے - میں تم سے ہزار مرتبہ کہہ چکا کہ " اُس ہجوم پر گولی چلانے میں ....

ڈاکٹر - (گفتگو کاٹتے ہوئے) ہاں - ہاں - ہاں - سن لیا - مجھے معلوم ہے، خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ تمھاری کوئی زیادتی نہیں - تمھارا مطلق قصور نہیں ہے - اب میرا قصور بھی معاف کروگے؟

راجکمار - تمھارا کیا قصور تھا - دنیا مجھے ہی قصوروار ٹھہراتی ہے - صرف مجھے، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اُس ہجوم پر گولی چلانے میں میری کوئی زیادتی نہیں ہے -

ڈاکٹر - توبہ ہے! .... اچھا ——— تم دلیرین کی ایک خوراک اور پیو، اور ابھی پیو - (گلاس اٹھاکر مریض کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے) ٹھیک ہے .... ذرا لیٹ جاؤ (کچھ دیر بعد) اب کہو کیا حال ہے؟

راجکمار - (خستہ و ماندہ آواز میں) معلوم نہیں دلیرین مجھے کیوں اتنا سکون پہونچاتی ہے جبکہ بلی پر اس کا اثر بالکل الٹا پڑتا ہے وہ آخر کیوں اُسے پی کر چیخنے چلانے لگتی ہے؟ .... یہ .... بیشک یہ مسئلہ غور طلب ہے ——— تمھیں ڈاکٹر، واقعہ یہ ہے کہ مجھے فلاسفر بنانا چاہیے تھا -

ڈاکٹر - فلاسفر پیدائشی ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے -

راجکمار - یہ ایک عام بات ہے - ہر شخص پیدا ہوتا ہے - بنایا نہیں جاتا -

ڈاکٹر - شاباش ——— معلوم ہوتا ہے کہ اب رفتہ رفتہ تمھارے اندر سمجھ آرہی ہے آج تمھارے ہوش و حواس بالکل جلتے رہے کل سے بھی زیادہ سخت دورہ پڑا - مجھے تمھاری حالت پر بڑا افسوس ہوتا ہے کاش میں اس دماغی اختلال کو یک لخت دور کر سکتا! .... اچھا بالفرض اگر تم ہارمونیم سے دل بہلاؤ تو کیا بُرا ہے؟

راجکمار - ہارمونیم میں نہیں بجا سکتا - میری انگلیاں میرے ارادے پر کام نہیں کرتیں - اس کے علاوہ میں اب ہارمونیم کی آواز کو بھی برداشت نہیں کر سکتا - آج صبح میں نے اتفاق سے اُسے چھیڑ دیا تو بے ساختہ میری چیخ نکل گئی -

ڈاکٹر - خیر تم خود نہ سہی، کسی دوسرے بجانے والے کو کیوں نہیں بُلا لیتے؟

راجکمار - فرض کرو کہ میں اس کی آواز کو برداشت بھی کرلوں تو میں کسی بجانے والے کو بلا سکتا ہوں؟ .... تم بھی تو بجانا جانتے ہوگے؟

ڈاکٹر - اونھ ——— صرف میں ہی دنیا میں ایک شخص نہیں رہ گیا ہوں -

راجکمار - پھر؟ ——— اگر کوئی غیر شخص میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں بالکل دیوانہ ہو جاؤنگا -

سچ کہتا ہوں اس کھڑکی سے باہر کود کر خودکشی کر لونگا - میں ہارمونیم کی آواز کو برداشت ہی نہیں کر سکتا - مجھے اس سے خوف معلوم ہوتا ہے - میں اس سے نفرت کرتا ہوں - بھاڑ میں جائے -

ڈاکٹر - تو پھر بڑی مشکل آ پڑی - تم سمجھتے ہو ؟

راجکمار - کیوں مشکل کیا آ پڑی ؟

ڈاکٹر - یہ کہ جب تمھیں سرود و موسیقی سے بھی کچھ مس نہیں ہے - تو تمھارا بنیگا کیا ؟ اور کسی قابل تو تمھارا دماغ ہے نہیں -

مریض - میں شہزادگاں کی کونسل میں ہوں - تمھیں معلوم ہے کہ میں مدار المہام بھی ہوں

ڈاکٹر - یہ تو اس لئے ہے کہ تمھارا باپ راجہ ہے اور تم ولیعہد سلطنت ہو - اگر تم کسی جمہوریت میں ہوتے تو شاید جوتے صاف کرنے کے قابل بھی نہ سمجھے جاتے - سنو راجکمار اگر تم نے بڑی صحبت نہ چھوڑی اور موسیقی سے تمھیں کوئی دلچسپی نہ ہوئی تو یقین کر لو کہ مغربی سوسائٹی کے نزدیک تم بالکل مردہ ہو - میں ہز ہائینس کو مشورہ دونگا کہ وہ تمھیں ہرگز یوروپ نہ بھیجیں -

راجکمار - (چونک کر) کیا واقعی ڈاکٹر ؟

ڈاکٹر - ہاں ——— لیکن تمھارے لئے علاجِ موسیقی ابھی ذرا قبل از وقت ہے - یہ رانی صاحبہ کا خیال ہے - میرے خیال میں ابھی ایک دور دوا اور دیکھا جائے - غالباً وہ کسی مشہور ماہر موسیقی کو اس غرض کے لئے پابند بھی کر چکی ہیں ——— بہرحال اب مجھے جانا چاہئے - پھر آؤنگا - اس دوران میں جتنا تم سے آرام کیا جا سکے کرو - اگر سو نہ سکو تو کچھ پڑھو -

راجکمار - کیا پڑھوں ؟

ڈاکٹر - کوئی میگزین ——— کوئی رسالہ -

راجکمار - لیکن رسالے تو بہت خشک ہوتے ہیں - انھیں میرا دماغ برداشت نہیں کر سکتا -

ڈاکٹر - اوہ ——— تو جانے دو - بس سو رہو - میں تمھیں ایک اور خواب آور دوا دیتا ہوں (وہ جیب سے دواؤں کا کیس نکالتا ہے) راجکمار یہ کیا ہے ؟ ——— ورنال ؟

ڈاکٹر - ہاں ——— اس طرح مت ڈرو - یہ ایک پرانا نسخہ ہے - یعنی محض افیون .... لو ! (راجکمار اس کے ہاتھ سے گولی لیتا ہے)

ڈاکٹر - مجھے یقین ہے کہ یہ کامیاب ثابت ہوگی - اگر آدھ گھنٹہ بعد تم یہ محسوس کرو کہ اس سے تمھارا جوش و خروش بڑھ گیا ہے تو دوسری بھی کھا لینا - میں رکھے جاتا ہوں (وہ پلیٹ میں ایک گولی اور رکھ دیتا ہے اور دواؤں کے ڈبے کو جیب میں

ڈال لیتا ہے)

راجکمار۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر تم بہت سی گولیاں چھوڑ جاتے۔ میں گولیوں کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ شکریہ! میں تمھیں عدالتی ملزم نہیں سمجھ رہا ہوں جس کی ہر درخواست پر رعایتی نظر ڈالنا پڑتی ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا، اگر معلوم نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ افیون زہر ہے۔

راجکمار۔ بیشک افیون زہر ہے۔ لیکن گولیاں تو زہر نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر۔ بحیثیت ڈاکٹر میں گولیوں سے تمھیں متنفر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اتنی گولیاں تمھارے پاس چھوڑ بھی نہیں سکتا جن سے تم اپنا کام تمام کرلو (وہ اپنی ٹوپی سنبھالتا ہے)

راجکمار۔ مہربانی فرماکر آپ باہر جاتے ہوئے لوگوں سے کہتے جائیں کہ یہاں آنے کی کوئی صاحب زحمت نہ فرمائیں میں سچ کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی غیر آدمی میرے پاس آیا تو اس کھڑکی سے کود کر جان دیدونگا۔ تم جانتے ہو کہ میں اجنبی آدمیوں کو مطلق برداشت نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر۔ فی الحال تمھیں مار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ کوئی نہیں آئے گا۔ اچھا خدا حافظ! (وہ وسطی دروازے کی طرف قدم بڑھاتا ہے)

راجکمار۔ تم اس دروازے سے نہیں جاسکوگے میں نے رانی صاحبہ سے کہکر اس میں قفل لگوا دیا ہے اور کنجی انہی کے سپرد کردی ہے۔ مجھے بالکل اطمینان ہے کہ کوئی شخص اس دروازے سے اندر نہیں آسکتا جبتک کہ خود رانی صاحبہ اسے کنجی نہ دیں۔

ڈاکٹر (واپس لوٹ کر) ٹھیک ہے۔ اچھا! .... اب اپنی روانگی سے پہلے میں تمھیں بحالت آرام دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے جانے سے قبل تمھیں سوجانا چاہئے۔ (راجکمار کروٹ پھیر کر سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر دبے پاؤں چھوٹے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اور چپکے سے باہر نکل جاتا ہے)

راجکمار (یکایک مجنونانہ انداز سے اٹھکر، ہارمونیم کی طرف خوفزدہ تکتے ہوئے) ڈاکٹر! ڈاکٹر!! دوڑو! مجھے بچاؤ!!

ڈاکٹر۔ (تیزی سے کمرے میں داخل ہوکر) کیا ہوا خیر ہے؟؟

راجکمار۔ (ہارمونیم کی طرف دوبارہ مشتبہ نگاہیں ڈال کر) کچھ نہیں! (پھر سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے)

ڈاکٹر۔ ایسا کچھ نہیں۔ ضرور کچھ نہ کچھ بات ہے ورنہ تم اس طرح نہ پکارتے (اس کا ہاتھ کھینچکر اپنی طرف کروٹ دلاتے ہوئے) ادھر دیکھو! ———— بتاؤ کیا افتاد پڑی؟

راجکمار۔ کچھ نہیں! اب تو چلا گیا۔

ڈاکٹر۔ کیا چلا گیا؟

راجکمار - گھڑیال!

ڈاکٹر - گھڑیال؟!!

راجکمار - ہاں گھڑیال! اُس نے پہلے تو مجھے دیکھ کر قہقہہ لگایا اور پھر اپنی دُم سے ہارمونیم بجانا چاہتا تھا

ڈاکٹر - صرف افیون کا کرشمہ ہے! ذرہ کم مقدار میں تمھیں موافق نہیں آئی میرے عزیز دوست تمھیں دوسری گولی بھی ابھی کھانی پڑے گی - (پلیٹ سے دوسری گولی اٹھاتے ہوئے)

راجکمار - لیکن اگر ایک مرتبہ دو گھڑیال آگئے - تو؟!

ڈاکٹر - بیوقوف ہو! اب نہیں آئیں گے - اگر کوئی چیز آئی بھی تو اس مرتبہ وہ ضرور کوئی خوبصورت چیز ہوگی - افیون کا یہی قاعدہ ہے کہ وہ اسی طرح اثر کیا کرتی ہے - بہرحال دس منٹ کے اندر تمھیں ضرور نیند آجائیگی - لو! اسے بلا تامل نگل جاؤ!

راجکمار - (گولی نگلنے کے بعد) واقعی میں نے بڑی بزدلی دکھائی - لیکن ڈاکٹر یہ واقعہ ہے کہ میں نے اس گھڑیال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا -

ڈاکٹر - دیکھا نہ ہوگا - اس چیز کے متعلق پریشان ہونا فضول ہے جسے بند آنکھوں سے دیکھا جائے -

راجکمار - یہ صحیح ہے ——— اچھا تم جا رہے ہو - خدا حافظ .... ذرا سننا، تمھیں تکلیف تو ہوگی لیکن جانے سے پہلے ذرا اس صوفے کے نیچے اور دیکھتے جاؤ - کہیں وہ کمبخت اُس کے نیچے نہ چھپا بیٹھا ہو ———

ڈاکٹر - آپ خود ہی تکلیف فرمائیے - اور زیادہ اطمینان ہو جائیگا -

راجکمار - میری تو ہمت نہیں پڑتی -

ڈاکٹر - احمق کہیں کا ——— (صوفے کے نیچے دیکھ کر) بالکل میدان صاف ہے - کسی گھڑیال وغیرہ کا پتہ نہیں ہے - بالکل پاؤں پھیلا کر سو ؤ ——— خدا حافظ - (وہ باہر چلا جاتا ہے)

راجکمار آنکھ بند کرکے لیٹ جاتا ہے - پانچ منٹ کے بعد وسطی دروازے کا قفل کھلتا ہے اور ایک نوجوان حسین عورت اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا گچھا لئے ہوئے داخل ہوتی ہے اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتی ہے - پھر جیب سے ایک خط نکالتی ہے اور اُسے پڑھتے ہوئے بار بار کمرے کی سمت میں نگاہ ڈالتی جاتی ہے - ہارمونیم دیکھ کر ایک اطمینان کا سانس لیتی ہے - راجکمار کو سوتا ہوا دیکھ کر بھی اُسے کوئی تعجب نہیں ہوتا - وہ اُس سے مخاطب ہونا بیکار سمجھتی ہے - بالآخر جب اُسے پورا اطمینان اس امر کا ہو جاتا ہے کہ وہ ٹھیک پتہ پر آئی ہے تو وہ ہارمونیم کے پاس آجاتی ہے اور باہر کمرے سے ہوتے ہوئے شائقین کے انداز کی طرح بڑھاتی ہے کہ پہلے پھولوں کا گچھا شمعدان پر

رکھتی ہے پھر اپنے دستانے نزاکت سے اُتار کر پھولوں کے پاس رکھ دیتی ہے - پھر انگلیوں سے جواہرات کی انگوٹھیاں نکال کر احتیاط سے جیب میں رکھ لیتی ہے پھر بورڈ اٹھا کر سُروں پر ایک مبصرانہ نگاہ ڈالتی ہے اور کرسی پر بیٹھ کر آہستہ سے دھونکنی پر پاؤں جما دیتی ہے ——— غرض ایک پیشہ ور ماہر فن کے وہ تمام ارکان پورے کرنے کے بعد جو وہ اپنے فن کی نمائش سے قبل بطور فرض ادا کرتے ہیں ——— وہ بالآخر ہارمونیم پر اپنی انگلیاں رواں کر دیتی ہے اور نہایت ہی دل کش طرز میں ایک راگ چھیڑ دیتی ہے ——— راگ کی آواز پر راجکمار چیخ مار کر چونک اُٹھتا ہے - اور سوفے سے گر کر خوفناک آوازیں نکالتے ہوئے فرش پر لوٹنے لگتا ہے -

نوجوان حسینہ یکایک اپنا ہاتھ روک لیتی ہے اور حیرت و استعجاب سے اس کی صورت دیکھنے لگتی ہے -

راجکمار - اوہ ! اوہ ! اوہ !! ——— گھڑیال ——— مگر مچھ ——— ارے دوڑو ——— بچاؤ ——— ٹھہرو (وہ آنکھیں پھاڑ کر بغور ہارمونیم کی طرف دیکھتا ہے اور نوجوان حسینہ پر اپنی نگاہیں گاڑ کر زیر لب کہتا ہے) ایں ؟ .... اچھا ——— یہ بات ہے !

نووارد حسینہ - اس بیہودہ شور و شغب کا کیا مطلب ہے ؟ خصوصاً اس وقت جبکہ میں اپنا آرٹ دکھا رہی ہوں - مجھے تمھاری جسارت پر حیرت ہے - کیا تم بالکل خارج از عقل ہو ؟ کیا تمھیں عمر بھر کسی سوسائٹی میں بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا ؟ ——— جواب دو - !

راجکمار - (فرش پر بیٹھے ہوئے) مجھے افسوس ہے - میں معافی چاہتا ہوں -

نووارد حسینہ - معافی ؟ ——— تم اس کا جواب دو کہ تم نے یہ بدتمیزی کی کیوں ؟

راجکمار - میں نے یہ خیال کیا کہ تم گھڑیال ہو !!

نووارد حسینہ - کتنی لغویات ہے - کس قدر بیہودہ ——— کیا میری صورت گھڑیال سے مشابہ ہے ؟!

راجکمار - نہیں -

حسینہ - پھر کیا میں گھڑیال جیسا ہارمونیم بجاتی ہوں -

راجکمار - (ہوشیاری سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے) نہیں .... میں یہ نہیں کہہ سکتا ! اس لئے کہ یہ اندازہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ایک گھڑیال کس قسم کا ہارمونیم بجا سکتا ہے ——— پھر مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟

حسینہ - لغویت ——— (وہ پھر بجانا شروع کر دیتی ہے)

راجکمار - بس ! (وہ اس کا ہاتھ کھینچکر پردوں پر تختہ کھینچ لیتا ہے) براہِ مہربانی یہ بتایئے کہ آپ کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی ؟ اور آپ آئیں کس راستہ سے ؟

حسینہ۔ (غصہ سے اُٹھکر) تمھیں اس سے کیا غرض ؟

راجکمار۔ (بزدلی سے ہٹکر) یہ میرا کمرہ ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں۔

حسینہ۔ کمرہ ہوٹل والے کا ہے اور رانی صاحبہ امورگڈھ کے پاس کرایہ پر ہے۔ یقیناً یہی وہ کمرہ ہے جس کی اُنھوں نے مجھے کنجی دی ہے اس لئے کہ کنجی اس کمرے کے قفل میں صحیح لگی ہے۔

راجکمار۔ مگر اُنھوں نے ایسا کیوں کیا ؟ کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ کون ہیں، بشرطیکہ آپ کو ناگوار نہ ہو

حسینہ۔ بیشک بے مجھے ناگوار ہے، اس لئے کہ عام آدمیوں کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہرحال تمھیں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ تم مخاطب کس سے ہو ——— میں مشہور ماہر موسیقی "تارا بائی" ہوں۔ !

راجکمار۔ کیا "بلبلِ بنگال" مس تارا بائی ! ——— خوبصورت بلا" تارا بائی ——— ؟ ؟

تارا بائی۔ ہاں میں نے "خوبصورت بلا" میں پارٹ کیا، اور اس کھیل کی شہرت بھی میری ہی وجہ سے ہوئی۔ لیکن تمھاری گفتگو کا انداز نہایت گستاخانہ ہے۔ کوئی بھلا آدمی کسی باوقار کنواری سے اس طرح پیش نہیں آسکتا جس طرح تم میری تذلیل کر رہے ہو۔ بس اب تمھاری خیر اسی میں ہے کہ سیدھے اپنے سوفے پر جاکر دراز ہوجاؤ اور اپنی زبان کو لگام دو۔ ورنہ کمرے سے نکل جاؤ۔

راجکمار۔ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں بیمار ہوں۔

تارا بائی۔ بیمار ہو تو شفاخانہ جاؤ یا ڈاکٹر بلانے کے لئے آدمی بھیجو۔ (یہ کہکر وہ پھر ہارمونیم کھول لیتی ہے)

راجکمار۔ (دوزانو ہوکر ہاتھ جوڑتے ہوئے) پرماتما کے لئے تم ہارمونیم نہ بجاؤ۔ میں کسی طرح اسے برداشت نہیں کرسکتا اگر تم نے ذرا بھی کسی پردے کو ہاتھ لگایا تو میں اپنے ہوش وحواس کھو دونگا۔

تارا بائی۔ (تختہ اٹھاتے ہوئے) تو پھر مجھے ضرور ہی بجانا چاہئے۔

راجکمار۔ (بدحواسی سے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) تم ہرگز نہیں بجا سکتیں۔

(تارا بائی برہمی سے اٹھتی ہے۔ راجکمار بدستور اس کے ہاتھ کھینچے رکھتا ہے۔ اور اسی حالت میں بے ساختہ کہنے لگتا ہے)

آہ ! تمھارے ہاتھ کتنے سندر ہیں ! ؟

تارا بائی۔ (فرش پر دھکا دیکر گراتے ہوئے) صرف ایک بات تم نے بالکل سچ کہی ہے۔

راجکمار۔ (فرش پر پڑے پڑے گھورتے ہوئے) تم طاقتور بھی ہو !

تارا بائی۔ (میرے بازوؤں کی قوت بائیں ستنگ کا ٹیپ بجانے میں بڑھی ہے) اس طرح ! (وہ بائیں سپتاک پر ایک راگ چھیڑ دیتی ہے اور ایک نہایت دلآویز تان لیتی ہے ——— راجکمار کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے مگر بدستور اسے گھورتا رہتا ہے)

تارابائی - (رک کر) میں اس طرح ہرگز نہیں گا سکتی کہ میرے سامنے ایک شخص اپنے کانوں میں انگلیاں دیئے بیٹھا ہو - یہ میرے فن کی توہین ہے - آپ فوراً کمرے سے نکل جائیے !!

راجکمار - لیکن یہ کمرہ میرا ہے - تمھارا نہیں -

تارابائی - (اُٹھ کر) کوئی مضائقہ نہیں - فوراً یہاں سے نکل جاؤ - میں حکم دیتی ہوں - ورنہ ابھی گھنٹی بجا کر ملازموں سے نکلوا دونگی - (وہ بڑھ کر میز کے قریب جاتی ہے اور اپنی نازک انگلی گھنٹی پر رکھ دیتی ہے)

راجکمار - (اس کے پیچھے دوڑ کر) نہیں ! اپنی جوانی کا صدقہ، مجھ پر رحم کرو - تم گھنٹی بجاؤ گی تو ضرور کوئی نہ کوئی آجائیگا اور میں اس کی صورت دیکھتے ہی دیوانہ ہو جاؤنگا -

(تارابائی اپنے بائیں ہاتھ کے جھٹکے سے اُسے پیچھے گرا دیتی ہے - وہ ملتجی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے لجاجت سے کہتا ہے) ———— کیا تمھیں میری حالت پر ترس نہیں آتا ؟ تم نہیں دیکھتیں کہ میں بیمار ہوں ؟ !

تارابائی میں دیکھتی ہوں کہ تمھارا دماغ خراب ہے - لیکن اس سے مجھے کیا - رانی صاحبہ نے پانچسو گنی صرف اسی غرض سے میرے نذر کی ہیں کہ میں دو گھنٹہ تک اس کمرے میں اپنے فن کے جوہر دکھاؤں - میں ایسی عادی نہیں ہوں کہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کروں خصوصاً پانچسو گنی والا وعدہ ایفا کرنا تو میں اپنی زندگی کا پہلا فرض سمجھتی ہوں - (وہ پھر باجے کی طرف بڑھتی ہے)

راجکمار - لیکن کیا رانی صاحبہ نے میرے متعلق کچھ نہیں کہا -

تارابائی - (رخ پھیرتے ہوئے) ہاں انھوں نے کہا تھا کہ اس کمرے میں ایک بیوقوف نوجوان بیٹھا ہوا ہے مگر اس کا بھی مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ صرف اپنے ہی لئے خطرناک ہے، دوسرے کے لئے نہیں (وہ راجکمار کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اُسے نیچے بٹھا دیتی ہے) واضح رہے کہ میں تمھاری [illegible] کو [illegible] برداشت نہیں کرونگی کہ جس وقت میں کوئی راگ شروع کروں تم کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ جاؤ ———— سنو یا نکل جاؤ !

راجکمار - (مجبور ہو کر) اچھا تو میں زینہ میں بیٹھ جاؤنگا - [illegible] سیکڑوں آدمی بیٹھے ہونگے وہاں میں کیسے جا سکتا ہوں ؟

تارابائی - بیوقوف ! زینہ میں بھی سیکڑوں آدمی بیٹھے ہیں - ہر سیڑھی پر پانچ پانچ چھ چھ سے کم نہیں ہیں وہ مجمع علحدہ رہا جو میری آواز سننے کے لئے نیچے سڑک پر بیٹھا ہے -

راجکمار - کتنی خوفناک بات ہے ؟ ! (آبدیدہ ہو کر) مجھے اس طرح لاچار کرنے کا مقصد [illegible] میں بیمار ہوں - میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا اور اگر تم گانا شروع کروگی تو میں کھڑکی سے گر کر خودکشی کر لونگا -

تارابائی - (ہنستے ہوئے) تمھیں میری قسم ضرور کرو - یہ میری شہرت کے لئے بہترین اشتہار ہوگا اور

میں تمھاری بیحد ممنون ہونگی (یہ کہکر وہ پھر ہارمونیم کے سامنے آبیٹھتی ہے اور بجانے کے لئے تیار ہوجاتی ہے)

راجکمار۔ (کھڑکی کے پاس آکر) جب تم میرا مردہ جسم خون خون دیکھوگی تو یقیناً تمھیں اس کا افسوس ہوگا کہ تم نے میری حالت پر ترس نہ کھایا۔ (یہ کہکر وہ کھڑکی کھول کر باہر کی طرف دیکھتا ہے اور چیخ کر تیزی سے بند کرلیتا ہے) کتنا بڑا ہجوم ہے ——— پرماتما!!

تارا بائی۔ (خوش ہوکر) اب غالباً تم شوق سے میرے فن کی داد دینے کے لئے تیار ہو؟ (وہ نہایت مدھم سروں میں ایک راگ شروع کرتی ہے)

راجکمار۔ (عاجز آکر) میں اُس موت کے مقابلہ میں اِس موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

تارا بائی۔ (باجے پر بدستور ہاتھ رواں رکھتے ہوئے۔ طنزاً) شکریہ!

راجکمار۔ واقعہ یہ ہے کہ میں خود بھی اچھا خاصہ بجانا جانتا ہوں۔

تارا بائی۔ (بدستور بجاتے ہوئے) غالباً مبتدی ہو!

راجکمار۔ مجھسے میرے اکثر دوستوں نے کہا کہ اگر میں موسیقی کا شوق جاری رکھوں تو اچھے اچھے پیشہ وروں کو نیچا دکھا سکتا ہوں۔ مگر میری جیسی پوزیشن رکھنے والے کے لئے پیشہ وروں کے مقابلہ میں آنا نازیبا ہے

تارا بائی۔ (یکایک باجے سے ہاتھ ہٹاکر) یہ تو تم نے خوب بات بتائی۔ حالانکہ مجھے اس کا یقین نہیں تاہم کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کون کون سے راگ کی آپ کو مشق ہے۔

راجکمار۔ اُوہو، کیا گنتی ہوسکتی ہے، سب اچھی اچھی راگنیوں سے میں واقف ہوں۔

تارا بائی۔ مثلاً

راجکمار۔ میری جان تم مجھسے واقف نہیں ہو۔

تارا بائی۔ (برہمی سے) احمق! یہ الفاظ کہنے کی تجھے کیونکر جرات ہوئی؟ کیا تو نے مجھے پیشہ ور عورت سمجھا ہے؟

راجکمار۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی۔ یہ تو ایک راگ ہے جس کا میں نے نام لیا۔ سنو میں تمھیں بجاکر دکھاتا ہوں۔ (وہ ہارمونیم پر بیٹھ جاتا ہے) غالباً تمھیں اس کا یقین نہیں ہے کہ میں باجہ بجانا جانتا ہوں۔

تارا بائی۔ جی نہیں۔ یقین کیوں نہیں۔ میں نے سرکس میں ایک گدھے کو بھی ہارمونیم بجاتے دیکھا ہے۔ مجھے اب ہر بات کا یقین ہے۔

راجکمار۔ اسے ——— "میری جان تم مجھسے واقف نہیں ہو" (وہ ہارمونیم پر گانا ہے) "آہا میری جان تم مجھسے واقف نہیں ہو" ——— دیکھا! کچھ سمجھیں؟

تارا بائی - کیا کہنے ہیں! واقعی موسیقی پر تمھارا بڑا زبردست احسان ہے!

راجکمار - آہا - میری چھوٹی سی گڑیا!

تارا بائی - مزے میں آگئے ـــــ پاجی کہیں کا (یہ کہکر وہ اُسے کرسی سے دھکا دیکر گرا دیتی ہے اس طرح کہ وہ دو تین قلابازیاں کھاکر فرش پر دور جا گرتا ہے۔) ـــــ واقعی خوب گڑیا ہے - !!

راجکمار - ارے - یہ تمھیں یکایک کیا ہوا؟ تمھیں معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک راگ ہے - معلوم ہوا کہ تم بہترین قسم کے گانوں سے بالکل ناواقف ہو - (کوٹ جھاڑتے ہوئے اُٹھکر) ذرا طبیعت کو قابو میں رکھکر - غور سے سنو - (پھر ہارمونیم کے سامنے کرسی ڈال کر بجانے لگتا ہے) "آہا رے - آہا رے - میری چھوٹی سی گڑیا ـــــ چھوٹی سی گڑیا ـــــ ننھی سی گڑیا ـــــ آہا جی، آہا جی میری ...."

تارا بائی - بس معاف کیجئے! آپ میرا نام کیوں بدنام کر رہے ہیں - لوگ نیچے سمجھتے ہوں گے کہ یہ حماقت مجھ سے ہو رہی ہے، انھیں کیا معلوم کہ آپ شوق فرما رہے ہیں - ہٹو - اب میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں کہ موسیقی کیا چیز ہے؟

راجکمار - (ڈرکر) تمھاری مراد پکّے گانوں سے تو نہیں ہے؟

تارا بائی - ہاں ـــــ (راجکمار دوڑکر زینہ کے دروازے پر پہونچ جاتا ہے)

تارا بائی - (برہمی سے) احمق کہیں کا! (بیٹھ کر بجانے لگتی ہے)

راجکمار - (بھاگ کر تارا بائی کے پاس آتے ہوئے) میں بھول گیا - زینہ پر بہت آدمی بیٹھے ہیں - پورا ہجوم ہے آہ! اب میں کیا کروں؟ خدا کے لئے پکّے راگ نہ چھیڑو - پکّی چیزوں کو رہنے دو - میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا - (تارا بائی راجکمار کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے ہوئے اور نہایت ہی سہانے سروں میں "بہاگ" الاپتی ہے)

راجکمار - واہ ـــ واہ - یہ تو خوب چیز ہے! (تارا بائی نگاہوں میں مسکراتی ہے)

راجکمار - (کچھ دیر خاموش سنتا رہتا ہے - پھر یکایک کہتا ہے) آہا ہا ہا - میں سچ کہہ رہا ہوں اس وقت میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ تم صرف میری چھوٹی سی گڑیا ہوتیں - (تارا بائی یکایک پنچم کے سروں میں شاہانہ شروع کر دیتی ہے - راجکمار زچ ہو کر چلانے لگتا ہے) بس رہنے دو - پرماتما کے لئے اسے بند کرو میں مرا......!

تارا بائی (انترہ پورا کر کے دوبارہ انگلیاں اُٹھاتے ہوئے) بولو؟ اب تو بیہودہ الفاظ نہیں کہو گے؟

راجکمار - نہیں - مجھے قصور ہوا!

تارا بائی - (مطمئن ہو کر باجے سے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے) اچھا!

راجکمار - (پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے) اوفوہ! یہ تو بہت ہی ٹھوس قسم کا پکا گانا تھا - میرے کان کے پردے اڑ گئے!

تارا بائی - تمھاری ہمت کو مضبوط بنانے کے لئے اسی کی ضرورت تھی - علاوہ اس کے میں صرف تفریحی راگ سنا کر خود کو پانچسو گنی پانے کا مستحق نہیں سمجھتی - اچھا اب سخت سے سخت چیز سننے کے لئے تیار ہو جاؤ میں تمھیں آدمی بنانا چاہتی ہوں -

راجکمار - (گھبرا کر) کس طرح ؟

تارا بائی - باگیسری اور بھاگ کے صرف کوئل سروں سے مالکوس نکال کر ———— تم دل میں یہ خیال کرو گویا کسی جنگ پر جا رہے ہو -

راجکمار - باگیسری ———— ! مالکوس ———— !! (پھر دروازے کی طرف بھاگتا ہے اور پہلے کی طرح پھر واپس آکر گڑگڑا نے لگتا ہے) لوگوں کا ہجوم پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے - کیا تمھیں میری حالت زار پر ذرا ترس نہیں آتا -

تارا بائی - اچھا - ادھر آؤ - یہ مت خیال کرو کہ تم جنگ پر جا رہے ہو محض یہ خیال کر لو گویا تم بہادری کے ساتھ لڑ کر اپنے ملک کو دشمنوں کے پنجے سے چھڑا کر ابھی ابھی میدان جنگ سے واپس ہوئے ہو اور اس وقت اپنی قوم کی ان حسین و جمیل لڑکیوں میں بیٹھے ہو جو تمھارے شاندار کاموں پر فخر کر رہی ہیں کیا تم تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال اپنے ذہن میں لا سکتے ہو ؟

راجکمار - ہا ———— ں - کیوں نہیں - بلکہ میں تو خود کو عموماً اسی حال میں پاتا ہوں -

تارا بائی - تو ٹھیک ہے ———— اب سنو ! (وہ رفتہ رفتہ باگیسری شروع کر دیتی ہے پھر اس میں مختلف راگنیوں کے سر ملا کر مالکوس گاتی ہے - راجکمار پہلے یکایک چونک اٹھتا ہے پھر بتدریج اس کو سکون ہو جاتا ہے پھر اکڑ کر بیٹھ جاتا ہے - پھر سپاہیانہ انداز سے ٹہلنے لگتا ہے اور کبھی کبھی بہادرانہ طور پر سینہ نکال دیتا ہے - تارا بائی ہمت افزا، محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی ہے اور نہایت قادرانہ طور پر ساز و آواز کو ملا کر ایک سماں باندھ دیتی ہے)

راجکمار - (بہت دیر تک اسی طرح مدہوش رہ کر) واہ واہ ! کیا سماں ہے !

تارا بائی - (گانا بند کر کے محض باجہ بجاتے ہوئے) کیا تم یہ سُر نکال سکتے ہو ؟ محض یہ سُر (وہ پھر دیں کے صرف ابتدائی سروں کو چھیڑتی ہے) پھر آواز سے انھیں الاپتی ہے -

راجکمار - (فخر سے) ہاں ہاں کیوں نہیں صرف ———— سا - گا - ما - رے - سا ———— سا - گا - ما - رے - سا - (وہ باجے پر بیٹھ جاتا ہے) سا - گا - ما - رے - سا ....

تارا بائی - ہیں - (اپنی انگلیوں سے) ایسے ———— سنو - مدہم سے پنچم کی طرف (الاپ کر) آ - آ - آ - آ -

آ - (دہرا کر بتدریج آواز اُٹھاتے ہوئے) آ - آ - آ - آ - آ ——— پہلے نہایت آہستہ پردے کو چھیڑو - بالکل شاما جیسا نغمہ - پھر رفتہ رفتہ سُر بڑھاؤ، یہاں تک کہ تمھاری روح تمھاری آواز کی ہمنوا ہو جائے -

راجکمار - میں سمجھ گیا - بیٹھو - ایک ستار پر تم بیٹھ جاؤ، ایک پر میں دونوں ساتھ بجائیں گے - (دہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ کر بجاتے ہیں - ہر اختتام پر راجکمار جوش سے چلا اُٹھتا ہے ——— ہاں ایک بار پھر! .... کئی بار بجانے کے بعد تارا بائی راجکمار کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے اور تنہا بھیرویں شروع کرتی ہے)

راجکمار - (بڑبڑاتے ہوئے) عجیب وغریب عورت ہے! بالکل حیرت انگیز!! ——— تمھارے بے مثل فن کا میں دل و جان سے قائل ہو گیا ہوں - سنتی ہو پیاری تارا ——— ! (وہ یکایک بھیانک سروں کو چھیڑ دیتی ہے)

راجکمار - نہیں ——— میں بھولا ——— مس تارا بائی، "بلبل بنگال"!

تارا بائی - اب ٹھیک ہے - لیکن میں خود کو تمھاری زبان سے "عجیب وغریب عورت" کھلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں -

راجکمار - مس تارا، تم یقیناً عجیب وغریب عورت ہو، تمھارا گانا سننے کے بعد میں اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہا ہوں - اجازت ہو تو ذرا سی ولیرین پی لوں - اس لئے کہ مجھ میں جوش ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے ——— (ایک خوراک پی کر) آہاہا - اب نسبتاً مجھے بہت سکون ہے - میری پیاری! (تم اس طرح نہ دیکھو یہ الفاظ میرے دل سے نکل رہے ہیں) واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی مسرور نہیں ہے - میں اپنی موجودہ حالت سے اکتا گیا ہوں - پبلک سے مجھے سخت نفرت ہے اور راج کے انتظامی معاملات سے میرے دماغ کو کوئی لگاؤ نہیں ہے - گھر پر تین بدمزاج بہنوں کے ساتھ مجھے زندگی بسر کرنی پڑتی ہے - جو بالکل مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتیں بلکہ اپنا زیادہ وقت سیر و تفریح میں گذارتی ہیں - ایسی سیر و تفریح جسے میں شرمناک سمجھتا ہوں تمھیں معلوم ہے اُنھوں نے میرا کیا نام رکھا ہے؟

تارا بائی - (نرمی سے) بھولے کنور جی!؟

راجکمار - نہیں جی - وہ مجھے بزدل رنبیر کہتی ہیں ——— بیشک میں اس کا اقبال کرتا ہوں کہ میں بزدل ہوں اور بے یار و مددگار - دنیا میں مجھ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا - میں ایک قوی بازو کا سہارا چاہتا ہوں، ایک منچلے ساتھی کی مجھے تلاش ہے جس پر میں ناز کر سکوں - ایک ایسے مونس و غمخوار کی مجھے ضرورت ہے جو میری ضروریات زندگی کو اپنی قوتِ بازو سے پورا کر سکے - اور مجھے حکمرانی یا سیاست کے بھیانک مسائل کی طرف مطلق غور نہ کرنے دے -

——— پیاری تارا - میں نہایت ہی حقیر اور ادنیٰ ہستی ہوں لیکن پھر بھی تمھاری پرستش کرنے کی جرأت

ضرور رکھتا ہوں - مصوری اور نقاشی کی طرف میرا فطری رجحان ہے مجھے بہترین کھانے پکانے آتے ہیں میں کھانے کے بعد دلچسپ قصے سنا سکتا ہوں - اور چاہے تمھیں اس کا یقین آئے یا نہ آئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں ملازمین سے نہایت اچھی طرح کام لے سکتا ہوں اور امور خانہ داری کو بہت عمدگی سے انجام دے سکتا ہوں بال بچوں سے بھی مجھے ایک قدرتی اُنس ہے اس لئے کہ وہ بڑے آدمیوں کی طرح ٹھوس باتیں کرکے میرا دماغ پراگندہ نہیں کرتے ——— بہرحال میں ہر لحاظ سے خانگی زندگی بسر کرانے کے لئے (بسر کرنے کے لئے نہیں) بہترین شریک زندگی ثابت ہو سکتا ہوں اور اس سلسلے میں اگر میرا شریک زندگی مجھ پر کسی قسم کی سختی بھی روا رکھے تو اُسے ہنسی خوشی برداشت کر سکتا ہوں - بلکہ غالباً اس کی مجھے تمنا ہے کہ کوئی مجھے جھڑکے میں اُسے سنوں، کوئی مجھے بُرا بھلا کہے اور میں اس کی منت کروں اس لئے کہ اس حال میں اس فکر سے تو میں آزاد ہونگا کہ اب مجھے کیا جواب لکھنا چاہئے اور فلاں ملکی مسئلے کو حل کرنے کے لئے کونسی سیاسی چال چلنی چاہئے ؟ ——— پیاری تارا! کیا تم ایسے سیدھے سادھے مسکین شوہر کے ساتھ نباہ کر سکتی ہو جسے سوائے تمھاری رضاجوئی کے دنیا میں اور کسی بات کا خیال ہی نہ ہو - جو سوائے اپنے گھر کے بیرونی زندگی سے سروکار ہی نہ رکھتا ہو - جسے عام شوہروں کی طرح سیاست یا حکومت کا مطلق خبط نہ ہو اور جس کے ساتھ اس دنیا کے بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تمھیں آزادانہ طور پر اپنے کمالات کی نمائش کرنیکا حق حاصل ہو ——— کیا میں تم سے اس قسم کی توقع رکھوں ؟

تارا بائی - (ہارمونیم سے اُٹھکر راجکمار کے قریب آتے ہوئے) میرے بھولے راجکمار! تم دیکھتے ہو کہ میں ایک ترش مزاج، سخت گیر اور آزاد عورت ہوں، میں جسم وجثہ میں تم سے کہیں زیادہ قوی ہوں - پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایسے نازک اور ملائم جسم وجثہ کے انسان کو مجھ میں وہ کونسا حسن نظر آتا ہے جس سے محبت کی جا سکے ——— ازدواجی زندگی میں اس کا ہر وقت امکان ہے کہ مجھسے تمھیں کوئی جسمانی اذیت، یا کوئی اعصابی نقصان پہونچ جائے - بلکہ شاید ——— ہاں مجھے صاف صاف اقبال کرنا چاہئے ——— میں ذرا بد مزاج ہوں اور بعض اوقات بہت ہی بھڑک اُٹھتی ہوں اس لئے ممکن ہے، بلکہ اغلب ہے کہ میں غصہ کی حالت میں کبھی تمھیں مار بھی بیٹھوں -

راجکمار - ہاں - ضرور، ضرور - تم اس طرح مجھ پر نہ ہنسو - یقیناً یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے لیکن بچپن سے میرے دل میں ایک ہی تمنا پرورش پاتی رہی ہے اور وہ یہ کہ کسی شاندار، قوی ہیکل اور خوبصورت عورت کے ہاتھ سے خوب اچھی طرح پٹوں -

تارا بائی - (متاثر ہوکر) دلبر ——— میرے خیال میں اسی نام سے رانی صاحبہ تمھیں پکارتی ہیں ؟

راجکمار - نہیں وہ رنو کہتی ہیں!
تارا بائی - ہاں پیارے رنو مجھے بھی اپنے دل کی کچھ باتیں تم سے کہنی ہیں، میں بھی محبت کا ایک راگ الاپنا چاہتی ہوں - سنوگے؟
راجکمار - کہو میری پیاری تارا!
تارا بائی - ہاں میں بھی عمر بھر ایک خواب دیکھتی رہی ہوں اور اس خواب نے محنت ومشقت کی اُن بھاری اور طویل گھڑیوں کو روشن بنائے رکھا ہے جب میں مسلسل آٹھ آٹھ نو نو گھنٹے گانے کی مشق کیا کرتی تھی - اس خواب نے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ہر اسٹیج پر جہاں ہزارہا انسانوں کے مجمع نے میرے کمال کو سراہا ہے، میرے دماغ پر تسلط رکھا ہے - وہ خواب یہ ہے کہ کسی نازک مرد کا ایک تنہا سا کمزور دل میرے دل کے مقابل دھڑک رہا ہو، ایک ملائم آواز مجھے گھر پر خوش آمدید کہہ رہی ہو، باریک باریک ریشم جیسی ملائم مونچھیں میری تھکی ہوئی انگلیوں کو بوسہ دے رہی ہوں اس حال میں کہ میں کئی گھنٹے اسٹیج پر کام کرنے کے بعد تھک کر گھر لوٹی ہوں - کوئی بالکل فرماں بردار، قطعی لاچار، مطلق بے سہارا ——— میرا اور صرف میرا پرستار شوہر مجھے میسر آجائے جس کی صرف میں کفیل ہوں اور کسی دوسرے سے اُسے کوئی علاقہ نہو -
راجکمار - لیکن تمھیں کسی دن غصہ آجائیگا، ناقابل ضبط اور بے پناہ غصہ، اس حالت میں تم اُس شخص کو پامال کردوگی جس سے تمھیں محبت اور پرستاری کا دعویٰ ہوگا - وہ تمھارے پیروں سے لپٹ کر عفوِ تقصیر چاہیگا اور تم اُسے کچل دوگی ——— !
تارا بائی - بیشک یہ بالکل ممکن ہے - تم اس بات کا اقبال کرنے کے لئے مجھے کیوں مجبور کرتے ہو - شاید میں اسے مارتے مارتے لب دم کردوں - اُسکی ہڈی ہڈی توڑ دوں اور پھر ممکن ہے کہ مجھے اپنے کئے پر پشیمانی ہو اور اپنے گرم گرم بوسوں سے اُس کے جسم میں زندگی کی تازہ روح پھونک دوں -
راجکمار - (فیصلہ کن طور پر) مجھے یہ سب بدل وجان منظور ہے - میں اس خدمت کے لئے خود کو پیش کرتا ہوں -
تارا بائی - تم میں ہمت ہے کہ ایسی خطرناک زندگی کو برداشت کرسکو؟ پھر سوچ لو!
راجکمار - سوچ لیا - میں اس زندگی کو خوش آمدید کہتا ہوں - مجھے تم سے محبت ہے میں مطلق تمھارا ہو چکا ہوں اب مجھے اپنی آغوش سے وابستہ ہوجانے دو -
تارا بائی - (اپنی کرخت آغوش میں دباتے ہوئے) اب کوئی طاقت تمھیں اس آغوش سے جدا نہیں کرسکتی -
راجکمار - کوئی نہیں - اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں -
تارا بائی - اب تو تمھیں کوئی دماغی عارضہ نہیں -

راجکمار - بالکل نہیں -
تارابائی - آدمیوں سے تو نہیں ڈروگے -
راجکمار - ہرگز نہیں -
تارابائی - باہر چلوگے -
راجکمار - اسی وقت - (دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرگوشیاں کرتے ہوئے کمرے کو چھوڑ دیتے ہیں)

طالب باغپتی (برنارڈ شا)

سیزر اور کلیوپیٹرا

(مسلسل)

سیزر - (مہربان ہوکر) جاؤ میرے لڑکے، تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تم اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ محفوظ رہوگے۔ یہاں تم ایک شیر کے منھ میں ہو۔

ٹالمی - (پلٹتے ہوئے) میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن (روفیو کو دیکھکر) گیدڑ سے ڈرتا ہوں۔

(وہ دالان سے نکل جاتا ہے)

سیزر - (ہنستے ہوئے) بہادر لڑکے!

کلیوپیٹرا - (سیزر کے الفاظ کو نگاہ حسد سے دیکھکر ٹالمی کو پکارتے ہوئے) چھوٹے بیوقوف تم اُسے بہت چالاک سمجھتے ہو۔

سیزر - برٹینس! بادشاہ کے ساتھ جاؤ اور اُسے پوتھینس کے حوالے کردو۔

(بری ٹینس ٹالمی کے ساتھ چلا جاتا ہے)

روفیو - (کلیوپیٹرا کی طرف اشارہ کرکے) اے خوبیوں کا مجسمہ؟ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔؟ ——— میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے تمھاری مرضی پر چھوڑ دیا جائے (وہ چلا جاتا ہے)

کلیوپیٹرا - (شگفتہ ہوکر سیزر سے) کیا تم نے مجھے بھی سب کے ساتھ جانے کو کہا؟

سیزر - (کسی قدر محویت سے سرد آہ بھرتے ہوئے ٹالمی کی کرسی کے قریب جاتا ہے اور کلیوپیٹرا تمتماتے ہوئے رخساروں اور بند مٹھیوں کے ساتھ اپنے جواب کا انتظار کرتی ہے) تم جو چاہو کر سکتی ہو۔ کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا - تو تم کو میرے ٹھہرنے اور چلے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔

سیزر - (مسکراکر) میں تو فی الحقیقت یہی چاہتا ہوں کہ ٹھہرو۔

کلیوپیٹرا - کیا واقعی بہت زیادہ!

سیزر - (سر ہلاکر) بہت بہت، بہت زیادہ

کلیوپیٹرا - تو میں ٹھہرنا مناسب خیال کرتی ہوں کیونکہ یہ بات میری مرضی پر رکھی گئی ہے۔ لیکن میں اُسے یاد رکھنا نہیں چاہتی۔

سیزر - یہ میں خوب سمجھتا ہوں (پکارتے ہوئے) طوطا تیتا۔ (فتاتا جو اب تک بیٹھی تھی اس کی طرف دیکھتی ہے۔ لیکن حرکت نہیں کرتی)

کلیوپیٹرا - (قہقہہ مارکر) اس کا نام طوطا تیتا نہیں ہے بلکہ فتاتا ہے۔ (پکارتے ہوئے) فتاتا (فتاتا اٹھکر کلیوپیٹرا کے پاس آتی ہے)

سیزر۔ (نام کو رٹتے ہوئے) تنفتا طیطا، فیتا طوطا ملکہ اسکندریہ میں اپنا دربار منعقد کرے گی عورتوں کو بلاؤ کہ اس کے احکام کی تعمیل کے لئے حاضر رہیں اس کے علاوہ اور جو ضروری انتظامات ہوں اُن کو انجام دو۔

فتاتا۔ تو کیا میں ملکہ کے محل کی مالکہ ہوں؟

کلیوپیٹرا۔ (تیزی سے) نہیں، محل کی مالکہ میں ہوں جاؤ تم سے جو کچھ کہا گیا ہے کرو۔ ورنہ میں تمھیں آج ہی سہ پہر کو دریائے نیل میں ڈال دونگی تاکہ نگر اور گھڑیال تم کو نگل جائیں۔

سیزر۔ (گھبرا کر) اوہ۔ نہیں نہیں۔

کلیوپیٹرا۔ ہاں، ہاں، تم بہت جذباتی ہو اور بڑے چالاک بھی اور اگر تم میرے کہنے کے مطابق عمل کرو تو تم کو حکومت کرنا جلد آجائے گا۔

(سیزر اس شوخی سے بے حد متاثر ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو گھورنے لگتا ہے۔ فتاتا زیر دستی ہنستی ہوئی جاتی ہے)

سیزر۔ کلیوپیٹرا میں یہ سوچتا ہوں کہ اب تم کو نگل لینا چاہیے۔

کلیوپیٹرا۔ (اس کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر ملتمسی نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے) تمھیں مجھے ایک بچے کی طرح باتیں نہ کرنی چاہئیں۔

سیزر۔ اس رات سے جب ابوالہول نے ہمارا تمھارا تعارف کرایا تھا، تم بڑی ہوتی جا رہی ہو۔ اور تمھارا خیال ہے تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔

کلیوپیٹرا۔ (اپنی غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے) نہیں یہ میری انتہائی بیوقوفی ہو گی۔ تاہم میں یہ ضرور جانتی ہوں مگر ——— (یکایک) کیا تم مجھ سے خفا ہو؟

سیزر۔ نہیں

کلیوپیٹرا۔ (یقین کرتے ہوئے) تو تم اس قدر خیالات میں کیوں ڈوبے ہوئے ہو۔؟

سیزر۔ (اُٹھکر) مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا۔ (جھلاتے ہوئے) کام (نفرت سے) تم باتیں کرتے کرتے تھک گئے ہو اور اب مجھ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔

سیزر۔ (بیٹھکر) خیر اور ایک منٹ سہی لیکن اس کے بعد پھر ——— کام!

کلیوپیٹرا۔ کام کیا لغو چیز ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب تم ایک بادشاہ ہو، اور میں نے تم کو بادشاہ بنا دیا ہے، بادشاہ کام نہیں کیا کرتے۔

سیزر۔ یہ تم سے کس نے کہا۔ چھوٹے بلی کے بچے؟

کلیوپیٹرا۔ میرا باپ مصر کا بادشاہ تھا اور اس نے کبھی کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن وہ ایک بہت زبردست بادشاہ تھا اور اس نے میری بہن کا سر محض اس لئے قلم کر دیا کہ اس نے باپ سے بغاوت کی تھی اور اس سے اس کا تخت چھین لیا تھا۔

سیزر۔ بہت خوب! لیکن اُسے پھر اس کا تخت کیونکر واپس مل گیا۔؟

کلیوپیٹرا - (آنکھیں مسرت سے چمکنے لگتی ہیں) سنو! ایک حسین جوان آدمی، جس کے بازو، خوبصورت، گول اور مضبوط تھے، بہت سے سواروں کے ساتھ ریگستان میں وارد ہوا - اس نے میری بہن کے شوہر کو قتل کر ڈالا اور میرے والد کو تخت واپس دلا دیا - اُس وقت میری عمر صرف بارہ برس کی تھی، میں چاہتی ہوں کاش کہ وہ پھر آتا اور میں اسے اپنا شوہر بنا لیتی -

سیزر - شاید یہ ممکن ہو - کیونکہ وہ شخص میں ہی ہوں، جس نے اس خوبصورت آدمی کو تمھارے باپ کی مدد کے لئے بھیجا تھا -

کلیوپیٹرا - (خوشی سے پھول کر) تم اُسے جانتے ہو؟

سیزر - (سر ہلا کر) ہاں!

کلیوپیٹرا - کیا وہ تمھارے ساتھ آیا ہے؟ -

(سیزر سر ہلا کر انکار کرتا ہے، اس سے کلیوپیٹرا انتہائی درجہ شکستہ دل ہو جاتی ہے) کاش وہ آیا ہوتا - کاش میں اور بڑی ہوتی کہ وہ مجھے تمھاری طرح صرف ایک بلی کا بچہ نہ سمجھتا - لیکن یہ شاید اس لئے کہ تم بڈھے ہو وہ تم سے عمر میں کئی سال چھوٹا ہے، کیا وہ چھوٹا نہیں ہے؟

سیزر - (جیسے ایک گولی نگل رہا ہو) ہاں وہ کسی قدر کم عمر ہے -

کلیوپیٹرا - کیا وہ میرا شوہر بننا پسند کریگا؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ میری اس درخواست کو منظور کر لیگا؟

سیزر - بہت ممکن ہے -

کلیوپیٹرا - لیکن مجھے اس سے کہنا نہ چاہیے - کیا تم اسکو مجھ سے دریافت کرنے پر راغب نہیں کر سکتے؟ مگر اسے یہ نہ بتاؤ کہ یہ میری خواہش ہے -

سیزر - (اس کی معصومیت سے متاثر ہو کر) میری چھوٹی بچی!

کلیوپیٹرا - تم مجھے بچہ کیوں کہتے ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے لئے متاسف ہو؟ کیا اُسے اور کسی سے محبت ہے؟

سیزر - مجھے کچھ ایسا ہی خطرہ ہے!

کلیوپیٹرا - (اشک آلود کر) تو پھر میں اس کی پہلی محبوبہ نہ بن سکونگی -

سیزر - ہاں پہلی محبوبہ نہیں بن سکتی عورتیں اسکی بے حد مداح اور قدردان ہیں -

کلیوپیٹرا - کاش میں سب سے پہلی محبوبہ ہوتی تاہم اگر وہ مجھ سے محبت کریگا تو میں اُس کو مجبور کرونگی کہ وہ اور سب کو قتل کر ڈالے - کیا وہ اب بھی خوبصورت ہے؟ کیا اس کے خوبصورت طاقتور اور گول بازو سورج کی روشنی میں، سنگ مرمر کی طرح چمکتے ہیں؟

سیزر - وہ بہت تندرست ہے -

کلیوپیٹرا - اوہ، تم کو اس کے متعلق عام، دنیاوی باتیں نہ کہنی چاہئیں کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں وہ ایک دیوتا ہے -

سیزر - وہ سواروں کا بڑا سردار ہے اور دوڑنے میں سب رومیوں سے زیادہ تیز ہے -

کلیوپیٹرا - اس کا اصلی نام کیا ہے؟

سیزر - (گھبرا کر) اس کا اصل نام؟

کلیوپیٹرا - ہاں! میں اس کو ہمیشہ ہورس کہتی ہوں کیونکہ ہورس ہمارے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن میں اس کا اصل نام دریافت کرنا چاہتی ہوں۔

سیزر - اس کا نام مارک انطونی ہے۔

کلیوپیٹرا - (ترنم کے ساتھ) مارک انطونی، مارک انطونی - کس قدر پیارا نام ہے (وہ دونوں بازو سیزر کی گردن میں حائل کر دیتی ہے) آہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے کہ تم نے اسے میرے باپ کی مدد کو بھیجا؟ کیا تمھیں میرے باپ سے محبت تھی؟

سیزر - نہیں میری بچی! لیکن تمھارے باپ نے کبھی محبت نہیں کی، جیسا کہ تم ابھی کہہ چکی ہو، اور میں ہمیشہ کام کرتا رہتا ہوں اس لئے جب اس نے اپنا تخت کھو دیا تو اس نے مجھے سولہ ہزار ٹیلنٹس اس شرط پر دینے کا وعدہ کیا تھا کہ میں اسے تخت واپس دلا دوں۔

کلیوپیٹرا - کیا اس نے وہ رقم ادا نہیں کی؟

سیزر - سب نہیں۔

کلیوپیٹرا - وہ تو بالکل راستی پر تھا، کیونکہ اس اعانت کا یہ بہت زیادہ معاوضہ تھا - اور ساری دنیا کی قیمت سولہ ہزار ٹیلنٹس نہیں ہو سکتی۔

سیزر - ہاں! شاید تمھارا یہ خیال ہو۔ غریب مصری مزدوروں نے اس قدر ادا کر دیا جتنا بادشاہ ان سے وصول کر سکتا تھا - اور باقی رقم اب بھی وصول طلب ہے - لیکن جہاں تک مجھے یقین ہے اب وہ مجھے نہ مل سکے گی - اس لئے اب مجھے اپنے کام پر جانا چاہئے - اس لئے تم ذرا دوڑ جاؤ اور میرے سکریٹری کو بلا لاؤ۔

کلیوپیٹرا - (خوشامدانہ) نہیں میں یہیں ٹھہرونگی میں یہیں ٹھہرنا چاہتی ہوں تاکہ تم سے مارک انطونی کے متعلق کچھ اور سنوں۔

سیزر - لیکن اگر میں محنت نہ کروں تو پوتھینس اور دوسرے آدمی ہمیں بندرگاہ سے جدا کر دیں گے، اور پھر روم کا راستہ بند ہو جائیگا۔

کلیوپیٹرا - کوئی پروا کی بات نہیں ہے، میں تمھیں چاہتی ہوں کہ تم پھر روم واپس جاؤ۔

سیزر - لیکن تم وہاں سے مارک انطونی کو بلانا چاہتی ہو۔

کلیوپیٹرا - (مسرت سے اچھل کر) اوہ - ہاں، ہاں میں بھول گئی - جاؤ جلد اور کام کرو سیزر! اور سمندری راستہ مارک انطونی کے لئے کھلا رہنے دو۔

(وہ دالان میں بھاگ جاتی ہے اور اپنا ہاتھ مارک انطونی کے تصور میں سمندر کی طرف اٹھا کر چوم لیتی ہے)

سیزر - (دالان کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر دالان میں جاتے ہوئے) بری ٹینس! (وہ ایک زخمی رومی سپاہی کے داخل ہونے پر چونک پڑتا ہے جو اسے اوپر کی سیڑھیوں سے تکتا ہے) کیوں؟ کیا حال ہے؟

سپاہی - (اپنے پٹی بندھے ہوئے سر کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے) میرے دو رفیق بازار میں قتل
کر دیئے گئے اور میں زخمی ہوا۔
سیزر۔ (خاموشی سے غور کرتے ہوئے) مگر کیوں؟
سپاہی۔ یہاں اسکندریہ میں ایک فوج آئی ہے
جو اپنے آپ کو رومی فوج بتاتی ہے۔
سیزر۔ رومی مقامی فوج ہاں؟
سپاہی۔ اچلیس کی نگرانی ہیں
سیزر۔ اچھا؟
سپاہی۔ جب فوج پھاٹک میں داخل ہوئی تو
شہری ہماری مخالفت پر تیار ہو گئے۔ جب یہ خبر
پہنچی تو میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ بازار میں تھا
لوگ ہم پر حملہ کر بیٹھے اور میں بمشکل تمام اُن سے بچ کر
یہاں تک پہنچ سکا۔
سیزر۔ خوب میں تم کو دیکھ کر مسرور ہوں۔
(روفیو عجلت دالان میں داخل ہوتا ہے اور سپاہی کے پیچھے
سے گذرتا ہے، تاکہ ایک محراب میں سے نیچے کا منظر دیکھ سکے)
روفیو ہم نظر بند کر لئے گئے۔
روفیو۔ کیا؟ بالکل؟
سیزر۔ ہاں بالکل،
(بری ٹینس اندر دوڑتا ہوا آتا ہے)
بری ٹینس۔ سیزر!
سیزر۔ (اس کے خیالات کو تاڑتے ہوئے) ہاں
میں جانتا ہوں (روفیو اور بری ٹینس دالان کی متضاد
سمتوں سے داخل ہوتے ہیں اور سیزر کے قریب سے
گزر جاتے ہیں جو سیڑھیوں کے قریب ایک میز کے پاس کھڑا
ہوا سپاہی سے کچھ کہنا چاہتا ہے) ——— میرے
دوست۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ یہاں سے نکل کر سمندر کے
کنارے جاؤ گے اور کشتیوں کی حفاظت کرو گے جاؤ
اپنے زخموں کی مرہم پٹی کراؤ (سپاہی چلا جاتا ہے، سیزر
پیچھے دالان میں بری ٹینس اور روفیو کے درمیان آتا ہے)۔
روفیو ہمارے بعض جہاز مغربی کنارے پر ہیں اُن کو
جلا دو۔
روفیو۔ (تعجب سے) جلا دو!
سیزر۔ ہاں انھیں جلا دو اور مشرقی کنارے پر
جتنی کشتیاں ہیں انھیں لیکر اس جزیرہ پر قبضہ کر لو
جس میں روشن مینار نظر آتا ہے۔ ہمارے نصف
رفیقوں کو وہیں چھوڑ دو تاکہ وہ ساحل کی حفاظت کریں
اور محل سے باہر جانے کے راستہ کی پوری نگرانی
رکھیں۔ یہی گھر کا راستہ ہے۔
روفیو۔ (نہایت بددلی سے) کیا ہم شہر چھوڑ دیں۔
سیزر۔ ہم کو لازمی ہے روفیو! صرف یہ
محل ہمارا ہے اور ——— وہ دوسری عمارت
دوسرے دروازہ کے پاس کونسی ہے؟
روفیو۔ تھیٹر۔
سیزر۔ ہم اسے بھی لے لیں گے، کیونکہ ساحل کی
حفاظت کے لئے اس پر قبضہ ضروری ہے۔ باقی
حصہ مصریوں کے لئے ہے۔
روفیو۔ ہوں! میرا خیال ہے کہ آپ سب سے
بہتر جانتے ہیں ——— اور کچھ؟
سیزر۔ ہاں اور کچھ نہیں کیا وہ جہاز ابھی تک

نذر آتش نہیں کئے گئے ؟

روفیو - گھبراؤ نہیں سیزر، میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرونگا (وہ بھاگ جاتا ہے)

بری ٹینس - سیزر، پوتھینس کو کوئی سبق دینا چاہئے اس کا رویہ بے حد وحشیانہ ہے

سیزر - وہ کہاں ہے ؟

بری ٹینس - وہ باہر انتظار کر رہا ہے -

سیزر - اچھا بلاؤ پوتھینس کو !

(پوتھینس داخل ہوتا ہے اور اکڑ کر دالان میں سیزر کی بائیں جانب نہایت تندخوئی سے آتا ہے)

سیزر - پوتھینس ؟

پوتھینس - سیزر، ہم تم کو آخری بار آگاہ کرنے آئے ہیں -

سیزر - آخری آگاہی! دروازہ کھلا ہوا تھا جنگ کا اعلان کرنے سے قبل تم کو اس دروازہ سے نکل جانا چاہئے تھا - اب تم میرے قیدی ہو - (وہ کرسی کے قریب جاکر اس کی عبا کھولتا ہے)

پوتھینس - (نفرت سے) میں تمھارا قیدی! کیا تم کو معلوم نہیں کہ تم اسکندریہ میں ہو، اور بادشاہ ٹالمی ایک بیشمار فوج کے ساتھ جو تمھاری ذراسی فوج کے مقابلہ میں سوگنا زیادہ ہے، اسکندریہ کا حکمراں ہے!

سیزر - (بے پروائی سے اس کی عبا اتار کر تخت پر پھینکتا ہے) اچھا میرے دوست، اگر تم میں طاقت ہے تو یہاں سے بھاگ جاؤ اور اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ بازار میں کسی رومی کو قتل نہ کریں ورنہ میرے سپاہی، جو میری طرح رحمدل اور حلیم نہیں ہیں، یقیناً تم کو مار ڈالیں گے، بری ٹینس محافظ کو اطلاع کردو - اور میری زرہ لاؤ - (بری ٹینس چلا جاتا ہے روفیو داخل ہوتا ہے) کیا خبر لائے ؟

روفیو - (دالان میں سے ساحل کی طرف اُٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کرکے) اس طرف دیکھو - (پوتھینس بےچینی سے باہر دیکھنے کو سیڑھی کی طرف دوڑتا ہے)

سیزر - کیا؟ بالکل آگ لگادی، ناممکن ہے -

روفیو - ہاں، پانچ بہترین جہاز، اور ہر ایک کے ساتھ ایک تیل سے بھرا ہوا خزانہ بھی لیکن یہ میرا کیا ہوا نہیں ہے، مصریوں نے مجھے اس تکلیف سے بچالیا، انھوں نے مغربی ساحل پر قبضہ کرلیا ہے -

سیزر - (بےچینی سے) اور مشرقی ساحل؟ روشنی کا مینار روفیو؟

روفیو - (سیزر کے قریب آکر) کیا میں ایک فوجی دستہ کو جہاز پر صرف پانچ منٹ میں روانہ کرسکتا ہوں؟ پہلا دستہ ساحل پر پہنچ گیا ہے اگر آپ اس سے تیز کام چاہتے ہیں تو خود آکر کیجئے

سیزر - (تسکین دیکر) شاباش شاباش تاہم صبر سے کام لو، روفیو، صبر!

روفیو - صبر! یہاں کون بےخبر ہے - آپ یا میں؟ اگر میں ان کو اس دالان سے نہ دیکھ سکتا تو کیا یہاں ٹھہرتا ؟

سیزر - معاف کرو - روفیو - اور (بےچینی سے) جلدی کرو - جس قدر ممکن ہو ——— (ایک بڈھے آدمی

کی دردناک آواز اس کی گفتگو کو منقطع کر دیتی ہے اور وہ
آواز قریب آجاتی ہے۔ آخرکار تھیوڈوٹس اپنے بال نوچتا
ہوا داخل ہوتا ہے۔ روفیو اُسے دیکھنے کو نیچے اتر جاتا ہے
اس کی اس حالت پر متعجب ہوکر پوتھینس سننے لگتا ہے)

تھیوڈوٹس - (سیڑھی پر دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھاکر)
آہ ناقابلِ بیان خطرہ، بدقسمتی، افسوس، مدد!

روفیو- کیا ہوا؟

سیزر- (دھمکاکر) کون قتل ہوا؟

تھیوڈوٹس- قتل، آہ دس ہزار آدمیوں کی موت
سے زیادہ خوفناک نقصان دنیائے انسانیت کا ناقابلِ
تلافی خسارہ!

روفیو- آخر ہوا کیا؟ بھلے آدمی؟

تھیوڈوٹس- (دالان میں آتے ہوئے) تمھارے
جہاز کی آگ مشتعل ہو چکی ہے اور دنیا کے سات
عجائبات میں سے سب سے پہلی چیز برباد ہو رہی ہے
اسکندریہ کے کتب خانہ میں آگ لگ گئی ہے۔

روفیو- اوہ- (وہ بالکل مطمئن انداز سے دالان کی
طرف جاتا ہے اور ساحل پر فوج کی نقل وحرکت دیکھنے
لگتا ہے)

سیزر- کیا یہی خبر ہے؟

تھیوڈوٹس- (اس کے ہوش وحواس پر یقین نہ کرتے
ہوئے) یہی! سیزر، کیا تم ایک وحشی سپاہی کی
طرح نسلاً بعد نسلٍ کتابوں کی قدر وقیمت سے ناآشنا
ہی بنے رہوگے؟

سیزر- تھیوڈوٹس! میں خود ایک مصنف ہوں،
اور میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ بہتر ہے کہ مصری خود
اپنی زندگی کو، زندگی کی طرح گذاریں بجائے اس کے
کہ وہ کتابوں کی مدد سے اسے خواب بنالیں۔

تھیوڈوٹس- (گھٹنوں پر کھڑے ہوکر ادبی جوش وذوق
اور خود نمائی کے جذبہ کے ساتھ) سیزر، انسان
کی دس پشتوں کے بعد دنیا کو ایک غیر فانی کتاب
نصیب ہوتی ہے۔

سیزر- جسے معمولی سے معمولی آدمی بھی جلا
سکتا ہے۔

تھیوڈوٹس- تاریخ کے بغیر موت تمھارے اور ایک
سپاہی کے مابین کوئی امتیاز باقی نہ رکھیگی اور اسی کے
برابر سلادیگی۔

سیزر- موت تو ہر حال میں یہی کرے گی، مجھے
اس سے بہتر قبر کی تمنا بھی نہیں ہے۔

تھیوڈوٹس- جو کچھ وہاں جل رہا ہے وہ انسانیت
کا ذہن اور حافظہ ہے۔

سیزر- ایک شرم آلود حافظہ، اُسے جل جانے دو۔

تھیوڈوٹس- کیا تم ماضی کو برباد کردوگے؟

سیزر- ہاں، اور اس کے ویرانوں پر مستقبل کی
تعمیر کرونگا ——— (تھیوڈوٹس، عالمِ یاس میں
مٹھیوں سے اپنی کنپٹیوں پر گھونسے مارنے لگتا ہے)۔
لیکن سنو تھیوڈوٹس بادشاہوں کے استاد،
تم، جس نے پمپئی کے سر کی اتنی قیمت بھی نہ لگائی
جتنی ایک چرواہا پیاز کی لگاتا ہے- اور تم جواب
میرے سامنے اشک آلود آنکھوں سے چند بھیڑوں

کی کھالوں کی جن پر کچھ گدا ہوا ہے، حفاظت کی درخواست کر رہے ہو، سنو کہ میں اس وقت تمھاری امداد ایک آدمی یا ایک کٹورا پانی سے بھی نہیں کرسکتا لیکن تم محل سے آزادانہ طور پر جاسکتے ہو۔ اچیلس کے پاس جاؤ اور اُس سے فوجیں مستعار لو۔ تاکہ وہ آگ بجھا دیں۔

(وہ اُسے سیڑھیوں پر تیزی سے دھکا دیتا ہے)

پوتھینس - (معنی خیز انداز سے) سمجھے تھیوڈوٹس، اور میں ایک قیدی ہوں۔

تھیوڈوٹس - ایک قیدی!

سیزر - کیا جب انسان کا حافظہ جل رہا ہے تو تم باتیں کرنے کے لئے ٹھہرے رہوگے؟ (دالان میں سے پکار کر) وہاں جاؤ تھیوڈوٹس، باہر نکل جاؤ (تھیوڈوٹس سے) چلے جاؤ۔

تھیوڈوٹس - (پوتھینس سے) مجھے کتب خانہ کو بچانے کے لئے جانا چاہئے (وہ چلا جاتا ہے)

سیزر - جاؤ پوتھینس، اس کے ساتھ دروازہ تک جاؤ۔ اس سے کہو کہ وہ اپنے ساتھیوں سے یہ استدعا کرے کہ وہ میرے کسی اور سپاہی کو قتل نہ کریں۔ یہ صرف تمھاری خاطر ہے۔

پوتھینس - اگر تم نے میری جان لی، تو اس کا معاوضہ ادا کرنا دوبھر ہوجائیگا۔ یاد رکھو سیزر! (وہ تھیوڈوٹس کے پیچھے جاتا ہے)

(روفیو جہاز کی طرف دیکھنے میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اُسے دونوں مصریوں کے جانیکا احساس نہیں ہوتا)

روفیو - (دالان سے ساحل کی طرف پکار کر) وہاں سب کچھ ٹھیک ہوگیا؟

ایک صوبیدار - (نیچے سے) سب ٹھیک ہے۔ ہم کو صرف سیزر کا انتظار ہے۔

سیزر - ان سے کہو کہ سیزر آرہا ہے - سیزر (پکار کر) برٹینس۔

روفیو - (نیچے پکار کر) چلو سب لوگ بڑھو۔ صرف ایک بڑی کشتی رہنے دو اور اس کے پاس سیزر کے محافظ کھڑے رہیں (وہ برآمدہ سے اُتر کر دالان میں آملتا ہے) وہ مصری کہاں ہیں - ان کو چلے جانیکی اجازت دیدی؟

سیزر - (زبان چبا کر) میں نے تھیوڈوٹس کو کتبخانے کو بچانے کے لئے جانے کی اجازت دیدی ہے۔ روفیو ہمکو ادب (لٹریچر) کی عزت کرنی چاہئے۔

روفیو - (بیزار ہوتے ہوئے) بیوقوفی - جہالت - مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ہسپانیہ گال اور تھسلی کے تمام مُردوں کو زندہ کرسکتے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان سے دوبارہ لڑیں۔

سیزر - کیا دیوتا ساری دنیا کو برباد نہ کردیں اگر صرف آئندہ سال تک مطمئن رہنے کا خیال ان کو ہو؟ (روفیو بے چینی اور غصہ سے منہ پھیر لیتا ہے۔ سیزر فوراً اسکی آستین پکڑ لیتا ہے اور اس کے کان میں چپکے سے کہتا ہے) میرے دوست ایک مصری کو قید کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ دو رومی سپاہی اس کی حفاظت کے لئے مقید ہوسکتے ہیں؟

(روفیو نہایت مردہ دل ہوکر سیزر کی طرف
سے پلٹتا ہے اور برآمدہ میں جاتا ہے اور سفر
کی طیاریوں کو دیکھکے پھر باہر چلا آتا ہے)

سیزر - کیا برٹینس سوگیا؟ میں نے ایک
گھنٹہ ہوا اُسے زرہ بکتر لانے کو بھیجا تھا - (پکارکر)
برٹینس! او برطانوی جزیرہ کے رہنے والے
برٹینس

(کلیوپیٹرا، سیزر کی زرہ اور تلوار لئے ہوئے
جو اس نے برٹینس سے لے لی تھی، برآمدہ سے
داخل ہوتی ہے - برٹینس اور دوسری چیزیں
لئے ہوئے پیچھے پیچھے آتا ہے دونوں سیزر کے
پاس آتے ہیں - وہ سیزر کی داہنی جانب
اور برٹینس بائیں جانب کھڑا ہوجاتا ہے)

کلیوپیٹرا - میں تم کو کپڑے وغیرہ پہناؤنگی سیزر
بیٹھ جاؤ - (وہ بیٹھ جاتا ہے) یہ رومی خود ہے بہت
موزوں ہے (وہ اس کی پگڑی اتار ڈالتی ہے) اوہ -
(وہ قہقہہ مارتی ہے)

سیزر - تم کس بات پر ہنس رہی ہو؟

کلیوپیٹرا - تمھارے گنجے سر پر -

سیزر - (گھبراکر) کلیوپیٹرا -

(وہ برٹینس کی سہولت کی خاطر، جو اُسے جوشن
پہنا رہا ہے کھڑا ہوجاتا ہے)

کلیوپیٹرا - اس لئے تم یہ پگڑی پہنتے ہو - اسے چھپانے
کے لئے -

برٹینس - او مصری خاموش رہ یہ ایک فاتح کے
راز ہیں -

(وہ جوشن باندھ دیتا ہے)

کلیوپیٹرا - چپ رہ - او جزیرے کے باشندے
(سیزر سے) تمھیں اپنے سر پر تیز سرکہ ملنا چاہیے
سیزر اس سے بال نکل آئیں گے -

سیزر - (منہ بناکر) کلیوپیٹرا اگر تم کہو تو یاد دلادوں
کہ تم ابھی بالکل جوان ہو -

کلیوپیٹرا - نہیں -

سیزر - (بیٹھکر اور پاؤں برٹینس کی طرف پھیلاکر)
اور میں بھی اس بات کو یاد رکھنا پسند نہیں کرتا کہ میں
کیا ہوں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بہتر ہے میں اپنی
زندگی کے بہترین دس سال تمھارے نذر کردوں اس سے
تم چھبیس سال کی ہوجاؤگی - اور مجھے چھوڑو - میرا
کیا ہے یہ سودا تمھیں منظور ہے؟

کلیوپیٹرا - منظور - چھبیس خیال رکھو - (وہ اسے خود
پہنا دیتی ہے) اوہ - کس قدر خوبصورت ہے تم اسکو
پہنکر صرف پچاس برس کے معلوم ہوتے ہو -

برٹینس - (کلیوپیٹرا کی طرف سختی سے دیکھکر) تم کو
سیزر سے اس طرح گفتگو نہ کرنی چاہیے -

کلیوپیٹرا - کیا یہ سچ ہے کہ جب سیزر نے تم کو
اس جزیرہ میں پکڑا تھا تو نیلے رنگ سے رنگ دیا تھا؟

برٹینس - نیلا رنگ تمام برطانوی شرفا استعمال
کرتے ہیں - جنگ میں ہم اپنے جسم کو نیلا رنگ لیتے ہیں

(وہ کھڑا ہوجاتا ہے)

کلیوپیٹرا - (سیزر کی تلوار لیکر) مجھے یہ لٹکانے دو

اب تم بڑے شاندار معلوم ہوتے ہو۔ کیا روم میں تمھارا کوئی مجسمہ بنایا گیا ہے؟

سیزر۔ ہاں بہت سے مجسمے۔

کلیوپیٹرا۔ تو تم کو چاہیئے کہ ایک رنگوا کر مجھے دو۔

(روفیو دوبارہ برآمدہ میں آتا ہے اور بے چین معلوم ہوتا ہے)

روفیو۔ سیزر! کیا باتیں ختم ہو چکیں؟ جیسے ہی تمھارا قدم جہاز پر ہوگا۔ ہمارے آدمیوں کی گرفتاری شروع ہو جائے گی۔ کشتیاں روشن مینار تک پہنچنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں گی۔

سیزر۔ (تلوار کھینچکر اس کی دھار چھوتے ہوئے) بری ٹینس کیا یہ تلوار آج بالکل ٹھیک ہے پہلے تو یہ ایک چھری کی طرح بالکل کند تھی۔

بری ٹینس۔ یہ آج ایک مصری کے بال کو بھی دو کر سکتی ہے۔

کلیوپیٹرا۔ (یکایک خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھ سیزر کی گردن میں حائل کرتے ہوئے) او۔ تم جنگ میں تو نہیں جا رہے ہو کہ لڑ کر مارے جاؤ۔

سیزر۔ نہیں کلیوپیٹرا۔ کوئی شخص مر جانے کو جنگ میں نہیں جایا کرتا۔

کلیوپیٹرا۔ لیکن جانیوالے ضرور مر جاتے ہیں میرا بہنوئی بھی لڑائی میں مارا گیا۔ تم کو نہ جانا چاہیئے۔ اس کو جانے دو (روفیو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سب اس پر ہنستے ہیں) او خدا کے لئے مت جاؤ۔ اگر تم پھر واپس نہ آئے تو میری کیا حالت ہوگی؟

سیزر۔ (سنجیدگی سے) کیا تم خوفزدہ ہو؟

کلیوپیٹرا۔ (بے چینی سے) نہیں۔

سیزر۔ (خاموش اور بارعب انداز سے) جاؤ تم برآمدہ میں سے جا کر دیکھو کہ ہم جزیرہ پر کس طرح قبضہ کرتے ہیں۔ تمھیں جنگی مناظر دیکھنے کا درس لینا چاہیئے جاؤ (وہ افسردہ دلی کے ساتھ جاتی ہے اور برآمدہ میں سے باہر کی طرف دیکھتی ہے) ہاں اب ٹھیک ہے۔ روفیو۔ چلو۔

کلیوپیٹرا۔ (یکایک تالی بجا کر) تم نہ جا سکو گے؟

سیزر۔ کیوں؟ اب کیا رہ گیا ہے؟

کلیوپیٹرا۔ ادھر (اپنی بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئی) ساحل پر فوجیوں کی ایک بڑی جماعت پانی ڈول سے نکال رہی ہے

روفیو۔ (جھک کر دیکھتے ہوئے) سچ ہے۔ مصری فوج مغربی ساحل کے کنارے ٹڈی دل کیطرح حرکت کر رہی ہے۔ (وہ غصہ سے اتر کر سیزر کے پاس آتا ہے) یہ آپ کی بربادی کا سامان ہے سیزر تھیوڈوٹس ان کو اپنے ساتھ لایا ہے۔

سیزر۔ (خوش ہو کر) روفیو میں نے خود اس سے کہا تھا۔ وہ لوگ آگ بجھانے آئے ہیں اور جتنی دیر تک وہ کتب خانے کی آگ بجھانے میں منہمک رہیں گے ہم روشنی کا مینار اپنے قبضے میں کر لیں گے۔

(وہ برآمدہ میں تیزی سے جاتا ہے اور بری ٹینس بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے)

روفیو - (آزردہ خاطر ہو کر) انتہائی بیوقوفی۔
(وہ باہر چلا جاتا ہے - ایک سپاہی کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ سیزر نیچے پہنچ گیا۔)
صوبیدار - (نیچے) سب لوگ جہاز پر چلو اور راستہ خالی کرو۔
کلیوپیٹرا - (اپنا رومال برآمدہ میں ہلاتی ہے) پیارے سیزر، خدا حافظ ——— (باقی دارد)

(ترجمہ برنارڈشا) محشر عابدی

آئندہ جنوری (۱۹۳۳ء) کے نگار کے چند مختلف ٹکڑے

تاریخ الفحشاء یا شہوانیات کے موضوع پر

(حضرت نیاز فتحپوری کے قلم سے)

ہیروڈوٹس مشہور مورخ لکھتا ہے کہ "سب سے پہلے اہل مصر میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہیکلوں اور معبدوں کے اندر عورت سے بات چیت کرنا ناجائز ہے اور اس میں اس حد تک غلو ہوا کہ اگر مندر میں داخل ہونے سے قبل وہ کسی عورت سے گفتگو کر لیتے تھے تو بغیر غسل کیے ہوئے اندر نہ جاتے تھے۔ لیکن اہل مصر کے علاوہ دیگر اقوام و ملل کا نظریہ کچھ اور تھا وہ کہتے تھے کہ جب مندروں اور معبدوں کے اندر مختلف قسم کے جانور اور طیور باہم گر ملتفت ہوتے ہیں اور دیوتا اس سے ناخوش نہیں ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ مرد و عورت کا اختلاط وہاں ناجائز قرار دیا جائے۔ یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر گیا کہ معبدوں کے اندر اختلاط جنسی مذہبی عبادت قرار پایا

ایک عرب جغرافیہ داں نے یوروپ کی سلافی قوم کی نسبت حسب ذیل دلچسپ تحقیق پیش کی ہے:—
اگر سلافی قوم کی کوئی لڑکی کسی مرد پر فریفتہ ہو جاتی ہے تو وہ بالکل آزاد ہوتی ہے۔ اور اس پر بجائے ملامت کے اظہار فخر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ اگر شادی کے بعد لڑکی کی عصمت غیر مجروح پائی جاتی ہے تو اس کا مرد اس پر طعن کرتا ہے اور اگر گھر سے نہیں نکالتا تو بہت ذلت کے ساتھ رکھتا ہے۔

مغرب کی ایک پیشہ ور عورت نے جو اپنے تجربات لکھے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں وہ لکھتی ہے:—
"میں گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی ایک دولتمند شخص آتا اور میرے اور میری ہمسن لڑکیوں کے سامنے بالکل برہنہ ہو جاتا اور تھوڑی دیر کے بعد چلا جاتا۔ بعد کو یہ شخص گرفتار ہو کر قید میں ڈال دیا گیا۔ میں نے بعض مردوں میں اس سے زیادہ عجیب و غریب شوق دیکھے۔ مثلاً میرے پاس ایک نوجوان آتا اور لوٹے یں سپید کبوتر کا ایک جوڑا بھی اپنے ساتھ لاتا۔ اس کے آنے کے بعد میں اور

میرے ساتھ کی دوسری لڑکی بہ حالت عریانی ایک ایک کبوتر اپنے ہاتھ میں لیتی اور ان کی گردنیں مروڑ کر زمین پر ڈال دیتی - اس جوان پر یہ منظر دیکھ کر سخت ہیجانِ نفس طاری ہو جاتا -

یہی عورت دوسری جگہ لکھتی ہے " ایک بار کا ذکر ہے کہ مجھے بازار میں ایک مرد ملا اور بولا کہ اگر آپ پسند کریں تو میرے ساتھ ہوٹل چلیں وہاں میں آپ کے بوٹ چاٹنا چاہتا ہوں' چنانچہ معاملہ طے ہو گیا اور ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہوئے - یہاں پہونچکر میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور وہ میز کے نیچے گھس کر میرے بوٹ جو کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے دیر تک چاٹتا گیا -

ایک اور صاحب کے متعلق لکھتی ہے کہ :-

وہ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک قمچی لایا کرتا تھا اور میرے ساتھ کی لڑکی کو خوب مارتا تھا یہاں تک کہ اس کے جسم سے خون جاری ہو جاتا - یہی منظر اس کے لئے باعث ہیجان ہوا کرتا تھا -

---

قدیم یونان میں " استلذاذ بالضد" کا شوق خاص خاص لوگوں تک محدود تھا یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہسواروں کو اس کی اجازت تھی - غلام یہ حرکت ہرگز نہ کر سکتے تھے ' ان کے لئے سزائے موت مقرر تھی - بڑھتے بڑھتے جب یہ شوق عام ہو گیا تو مستقلاً اک معاشرتی ادارہ بنگیا اور حکومت نے بھی اس کی سرپرستی اختیار کر کے قوانین وضع کئے -

ملک اسپارٹا میں رواج تھا کہ جب لڑکا بارہ برس کا ہو جاتا تو وہ آزاد ہوتا کہ جس کے پاس جائے رہے جزیرۂ کریٹ میں اس شوق نے اس قدر ترقی کی کہ باضابطہ شادیاں ہونے لگیں - اگر کوئی شخص کسی امرد پر مائل ہوتا تو وہ اس کے والدین یا اعزہ کو آگاہ کر دیتا پھر اگر اس کے خاندان والے اس تعلق کو پسند کرتے تو اس کی حفاظت کرتے ورنہ ملنے کی اجازت دیدیتے - نہ صرف جزیرۂ کریٹ بلکہ تھیبا اور تھیرا میں بھی اس قسم کی شادی کی رسم مذہباً جاری تھی - چنانچہ تھیبا میں اپالو کے مندر کے قریب ایک کتبہ اب بھی نظر آتا ہے - جس پر یہ عبارت کندہ ہے -

اس مقدس مقام پر بادشاہ کریون نے باسقلیس کے بیٹے سے شادی کی اور

اس نے اس یادگار میں یہ کبھی نہ محو ہونے والا نشان قائم کیا -

روم میں بھی یہی حالت تھی چنانچہ بیبل لکھتا ہے کہ عورتوں سے زیادہ یہاں امارد کے " فحش خانے " موجود تھے -

---

مردوں کی طرح عورتوں میں بھی استلذاذ بالمثل کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں اور تاریخ قدیم وجدید اس

قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔

وہ کون ہے جو سیفو کو نہیں جانتا اور اس کی شاعری پر ایمان نہیں لایا، لیکن غالباً آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا تھی۔ وہ لڑکیوں سے بالکل اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح مرد ایک عورت سے کرتا ہے چنانچہ ایک لڑکی فاؤن کی عشق میں وہ اس حد تک مبتلا ہوگئی کہ جان دینے کے لئے سمندر میں کود پڑی ـــــ وہ اپنی سہیلیوں کو اسی شوق و ذوق کے خط لکھا کرتی تھی جیسے الکائیس اپنے محبوب لڑکوں کو لکھا کرتا تھا۔

"استلذاذ بالنفس" کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی اور دوسری فحاشیوں کی۔ چنانچہ بابل و آشوریا کے کھنڈروں میں جو معابد برآمد ہوئے ہیں ان کی دیواروں پر مصنوعی اعضا کی تصویریں بکثرت نظر آتی ہیں صحیفہ خرقی ایل میں بھی ایک جگہ اشارہ موجود ہے (ملاحظہ ہو صحیفۂ مذکور باب ۱۶ آیت ۱۷)

"تو نے مرے دئے ہوئے سونے چاندی کے زیور بھی لے لئے۔ تو ان سے مردوں کے بت بناتی ہے اور اُن سے اپنی خواہش پوری کرتی ہے"

برطانیہ کے عجائب خانہ میں ایک قدیم یونانی گلدان موجود ہے جس پر ایک یونانی پیشہ ور عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے اور وہ اپنے ہاتھ میں مصنوعی عضو جنسی لئے ہوئے ہے۔ اس قسم کا ایک دوسرا گلدان پامپیائی کے کھنڈروں سے برآمد ہوا جو اٹلی کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

قدیم یونانی عورتوں میں اس آلہ کا نام اولسبوس تھا، لاطینی میں فلّس کہتے تھے، فرانسیسی میں اس کے لئے اصطلاح گاڈیمیشہ رائج تھی، انگریزی میں اس کا نام ڈلڈو تھا، اور جرمنی میں سمجھا نسے نسوانی عضو کا نام انگریزی اصطلاح میں مرکن تھا۔

الغرض کتاب تاریخ الفحشا، اسی قسم کے ہزاروں واقعات سے لبریز ہے اور فحاشی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر تاریخی، علمی، نفسیاتی بحث نہ کی گئی ہو۔ اس لئے جنوری ۱۹۳۳ء کے نگار کا جو کم از کم دس جزو پر شایع ہوگا انتظار کیجئے۔

ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کتاب آج کل کی ان کتابوں کی طرح عریاں و مخرب اخلاق نہیں ہے جو عام طور سے بازار میں نظر آتی ہیں اور جو صرف نام بدل کر کوک شاستر کو پیش کرتی ہیں۔ یہ کتاب ایک نادر مجموعہ ہے تاریخی تحقیق کا نفسیاتی نظریوں کا اور بے مثل جنسی معلومات کا

تاجدار رقاصہ

(تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق)

آج قصر فرعون دلھن کی طرح سجا ہوا ہے۔ جوق در جوق تماشائی ہر چہار طرف سے کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں فوج کے مسلح سپاہی باقاعدہ دروازوں پر کھڑے ہوئے نگرانی کر رہے ہیں۔ موسیقی کی آوازیں مختلف خوشبوؤں کے ساتھ لپٹی ہوئی اندر سے آ آ کر باہر تماشائیوں کے کانوں تک پہونچ رہی ہیں۔ جب کوئی کاہن یا سردار اندر داخل ہوتا ہے تو لوگوں کی صفیں پھٹ جاتی ہیں اور ان پر ہر طرف سے پھول برسائے جاتے ہیں آج فرعون نے جشن طرب برپا کیا ہے اور اپنے ملک کے تمام اکابر کو دعوت شرکت دی ہے

فرعون امنحوتب چارم اپنے طلائی جڑاؤ تخت پر پوری شان فرعونیت کے ساتھ جلوہ گر ہے، چاروں طرف امرا، حلقہ کئے ہوئے ہیں، رامشگر رقص و سرود میں مصروف ہیں۔ اور ہر طرف "فرعون زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

فرعون کے پہلو میں اس کی ماں ملکہ تیتی بیٹھی ہوئی ہے جو امنحوتب ثالث کی بیوی تھی۔ امنحوتب ثالث، فراعنہ مصر میں نہایت ہی بہادر و قوی فرعون گزرا ہے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تیر ایسا نہیں چلایا جو نشانہ پر جا کر بھرپور نہ بیٹھا ہو۔ میدان جنگ میں اس کی شجاعت بجلی کا سا کام کرتی تھی اور جب شکار کو جاتا تھا تو صحرا کا صحرا درندوں سے خالی ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے دس سال کے عرصہ میں علاوہ اور بہت سے درندوں کے ایک سو بارہ شیر اپنی تلوار سے ہلاک کئے۔

اس کا بیٹا امنحوتب چہارم بھی اپنے باپ کی طرح فتح ممالک کا شائق تھا لیکن اس کا طریق کار جدا تھا اس کے اسلحہ کچھ اور تھے۔ اس کا باپ تو تیر و تبر، تیغ و خنجر، نیزہ و کمان سے کام لیکر دشمنوں کو مغلوب کرتا تھا لیکن اس نے نئے دین اور نئے عقائد کا اجرا کر کے لوگوں کی روح کو مفتوح کرنا چاہا۔ اس نے کاہنوں کے اقتدار اور خدائے آمون کے پرانے معابدوں کو مٹا کر نئے ہیکلوں کی بنیاد ڈالی اور اسی وقت سے اس کا نام اخناتون ہو گیا۔

لیکن اس وقت جو جشن اس نے ترتیب دیا اس کا تعلق کسی مذہبی رسم سے نہ تھا بلکہ فرمانروائے سوریا و شرقیہ کے ایلچی کی پذیرائی کے لئے تھا۔

امنحوتب کی ماں ملکہ تیتی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے اپنی ہی یا جگر ارادہ شاہوں میں سے کسی

بادشاہ کی بیٹی کو تلاش کرے اور چونکہ شاہ سوریا کی بیٹی حسن وجمال کے لحاظ سے اس وقت آشوب زمانہ بنی ہوئی تھی اس لئے اُس نے وہیں پیام دیا اور اس وقت وہیں کا ایلچی ہدایا وغیرہ لیکر آیا تھا تاکہ رسم نسبت ادا کی جائے اور شاہ سوریا کی بیٹی "تادو" اخناتون کے رشتۂ ازدواج میں آکر ملکۂ مصر بنے۔

شاہ سوریا کے ایلچی نے اپنے بادشاہ کا مکتوب پیش کیا اور وہ ہدایا سامنے گزرانے جو اخناتون کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اخناتون نے ان کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا اور افسر تشریفات کو حکم دیا کہ جلسۂ رقص شروع کیا جائے۔

اس حکم کے ملتے ہی مصر کی بہترین رقص کرنے والی لڑکیاں جو اپنے حسن وجمال اور فن دلربائی کے لحاظ سے نظیر نہ رکھتی تھیں دس دس کی جماعت میں سامنے آئیں اور اپنی سحر کاریوں سے ہر ہر شخص کو مبہوت بنانا شروع کیا۔ جب ان سب کا رقص ختم ہوگیا تو معلوم ہوا کہ ایک رقاصہ باقی رہ گئی ہے جو تنہا بغیر کسی کی معیت کے اپنے فن کی نمائش کرنا چاہتی ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ حاضر کی جائے۔

وہ اندر داخل ہوئی اور اس ادا سے گویا کہ وہ وادیٔ نیل کی سب سے زیادہ لچکدار ناگن تھی۔ اُس نے ناچنا شروع کیا مگر اس انداز سے گویا کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت رقصیہ سے کائنات کو الٹ دینا چاہتی ہے اس کی آواز میں، اس کی آنکھوں میں، اس کے جسم کی ہر ہر جنبش میں، ایک ایسا ملکوتی سحر پنہاں تھا کہ لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید وہ کسی اور دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رقص ختم ہوا تو اخناتون نے ایک عالم مسرت میں حکم دیا کہ اس کو سامنے لایا جائے۔ وہ ڈری کہ کہیں اس کے رقص کا الٹا اثر تو نہیں ہوا کیونکہ فراعنہ کی بہت سی داستانیں وہ سن چکی تھی اور متعدد مثالیں اس کے سامنے ایسی تھیں کہ سب سے زیادہ خونریزیاں انھوں نے اسی وقت کیں جب ان کے چہروں پر تبسم دوڑ رہا تھا اور آنکھوں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ وہ سامنے گئی لیکن اس طرح ڈرتی ہوئی، کانپتی ہوئی گویا کہ وہ شاخ بید تھی جس سے بادصرصر گزر جائے۔

اخناتون نے کہا۔ "اور قریب آ" اس کو یقین ہوگیا کہ آج خیر نہیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن بالکل اس طرح جیسے کوئی جسم بیجان کو پکڑ کر آگے بڑھا دے —— اخناتون نے کہا "اور قریب آ" وہ اور آگے بڑھی، یہاں تک کہ فرعون کے چہرہ سے اس کے چہرہ کا فصل ایک بالشت سے زیادہ نہ تھا۔

فرعون نے پوچھا "میں نے تجھے اس سے قبل قصر کے ارباب نشاط میں نہیں دیکھا۔ تو ابھی آئی ہے"۔

رقاصہ —— "اے مالک مجھے یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہوگئے"۔

فرعون - "کیا رقص تجھے بہت محبوب ہے"
رقاصہ - " اے آقا، جنون کی حد تک"
فرعون - "کیا تو شرفاء مصر کے کسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے"
رقاصہ - "ہاں، اے آقا"
فرعون - "تیرا نام کیا ہے"
رقاصہ - "نفرتیتی"
فرعون - کس قدر پیارا نام ہے۔ نفرتیتی!"

دربار میں سکوت کامل طاری تھا کہ فرعون اُٹھا اس نے رقاصہ کے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے اور اس کو اپنے سے اور زیادہ قریب کھینچکر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، ــــ "اے نفرتیتی تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

یہ سنتے ہی رقاصہ کے آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہوگئے اور فرعون نے اس کے بالوں کی لٹوں کو چھوتے ہوئے کہا ــ "اے نفرتیتی، تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

ملکہ تیی یہ حالات معلوم کرکے بہت فکرمند ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کو تنہائی میں بلاکر سمجھایا کہ اس طرز عمل سے شاہ سوریا کو سخت تکلیف پہونچے گی اور نقض عہد مناسب نہیں، کاہنوں نے کہا کہ اگر نفرتیتی سے شادی کا ارادہ کیا تو ملک پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہونگی۔ کاہنوں کے سردار نے کہا کہ وہ رسم نکاح کو ادا نہ کرے گا۔ لیکن ان سب کا جواب اخناتون کے پاس صرف یہی تھا کہ "نفرتیتی کے خوبصورت سر پر مصر کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوگا"

ایک مہینہ کے بعد سرزمین مصر نے ایک اور منظر جشن طرب کا دیکھا۔ جلوس راستہ سے گزر رہا ہے۔ فوجی دستے، مسلح سوار چاروں طرف حفاظت پر مامور ہیں، اور شاہ سوریا کی بیٹی زرین رتھ پر سوار قصر فرعون کی طرف جارہی ہے۔

اخناتون نے پورے شاہانہ اہتمام کے ساتھ اپنی بیوی کا خیر مقدم کیا، لیکن اس کی صورت دیکھنے سے انکار کردیا۔ ہفتوں پر ہفتے گزر گئے، لیکن اخناتون کسی طرح اس پر راضی نہ ہوا کہ وہ شاہ سوریا کی بیٹی سے خلوت میں ملے۔ آخرکار ملکہ تیی نے مجبور ہوکر اُسے شاہ سوریا کے پاس اس پیغام کے ساتھ

واپس کر دیا کہ فرعون بیمار ہے اور اس کی بیماری تعلق از دواج کے منافی ہے۔
ٹھیک اس وقت جبکہ تادور اپنے باپ کے سامنے سوریا میں اپنی تمام داستان درد دہرا رہی تھی مصر میں ہنگامۂ جشن برپا تھا اور نفرتیتی مصر کا تاج زیب سر کئے ہوئے اخناتون کے پہلو میں حکمرانی کر رہی تھی

امنحوتب جس نے انقلاب دینی کے بعد اپنا نام اخناتون رکھ لیا تھا۔ ۳۰ سال کی عمر تک زندہ رہا اور نفرتیتی سے سات لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن میں سے دوسری لڑکی ایک سردار سے بیاہی گئی جس کا نام توتو تھا اور جو بعد کو توت عنخ آمون کے نام سے مشہور ہوا۔
یہی وہ فرعون تھا جس کا مقبرہ چند سال ہوئے دریافت ہوا اور عرصہ تک اخبارات میں موضوع بحث بنا رہا ——

ایک دشمن محبت سلطنت

اخلاق انسانی میں سب سے زیادہ بلند چیز رشتۂ محبت سمجھا جاتا ہے اور اسی کو انسانیت کا مدار قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس وقت دنیا میں ایک ایسی سلطنت و حکومت بھی ہے، جو اس جذبہ کی سخت دشمن ہو اور اس کو بیخ و بن سے فنا کر دینا چاہتی ہے۔ وہ سلطنت روس کی ہے، وہ حکومت بالشیوک ہے۔

مغرب میں اس سے قبل بھی اور اب بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب کوئی مرد شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہ اس عورت سے ملنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ جس کی طرف اس کو میلان ہے، پھر رفتہ رفتہ اس سے مراسم بڑھاتا ہے، اس کے ذوق کا مطالعہ کرتا ہے اور مہینوں برسوں میں جاکر کہیں وہ منزل آتی ہے جب وہ کسی خنک شب ماہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی التجائے محبت پیش کرتا ہے۔

لیکن بالشیوک روس جو دنیائے سعی و عمل میں اب صرف میکانکی انسان پیدا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے لئے طیار نہیں اور وہ کہتا ہے کہ شادی سے قبل ان تمام تمہیدات میں زندگی کے قیمتی لمحات کھو دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دیگر ممالک یوروپ میں علاوہ جذبۂ محبت کی تسکین کے ایک مقصود شادی کا یہ بھی ہوتا ہے کہ مرد اہلی زندگی کے اُس سکون کو بھی حاصل کر سکے جسے صرف عورت ہی کی محبت بھری ذات مہیا کر سکتی ہے، یعنی وہ تربیت اولاد اور انتظام خانہ داری میں عورت کو شریک بنا کر اپنی حیثیت و معاشرت کی راہوں میں بھی آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن بالشیوک روس کہتا ہے کہ کہاں کی اہلی زندگی اور کیسی معاشرتی آسانی۔ انسان ہر وقت کام کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس میں مرد و عورت کی کوئی تفریق نہیں روس کا مرد جب کسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی تمہید کے نہایت صفائی اور کھلے الفاظ میں اس سے کہتا ہے:-

> "میں جوتا بنانے کے کارخانے میں کام کرتا ہوں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی سلائی کے کارخانے میں کام کرتی ہو اور مجموعی طور پر ہم دونوں کی ہفتہ وار اجرت دو اشرفی ہوتی ہے۔ اس لئے بتاؤ کہ شادی کرو گی یا نہیں۔"

وہ عورت یہ سنکر بغیر اس کے کہ اس کے چہرہ پر شرم و حجاب کی سرخی نظر آئے جواب دیتی ہے :۔

"کیا تمھارے پاس کوئی مکان یا کمرہ ایسا ہے جس میں ہم دونوں رہ سکیں"

وہ کہتا ہے ——— "نہیں، لیکن تمھارے پاس تو ہے اور اسی میں ہم دونوں بسر کر سکتے ہیں"

اس کے بعد ہی وہ دونوں "محکمۂ ازدواج" کے دفتر میں چلے جاتے ہیں۔ یہاں دونوں کا وزن کیا جاتا ہے طبی معائنہ ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں جو گویا اقرار نامہ ہے اس امر کا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ جہیز ہے نہ مہر، نہ اقرار وفاداری ہے نہ خطبہ نہ کوئی پادری ہوتا ہے نہ کلیسہ۔

یوروپ کے دوسرے ممالک میں بھی فریقین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے لیکن صرف اس لئے کہ امراض متعدیہ نہ پھیلیں۔ مگر روس میں طبی معائنہ صرف اس اصول و غائت کے ساتھ ہوتا ہے کہ بچے مضبوط، قوی اور صحیح الاعضا پیدا ہوں۔

روس کے جوانوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ محبت ایک جذبۂ مجہول ہے، ایک کیفیت ناکارہ ہے، اس سے مغلوب ہوجانا انسانیت کی توہین اور اس کے لئے سرگرداں رہنا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ بیوی بنانے کے لئے اس جذبہ سے کام لینے کی مطلق ضرورت نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اس سے اولاد صحیح و توانا پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں۔ بالشیوک حکومت نکاح کو ضروری قرار دیتی ہے لیکن اس کا کہنا یہ ہے کہ نکاح صرف نکاح کے لئے ہونا چاہئے، نسل بڑھانے کی غرض سے ہونا چاہئے نہ کہ لذت محبت کے لئے۔

اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جو خدمات دیگر ممالک یوروپ میں عورت سے متعلق ہیں ان سے روسی عورت کو کوئی علاقہ نہیں۔ ہر جگہ عام طور پر ایک بیوی کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے راحت و آرام کا خیال رکھے اس کے لئے کھانا پکائے، کپڑے درست رکھے گھر کا انتظام کرے، لیکن روس کی بیوی ان تمام فرائض سے آزاد ہے۔ کیونکہ جس طرح مرد گھر سے باہر نکل کر کام کرنے پر مجبور ہے، اسی طرح عورت بھی ہے اور خانگی انتظام کی صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ مرد و عورت میں سے جو کوئی سب سے پہلے بیدار ہو وہ جلدی جلدی کام ختم کرے۔

پھر جس طرح وہاں شادی کر لینا معمولی و آسان بات ہے، اسی طرح طلاق دینا بھی دشوار نہیں، جب میاں بیوی میں کوئی ایک یا دونوں جدائی چاہتے ہیں تو محکمۂ متعلقہ میں جا کر اس کی اطلاع کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی اولاد ہوتی ہے تو حکومت کے سپرد کر دیجاتی ہے جو ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہے۔

وہاں فوج کے سپاہیوں کو جہاں اور عسکری تعلیم دیجاتی ہے، وہیں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا جاتا ہے کہ

محبت سے زیادہ بُری چیز کوئی نہیں، پھر یہ کوشش اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ تمام اطراف وجوانب میں مُبلغ روانہ کئے جاتے ہیں جن کا فرض صرف یہی ہوتا ہے کہ محبت کے خلاف پروپاگنڈا کریں۔

محبت کے خلاف اپنی نفرت کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ محبت کی گزشتہ تاریخ نہایت خطرناک ہے، اسی کے وجہ سے انسان مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، یہی جذبہ سلطنتوں اور حکومتوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اور بہت سے جرائم کی بنیاد بھی یہی ہے۔

سرعت سیر کا مستقبل

اور

دوسرے کُروں تک انسانی پرواز

حیوان و انسان کے درمیان

پروفیسر اینڈروز مشہور امریکن سیاح کا بیان ہے کہ وہ صحرائے گوبی میں اپنی موٹر پر جا رہا تھا کہ دفعتہ ایک ہرن جنگل سے نمودار ہوا اور موٹر کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا - موٹر کی رفتار اس وقت ۵۰ میل فی گھنٹہ تھی، لیکن تھوڑی دیر میں ہرن موٹر سے آگے نکل گیا اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو گیا - کیونکہ ہرن ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا -

خرگوش کی رفتار کا اندازہ ۳۵ میل کیا گیا ہے اور شکاری کتے ۴۰ میل کی رفتار سے دوڑتے ہیں لومڑی اس سے بھی زیادہ تیز دوڑتی ہے اور بعض شکاریوں کا بیان ہے کہ چھوٹا ہرن ۵۰ میل کی رفتار سے بھاگتا ہے -

چڑیوں کی پرواز ان سے زیادہ تیز ہے - چنانچہ حال ہی میں امریکہ کے ایک کبوتر نے ۳۰۰ میل کا سفر ۱۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کیا - یوروپ میں ایک خاص قسم کا گدھ ہوتا ہے اس کے متعلق ایک ہوائی جہاز راں کا بیان ہے کہ ایک بار وہ اپنے جہاز پر جا رہا تھا کہ یہ گدھ مل گیا اور دونوں میں مقابلہ شروع ہوا - نتیجہ یہ ہوا کہ گدھ ۱۱۰ میل کی رفتار سے اڑنے لگا اور جہاز سے آگے بڑھ گیا -

ایک بار ایک ابابیل کو اس کے گھونسلہ سے نکال کر کسی دوسرے مقام پر جو ۱۴۸ میل دور تھا لے گئے اور چھوڑ دیا گیا - یہ ایک گھنٹہ ۸ منٹ میں پھر اپنے گھونسلہ میں داخل ہو گئی یعنی اس نے ۱۳۴ میل کی رفتار سے اپنا سفر طے کیا -

اب ان چوپایوں اور چڑیوں کے مقابلہ میں انسان کے عضلات کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ وہ بہت ضعیف ہیں - دنیا میں سب سے زیادہ تیز چلنے والا فنلینڈ کا ایک شخص ہے جو ۱۴ میل فی گھنٹہ کے حساب سے چل سکتا تھا، البتہ اگر انسان اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو تو ۱۲ میل فی گھنٹہ طے کر سکتا ہے اور گھوڑے پر ۴۰ میل - پانی کے اندر وہ ڈھائی میل سے زیادہ نہیں جا سکتا، درانحالیکہ بڑی سی بڑی مچھلی دس میل جاتی ہے - البتہ اگر برف پر انسان پھسلے تو ۲۰ میل کی رفتار سے جا سکتا ہے - لیکن باایں ہمہ وہ اپنی دماغی ترقی سے ایسے میکانکی

ذرایع ضرور پیدا کر لیتا ہے جو اس کے عضلات کی کمزوری کی پوری تلافی کرنے والے ہیں۔ چنانچہ سیگریو کا ۲۳۱ میل کی رفتار سے ساحل فلوریڈا پر موٹر چلانا، پھر کپتان کیمبل کا اس رفتار کو ۲۴۵ میل تک بڑھا دینا اسی طرح ہوائی جہاز کو اسٹنفورتھ کا ۴۰۷ میل کی رفتار سے لے جانا، یہ سب ایسی شہادتیں ہیں جن کو دیکھکر انسانی سرعت رفتار کے مستقبل کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تاریخ سرعت

اس میں شک نہیں کہ انسان کی یہ سرعت رفتار نہایت تدریج کے ساتھ اور کافی مدت میں ہوئی ہے۔ انجن سے پہلے صرف معدنوں کے اندر سے پانی کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا اور رکال ایک صدی کے بعد خیال اس طرف منتقل ہوا کہ اگر انجن کسی گاڑی میں لگا دیا جائے تو اس کی رفتار بڑھ سکتی ہے اول اول لوہے کی پٹریوں پر گھوڑوں کے ذریعہ سے گاڑیاں کھینچی جاتی تھیں، اور جب کامل دو صدیاں گزر گئیں تو انجن لگانے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلی گاڑی جو دخانی انجن سے چلائی گئی وہ ۱۸۰۴ء میں بمقام ویلز چلائی گئی جس کی رفتار ۵ میل فی گھنٹہ تھی۔ ۵۰ سال تک اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی حتیٰ کہ ایک کمپنی قائم ہوئی اور اس مسئلہ پر غور کیا گیا۔

بات یہ ہے کہ اول اول لوگ سرعت رفتار کے خیال سے ڈرتے تھے، چنانچہ اُس وقت کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ "معمولی گاڑیوں کی رفتار سے دو چند رفتار کی برداشت محال ہے اور اگر تیزی کا ایسا ہی شوق ہے تو ہوائی میں بیٹھ کر کیوں نہ سفر کیا جائے"۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ پارلیمنٹ نے نہایت مشکل سے لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل کی پٹری بچھانے کی اجازت دی۔

ہر چند جارج اسٹوفنسن نے ایک دخانی گاڑی چلا کر تجربہ کرا دیا تھا، لیکن لوگوں کو اطمینان نہ تھا اور ایک شخص لارڈز نامی نے تو اپنی تقریر میں صاف صاف کہہ دیا کہ دس میل سے زیادہ اگر گاڑیاں چلائی گئیں تو وہ وہیں ٹھہر کر رہ جائیں گی کیونکہ پہیے اس رفتار میں صرف اپنے محور ہی پر چکر کھا کھا کر رہ جائیں گے اور آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ الغرض اسٹوفنسن کے اس خیال پر کہ ۲۰ میل کی رفتار سے کسی گاڑی کا چلنا ممکن ہے، لوگ اُسے پاگل ہی سمجھتے رہے۔ آخر کار اُس نے مجبوراً ۲۰ کا نام لینا ہی چھوڑ دیا اور صرف بارہ میل کہنے لگا۔ اس پر بھی ارکان پارلیمنٹ کو یقین نہ آتا تھا۔ آخر کار ہزاروں دقتوں کے بعد ایک ریلوے کمپنی قائم ہوئی اور ایک انعام ۵۰۰ گنی کا اس مخترع کے لئے مقرر کیا گیا جو دس میل فی گھنٹہ کے رفتار سے ۳۰ میل تک گاڑی کو لے جا سکے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں دس ہزار آدمیوں کے مجمع میں پانچ آدمیوں نے اپنی اپنی ریل گاڑیاں پیش کیں، انھیں میں سے ایک اسٹوفنسن بھی تھا۔

اسٹوفنسن کے انجن کا نام راکٹ یعنی ہوائی تھا جس میں کئی گاڑیاں لدی ہوئی لگا دی گئی تھیں۔

آخرکار مقابلہ ہوا اور اس کے انجن نے ۱۵ میل کی رفتار سے راستہ طے کیا۔ اس کے بعد اسٹونسن نے انجن علیحدہ کرکے اس کی رفتار کا تجربہ کرایا۔ چنانچہ پہلے وہ دس میل کی رفتار سے لے گیا۔ پھر پندرہ میل کی رفتار سے حتیٰ کہ ۳۵ میل تک رفتار بڑھ گئی۔

لوگ حیران تھے کہ یہ کیا طلسم ہے اور کیونکر اتنی تیز رفتار کو لوہے کی پٹریاں اور پہیے برداشت کرسکتے ہیں، مگر چونکہ یہ ایک واقعہ تھا جو ان کی نگاہوں سے گزر رہا تھا اس لئے اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی اور سب خاموش تھے۔ امریکہ میں بھی تقریباً اسی تدریج کے ساتھ ریل کی ترقی ہوئی۔

موٹر اور ہوائی جہاز اس کے بعد وہ دور آیا جب انجن کی تیزی رفتار کی طرف خاص توجہ کی گئی اور رفتہ رفتہ اتنی ترقی ہوئی کہ ۱۹۰۱ء میں ایک خط مستقیم پر پورے ۱۲۰ میل کا راستہ ایک گھنٹہ میں طے کیا گیا۔

موٹر کی ایجاد کے وقت اس قسم کی دشواریاں پیش نہیں آئیں اور ہنری فورڈ نے ۱۹۰۱ء میں اپنا سب سے پہلا موٹر پیش کیا جس کی رفتار ۴۵ میل تھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں فورڈ نے اعلان کیا کہ اس کا جدید موٹر ۹۰ میل کی رفتار سے جا سکتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ساری دنیا اس طرف متوجہ ہوگئی اور تمام کارخانوں نے کوشش کی کہ اس مسابقت میں بازی لے جائیں، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں یہ رفتار ۱۷۰ میل تک ہوئی ۱۹۲۰ء میں ۱۵۶ میل ۱۹۲۶ء میں ۱۷۰ میل، ۱۹۲۷ء میں سیگریو ۲۰۰ میل کی رفتار سے گیا، ۱۹۲۸ء میں ایک اور شخص ۲۰۸ میل لے گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پھر سیگریو نے مقابلہ کیا اور ۲۳۱ میل کی رفتار سے اپنے موٹر کو لے گیا۔ لیکن ابھی تیزی کی انتہا نہ ہوئی تھی کیونکہ اس کے بعد ایک اور شخص کمبل نامی رونما ہوا اور ۲۴۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے موٹر کو لے گیا۔

پھر انسان نے سرعت سیر میں صرف وحوش ہی کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ طیور کے سامنے بھی آیا اور ان کو بھی بڑی حد تک شکست دی۔

سب سے پہلے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو اورویل ریت ایک ایسے طیارہ میں بیٹھکر اڑا جو ہوا سے زیادہ بھاری تھا اور اس نے ۶ میل فی گھنٹہ کے حساب سے راستہ طے کیا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں یہی شخص ۳۶ میل کی رفتار سے اڑا اور ۱۹۰۸ء میں ۴۴ میل کے حساب سے۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں امریکہ کے ایک شخص نے ۴۷ میل کے حساب سے پرواز کی، ۱۹۱۲ء میں یہ رفتار ۱۱۱ میل تک پہونچ گئی اور گزشتہ جنگ کے بعد ۱۷۰ میل تک۔

مائی طیاروں (پانی پر دوڑنے والے طیارے) میں بہت زیادہ ترقی ہوئی اور ۱۹۱۳ء سے لیکر

سنہ ۱۹۳۱ء تک ان کی رفتار ۸۴ میل سے ۲۱۵ میل تک پہونچ گئی۔

مستقبل اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنی سرعت سیر میں انتہائی ترقی کرلی ہے اور اب اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا؟ - کا ہم کا بیان ہے کہ تجارتی ہوائی جہازوں کا ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے سفر طے کرنا مستقبل قریب میں ہر شخص دیکھ لیگا - پروفیسر لو کا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ سرعت ۵۰۰ میل تک بڑھ جائے گی - بالر یو یقین کرتا ہے کہ دس سال میں یہ سرعت ۷۰۰ میل تک پہونچ جائے گی اور مسٹر بلنڈ کہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۵۰ء تک اس رفتار کا ایک ہزار میل فی گھنٹہ تک پہونچ جانا یقینی ہے - گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ جب سرعت سیر اس حد تک پہونچ جائے گی تو وہ دور طیاروں کا نہ ہوگا - بلکہ ہوائیوں کا ہوگا

اس سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان اس سرعت سیر کو برداشت کرسکتا ہے یا نہیں؟ پروفیسر اڈنگٹن کا بیان ہے کہ انسان فی الحال زمین کے ساتھ ساتھ بحساب ۲۰ میل فی سکنڈ آفتاب کے گرد گردش کر رہا ہے اور اگر اس سلسلۂ کہکشاں کو دیکھا جائے جس میں ہمارا نظام شمسی شامل ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ۲۵ میل فی سکنڈ کے حساب سے چکر کھا رہا ہے - اس لئے یہ سوال فضول ہے کہ انسان سرعت سیر کو برداشت کرسکتا ہے یا نہیں -

البتہ یہ ضرور ہے کہ بہت بلند فضا میں درجۂ حرارت صفر سے نیچے ہے اور وہاں کی ہوا بھی نہایت لطیف ہے جو انسان کی زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتی، سو اس کا انتظام نہایت آسان ہے، اور ایسے بند کمرے ہوائی جہازوں میں بن سکتے ہیں جہاں درجۂ حرارت اور کثافت ہوا دونوں انسان کے بقائے حیات کے لئے قائم رہ سکیں -

الغرض سرعت سیر کی حرص جو انسان میں پیدا ہوئی ہے وہ اب کسی طرح مٹ نہیں سکتی اور وہ زمانہ آنے والا ہے جب انسان کی سرعتِ سیر کشش زمین پر غالب آجائے گی اور وہ کرۂ ارض سے دوسرے کروں تک پرواز کرکے جا سکے گا -

---

باب الاستفسار

(علی اختر اور جوش کی شاعری)

(جناب ابوتراب محمد احمد صاحب (عثمانیہ) حیدر آباد دکن)

براہ کرم جوش اور علی اختر کی شاعری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرما کر ممنون کیجئے اور یہ متعین کیجئے کہ ان دونوں کی شاعری میں کیا فرق ہے۔

(نگار) اس بار حیدر آباد آنے کے ایک ہفتہ بعد ہی یہ استفسار مجھ تک پہونچ گیا تھا، لیکن میں اس کے جواب کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ میرے پاس ان دونوں حضرات کے کلام کا کوئی مجموعہ موجود نہیں اور دفتر سے دور ہونے کے باعث میں نگار کے گزشتہ پرچوں سے بھی استفادہ نہ کر سکتا تھا۔ یہی عذر اب بھی موجود ہے لیکن چونکہ مستفسر کا تقاضہ شدید ہے اس لئے بغیر کسی تفصیل کو سامنے رکھے ہوئے مجملاً اپنی رائے پیش کئے دیتا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں ان دونوں کی شاعری پر مقابلتاً اظہار خیال کروں یہ متعین کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ اصولاً صحیح بھی ہے یا نہیں یعنی یہ دونوں حضرات ایک ہی رنگ کے شاعر ہیں یا نہیں اور اُن کے مقصود شعری میں اتنا تفاوت تو نہیں ہے کہ مجھے زاویۂ نگاہ بالکل بدلنا پڑے۔

جوش کی شاعری یا بہ حیثیتِ شاعر اُن کے روشناس خلق ہونے کی تاریخ غالباً ۲۲ء سے شروع ہوتی ہے جب اول اول ان کی غزلیات، منظومات و منثورات کا یا تصویر مجموعہ روح ادب کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کا ذکر اب جوش صاحب کو بھی کھلا نہ معلوم ہو، لیکن میرے لئے اس کا بیان ناگزیر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ جوش کی شاعری نے تدریجاً کتنی ترقی کی ——

ہر چند جس وقت یہ مجموعہ شایع ہوا ہے، جوش صاحب اس وقت بچہ نہ تھے بلکہ ریعان شباب سے بھی گزر چکے تھے، لیکن اس مجموعہ میں بہت کچھ نشانیاں بچپن کی موجود تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ان کو بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف ٹیگور کو اس کی کتاب گیتان جلی پر نوبل پرائز مل چکا تھا اور ہندوستان میں اس کے طرز بیان پر ہر جگہ سر دھنا جا رہا تھا۔ دوسری طرف اقبال کی نظموں نے تو اتسے ترکیب و جدت بیان کی طرف ذہین دماغوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ ہر چند ٹیگور کی گیتان جلی اور اقبال کی نظموں میں لوگوں کو جو بات جدید و لذیذ معلوم ہو رہی تھی وہ حقیقتاً دنیا میں کوئی نئی چیز نہ تھی کوئی ابداع و اختراع نہ تھا بلکہ ایک پرتو تھا ادب متقدم کا اک نقش خام تھا سور داس و بیدل کے انداز بیان کا، لیکن چونکہ تعلیم جدید کا نصاب لوگوں کو اس کا موقعہ ہی نہیں دیتا کہ وہ اپنی اپنی کلاسکس کی طرف متوجہ ہوں، اس لئے ہندو، سور داس کی اہمیت سے ناواقف اور مسلمان بیدل کے مرتبہ سے بے خبر یہی باور کرنے لگا کہ ٹیگور و اقبال اپنے اپنے طرز ادا میں مخترع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہر حال میں اس کو بھی قدرت کی عنایت سمجھتا ہوں کہ جو لوگ خود متقدمین کے خیالات سے فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے اُن کے لئے دو درمیانی کڑیاں ایسی پیدا کر دی گئیں ہیں جو حال کو سور داس و بیدل کے اُس زمانہ سے ملا دینے والی تھیں جس کو بہ لحاظ رفعت خیال، و بداعت تخیل بجائے ماضی کے ازل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

منجملہ اُن بہت سے ذہین نوجوانوں کے جن کے سوئے ہوئے جذبات کو ٹیگور و اقبال نے بیدار کیا ایک جوشؔ بھی تھے اور ہر چند جوشؔ نثر نگاری کے لحاظ سے کسی قابل ذکر منزل تک نہ پہونچ سکے کیونکہ فطرت اُن کے لئے اپنی فیاض ثابت نہ ہوئی کہ نظم و نثر دونوں کی اہلیت تامہ ان میں پیدا کر دیتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی شاعری نے جوشؔ کے جذبات شاعرانہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک چنگاری گھاس کے خشک ڈھیر کے ساتھ کر سکتی ہے۔

جوشؔ فطرتاً نثر لکھنے کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے اس پر روح ادب کے منثورات کا ہر فقرہ شاہد ہے کہ باوجود سعی و کاوش وہ ناقص تتبع بھی ٹیگور کا نہ کر سکے، جوشؔ قدرتاً آرٹ کا صحیح درک نہ رکھتے تھے اس پر روح ادب کی وہ تصویریں گواہ ہیں جو ذوق صحیح کا خون کرنے کے لئے اس میں شامل کی گئی تھیں لیکن جوشؔ شاعر پیدا ہوئے تھے، اس کا ثبوت یقیناً روح ادب سے ملتا تھا اور اس کے ہر ہر شعر سے ملتا تھا۔

روح ادب میں غزلیں بھی تھیں اور نظمیں بھی، لیکن ان میں ہر چیز اپنی جگہ دل کو متوجہ کرنے والی تھی اور غزلگوئی و نظم نگاری کے پامال راستہ سے علحدہ ہٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چند جوشؔ جوار لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اودھ کے آخریں تاجدار واجد علی شاہ سے ان کا خاندان وابستۂ ملازمت بھی رہا، لیکن روح ادب میں ان کی شاعری بہت کم اس سخافت و رکاکت سے آلودہ نظر آتی ہے جو فرمانروایان

اودھ اور خصوصیت کے ساتھ "جان عالم پیا" کی عیش کوش و اخلاق کش حکومت میں سرزمین اودھ کے باشندوں کا خمیر ہو گئی تھی۔

گو روح ادب میں اور نہ اس کی اشاعت کے بعد سے لیکر اس وقت تک کوئی غزل جوش کی ایسی نظر نہیں آئی جس کو صحیح معنے میں غزل کہا جا سکے لیکن میں اس کو فطرت کا بڑا معجزہ سمجھتا ہوں کہ لکھنوی ہونے کے باوجود جوش کے تغزل میں وہ سخافت و رکاکت نہیں پائی جاتی جو لکھنوی شاعری کا عنصر اصلی ہے۔ یقیناً جوش کی غزلوں میں وہ درد و تاثر نہیں پایا جاتا جو تغزل کی جان ہے' ان کا تغزل اس سوز' بروگ سے محروم ہے جو غزل کو زبان عشق و محبت بنا دیتا ہے' لیکن ان کے یہاں وہ سرمستی' وہ کنگھی چوٹی وہ نخرہ' وہ زنانہ پن بھی نہیں ہے جو لکھنوی غزلگوئی کی خصوصیت خاصہ ہے۔ جوش کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات بھی ہیں' لیکن رنگ مستی لئے ہوئے مبالغہ و تصنع بھی ہے لیکن ایک خاص کیفیت جوش کے ساتھ اور یہی سبب ہے کہ اگر ان کی ادنیٰ سی ادنیٰ غزل لکھنوی معائب سے پاک ہے تو اچھی بہتر سے بہتر غزل بھی ایک نظم کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی جہاں اس کا مرتبہ یقیناً کافی بلند نظر آتا ہے۔

میں نے روح ادب کے مطالعہ کے بعد ہی حکم لگا دیا تھا کہ اگر جوش نے صرف غزلگوئی کو اپنا شعار قرار دیا تو ان کیلئے میدان زیادہ وسیع نہیں ہے اور اگر منظومات کی طرف توجہ کی تو انکا مستقبل یقیناً شاندار ہے چنانچہ فطرت نے انکی صحیح رہنمائی کی اور رفتہ رفتہ انکی غزلگوئی کم ہونے لگی۔ یہ تھا جوش کی شاعری کا اولین دور جو روح ادب کے ساتھ پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں انھوں نے زیادہ تر محاکات کی شاعری کی اور مناظر کے ساتھ ساتھ جذبات محبت کی چاشنی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس میں کلام نہیں کہ اس دور میں جوش نے جتنی نظمیں لکھیں وہ نہایت پاکیزہ تھیں لیکن افسوس ہے کہ اس رنگ کی انتہائی منزل تک پہونچنے سے قبل ہی وہ حیدرآباد آ گئے جو ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز نمائش جاہ و ثروت (Aristocracy) کا ہے جوش صاحب یا ان کا خاندان چونکہ خود بھی کسی زمانہ میں اعیان و اشراف اودھ میں شامل تھا اور امارت و دولت کی بو ان کے دماغ میں ہنوز باقی تھی اس لئے حیدرآباد کے یہ مناظر تنعم و تعیش دیکھکر ان کو بہت سے بھولے ہوئے خواب یاد آ گئے' بہت سی خوابیدہ تمنائیں ان کی بیدار ہو گئیں اور ان کا وہ رنگ شاعری جو مایوسی کے بعد ترک تمنائی حالت میں صرف قدرت و مناظر قدرت سے متعلق ہو گیا تھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

اگر جوش صاحب کی وہ تمنائیں جنکا یہاں آنے کے بعد نیا حشر ہوا تھا پوری ہو جاتیں تو ان کی شاعری یقیناً ختم ہو جاتی۔ اور اگر ختم نہ ہوتی تو یقیناً وہ صرف اس سطح پر آ جاتی جسے شراب کی کیفیت نہیں بلکہ صرف

شراب کے بلبلوں سے تعلق ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور دنیا باندازۂ تمنا اُن پر وسیع نہ ہوسکی اس لئے ان میں جذبۂ انتقام پیدا ہوا اور دولت و سرمایہ داری کے خلاف اُنھوں نے لکھنا شروع کیا کاش کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہی انکا ایمان و اعتقاد ہوتا، وہی ان کی روح کا پیغام ہوتا۔ لیکن ایک وہ کیا ہم سب کی یہی حالت ہے اور ایک قوم کے انتہائی دورِ انحطاط میں جو روباہ وشی پیدا ہو جاتی ہے اس سے نہ ہمارے یہاں کوئی مصنف خالی ہے نہ مولف، نہ شاعر بچا ہوا ہے نہ مغنی۔

یہ تو ایک عمومی تبصرہ ہوا ان کے مختلف ادوار شاعری کے متعلق اب رہا یہ امر کہ فن شعر کے لحاظ سے ان کا کیا مرتبہ ہے، اس کے متعلق بھی چند سطریں لکھنا ضروری ہیں۔ غزلوں کے متعلق میں پہلے ہی اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ان میں والہانہ جوش، اندازِ مستی ضرور پائی جاتی ہے، مگر وہ سوز و تاثر جو تغزل کی جان ہے ان کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اُن کی غزلگوئی صرف حافظ کے حدود تک رہجاتی ہے اور وہاں سے گزر کر سعدی تک نہیں پہونچتی۔ اُن کی محاکاتی و منظری شاعری جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں بہت پاکیزہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کی وہ نظمیں جو انگریزی خیالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں نہایت ہی لطیف ہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ اس رنگ میں ایک ذہن خلاق کے درجہ تک پہونچتے قومی و اشتراکی شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے اور ابھی اس میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی کہ رباعیات کی جانب انہماک پیدا ہوا جو یکسر خیام کی تقلید ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ قدرت نے جوش کو نابغہ پیدا کیا۔ اک ذہن خلاق کی تمام اہلیتیں ان میں ودیعت کر دیں، لیکن اس دل و دماغ کے ساتھ ہی ساتھ آنکھیں ایسی دیدیں جو صرف طلسم آب و رنگ سے لطف اٹھانے والی تھیں یہی سبب تھا کہ ہر منظر و ماحول کے ساتھ ان کی شاعری کا رنگ بدلتا رہا اور قبل اس کے کہ ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے نکلنے والی کوئی ایک صدا بلند ہو کر فضا میں پوری طرح گونجتی ان کے ذوقِ نظر نے اس کو دبا دیا اور دوسری کیفیت میں محو ہو کر رہ گئے۔

دنیا میں نابغہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جنکے تمام احساسات کا میلان ایک ہی مرکز کی طرف ہوتا ہے، ایک ہی آواز اُن کے منھ سے نکلتی ہے اور ایک ہی منزل کی طرف اُن کے قدم اُٹھتے ہیں یعنی اُن کی روح کا ایک ہی پیغام ہوتا ہے، ان کے قلب کی ایک ہی صدا ہوتی ہے اور ان کا سازِ ہستی تمام ہم آہنگیوں کے ساتھ ایک ہی نغمہ بلند کرتا ہے ــ دوسری قسم نابغہ کی وہ ہے جس کی قوت ادراک عام سطح سے تو بہت بلند ہوتی ہے، جس کے احساسات یوں تو نہایت لطیف و نازک ہوتے ہیں مگر اُن میں وزن کم ہوتا ہے اور تنوع زیادہ، ولولۂ انبساط زیادہ ہوتا ہے اور خواہش فکر و تامل کم، ان کے دلوں میں درد ہوتا ہے، ان کی روحیں غم آلود ہوتی ہیں مگر وہ چاہتے یہ ہیں کہ جب تک سطح آب و رنگ سے لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ اس درد و غم کو بھلا دیا جائے تو

بہتر ہے اور جس وقت تک ظاہری شیرینی لذت کام و دہن بنی ہوئی ہے، اندرونی تلخیوں سے جس قدر کم سروکار رکھا جائے مناسب ہے وہ تماشہ گاہ عالم میں اپنے غم سے ہلاک ہو کر بایۂ اعتبار و بینش بننا نہیں چاہتے بلکہ اس مغموم ایکٹر کا سا پارٹ ادا کرنا چاہتے ہیں جو تھپیڑ کھانے کے بعد بھی ہنسنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لئے اول الذکر نابغہ تو وہ ہے جو اپنے اندوہ احساس میں فنا ہو کر دنیا میں ایک پرستش گاہ اپنے بعد چھوڑ جاتا ہے اور موخر الذکر دنیا کی ظاہری حالت سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان ہیکلوں کو بھی مٹا جاتا ہے۔ جنھیں وہ اپنے دل و دماغ میں اس پس و پیش کے ساتھ لئے پھرتا ہے کہ ان کو دنیا کے سامنے لاؤں یا نہ لاؤں۔

جوش اسی دوسری قسم کے نابغہ ہیں اور اگر قدرت نے ان کے حالات میں کوئی مستقل کیفیت ادھر یا اُدھر پیدا نہ کی تو مشکل سے وہ کسی ایک رنگ پر قائم رہ سکتے ہیں، اور فطرت کی بہت سی ذہنی ودیعتوں کا یونہی رائگاں چلا جانا یقینی ہے۔ جوش اگر بادشاہ ہو کر اپنی ان تمام تمناؤں کو پورا نہیں کر سکتے جن کی حسرت میں اُنھوں نے اپنی جوانی گنوائی ہے اور جس کا انتقام وہ زمانہ سے صرف اسی طرح لے سکتے ہیں کہ اپنے آقا رنامدار واجد علی شاہ کی سنت دیرینہ کو پھر از سر نو زندہ کر دیں، تو ان کو مایوس ہو کر وہ زندگی اختیار کرنا چاہئے جو بظاہر بہت تلخ و ناگوار ہے، لیکن ان کی فطرت کی حقیقتوں کا راز اسی میں پنہاں ہے۔

وہ دولت و سرمایہ داری کی مخالفت اس لئے نہ کریں کہ وہ خود اس سے محروم ہیں، وہ درس آزادی اسلئے نہ دیں کہ جاہ و ثروت سے انتقام لینے کی یہ بھی ایک صورت ہے، وہ صاحبان جبہ و عمامہ، ذاکران مجلس اور خانقاہ نشینوں کی برائی اس بنا پر نہ کریں کہ ان کی دنیاوی آسودگی پر انھیں رشک آتا ہے بلکہ وہ اپنے حال سے، اپنے اخلاق سے، اپنی زندگی سے یہ ثابت کریں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اُن کے دل کی آواز ہے، ان کے روح کا پیام ہے اور ان کی فطرت کا تقاضہ ہے۔ ورنہ یوں آزادی کا درس دیتے ہوئے خود غلامی کی زندگی بسر کرنا صاحبان دولت و جاہ کی بُرائیاں کرتے ہوئے خود اُن کے سامنے دست سوال پھیلاتا اور علمبرداران مذہب کے خلاف آتش بیانیاں دکھاتے ہوئے خود ایسے ہی اخلاق ذمیمہ میں مبتلا رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

بہرحال جوش اس میں شک نہیں کہ نابغہ ہیں لیکن دوسرے درجہ کے وہ فضائے شاعری کے اختر تابندہ ہیں مگر "قدر اول" کے نہیں۔ ان کی زبان میں حلاوت ہے، اُن کے الفاظ میں عذوبت ہے، اُن کی

ترکیبوں میں دلکشی و ندرت ہے، اُن کی فکر و جستجو میں ابداع و اختراع ہے، ان کے انداز بیان میں جوش و مستی ہے، لیکن دردِ حقیقت سے خالی، دل کی تڑپ سے معرا، روح کے سوز سے ناآشنا اور پیام صداقت کی ہیبت و جلال سے محروم!

علی اختر صاحب کی شاعری کا علم مجھے جوش کے منصۂ شہود پر آنے سے تقریباً ۶ سال قبل اول اول غالباً ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا جب یادش بخیر مولانا ہوش کا ذخیرہ پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔ اُن کی سب سے پہلی نظم جو میں نے دیکھی وہ "بہار کے آخری پھول" پر تھی۔ میں نے غور کیا کہ کہیں یہ انگریزی کی مشہور نظم (Last Rose of Summer) کا ترجمہ تو نہیں ہے، لیکن معلوم ہوا کہ اس سے بالکل علحدہ کوئی اور چیز ہے۔ ہر چند یہ وہ زمانہ تھا جب میں خود بھی تنقید کا اہل نہ تھا تاہم اس نظم کے پڑھنے کے بعد میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ شاعری کے اسٹیج پر ایک اور ایکٹر حزن و ملال کا پارٹ ادا کرنے کے لئے طیار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد تیرہ سال کا طویل زمانہ گزر گیا اور میں بالکل بے خبر رہا کہ اختر کون ہیں اور ان کا رنگ شاعری کیا ہے۔ پھر ۱۹۲۹ء میں ان کی ایک نظم نگار میں شایع ہونے کے لئے مجھے موصول ہوئی اور یہ واقعہ ہے کہ میں اس نظم کو پڑھکر دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کیسی آواز ہے، یہ شخص کون ہے جو اس صدا سے پکار رہا ہے، اس کے دل میں کیا ہے جو کہنا چاہتا ہے۔ معاً میرا خیال مجھے اسی "بہار کے آخری پھول" کی طرف لے گیا اور میں خوش ہوا کہ جو پیشین گوئی میں نے کی تھی وہ بڑی حد تک صحیح نکلی۔

اس کے بعد سے اس وقت تک برابر نگار میں جناب اختر کی نظمیں شایع ہو رہی ہیں اور اہل نظر سے مخفی نہ ہوگا کہ ان کی اور جوش کی شاعری میں کیا فرق ہے۔ میں اس فرق کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ جوش کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اور اختر کی نظم سے، اختر کی سب سے پہلی نظم ۱۹۱۶ء میں پبلک کے سامنے آتی ہے اور اک مستقل کیفیت لیے ہوئے جوش اس کے ۶ سال بعد روحِ ادب کے ذریعہ سے رونما ہوتے ہیں اور اس طرح کہ ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہوتا ہے کہ آئندہ چلکر انکا کیا بنتا ہے۔ جوش کی شاعری کا اولین مظاہرہ رنگینی و مستی کے ساتھ ہوتا ہے اور اختر کا حزن و ملال کے ساتھ، جوش کی شاعری تغزل سے گزر کر مناظر و محاکات پر آتی ہے اور پھر قومیاتی و اصلاحی رنگ اختیار کر کے ہزل و ہجا کی صورت اختیار کر لیتی ہے، برخلاف اس کے اختر کی شاعری کا حزن و ملال ترقی پاکر اک ایسا احساس درد بن جاتا ہے جس کا تعلق فرد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ جوش نے بھی ملک و قوم کے

اسی دورِ انحطاط میں آنکھ کھولی جو اختر کے سامنے تھا، لیکن فرق یہ ہے کہ ایک نے اس سے بیخبر رہکر نیرد کی طرح نغمۂ شاعرانہ چھیڑا اور دوسرے نے مولیر کی طرح اپنے آپ کو اسی دردِ احساس کے لئے وقف کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض بعض نظمیں جوش کی بھی ایسی ہیں جن سے ان کی فکر کی گہرائی، تخئیل کی بلندی غیر معمولی طور پر ثابت ہوتی ہے، لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اخیر میں یا تو وہ بالکل "انفرادی" احساس کی چیز ہو کر رہ گئی ہیں، یا شاعر کے خیال نے آہستہ آہستہ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جیسے کوئی تھک کر سایہ میں آرام لینے لگے۔ برخلاف اس کے اختر کی تمام نظمیں فکر عمیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی نظم کا ہر شعر ایک کے بعد دوسرا عمیق تر ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود بھی اس کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔ جوش کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن کو انھوں نے اختر کے نقطۂ خیال سے شروع کیا ہے لیکن جوش تھوڑی دور تک گہرائی میں جانے کے بعد ہاتھ میں کچھ گل دریائی لئے ہوئے باہر نکل آتے ہیں اور اسی کو معراجِ کمال سمجھتے ہیں، لیکن اختر کی غواصی برابر قائم رہتی ہے یہاں تک کہ کوئی موتی ان کے ہاتھ نہ آجائے۔

جوش بھی کبھی کبھی حیاتِ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس میں "انفرادی" حیثیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، برخلاف اختر کے کہ ان کی نظر ہمیشہ اجتماعی پہلو پر جاتی ہے اور اس سے کوئی نظم خالی نہیں ہوتی۔

جوش کی قومی یا اصلاحی نظموں میں ایک خشونتِ انتقام ہے، لیکن اختر کی نظموں میں کیفیت التیام۔ ان کے پیام میں جرح و طعن ہے اور ان کے پیام میں لینت و رافت، ان کے یہاں غصہ ہے ان کے یہاں محبت وہ تخریب چاہتے ہیں اور یہ تعمیر اور اس طرح جو اخلاقی فرق ان دونوں کی شاعری میں پیدا ہو گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب مستقبل میں تعمیر قومیت و وطنیت کی تاریخ مرتب کیجائے گی تو اس میں اختر ہی کا نام زیادہ نمایاں و روشن نظر آئے گا۔

اب جوش کے درمیانی دور اور زمانہ حال دونوں کی نظموں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اب جوش کی حالت اس طایر کی سی ہے جو اڑتے اڑتے تھک گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت وہ تھک کر زمین پر آ رہے، برخلاف اس کے اختر کا شہباز فکر یکساں طور پر بلندی کی طرف اڑتا چلا جا رہا ہے اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کہاں جا کر دم لے گا۔

اس میں شک نہیں کہ جوش بھی اختر کی طرح کبھی کبھی کائنات کی بعض تلخ حقیقتوں سے بحث کرتے ہیں، لیکن دونوں کے اندازِ بیان اور مقصود میں بہت فرق ہے۔ وہ دنیا کے سامنے منظر عبرت و

انتباہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ درس بصیرت وتحمل، اُن کے یہاں غم ایک نیش ہے، اِن کے یہاں نوش وہ اس سے احتراز کا درس دیتے ہیں، اور یہ اس کو گوارا کر لینے کا

جوشؔ کی شاعری میں حلاوت وشیرینی زیادہ ہے۔ اور اخترؔ کی شاعری میں وزن وگرانمایگی جوشؔ کی شاعری ایک ایسا حسن صبیح ہے جو اول اول تو آنکھوں کو خیرہ کرکے دل کو ضرور بے چین بنا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر زائل بھی ہو جاتا ہے، لیکن اخترؔ کی شاعری ایک حسن ملیح ہے جس کا اثر اول اول تو زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن بعد کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا ہے اور جس کا نکالنا کسی طرح گوارا نہیں۔ علاوہ اس کے فن کے لحاظ سے بھی اخترؔ کا مرتبہ بلند تر ہے، کیونکہ جوشؔ کے یہاں نہ صرف معانی وبیان اور عروض وقافیہ کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ الفاظ وتراکیب کے نادرست استعمال کی بھی۔ اخترؔ کے کلام میں ایسی غلطیاں شاذ نکلیں گی۔ عدم توازن دونوں کے کلام میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ اخترؔ کے یہاں یہ عیب صرف الفاظ تک محدود رہتا ہے۔ اور جوشؔ کے یہاں کبھی کبھی مصرعوں تک پہونچ جاتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ علم ومطالعہ کے لحاظ سے بھی اخترؔ کی نظر بہ نسبت جوشؔ کے زیادہ وسیع ہے۔

بہرحال میرے نزدیک اس وقت بھی اخترؔ، جوشؔ سے بہتر شاعر ہیں اور اگر مستقبل میں اخترؔ نے ترقی کرکے اس ثقل کو بھی دور کر دیا جو کبھی کبھی ناگوار حد تک ان کے کلام میں پایا جاتا ہے تو میں یہ کہونگا کہ وہ اپنے رنگ میں ہندوستان کا ایک ہی شاعر ہوگا اور اس کا مثل پیدا کرنے کے لئے زمین کو خدا جانے کتنے چکر اور کھانا پڑیں گے۔

یہاں تک تو میں نے ایک عمومی تبصرہ کرکے دونوں کی شاعری کا فرق ظاہر کر دیا، لیکن اسی کے ساتھ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ میں دونوں کے کلام سے اقتباس پیش کرکے اپنے دعوے کا ثبوت بھی فراہم کروں ——— سو اس کو میں کسی آئندہ اشاعت پر ملتوی رکھتا ہوں تاکہ لکھنؤ پہونچکر اطمینان سے ان دونوں کا کلام سامنے رکھنے کے بعد اس خدمت کو انجام دوں۔ تاہم تمہیداً جوشؔ کی خامیوں کی چند مثالیں جو اس وقت مجھے زبانی یاد ہیں پیش کئے دیتا ہوں۔

ان کی ایک نظم محشرستان کانپور کے عنوان سے شایع ہوئی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبین ارض کے داغ اے دنئی ہندوستاں

دوسرا شعر اس کا یہ ہے:۔

تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ اولیں
آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں

پہلے شعر میں سرزمین ہندوستان سے خطاب ہے جسے جبین ارض کا داغ کہکر اور زیادہ موثق کردیا گیا ہے، لیکن دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ "تجھکو عورت نے جنا ہے" درانحالیکہ ہندوستان کی سرزمین کو عورت نے کبھی نہیں جنا اور نہ وہ آدمی کی نسل سے ہے۔ یہ نقص معانی وبیان کا ہے۔ علاوہ اس کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ اولیں کا غیر ضروری استعمال کسی سے مخفی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ محض نہیں کا ہم قافیہ لانے کے لئے یہ آخریں کوشش کی گئی ہے۔

ایک شعر ہے:-

تیری جانب اُٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ وزنار میں جکڑے ہوئے دیو سیاہ

دوسرے مصرعہ میں دیو سیاہ منادیٰ واقع ہوا ہے اور حرف ندا کہیں نہیں لایا گیا، درآنحالیکہ فن کی رو سے ایسی صورت میں کہ مصرعہ کا اکثر حصہ منادیٰ کی صفت واقع ہو حرف ندا لانا بالکل لازم ہے تاکہ ذہن سامع مشوش نہ ہو۔

اور ایک شعر ہے:-

تیغ بُراں اور عورت کا گلا کیوں بدصفات
چھوٹ جائیں تیری نبضیں ٹوٹ جائیں تیری ہاتھ

دوسرے مصرعہ میں جو بددعا دی گئی ہے وہ غالباً اسی عورت کی طرف سے دی گئی ہے۔ جس کا گلا تیغ بُراں کے نذر ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی پُرجوش نظم میں یہ نسائی قسم کی ضعیف وکمزور بددعا کیسی۔

ایک شعر یہ ہے:-

کہنیوں سے یہ تری کیسا ٹپکتا ہے لہو
یہ تو ہے اے سنگدل بچوں کا خونِ مشکبو

پہلے مصرعہ میں لفظ لہو بالکل بیکار ہے اور زور بیان کو ضعیف کرنے والا۔ اگر پہلے مصرعہ میں بغیر کسی تخصیص وتعین کے صرف استفسار ہوتا اور دوسرے مصرعہ میں تنکیری حیثیت سے اس کا جواب دیدیا جاتا تو شعر بہت بلند ہوجاتا۔ نثر میں ہم اس مفہوم کو یوں ادا کریں گے کہ:- یہ تیری کہنیوں سے کیا ٹپکتا ہے،

اے سنگدل سچ بتا یہ بچوں کا خون تو نہیں؟

ایک جگہ فرماتے ہیں :-

مرد ہے تو اس سے لڑ پہلے جو مارے پھر لڑے
تو نے بچوں کو چباڈالا خدا غارت کرے

پہلے مصرعہ میں اخیر کے دو لفظ (پھر لڑے) بالکل بیکار ہیں، مفہوم بغیر ان کے پورا ہوجاتا ہے دوسرے مصرعہ میں "خدا غارت کرے" بھی وہی نسائیت لئے ہوئے ہے۔

ایک شعر ہے :-

دل میں کھوٹاپن، ارادوں میں بدی نیت خراب
اسپہ بدباطن یہ عالم اور آزادی کے خواب

یہ عالم کا اشارہ کس طرف ہے شعر سے متبادر نہیں۔ مفہوم بغیر اس کے اس طرح پورا ہوجاتا ہے کہ "اسپہ بدباطن یہ آزادی کے خواب!"

جوش نے ایک نظم خاتونِ ہند کے عنوان سے لکھی تھی جس کا پہلا شعر ہے :-

سن اے خاتونِ ہندی انجمن سے کیا تجھے نسبت
کہ زیبا ہے تجھے تو خلوتِ اخلاق کی مسند

پہلے مصرعہ میں لفظ انجمن استعمال کیا گیا ہے جو مادی منظر کی چیز ہے اور مصرعۂ ثانی میں مقابلتاً خلوتِ اخلاق کہا گیا ہے جو بالکل غیر مادی چیز ہے۔ انجمن کے مقابلہ میں صرف خلوت کہا جاسکتا تھا۔ مگر محض مصرعہ پورا کرنے کے لئے لفظ اخلاق لایا گیا۔ علاوہ اس کے خلوتِ اخلاق یوں بھی بالکل مہمل فقرہ ہے۔ اگر اخلاق خلوت ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ اس قسم کی غلط ترکیبیں جوش کے یہاں بہت نظر آتی ہیں۔ اسی نظم کا دوسرا شعر ہے :-

تری رعنائیوں پر حق نہیں بزمِ شبستاں کا
ترے عشووں کا مرکز ہے حیا و شرم کا گنبد

لفظ گنبد کو مسند کا ہم قافیہ استعمال کیا گیا ہے۔ درانحالیکہ صحیح تلفظ اس کا گنبد (بہ ضم با) ہے علاوہ اس کے بزم کے بعد شبستاں کی تخصیص بھی لغو ہے۔ اگر کوئی بزم دن میں منعقد ہو تو کیا عورت کی رعنائیوں پر اس کا حق ثابت ہوجائے گا!

ایک نظم میں اپنی شریک زندگی سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

کیوں نہیں روتی کہ دنیا دام میں آئی ہوئی
زر کے پیچھے دوڑتی پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

لفظ دام کے معنے جال کے ہیں اور مجازاً اس کا استعمال مکر و فریب کے محل پر بھی ہوتا ہے، لیکن اصول معانی و بیان کے لحاظ سے مجازی معنی میں ایک لفظ ہمیشہ اس وقت استعمال کیا جائے گا جب اس کے بعد کوئی لفظ یا نقرہ ایسا نہ ہو جو لفظ کے اصل مفہوم کے متناقض ہو۔ درانحالیکہ یہاں دوسرے مصرعہ میں دوڑتی پھرتی کا نقرہ استعمال کیا گیا ہے جو دام کے اصلی معنی کے متناقض ہے۔ دام (جال) میں آنے کے بعد "دوڑتے پھرنا" کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے :-

کیوں نہیں روتی کہ جنکے رخ پہ تھا رعب وقار
آج ان لڑکوں کی سج دھج دیکھ کر آتا ہے پیار

ظاہر ہے کہ جن کے رخ پر رعب وقار تھا وہ لڑکے اور تھے اور جن کی سج دھج پر پیار آتا ہے وہ اور ہیں پھر دونوں کو ایک کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اگر "اُن کے لڑکوں کی سج دھج" کہا جاتا تو بیشک درست ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے سامنے جوش کی ایک بھی مکمل نظم موجود نہیں ورنہ ممکن تھا کہ میں کچھ مثالیں اور پیش کر سکتا۔

بہرحال میں اس بحث کو صحبت آئندہ پر موقوف رکھتے ہوئے، جوش صاحب سے عرض کرونگا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے ان کی تنقیص مراد نہیں ہے۔ اُن کی شاعری کی بعض خصوصیات کا میں بیحد معترف ہوں اور میں اُن کو بھی کسی وقت دنیا کے سامنے پیش کروں گا۔

جنوری ۱۹۳۳ء کا نگار

وقف ہوگا صرف حضرت نیاز کے ملاحظات کے لئے کتاب شہوانیات علیحدہ طبع ہو رہی ہے اور ناظرین نگار کو بہت معمولی قیمت پر دیجائے گی۔

غیر خریداران نگار علاوہ محصول ۱۲ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

مینیجر نگار لکھنؤ